ہماری ویب ڈیجیٹل بک

محمد آصف اقبال

MOHAMMAD ASIF IQBAL

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Mohammad Asif Iqbal"
at Hamariweb.com

کرپشن کی اصل وجہ ! آخرت پر یقین نہ ہونا

کرپشن وقت کا ایک اہم موضوع ہے کیونکہ شاید آج کرپشن کے خلاف لوگ سوچنے اور غور و فکر کرنے لگے ہیں۔انسانیت کے اندر وہ روح بیدار ہو رہی ہے جو چاہتی ہے کہ برائیاں ختم ہوں، بھلائیاں پروان چڑھیں۔ ناانصافی کا خاتمہ ہو اور عدل قائم ہو۔ظالم ،جابر اور ڈکٹیٹر حکمرانوں نے جو عام انسانوں کو غلامی کے طوق پہنا رکھے ہیں وہ گلوں سے اتریں اور انسان آزاد ہو جائیں۔آزادی ملک کی نہیں بلکہ انسانوں کے حقوق کی آزادی۔یعنی وہ اپنے بنیادی حقوق حاصل کر سکیں،حکومتیں ان کے حقوق ادا کریں اور ادا کرنے کا نظم قائم کریں ، یہ نظم ایسا ہو جہاں شفافیت ہو، ایمانداری ہو،احساس ذمہ داری ہواوران لوگوں پر گرفت ہو جو اس کام میں رکاوٹ بنتے ہیں،اور یہ سب کام زبانی نہیں بلکہ عملی ہونے چاہیں۔آج کرپشن کا مسئلہ کسی خاص ملک کا مسئلہ نہیں ہے۔ایسا نہیں ہے کہ یہ مسئلہ صرف کم ترقی یافتہ ملکوں ہیں ہی پایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف یہ مسئلہ ترقی پذیر قوموں اور ملکوں میں بھی اپنے عروج پر پہنچ چکا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ہند میں بلکہ نیو یارک کی وال سٹریٹ پر بھی انسانوں کے ساتھ ان ہی جیسے مٹھی بھر انسانوں کی جانب سے جب غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور لوگوں کے حقوق جب سلب کیے جاتے ہیں تو فضا میں occupy wall streeکے نعرے گونج اٹھتے ہیں۔

: کرپشن ایک ناسور

واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی کام ہو خصوصاً سرکاری اور بعض مواقع پر غیر سرکاری اداروں میں بیٹھے ذمہ دار اس کام کو کرنے سے قبل رشوت چاہتے ہیں۔کاروبار میں بدعنوانی، بھتہ خوری، سرکاری رقوم میں خرد۔برد۔اس سے بھی آگے بڑھیے تو تعلیمی اداروں میں ایڈمیشن کے وقت "ڈونیشن " کے نام پر لی جانے والی رشوت، سرکاری اسپتالوں میں دواؤ ں اور دیگر اشیاء میں خرابی و چھیڑ چھاڑ اور قانونی چارہ جوئی کرنے والے ذمہ داران اور ان کے اداروں میں کھلے طور پر لی جانے والی رشوت۔ معلوم ہوتا ہے کرپشن ایک ناسور ہے جو چہار جانب رچ بس چکا ہے۔ جس سے چھٹکارا پانا اور جس کو دور کرنا مشکل ہی نہیں مشکل ترین ہو گیا ہے۔ مہذب معاشرے میں رشوت قابل قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ وہ ناسور ہے جو اخلاقی، ثقافتی، سیاسی اور قانونی نظاموں کا تانا بانا بکھیر دیتا ہے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ یہ پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے کر نظام وقت کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔لوگ کہتے ہیں کہ کرپشن کیونکہ انسانوں میں رچ بس چکا ہے لہذا انسانوں کے ذریعہ چلائے جانے والے اداروں کے نظم و نسق بیں‌بں شفافیت اور اینٹی کرپشن اقدامات کے ذریعہ قابو پایا جا سکتا ہے۔اگر یہ مان لیا جائے کہ شفافیت اور اینٹی کرپشن اقدامات کے ذریعہ کرپشن پر قابو پایا جا سکتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو ادارہ بھی اس اقدام کے لیے قائم کیا

جائے گا کیا اس میں یہی طرز فکر و عمل رکھنے والے افراد نہ ہوں گے؟ کیا یہ اینٹی کرپشن کے اقدامات کرنے والے حضرات اسی معاشرے کا حصہ نہیں ہوں گے جو پہلے سے موجود ہے یا کہیں اور سے آئیں گے؟ جب یہ حضرات خود اسی معاشرے کا حصہ ہوں گے جو معاشرہ اِس سماجی برائی اور اخلاقی بگاڑ میں ملوث ہے تو کیونکر اور کیسے وہ اس بات کی ضمانت دے سکتے ہیں کہ وہ اس برائی پر گرفت پا سکیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ کرپشن کی روک تھام کے وہ ادارے جن کی ذمہ داری ہے کہ وہ رائج کرپشن کو ختم کریں آج سب سے زیادہ خود وہ اس برائی میں مبتلا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ:

حقیقت یہ ہے کہ وطن عزیز ہند میں کرپشن کے خلاف آواز اٹھانے والون پر لوگ خود انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ کرپشن جو آج ہندوستان کو اندر سے کھوکھلا کیے جا رہا ہے ایک اہم مدا ہے لیکن اس مدے کو اٹھانے والوں کو اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا چاہیے۔ بابا رام دیو اور ان کے ساتھی بال کرشن کا جالی پاسپورٹ، بابا کے ٹرسٹ، کمپنیز اور تنظیموں کے حسابات میں انکم ٹیکس کی خلاف ورزیاں۔ انا ہزارے کے ہند سوراج ٹرسٹ کے تعلق سے سپریم کورٹ کا نوٹس، ایک پارٹی کی کھل کر مخالفت اور ایک خاص "کی حمایت۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھی ان سے ایک ایک کرکے دور ہوتے" جا رہے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو ان کے شانہ

بشانہ تو نہ صحیح لیکن ان کے کام سے دلی ہمدردی ضرور رکھتے تھے۔آج وہ کہنے پر مجبور ہیں کہ "میں انا کا کل تک حامی تھا، آج غیر جانبدار ہوں، کل شاید ان کی مخالفت میں کھڑا ہو جاؤ ں۔البتہ ان کی سادگی اور زندگی کی تعریف ہمیشہ کروں گا، لیکن ان سے کچھ سوال ضرور پوچھنا چاہتا ہوں، انا آپ نے کہا تھا کہ کسی پارٹی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔لیکن اب تو آپ صاف صاف کانگریس کی کھل کر مخالفت کر رہے ہیں اور آپ کے ساتھیوں میں سے ایک کرن بیدی درپردہ بی جے پی کی حمایت کر رہے ہیں، جو لوگ کسی فائدے کے لالچ کے بغیر آپ کی مہم میں شریک ہوئے تھے، یہ تو ان کے ساتھ دھوکہ ہے" (منگل سنگھ ،دینک ہندوستان) ۔پھر دیکھیں مودی کا انشن اور حکومت کا کروڑ روپیہ کا استعمال نیز مودی پر الزام لگانے والوں پر مودی کا عتاب۔اڈوانی کہ 100 جس کی ایک یاترا نے پورے ملک کا امن و امان تہس نہس کر دیا تھا۔اسی طرز پر نکلی ایک اور یاترا اور یاترا سے قبل مختلف مقامات پر مسلمانوں کے جان و مال کی کھیلی جانی والی ہولی۔اور سب سے بڑھ کر میڈیا کا مشتبہ کردار۔ یہ تمام واقعات اس جانب متوجہ کرتے ہیں کہ کرپشن کے خلاف آواز اٹھانے والے خود ہی کرپٹ ہیں ۔پھر جب کہ برائی کو ختم کرنے والے خود اسی دلدل میں دھنسے ہوئے ہوں تو کیونکر وہ اپنے جسم اور آتما کو سب سے پہلے پاک و صاف نہیں کرتے ؟ان کے اندر کیسے ہمت ہو جاتی ہے کہ وہ خود برائی کرتے رہیں اور دوسروں کو بھلائی کی ترغیب دیں؟ کیا وجہ ہے کہ ان کا ضمیر ان کو نہیں جھنجوڑتا اور کیونکر وہ دوسروں کو نیکی کی

نصیحت کرنے اپنے گھروں سے نکل پڑتے ہیں؟ مالک برحق جس نے مجھے بھی پیدا کیا اور آپ کو بھی اور اس دنیا میں موجود ہر انسان و جاندار کو پیدا کیا وہ کہتا ہے کہ: "تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں" (الصف: ۳-۲)۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ برائیوں کے خاتمہ کی سعی و جہد کرنے والے ہوں اُن کو خود اس برائی سے پاک ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہوگا تو ان کی سعی و جہد رائیگاں جائے گی۔ وہ خود جھوٹے ثابت ہوں گے اور دنیا کی نظر میں مکار، عیار، چال باز اور مفاد پرست کہلائیں گے۔

:یہی وجہ ہے کہ

میڈیا کہ جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی دونوں عوام کے سامنے لا کر رکھ دے۔ افسوس کہ وہ آج سرمایہ داروں، ملٹی نیشنل کمپنیز اور سیاست دانوں کے ہاتھ بک چکی ہے۔ ایک جانب وہ کرپٹ لوگ ہیں جو کرپشن کے نام پر اپنی سیاست چمکانے میں مصروفِ عمل ہیں تو دوسری جانب سستے اور کم داموں پر بک جانے والے صحافی اور رپورٹرس کہ جن کے دام کہیں 1000 روپے کا ایک نوٹ ہے تو کہیں صرف 500 روپے۔ مفاد پرستوں نے میڈیا کی تصویر مسخ کر کے رکھ دی ہے یہی وجہ ہے کہ دن رات اور ہفتہ کے ساتوں دن خصوصاً ہندی الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا ایک خاص نظریہ و مقصد سے وابستہ افراد کے

کوریج میں مصروفِ عمل ہے۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستانی میڈیا میں فاسسٹ اور ہندوتو وادی منفی سوچ رکھنے والوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے یا دوسرے لفظوں میں سچائی کے علمبرداورں کو یہ لوگ خریدنے میں بہت تیزی کے ساتھ کامیاب ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ توجہ طلب پہلو ہے کہ جب حقیقت کی عکاسی کرنے والوں کے بازار لگے ہوں اور ان کی خرید و فروخت جاری ہو تو کیسے ممکن ہے کہ وہ جو رپورٹیں میڈیا میں پیش کریں اس میں جانب دارانہ رویہ وہ اختیار نہ کرتے ہوں گے؟ پھر یہ بھی کہ جانب داری چاہے وہ کسی بھی قسم کی ہو ایک برائی ہے جو انسان کو سچ کہنے، لکھنے اور بیان کرنے سے روک دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج میڈیا کی بیان کی جانے والی رپورٹوں میں جانب داری کی بو محسوس کی جاتی ہے اور یہ طرز عمل خود کرپشن کے دائرے میں آتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ:

معاملہ یہ ہے کہ کرپشن جو آج موضوع بحث بنا ہوا ہے وہ موجودہ چند سالوں میں پیدا ہونے والی برائی نہیں۔ یہ کوئی نئی اور انوکھی چیز بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کرپشن ہر دور میں کسی نہ کسی شکل یں موجود رہی ہے۔ دنیا کی کوئی تہذیب نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ اس لعنت سے مکمل طور پر پاک و محفوظ ہے یا رہی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ پہلے اس کا دائرہ محدود ہوا کرتا تھا اور یہ زہر اپنی مرضی سے لوگ پیا کرتے تھے لیکن آج ہر کس نا کس مجبور ہے کہ وہ اس

زہر کا پیالہ اپنے منھ سے لگائے۔ پھر جس میں اس زہر کو برداشت کرنے کی صلاحیت بڑھتی جائے وہ اسی قدر اس کا گرویدہ بن جاتا ہے۔
اگر آج ہم یہ عہد کرلیں کہ اس برائی کے خلاف آواز اٹھائیں گے، اپنے ذاتی معاملات میں اس برائی سے سب سے پہلے خود لڑیں گے، اپنے گھر، خاندان، معاشرے کو اس برائی سے پاک و صاف کریں گے تو کوئی طاقت نہیں جو آپ کو اس فیصلے سے روک سکے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ اس برائی سے سب سے پہلے اپنی ذات کو پاک و صاف کرلیں یا کم از کم پاک و صاف کرنے کا عہد کرلیں۔ اس کے لیے اسلام آخرت کا تصور پیش کرتا ہے۔ آخرت پر جس درجہ ہمارا ایمان محکم ہوگا اس عقیدہ کے ساتھ کہ مرنے کے بعد ایک اور زندگی ملنی ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہوگی، جہاں ذرہ برابر نیکی اور بدی کھول کر رکھ دی جائے گی، جہاں ناانصافی نہیں ہوگی بلکہ عدل قائم ہوگا، اور اُسی عدل کا تقاضہ ہوگا کہ ہم جنت میں جائیں یا دوزخ میں۔ اگر یہ عقیدہ مضبوط ہو جائے۔ یہ یقین، یقین کامل میں تبدیل ہو جائے، تو پھر ہم نیکی و بدی کو خوب اچھی طرح پہچان سکیں گے، نیکو کاری اور پارسائی کے اوصاف سے ہم متصف ہوں گے۔ ہمارا ذہن پاکیزہ ہوگا اور ہمارا جسم آلائشوں سے پاک ہوکر حرص و ہوس اور ترغیبات کے جال میں پھنسنے سے بچ جائے گا۔ اس کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ خصوصاً مسلمان اور عموماً تمام انسان جنھوں نے مال وزر کے حصول اور دنیاوی آسائشوں کو ہی حاصل زندگی سمجھ لیا ان

میں دنیا کی محبت کم ہو اور مرنے کے بعد جواب دہی کا احساس زیادہ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری فکر اور ہمارا طرز عمل مادیت پرستی، بے حیائی اور اخلاقی بگاڑ کی اس عمومی فضا سے پاک ہو جس میں یہ برائی پروان چڑھتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ برائی جب ہی ختم ہو سکتی ہے جبکہ اس برائی کو برائی تسلیم کیا جائے اور اس برائی کے خلاف بڑے پیمانہ پر آواز اٹھائی جائے۔ اُس نظام باطل سے نجات حاصل کی جائے جو نظام اس برائی کو پروان چڑھانے میں معاون و مددگار ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نہ خود باطل نظریات سے مرعوب ہوں اور نہ ہی اہل وطن کو مرعوب ہونے دیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خود بھی اسلامی تعلیمات و اقدار سے مکمل طور پر واقف ہوں اور ساتھ ہی اہل وطن کو بھی واقف کرائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سر سے پیر تک خود کرپشن میں غرق کسی حکومت سے کرپشن کے خاتمہ اور اصلاح احوال کی توقع عبث ہے۔ لہٰذا دوسروں کے جھنڈے اپنے ہاتھوں میں اٹھانے کے سابقہ رویہ میں تبدیلی آنی چاہیے۔ آج جن کے کاندھے سے کاندھا ملا کر آپ کرپشن کے خلاف بگل بجا رہے ہیں بہت ممکن تھا کہ اگر آپ برائی کو اس کی موجودہ صورت میں بیان کرتے تو وہ آپ کے شانہ بشانہ ہوتے اور آپ اس مہم کو لیڈ کرتے۔ ایسا نہیں ہے کہ وقت گزر گیا اور دوبارہ نہیں آئے گا، ایسا بھی نہیں ہے کہ افسوس کریں اور خاموش بیٹھ جائیں۔ بہت سارے ایشوز زندہ ہیں جو عام انسانوں کے لیے تکلیف کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ آپ متحد ہو

جایئے! لوگوں کی خدمت کرنے کا عزم کرلیجیے! آپ دیکھیں گے کہ دنیا آپ کے نظریہ
اور آپ کے طریقہ کو اختیار کرے گی۔ شرط وہی پرانی ہے جو کہیں وہ کریں اور دنیا کو
امتحانِ آزمائش سمجھیں، جہاں ٹھہرنا نہیں بلکہ امتحان دے کر کوچ کر جانا ہے اور رزلٹ
آپ کا منتظر ہے!!

تیسرا پانسا

کھیل کا دستور ہے کہ جب تک ایک شخص اپنی چال نہ چل لے تب تک دوسرا انتظار کرے۔ شطرنج کے کھلاڑی ہوں اور وہ پیادوں کو صحیح جگہ اور صحیح موقع پر فٹ نہ کر سکیں تو سمجھئے وہ کھیل سے واقفیت نہیں رکھتے۔ شطرنج میں پیادے بھی ہوتے ہیں اور اؤنٹ، گھوڑے، ہاتھی، رانی اور بادشاہ بھی اور ہر چیز کی اپنی مخصوص اہمیت ہوتی ہے۔ پیادے پہلے مرحلے میں آگے بڑھائے جاتے ہیں تو کبھی گھوڑے کی ڈھائی چال سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پیادہ ہی عام طور پر سب سے آسان چارہ ہوتا ہے اور جلد ہی مات کھا جاتا ہے۔ سیاست بھی شطرنج کی بساط سے کچھ کم نہیں۔ سیاست میں بھی بادشاہ ہوتے ہیں جو مرتے نہیں یہاں تک کہ وہ چہار جانب سے نہ گھر جائیں اور ان کے آگے یا پیچھے ہونے کی جگہ ہی نہ بچے ، بس یہی شہ مات ہوتی ہے یعنی CHECKMATE ! ملک عزیز ہند میں بھی آج کل شطرنج کے کھلاڑی بڑی جی جان اور یکسوئی کے ساتھ سیاست کی بساط پر مصروفِ عمل ہیں۔ اور ہوں بھی کیوں نہیں ! یہی تو رائٹ ٹائم ہے۔ پھر صحیح وقت پر صحیح قدم نہ اٹھایا جائے تو کھلاڑی اچھے نہیں کہلاتے ۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس بساط پر ایک طرف "رانی" ہے تو دوسری طرف "بوڑھا شیر"۔ رانی کے پیادے، اؤنٹ، گائے ، بکری، گدھے، گھوڑے، ہاتھی سبھی ریوڑ میں ہانکے جا چکے ہیں اور بوڑھے شیر کے ساتھ چلنے والے بھی اس کے شانہ

بشانہ بظاہر تو چل ہی رہے ہیں ۔اب یہ الگ بات ہے کہ اس ریوڑ میں آگے کون چلے اور کون کس کو ہانکے اس پر ابھی کوئی آخری رائے قائم نہیں ہو سکی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ انتشار ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔

: تین مہرے

ملک عزیز کا قومی کھیل ہاکی ہے لیکن کیونکہ کہ ملک سے محبت رکھنے والے عام طور پر ملک کے قومی مفاد کی بجائے یہ دیکھتے آئے ہیں کہ کہاں پیسہ زیادہ ہے؟ کہاں شہرت زیادہ ہے؟ کہاں کرپشن زیادہ ہے، بس جہاں اور جس چیز میں یہ تینوں چیزیں مل جائیں اسی کو اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح وہ شہرت بھی کماتے ہیں، پیسہ بھی اور کرپشن کے جو بے پناہ فائدے ہیں ان سے بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ملک کا قومی کھیل ہاکی کھیلنے کی بجائے کرکٹ کو اہمیت دی جاتی ہے اور تقریباً ملک کے ہر گھر میں ایک نہ ایک کرکٹر ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ فل الوقت جو کھیل جاری ہے اور جس کو ہماری ذمہ دار خصوصاً الیکٹرانک میڈیا پوری تندہی کے ساتھ بنا کوئی لمحہ گنوائے لوگوں کو "حقیقت پر مبنی اطلاعات "فراہم کر رہی ہے اور اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندی اور انگلش جاننے والے تمام لوگ اس کھیل سے خوب محظوظ ہو رہے ہیں جس کا نام "کرپشن" ہے۔ اور اِسی کرپشن کے عنوان سے "کرپشن کرپشن" کھیل کھیلا جا رہا ہے۔اب چونکہ یہ کھیل شطرنج کی بساط پر کھیلا جا

رہا ہے لہذا پیادوں کو آگے تو آنا ہی پڑے گا، ارے یہ کیا کہہ گیا! آگے آنا نہیں بلکہ لانا ہی پڑے گا۔ ابھی تک دو پیادے سامنے آچکے ہیں اور تیسرے نے اپنی کمر کس لی ہے۔ یہ کہتے ہوئے تو اچھا نہیں لگ رہا کہ ملک عزیز ہند میں کرپشن جو ایک اہم مدا ہے اور جس کے خاتمے کے لیے پہلے بابا رام دیو اور پھر ٹیم انا سرگرم عمل ہے ان کو پیادوں سے تشبیہ دی جائے لیکن بات کھیل کی ہو رہی ہے، شطرنج کی ہو رہی ہے، لہٰذا شطرنج کی بساط پر پیادے تو ہونے ہی چاہئیں۔ کانگریس کے جنرل سکریٹری دگ وجے سنگھ کہہ رہے تھے کہ رام دیو اور انا ہزارے بی جے پی اور آر ایس ایس کے پلان A اور میں سری سری روی شنکر ہوں گے جو اترپردیش میں کرپشن کے C تھے اور اب پلان B خاتمہ کے لیے پلان کے تحت کام کریں گے۔ ان کی یہ کہی ہوئی بات آج سچ ثابت ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود انا اور گڈکری چاہتے ہیں کہ وہ اپنا علاج پاگل خانے میں کروائیں۔

ہم کیا چاہتے ہیں؟

سوال یہ ہے کہ اس ملک میں کرپشن کہاں، کس صورت میں اور کن لوگوں کے درمیان پنپ رہا ہے؟ کیا کرپشن کا خاتمہ یہی ہے کہ کالی دولت سوئیز بنکوں سے نکل کر ہندوستان میں چلی آئی جائے۔ کیا کرپشن کے رکھوالے لوک آیت اور لوک پال کے ذریعہ کرپشن پر روک لگوانے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ کیا کرپشن یہ نہیں ہے کہ میڈیا جو ایک ذمہ دار ادارہ ہے وہ بغیر ثبوت کے صرف ایک میل آنے پر ان

لوگوں کو بدنام کردے جو اس بدنامی کا حصہ نہیں ؟پھر ان لوگوں کا کیا کہیے جو ملک کے امن و امان اور سالمیت کو طاق پر رکھ کر اپنے گھنونے کارنامے انجام دیتے ہیں لیکن پھر بھی ان پر گرفت کسی نہیں جاتی۔ملک میں غربت و افلاس کی انتہا یہ ہے کہ کسان جو آپ کے کھانے کی چیزیں کاشت کرتے ہیں اور آپ کے آرام و سکون کا ذریعہ بنتے ہیں وہ بے چارے بڑے پیانے پر خودکشی کریں اور شور و غوغا مچانے والوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگے ؟کیا آپ کو حوالہ اسکینڈل یاد ہے؟کارگل تابوت اسکینڈل؟پرمود مہاجن ، بنگارو لکشمن، دلیپ جودیو اور ایدوایرپا کی کارستانیاں ؟1980کا بوفورس اسکینڈل،اسٹیمپ پیپر اسکینڈل اور معلوم نہیں کون کون سے۔سوال یہ نہیں ہے کہ آج کا موجودہ کرپشن کیسے ختم ہو۔اصل سوال یہ ہے کہ کیا اس نظام میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ کرپشن کو ختم کرسکے ؟موجودہ معاشرہ اور اسی میں سے اٹھنے والے ہمارے سیاسی لیڈران ، کیا ان کے اندر برائی کو برائی کہنے کی ہمت ہے ؟اگر ہے تو اُس موقع پر ریلی اور رتھ یاترا کیوں نہیں نکالتے جبکہ معصوم لوگوں پر ظلم و بربریت کا ننگا ناچ کھیلا جاتا ہے، ایک خاص طبقے کے لوگوں کے ساتھ دہرا معیار اپنایا جاتا ہے، غریب خاندانوں کے معصوم جیالوں کی زندگیوں کو تباہ و برباد کیا جاتا ہے۔بلکہ یہ لوگ اس کے برخلاف کام کرتے ہیں،لوگوں کو اکساتے اور ورغلاتے ہیں، مسجد کہ جس کا فیصلہ کورٹ کرے گی اس کو کھلے طور پر چیلینج کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ " سومناتھ مندر کی طرز پر رام مندر کی تعمیر کے لیے ایک قانون لایا جائے

گا۔۔۔پارٹی یہ کام باہمی رضامندی سے چاہتی ہے لیکن اگر یہ ایسے یا عدالت کے حکم سے نہ ہوا تو تازہ قانون لایا جاسکتا ہے"۔یہ سب کیا ہے؟یہ باتیں کس زمرے میں آتی ہیں؟کیوں ان لوگوں پر جو ملک کی سالمیت اور امن کو برہم کرنے پر تلے ہیں گرفتار نہیں کیا جاتا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ آوازیں ہیں، وہ لوگ ہیں، جن کو ایک خاص گروہ بہت عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا ہے؟لیکن سوال یہ بھی ہے کہ کیا آپ بھی ان لوگوں کی عقیدت میں ڈوبے ہوئے ہیں؟آپ کیا چاہتے ہیں؟"ہم "کیا چاہتے ہیں؟یہ ہم "مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ عقیدے کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔عقیدہ ان لوگوں کا جو" !چاہتے ہیں کہ غلط کا کبھی ساتھ نہ دیا جائے

:تیسرا پانسا

پانسے کچھ بھی پھینکے جائیں ںاور پیادے کہیں بھی اپنی چالیں چلیں لیکن کھیل تو کھیل ہی ہے۔اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے کہ کھیل میں جیت یا ہار حقیقی جیت یا ہار نہیں ہوا کرتی۔جب لوگ کسی مہم کے حق میں یا اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک انسانوں کا ایک گروہ بھی ہو تو ایسا نہیں کہ ہر شخص غلط ہی ہو یا ہر شخص صحیح۔لیکن وقت یہ ثابت کردیتا ہے کہ غلط لوگوں کا ساتھ دینے والے کون تھے اور صحیح لوگوں کے حواری کون تھے۔سری سری روی شنکر بھی اب اس میدان میں اترنے کے لیے تیار ہو چکے ہیں

لیکن ان کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ رام دیو اور انا سے زیادہ لوگ ان کے عقیدت مند ہیں اور رہے ہیں۔ اس میدان میں جن لوگوں کے ساتھ وہ اترے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اِس سے ان کی ساکھ خراب ہو جائے اور عقیدت مندوں کے عقیدے میں کمزوری نمایاں ہونے لگے۔ کیونکہ کیچڑ کے اوپر تو سب نے کنول کھلتے دیکھے ہیں لیکن کیچڑ کی بدبو برداشت کرنا سب کے بس کی بات نہیں!

"اور ہم نے انھیں ندا دی کہ اے ابراہیمؑ ! تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم وفادار بندوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی" (الصافات: 104-106)۔ قربانی مختلف اوقات میں مختلف طرح سے دی جاسکتی ہے اور آزمائش بھی مختلف وقتوں میں الگ الگ انداز سے لی جاسکتی ہے۔ لیکن کامیابی ان ہی لوگوں کی مقدر بنتی ہے جو ہر حالت میں قربانی دینے والے اور ہر آزمائش میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ پھر یہ کامیابی بس یہیں نہیں رک جاتی بلکہ اس کے اثرات آنے والی صالح نسلوں تک برقرار رہتے ہیں۔ یہ اللہ کا قانون ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہر چھوٹی اور بڑی آزمائش میں پورے اترنے والوں کا صلہ۔

قربانی وقت کی اہم ترین ضرورت :

امت مسلمہ آج جس دور سے گزر رہی ہے اِس دور میں ہر محاذ پر قربانی ادا کرنے والے مومنین کی ضرورت ہے۔ یہ قربانی کس طرح سے ادا کی جاسکتی ہے اور اللہ کی نصرت کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے اس کا مختصر تذکرہ کیا جارہا ہے۔ ممکن ہے ایک فرد کو ہر جہت پر قربانی ادا کرنے کی ضرورت ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک فرد چند حیثیتوں سے قربانی ادا کر رہا ہو اور اس کے علاوہ دیگر

محاذ پر دینے کی ضرورت ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کہاں اور کس حد تک قربانی دے رہے
دنیا میں (i : ہیں اور مزید کی کہاں ضرورت ہے۔ یہ محاذ اس طرح بیان کیے جا سکتے ہیں
موجود عقائد و نظریات کو اسلامی تناظر میں سمجھنے اور ان سے نتیجہ اخذ کرنے کے لیے
جس تگ و دو اور انتھک جدوجہد کی ضرورت ہے اس کے لیے اپنے وقت کی قربانی دینا۔
اس سے قبل اس چیز کی قربانی کہ ہمیں اسلام کا جامع علم حاصل ہو جائے ،اس کے (ii
لیے ہمیں اپنے شب و روز کے وقت میں سے ایک مخصوص وقت متعین کرنا اور ایک
معاشرہ میں موجود (iii طویل منصوبہ بندی کے تحت اس میں بتدریج آگے بڑھتے جانا۔
رسم و رواج کو بس اس ہی حد تک اختیار کرنا کہ جو اسلامی معاشرہ کے قیام و استحکام میں
مددگار ہوں اور ان تمام رسوم سے پرہیز کرنا جو اسلامی معاشرہ میں رکاوٹ پیدا کرنے
والے ہوں۔ اس سلسلے میں کسی بھی طرح کے سمجھوتے اور لچک سے پرہیز کرنا اور اس
پر قائم رہنا۔ یہ استحکام اس ہی وقت ممکن ہے جبکہ ہم اسلامی معاشرہ سے واقفیت رکھتے
اسلام ایک مکمل نظامِ حیات رکھتا ہے اور وہ زندگی کے ہر چھوٹے اور بڑے (iv ہوں۔
معاملہ میں رہنمائی دیتا ہے۔اس عقیدہ پر نہ صرف یقین رکھنا بلکہ جس مرحلے میں جب
(v بھی معاملہ پیش آئے اس وقت اسلامی احکامات کو جاننا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا۔
اسلامی عبادات کو اختیار کرنا اور ان کو اپنی ذات ،اپنے گھر، اپنے محلّہ اور جہاں تک
ممکن ہو قائم کرنے کے لیے سعی و جہد کرنا۔ یہ پانچ باتیں ہیں جن پر عمل کے لیے
قربانی کی ضرورت ہے۔قربانی اس

بات کا نام نہیں کہ بس جانور کو خرید کر ذبح کر دیا جائے بلکہ قربانی اس بات کا نام ہے کہ ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے قربانی کی روح اختیار کی جائے۔ توقع ہے اللہ تعالی ہماری قربانیوں کو قبول کرے گا اور ہمیں اپنے وفادار بندوں میں شامل کرے گا۔

قربانی ایک بتدریج عمل:

ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا مطالع کیا جائے تو یہ بات نظر آتی ہے کہ جس عظیم قربانی کو انھوں نے ادا کرکے آئندہ آنے والی تمام نسلوں کے لیے ایک یادگار بنا دیا۔ پھر جس قربانی کو اللہ ربِ رحیم نے امت مسلمہ کے لیے ایک فرضِ عبادت کی شکل میں طے کر دیا۔ یہ قربانی کا پہلا اور آخری مرحلہ نہیں تھا۔ اللہ کے نبی حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا مطالع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی سراپا قربانی تھی۔ آپ نے اپنے گھر، اپنے خاندان، اپنے ملک، اپنے معاشرہ اور اس کے رسم و رواج، اپنے عقیدہ اور وقت کے نظریات تمام ہی چیزوں کی قربانی دی۔ پھر آپؑ نے آتش نمرود میں کود کر اس بات کی وضاحت کر دی کہ دنیا میں اگر زندہ رہنا ہے تو اُس رب العالمین کے احکام پر عمل پیروی کرتے ہوئے رہنا ہے جس نے زندگی عطا کی ہے۔ اور جب آپؑ نے یہ اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ زندگی اللہ ربِ رحیم کی مرضی کے مطابق ہی گزرے گی تو پھر ربِ اعلیٰ نے مزید امتحان لے ڈالا اور کہا کہ اپنے بیوی اور بچوں کو

اس آب وگیاہ وادی میں چھوڑ آؤ جہاں اللہ کی رحمت کے سوا بظاہر کوئی آسرا نہیں۔ یہ امتحان پورا ہی کیا تھا کہ بڑھاپے کا سہارا، مومن بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کر دینے کی آزمائش سامنے لاڈالی گئی اور آپؑ اس میں بھی ثابت قدم ٹھہرے۔ معلوم ہوا کہ بڑی قربانیاں چھوٹی قربانیوں کے ادا کرنے کے بعد دی جاتی ہیں اور جس قدر بڑی قربانی ہیں جو بھی ڈالا گیا اس ہی قدر اس کی منزلت بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ اپنے رب اعلیٰ سے جا ملا اور بشارت حقیقت میں تبدیل ہو گئی۔ غور فرمایئے ہم نے اب تک کس درجے کی قربانی ادا کی ہے اور قربانی کے کن مراحل سے گزرے ہیں۔ یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے کتنے قریب ہیں۔ کیونکہ آزمائش اور قربانی ان ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو اس کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں!

قبولیت قربانی :

قرآن حکیم کہتا ہے "اور انھیں آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ ٹھیک سنا دو۔ جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی قبول نہ کی گئی۔ اس نے کہا: میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اس نے جواب دیا: اللہ تو متقیوں ہی کی قربانی قبول کرتا ہے" (المائدہ: 28)۔ یہ ہے وہ معیار جس پر پورے اترنے والوں کی قربانی قبول کی جائے گی۔ جس میں ایک بات یہ کہ وہ متقی ہوں اور دوسری یہ کہ وہ قربانی دینے میں مخلص ہوں، اور یہ اخلاص ہر نہج پر

ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہم اللہ کے لیے مخلص ہوں، اپنے نبی کے لیے مخلص ہوں، اپنے دین کے لیے مخلص ہوں، اپنی امت کے لیے مخلص ہوں اور ان سب سے پہلے اپنی ذات کے لیے مخلص ہوں۔ ذات کے لیے مخلص، یعنی ہم اس بات پر یقین رکھنے والے ہوں کہ ہماری ذات کے ذریعہ انجام دیا جانے والا ہر عمل اللہ کی خوشنودی کے لیے ہی انجام دیا جائے گا اور ہر کام سے رکنا اس بنا پر ہوگا کہ اللہ ہم کو رکنے کا حکم دیتا ہے۔اس تصورکے ساتھ انجام دی جانے والی ہر قربانی انشااللہ قبول ہوگی اور وہ ہمیں دنیا و آخرت میں مقبولیت کی منزلیں طے کروائے گی۔کہا کہ "اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں" (البقرہ:269)۔مزید کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو: "عرض کرتے ہیں کہ ہم نے (تیرا حکم) سنا اور قبول کیا۔اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے" (البقرہ:285)۔پہلی خوبی: وہ عقل رکھتے ہیں، نہ صرف عقل رکھتے ہیں بلکہ عقل کا استعمال ان ہدایات کی روشنی میں کرتے ہیں جو ان کے رب کی طرف سے نازل ہوئیں ہیں۔ دوسری خوبی: جب ان کے پاس نصیحت آجاتی ہے تو وہ اس کو قبول کرنے سے گریز نہیں کرتے،تذبذب میں مبتلا نہیں ہوتے،کاہلی اور تساہلی سے بچتے ہیں،یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی قربانیاں قبول کی جاتی ہیں۔اور تیسری خوبی یہ کہ ان لوگوں کو یقینِ کامل ہے کہ آخر کار اس زندگی کا اختتام ہونا ہے، آخرت کا دن آنا ہے، جزا اور سزا ملنی ہے، اور یہی وجہ ہے جس کے سبب وہ اللہ رب العالمین سے

بخششیں طلب کرتے ہیں۔ پھر کہا کہ "اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے۔ اور ابراہیمؑ کے دین کا پیرو ہے جو یکسو مسلمان) تھے اور خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنایا تھا" (المائدہ: 125)۔ یہ وہ کسوٹی) ہے جس پر ہر فرد اپنی ذات اور اپنی عبادات کا مکمل جائزہ لے سکتا ہے۔ اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر پرکھ کر یہ بات بھی معلوم کی جا سکتی ہے کہ آیا ہماری عبادات قبول ہونے کے لائق ہیں یا نہیں! کہا کہ "زمین و آسمان کی ہر چیز کا اسے علم ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، سب اس کو معلوم ہے، اور وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے" (البقرہ: 33)۔

: قربانی کا حکم تمام امتوں کے لیے

ربِ حکیم فرماتا ہے: "ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تاکہ اس امت کے) لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ (ان) مختلف طریقوں کے اندر مقصد ایک ہی ہے) پس تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے اور اسی کے تم مطیع فرمان بنو" (الحج: 34)۔ معلوم ہوا کہ جس طرح نماز اور روزہ دوسری امتوں میں پر فرض رہے ہیں اسی طرح قربانی بھی امت مسلمہ سے قبل کی امتوں پر فرض کی جاتی رہی ہے۔ پس ہم وہی عبادات انجام دے رہے ہیں جو ابراہیمؑ، اسحاقؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ انجام دیتے آئے ہیں۔ پھر یہ جانور جو

اللہ رب العزت نے نوازے ہیں اور جن کے ذریعہ کھانے اور پینے کی چیزیں میسر آئی ہیں اور جو مال و دولت کو بڑھانے کا ذریعہ ہیں، کیونکہ یہ سب اللہ ربِ رحیم کی عنایت کردہ ہیں اس لیے لازم ہے کہ اس مال و دولت کو اللہ کی نظر چڑھایا جائے۔اب اگر مال و دولت کسی اور شکل میں ہو تو بھی اس قربانی کو ادا کرنے کے لیے جانور کی قربانی کی جائے اور اُس یاد کو ہر لمحہ تازہ دم رکھا جائے کہ یہ عنایات اللہ کی عطا کردہ ہیں۔ لہٰذا ان کا استعمال بھی اللہ کی رضا اور اس کی مرضی کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔

ایمانی غذا کی فراہمی :

جس طرح ایک انسان کی رواں دواں زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اس کو بھرپور غذا ملتی رہے ٹھیک اس ہی طرح ایک مسلمان کے دین، اس کی فکر، اس کی نظراور اس کے اعمال کو صحیح رخ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ایمانی غذاؤں کا استعمال کرتا رہے جو اس کو وقتاً فوقتاً تقویت پہنچانے والی ہیں۔ یہ ایمانی غذا اُس صورت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے جبکہ وہ اس کا شعوری طور پر اہتمام کرے۔اس کے لیے جہاں دن میں پانچ مرتبہ اللہ رب العزت کے سامنے حاضری ایک ذریعہ ہے تو وہیں اللہ کا ذکر اور اُس کی عبادات کو ہر لمحہ بجالانا بھی معاون و مددثابت ہوتے ہیں۔ یہ اہتمام بندہ مومن خوشی اور غم کے ہر موقع پر کرتا ہے۔ یہی وہ عظیم مقصد ہے جس کی جانب یہ عید الضحیٰ کا واقع بھی

رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ ایک جانب مسلمان اللہ ربِ اعلیٰ کی کبریائی بیان کرتے ہیں، اس سے تعلق برقرار رکھنے اور اس کے بتائے طریقہ پر عمل کرنے کا اظہار کرتے ہیں تو وہیں دوسری جانب اُن لوگوں کے ساتھ مل کر عید کی خوشیوں کو تقسیم کرتے ہیں جو عام دنوں میں اس قدر سیر ہو کر کھا نہیں پاتے جیسا کہ اس موقع پر صحت بخش غذا حاصل کرتے ہیں۔ یہ وہ موقع ہے جب کہ خوں بہانے اور خوشی منانے کے ساتھ ساتھ ایک عزم مستحکم کا عہد کیا جاتا ہے۔ قربانی کے اعلیٰ ترین نمونہ کو یاد کیا جاتا ہے اور اپنی جان اور مال اور صلاحیتوں کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ یہ عہد صرف زبانی حد تک ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات انسان کے ظاہر و باطن دونوں پر پڑتے ہیں۔ اس طرح اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف مسلمانوں کو قوت حاصل ہوتی ہے جو ان کے اندر خدا پرستی کی توانائیاں تازہ بہ تازہ داخل کرتی رہتی ہیں تاکہ وہ برابر چست رہیں، فعال رہیں اور ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے صراط مستقیم پر قائم ہو جائیں۔ کائنات اور اس کی ہر شے مستقل حرکت پذیر ہے اُس میں ٹھہراؤ نہیں اگر اس میں ٹھہراؤ آ جائے تو یہ دنیا تباہ ہو سکتی ہے ٹھیک اسی طرح بندہ مومن ہر آن اپنے ایمان کو تازہ دم رکھنے میں متحرک رہتا ہے۔ یہی نشانی ہے اس بات کی کہ اس کی فکر اور اس کا عمل منجمد نہیں، اگر ایسا ہوا تو یہ اس کی ہلاکت اور بربادی کا نتیجہ ہو گی۔ بندہ مومن اللہ کے رسول کی زندگی سے استفادہ کرتا ہے کیونکہ آپ کی زندگی تحریکیت کی غماز ہے۔ آپ کے سامنے سیاسی

حالات نے آنکھیں دکھائیں، وطنی مفاد آڑے آئے، وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مصلحتوں نے دامن پکڑا، مشکلات نے راستہ روکا، ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا۔ لیکن آپ نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہ آنے دی۔ بس یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارا عقیدہ جب تمام عقائد پر اثر انداز ہوتا ہے تو مسلمان کی راہ ہموار ہوتی ہے اور رکاوٹیں دور ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ مومنین کو اللہ تعالی نے صاف طور پر متنبہ کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ: "اور جو کافر ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی خوشنما بنا دی گئی ہے اور وہ مومنین سے تمسخر کرتے ہیں۔ لیکن جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر غالب ہوں گے اور خدا جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے" (البقرہ:212)

۔قربانیاں ہمارے ایمان کو تازہ رکھنے میں مددگار ہوتی ہیں، آیئے عہد کریئے اور اٹھ کھڑے ہویئے اس عزم کے ساتھ کہ ہم اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنی زندگی کے شب و روز میں قربانیاں دیں گے اور اللہ کے دین کو اللہ کی زمین پر قائم کرنے والوں میں شمار ہوں گے۔

کرپشن کے خلاف کرپٹ لوگوں کا مہاسنگرام

کرپشن اس وقت ہندوستانی میڈیا، سیاسی پارٹیوں اور خواندہ و ناخواندہ تمام ہی لوگوں کا دلچسپ موضوع بن چکا ہے۔ جلسے و پارٹیاں ہوں یا مذہبی و غیر مذہبی قسم کے پروگرام، آفسس ہوں یا گلی کوچوں کے ڈھابے، نائی کی دکان ہو یا قہواہ خانے۔ بس ایک ہی بات ہے ، کرپشن، کرپشن، کرپشن۔ کہیں لوگ کہتے ہیں کہ یہ ملک بہت کرپٹ ہو چکا ہے، اس کے سیاسی لوگ کرپشن کی دلدل میں دھنستے ہی جارہے ہیں۔ کہیں لوگ کہتے ہیں کہ کرپشن ایک برائی ہے اس لیے ہر سنجیدہ شخص کو اس آواز میں آواز ملا لینی چاہیے۔ تو کہیں لوگ کہتے ہیں کہ کرپشن کے خلاف آواز اٹھانے والے لوگ خود ہی کرپٹ ہیں، چال باز ہیں، عیار اور مکار ہیں، موقع پرست اور ایک خاص نظریہ کے حامل ہیں۔ یہ کرپشن کے خلاف مہاسنگرام چلانے والے افراد چاہتے ہیں کہ عوام اُن کو ہیرو بنالیں، ان کی سوچ کو اپنی سوچ بنالیں، اور جس مقصد کے تحت وہ یہ سب کر رہے ہیں اسی مقصد کو عوام بھی اپنا مقصد بنالیں۔ تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اور عوام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تو عوام تو آخرکار عوام ہی ہوا کرتی ہے !

پہلے بابا پھر انا:

مرد آہنگ بابا رام دیو نے کرپشن، کالا دھن اور ملک کی سیاست کو ٹھیک کرنے کا

عہد کیا تھا اور اس مقصد کے لیے انھوں نے پنڈال لگایا، پوسٹر چسپاں کیے، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے دل کھول کر ان کا چرچا بھی کیا لیکن بابا کو یہ سب راس نہ آیا۔ پہلے وہ اپنے ہی لگائے پنڈال سے غائب ہو گئے اور بعد میں نظر بھی آئے تو عورتوں کی چوڑیاں پہنے ہوئے تو نہیں لیکن عورتوں کے لباس میں وہ ضرور نظر آئے۔ اور کہا کہ جس رات انھوں نے ایسا کچھ کیا تھا وہ رات " تاریخ میں سیاہ رات قرار دی جائے گی" شاید اس لیے کہ بابا رام دیو نے عورت کا روپ دھار لیا تھا یا پھر وجہ کوئی اور تھی، یہ وہی زیادہ بہتر جانتے ہوں گے۔ انا جی تو پہلے ہی سے میدانِ کرپشن میں تھے یعنی کرپشن کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے لیکن ابھی ان کی مقبولیت اس درجہ نہیں پہنچی تھی جس کے وہ خواہاں تھے۔ اب انا جی نے بھی راج گھاٹ پر کرشن کے خلاف بنسی بجائی اور شیلا جی جھوم اٹھیں۔ بس پھر کیا تھا یہ جھومنا تھا کہ عوام کو بھی اس سُر پر جھومنے کی منصوبہ بندی کی جانے لگی اور اس کے لیے جو جگہ طے کی گئی وہی پرانی بابا کی جگہ، یعنی دہلی کا رام لیلا میدان۔ بارہ دن تک اپواس پر بیٹھے انا نے اور ایک خاص نظریہ سے تعلق رکھنے والے کیڈر نے ان کا خوب ساتھ دیا۔ کہا گیا کہ ڈاکٹر جو انا جی کی صحت کا خیال رکھیں گے وہ سرکاری نہیں ہوں گے۔ شاید اس لیے کہ کہیں گورمنٹ بابا رام دیو کی طرح انا جی کو بھی "مارنے کا پلان" نہ بنا رہی ہو یا اس لیے کہ کہیں اس اپواس کا راز نہ کھل جائے۔ 74 سالہ انا جیجو جسمانی لحاظ سے بھی کمزور محسوس ہوتے ہیں 12 دن کی

لگاتار بھوک ہڑتال کے باوجود اُن کا وزن صرف 7.5 کلو گرام کم ہوتا ہے وہیں بابا رام دیو جو یوگا کے گرو مانے جاتے ہیں اور جسمانی صحت کے لحاظ سے انا جی سے کافی بہتر نظر آتے ہیں چند ہی دنوں کی بھوک ہڑتال میں بے حال ہو جاتے ہیں۔ذہن جھنجوڑتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ کیا انا جی کا اپواس حقیقی اپواس تھا بھی یا نہیں؟

پھر ایک اور پنڈال سجا !

اب باری تھی "انسانیت کے مسیحا" نریندر مودی کے اپواس کی۔اور بقول کالم نگار 17 سے 19 ستمبر تک چلنے والا نریندر مودی کا فائیو اسٹار "اپواس" دنیا کے سامنے آیا جس پر تقریباً100 کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا۔یہ اس شخص کا "ڈرامہ" تھا جس نے آج تک ہندوستانی آئین، ہندوستانی اقدار، ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی جمہوریت کا مذاق ہی اڑایا تھا اب انہوں نے اس لفظ "اپواس "کا بھی مذاق اڑایا ہے جو جنگ آزادی کے دوران چوٹی کے مجاہدین آزادی کا خاصہ رہا تھا۔ ہر چیز کا مذاق اڑانے والے کے لیے صرف ایک ہی چیز رہ گئی تھی بھوک ہڑتال اور اپواس ، اس کی بھی انہوں نے جم کر تذلیل کی اور میڈیا نے اپنا "ذمہ دارانہ رویہ" اختیار کرتے ہوئے اُس اپواس کو بھرپور کوریج دیا۔ کوئی ٹی وی چینل ایسا نہیں تھا جس پر 24 گھنٹے کوریج نہ ہو۔ ہندوستانی عوام دیگر خبریں دیکھنے اور سننے کے لئے ترس گئے تھے۔ایک ٹی وی چینل مودی کی تعریف

میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ مودی نے یہ کر دیا، وہ کر دیا، ترقی کا دوسرا نام نریندر مودی ہے۔ گجرات دیگر ریاستوں کے لئے ہی نہیں مرکز کے لئے بھی ایک ماڈل ہے وغیرہ وغیرہ (http://article.urduhome.net/2011/09/28
۔اُس موقع پر پرشانت بھوشن کہہ رہے تھے : "گجرات کے وزیر اعلیٰ (/abid-12/
نریندر مودی کے" مشن یکجہتی " اپواس کو ان کے ذاتی عمل سے تعبیر کرنا چاہیے کیونکہ اگر اس سہ روزہ اپواس پروگرام کے اخراجات ریاستی حکومت نے برداشت کئے ہیں تو یہ
۔ بعد میں سری رام سینا (http://www.urdutahzeeb.net/c) " کرپشن ہے
کے اراکین ایک اور بیان سے ناراض ہو کر پرشانت بھوشن کے چیمبر میں گھس گئے اور ان کی جم کر پٹائی بھی کر بیٹھے۔

!یاترا بھی کی گئی

ہمارے ملک ہندوستان میں یاتراؤ ں کی خاص اہمیت ہے۔بہت ساری یاترائیں مذہبی جذبات کے پیش نظر کی جاتی ہیں اور عام ہندوستانی جن کے بارے میں آر ایس ایس ہندو"کا لفظ تعبیر کرتی ہے ،کے جذبات وابستہ ہوتے ہیں۔لفظ "یاترا"مذہب اور" مذہبی عقیدت مندوں کے لیے متبرک ہے اور اسی لیے زندگی کی اہم یاترا " تیرتھ یاترا" اپنے گناہوں کو دھلوانے کی غرض سے ہوا کرتی ہے جس سے ایک شخص کے وہ پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں جو اس نے اب تک انجام دیے ہیں۔شاید

اسی لیے بی جے پی کے قدآور لیڈر ایل کے اڈوانی نے بھی مختلف مواقع پر مختلف ناموں سے یاترائیں نکالی ہیں۔ اب معلوم نہیں اڈوانی کی یہ یاترائیں ان کے پاپ دھونے کا ذریعہ بنتی ہیں یا ان میں اضافہ کا؟ فی الوقت جو "جن چیتنا یاترا" نکلی ہے وہ جے پرکاش نارائن کے گاؤں سبت دیارا سے شروع کی گئی ہے اور ایک ساتھ کئی پیغام دینے کی کوشش کررہی ہے۔ اس یاترا کے ذریعہ اڈوانی جہاں سوشلسٹ بننے کی کوشش کررہے ہیں وہیں یہ پیغام بھی دینے کی کوشش کررہے تھمیں کہ ان کا اس بار کا موضوع رام جنم بھومی نہیں بلکہ بدعنوانی، کالا دھن اور مہنگائی ہے جس سے عام لوگ متاثر اور پریشان ہیں۔ یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ جے پرکاش نارائن نے ہی 1974 میں مکمل انقلاب کا نعرہ دیا تھا اور لوگوں کو متحد کیا تھا جس کے بعد اندرا گاندھی کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تھا اور وہیں سے جن سنگھ (آج کی بی جے پی) کے سنہرے دور کا آغاز ہوا تھا ورایل کے اڈوانی اُس حکومت میں اطلاعات و نشریات کے مرکزی وزیر بنے تھے۔ ان کی یوم پیدائش کے موقع پر مسٹر اڈوانی نے یہ یاترا ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت شروع کی ہے۔ جے پرکاش کی تحریک سے کسی کو کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن بی جے پی کو قومی سیاست میں اپنی موجودگی کا احساس کرانے کا بھرپور موقع دستیاب ہوگیا تھا۔ اس کے بعد سوائے 1984 کے بعد جس میں بی جے پی کو صرف دو سیٹوں پر اکتفا کرنا پڑا تھا، کبھی پیچھے مڑ نہیں دیکھا۔ 1989 میں وی پی سنگھ کی بدعنوانی تحریک کا فیض بھی سب سے زیادہ بی

جے پی کو ہی پہنچا تھا اور وہ 2 سیٹوں سے چھلانگ لگا کر 89 پر پہنچ گئی تھی اور بالآخر مرکز میں اقتدار کی کرسی پر چھ سال تک براجمان رہی۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ سماج واد کی کوکھ سے ہی بی جے پی اور فرقہ پرستوں طاقتوں کا فروغ ہوا ہے۔آج جبکہ ایک بار پھر مسٹر اڈوانی نے اپنی رتھ یاترا کا موضوع بدعنوانی، کالا دھن اور مہنگائی بنایا ہے،اس موقع پر ٹیم انا کے ممبر اروند کیجری وال نے آڈوانی کی رتھ یاترا کے حوالے سے کہا کہ ملک کو کرپشن سے نجات دلانے کے لئے ایک جن لوک پال قانون کی ضرورت ہے رتھ یاترا کی نہیں۔ لیکن لکھنے والے اور کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ ان موضوعات کے پس پردہ کوئی اور ہی مفاد وابستہ ہیں جو جلد ہی سامنے آ جائیں گے ۔اڈوانی کی اس رتھ یاترا سے بی جے پی کا اندرونی خلفشار بھی ابھر کر سامنے آگیا ہے اور یہ بات بھی سامنے آ گئی ہے کہ بی جے پی کے اندر وزیر اعظم کی دوڑ میں کسی ایک نام پر اتفاق رائے نہیں ہے یہی وجہ ہے اس یاترا میں عوام کے لیے وہ کشش نہیں جو ہونی چاہیے تھی اور عوام ہی کیا بی جے پی کے ورکرس بھی مختلف مقامات پر بہت مختصر نظر آئیں ہیں۔وہیں دوسری جانب ملک کے لاکھوں عوام جو ایک وقت کی روٹی کے لیے ترستے نظر آ رہے ہیں ان کے مسائل حل کرنے کی بجائے اپواس، انشن اور یاتراؤں پر کروڑوں روپیہ بیجا خرچ کرکے یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ان تمام سرگرمیوں کا مقصد صرف اور صرف حصولِ اقتدار ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں !

!میڈیا کہ جس کی ذمہ داری تھی

میڈیا کہ جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی دونوں عوام کے سامنے لا کر رکھ دے۔افسوس کہ وہ آج سرمایہ داروں، ملٹی نیشنل کمپنیز اور سیاست دانوں کے ہاتھ بک چکی ہے۔ایک جانب وہ کرپٹ لوگ ہیں جو کرپشن کے نام پر اپنی سیاست چمکانے میں مصروفِ عمل ہیں تو دوسری جانب سستے اور کم داموں پر بک جانے والے صحافی اور رپورٹرس کہ جن کے دام کہیں 1000 روپے کا ایک نوٹ ہے تو کہیں صرف 500 روپے۔مفاد پرستوں نے میڈیا کی تصویر مسخ کرکے رکھ دی ہے یہی وجہ ہے کہ دن رات اور ہفتہ کے ساتوں دن خصوصاً ہندی الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا ایک خاص نظریہ و مقصد سے وابستہ افراد کے کوریج میں مصروفِ عمل ہے۔نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستانی میڈیا میں فاسسٹ اور ہندوتو وادی منفی سوچ رکھنے والوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے یا دوسرے لفظوں میں سچائی کے علمبرداروں کو یہ لوگ خریدنے میں بہت تیزی کے ساتھ کامیاب ہوتے نظر آ رہے ہیں۔

:مہا سنگرام

کرپشن جو آج ہندوستان کو اندر سے کھوکھلا کیے جا رہا ہے ایک اہم مدا ہے لیکن اس مدے کو اٹھانے والوں کو اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا چاہیے۔بابا رام دیو اور ان کے ساتھی بال کرشن کا جالی پاسپورٹ، بابا کے

ٹرسٹ، کمپنیز اور تنظیموں کے حسابات میں انکیم ٹیکس کی خلاف ورزیاں۔انا ہزارے کے ہند سوراج ٹرسٹ کے تعلق سے سپریم کورٹ کا نوٹس۔ مودی کا انشن اور حکومت کا کروڑ روپیہ کا استعمال نیز مودی پر الزام لگانے والوں پر مودی کا عتاب۔اڈوانی کہ 100 جس کی ایک یاترا نے پورے ملک کا امن و امان تہس نہس کر دیا تھا۔اسی طرز پر نکلی ایک اور یاترا اور یاترا سے قبل مختلف مقامات پر مسلمانوں کے جان و مال کی کھیلی جانی والی ہولی۔اور سب سے بڑھ کر میڈیا کا مشتبہ کردار۔ یہ تمام واقعات اس جانب متوجہ کرتے ہیں کہ کرپشن کے خلاف آواز اٹھانے والے خود ہی کرپٹ ہیں۔پھر جب کہ برائی کو ختم کرنے والے خود اسی دلدل میں دھنسے ہوئے ہوں تو کیونکر وہ اپنے جسم اور آتما کو سب سے پہلے گنگا میں ڈبکی لگا کر پاک نہیں کرتے۔لیکن ہائے افسوس کہ گنگا تو خود ہی گرد آلود ہے!

اترپردیش کی تقسیم یا مایا کا ٹرمپ کارڈ؟

عام طور پر سیاست کی بساط پر وہی لوگ کامیاب کہلاتے ہیں جن یں مختلف خوبیوں کے ساتھ ساتھ وقت کی نزاکت کو سمجھنے، حالات کے تحت منصوبہ بندی کرنے اور فیصلہ لینے کی صلاحیت موجود ہو۔ ہندوستان کو 1947 میں آزادی ملی اور اسی وقت سے ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا گرچہ اس وقت ملک میں سب سے زیادہ استعمال کی جانے والی زبان اردو تھی لیکن اردو کو پس پشت ڈالتے ہوئے ہندی زبان کو فروغ ملا پھر نہ صرف ہندی اردو کے درمیان دوریاں بڑھائی گئیں بلکہ زبانوں کی بنیاد پر سیاسی کرسیاں تقسیم ہوئیں۔ جس وقت انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا ناجائز قبضہ کیا اس وقت بھی انھوں نے divide and rule کی پالیسی اپنائی تھی اور یہ بات آزادی سے پہلے کی تھی لیکن ہائے افسوس کہ آزادی کے بعد بھی ملک میں یہ پالیسی مختلف وقتوں میں استعمال کی جاتی رہی کیونکہ تقسیم کے بعد چھوٹی مچھلی نگلنا بہ نسبت بڑی مچھلی کے زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔

مایا کی یوپی:

اترپردیش کی وزیر اعلیٰ مایاوتی نے یوپی کو چار چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنے کی بات اس وقت کہی ہے جبکہ ایک دن پہلے راہل گاندھی نے بڑی محنت اور

بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یوپی میں آئندہ ہونے والے الیکشن مہم کا آغاز پھولپور کانسٹی ٹیونسی سے کر دیا ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کامیاب ہوئے تھے۔ پنڈت جی نہ صرف پہلے وزیر اعظم تھے بلکہ آئندہ ہونے والے کانگریس پارٹی کے وزیر اعظم کے نانا بھی ہوا کرتے تھے۔ مجمع کو خطاب کرتے ہوئے راہل گاندھی نے یوپی کے لوگوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی وہیں وہ خود بھی جوش میں آکر یوپی کے لوگوں کو یہ نصیحت کر بیٹھے کہ وہ دیگر ریاستوں میں بھکاریوں کی سی زندگی گزارنا چھوڑ دیں۔ لیکن اس خطاب کے مثبت نتائج نکلنے کی بجائے منفی تاثرات سامنے آئے اور میڈیا جو کسی کو اوپر اور نیچے چند ہی سیکنڈ میں کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اس نے راہل اور ان کی کوششوں کو نظرانداز کرتے ہوئے مایاوتی کے بیان کو اہمیت دی کہ " یوپی کو چار چھوٹی ریاستوں میں ہرت پردیش، اودھ پردیش، بندیل کھنڈ اور پوروانچل کی تجویز 21 نومبر سے شروع ہونے والے اسمبلی سرمائی اجلاس میں پاس کراکر مرکزی حکومت کو بھیج دی جائے گی"۔ اور اس بیان کو اہمیت بھی کیوں نہ دی جائے کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ راہل کا خطاب ایک مخصوص طبقے تک محدود ہو لیکن مایاوتی کا بیان نہ صرف یوپی کے عوام بلکہ ملک کی سیاست کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

حقیقت کیا ہے:

مایا وتی کے بیان کے پیچھے حقیقت کیا ہے؟ یہ دیکھنے اور غور کرنے کی بات ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ یوپی کیونکہ ملک کی سب سے بڑی ریاست ہے اس لیے یہاں فلاح و بہبود کے کام کرنا مشکل ہے۔ نظم و ضبط قائم رکھنا اور لوگوں کو ان کے حقوق دلانا، ریاست کی ترقی اور خوشحالی اور ایڈمنسٹریشن پر کنٹرول رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ بڑی ریاست ہونے کی وجہ سے بد نظمی دیکھنے میں آتی ہے۔اگر ریاست چھوٹی ہو تو یہ
دشواریاں جلد دور ہو جائیں گی اور یہ قدم انھوں نے یکساں ترقی کے لیے چھوٹی اکائیوں کے تعلق سے بابا صاحب امبیڈ کرکے فلسفے سے متاثر ہو کر کیا ہے۔بی جے پی اور سماج وادی پارٹی ان کے اس دعوے کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔دونوں کے مطابق یہ الیکشن سے قبل مایاوتی کی چال ہے۔ملائم سنگھ کے مطابق یہ سیاسی سازش اور انتخابی چال ہے جبکہ بی جے پی مغربی اترپردیش کو الگ ریاست بنائے جانے کی وجہ سے تشویش میں مبتلا ہے۔کانگریس نے اس معاملے میں محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔ایک جانب جہاں اتر پردیش کی صدر نے اسے گھبراہٹ میں اٹھایا گیا قدم قرار دیا وہیں مرکزی وزیر سلمان خورشید نے کہا کہ کانگریس ہمیشہ سے چھوٹی ریاستوں کے حق میں رہی ہے۔بقول مایا وتی 2011 مردم شماری کے مطابق یوپی کی کل آبادی 19 کروڑ 95 لاکھ سے زیادہ ہو گئی ہے۔مایا وتی کا کہنا ہے کہ آئین کی دفعہ تین کے مطابق نئی ریاستوں کی تشکیل اور ان کے علاقوں میں تبدیلی کا حق مرکزی حکومت کا ہے اس لیے کابینہ نے تجویز منظور کر دی ہے اور اب اسے قانون ساز کونسل سے منظور

کروانے کے بعد مرکزی حکومت کے پاس بھیج دی جائے گا۔

مایاوتی کے چھوٹی ریاست کے بیان سے قبل راہل گاندھی نے پھولپور سے اپنی انتخابی مہم کا باضابطہ آغاز کرتے ہوئے اترپردیش کی مایاوتی حکومت کو جم کر نشانہ بنایا تھا اور کہا تھا کہ اترپردیش کو فلاحی اسکیموں کے لیے مرکز سے جو پیسہ ملتا ہے وہ بدعنوانی کی نظر ہو جاتا ہے۔انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ گزشتہ چھ سالوں سے ریاست کا دورہ کر رہے ہیں لیکن انھیں مختلف علاقوں میں غریبی، مظلومی اور بے بسی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔مزید کہا کہ ریاست میں کسانوں سے زمین زبردستی چھینی جا رہی ہے اوراحتجاج کرنے پر لوگوں کو گولیوں کانشانہ بنایا جا رہا ہے۔مرکزی حکومت سے 60 کروڑ روپے کا پیکیج بھجوایا گیا لیکن وہ بدعنوانی کی نظر ہوگیا۔اس کے برخلاف مایاوتی کہتی ہیں کہ یہ وہی ریاست ہے جس نے ملک کو سب سے زیادہ وزیراعظم دیے لیکن اس کے باوجود اس کی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی۔انھوں نے کہا کہ ریاست کے سب سے پس ماندہ علاقے بندیل کھنڈ کی ترقی کے لیے ان کی حکومت نے 80ہزار کروڑ کے پیکیج کا مرکز سے مطالبہ کیا تھا لیکن مرکز نے اب تک کوئی مثبت اشارہ نہیں دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک جانب راہل گاندھی ملک کی اعلیٰ ترین سیٹ حاصل کرنے کی

مہم میں ہیں تو وہیں دوسری طرف ملک کو سب سے زیادہ وزیر اعظم دینے والی ریاست میں بہوجن سماج پارٹی، سماج وادی پارٹی، بھارتی جنتا پارٹی بھی کسی سے کم نہیں ۔یہی وجہ ہے کہ ایک جانب بی جے پی اور اس کی مادری تنظیم آر ایس ایس نے بابا رام دیو، انا ہزارے اور سری سری روی شنکر کو ملک سے کرپشن اور بد عنوانی کے خاتمہ کا مدا اٹھا کر الیکٹرانک میڈیا میں چھا جانے کی مہم تیز کی تو وہیں دوسری جانب کانگریس کے دگ وجے سنگھ اپنے پرانے ساتھیوں کے کارنامے بیان کرتے پھر رہے ہیں اور اُن واقعات کا بھی تذکرہ و قیاس کر رہے ہیں جن کے بارے میں ان کو گمان ہے کہ یہ دہشت گردی کے کام اور ملک میں بد امنی اُن ہی لوگوں نے پھیلائی ہے جن کی فکر سے کبھی وہ خود بھی وابستہ رہے ہیں۔

:مایا کا ٹرمپ کارڈ

ایسے موقع پر جب کہ ایک جانب یادو ووٹ تقسیم ہوا چاہتا ہے اور ایس پی کا سب سے بڑا ووٹ بنک مسلمان بھی اب ملائم سنگھ یادو کے وعدوں پر توجہ نہیں دے رہے کیونکہ ملائم سنگھ نے کلیان سنگھ جو بابری مسجد شہید کرنے میں پیش پیش رہے ان کو ایس پی میں شامل کرکے اور پھر نکال کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی موقع کی تلاش اور کرسی کی دوڑ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔کل کے ملائم جو بی جے پی اور اس کے لیڈروں پر آوازیں کستے تھے آج وہ ان کے قدم چومنے کے

لیے تیار ہیں، یہ الگ پریشانی کی بات ہے کہ بی جے پی سے زیادہ قربت پیدا کرنے کے نتیجہ میں ان کو اپنا وجود خود ہی خطرے میں نظر آتا ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ وہ بی جے پی سے دوری بنائے رکھنے میں ہی اپنی آفیت سمجھتے ہیں۔پھر دوسری جانب ان کی بہت ہی قریبی دوست رہے ٹھاکر امر سنگھ بھی ان کی کاٹ میں مصروف ہیں اور اس کے لیے وہ اپنی سیاسی پارٹی راشٹریہ لوک منچ کا اسٹیج سجانے کی تیار کری چکے ہیں۔لہذا ملائم کی ایس پی مایا وتی کے لیے ایک بار پھر ملائم ثابت ہو سکتی ہے۔

یوپی میں آئندہ سال اسمبلی انتخابات کا بگل تو بجایا ہی جا چکا ہے لیکن تمام ہی پارٹیاں بری طرح سے بوکھلائی نظر آرہی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک بار پھر بی جے پی نے اپنے پرانے مدے "رام مندر" کی تعمیر کی بات کہنی شروع کردی ہے۔ لیکن فی الوقت مایا وتی کے یوپی تقسیم کے پلان نے سب کے نیندیں حرام کر دی ہیں۔جہاں ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ چھوٹی ریاست.بڑی ریاست کے بالمقابل زیادہ بہتر نظم و نسق قائم رکھ سکتی ہے وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ چھوٹی ریاست کے نتیجہ میں یوپی کے بہت سے پرانے مدے بھی تقسیم ہو جائیں گے۔اور ان تمام مدوں میں سب سے.بڑا مدا شہید بابری مسجد کا مدا ہوگا جس کی بنیاد پر ابھی تک ملک میں اور خصوصاً یوپی میں بی جے پی اپنی ایک الگ شناخت بناتی آئی ہے۔پھر وہ لوگ بھی جو ایک طویل عرصہ سے چھوٹی ریاست کے حق میں اپنی

آوازیں اٹھا رہے تھے اور چاہتے تھے کہ یوپی تقسیم ہو کر ہرت پردیش اور دیگر ناموں سے ان کے قبضہ اختیار میں آجائے ان کے خوابوں پر بھی پانی پھر سکتا ہے۔ لیکن سیاست اتنی آسان بھی نہیں کیونکہ یہ وہ موقع ہے جب کہ سی بی آئی نے سپریم کورٹ کو بتایا کہ ان کے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں کہ اترپردیش کی وزیراعلیٰ مایاوتی اور ان کے رشتہ داروں کے پاس غیر قانونی دولت ہے۔ مایاوتی کے خلاف کرپشن کیس کے سلسلے میں ایک حلف نامہ داخل کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ان کے پاس گواہوں کے بیانات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مایاوتی نے عوام سے زبردستی تحائف حاصل کئے ہیں۔ سی بی آئی نے دعویٰ کیا ہے کہ معاملہ بڑا سنگین ہے لہٰذا وزیراعلیٰ اور ان کے رشتہ داروں کو گرفتار کیا جائے۔ سی بی آئی نے مزید کہا کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ ان کے پاس اپنے جائز وسائل سے زائد اثاثہ جات ہیں۔ سی بی آئی کے حلف نامے میں ہزار ہزار روپوں کے ہار بھی ظاہر کئے جس کی مالیت 21 لاکھ روپے ہے جو مایاوتی کی بہوجن سماج پارٹی کی 25 ویں سالگرہ کے موقع پر 15 مارچ کو لکھنو میں پیش کیا گیا۔ اس کے باوجود مایاوتی کہتی ہیں کہ سی بی آئی کا حلف نامہ کانگریس کی مرکزی حکومت نے ان سے سیاسی معاملات طے کرنے کیلئے پیش کیا ہے لہٰذا عدالت ان کے خلاف کرپشن کیس ختم کردے۔ وہیں یوپی اے سرکار کو بھی اس تذبذب میں ڈال دیا ہے کہ آیا وہ چھوٹی ریاست کے حق میں بیان دے یا اس کے خلاف۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف کانگریس کی ریاستی صدر کچھ کہتی ہیں تو وہیں مرکزی وزیر

سلمان خورشید کچھ اور۔

مایاوتی نے اپناٹرمپ کارڈ کھول دیا ہے اور یہ وہ مدا ہے کہ جس پر پرنٹ والیکٹرانک میڈیا بھی دلچسپی لیے بغیر نہ رہ سکے گا۔فائدہ یہ ہوگا کہ مایا وتی کو موقع مل جائے ان لوگوں کو سامنے لانے کا جو اس کے مخالف ہیں اور یہ کہنے کا بھی کہ یہی وہ لوگ ہیں جو ریاست میں امن وامان اور ترقی و خوشحالی دیکھنا نہیں چاہتے۔فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مایا وتی کا کرپشن دب جائے گا،کانگریس کے نوجوان لیڈر راہل گاندھی کی آواز میڈیا میں پست کی جاسکے گی اور اُن لوگوں کی آوازیں بھی پست کی جاسکیں گی جو ریاست میں سیاست صرف مذہبی رنگ چڑھا کر ہی کیا کرتے ہیں ان کی کمندیں بھی ڈھیلی ہو چلیں گی!

تذکرہِ حسنؓ و حسینؓ: بطور اصلاح

شہادت امام حسینؓ ایک تاریخ ساز واقعہ ہے جس کو نہ صرف اسلامی تاریخ میں بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی اہم مقام حاصل رہا ہے۔ یہ شہادت کیوں پیش کی گئی؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ کیا امام تخت و تاج کے لیے اپنے کسی ذاتی استحقاق کا دعویٰ رکھتے تھے۔ تاریخ کے بغور مطالعے سے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور پھر اس کی تخت نشینی سے دراصل جس خرابی کی ابتدا ہو رہی تھی وہ اسلامی ریاست کے دستور، اس کے مزاج اور اس کے مقصد کی تبدیلی تھی۔ گرچہ اس کے نتائج ابھی سامنے نہیں آئے تھے لیکن ایک صاحب بصیرت انسان کی نگاہ دیکھ رہی تھی کہ اسلامی ریاست کس کروٹ تبدیل ہو رہی ہے۔ اس کا راستہ بدل رہا ہے اور جس راہ پر وہ مڑ رہی ہے وہ آخر کار اسے کہاں لے جائے گی۔ یہی رُخ کی تبدیلی تھی جسے امام نے دیکھا اور صحیح رخ پر ایک بار پھر لانے کی اپنی ساری سعی و جہد کر ڈالی، یہاں تک کہ جامِ شہادت پیش کر دی۔ اسلامی ریاست کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ صرف زبان سے بلکہ اپنے عملی رویہ سے بھی اس عقیدہ اور یقین کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے کہ ملک اللہ کا ہے، باشندے اللہ کی رعیت ہیں، اور حکومت اس رعیت کے معاملے میں اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ حکومت اس رعیت کی مالک نہیں اور رعیت اس کی غلام نہیں۔ لیکن یزید کی ولی عہدی سے جس انسانی

بادشاہی کا مسلمانوں میں آغاز ہوا اس میں اللہ کی بادشاہی کا تصور صرف زبانی تھا۔ عملاً اس نے وہی نظریہ اختیار کیا جو ہمیشہ سے ہر انسانی بادشاہ کا رہا ہے۔ یعنی ملک بادشاہ کا، رعیت کی جان، مال آبرو ہر چیز کا مالک بادشاہ ہے۔ اللہ کا نظام اگر عائد ہوگا تو عوام پر، بادشاہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

اسلامی ریاست کی سنگ بنیاد یہ تھی کہ حکومت لوگوں کی آزادانہ مرضی سے قائم ہو۔ کوئی شخص اپنی کوشش سے اقدار حاصل نہ کرے۔ بلکہ لوگ اپنے مشورے سے بہتر آدمی کو چن کر اقتدار اس کے سپرد کر دیں۔ بیعت حاصل ہونے میں آدمی کی اپنی کوئی کوشش یا سازش کا دخل نہ ہو۔ لوگ بیعت کرنے یا نہ کرنے میں آزاد ہوں۔ جب تک کسی آدمی کو بیعت حاصل نہ ہو وہ اقتدار میں نہ آئے اور جب سارے لوگوں کا اعتبار اس سے اٹھ جائے تو اقتدار سے چمٹا نہ رہے۔ خلفائے راشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدے سے برسر اقتدار آیا۔ لیکن یزید کی ولی عہدی نے اس قاعدے کو الٹ دیا۔ اس سے خاندانوں کی موروثی بادشاہتوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کے بعد سے آج تک پھر مسلمانوں کی انتخابی خلافت کی طرف پلٹنا نصیب نہ ہو سکا۔ اب حکمران طاقت سے برسر اقتدار آنے لگے، طاقت اور اقتدار سے بیعت حاصل کی جانے لگی۔ اسی جبری بیعت کو کالعدم قرار دیے جانے پر خلیفہ منصور کے زمانے میں امام مالکؒ کی پیٹھ پر کوڑے برسائے گئے اور ان کے ہاتھ شانوں سے اکھاڑوا دیئے گئے۔ یہ ہے وہ ملوکیت اور خلافت کا فرق جس کو سمجھنے کی ضرورت

ہے۔یہاں بہت سے اہم نکتوں میں سے ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ خلافت میں حکومت مشورے سے کی جائے اور مشورہ ان لوگوں سے لیا جائے جن کے علم، تقویٰ اور اصابت رائے پر لوگوں کو اعتماد ہو، لیکن شاہی دور کا آغاز ہوتے ہی شورائی دور کا اختتام ہوگیا اور بادشاہ اپنی مرضی سے فیصلے کرنے لگے۔

:تاریخ کی اہمیت

کسی تاریخی واقعہ کی حقیقت اور اس کی اساس ہمیں تاریخ ہی سے حاصل ہوتی ہے۔لہٰذا تاریخ کے بارے میں جستجو صرف فلسفیانہ اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اس کی بڑی زبردست عملی اہمیت ہے۔اس لیے کہ انسان کی ساری سعی و جہد کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے "کیوں "کا جواب حاصل کرلے بلکہ وہ یہ بھی جاننا چاہتا ہے کہ کون سا طریقہ اور راستہ ایسا ہے جو اس کو زوال سے بچاسکے اور عروج کی طرف لے جائے۔ یعنی انسان کی ساری تگ و دو کا مقصد صرف یہ نہیں ہوتا کہ وہ کل کیا تھا، کیوں تھا اور کیسے اس مقام تک پہنچا بلکہ کسی چیز کا تجسس انسان کے اندر اس لیے بھی پیدا ہوتا کہ وہ کل کے گزرے ہوئے لمحات میں ان کمیوں اور غلطیوں کو علیحدہ کردے جو اس کو ناکامی کی طرف لے جانے والی تھیں اور ان کی جگہیں ان چیزوں کو متبادل بنادے جو اس کو آج کامیابی سے ہمکنار کرنے کا ذریعہ بننے ولی ہیں۔جس تہذیب اور قوم نے کسی زمانے عروج کی منزلیں طے کی تھیں وہ پچھلی چند صدیوں میں زوال کا شکار ہو گئی۔ تمام سلطنتیں چھین

لی گئیں یا یہ کہیں کہ اس کے حکمراں اس لائق نہیں رہے کہ ان سلطنتوں کے نظام کو چلا سکیں، ایسے میں اللہ نے اپنی دنیا کے نظام کو چلانے کے لیے دوسروں کو اٹھا کھڑا کیا۔ گو کہ وہ اسلامی، اخلاقی، روحانی بنیادوں پر کمزور صحیح لیکن ان میں یہ طاقت ٹھہری کہ دنیا کے نظام کو چلا سکیں اور برقرار رکھ سکیں۔ آج مسلمانوں کے پاس لاکھوں کروڑوں ڈالر ہیں، بے شمار انسانی وسائل ہیں، دنیا کے بہترین خطے ہیں، پھر یہ لوگ دنیا کی اہم شاہراروں اور گزرگاہوں پر واقع ہیں، اس سب کے باوجود! پوری دنیا میں بے وزن ہیں۔ یہ بات قابل غور ہی نہیں توجہ طلب بھی۔

تاریخ کی یہ داستان ہمارے لیے صرف علمی گفتگو اور فلسفیانہ کاوش کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ دلچسپی ہمیں اس لیے بھی ہونا چاہیے کہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ آیا ہمارے مسیحا جو مشرق سے لے کر مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں اور جو ہماری قوموں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، ان کے ہاتھوں کیا یہ امت مسلمہ اور یہ دنیاء انسانیت عروج کی منزل طے کر سکے گی۔ کیا وہ ٹیکنالوجی اور سائنس جس کو ہم لاکھوں کروڑوں ڈالر دے کر حاصل کر رہے ہیں، اس سے ہماری قومیں ترقی کی منزل طے کرلیں گی؟ کیا معاشی ترقی کے ان پنج سالہ منصوبوں کے ذریعہ انسانیت کو اطمینان و سکون حاصل ہو سکے گا؟ ان سارے نسخوں اور مسائل کے حل کی فی الواقع حقیقت کیا ہے؟ چنانچہ اس سوال کی اہمیت صرف علمی

اور فلسفیانہ ہی نہیں، بلکہ عملی بھی ہے۔ کیونکہ اس سے ہمارا نہ صرف ماضی یا حال بلکہ مستقبل بھی وابستہ ہے۔

قرآن کا نقطہ نظر:

قوموں کا عروج وزوال نہ مادی قوتوں پر منحصر ہے، نہ سائنس و ٹکنالوجی کا اس میں عمل دخل ہے اور نہ علمی ترقیوں پر ہی اس کا انحصار ہے۔ بلکہ یہ خالصتاً اخلاقی اور معنوی اقدار کے اوپر منحصر ہے۔ یہ انسان کے اخلاقی کسب واعمال کا نتیجہ ہے جس کے نتیجہ میں قومیں عروج وزوال کی طرف جاتی ہیں۔ قرآنِ حکیم میں جو قوموں کے عروج وزوال کا تذکرہ ہے وہ ایک فرد واحد کی زندگی سے بالکل مختلف ہے۔

فرد اس بات پر مجبور ہے کہ وہ موت کی طرف جائے اور اس میں اخلاقی زندگی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اگر کوئی صالح ہوگا تو اس کو بھی موت آئے گی اور کوئی فاسق تو اس کو بھی موت۔ لیکن قوموں کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ قومیں لازماً موت سے ہمکنار نہیں ہوتیں۔ ان کی موت اس لیے واقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرتی ہیں، حالانکہ کہ فرد کی موت کا تعلق اس کے اپنے نفس پر ظلم کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی فطری موت مرتا ہے۔ کسی قوم کا مِٹ جانا یا اس کی موت واقع ہونا، ناگزیر عمل نہیں ہے جو اسے لازماً پیش آئے۔ جس طرح کوئی

فرد اپنی ذاتی زندگی میں اچھا بننا چاہے تو وہ بن سکتا ہے اور برا بننا چاہے تو برا بن سکتا ہے۔ اسی طرح قومیں بھی آزاد ہیں کہ وہ اچھائی کی روش پر چلنا چاہیں تو چل سکتی ہیں، ترقی کی راہیں طے کر سکتی ہیں، اخلاقی اور معنوی اقدار حاصل کر سکتی ہیں، اور اگر برائی کی طرف جانا چاہیں، اپنے اوپر ظلم کریں، دنیا کے اندر ظلم و فساد کا دروازہ کھولیں، تو وہ تباہی کی طرف جا سکتی ہیں۔ اور یہ عمل ایسا بھی نہیں ہے کہ پلٹایا نہ جا سکے۔ آدمی جوان ہونے کے بعد بچہ نہیں بن سکتا، اور بوڑھا ہونے کے بعد جوان نہیں، لیکن قومیں زوال پذیر ہونے کے بعد ایک بار پھر سربلند ہو سکتی ہیں۔

اگر یہ بات صحیح نہ ہوتی تو انبیاء کرام کا اس قدر طویل سلسلہ نہ ہوتا۔ وہ گمراہ لوگوں کو ہدایت کی تبلیغ نہ کرتے، اندھیروں سے اجالے کی طرف لوٹانا اور معصیت کے کاموں سے چھٹکارا دلانا ان کا مقصد نہ ہوتا اور بگڑی ہوئی قوموں کے سامنے اپنا پیغام لے کر نہ کھڑے ہوتے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ نسخہ ایسا ہے جس سے کوئی قوم خواہ کتنی ہی نیچے گر چکی ہو، اگر وہ چاہے تو دوبارہ عروج کی طرف گامزن ہو سکتی ہے۔ انھوں نے قوموں سے یہ وعدہ کیا اور خوشخبری بھی دی کہ اگر تم نے اپنی اصلاح کر لی یا تم اس کے لیے تیار ہو گئے، تو تم خواہ کتنے ہی نچلے درجہ میں کیوں نہ چلے گئے ہو تم ہی کامیاب ہو گے

اور سرخروئی تمہارے قدم چومے گی۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کو یہ پیغام سنایا کہ اگر تم نے میری دعوت قبول کر لی تو تم عرب اور عجم دونوں کے مالک بن جاؤ گے۔ اور دیکھنے میں آیا کہ سائنس و ٹیکنالوجی سے عاری لوگ دنیا کے امام بن گئے۔ قرآن نے اس بات کو مختلف پیرایہ بیان کیا ہے۔ کہا کہ: فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (الاحقاف 35:46) "اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟"۔ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا (الکھف 59:18) "یہ عذاب رسیدہ بستیاں تمہارے سامنے موجود ہیں، انھوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا"۔ اور کہا کہ: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (الروم 41:30) "خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا، لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے"۔ معلوم ہوا یہ فساد کی لوگوں کی بد اعمالیوں کی وجہ سے برپا ہوا اور اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نہ تھی۔ قومِ عاد کا تذکرہ اس طرح کیا گیا: عاد کو دیکھو، جب انھوں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً "ہم سے طاقت ور کون ہے؟" اور وہ اس غرور کے اندر آ گئے تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ قومِ عاد پر خدا کی پھٹکار پڑنے اور ان کو دور پھینکنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ کہا کہ: "یہ ہیں عاد، اپنے رب کی آیات سے انھوں نے انکار کیا، اس کے رسولوں کی بات نہ مانی، اور ہر جبار دشمنِ حق کی پیروی کرتے رہے" (ھود 59:11)۔ لہٰذا یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ جس قوم کو بھی

زوال و تباہی سے سابقہ پیش آیا، وہ بس اس لیے کہ اس نے اللہ کے احکامات سے بغاوت کی، ظلم و ناانصافی کو فروغ دیا اور اس طریقہ کی پیروی کی جو بدکردار لوگوں کا رہا ہے۔ کہا کہ: "اور اللہ ایک ایسی بستی کی مثال دیتا ہے۔ وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا۔ تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں" (النحل 112:16)۔ غور فرمایئے کہ ایک ایسی قوم جس کے لیے ہر طرف سے دروازے کھلے ہوئے تھے، معاشی ترقی کی بے انتہا عروج پر تھی، مزید یہ کہ اطمینان اور امن و امان قائم تھا یعنی لاء اینڈ آڈر کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی تھی، ملک کا نظام مستحکم تھا۔ لیکن ان کی کفران نعمت کی غلطی نے ان کو ہلاک کر دیا۔ کفرانِ نعمت اس طرح ہی نہیں ہوا کرتا کہ لوگ اللہ کا زبان سے شکر ادا نہ کریں بلکہ کفرانِ نعمت یہ ہے کہ اللہ نے جو بے انتہا وسائل فراہم کیے ہیں ان کو اللہ کی مرضی کے خلاف استعمال میں لا کر اُس ربِ اعلیٰ کی زمین پر اس کے احکامات کی خلاف ورزی کی جائے۔ بس یہی وجہ بنی کہ اس بستی کو ہلاک کر دیا گیا۔ ان پر مصیبتیں ٹوٹ پڑیں، امن کی جگہ خوف طاری ہو گیا اور بھوک اور پیاس میں وہ مبتلا کر دیے گئے۔ غور فرمائیں آج امت مسلمہ کی صورتحال کیا ہے؟

: قبولیتِ عبادات

قرآن حکیمکہتا ہے "اور انھیں آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ ٹھیک سنا دو۔جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی قبول نہ کی گئی۔ اس نے کہا: میں تجھے مارڈالوں گا۔اس نے جواب دیا: اللہ تو متقیوں ہی کی قربانی قبول کرتا ہے" (المائدہ: 28)۔ یہ ہے وہ معیار جس پر پورے اترنے والوں کی قربانی قبول کی جائے گی۔ جس میں ایک بات یہ کہ وہ متقی ہوں اور دوسری یہ کہ وہ قربانی دینے میں مخلص ہوں،اور یہ اخلاص ہر نہج پر ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہم اللہ کے لیے مخلص ہوں، اپنے نبی کے لیے مخلص ہوں، اپنے دین کے لیے مخلص ہوں، اپنی امت کے لیے مخلص ہوں اور ان سب سے پہلے اپنی ذات کے لیے مخلص ہوں۔ ذات کے لیے مخلص، یعنی ہم اس بات پر یقین رکھنے والے ہوں کہ ہماری ذات کے ذریعہ انجام دیا جانے والا ہر عمل اللہ کی خوشنودی کے لیے ہی انجام دیا جائے گا اور ہر کام سے رکنا اس بنا پر ہوگا کہ اللہ ہم کو رکنے کا حکم دیتا ہے۔اس تصور کے ساتھ انجام دی جانے والی ہر قربانی انشااللہ قبول ہوگی اور وہ ہمیں دنیا و آخرت میں مقبولیت کی منزلیں طے کروائے گی۔ کہا کہ "اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں" (البقرہ: 269)۔مزید کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو: "عرض کرتے ہیں کہ ہم نے (تیرا حکم) سنا اور قبول کیا۔اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے" (البقرہ: 285)۔ پہلی خوبی: وہ عقل رکھتے ہیں، نہ صرف

عقل رکھتے ہیں بلکہ عقل کا استعمال ان ہدایات کی روشنی میں کرتے ہیں جو ان کے رب کی طرف سے نازل ہوئیں ہیں۔ دوسری خوبی : جب ان کے پاس نصیحت آجاتی ہے تو وہ اس کو قبول کرنے سے گریز نہیں کرتے ،تذبذب میں مبتلا نہیں ہوتے، کاہلی اور تساہلی سے بچتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی قربانیاں قبول کی جاتی ہیں۔اور تیسری خوبی یہ کہ ان لوگوں کو یقینِ کامل ہے کہ آخر کار اس زندگی کا اختتام ہونا ہے، آخرت کا دن آنا ہے، جزا اور سزا ملنی ہے، اور یہی وجہ ہے جس کے سبب وہ اللہ رب العالمین سے بخششیں طلب کرتے ہیں۔پھر کہا کہ "اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے۔اور ابراہیمؑ کے دین کا پیرو ہے جو یکسو (مسلمان) تھے اور خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنایا تھا" (المائدہ:125)۔یہ وہ کسوٹی ہے جس پر ہر فرد اپنی ذات اور اپنی عبادات کا مکمل جائزہ لے سکتا ہے۔اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر پرکھ کر یہ بات بھی معلوم کی جا سکتی ہے کہ آیا ہماری عبادات قبول ہونے کے لائق ہیں یا نہیں! کہا کہ زمین وآسمان کی ہر چیز کا اسے علم ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، "سب اس کو معلوم ہے، اور وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے" (البقرہ:33)۔

تذکرہ بطور اصلاح :

جس طرح ایک انسان کی رواں دواں زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اس کو بھرپور غذا ملتی رہے ٹھیک اس ہی طرح ایک مسلمان کے دین، اس کی فکر، اس کی نظراور اس کے اعمال کو صحیح رخ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ایمانی غذاؤں کا استعمال کرتا رہے جو اس کو وقتاً فوقتاً تقویت پہنچانے والی ہیں۔ یہ ایمانی غذا اُس صورت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے جبکہ وہ اس کا شعوری طور پر اہتمام کرے۔ اس کے لیے جہاں دن میں پانچ مرتبہ اللہ رب العزت کے سامنے حاضری ایک ذریعہ ہے تو وہیں اللہ کا ذکر اور اُس کی عبادات کو ہر لمحہ بجالانا بھی معاون و مدد ثابت ہوتے ہیں۔ یہ اہتمام بندہ مومن خوشی اور غم کے ہر موقع پر کرتا ہے۔ یہی وہ عظیم مقصد ہے جس کی جانب یہ واقعہ شہادت امام حسین ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

یہ وہ موقع ہے جب کہ تذکرہ امام حسنؓ و حسینؓ کے ساتھ ساتھ ایک بڑے مقصد کے لیے عزم مسمّم کا عہد کیا جاتاہے۔قربانی کے اعلیٰ ترین نمونہ کو یاد کیا جاتا ہے اور اپنی جان اور مال اور صلاحیتوں کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ یہ عہد صرف زبانی حد تک ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات انسان کے ظاہر و باطن دونوں پر پڑتے ہیں۔ اس طرح اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف مسلمانوں کو قوت حاصل ہوتی ہے جو ان کے اندر خدا پرستی کی توانائیاںتازہ بہ تازہ داخل کرتی رہتی ہیں تاکہ وہ برابر چست رہیں، فعال.

رہیں اور ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے صراط مستقیم پر قائم ہو جائیں۔کائنات اور اس کی ہر شے مستقل حرکت پذیر ہے اُس میں ٹھہراؤ نہیں اگر اس میں ٹھہراؤ آ جائے تو یہ دنیا تباہ ہو سکتی ہے ٹھیک اسی طرح بندہ مومن ہر آن اپنے ایمان کو تازہ دم رکھنے میں متحرک رہتا ہے۔یہی نشانی ہے اس بات کی کہ اس کی فکر اور اس کا عمل منجمد نہیں، اگر ایسا ہوا تو یہ اس کی ہلاکت اور بربادی کا نتیجہ ہوگی۔بندہ مومن اللہ کے رسول، آپ کے صحابہ اور ان کی امت سے منسلک ہر اس فرد کی زندگی سے استفادہ کرتا ہے جو اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہو، یا رہا ہو۔یہی تحریک امام حسن اور امام حسین کی زندگی سے بھی ہمیں ملتی ہے۔آپ کے سامنے سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں، وطنی مفاد آڑے آئے، وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مصلحتوں نے دامن پکڑا، مشکلات نے راستہ روکا،ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا۔لیکن آپ نے اپنی آواز میں پستی نہ آنے دی۔آپ نے خلافت وملوکیت کے درمیان دیوار کھینچ دی اور ثابت کردیا کہ عقیدہ کی پختگی سے ایک مسلمان کی راہ ہموار ہوتی ہے اور راس کی زندگی سے کاوٹیں دور ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔کیونکہ مومنین کو اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر متنبہ کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ: "اور جو کافر ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی خوشنما بنا دی گئی ہے اور وہ مومنین سے تمسخر کرتے ہیں۔لیکن جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر غالب ہوں گے اور خدا جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے" (البقرہ: 212)۔قربانیاں ہمارے ایمان کو تازہ رکھنے میں مددگار

ہوتی ہیں۔

آیئے عہد کریئے اور اٹھ کھڑے ہویئے اس عزم کے ساتھ کہ ہم اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنی زندگی کے شب و روز میں قربانیاں دیں گے اور اللہ کے دین کو اللہ کی زمین پر قائم کرنے والوں میں شمار ہوں گے ۔کہا کہ : "ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو" (آل عمران 120:3) ۔معلوم ہوا کہ ہماری تعداد، ہمارے وسائلِ ترقی ہمارے کام نہیں آئیں گے جب تک کہ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے پاس اللہ کا تقویٰ نہ ہو اور ہم صبر کرنے والے شمار نہ کیے جاتے ہوں۔ منھ پر تمانچہ کھا کر صبر کرنے والے صابر نہیں کہلائے بلکہ اپنے مقصدِ وجود کے حصول کے لیے تمام ترکاوٹوں اور آزمائشوں کے باوجود قدم آگے بڑھاتے چلے جانے والے ہی صابر لوگ ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ ہم ان لوگوں میں شمار نہ ہوں جو تذکرہ بطور تذکرہ کیا کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں میں ہمارا شمار کیا جائے، جو تذکرہ بطور اصلاح کیا کرتے ہیں، جو اپنی ذات پر ہر لحہ نظر رکھتے ہیں اور اس کے ذریعہ انجام دیے جانے ہر عمل کی اللہ کے سامنے جوابدہی کے لیے تیار رہتے ہیں، کیونکہ فکرِ جوابدہی انسان کو بلندیاں عطا کرتی ہے اور یہ حصولِ بلندی اور سرخروئی ہی ہمارا نصب العین ہے!

دوسرے ملکوں پر زور زبردستی یا مکر وفریب اور دھاندلی کے ذریعہ قبضہ اور وہاں کے عوام کی مرضی کے خلاف زبردستی اپنے من پسند سیاسی و معاشی فیصلے تھوپنے کے عمل کو استعمار کہتے ہیں۔تاریخ کے ہر دور میں طاقتور قوموں نے کمزور قوموں کا استحصال کیا ہے۔ ماضی قریب میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، ہالینڈ، پرتگال، روس وغیرہ نے ایشیا اور افریقہ کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ سفید فام یوروپی اقوام نے براعظم امریکہ کے مختلف علاقوں پر قبضہ کیا اور مقامی عوام کو غلام بنا لیا۔ یہ سب استعمار اور استعماری ہتھکنڈوں کی مثالیں ہیں۔اب جبکہ انسانی شعور بیدار ہو چکا ہے اور کسی بھی ملک کے لئے ، دوسرے ملک پر قبضہ ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ہوگیا ہے، استعمار نے بھی اپنا روپ بدل دیا ہے۔اب راست ممالک پر قبضہ نہیں کیا جاتا۔بظاہر حکمران مقامی ہی ہوتے ہیں۔ اکثر عوام کے ذریعہ منتخب حکمران ہوتے ہیں۔ لیکن دھونس ، دھاندلی،فریب، لالچ اور بلیک میلنگ کے مختلف طریقوں کو اختیار کرکے استعمار مقامی حکمرانوں ہی کے ذریعہ عوام دشمن پالیسیاں ملک پر مسلط کرتا ہے۔ جدید سرمایہ دارانہ استعمار کا اصل مقصد دنیا کے وسائل پر قبضہ کرنا اور دولت کی طاقت سے دنیا کو غلام بنانا ہے۔ اس مقصد کے لیے استعمار مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ سیاسی محاذ پر وہ

ملکوں اور قوموں پر اپنے پٹھو حکمران مسلط کرتا ہے، ان کے ذریعہ اپنی پالیسیاں وہاں کے عوام پر تھوپتا ہے۔ مقامی معیشتوں کو تباہ کرکے بڑی کمپنیوں اور سرمایہ داروں کے لیے راہیں ہموار کرتا ہے۔ قدرتی وسائل کو لوٹتا ہے۔ قبائل اور مقامی آبادیوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کرتا ہے۔ جو قومیں استعمار کی اس راہ میں مزاحم ہوتی ہیں، ان پر فوجی کاروائی کرتا ہے اور فوجی طاقت کے بل بوتے پر انہیں تباہ وتاراج کرتا ہے۔ اس کے لئے استعمار کے پاس مختلف طریقے موجود ہیں۔ وہ پسماندہ قوموں کو ترقی اور گروتھ کے خواب دکھاتا ہے۔ انہیں قرضوں کے جال میں پھنساتا ہے۔ مصنوعی طور پر پیدا شدہ مالیاتی بحرانوں سے نکلنے اور ترقیاتی کاموں کے لئے آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک جیسے اداروں سے مشروط قرضے فراہم کراتا ہے۔ ان شرائط میں بیرونی کمپنیوں کو کام کرنے کی اجازت، بیرونی سرمایہ کاری کی اجازت، غریبوں کو دی جانے والی رعایتوں میں کمی، تعلیم اور صحت جیسے سماجی امور میں خرچ میں کمی، سرکاری اداروں کو خانگیانا وغیرہ جیسی شرائط شامل ہوتی ہیں۔ ان شرائط کی وجہ سے دھیرے دھیرے ملک کی دولت اور اسکے وسائل عالمی سرمایہ داروں کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اس لوٹ کا اصل ذریعہ ہوتی ہیں۔ میڈیا، پروپگنڈہ اور اشتہارات کی قوت کے ذریعہ اس کام میں سرمایہ داروں کی مدد کرتا ہے۔ اور ملک کے عوام کو غلامی اور غریبی کے عذاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

:آئی ایم ایف کی حالیہ رپورٹ اور ہندوستان کی صورتحال

آئی ایم ایف کی جاری کردہ تازہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے اندر چالیس کروڑ سے زائد افراد کی آمدنی ایک ڈالر یومیہ سے بھی کم ہے۔ گویا دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی گود میں دنیا کی سب سے بڑی غربت پرورش پا رہی ہے ۔ جس کی ایک وجہ دولت کی ناقص تقسیم ہے تو وہیں دوسری جانب مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھ میں ملکی دولت پر قبضہ ہے۔ رپورٹ کے مطابق ہندوستان کی شرح نمو جس کے متعلق دعویٰ کیا گیا تھا کہ 9.5 فیصد رہے گی 8 فیصد سے بھی نیچے جا چکی ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہندوستانی حکومت نے کئی ایک بڑے پراجیکٹس پر جاری کام بند کر دیئے ہیں۔ دوسری جانب عالمی ادارہ خوراک کے مطابق ہندوستان میں 71 فیصد زراعت سے وابستہ کسان عالمی اداروں کی شرائط ، بیج ، کھاد اور بجلی کی قیمتوں میں اضافے کے باعث مالی مشکلات سے دوچار ہیں۔ کسانوں کی بڑی تعداد روزگار کے حصول کے لئے شہروں کا رخ کر رہی ہے جس سے آبادی کا توازن بری طرح بگڑ چکا ہے۔ کسانوں کی بدتر ہوتی حالت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ مالی سال کے دوران صرف تین ریاستوں میں 12 سو سے زائد کسانوں نے قرضہ جات اور سود سے تنگ آ کر خود کشی کر لی۔ ماہرین کے مطابق اس وقت تیزی سے کسان زراعت کے شعبے کو چھوڑ رہے ہیں جس سے ملک میں غذائی اجناس کی قیمتوں میں ایک سال کے اندر 31 فیصد سے زائد اضافہ ہو گیا ہے۔

دیگر نو آبادیاتی ممالک کی طرح ہندوستان کا مقامی حکمران طبقہ بھی اپنی تاریخی متروکیت اور پسماندگی کی وجہ سے ہندوستان کو ایک جدید قومی، صنعتی، ترقی یافتہ ریاست بنانے میں بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ 80ء اور 90ء کی دہائی میں معیشت اور منڈی کو کھولنے کے عمل نے ہندوستان میں بہت بڑے پیمانے کی معاشی تفریق کو جنم دیا۔ آج ہندوستان کی آبادی کا 10 فیصد امیر ترین حصہ آمدنی کا 31.1 فیصد لے کے جاتا ہے اور غریب ترین 10 فیصد کے حصے میں کل ملکی آمدنی کا 3.6 فیصد آتا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کی وسیع اکثریت غربت کی اتھاہ گہرایوں میں گھری ہوئی ہے۔ 77 فیصد افراد 20 روپے یومیہ آمدنی کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں جبکہ حکومت کی جانب سے غربت کا 'سرکاری' پیمانہ 24 روپے یومیہ کی حد ہے۔ 9 کروڑ 30 لاکھ لوگوں کی رہائش جھونپڑ پٹیوں میں ہے جو ہندوستان کی شہری آبادی کا 27 فیصد ہے۔ 1 کروڑ 24 لاکھ کی آبادی کے شہر ممبئی میں 86 لاکھ افراد ان کچی بستیوں کے رہائشی ہیں جہاں کوئی بھی بنیادی سہولت میسر نہیں ہے۔ دہلی میں یہ تعداد 31 لاکھ ہے۔ دوسری جانب ہندوستان کے دوسرے امیر ترین آدمی مکیش امبانی نے حال ہی میں اپنے لیے 27 منزلہ محل تعمیر کیا ہے جس کی مالیت ایک ارب ڈالر کے قریب ہے اور اس کی چھٹی منزل سے ممبئی کی جھونپڑ پٹیوں کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کا امیر ترین آدمی لکشمی متل 31 ارب ڈالر سے زائد اثاثوں کے ساتھ دنیا کا چھٹا امیر ترین آدمی ہے۔ جبکہ دوسری طرف ہندوستان خوراک کی کمی کے شکار بچوں کے

تناسب میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے جہاں 47 فیصد بچے خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ ہندوستان میں ان کی تعداد افریقہ کے غریب ترین ممالک سے دوگنی ہے۔ ہر سال 21 لاکھ بچے 5 سال کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہی قابل علاج بیماریوں کی وجہ سے مر جاتے ہیں جن میں اسہال، ملیریا، خسرہ، ٹائیفائڈ اور نمونیا شامل ہیں۔ روزانہ ایک ہزار بچے صرف اسہال سے ہی مر رہے ہیں۔ 2008ء کی ایک رپورٹ کے مطابق پانچ سال کے کم عمر بچوں میں سے 43 فیصد وزن کی کمی کا شکار ہیں۔ زرعی پیداوار میں دنیا میں دوسرے نمبر ہونے کے باوجود ہندوستان کو بڑے پیمانے پر بھوک کا سامنا ہے۔

کھدرے بازار میں بیرونی سرمایہ کاری:

حکومت ہند نے کھدرے بازار میں بیرونی سرمایہ کاری کی اجازت دینے کا فیصلہ اس جواز کے ساتھ کیا ہے کہ اس سے روزگار کے مواقع فراہم کرنے، کاشت کاروں کے معاوضہ میں بہتری پیدا کرنے، ٹکنالوجی کی درآمد کے قابل بنانے اور صارفین کو فائدہ ہوگا۔ ساتھ ہی انفرااسٹرکچر بہتر ہوگا، زرعی پیدوار کم ضائع ہوگی اور اس کے معاوضہ میں اضافہ ہوگا جس کی وجہ سے ہمارے کاشتکار اپنی فصلوں کی بہتر قیمت حاصل کر سکیں گے۔ چونکہ ہول سیل اور ریٹیل قیمتوں میں کافی فرق پایا جاتا ہے لہٰذا اس میں کمی واقع ہوگی اور صارفین روزانہ استعمال کے لیے کم قیمت میں اشیاء حاصل کر سکیں گے۔ اس کے برخلاف بائیں

پارٹیوں کے علاوہ سماج وادی پارٹی، بی ایس پی، این ڈی اے، ترنمول کانگریس اور آل انڈیا انا ڈی ایم کے کے اراکین نے ملٹی برانڈ ریٹیل میں 51 فی صد اور سنگل براںڈ میں صد فی صد غیر ملکی راست سرمایہ کاری کی اجازت دینے کے سرکاری فیصلہ کے خلاف احتجاج درج کیا ہے۔ حکومت کی بعض اتحادی جماعتوں سمیت بیشتر جماعتیں اس فیصلے کی مخالفت کر رہی ہیں اور اس پر انہوں نے پارلیامنٹ بحث کا مطالبہ کیا ہے۔ پارلیامنٹ کے سرمائی اجلاس میں لگاتار چھٹے دن بھی کوئی کام نہیں ہو سکا اور باقی نشستوں پر بھی سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ سال بھی سرمائی اجلاس ہی میں پارلیامنٹ کے 21 دن برباد ہوئے تھے جس پر 146 کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا اور یہی صورتحال اب ہے کہ جس پر اب تک تقریباً 50 کروڑ خرچ ہو چکا ہے۔ ملک کی دولت جو غریبوں سے مختلف ٹیکسس کی شکل میں لی جاتی ہے اس کو اس ٹھاٹ باٹ کے ساتھ برباد کیا جا رہا ہے اور عوام کے نمائندے عوام کے سامنے جوابدہ بھی نہیں! بیرونی سرمایہ کاری کے تعلق سے مخالفین کا کہنا ہے کہ اس سے ریٹیل بازار میں تجارت کرنے والے وہ لاکھوں گھریلو تاجر بے روزگار ہو جائیں گے جن کی روزی روٹی چھوٹی چھوٹی دکانوں سے چلتی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ بین الاقوامی کمپنیاں پہلے مارکیٹ میں آتی ہیں، سستا سامان فروخت کرتی ہیں لیکن جب ان کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے تو وہ اپنی من مانی کرتی ہیں۔ لیکن حکومت کا خیال ہے کہ غیر ملکی کمپنیوں کو ملک میں کام کرنے کی اجازت دینے سے ترسیل کی صورتحال بہتر

ہو گی اور مہنگائی پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔ ملک میں کارپوریٹ دنیا کی طرف سے بھی حکومت پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ اس تجویز کو جلد منظوری دی جائے۔

معاملہ یہ ہے کہ حکومت کے اس فیصلہ پر چہار طرفہ مذمت جاری ہے اور عوامی احتجاج شروع ہو چکے ہیں۔ کیونکہ کھدرا بازار قومی آمدنی کا ایک اہم جز ہے جس کا راست تعلق عوام سے ہے۔ یعنی پیدوار کرنے والے بھی عوام اور خرید و فروخت کرنے والے بھی عوام۔ لیکن اگر یہ تعلق بیرونی حکومتوں یا ان کے من چاہے افراد کی شکل میں تبدیل ہو جائے تو لازم ہے کہ ملک کی معیشت بیں راست اُن بیرونی حکومتوں کی حصہ داری بھی بڑھ جائے گی جو چاہتے ہیں کہ ایک بار پھر ابھرتا ہوا ہندوستان ان کی غلامی کے پنجے میں جکڑ جائے۔ ہندوستان کی سیاسی صورتحال کا تجزیہ کرنے والے اس جانب بھی متوجہ کرتے آئے ہیں کہ ملک کو سیاسی رخ دینے میں سرمایہ داروں کے مفاد ہمیشہ پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ کہیں یہ سرمایہ دار ٹاٹا اور امبانی جیسے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں تو کہیں دوسرے ناموں سے۔ یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ آج ہندوستان بیں سیاست ایک کھلا بازار بن چکا ہے جہاں مال و دولت کی بے انتہا فراوانی ہے۔ انتخابات میں الیکشن کمیشن کی جانب سے طے کیے گئے رقم کے باوجود سیاسی گٹھ جوڑ میں بے انتہا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور جو شخص یا پارٹی جتنی دولت خرچ کرتی ہے

اسی قدر اس کی کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ایسے حالات میں کھدرے بازار میں بیرونی سرمایہ داری کے اثرات دور رس محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ساتھ ہی یہ سرمایہ داری ان لوگوں پر بھی اثر انداز ہوگی جو مارکیٹ میں کھانے پینے کی مختلف چیزوں کی ذخیرہ اندوزی صرف اس غرض سے کرتے ہیں کہ اس سے قیمتوں میں ذاتی مفاد کے پیش نظر اضافہ و کمی کی جاسکے گی نیز اس عمل کے نفاذ میں تعاون و مدد کرنے والے چھوٹے سے لیکر بڑے تمام ہی سیاسی رہنما ہوتے ہیں۔اور یہ مدد و رہنمائی اس لیے کی اور کروائی جاتی ہے کیونکہ یہی وہ سرمایہ دار ہیں جو ان سیاسی جماعتوں کو مالی تعاون فراہم کرتے ہیں۔پس ایسے حالات میں کیوں کر ان کے مفاد کو نظر انداز کیا جا سکتے ہیں؟یہ صحیح ہے کہ کھدرے بازار میں بیرونی سرمایہ داری سے ان چھوٹے قسم کے دلالوں و سرمایہ داروں کی گرفت کمزور ہوگی تو سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ وہ کون لوگ ہوں گے جن کی گرفت مضبوط ہونے کے امکانات ہیں؟کیا یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے ملک کو پہلی دفعہ غلامی کا طوق پہنایا تھا؟یا ان ہی سے مشابہت رکھنے والے چند ملتے جلتے نام۔واقعہ یہ ہے کہ ایک طویل عرصہ سے ملک میں روزمرہ کا سامان وہی لوگ فراہم کرتے آئے ہیں جن کو ہم اسرائیل،امریکہ،یورپین کمپنیز نیز چین و جاپان کے نام سے جانتے ہیں۔فرق اب تک بس یہ تھا کہ یہ کام قدرے کم اثر انداز تھا لیکن اب اس کے لیے حکومت جواز تلاش کر رہی ہے،قانون بنا رہی ہے اور کھل کر مداخلت کر رہی ہے۔ملک کے 80% عوام بنیادی ضروریات سے محروم ہیں اور مزیدان

کی ذلت و رسوائی کے مواقع پیدا کیے جا رہے ہیں اس مفروضہ کے ساتھ کہ یہ فیصلہ ملک کے مفاد میں بہتر ثابت ہوگا۔

منافرت پر مبنی سیاست

انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی سوچ سے دوسرے انسانوں اور اُن کے گروہ کو متاثر کرے اور اپنا ہم نوا بنائے تاکہ جن مقاصد کو وہ لے کر اٹھا ہے اس میں اس کو کامیابی میسر آئے اور وہ اپنے نصب العین کو حاصل کر لے۔اِس "کامیابی" کے حصول کے لیے کبھی وہ مثبت طریقے اختیار کرتا ہے اور کبھی منفی۔انسان کو کیونکہ خالق.بر حق نے فطرتِ سلیم پر پیدا کیا ہے لہٰذا جب انسانوں کے گروہ کو منفی طریقوں سے اپنا ہم نوا بنانے کی سعی و جہد کی جاتی ہے ،کامیابی اُن لوگوں کے حصہ میں نہیں آتی۔اور اگر وقتی طور پر گمراہ کرکے یا منفی سوچ کے ساتھ چند قدم لوگ چلنے کے لیے تیار بھی ہو جائیں تو بہت جلد وہ دوریاں اختیار کر لیتے ہیں اور آخر کار ایسے لوگ ظلیل و خوار ہو کر رہتے ہیں۔انسان کی یہ بھی خواہش ہے کہ وہ ان حرکات و سکنات پر تنقید کرے جو اس کے خیال میں صحیح نہیں۔اس کے لیے کبھی وہ تحریر اور کبھی تقریر کا ذریعہ اختیار کرتا ہے۔ہم کسی صورت کسی بھی شخص کو "تنقید"کے اختیار سے محروم نہیں کر سکتے اور اگر کوئی شخص یا گروہ ایسا کرتا ہے تو بالواسطہ وہ لوگوں کے بنیادی حقوق سلب کرتا ہے جس کی حد درجہ مذمت کی جانی چاہیے۔حقِ تنقید کے باوجود آپ کا لہجہ اور زبان دونوں ہی ایسے ہونے چاہئیں جن سے ہر سننے والے کو محسوس ہو کہ فل واقع آپ اصلاح

چاہتے ہیں۔ تنقید کے لیے زبان کھولنے سے پہلے یہ اطمینان بھی کر لیجئے کہ آپ کے اعتراض کی کوئی بنیاد واقعہ میں موجود ہے؟ بلا تحقیق کسی کے خلاف کچھ کہنا ایک گناہ ہے جس سے فساد رونما ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس فرمان پر بھی اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے جس میں اللہ تعالی متوجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: "اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ خدا تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے" (المائدہ: ۸)۔ یہ وہ واضح تعلیمات ہیں جن حدود کا ایک مسلمان کو لازماً پاس و لحاظ رکھنا چاہیے، الفاظ کی ادائیگی میں بھی اور معاملات کے لین دین میں بھی۔ لیکن وہ لوگ جو اسلام اور اسلامی تعلیمات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں ان پر بھی تنقید کے تعلق سے اخلاقی پابندیاں نیز مختلف ممالک کے قوانین میں قانونی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔

قوم کے لیے وقف نوجوانوں کی ٹریننگ:

ملک میں فی الوقت کرپشن اور اس کے خاتمہ کی آوازیں سنی جا رہی ہیں، اس کے لیے نوجوان اپنی حمایت کا اعلان بھی کر رہے ہیں اور ایسے نوجوان بھی سامنے آئے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم شادی نہیں کریں گے بلکہ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے مر مٹیں گے کیونکہ ان نوجوانوں کو دیش سے محبت ہے اس لیے کچھ لوگ ان کو

ٹریننگ دینے کے بھی خواہاں نظر آتے ہیں اور یہ کام رالے گن سدھی میں انجام دینے کی تیاری میں ہیں۔اب جبکہ انا جی نے ایک بار پھر راہل گاندھی اور کانگریس کے بخیے ادھیڑنا شروع کر دیے ہیں تو ان کی مخالفت میں آندھرا پردیش سے کانگریس ممبر پارلیمنٹ ہنومنت راؤ نے ٹیم انا پر پلٹ وار کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ کانگریس جنرل سکریٹری راہل گاندھی پر حملے سے باز آئیں وہیں راہل گاندھی کو نشانے پر لینے پر کانگریس لیڈر دگوجے سنگھ نے بھی ٹیم انا کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے اس پر الزام لگایا ہے کہ ان کا ارادہ سیاسی ہے اور وہ کانگریس کے خلاف ماحول بنانے پر آمادہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پوری ٹیم انا، بشمول بابا رام دیو اور شری شری شنکر کا رادہ سیاسی ہے۔ان کے لیے بدعنوانی ایشو نہیں ہے، ان کا ایشو یہ ہے کہ کانگریس کے خلاف کیسے ایشو بنایا
جائے۔انھوں نے کہا کہ بی جے پی کی حکمت عملی دہشت گردانہ سرگرمیوں میں شامل سنگھ کے اراکین سے توجہ ہٹانے کی ہے۔ ایک طرف ٹیم انا کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے اور دوسری جانب انا جی نوجوانوں کو ٹریننگ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس ٹریننگ سے فیض یاب ہونے والے کس کے لیے کام کریں گے؟ سنگھ اور ان کی ہم نوا پارٹیوں کے لیے یا ملک میں امن وسلامتی اور آپسی بھائی چارے کے قیام کے لیے؟سوال یہ بھی ہے کہ یہ نوجوان اے بی وی پی کے ہوں گے یا این ایس یو آئی ،ایس ایف آئیاے آئی ایس ایف،بی وی ایس،ایس سی ایس پارٹیوں کے نوجوان ہیا پھر وہ عام نوجوان جو حقیقی تبدیلی کے خواہاں ہیں

اور جن کا کسی سیاسی پارٹی سے واسطہ نہیں؟

اظہار خیال کی آزادی۔۔۔۔؟

کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے اس دور میں جب گوگل متعارف ہوا تو بہت آسانی ہو گئی، اس کے بعد فیس بک اور ٹوئٹر کا وجود سامنے آیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اظہار خیال کی آزادی میں اِن سائٹس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ ایک دوسرے سے جڑنے اور پیغامات دینے میں سہولت بھی ہے اور فائدے بھی، یہی وجہ ہے کہ آج کی نوجوان نسل فیس بک پر اپنے خیالات کا اظہار بڑی بے باکی سے کر رہی ہے ساتھ ہی یہ افراد اپنی ذہانت کا مظاہرہ بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس شر پسند ذہن رکھنے والے افراد "اظہار خیال کی آزادی" کے نام پر فیس بک اور ٹوئٹر کے استعمال سے فساد برپا کر نے میں مصروف ہیں جبکہ اظہار خیال کے معنی یہ نہیں کہ کسی دوسرے فرد یا طبقے کی دل آزاری کی جائے۔ انٹرنیٹ کی مذکورہ سائٹس پر کئی ایسی تصاویر اور بیانات ہیں، جس سے مخصوص افراد اور فرقے کے لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اس کے برے انجام بھی سامنے آئیں گے۔ مخصوص واقعہ اور موجود شر پسند مواد کی روشنی میں وزیر مواصلات کپل سبل کہتے ہیں کہ اظہار خیال کی آزادی یا صحافتی آزادی میں مداخلت نہیں کی جا رہی ہے، مگر ایسے بیانات، جو شر انگیز ہوتے ہیں ان پر پابندی لگانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں سبل نے سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کو متنبہ

کر دیا ہے کہ یا تو وہ خود ہی اشتعال انگیز مواد پر پابندی عائد کر دیں بصورت دیگر حکومت اس ضمن میں اقدام کرے گی۔

اظہار خیال یا منافرت پھیلانے کی سازش؟

اظہار خیال ہی کا تعلق ہے کہ گزشتہ جولائی میں ممبئی بم دھماکے کے دو روز بعد سبرامنیم سوامی نے ایک انگریزی اخبار میں لکھے گئے اپنے کالم میں اس کے لیے مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ سبرامنیم سوامی کے اس مذکورہ مضمون کا عنوان تھا" ہاؤ ٹو وائپ آؤٹ اسلامک ٹیرز "یعنی اسلامک دہشت گردی کو کیسے ختم کیا جائے۔ یہ مضمون انگریزی اخبار ڈی این اے میں شائع ہوا تھا۔ سبرامنیم نے اپنے کالم میں لکھا تھا کہ دہشت گردانہ کاروائیوں سے نمٹنے کے لیے ہندوؤں کو متحد ہو کر جواب دینا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو مسلمانوں کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دیا جانا چاہیے۔اپنے مضمون میں سوامی نے لکھا تھا کہ مندروں کی جگہ بنی تمام مساجد کو منہدم کر دینا چاہیے اور اس بات کی وکالت کی تھی کہ جو لوگ اپنے آباؤ اجداد کو ہندو نہیں مانتے انہیں بھی ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دینا چاہیے۔ سبرامنیم سوامی نے اس موقف کی بھی وکالت کی تھی کہ ہندوستان میں اسلامی دہشت گردی قومی سلامتی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ سبرامنیم سوامی امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں اقتصادیات کے ماہر کی حیثیت سے درس دیتے آتے ہیں۔ان کے اس مضمون کے بعد ہارورڈ کی پروفیسر

ڈائنااک کہتی ہیں کہ "سبرامنیم سوامی نے ایک خاص مذہب کے تمام افراد کو نیچا دکھا کر ان کی عبادت گاہوں پر حملے کی وکالت کرکے ہر طرح کی حدیں پار کردی ہیں۔ لہٰذا یونیورسٹی کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا رشتہ کسی بھی ایسے فرد سے نا جوڑے جو کسی بھی اقلیتی طبقے کے خلاف نفرت پھیلانے کا کام کرتا ہو"۔ بیشتر اساتذہ اور یونیورسٹی اسٹاف نے اس فیصلے کی حمایت کی اور آخر کار متعصبانہ ذہنیت کی عکاسی کرنے والے آرٹیکل کی پاداش میں سوامی کے ذریعے پڑھائے جانے والے 'کورسیس' کو ختم کردیا گیا ساتھ ہی اِن کے ۲ مضامین کو بھی ہٹا دیا گیا۔

!توجہ طلب

توجہ طلب پہلو ہے کہ یہ منافرت کہاں سے پیدا ہوئی؟ کون لوگ ہیں جو اس کو ہوا دے رہے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ملک میں امن و سکون کا ماحول ختم کر دیا جائے؟ توجہ طلب پہلو یہ بھی ہے کہ یہ لوگ جو سیاست کی کمان سنبھالے ہوئے ہیں اور مختلف پارٹیوں میں سرکردہ حیثیت رکھتے ہیں اگر وہ اپنے قلم یا زبان سے منافرت پھیلاتے پھریں تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ امن و امان کے قیام میں کوئی کردار ادا کر سکیں گے؟ اور توجہ طلب پہلو یہ بھی ہے کہ ان منافرت کے پرستاروں کو سیاسی میدان میں کون مات دے گا؟ یعنی وہ کون لوگ ہوں گے جو منافرت کے خلاف ووٹ دینے سے لے کر ووٹ مانگنے تک میں اتحاد کا

مظاہرہ کر سکیں گے؟ کیا یہ ووٹ بینک کی سیاست رنگ، نسل، ذات اور مذہب کی ہی بنیادوں پر ہوتی رہے گی؟ یا اس کا متبادل بھی سامنے آئے گا۔ یہ صحیح ہے کہ تمام ہی سیاسی پارٹیاں اور سیاسی لیڈر انتخابات کے دنوں میں آپسی بھائی چارے اور فرد و ریاست کی فلاح و بہبود کی بات کرتے ہیں لیکن جب وعدے پورے کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اقتدار میں وہ کن بنیادوں پر آئے تھے۔ آج وطن عزیز میں چند مقامات سے مسلم قیادت بھی ابھر رہی ہے لیکن اس قیادت کو موجودہ گمراہ کن سیاست سے اپنے آپ کو الگ رکھنا ہوگا تبھی ممکن ہے کہ وہ سیاسی میدان میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ کیونکہ جذبات عام طور پر وقتی ہوتے ہیں لیکن فکر و عمل میں ہم آہنگی بہت دور رس نتائج اخذ کرتے ہیں۔

ڈواڈ اینڈ رُول

ہندوستانی سماج اور ہندوستانی معاشرہ آزادی سے قبل " لڑاؤ اور راج کرو" کی پالیسی سے نبرد آزمارہا ہے۔اس کے باوجود ہند میں ہندؤں اور مسلمانوں نے اتحاد و یگانگت کی زندہ مثالیں قائم کرکے تخریب کاروں کے ناپاک عزائم کو ناکام بنادیا ۔یہی وجہ تھی کہ انگریز اپنی تمام تر عیاریوں، مکاریوں اور دھوکہ دہی کے باوجود کامیاب نہیں ہوسکے اور آخرکار وہ ذلیل و خوار ہوکر ملک سے دربدر کئے گئے۔یہ سلسلہ نہ کل بند ہوا تھااور نہ ہی آج بلکہ تخریب کاروں کی ہمیشہ اور ہر دور میں یہی کوشش رہی ہے کہ وہ جذباتیت کو فروغ دے کر لوگوں کو اکسائیں،دو فرقوں اور دو گھرانوں کے درمیان نفرت کی خلیج قائم کریں اوران نامناسب بنیادوں پر دوریاں پیدا کردیں۔یہ حقیت ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے آنے والے انسان آدمؑ تھے لہٰذا ایک ماں باپ کی اولاد کو اکسانے والے اکساتے رہیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے جوالفت و محبت دو بھائیوں کے درمیان پیدا کردی ہے اس کو ئی ختم نہیں کر سکتا۔ہاں یہ کہ وہ خود ہی ایک دوسرے کے درمیان دوریاں رکھنا چاہیں۔

چند مثالیں تاریخ کے صفحات سے !

تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام اس ملک میں پہلی صدی کے آخر میں خشکی کے راستہ سے

سندھ تک اور کچھ دنوں بعد کیرل اور کوکن کے ساحلی علاقوں تک پہنچا تھا۔ ہندوستان میں دیگر مذاہب کے اختیار کرنے والوں نے اسلام کو جس قدر مقبول عام بنایا یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے۔ یہ وہ مذہب ہے جس کو ہندوستان کی ہر برادری نے کم و بیش قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج گوجر، راجپوت، جاٹ، ٹھاکر، برھمن، لالہ، تیاگی اور بے شمار فرقوں و برادریوں میں ہندوستان کے ہر شہر و قصبہ اور گاؤں میں مسلمان موجود ہیں۔ اور یہ بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ مذہب کا یہ اختلاف رہن سہن میں تفریق کا باعث نہیں بنا بلکہ اختلاف مذاہب کے باوجود ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے اسی طرح جس طرح ایک گھر کے دو بھائی غم اور خوشی کے مواقع پر ایک دوسرے کی مزاج پرسی کرتے ہیں۔ اگر یہ بات کہی جائے کہ یہ پیار و محبت کا رشتہ ہندوستانی قوم کے رگ وریشہ میں پیوست تھا اور ہر سطح پر پایا جاتا تھا تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا، کیونکہ ہمیں ہندو مسلم راجاؤں اور بادشاہوں کی حکومتوں میں بھی انتہائی حساس عہدوں پر بلا تفریق مذہب ہندو مسلم دونوں ملتے ہیں۔ ہندوستان کبھی بھی سیاسی اور ملکی معاملات میں ہندو مسلم تفریق وامتیاز کا قائل نہیں ہوا۔ اس کی حکومتیں خواہ مسلم حاکم کے زیر اثر رہی ہوں یا ہندو فرمانرواؤں کے وہ کبھی افتراق وامتیاز سے آشنا نہیں ہوئیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسے کٹر مذہبی راجہ کی وزارت میں ہندو اور سکھوں کی طرح مسلمان شریک تھے۔ پیرزادہ عزیز الدین وزیر تھے اور الٰہی بخش توپخانہ کے سردار تھے، مرہٹوں کے

توپخانہ کا اعلیٰ افسر ابراہیم کردی تھا۔ اکبر بادشاہ کی قوم پرستی کسی تحریر اور تفصیل کی محتاج نہیں۔ جہانگیر بادشاہ کا عدل و مساوات بھی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے اس کے توپخانہ کے افسر اعلیٰ راجہ بکرماجیت تھے جن کے ماتحت پچاس ہزار توپچی اور تین ہزار توپیں رہتی تھیں۔ اورنگزیب عالمگیر کو کٹر مذہبی کہا جاتا ہے مگر جب اس سے کہا گیا کہ حکومت کا منصب کسی غیر مسلم کو سپرد نہ کیا جائے تو اس نے نہایت تعجب اور حیرت سے اس اعتراض کو سنا اور بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ دنیا کے انتظامی امور میں منصب کا مدار قابلیت ہوتی ہے مذہب کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اس کے بڑے بڑے منصب داروں میں ساہو پسر راجہ سبتا، جے سنگھ، جسونت سنگھ، سیواجی کے
داماد راجندر جی اور ان کے علاوہ بڑے بڑے راجپوت اور ہندو تھے جن کی تعداد بقول منشی کیول رام بٹالوی سو سے زیادہ تھی۔ اور حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ نے اپنے توپخانہ کا افسر راجہ رام راجپوت کو بنایا۔ لارڈ ولیم بینٹنگ نے ۲۸۸۱ء کی تقریر میں، ڈبلیو ایم ٹارنس نے اپنی کتاب "ایشیاء میں شہنشاہیت" سربی رام آف بنگال نے اپنی تصنیفات میں اور پنڈت سندر لال آف الہ آباد نے اپنی کتاب" بھارت میں انگریزی راج" میں ایسی بہت سی مثالیں اور نظیریں پیش کی ہیں جن سے ہندو مسلمانوں کے باہمی بہتر تعلقات اور آپس کے اعتماد پر روشنی پڑتی ہے واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے حکمراں ہمیشہ اس اصول کے حامی رہے کہ ملاؤ اور حکومت کرو۔ حتی کہ سلطنت مغلیہ کے بانی بابر بادشاہ نے اپنے بیٹے ہمایوں کو

وصیت کی تھی۔اے بیٹے ہندوستان مختلف مذاہب سے پر ہے۔الحمد للہ کہ اس نے اس کی بادشاہت تمہیں عطا فرمائی تمہیں چاہیۓ کہ تمام تعصبات مذہبی کو لوح دل سے دھوڈالو۔اور عدل وانصاف کرنے میں ہر مذہب وملت کے طریق کا لحاظ رکھو۔جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہیں کر سکتے۔

:انتخابی میدان میں تخریبی پالیسی کے علمبردار

حالیہ دنوں میں ہونے والے چند واقعات ایک مخصوص نظریۂ اور فکر سے تعلق رکھنے والوں کے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ تخریبی پالیسی ہی کارگر ہو سکتی ہے۔شاید اسی لیے وہ اس طریقہ کار کواختیار کرتے ہیں جس سے امن واماں ختم ہو، ناچاقی پیدا ہو، نفرت و کدورت عام ہو اور وہ اس طرح کامیاب ہو جائیں۔ذیل میں تین واقعات درج کیۓ جا رہے ہیں جن کی بنیاد تفرقہ و تخریب کاری ہے۔

:سبرامنیم سوامی کا نفرت آمیز مضمون

گزشتہ جولائی میں ممبئ بم دھماکے کے دو روز بعد سبرامنیم سوامی نے ایک انگریزی اخبار میں لکھے گئے اپنے ایک کالم میں اس کے لیے مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔سبرامنیم سوامی کے اس مذکورہ مضمون کا عنوان تھا 'ہاؤ ٹو وائپ آؤٹ اسلامک ٹیرر' یعنی اسلامک دہشت گردی کو کیسے ختم کیا جائے۔یہ مضمون انگریزی اخبار ڈی این اے میں شائع ہوا تھا۔سبرامنیم سوامی نے اپنے

کالم میں لکھا تھا کہ دہشتگردانہ کاروائیوں سے نمٹنے کے لیے ہندوؤں کو متحد ہو کر جواب دینا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو مسلمانوں کو ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دیا جانا چاہیے۔اپنے مضمون میں سوامی نے لکھا تھا کہ مندروں کی جگہ بنی تمام مساجد کو منہدم کر دینا چاہیے اور اس بات کی وکالت کی تھی کہ جو لوگ اپنے آباؤ اجداد کو ہندو نہیں مانتے انہیں بھی ووٹ دینے کے حق سے محروم کر دینا چاہیے۔سبرامنیم سوامی نے اس موقف کی بھی وکالت کی تھی کہ بھارت میں اسلامی دہشتگردی قومی سلامتی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ سوامی کی سوچ کو قابل مذمت قرار دیا گیا اور ان موضوعات کو یونیورسٹی کے نصاب سے ہٹانے کا فیصلہ کیا گیا۔

:پاکستان کا پرچم لہرانے پر گرفتاری

ہندوستان کی جنوبی ریاست کرناٹک میں پولیس نے ایک سرکاری عمارت پر پاکستان کا جھنڈا لہرانے کے الزام میں چھ افراد کو گرفتار کیا ہے جن کا تعلق ہندو قوم پرست تنظیم شری رام سینا سے بتایا گیا ہے۔پولیس کا دعویٰ ہے کہ ان لوگوں نے نئے سال کے موقع پر بیجاپور ضلع میں سندگی کے تحصیلدار کے دفتر پر پاکستان کا پرچم بلند کیا تھا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ مسلمانوں کا کام ہے اور علاقے میں مذہب کی بنیاد پر کشیدگی پیدا ہو جائے۔اخباری اطلاعات کے مطابق بیجاپور کے پولیس سربراہ ڈی سی راجپا نے گرفتاریوں کا اعلان کرتے

ہوئے کہا کہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ مذہبی کشیدگی سے ان کی تنظیم کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ شری رام سینا ایک قدامت پسند تنظیم ہے جو ملک کی تہذیب اور سماجی اقدار کے تحفظ کے نام پر نوجوانوں کو نشانہ بناتی رہی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ وہ کامیاب نہ ہوسکے اور آخرکار ان کے کارکن گرفتار ہوئے۔

:اُپینگڈی میں اشتعال انگیز بیان

منگلور سے قریب 45 میل دور اُپینگڈی میں ہندو سماج اُتسو میں آر ایس ایس لیڈر کلڈکا پربھاکر کے اشتعال انگیز بیان سے ماحول کشیدہ ہوگیا۔خطاب کے دوران مسلمانوں پر حملہ کرنے کی دھمکی دی اور ہندو نوجوانوں پر زور دیا کہ مسلم نوجوانوں پر گولیاں برسائیں۔ تقریر میں پربھاکر نے اسلامی شریعت اور اسلامی قوانین کا مذاق اڑایا اور ہندوؤں پر زور دیا کہ جیسے ہی کسی مسلم لڑکے کو کسی ہندو لڑکی کے ساتھ بات کرتا ہوا دیکھیں تو مسلم نوجوانوں پر فوری حملہ کریں۔مزید کہا کہ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایسے نوجوانوں کو ناقابل فراموش سبق سکھانا ہے،ہمیں معلوم ہے کہ ان مسلمانوں کو کس طرح سزا دینا چاہیے۔پربھاکر نے کہا کہ ہم مسلمانوں کو گولی مار دیں گے۔ کلڈکا پربھاکر نے دعویٰ کیا کہ وہ ہندو لڑکیوں کو لوجہاد کے نام پر پیار اور محبت کے چکر میں پھنسا کر مسلم نوجوان انہیں اپنے مذہب میں تبدیل کرتے ہیں، ایسا کرنے کے عوض انہیں باہر سے انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا

کہ اگر کشمیر کی لڑکی کو مسلمان بنایا جاتا ہے تو اس نوجوان کو 9 لاکھ روپے اور دیگر کے لیے پانچ پانچ لاکھ روپے انعام دیا جاتا ہے۔ نتیجتاً دو فرقوں کے درمیان کشیدگی بڑھائی گئی ، مسجد پر پتھراؤ کرایا گیا، 7 لوگ زخمی ہوئے اور بڑی تعداد میں نوجوانوں کو حوالات کے حوالہ کیا گیا اور کل ملا کر علاقے اور صوبے کے امن و امان کو برباد کیا گیا۔ فائدہ؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ شاید اس بہکاوے میں آ کر چند لوگ شر پسندوں کو اپنا ہم نوا سمجھنے لگیں۔ لیکن حقیقت جب آشکارا ہوگی اور یہ دعوے جھوٹے ثابت ہوں گے تو لازماً یہ شر پسند بھی ناکام ہی ٹھہریں گے۔

!پیار و محبت کے دیئے جلایئے

وہ خیال اور فکر جو تخریب پر مبنی ہو اور جس کا مقصد لوگوں کے دلوں اور تعلقات میں دوریاں پیدا کرنا ہو وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بس ضرورت ہے کہ افواہوں اور بے بنیاد باتوں اور حوالوں پر عوامی گرفت کی جائے۔ جو لوگ ملک میں امن و امان کے خواہاں ہیں ان کے درمیان اتحاد و الفت کا ماحول پروان چڑھے۔ جس طرح آگ کو آگ سے نہیں بجھایا جا سکتا ہے، اسی طرح خوب سمجھ لیجئے کہ فرقہ پرستی اور نفرت کو فرقہ پرستی اور نفرت سے نہیں مٹایا جا سکتا ہے۔ اگر اس ملک کو امن وامان اور صلح وآشتی کا گہوارہ بنانا ہے تو اپنی پرانی روایت کو پھر زندہ کرنا ہوگا اور پیار و محبت کے دئے جلانے ہوں گے یہ ایک جہد مسلسل

ہے۔ جو کٹھن ضرور ہے پر ناممکن ہرگز نہیں!

رُشد و ہدایت سے عاری

"پس یہ حقیقت ہے کہ جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ اسلام کا تصوّر کرتے ہی اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ حق سے فرار اور نفرت کی ناپاکی ان لوگوں پر مسلّط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے" (الانعام: 125)۔ سینہ کھول دینے سے مراد اسلام کی صداقت پر پوری طرح مطمئن کر دینا اور شکوک و شبہات اور تذبذب و تردّد کو دور کر دینا ہے۔ اس کے برخلاف وہ لوگ جن کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہو وہ حقیقت کو نہیں دیکھ پاتے اور سچائی ان پر واضح نہیں ہوتی اور اس کی وجہ بس ایک ہے کہ وہ خود سچائی کے حصول کے خواہاں نہیں ہوتے۔ وہ آنکھ رکھتے ہیں لیکن بے نور، دل رکھتے ہیں لیکن مردہ اور دماغ رکھتے ہیں لیکن غور و فکر کی صلاحیت سے عاری ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ قرآن اس انداز سے کرتا ہے۔ کہا کہ: " یہ لوگ جنھوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے ہیں ، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی" (البقرہ: ۱۷۱)۔

"یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے، یہ بجلی کے کڑاکے سن کے اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں اور اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی اِن کی بصارت اچک لے جائے گی۔ جب ذرا کچھ روشنی انہیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل سَلب کر لیتا، یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے " (البقرہ: ۱۹-۲۰) دین حق سے برگشتہ منافقین راہ سے بھٹک جانے والے ایک مسافر کی مانند ہیں۔ جو اندھیرے بیابان میں موسلادھار بارش میں گھرا، تیرہ و تار بادلوں کی شدید بارش، بجلی کی تڑک اور چمک اور بادلوں کی گرج اور کڑک سے خوف زدہ کانوں میں انگلیاں دئے کھڑا ہو کہ کہیں موت بجلی بنکر پیکر وجود کو بھسم نہ کردے بجلیاں چمکتی ہیں تو چند قدم آگے بڑھاتا ہے اور پھر اندھیرا پھیل جاتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ در اصل منافقین اپنے ظاہری ایمان کے سبب اسلامی معاشرے میں جب سیاسی اور معاشرتی ماحول سازگار ہو آرام و سکون کی زندگی گزارتے ہیں لیکن شک کا اندھیرا اور کفر و نفاق کی گرج اور چمک، سختیاں آتے ہی ان کے باطن کو جو کفر سے معمور ہے ظاہر و آشکار کردیتی اور ان کی تمام

قوت عمل کو سلب کرلیتی ہے چنانچہ اگر خدا چاہتا تو آغاز کار میں ہی ان کے نور کو چھین لیتا اور لباس اسلام پہننے سے پہلے ہی وہ معاشرے میں. برہنہ ہوجاتے مگر آزمائش کے لئے خدا نے کچھ دنوں کی مہلت دیدی اور انہیں اپنے اقتدار واختیار کے گھیرے میں لیکر آزاد چھوڑ دیا تاکہ ان کا باطن پوری طرح آشکار ہوجائے چنانچہ حق کی کرنیں راہ میں اجالے بکھیرتیں تو وہ چند قدم چل پڑتے لیکن نفاق کی ظلمتیں انہیں جلد ہی تاریکیوں میں ڈھکیل دیتی ہیں اور اسلامی معاشرے کی مشکلات کا خوف انہیں بہانے بنانے اور راہ سے بے راہ کردینے پر مجبور کردیتا ہے۔ پہلی مثال ان منافقین کی تھی جو دل میں قطعی منکر تھے اور کسی غرض و مصلحت سے مسلمان بن گئے تھے۔ اور یہ دوسری مثال ان کی ہے جو شک اور تذبذب اور ضعفِ ایمان میں مبتلا تھے، کچھ حق کے قائل بھی تھے، مگر ایسی حق پرستی کے قائل نہ تھے کہ اس کی خاطر تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھی. برداشت کر جائیں۔ اس مثال میں بارش سے مراد اسلام ہے جو انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا۔ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک سے مراد مشکلات و مصائب کا وہ، ہجوم اور وہ سخت مجاہدہ ہے جو تحریکِ اسلامی کے مقابلہ میں اہل جاہلیّت کی شدید مزاحمت کے سبب سے پیش آرہا تھا۔ مثال کے آخری حِصّہ میں ان منافقین کی اس کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا سہل ہوتا ہے تو یہ چل پڑتے ہیں ، اور جب مشکلات کے دَل بادَل چھانے لگتے ہیں، یا ایسے احکام دیے جاتے ہیں جن سے ان کے خواہشاتِ نفس اور ان کے تعصّباتِ جاہلیت

پر ضرب پڑتی ہے، تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

!ایک رُسوا کن انسان کی کہانی

1968 میں کیمبرج یونیورسٹی میں حصول تعلیم کے دوران سلمان رشدی بائیں بازو کی جماعت میں شمولیت اختیار کرلیتا ہے۔ انہی ایام میں اس میں شوق پیدا ہوتا ہے کہ کوئی آرٹسٹک کام کرے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ ایک چھوٹی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں نوکری کرلیتا ہے اور اسی دوران اپنا پہلا ناول لکھنا شروع کر دیتا ہے جو ایک مسلمان روحانی شخصیت سے متعلق تھا۔ تاہم وہ اسے پبلش کرانے میں ناکام ہوتا ہے۔ اسی طرح اسکی دوسری کتاب "گریموس کی کہانیوں کا مجموعہ" بھی خاص مقبولیت حاصل نہیں کرپاتی۔ وہ مایوس نہیں ہوتا۔ پانچ سال بعد 1981 میں اس نے اپنا ناول "آدھی رات کے بچے" پبلش کروایا۔ اس ناول نے برطانیہ کی مطبوعات کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ یہ ناول انڈیا کی آزادی کی کہانی ہے جو ایک مسلمان نوجوان کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ تاہم اس ناول میں بھی مسز اندرا گاندھی کو بیوہ خطاب کرنے اور اس وقت کی انڈین حکومت کو تنقید کا نشانہ بنائے جانے کی وجہ سے ہندوستان میں شدید اعتراض کا باعث بنا۔ اسی طرح رشدی نے 1983 میں اپنے ناول "Shame" میں بعض پاکستانی شخصیات پر تنقید کی تھی، خصوصا اس میں بے نظیر بھٹو کو غیر اخلاقی الفاظ سے یاد کیا تھا جس پر پاکستان میں اس پر پابندی لگا دی گئی۔

سلمان رشدی کی عادت رہی ہے کہ وہ شخصیات یا مذاہب و ادیان کی توہین کرکے شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ بالآخر اس لعین نے اپنی جوانی کی خفیہ اوصاف کو منظر پر لاتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی۔ 41 سال کی عمر میں رشدی نے اپنا ناول "شیطانی آیات" لکھ کر پانچ لاکھ برطانوی پاونڈ کی صورت میں ایک ارب مسلمانوں کی اذیت اور دل آزاری کا انعام وصول کیا۔

شیطانی آیات میں ایک من گھڑت اور ضعیف روایت کا حوالہ دے کر سرکار دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی گئی ہے۔ 547 صفحات پر مشتمل ناول "شیطانی آیات" سب سے پہلے انگریزی زبان میں 26 ستمبر 1988 کو پینگوئن پریس کے ایک شعبے "وائکنگ" نے شائع کیا۔ سلمان رشدی انڈین نژاد مسلمان ہے اور برطانوی شہریت کا حامل ہے۔ یہ ناول اسکی پانچویں تصنیف تھی۔ رشدی نے یہ ناول وائکنگ پریس کے یہودی سربراہ "گیلن ریٹیکن" کی سفارش پر 5 لاکھ 80 ہزار برطانوی پاونڈ کے عوض لکھا۔ اتنی پُرخرچ اور مہنگی کتاب کی کوئی مثال اس سے پہلے موجود نہیں۔ شروع ہی میں میڈیا کی زبردست توجہ کا مرکز بن گئی اور بہت سے ممالک میں بڑی تعداد میں اس کے نئے نئے ایڈیشن شائع ہوئے۔ آہستہ آہستہ اس کتاب کے انتشار پر مسلمانوں کی صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ بریڈ فورڈ کے شہر میں کچھ مسلمانوں نے اس کتاب کے سینکڑوں نسخے جلا ڈالے۔ پاکستان اور بھارت سمیت تمام مسلمان ممالک میں مسلمانوں نے مظاہروں کی صورت میں اپنے غم و غصے کا اظہار کیا جن میں کئی

افراد شہید بھی ہوئے۔ آخر کار 14 فروری 1989 کو امام خمینی رحم اللہ علیہ نے سلمان رشدی کے ارتداد کا تاریخی فتویٰ صادر کرکے اسے واجب القتل قرار دیا جس نے اسکی آسودہ زندگی کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ امام خمینیؒ کے فتوی کے بعد کے ایام سے متعلق اپنی یادداشتوں میں رشدی لکھتا ہے: "بار بار اپنی رہائش گاہ کو تبدیل کرنا پڑتا ہے"۔ امام خمینیؒ کے فتوے کے نتیجے میں برطانوی پولیس اسکی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے، یہ صورتحال بالآخر اس کی بیوی کی طلاق کا باعث بن جاتی ہے۔ واضح رہے کہ ابھی تک چار بیویاں اس سے طلاق لے چکی ہیں۔ امام خمینیؒ کے فتویٰ کے فورا بعد رشدی روپوش ہو گیا اور برطانوی پولیس نے نامعلوم مقامات پر اسکی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اسکی حفاظت کا سالانہ تخمینہ تقریباً ایک کروڑ پونڈ لگایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ شہزادہ چارلس نے ایک مرتبہ کہا: "سلمان رشدی برطانوی ٹیکس دھندگان کیلئے ایک غیر معمولی بوجھ بن چکا ہے"۔ برطانوی ہوائی سروس "برٹش ایئرویز" نے 1998 تک اپنے جہازوں میں سلمان رشدی کے سفر پر پابندی لگائی ہوئی تھی۔ اسی طرح "کینیڈا ایئر لائنز" نے چند سال پہلے اپنی کمپنی میں رشدی کے سفر کو ممنوع قرار دیا تھا۔ رشدی نے عالم اسلام کے غم وغصے کے باوجود اپنی کفر آمیز کتاب کی مزید اشاعت جاری رکھی۔ جب برطانوی حکومت اس کتاب کے سستے ایڈیشن کو پبلش کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی تو رشدی نے اسے امریکہ لے جا کر اسے سستی قیمت پر پبلش کروایا۔ اس نے اپنی تازہ کتابوں میں سے ایک میں اپنی ذلت آمیز زندگی کے کافی پہلوؤں

کو اجاگر کیا ہے۔ اٹلی کے مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی کتاب کے اٹالین مترجم کے زخمی ہونے، جاپانی مسلمانوں کے ہاتھوں اس کتاب کے جاپانی مترجم کی ہلاکت اور ناروے کے ناشر پر حملے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ ملعون کچھ یوں لکھتا ہے: "جس دن ناروے کا ناشر گولیوں کا نشانہ بنا وہ میری زندگی کا بدترین دن تھا"۔ تنہائی کے ان ایام میں اس نے صرف 20 دنوں میں 13 مرتبہ اپنا ٹھکانہ تبدیل کیا۔ اسکی زندگی کی فضا کچھ اس طرح ہو چکی ہے کہ اپنی بیوی نے بھی اسے چھوڑ دیا اور اخباروں میں اسے بزدل کے نام سے موسوم کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ برطانیہ میں موجود صورتحال سے بچنے کی خاطر چند سال بعد رشدی نے امریکہ کی طرف فرار اختیار کیا۔ تاہم وہاں بھی مسلمانوں کے انتقام کے خوف سے امریکی پولیس کا سہارا لینے پر مجبور ہے تاہم یہ گستاخ اس دنیا میں سزا سے اگر بچ بھی جائے، کم از کم جہنم اس کے انتظار میں تو ہے ہی۔

!رُشد و ہدایت سے عاری

درج بالا کہانی میں جس رسوا کن انسان کا تذکرہ کیا گیا ہے اُس اور اُس جیسے لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ: "جن لوگوں کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ اس سے بھی زیادہ بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا ہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا

کرتا" (الجمعۃ: ۵)۔ یعنی جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوں اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اسی طرح یہ توراۃ کو اپنے اوپر لادے ہوئے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ کتاب کس لیے آئی ہے اور ان سے کیا چاہتی ہے۔ پھر کہا کہ ان کا حال گدھے سے بھی بد تر ہے وہ تو سمجھ بوجھ نہیں رکھتا اس لیے معذور ہے۔ مگر یہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ توراۃ کو پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ اس کے معنی سے ناواقف نہیں ہیں۔ پھر بھی یہ اس کی ہدایات سے دانستہ انحراف کر رہے ہیں، اور اس نبی کو ماننے سے قصداً انکار کر رہے ہیں جو تورۃ کی رو سے سراسر حق پر ہے۔ یہ نافہمی کے قصور وار نہیں ہیں بلکہ جان بوجھ کر اللہ کی آیات کو جھٹلانے کے مجرم ہیں۔ پس یہی حال ہے آج ان بد کردار لوگوں کا بھی جو اسلامی نام رکھنے کے باجود اسلام اور اس کی بنیادی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ پھر ان کے دل اس قدر سخت ہو چکے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ یہ اللہ کی رسی ہے جس کو وہ دراز کیے جارہا ہے، وہ چاہے تو ان کی تمام قوت عمل سلب کرلے اور یہ کہیں کے بھی نہ رہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو رشد و ہدایت سے عاری ٹھہرے، جو تمام تر صلاحیتیں حاصل کرنے کے باوجود رسوا اور ذلیل و خوار ہوئے اور جن کی دنیا و عاقبت برباد ہو چکی ہے۔ پھر اگر ان ناعاقبت اندیشوں کی کوئی طرف داری کرے تو وہ کیا کہلائے گا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مثالی کردار

اللہ تعالیٰ نے انسانی کردار کے دونوں رُخ قرآن حکیم میں بیان فرما دیے ہیں۔ ایک رخ، بد کردار لوگوں کا اور دوسرا نیک کردار لوگوں کا۔ بد کردار لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی تعلیمات کو بھلا کر شیطان کو اپنا رب مانتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اس لیے آخرت میں شیطان اور وہ ایک دوسرے کے شریک ہوں گے اور ایک ساتھ جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ متوجہ کرتا ہے، سمجھاتا ہے اور ڈراتا ہے کہ: "اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا، یہی لوگ فاسق ہیں" (الحشر: 19)۔ بد کردار لوگوں کے مقابلے میں قرآن نیک صفت انسانوں اور ان کی اجتماعیت کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ کہا کہ: "البتہ جو لوگ تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر لیں، ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا" (النسائ: 164)۔ اس آیت کریمہ میں نیک صفت لوگوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے وہ کسی بھی لمحہ غفلت کا شکار نہیں ہوتے، وہ اللہ کو ہر معاملے میں یاد رکھتے ہیں۔ اس کی ہدایت کی روشنی میں اپنی زندگی کے روز و شب گزارتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو فوراً اللہ

کی جانب پلٹتے ہیں ۔ توبہ واستغفار کرتے ہیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں ۔اس لیے ایسے لوگوں سے اللہ رب العزت راضی ہوتا ہے اور ان کو اپنے انعمات سے نوازتا ہے۔

: عملی نمونہ کی ضرورت

کسی بات پر عمل کرنے کے لیے پہلی ضرورت علم کی ہوتی ہے اور دوسری عمل کی ۔ علم کے ذرائع محفوظ شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں اور عمل کرتے ہوئے افراد بھی اللہ کے فضل سے ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں۔یہی وہ دونوں چیزیں ہیں جن کی ہر زمانے اور ہر مقام پر اشد ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور اگر یہ دونوں چیزیں موجود ہوں تو انسان میں عمل کی تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ایک آئیڈیل انسان کی ہر محاذ پر ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اگر یہ عملی نمونہ موجود نہ ہو تو ہر انسان اپنی عقل کے مطابق عمل کے میدان میں اتر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مختلف انسان مختلف راہیں طے کرتے ہوئے درمیان میں بہت سی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے نہ وہ خود اپنے لیے اور نہ ہی دوسروں کے لیے مثالی کردار بن پاتے ہیں۔اس لیے لازمی ہوا کہ کوئی ہستی ایسی ضرور ہونی چاہیے جو علم اور عمل دونوں میں اپنی مخصوص حیثیت رکھتی ہو۔اس ضرورت کے پیش نظر انسانوں کو بنانے والے اللہ نے خود ہی اس کا مکمل انتظام بھی فرما دیا ہے۔ اللہ نے نبیوں اور رسولوں کے سلسلے کو جاری کیا اور ان کو راست علم سے

نوازا اور عمل کی توفیق دی تاکہ یہ شخصیات دنیا کے لیے نمونہ بن سکیں۔ نبیوں کے سلسلے کو ختم کرتے ہوئے آخری رسول محمد کو دنیا میں بھیجا جو قیامت تک انسانوں کے لیے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر محاظ پر مثال اور نمونہ رہیں گے۔ کہا کہ: "مومنو! اللہ کا ارشاد مانو اور پیغمبر کی فرمانبرداری کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو" (محمد: ۳۳) ۔یہاں پہلی بات اللہ کے واضح احکامات پر عمل کرنا ہے اور دوسری بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ ہے۔ان دونوں احکامات پر عمل کا نتیجہ میں ہم کسی بھی طرح کے نقصان میں مبتلا نہیں ہوں گے ۔اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہوگا اور آخرت میں کامیابی و سرخروئی ہمارا مقدر ہوگی ۔

: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت نمونہ

انبیا کرام اور پیغمبران اسلام کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد تکمیل اخلاق تھا۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پہلا مقصد ہے کہ انسان صرف اللہ کی بندگی کرے اور دوسرا یہ کے وہ اعلیٰ اخلاق پر فائز ہوجائے تاکہ وہ اپنے رب کو جانے،مانے،تصدیق کرے اور عمل کرتے ہوئے دنیا میں امن وسکون برقرار رکھے۔اور اگر کسی مقام پر ایسا نہ ہو تو اِن مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کی جائے۔ یہ جدوجہد انفرادی اور اجتماعی دونوں محاذ پر ہونی چاہیے اور اس سلسلے میں عملی نمونہ کے لیے نبی امّی محمد کو دیکھنا چاہئے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے کہ : وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ (القلم : ۴)۔ "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو"۔ اس آیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بلند اخلاق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت شخصیت تھی کہ جس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ متوازن تھا۔ لہٰذا ایک متوازن ذہن کی پیروی کرنا ہمارے لیے بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اور ایسے ہی انسان کی پیروی بھی کرنی چاہیے جس کا دماغ صحیح ہو، جس کی فطرت صالح ہو اور جس کا مزاج معتدل ہو۔ ہمارے لیے وہ حضرات بھی قابل نمونہ ہیں جن کو اصحاب رسول کا شرف ملا اور ہمارے وہ علماء اور امراء بھی قابل نمونہ ہیں جو اسلام پر عمل پیرا رہنے والے ہیں۔ کیونکہ یہ تمام لوگ نبی کی ذات پر خود عمل پیرا رہنے والے ہوں گے لہٰذا ہمارے لیے ان کی پیروی کرنا آسان ہو جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بہترین تعریف حضرت عائشہؓ نے اپنے اِس قول میں فرمائی ہے کہ :کان خلقه القرآن۔ "قرآن آپ کا اخلاق تھا"۔ (امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ابن ماجہ، دارمی) ۔ اور اسی بات کو اللہ تعالیٰ اس طرح ارشاد فرماتا ہے کہ: وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ (القلم : ۴) "اور اخلاق تمہارے بہت (عالی) ہیں"۔ معنی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی تھی بلکہ خود اس کا مجسم نمونہ بن کر دکھا دیا تھا اور آپ کی زندگی ہر اس شخص کے لیے نمونہ ہے جو اخلاق کے اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کی خواہش رکھتا ہو۔

: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گھریلوزندگی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے اس لحاظ سے بھی قابل اہم ہے کہ آپ ہمارے قائد، رہنما، رہبراور نبی ہیں۔آپ کی زندگی ہماری اجتماعی زندگی کے لیے بھی بہت اہم ہے۔جب ہم اس لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا مطالع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی گھریلوزندگی میں امہات المونین کے ساتھ حسن سلوک، ان کی تربیت ،ان سے محبت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرتے، بچوں سے بے انتہا محبت کرتے اور فرماتے کہ "بچے جنت کے پھول ہیں"۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "حضور نے اپنے دست مبارک سے اللہ تعالی کے راستہ میں جہادکے علاوہ کبھی کسی کو نہیں مارا۔نہ کبھی کسی خادم کو نہ کسی عورت کو (بیوی یا باندی وغیرہ) کو"۔یہ اس طرح کے بے شمارتذکرے ہمیں سیرت اور احادیث کی کتابوں میں مل جائیں گی۔ جن سے ہمیں راہنمائی بھی ملتی ہے، حوصلہ بھی اور شوق بھی ۔ہماری اجتماعی زندگی کا وہ حصہ جس کو ہم گھر کہتے ہیں، جہاں ماں ، باپ، بیوی بچے، بھائی بہن اور دیگر رشتہ دار ہوا کرتے ہیں ۔ان کے ساتھ کس طرح سے پیش آئیں اور ان کے ساتھ کون سے رویہ اور طریقہ کواختیار کریں اس کی مکمل وضاحت ایک طرف اللہ تعالی خود اپنے قرآنِ الحکیم میں فرماتا ہے اور دوسری جانب رسول کا اسوہ ہمارے لیے راہنمائی اور راہبری کا کام کرتا ہے۔ ہمیں اس جانب غفلت نہ برتتے ہوئے ، شعوری اور سنجیدہ زندگی

گزارنی چاہیے تاکہ جب ہم قیامت میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں تو کوئی اٹھنے والا ہاتھ ایسا نہ ہو جو ہماری جانب ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں کا اشارہ کرے اور اللہ کا غضب ہم پر نازل ہو۔ ہمیں ہر لمحہ اُس بڑے دن سے ڈرتے رہنا چاہیے، یہی ہماری کامیابی کا لازمی تقاضہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معاشرتی زندگی :

ہم جانتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی، اور نہ ہی کبھی کسی کے حق میں بد دعا کی۔ بہت سے واقعات آپ کی زندگی سے وابستہ ہیں جہاں لوگوں نے آپ کو تکلیفیں پہنچائیں لیکن آپ نے ہمیشہ ان لوگوں کو معاف کر دیا اور یہی تعلیم آپ نے اپنے اصحابؓ کو بھی دی۔ پڑوسیوں کے حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ کہتی ہیں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم نے فرمایا: "جبریلِ ہمیشہ مجھ کو ہمسایہ پڑوسی) کا حق ادا کرنے کی ہدایت کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ میں نے یہ خیال قائم) کر لیا کہ جبریلِ امین پڑوسی کو وارث قرار دیں گے" (یعنی ایک ہمسایہ کو دوسرے ہمسایہ کا وارث بنا دیں گے) (بخاری و مسلم)۔ اسی طرح لوگوں کی عزت احترام کے سلسلے میں فرمایا: "کبیرہ گناہوں میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی اپنے والدین کو گالی دے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے۔ آپنے فرمایا ہاں جب یہ کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا

ہے اور یہ کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے" (جامع ترمذی) ۔لوگوں سے ہمدردی کے تعلق سے اللہ کے رسول فرماتے ہیں : "جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا" (جامع ترمذی)۔اللہ تعالی قرآن حکیم میں فرماتا ہے: "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں" (البقرہ: 177)۔ اس آیت کریمہ میں ایک مہذب معاشرہ کی مکمل تصویر پیش کر دی گئی ہے۔بتایا گیا ہے کہ معاشرہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر کون سے کام لازم ہیں اور کس طرح وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے لوگوں کے لیے خیر ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کی بات ہے، اللہ کے حقوق یعنی عبادت کا تذکرہ ہے، لوگوں کے ساتھ معاملات اور معاہدوں کو بھی بہ خوبی ادا کرنے کی بات ہے۔اس طرح کی بے شمار ہدایات واحکامات قرآن و حدیث میں موجود ہیں ان احکامات پر عمل کرنے کے نتیجہ میں صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

:مثالی کردار کے اختیار کا نتیجہ

یہ بات عقل سے بعید تر ہے کہ جس چیز کی ہم خواہش کریں اس کو اپنی ذات کے لیے پسند نہ کریں۔ اسلامی بنیادوں پر استوار معاشرہ کی خواہش جب ہم اپنے دل میں رکھتے ہیں تو اس کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اختیار کرنے کے لیے بھی ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ حالات سازگار نہ ہوں تو اس کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔اس خواہش کو رکھنے والے،اس پر عمل کرنے والے اور اس کے لیے جدوجہد کرنے والے، یہ تمام ہی وہ لوگ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہوا اور اس نے دنیا ہی میں ایسے لوگوں کو جنت کی بشارت ان الفاظ کے ساتھ دے دی کہ: "اور یہ جنت جس کے تم مالک کر دیے گئے ہو تمہارے اعمال کا صلہ ہے" (الزخرف: 72)۔ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ خوش ہوگا جو دنیا میں اخلاق کے اعلیٰ معیار پر تھے ساتھ ہی وہ اہل ایمان تھے اور جنھوں نے مومن و مسلم بندے بن کر زندگی گزاری تو ایسے لوگوں کے لیے بشارت ہے اور یہی لوگ جنت کے وارث ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ زندگی میں انجام دیا جانے والا ہر چھوٹا اور بڑا عمل جب کہ تم نے کرنے کا ارادہ کیا، قبل اُس کے،اس بڑے دن کی ہولناکی اور سختی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے جس دن نہ کوئی باپ ہوگا اور نہ کوئی ماں جو

اپنی ماماتا کو یاد رکھ سکے گی۔ وہ دن بڑا ہی زبردست ہوگا جب کہ دیدہ پھٹے جا رہے ہوں گے۔ جو کچھ یہ انسان دنیا سے کما کر لے گیا وہی اس کا کل سرمایہ حیات ہوگا بس وہی اس کے کام آئے گا۔ اس بات کو بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اعمال کا دارومدار عقیدہ کی پختگی اور اخلاق کی برتری پر منحصر ہے۔ اس لیے ہمارے سارے اعمال اُس دن اِن ہی دو چیزوں کے تحت پیش کیے جائیں گے۔ اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ "اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا۔ اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہوگا" (البقرة:281)۔ وہاں جو کچھ ہم کما کر لے جائیں گے اس کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا چاہے وہ اعمال صالحہ ہوں یا پھر اعمالِ رذیلہ۔ اللہ کی عدالت ہیں ذرہ برابر بھی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ قرآن کہتا ہے: "انہیں المناک عذابوں کی خوشخبری سنا دو۔ ہاں ایمان والوں اور نیک اعمال والوں کے بے شمار اور نہ ختم ہونے والا اجر ہے" (الانشقاق: 24-25)۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اخلاق و کردار میں سدھار پیدا کریں اور دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنے والوں میں شمار ہو جائیں۔ اس کے لیے ہمیں ایک طرف نماز سے مدد لینی ہوگی اور دوسری طرف صبر سے۔ نماز ہمارے اندر مستقل مزاجی پیدا کرنے اور فحش اور معصیت کے کاموں سے بچنے میں مدد کرے گی۔ اور صبر ہمارے اندر منزلِ مقصود تک پہنچنے میں تعاون کرے گا۔ اور ہم دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں گے (انشاءاللہ)۔

! لیڈرانِ قوم: فحش و بد

ملک کی ترقی ہو یا معاشرہ کی اصلاح ہر محاذ پر قوم کا راہنما اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن اگر راہنما یا قائد وعدہ خلاف ہو، بد فعل اور بد معاش ہو، بد کرداری اور اخلاقی زوال میں مبتلا ہو، تو اُس معاشرہ اور ملک کی ترقی و اصلاح رک جائے گی۔ نہ صرف ترقی و اصلاح رک جائے گی بلکہ ملک و معاشرہ تنزلی، پستی و انحاط کا شکار ہوگا۔ پس یہی صورتحال اس وقت ملک عزیز ہند میں اخلاقی زوال کی ہے جو اپنے عروج پر آچکا ہے ۔ اس اخلاقی زوال کے مختلف پہلوؤ ں پر سوچنے اور غور وفکر کرنے والے افراد آواز اٹھا رہے ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ یہ زوال و تنزلی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں کرناٹک کے وزیر اعلیٰ یدو رپا کے خلاف آوازیں اٹھنا بند ہی ہوئیں تھیں کہ اب اسی ریاست کے وزرا اسمبلی میں فحش فلم دیکھنے کے مرتکب ٹھہرے۔ ان وزراء کے نام لکشمن سوادی، سی سی پاٹل اور کرشنا پالیمار ہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ جب فحش فلم دیکھنے والے وزراء کے استعفے حاصل کرنے کے بعد ان کو رکنیت سے نا اہل قرار دینے کی اپوزیشن نے بات کہی تو ان کے مطالبہ کو مسترد کر دیا گیا اور اپنی ساکھ بچانے کے لیے اپوزیشن پارٹیوں کو اس معاملہ پر 146 اور ضابطہ 363 کے تحت بحث کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ بعد میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں بی جے پی، کانگریس اور جے ڈی ایس کے دو

دو اراکین رہیں گے۔ یہ 6 رکنی کمیٹی 12 مارچ تک اسمبلی میں رپورٹ پیش کرے گی۔ اسمبلی سے باہر سدارامیا نے نامہ نگاروں سے کہا کہ اپوزیشن کو بحث کا موقع نہ دینا یہ ثابت کرتا ہے کہ حکومت ایوان میں فحش فلم دیکھنے والے وزرا کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ اس طرح کی حکومت کو اقتدار میں رہنے کا اخلاقی حق حاصل نہیں ہے۔ اس لیے داغ دار وزیر کو اسمبلی کی رکنیت سے نااہل قرار دیا جائے۔ ماہرین قانون کا کہنا ہے کہ وزراءکے قصور وار پائے جانے پر 3 سال کی قید اور 5 لاکھ کا جرمانہ ہو سکتا ہے کیونکہ اسمبلی کے اندر فحش فلم دیکھنا جرم ہے۔

اخلاقی پستی کل بھی تھی:

یہ اخلاقی پستی جس کا تذکرہ کیا جا رہا ہے اور جس کی وجہ سے معاشرہ کھوکھلا ہوا جا رہا ہے ایسا نہیں ہے کہ یہ آج کی دین ہو اور کل کے لوگ اس سے محفوظ رہے ہوں بلکہ یہ، اخلاقی زوال کل بھی تھا اسی لیے خالقِ انسانیت نے قرآن حکیم میں مختلف قوموں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان میں کون کون سی کمیاں اور برائیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ ہلاکت کی شکار ہوئیں۔ کہا کہ: "اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا، پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسے بے حیا ہوگئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ (الاعراف: 80)۔ مزید کہا کہ: "اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان

کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادرانِ قوم، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے ربّ کی صاف رہنمائی آ گئی ہے، لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو" (الاعراف: 85) ۔قرآن نے بہت تفصیل کے ساتھ ان برائیوں کی جانب توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ یہ وہ ذلت بھرے کام ہیں جن کو اختیار کرنے سے فی زمانہ ناکامی ہی ٹھہرے گی لیکن اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ برائیاں ان لوگوں میں بھی بڑھ رہی ہیں جو قرآن کے قاری ہیں اور ان میں تو بڑھتی ہی جارہی ہیں جو قرآن پر یقین نہیں رکھتے۔آج

ہندوستان میں ہر وہ برائی موجود ہے جس کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے لیکن توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ کیا ان برائیوں کے خاتمے کے لیے چند قدم اٹھے ہیں؟اگر ہاں تو وہ کون لوگ ہیں جو اس جانب پیش قدمی کر رہے ہیں اور کیا ان میں وہ برائیاں موجود نہیں جن کے خاتمے کی جانب وہ آواز اٹھاتے ہیں !آج کرپشن کا مسئلہ زور و شور سے اٹھایا جا رہا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس کرپشن ،کالے دھن اور رشوت نے ملک کی معیشت کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔اس کے باوجود آج ہم دنیا میں ابھرتے ہوئے ملک کے طور پر مانے جاتے ہیں لیکن کیا یہ صحیح نہیں کہ اگر ہمارے معاشرے میں رشوت اور جعل سازی ، کالے دھن اور کرپشن کو کنٹرول کر لیا جاتا تو ہم آج اور بھی آگے ہوتے۔ لیکن سوال یہ بھی ہے کہ کیا یہ مادی ترقی ہی ہماری معاشرتی ترقی کا ثبوت فراہم کرتی ہے یا ہم کو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی انحطاط سے اوپر

اٹھ کر اخلاقی برتری کی بھی ضرورت ہے؟توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ یہ اخلاقی برتری کیسے حاصل ہوگی؟کہا کہ: " وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی" (الانفال:53)
۔یعنی جب تک کوئی قوم اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی نعمت کا غیر مستحق نہیں بنا دیتی اللہ اس سے اپنی نعمت سلب نہیں کیا کرتا۔

!تقاضائے وقت

جس ملک میں ہم رہتے ہیں وہ اخلاقی پستی میں مبتلا ہو،اس کے زوال کے دن قریب آ رہے ہوں، اس پر خدا اور اس کے فرشتے لعنت بھیج رہے ہوں،اس ملک اور اہل ملک کی ناکامی لکھی جا چکی ہو اور وہ بربادی کے دہانے پر آ لگے ہوں۔اور ان حالات میں وہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہوں کہ ہمارے پاس ربِ کائنات رحمان و رحیم کی تعلیمات موجود ہیں۔اس کا مظاہرہ نہ وہ اپنے عمل سے کرتے ہوں، نہ اپنے قول سے کرتے ہوں، نہ لوگوں کو اس جانب متوجہ کرتے ہوں اور نہ ہی وہ ایسا کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔ تو پھر کیونکر وہ ان ہلاکتوں میں شمار نہ ہوں گے جن کے شکار دوسرے ہو رہے ہیں۔یہ وقت وہ بھی نہیں کہ دوسروں کی تباہی پر خوش ہوا جائے اور سمجھا جائے کہ اب جب کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے تو ہم کو خود بہ خود اقتدار حاصل ہو جائے گا اور ہم اللہ کی مرضی کو اللہ کی زمین پر نافذ کر دیں گے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ "دوسرے" دوسرے نہیں بلکہ آپ کے اپنے ہی

ہیں۔دن رات وہ آپ کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، لین دین اور کاروبار کرتے ہیں، خوشی اور غم میں شریک ہوتے ہیں، ملک اور معاشرہ کو سنوارنے اور بگاڑنے میں ساتھ ساتھ ہیں ان حالات میں جب کہ وہ اور آپ ہر موقع پر ایک دوسرے کے شریک ٹھہرے تو پھر کیونکر وہ "دوسرے" ہوئے۔یہ موقعہ ضایع کرنے کا وقت نہیں بلکہ موقع سے فائدہ اٹھانے کا وقت ہے معنی یہ کہ اپنے قول سے بھی اور اپنے عمل سے بھی آپ ان پر اسلام پورے کا پورا واضح کر دیجیے۔اور اسلام کی وضاحت آپ تب ہی کرنے کا اخلاقی جواز رکھتے ہیں جب کہ آپ خود اس پر عمل پیرا ہوں۔اس سے آگے یہ کہ یہ اسلام زندگی کے کسی ایک شعبے میں قائم ہونے کے لیے نہیں آیا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں جاری و ساری ہونا چاہیے!

تحریر و تقریر: چند توجہ طلب پہلو

دلوں کو متاثر و مسحور وہی بات کرتی ہے جس میں دو خوبیاں پائی جاتی ہوں حسنِ مضمون اور حسنِ بیان۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں یہ دونوں خوبیاں بکمال درجہ پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کلام نے سنگ دلوں کو موم بنا کر رکھ دیا۔ اس کلام کو اس کی اصل نفاست و سلاست اور اصل حکمت و نکہت کے ساتھ جب بھی بیان کیا جائے گا یہ دلوں کو مسحور اور ذہنوں کو مقہور کرے گا۔ یہی کچھ تذکرہ علامہ اقبالؒ نے اپنے ان اشعار میں بیان کیا ہے:

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضرِ و موجود سے بیزار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرمادے
فقر کی سان چڑھا کے تجھے تلوار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

ایسی تحریریں زندہ و جاوید ہوتی ہیں۔جن کے پیچھے صرف بلاغت و ندرت کا اعجاز ہی نہیں ہوتا بلکہ کردار کی عظمت بھی کارفرما ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

کوئی طاقت انہیں محو کر سکتی ہے نہ محدود۔ سید قطبؒ لکھتے ہیں: "کسی مصنف کی تحریریں ایسی ہیں جیسے خوب صورت مورتیاں۔ جب مصنف اپنی تحریروں کی تائید اپنے کردار سے کرتا ہے تو ان میں روح داخل ہو جاتی ہے اور پھر وہ کتابوں کے اندر ہی نہیں رہتیں، بلکہ انسانی آبادیوں کے اندر چلتی پھرتی نظر آنے لگتی ہیں"۔ انسان کی گفتگو خود اُس شخصیت کی عکاس ہوتی ہے۔ جب کوئی بات زبان سے باہر نکلتی ہے تو سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں اس جانب ٹھہر جاتی ہیں جہاں سے وہ آواز آ رہی ہوتی ہے۔ بس چند لمحات گزرتے ہیں کہ یہ کان، آنکھ اور دماغ یکجا ہو کر فیصلہ کر ڈالتے ہیں۔ اب یا تو یہ بات اپنے مثبت اثرات کے ساتھ قلب میں جاگزیں ہو جاتی ہے یا پھر منفی اثرات کے ساتھ قلب سے دور، بہت دور پھینک دی جاتی ہے۔ جہاں نہ صرف وہ الفاظ بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں بلکہ وہ شخصیت بھی اپنا وقار کھو بیٹھتی ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے: وَاَنَّھُم یَقُولُونَ مَالَایَفعَلُونَ (الشعرائ: ۲۲۶)۔ "اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں"۔ یہ وہی بات ہے جو ہم یہاں کر رہے ہیں کہ جب شخصیت جانی پہچانی ہو اور اس سے سابقہ بھی پیش آ چکا ہو ایسی حالت میں اس کی زبان سے نکلی بات یا تو منفی یا پھر مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس لیے لازم ہو جاتا ہے کہ زبان سے وہی بات ادا کی جائے جو انسان خود اپنے لیے، اپنے گھر والوں کے لیے، اپنے متعلقین کے لیے پسند کرتا ہو۔ آیئے اب ہم جاننے کی کوشش کریں کہ تحریر و تقریر کے معنی کیا ہیں اور ان کو ادا کرتے وقت کن خوبیوں سے مزیّن

ہونا چاہیے۔

بات کہو جب دل سننے کے لیے آمادہ ہوں: حضرت علیؓ نے فرمایا: "دلوں کی کچھ خواہشات اور میلانات ہوتے ہیں، کسی وقت وہ بات سننے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور کسی وقت اس کے لیے تیار نہیں ہوتے، تم لوگوں کے دلوں میں میلان کے وقت داخل ہو اور اس وقت اپنی بات کہو جب کہ سننے کے لیے آمادہ ہو کیونکہ دل کا معاملہ ایسا ہے کہ جب اسے کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے (بات کو قبول کرنے سے انکار کر بیٹھتا ہے)" (کتاب الخراج ابو یوسف)۔ معلوم ہوا کہ ہر بات ہر وقت لوگوں کے سامنے نہ پیش کی جائے بلکہ پیش کرنے سے پہلے موقع و محل دیکھ لیا جائے۔ اس بات کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ جس مجلس میں ہم اپنی بات پیش کر رہے ہیں وہ کس نوعیت کی ہے۔ فائدہ یہ ہوگا کہ جب ہم مجلس کا خیال رکھتے ہوئے اپنی بات کہیں گے تو کیونکہ پہلے سے ہی اُس طرح کی بات لوگ سننے کے لیے آمادہ ہوں گے لہٰذا وہ بات اثر انداز ہو جائے گی۔ اس کے برخلاف جو لوگ موضوع سے ہٹ کر بات لوگوں کے دماغوں میں ٹھونسنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں تو کیونکہ لوگوں کے دل اس جانب مائل نہیں ہوتے لہٰذا بہت شاندار انداز میں کی گئی بات بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ نہ صرف ضائع ہوتی ہے بلکہ لوگوں کا وقت بھی برباد ہوتا ہے اور سوائے وقت بربادی کے کچھ ان کو حاصل نہیں ہوتا۔

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گزر رہے تھے، لوگوں نے آپ کو دونوں طرف سے گھیر رکھا تھا، آپ کا گزر ایک چھوٹے کان والے مردہ بکری کے بچہ سے ہوا، آپ قریب گئے اور اس کے کان پکڑ کر فرمایا: "تم میں سے کون اس مردہ بچہ کو ایک درہم میں خریدنا پسند کرے گا؟"۔ صحابہ نے عرض کیا" ہم کسی قیمت پر اس کو خریدنا نہیں چاہتے، یہ ہمارے کس کام آئے گا۔ آپ نے پوچھا! کیا تم پسند کروگے کہ یہ مفت میں تمہیں مل جائے؟ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ اگر زندہ ہوتا تب بھی کان چھوٹے ہونے کا عیب اس میں تھا ہی، جب کہ ابھی تو یہ مردہ ہے، اس لیے اس کو لینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا "۔ یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کی قسم! یہ بچہ تمہاری نظر میں جتنا بے وقعت ہے، دنیا اللہ کی نظر میں اس سے کہیں زیادہ بے وقعت ہے" (صحیح مسلم)۔ یہ ہے وہ انداز اور موقع و محل کہ جس کے ذریعہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے دلوں میں دنیا کی حیثیت واضح کردی۔ یہاں دو باتیں قابل لحاظ ہیں۔ ۱) والدین، اساتذہ، اور وہ لوگ جو لوگوں کی تربیت کے لیے مقرر ہوں یا جن پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہو کہ وہ لوگوں کی تربیت کریں، انھیں اگر کوئی اچھی بات ذہن نشیں کرانے کے لیے ذرا سا بھی موقع ملے تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ ۲) بات جو ذہن نشیں کرائیں وہ اس انداز میں کہ لوگوں کا قلب

و ذہن اس کی طرف پوری طرح یکسو ہو جائے۔

کلام میں محبت و دل سوزی: انداز بیان ہمیشہ شیریں رکھنا چاہیے، یہ وہ کلید ہے جس سے سخت ترین لوگوں کے دل بھی پگھل جاتے ہیں۔ انداز بیان شیریں ہونے کے ساتھ ساتھ جس سے بات کی جائے اس سے انسان محبت بھی رکھتا ہو اور اس کا اظہار اُس پر کھل کر کرنا چاہیے، صرف زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی۔ اگر یہ دو باتیں انسان کی ذات میں موجود ہوں تو زبان سے نکلی ہوئی بات مخاطب کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے گی۔ بات اس انداز سے بیان کی جائے کہ اس میں حد درجہ مشفقانہ اور خیر خواہانہ جذبات جھلکتا ہو۔ یہ وہ انداز ہوگا کہ جس سے مخاطب مجال سرتابی نہیں کر سکتا اور جو بات بھی ادا کی جائے گی اس کو نہایت خوش دلی سے عملی جامہ پہنانے کو تیار ہو جائے گا۔ یہ ممکن ہے کہ مخاطب کا عملی اظہار آپ کی بات کے اولین دن سے ہی نہ ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ ہم صبر کے دامن کو بھی نہ چھوڑیں، اپنی بات کو بھی جاری رکھیں اور پھر بھی ہمیں نتائج نہ حاصل ہوں۔

ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندان قریش کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

قافلے کا دیدبان کبھی بھی اپنے ساتھیوں سے جھوٹ نہیں بولتا، اللہ کی قسم! اگر میں" بفرض محال) تمام لوگوں سے غلط بات کہنے پر آمادہ ہو بھی جاتا تب بھی تم سے غلط) بات نہ کہتا۔ اگر (بفرض محال) تمام لوگوں کے ساتھ دھوکہ دہی

کرتا، تب بھی تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں کرتا۔اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں ، میں تمام لوگوں کی جانب اور خاص طور پر تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں۔ جس طرح تم سو جاتے ہو پھر نیند سے بیدار ہوتے ہو ، اللہ کی قسم ویسے ہی تم کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد جی اٹھنا ہے، تم سے تمہارے کاموں کا حساب لیا جائے گا، تمہیں بھلائی کا بدلہ بھلائی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے ضرور دیا جائے گا اور یہ بدلہ یا تو ہمیشہ کی جنت کی شکل میں ہوگا یا ہمیشہ کی جہنم کی صورت میں "۔ معلوم ہوتا ہے کہ مربی اعظم جو بات بھی ادا کر رہے ہیں اس کے اندر بے انتہا محبت اور دل سوزی موجود ہے۔اور آپ کی بات نہ صرف قولی بلکہ عملی طور پر بھی اس کا کھلا ثبوت پیش کرتی ہے، جبکہ آپ لوگوں کی مدد کرتے ، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے، مصائب میں ان کی دل جوئی کرتے، ہمیشہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتے، اظہارِ محبت کے لیے مصافحہ اور معانقہ کرتے، یہ وہی اعمال تھے کہ جس کے نتیجہ میں لوگ آپ کے گرویدہ ہو جاتے، اپنے ماں باپ سے زیادہ آپ سے محبت کرتے ، آپ کے ہر حکم پر اپنی جان دینے کے لیے تیار رہتے۔ایک بار ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے آیا۔آپ نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلیوں پر نشانات پڑے ہوئے ہیں، آپ نے وجہ دریافت کی تو اس نے کہا: یارسول اللہ میں ایک مزدور آدمی ہوں، کسب حلال کے لیے مجھے پتھر توڑنا پڑتا ہے، اس سخت محنت کی وجہ سے یہ نشانات پڑ گئے ہیں، جب آپ نے یہ بات سنی تو فرط محبت میں اس کے ہاتھ چوم

لیے۔ غور فرمایئے کیا اس شخص کا دل نہ بھر آیا ہوگا، اس کا حوصلہ بلند نہ ہوا ہوگا نتیجہ یہ کہ آپ سے محبت میں بے انتہا اضافہ ہو گیا ہوگا۔ یہ ہے وہ سوز محبت جو لوگوں کے دلوں کو پگھلانے والا ہے۔ لوگوں میں عیوب تلاش کرنا اور پھر انکا نازیبا انداز سے تذکرہ کرتے پھرنا یہ وہ نقائص ہیں جن سے لوگ آپ سے دور بھاگیں گے۔ ہمیں ہر حال میں لوگوں سے قربت قائم کرنا ہے نہ کہ ان سے دوری۔ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں: "بہترین عالم وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں کرتا اور نہ اللہ کی نافرمانی کے لیے رخصت دیتا ہے، اور نہ اللہ کے عذاب سے انہیں بے خوف بناتا ہے"۔

تدریج: جس طرح زندگی کے مختلف مراحل میں تدریج لازمی ہے۔ اور جس طرح ایک انسان کی زندگی خود اس کی واضح اور زندہ مثال ہے کہ بچپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد بڑھاپا ایک تدریجی عمل ہے اسی طرح زندگی کے ہر کام میں تدریج لازمی جز ہے۔ چاہے وہ تربیت کے تعلق سے ہو، علم کے حوالے سے ہو، ذمہ دارانہ زندگی کے تعلق سے ہو یا پھر عقائد و نظریات اور عبادات کے ارتقائی مراحل سے ہو۔ لہذا قول و عمل اور تحریر و تقریر میں بھی ان باتوں کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ اب یہ تحریر و تقریر میں کس طرح تدریجی عمل جاری رہے گا، یہ اُن لوگوں سے متعلق ہے جو یہ جانتے ہیں کہ ہم اپنی بات کن لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ وہ جس عملی میدان تک بھی بڑھ چکے ہوں اس سے آگے کی

بات ان کے سامنے بیان کی جانی چاہیے۔ لیکن یہ کام تقریر میں تو ممکن ہے لیکن تحریر میں دشوار، کیونکہ نہیں معلوم کہ کب کس طرح کا شخص اس تحریر کو پڑھنے بیٹھ جائے۔ وہاں پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تحریر کی ترتیب اس انداز کی ہونی چاہیے کہ بات بتدریج آسانی کے ساتھ واضح ہوتی چلی جائے اور یہی تحریر کا تدریجی اظہار ہوگا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "قرآن پاک میں پہلے پہل صرف وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے سائے میں آگئے تو حلال و حرام کی آیتیں نازل ہوئیں۔ اگر پہلے ہی مرحلہ میں وہ آیات نازل ہو جاتیں جن میں شراب اور زنا کو حرام قرار دیا گیا ہے تو شاید لوگ پکار اٹھتے: ہم شراب اور زنا کو کبھی نہیں چھوڑیں گے" (بخاری)۔ ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے بیٹے کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: "بیٹے! جلدی نہ کرو، اللہ تعالی نے قرآن میں شراب کی مذمت میں دو بار آیتیں نازل کیں، پھر تیسری بار آیات نازل کرکے شراب کو حرام قرار دیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں تدریج کو نظر انداز کرکے یکبارگی لوگوں کو پورے طور پر حق پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں تو کہیں لوگ اسے چھوڑ نہ دیں، تو یہ فتنہ پہلے سے بھی بڑا فتنہ ہوگا" (الموافقات)۔ ایک اور واقعہ کا تذکرہ کرکے ہم اپنی اس بات کو مکمل کریں گے۔ حضرت معاذ بن جبل کو یمن روانہ کرتے وقت اللہ کے رسول نے

فرمایا: "اے معاذ! تم ایک ایسی قوم کی طرف جا رہے ہو جو اہل کتاب ہے، تم پہلے انہیں توحید اور رسالت کی دعوت دینا۔ جب وہ یہ بات مان لیں کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں تو پھر انہیں یہ بتانا کہ اللہ نے دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جب وہ اس بات کو بھی تسلیم کر لیں تو پھر انہیں یہ بتانا کہ اللہ نے ان پر زکاۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء میں تقسیم کر دی جائے گی" (متفق علیہ)۔ زندگی کے مختلف محاذ پر تدریج کو ملحوظ رکھنا

چاہیے، فائدہ یہ ہوگا کہ ہماری بات میں اثر پیدا ہوگا اور ہمارے اور دیگر لوگوں کے کردار میں تبدیلی آئے گی۔ اگر اس کا خیال نہ رکھا گیا تو یہ نہ ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم زندگی کے ہر محاذ پر لوگوں کے لیے نمونہ پیش کر سکیں اور نہ ہی لوگوں کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ ایک ہی وقت میں اپنی زندگیوں کو سنوار لیں۔ اس کے برخلاف طرز عمل اختیار کرنے سے نقصان یہ ہوگا کہ لوگ ہم پر اور ہم لوگوں پر طعنے کسیں گے، اور وہ ہم سے دور اور ہم ان سے دور ہوتے جائیں گے!

چند توجہ طلب پہلو:

۱۔ قرآنی اسلوب: کہا کہ: "تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی مثال اس پاکیزہ درخت سے دی ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور چوٹی نہایت بلند آسمان پر پہنچی ہوئی ہے۔ وہ ہر وقت اپنے رب کے حکم سے پھل لاتا ہے۔ اللہ لوگوں کے

لیے تمثیلات بتلاتا ہے تاکہ وہ سمجھیں اور نصیحت حاصل کریں" (ابراہیم: ۵۲)۔اپنی بات پیش کرتے وقت مختلف مثالوں اور تشبیہوں کا استعمال کیا جانا چاہیے۔یہی طریقہ اللہ تعالیٰ خود قرآن حکیم میں اختیار کرتا ہے اور اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی لوگوں کو اپنی بات سمجھانے کے لیے آسان مثالیں اور تشبیہیں استعمال کرتے تھے۔ ہمیں بھی اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے ، کیونکہ یہ طریقہ آسان اور عام فہم ہے۔اور اس طرح بات جلد ذہن نشیں ہو جاتی ہے۔

۲۔ جھوٹ سے گریز: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے بیان کرتے ہیں،کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا"آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اس کو بیان کرتا پھرے" (مسلم)۔معلوم ہوا کہ ہر وہ بات جو ہم نے سنی اور پڑھی اس کو بغیر علمی تحقیق کے نہ بیان کر دیا جائے۔اگر اس بات کا خیال نہ رکھا گیا تو آدمی جھوٹوں میں شمار ہوگا،اس کی شخصیت مجروح ہوگی ، اور اس کے زبان و قلم کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔لہٰذا بات پیش کرتے وقت جھوٹ سے لازماً گریز کیا جانا چاہیے۔

۳۔ قول و عمل میں یکسانیت: قول و عمل میں یکسانیت ایک لازمی جز ہے۔اس کے بغیر بات میں تاثیر پیدا ہو ہی نہیں ہو سکتی۔اسی لیے اللہ تعالیٰ متوجہ

کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں" (صف: ۲-۳)۔یہاں یہ بات صاف کردی گئی کہ جو بات بھی ادا کی جائے اس پر خود عمل کیا جائے اور اگر اس پر عمل نہیں کیا جاتا تو نہ صرف وہ بات بلکہ وہ شخص بھی مجروح ہوتا ہے۔اللہ کی پھٹکار پڑتی ہے اور وہ دنیا اور آخرت میں ناکام و نامراد ہوتا ہے۔اسی طرف توجہ دلاتے اور ڈراتے ہوئے فرمایا گیا کہ: "تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے" (البقرہ: ۴۴)۔

۴۔ نقطہ نظر: آج بھی اور آج سے قبل بھی دنیا میں بہت سارے نقطہ نظر نہ صرف موجود تھے بلکہ موجود ہیں۔ہم اگر ان ہی کے ارد گرد گھومتے رہے اور اگر اپنا کوئی واضح نقطہ نظر نہیں رکھتے تو پھر ہمارا بات کرنا اور نہ کرنا.برابر ہے۔کیونکہ ہم وہی کچھ کر رہے ہوں گے جو دوسرے لوگ کرتے آئے ہیں، اس لیے ہم اور ہماری بات میں نہ کوئی وزن ہوگا اور نہ کوئی متاثر کرنے والی بات۔ضروری ہوا کہ ہم جو بات بھی کہیں ا ور پیش کریں اس میں ہمارا بحیثیت مسلمان،اسلام کا نقطہ ٔ نظر واضح ہونا چاہیے۔کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کی بساط اسی وقت پلٹی جاتی ہے جب کہ وہ اخلاقی پستی میں

مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ عروج وزوال کی کہانی نہ مادی قوتوں پر منحصر ہے، نہ سائنس و ٹیکنالوجی کا اس میں عمل دخل ہے اور نہ علمی ترقیوں پر ہی اس کا انحصار ہے۔ یہ انسان کے اخلاقی کسب اعمال کا نتیجہ ہے جس کے نتیجے میں قومیں عروج وزوال کی طرف جاتی ہیں۔ لہٰذا ہماری تحریر و تقریر میں وہ عامیانہ رویہ نہ اختیار کیا جائے اور اس سے بچنے کی ہر ممکن سعی و جہد کی جائے، تب ہی ہماری بات اور دوسروں کی بات میں فرق ہوگا، اور اس فرق کا نتیجہ ہوگا کہ دیر یا سویر لوگ ہماری بات پر غور کریں گے، اس کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ہم سے اور ہماری باتوں سے فیض یاب ہوں گے۔

۵۔ تنقید: جب آپ اسلام کا نقطہ نظر پیش کریں گے تو یہ ممکن ہے کہ دیگرافکار و نظریات اور فلسفیانہ تحریر و تقریر پر اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے تنقید کریں۔ یہ آپ کا اختیار بھی ہے اور اس تعلق سے آپ کو قانونی اور اخلاقی حقوق بھی حاصل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تنقید کا لہجہ اور زبان دونوں ایسے ہونے چاہئیں جن سے ہر سننے والے کو محسوس ہو کہ آپ فل واقع اصلاح چاہتے ہیں۔ تنقید کے لیے زبان کھولنے سے پہلے یہ اطمینان بھی کر لیجیے کہ آپ کے اعتراض کی کوئی بنیاد واقعہ میں موجود ہے؟ بلا تحقیق کسی کے خلاف کچھ کہنا ایک گناہ ہے جس سے فساد رونما ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس فرمان پر بھی اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ متوجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ:

وَمَا

یَجرِ مَنَّکُم شَنَاٰنُ قَومٍ عَلٰی اَلَّا تَعدِلُوا اعدِلُوا ھُوَ اَقرَبُ لِلتَّقوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیرٌ بِمَا تَعمَلُونَ۔ "اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیز گاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ خدا تمہارے سب اعمال سے خبر دار ہے" (المائدہ: ۸)۔ یہ وہ واضح تعلیمات ہیں جن حدود کا ایک مسلمان کو لازماً پاس و لحاظ رکھنا چاہیے، الفاظ کی ادائیگی میں بھی اور معاملات کے لین دین میں بھی۔

۶۔ یقینِ کامل: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ شبہات کے نزول کے وقت تیز نگاہ کو اور شہوات کے ہجوم کے وقت عقلِ کامل کو محبوب رکھتا ہے"۔ جو بات کہی جائے اس میں تردد، تذبذب، حیرت اور درماندگی کی کیفیت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو اس سے انتشار، بے اعتمادی کا فقدان ہوگا۔ کیونکہ کہنے والا اگر خود ہی تذبذب کا شکار ہوگا تو اس کو سننے اور پڑھنے والا کس طرح اس پر یقین کرے گا۔ اور ایسی بات کہنے کا کیا فائدہ جس پر نہ کہنے والے کو یقین ہو اور نہ سننے والا ہی اس سے فیض یاب ہو سکے۔

۷۔ جہدِ مسلسل: انسان اس دنیا میں سعی جہد کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی نجات اس ہی حالت میں ہے کہ وہ اس کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کر لے جہاں

سے وہ کبھی نکالا گیا تھا۔ یعنی جنت کے حصول کے لیے لگاتار، مسلسل، بغیر رکے اور ٹھہرے کوشش کرتا چلا جائے۔ یہاں ہماری بات تحریر و تقریر کے سلسلے میں ہو رہی ہے اور اس میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے تعلق سے ہے تو اس میں لازم ہے کہ ہم اپنے علم، اپنی سمجھ، اپنے فہم میں اضافہ و اصلاح کرتے چلے جائیں نیز اسی طرح کی دیگر خصوصیات کے حصول کو بھی مسلسل جاری رکھیں۔ اس سلسلے میں کبھی بھی اور کسی بھی لمحہ اس شیطانی وسوسہ کا شکار نہ ہوں کہ اب ہم کافی کچھ جانتے ہیں یا اب ہم ان میدانوں میں کامل ہو گئے ہیں۔ جو کچھ ہمیں بننا تھا وہ بن چکے، مزید کمال مطلوب ایسا نہیں رہا جو ہمیں حاصل کرنا ہو۔ آپ نہ فرداً فرداً اور نہ من حیث الجماعت، کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ وہ باتیں ہیں جن کا اگر پاس و لحاظ رکھا جائے تو ہماری گفتگو اور ہماری تحریروں میں جان پیدا ہو جائے گی۔ اور اگر ہم نے ان باتوں کا اپنے قول و عمل سے مظاہرہ نہ کیا تو نہ صرف ہماری بات بلکہ ہم بھی بے وزن ثابت ہوں گے۔ اللہ تعالی ہمارے کردار کو داغ دار ہونے سے بچائے اور ہمیں اُس فتنہ عظیم سے بچالے کہ جس میں بد اعمال لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ آج نہ صرف عام آدمی بلکہ تحریکِ اسلامی کے شعلہ بیان مقررین نے بھی تربیت کے تنفیذی طریقہائے کار کو چھوڑ دیا ہے، جس کی وجہ سے اکثر اسلامی نظریات اور فلسفے، علم اور نظریہ کی حدتک محدود ہو کر رہ جاتے

ہیں اور بات علم و ثقافت اور اطلاعات سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ہم نہیں کہتے کہ سب ایک ہی رَو میں بہہ رہے ہیں لیکن نتیجہ کے اعتبار سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم داعیانِ دین کی فہرست میں بیشتر ایسے شعلہ بیان مقررین اور زور دار خطیبوں کو دیکھ سکتے ہیں جو عوام سے کہیں زیادہ زندگی اور دولتِ دنیاکے خواہش مند ہوتے ہیں۔شاید ایسے ہی لوگوں کو یہ الفاظ اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں!

اِذا عِبتَ مِنھُم اُمُورًا اَنتَ تَاتِیھَا
اَصبَحتَ تَنصَحُھُم بِالوَعظِ مجتھدًا
وَالمُوبِعَاتُ لَعمرِی اَنتَ جَانِیھَا
تَعِیبُ دُنیَا وَنَاسًا رَغِبِینَ لَھَا
وَاَنتَ اَکثَرُ النَّاسِ رَغبَۃً فِیھَا

(اے واعظِ شعلہ بیاں! تو لوگوں کو بُرا بھلا کہہ رہا ہے حالانکہ ان امور کا ارتکاب کرکے تونے خود اپنا دامن رنگین کر لیا ہے! تو انہیں وعظ و نصیحت کے جام پلاتا ہے حالانکہ بخدا تو خود اس جُرم کا ارتکاب کر رہا ہے! جو عوام کو بُرا بھلا کہہ رہا ہے کہ وہ دنیا کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اور تیرا حال یہ ہے کہ عوام سے زیادہ دنیا سے دل چسپی تو رکھتا ہے!)

ہم دیکھتے ہیں کہ مخلص ترین افراد اور جاں باز کارکن بھی جب متاعِ دنیا کی

طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں تو ذلیل اور پست ہو کر رہتے ہیں۔ بہت سے وہ لوگ بھی ہیں جو دعوت کے آفاق میں گم ہو گئے اور قیادت کے مرحلے تک پہنچ گئے پھر دنیوی مال و منال اور اس کی فتنہ سامانیوں سے شکست کھا کر چت گر پڑے اور آخرت پر متاعِ حیات کو ترجیح دے دی۔ کہا کہ: فَاَمَّا مَنْ طَغٰی۔ وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا۔ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی۔ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔ "پس جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی، دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی، اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا، جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی" (نازعات: ۳۷-۴۱)۔ لہٰذا ہمیں ہر حالت میں ان خرابیوں اور ناکامیوں کے رستہ سے گریز کرنا چاہیے اور قول و عمل کے تضاد سے بچنا چاہیے۔ اس بات کو ہمیشہ تازہ رکھنا چاہیے کہ ہم جو بات کہہ رہیں یا لکھ رہے ہیں وہ بہت اہم ہے اور ان باتوں کا تعلق ایک بہت بڑے نصب العین سے وابستہ ہے۔ لہٰذا اس کام کے حصول کے لیے ہمیں اللہ کی مدد و نصرت بھی درکار ہوگی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ ربِ رحیم سے دعا کرتے رہیں اور ان الفاظ کو اپنی زبان پر جاری رکھیں:

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ۔ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ۔ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ۔ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ "پروردگار (اس کام کے لیے) میرا سینہ کھول دے، اور میرا کام آسان کردے، اور میری زبان کی گرہ کھول دے، تاکہ وہ بات سمجھ

لیں" (طہ : ۲۵-۲۷)۔ نیز قرآن حکیم کی اس تنبیہ سے بھی ڈرتے رہیں، جس میں فرمایا گیا: یَومَ تَشہَدُ عَلَیہِم اَلسِنَتُہُم وَاَیدِیہِم وَاَرجُلُہُم بِمَا کَانُو یَعمَلُون۔ " (قیامت کے دن جس دن ان کی زبانیں ہاتھ اور پاؤں سب ان کے کاموں کی گواہی دیں گے" (النّور: ۲۴)۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ قول و عمل میں یکسانیت اور قول و عمل کا تضاد دونوں چیزیں کھل کر سامنے آجائیں گی۔ لہٰذا اُس دن کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ قبل اس سے کہ زبان سے کوئی لفظ ادا ہو یا قلم میں جنبش پیدا ہو جائے !!

اے عرضِ مقدسِ فلسطین

یوم نکبہ: 15 مئی 1948ء

پچاسی سالہ یہودی خاتون اَوی تال بن خورِین 1923ء میں جرمن شہر Eisenach میں پیدا ہوئیں۔ تب ان کا نام ایریکا فاکن ہائیم تھا۔ نو عمری ہی میں انہیں اپنے یہودی مذہب اور صیہونیت کے ساتھ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ جرمنی میں نازی سوشلسٹوں کے برسرِاقتدار آنے کے تین سال بعد ہی اِس یہودی لڑکی نے جرمنی چھوڑنے اور فلسطین جانے کا فیصلہ کیا۔ "میں نے تیرہ سال کی عمر میں نقل مکانی کی اور یہاں آ کر فلسطینی شہریت اختیار کر لی۔ یہ 1936ء کی بات ہے"۔ حائفہ کی بندرگاہ پر اترنے کے بعد اَوی تال جرمن تارکین وطن کے قائم کردہ قصبے کیریات بیالیک میں پہنچیں، جہاں نو عمر یہودیوں کے لئے ایک یوتھ ہوسٹل موجود تھا۔ جب نومبر 1947ئ میں فلسطین کی تقسیم سے متعلق اقوامِ متحدہ کا فیصلہ سامنے آیا اور ایک سال بعد ریاست اسرائیل قائم ہوئی تو اَوی تال یروشلم میں تھیں۔ اِسی دوران ان کی جرمن شہر میونخ سے تعلق رکھنے والے مذہبی فلسفے کے ماہر شالوم بن خورِین کے ساتھ شادی بھی ہو چکی تھی۔ اس زمانے کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں: "تب یہاں جشن کا سا سماں تھا کہ اب ہماری اپنی ایک ریاست ہو گی۔ یہ بہت ہی چھوٹی سی ریاست تھی لیکن ہم نے سوچا کہ چھوٹی سہی، پَر اپنی تو ہے"۔ دوسری جانب 14 مئی 1948ئ کے دن سے ہی فلسطینیوں

کی گھر بدری کا عمل شروع ہو گیا۔ وہ اِسے یومِ نقبہ یا آفت کا دِن قرار دیتے ہیں۔ اس روز جن فلسطینی خاندانوں کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا، ان میں سے ایک خاندان فواض ابو سِتہ کا تھا، جو آج کل غزہ میں رہتے ہیں۔" میرا تعلق ایک بدّو قبیلے سے ہے اور ہم بیر شے وا کے علاقے میں رہا کرتے تھے، جس کی سرحدیں غزہ سے ملتی تھیں۔ لیکن جب انیس سو سینتالیس اڑتالیس کا دَور آیا تو دیکھتے ہی دیکھتے پورے ابو سِتہ قبیلے کو زبردستی اس گاؤں سے نکال دیا گیا۔اِس گاؤں پر تین اطراف سے حملہ کیا گیا۔ قبیلے کے چار سو سے زیادہ اراکین نے بھاگ کر نواحی غزہ میں پناہ لی۔ یہیں پر 1953ء میں فواض کا جنم ہوا۔ اس کی پرورِش ایک ایسے مہاجر کے طور پر ہوئی، جسے امید تھی کہ ایک روز وہ اپنے قبیلے کے پرانے علاقے میں لَوٹ کر ضرور جائے گا۔ لیکن کئی برس جرمنی میں رہنے کے بعد، جہاں اس کی شادی بھی ایک جرمن خاتون سے ہوئی، فواض کی اپنے آبائی وطن واپسی کی امیدیں دم توڑ چکی ہیں!

تاریخ فلسطین و اسرائیل:

یہ وہی مقامِ قبلہ اول ہے جس کی طرف رخ کرکے رسول اللہ نے ساڑھے چودہ برس تک نماز پڑھی ہے۔اور یہ وہی بنی اسرائیل ہیں جو تقریباً تیرہ سو برس قبل مسیح اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور دو صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد باالآخر اس پر قابض ہو گئے تھے۔بنی اسرائیل نے اُن قوموں کا قتل کرکے اس سر

زمین پر اسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح انگریزوں نے سرخ ہندیوں (Red Indians) کو فنا کرکے امریکہ پر قبضہ کیا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں اسیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کرکے اسرائیلوں کا بالکل قلع قمع کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لابسایا جو زیادہ تر عربی النسل تھیں۔ چھٹی صدی قبل مسیس میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کرکے تمام یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔ بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ کو جسے دسویں صدی قبل مسیح میں (Temple of Solomon) بجادی اور ہیکل سلیمانی حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرایا تھا، اس طرح پیوند خاک کر دیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔ ایک طویل مدت کی جلاوطنی کے بعد ایرانیوں کے دور حکومت میں یہودیوں کو پھر سے جنوبی فلسطین میں آکر آباد ہونے کا موقع ملا اور انھوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی۔ 70ء میں یہودیوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی جس کی پاداش میں بیت المقدس کے شہر اور ہیکل سلیمانی کو بالکل مسمار کر دیا گیا اور پھر ایک دوسری بغاوت کو کچل کر 135ء میں رومیوں نے پورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ اسلام کی آمد سے قبل یہ پورا علاقہ عربی قوموں سے آباد تھا، بیت المقدس میں یہودیوں کا داخلہ تک رومیوں نے قانوناً ممنوع کر رکھا تھا اور فلسطین میں بھی یہودی آبادی قریب قریب ناپید تھی۔ اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہے۔ اور

نہیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو بزور قوت حاصل کرکے اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبل مسیح میں انھوں نے کیا تھا۔اس تعلق سے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (Maimon Ides) نے اپنی کتاب "شریعت یہود" (The Code of Jewish Law) میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہر یہودی نسل کا یہ فرض ہے کہ بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو از سر نو تعمیر کرے۔ ہیکل سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے 70ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ یہ بات بھی تاریخ ہی ہمیں بتاتی ہے کہ رومیوں کے زمانے میں فلسطین یہودیوں سے خالی کرالیا گیا تھا اور بیت المقدس میں تو ان کا داخلہ بھی ممنوع تھا۔ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا ہے تو وہ صرف مسلمان ملک تھے۔ ورنہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی عیسائیوں کی حکومت رہی وہاں وہ ظلم و ستم کا نشانہ ہی بنتے رہے۔ یہودیوں کے اپنے مورخین خود اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار دور وہ تھا جب وہ اندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے آباد تھے۔

اقوام متحدہ کا کردار:

پہلی جنگ عظیم کے موقع پر ڈاکٹر وائز مین جو اس وقت یہودیوں کے قومی وطن کی

تحریک کا علمبردار تھا،انگریز حکومت سے اس نے وہ مشہور پروانہ حاصل کر لیا جو اعلان بالفور کے نام سے مشہور ہے۔اعلان بالفور کے وقت فلسطین میں یہودیوں کی کل آبادی پانچ فیصد بھی نہ تھی۔اس موقع پر لارڈ بالفور اپنی ڈائری میں لکھتا ہے: "ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صیہونیت ہمارے لیے ان سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اس قدیم سرزمین میں اِس وقت آباد ہیں"۔بالفور کی ڈائری کے یہ الفاظ آج بھی برطانوی پالیسی کی دستاویزات (Documents of British Policy) کی جلد دوم میں ثبت ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 1917ء میں یہودی آبادی جو صرف 52ہزار تھی وہ پانچ سال میں بڑھ کر 83 ہزار کے قریب ہو گئی۔1922ء سے 1939ء تک ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی ۔جنگ عظیم دوم کے زمانے میں ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے بے تحاشہ فلسطین میں داخل ہونے لگے۔صیہونی ایجنسی نے ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں فلسطین میں گھسانا شروع کر دیا اور مسلح تنظیمیں قائم کیں جنھوں نے ہر طرف مار دھاڑ کرکے عربوں کو بھگانے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے میں سفاکی کی حد کر دی۔اب ان کی خواہش تھی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن "کی بجائے " قومی ریاست "کا درجہ حاصل ہو جائے۔1947ء میں برطانوی" حکومت نے فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔مطلب یہ تھا کہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) نے

صیہونیت کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ ہم انجام دے چکے ہیں۔ اب آگے کا کام اس آنجہانی مجلس کی نئی جانشین اقوام متحدہ انجام دے۔ نومبر 1947ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس کے حق میں 33 ووٹ اور اس کے خلاف 13 ووٹ تھے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا۔ آخر کار امریکہ نے غیر معمولی دباؤ ڈال کر ہائیٹی، فلپائن اور لائیریا کو مجبور کر کے اس کی تائید کرائی۔ یہ بات خود امریکن کانگریس کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ تین ووٹ زبردستی حاصل کیے گئے تھے۔ جیمز فورسٹال (Forestal) اپنی ڈائری میں لکھتا ہے: "اس معاملہ میں دوسری قوموں پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے وہ شرمناک کارروائی کی حد تک پہنچے ہوئے تھے"۔

یوم نکبہ:

تقسیم کی جو تجویز ان ہتھکنڈوں سے پاس کرائی گئی اس کی رو سے فلسطین کا ۵۵ فیصد رقبہ فیصد یہودی آبادی کو، اور 45 فیصد رقبہ 67 فیصد عرب آبادی کو دیا گیا۔ حالانکہ ۳۳ اس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف ۶ فیصد حصہ یہودیوں کے قبضے میں آیا تھا۔ یہودی اس تقسیم سے بھی راضی نہ ہوئے اور انہوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ آرنلڈ ٹائن بی اپنی کتاب A Study of History میں لکھتا ہے کہ: وہ

مظالم کسی طرح بھی ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے خود یہودیوں پر کیے تھے۔دیریاسین میں ۹اپریل 1948ء کے قتل عام کا خاص طور پر اس نے ذکر کیا ہے جس میں عرب عورتوں، بچوں اور مردوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا گیا۔عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر لگاکر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ: "ہم نے دیریاسین کی عرب آبادی کے ساتھ یہ اور یہ کیا ہے، اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ"۔ان حالات میں 14 مئی 1948ء کو عین اس وقت جبکہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کے مسلہ پر بحث کر رہی تھی، یہودی ایجنسی نے رات کے دس بجے اسرائیلی ریاست کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا اور سب سے پہلے امریکہ اور روس نے آگے بڑھ کر اس کو تسلیم کیا۔ حالانکہ اس وقت تک اقوام متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔اس اعلان کے وقت تک ٦ لاکھ سے زیادہ عرب گھر سے بے گھر کیے جا چکے تھے اور اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف یروشلم بیت المقدس) کے آدھے سے زیادہ حصے پر اسرائیل قبضہ کر چکا تھا۔پس یہی ہے وہ) منحوس دن جس کو تاریخِ فلسطین میں یوم نکبہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

:صورتحال کے پس منظر میں

انسان کی فطرت میں یہ بات پیوست ہے کہ وہ عزت اور وقار کے ساتھ جیئے،اگرا

میں مبتلا ہو جائے (Inferiority complex) یانہ ہو تو وہ احساس کمتری کے مرض گا۔ عزت و وقار کی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ انسانوں کے بنیادی حقوق صلب نہ کیے جائیں۔ سوشل سائنٹسٹ کہتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالٰی نے معاشرتی زندگی عطا کی ہے، وہ رہبانیت کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اسی بات کو اسلام بھی زور دے کر کہتا ہے کہ معاشرے سے الگ تھلگ زندگی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے۔ مزید یہ کہ معاشرے میں رہتے ہوئے بھی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کی ترغیب دی گئی۔ اور اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ فرماتے ہیں: "تم مومنوں کو آپس میں ایک دوسرے سے رحم کا معاملہ کرنے ایک دوسرے سے محبت و تعلق رکھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی ومعاونت کا سلوک کرنے میں ایسا پاؤ گے جیساکہ بدن کا حال ہے کہ جب بدن کا کوئی عضو دکھتا ہے تو بدن کے باقی اعضاء اس ایک عضو کی وجہ سے ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اور بیداری وبخار کے تعب ودرد میں سارا جسم شریک رہتا ہے"۔ (بخاری ومسلم)۔ یہی بات اس طرح بھی کہی: " ایک خدا ایک رسول اور ایک دین کو ماننے کی وجہ سے سارے مسلمان ایک شخص کی مانند ہیں کہ اگر اس کی آنکھ دکھتی ہے تو اس کا سارا جسم بے چین ومضطرب ہو جاتا ہے اور اس کا سر دکھتا ہے تو پورا بدن تکلیف محسوس کرتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کی تکلیف کو سارے مسلمانوں کو محسوس
کرنا چاہیے" (مسلم)۔ لہٰذا فطری تقاضے کی بنیاد پر اور اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر ہمارے لیے لازم ہوتا ہے کہ غاصب یہودیوں کے ناپاک منصوبوں کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ اُن کی

چالاکیوں، عیاریوں اور متشددانہ ظلم و ستم کے خلاف ایک آواز ہو کر امت کو چاہیے کہ ان کا معاشی بائیکاٹ کریں، دنیا میں جہاں بھی مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہیں ان کا ساتھ دیں ،اسلام کو اس کے حقیقی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کریں،اس کے پیغام کو عام کریں اور اپنے قول و عمل سے شہادت پیش کریں، اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑائیں،اس سے معافی مانگیں اور دعائیں کریں اور ایک نئے عزم و حوصلے کے ساتھ اسلام کو دنیا پر نافذ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔یہی ہے تقاضائے وقت اور یہی ہے دنیا و آخرت میں سرخروئی اور کامیابی کی راہ !!

شب برات: حقیقت کیا ہے؟

"کہا کہ: چھوڑو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جنہیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہے"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسے گمراہ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے؟ قرآن ہمارے سوال کا جواب دیتے ہوئے راہنمائی کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ: "ہاں مگر یہ قرآن سنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے" (الانعام: 70) ۔یہ وہ صورتحال جس کا ہر مسلمان کو پاس و لحاظ رکھنا ہے۔ایک جانب خود اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کو گمراہ کن کاموں سے دور رکھنا ہے دوسری طرف ان گمراہ لوگوں سے نفرت کرنے اور دوری بنانے کی بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرنی ہے۔اس کے لیے ان کو: قرآن و حدیث کی روشنی میں نصیحت کرنی ہے، آخرت کی ہولناکیوں سے متنبہ کرنا ہے، جنت کی نعمتیں بیان کرنی ہیں اور ساتھ ہی وہ بشارتیں سنانا ہیں جو کامیابی اور سرخروئی حاصل کرنے والوں کے لیے بیان ہوئیں ہیں۔فی الوقت ہم جس مسلہ پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں وہ شب برات ہے۔شب برات کی حیثیت کیا ہے اور اس کو کس طرح گزارنا چاہیے؟ سنت محمدی ہماری کیا راہنمائی کرتی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا محبت اور عقیدت رکھنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہ اجمعین کا اس معاملے میں کیا رویہ

تھا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر غور و خوض کرنا نہایت ضروری ہے۔

صورتِ واقعہ یہ ہے کہ آج امت مسلمہ نے شب برات کو تہوار سمجھ لیا ہے اور ساتھ ہی اس کے کچھ مخصوص مراسم بھی مقرر کر لیے ہیں جن کی شدت سے پابندی کی جاتی ہے۔ جس طرح محرم ایک تہوار بن چکا ہے اسی طرح دوسرے نمبر کا تہوار شب برات ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بناؤٹی اور خود ساختہ تہوار ہے۔ نہ قرآن میں اس کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ ہی احادیث میں۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں تاریخ سے بھی اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا اور نہ ہی ابتدائی زمانے کے بزرگانِ دین ہی اس تہوار کو اسلامی تہورار قرار دیتے ہیں۔ درحقیقت اسلام رسموں اور تہواروں کا مذہب نہیں ہے۔ یہ تو ایک سیدھا اور معقول مذہب ہے جو فضول کاموں میں وقت، محنت اور دولت کی بربادیوں سے بچا کر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے اور ان کاموں میں آدمی کو مشغول کرنا چاہتا ہے جو دنیا اور آخرت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہوں۔ ایسے مذہب سے یہ توقع کرنا کہ وہ سال میں ایک دن حلوے پکانے اور آتشبازیاں چھوڑنے کے لیے مخصوص کرے گا، یہ سب باتیں عقل سے بعید تر ہیں۔ اللہ کے نبی نے مسلمانوں کے لیے اس قسم کی رسمیں اور تہوار پسند نہیں کیے بلکہ اگر اُس زمانے میں یہ اور اس قسم کی دیگر خرافات انجام دی جاتیں تو لازماً اس کو حکماً روک دیا جاتا اور جو ایسی رسمیں اس زمانہ میں موجود تھیں ان کو روکا بھی گیا۔

:فضیلت جو بیان کی جاتی ہے

اس رات کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس میں قسمتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں اور پیدائش اور موت کے معاملات طے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب روایات ضعیف ہیں اور ہر ایک کی سند میں کوئی نہ کوئی کمزوری موجود ہے۔ اس لیے حدیث کی قدیم تر اور زیادہ معتبر کتابوں میں کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی چیز اسلامی لٹریچر میں ملتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ شعبان کی پندرھویں شب کو حضرت عائشہؓ نے آنحضرت کو بستر پر نہ پایا اور وہ آپ کو تلاش کرنے کے لیے نکلیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بقیع کے قبرستان پہنچیں۔ وہاں آپ کو موجود پایا۔ وجہ دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ اس رات کو اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف توجہ فرماتا ہے اور قبیلہ کلب کی بھیڑوں کے جس قدر بال ہیں اس قدر انسانوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔ لیکن حدیث کے مشہور امام ترمذیؒ نے اس روایت کو بھی ضعیف قرار دیا ہے اور اپنی تحقیق یہ بیان کی ہے کہ اس کی سند صحیح طور پر حضرت عائشہؓ تک نہیں پہنچتی۔تاہم اگر ان کی کوئی اصلیت تسلیم بھی کر لی جائے تو حد سے حد بس اتنا ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس رات میں عبادت کرنا اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرنا ایک اچھا فعل ہے جسے انفرادی طور پر لوگ کریں تو ثواب پائیں گے۔ اس سے بڑھ کر کوئی ایسی چیز ان روایتوں سے ثابت نہیں ہوتی جس سے یہ سمجھا جائے کہ چودھویں تاریخ کو

یا پندرھویں شب اسلام میں عید قرار دیا گیا ہے یا کوئی اجتماعی عبادت مقرر کی گئی ہے۔ حلوے اور آتش بازی کا معاملہ تو خیر اس قدر کھلا ہوا ہے کہ جو شخص کچھ بھی اسلام کے متعلق جانتا ہے وہ پہلی ہی نظر میں یہ کہہ دے گا کہ ان چیزوں کی پابندی اس مذہب کی روح کے خلاف ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ:

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر رمضان کی آمد سے پہلے ہی شعبان کے مہینہ میں ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور یہ بات حدیث کی زیادہ معتبر کتابوں سے ثابت ہے۔ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں آپ کو اللہ تعالی کی طرف سے پیغمبری جیسے عظیم الشان منصب پر مامور کیا گیا اور قرآن جیسی لازوال کتاب کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس وجہ سے نہ صرف رمضان میں آپ غیر معمولی طور پر عبادت فرمایا کرتے تھے بلکہ اس سے پہلے ہی آپ عبادت میں عام دنوں کے مقابلے زیادہ مصروف ہو جایا کرتے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت اُمِ سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ رمضان کے سوا سال کے باقی گیارہ مہینوں میں صرف شعبان ہی ایسا مہینہ تھا جس میں آپ سب سے زیادہ روزے رکھتے تھے بلکہ تقریباً پورا مہینہ ہی روزے رکھتے گزر جاتا تھا۔ لیکن آپ کا یہ طرز عمل اپنی ذات کے لیے خاص تھا اور اس گہرے روحانی تعلق کی بنا پر تھا جو نزول قرآن کے مہینے سے آپ کو تھا۔ رہے عام مسلمان، تو ان کو اپ نے ہدایت فرمادی تھی کہ ماہِ

شعبان کے آخری پندرہ دنوں میں روزے نہ رکھا کریں۔ کیونکہ اس میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر عادۃً لوگ اس مہینہ کے آخری دنوں میں روزے رکھنے لگے تو رفتہ رفتہ یہ ایک لازمی رسم بن جائے گی اور رمضان کے فرض روزوں پر خواہ مخواہ دس پندرہ مزید روزوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ اور اس طرح لوگوں پر وہ بار پڑ جائے گا جو خدا نے ان پر نہیں رکھا ہے۔

مسلمانوں یں آتش بازی کی ابتدائ :

تاریخ کے حوالہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ 231ھ میں جب بنو عباس نے بنو امیہ سے اقتدار چھیننے کے لیے سازشوں کے جال بچھائے تو انہوں نے دیکھا کہ بنو امیہ کو شکست دینا آسان کام نہیں ہے کیونکہ عرب کے جنگجو لوگ اموی حکومت کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایرانیوں اور عجمیوں سے تعاون لینے کے لیے سوچا۔ ایرانی آتش پرست تھے مگر فاروقی اور عثمانی حکومت کی فتوحات نے مجوسی آتش کدوں کو سرد کر دیا تھا مگر آتش پرست ایرانی مسلمانیت کا لبادہ اوڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ ایرانیوں کا ایک مشہور خاندان "خاندان برامکہ" تھا۔ "برمک" کہتے ہیں آتش کدے کی آگ روشن کرنے اور اس کی نگرانی کرنے والے کو یہ مجوسیوں کے ہاں سب سے بڑا مذہبی عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ جب مسلمانوں کی آمد سے برمک عہدے بھی ختم ہو گئے تو برمکی خاندان کے لوگوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا مگر اندورنِ خانہ آگ سے محبت برقرار رکھی۔

جب بنو عباس نے بنو امیہ

سے اقتدار چھینا تو ایسے نو مسلم عجمیوں سے تعاون لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایرانی امور سلطنت میں شامل ہو گئے۔ بلکہ برمکی خاندان نے تو حکومت اسلامیہ میں بڑے بڑے عہدے حاصل کر لیے اور خالد برمکی تو وزرات کے عہدے تک جا پہنچا۔ 361ھ میں خالد کا انتقال ہوا تو خلیفہ ہارون الرشید نے اس کے بیٹے یحیٰ کو برمکی وزرات کا قلمدان سونپ دیا۔ برمکی چونکہ سابقہ آگ پرست تھے اس لیے یحیٰ برمکی نے خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں مقدس آگ کو روشن کرنے کا ایک عجیب طریقہ ایجاد کیا۔ اور خصوصاً شعبان کی پندرھیوں رات کو نیک اعمال سے منسوب کرکے اس رات کثرت سے چراغاں کیا۔ آگ روشن کرنے کا مقصد لوگوں کے دلوں میں آگ کا تقدس اور وقار پیدا کرنا تھا۔ مساجد میں چراغاں کی بدعت کو اسی نے ایجاد کیا تاکہ وہ اس طرح آگ کی پوجا کر سکیں گویا آتش بازی اور چراغاں کی رسم اسلام میں ڈیڑھ سو سال بعد جاری ہوئیں ۔پھر زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں آتی رہیں اور آتش بازی کی جدید صورت جو آج ہمارے سامنے موجود ہے اس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

کتب احادیث کی شروحات سے ثبوت:

مذکورہ واقعہ کا ثبوت ان شروحات سے بھی ملتا ہے جن پر ہمارے معزز علماء احناف اور علماء اہلحدیث ہر دو کا اتفاق ہے۔ جیسے ترمذی کی عربی شرح تحفۃ الاحوذی میں مرقوم ہے: کیونکہ وہ مجوسی تھے جب وہ مسلمان ہوئے تو

انہوں نے آتش پرستی کو اسلام میں داخل کر دیا۔لوگوں کو یہ دھوکہ دیتے ہوئے کہ یہ بھی دینی طریقہ ہے حالانکہ ان کا مقصد آگ کی پوجا تھی ۔جب وہ مسلمانوں کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرتے تو آگ کو سجدہ مقصود ہوتا جبکہ شریعت میں کسی مقام پر بھی ضرورت سے زیادہ آگ روشن کرنا جائز نہیں۔(اردو ترجمہ :)۔مشہور حنفی عالم علی قاری نے بھی یہی نقل کیا ہے:اس رات خاص طور پر فقراءکے لیے انواع اقسام کے کھانے تقسیم کرنا اس بارے میں کوئی حدیث مروی نہیں،نہ مرفوع نہ موقوف نہ صحیح اور نہ ضعیف اور یہ اعتقاد رکھنا کہ اس رات مردوں کی روحیں حاضر ہوتی ہیں اور ان کی تکریم کے لیے گھروں کو صاف رکھنا اور دیواروں کی لیپا پوتی کرنا اور ضرورت سے زیادہ چراغاں اور قندیلوں کو روشن کرنا تمام بدعات ، گمراہی کے کام ہیں۔اب اگر ان باتوں کے تعلق سے آپ کو اطمیان نہیں تو اپنے ہی محلہ کے کسی عالم دین سے اس بارے میں دریافت کریں اور بتائیں کہ میں نے ڈھیر سارا چراغاں کیا، پٹاخے پھوڑے اور اسی طرز کے دیگر کام انجام دیے۔آپ بتائیں کہ اس عمل کے بعد میں دین سے قریب ہوا یا دور؟

دیکھیں اسلام میں خاص طور پر یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جو کچھ خدا نے اپنے بندوں کے لیے لازم کیا ہے۔اس کے سوا کوئی دوسری چیز بندے خود اپنے اوپر لازم نہ کرلیں۔ کوئی خودساختہ رسم، کوئی مصنوعی قاعدہ، کوئی اجتماعی عمل ایسا نہ ہو جس کی پابندی لوگوں کے لیے فرض کی طرح بن جائے۔خدا زیادہ

بہتر جانتا ہے کہ اس کے بندوں کی بھلائی کن چیزوں کی پابندی میں ہے اور کس چیز کی کتنی پابندی میں ہے۔ اس کی قائم کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرکے اگر بندے بطور خود کچھ رسمیں مقرر کرلیں گے اور فرض کی طرح ان کی پابندی کریں گے تو اپنی زندگی کو آپ تنگ کرلیں گے۔ پچھلی قوموں نے یہی غلطی کی تھی کہ نئی نئی رسمیں ایجاد کرکے اپنے اوپر فرائض اور واجبات کے ردّے چڑھاتی چلی گئیں اور رفتہ رفتہ رسمیات کا ایک ایسا تانا بانا اپنے گرد بن ڈالا جس کے جال نے آخر کار ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر رکھ دیے۔ قرآن رسموں کو زنجیروں سے تشبیہ دیتا ہے اور حضرت محمد کے مشن کا ایک بڑا کام یہ بتاتا ہے کہ ان زنجیروں کو کاٹ پھینکیں جن میں انسان نے اپنے آپ کو خود کَس رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت محمدی میں فرائض کا ایک نہایت ہلکا اور سادہ ضابطہ تجویز کرکے باقی تمام رسموں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ عید الفطر اور عید الاضحٰکے سوا کوئی تہوار نہ رکھا گیا۔ حج کے سوا کوئی عبادت پر مبنی سفر نہ رکھا اور زکوۃ کے سوا کوئی نذر و نیاز کا طریقہ مقرر نہ کیا۔ اور ہمیشہ کے لیے یہ اصول طے کر دیا گیا کہ انسان کو جس طرح خدائی فرض میں کوئی چیز کم کرنے کا حق نہیں ہے، اسی طرح کوئی چیز بڑھانے کا حق بھی نہیں ہے۔

:ہر بدعت گمراہی ہے

ابتدائی زمانہ میں جو لوگ شریعت محمدی کی روح کو سمجھتے تھے وہ سختی کے

ساتھ اس اصول کے پابند رہے۔ انہوں نے نئی رسمیں ایجاد کرنے سے انتہائی پرہیز کیا اور جو چیز لازمی رسم بنتی نظر آئی اس کی فوراً جڑ کاٹ دی۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک چیز جس کو نیکی اور ثواب کا کام سمجھ کر ابتداء میں بڑی نیک نیتی کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے وہ رفتہ رفتہ کس طرح سنت، پھر واجب، پھر فرض اور آخر کار فرضوں سے بھی زیادہ اہم بنتی چلی جاتی ہے اور جہالت کی بنا پر لوگ اس نیکی کے ساتھ کس طرح بہت سی برائیاں ملا جلا کر ایک قبیح رسم بنا ڈالتے ہیں۔ اس قسم کی رسمیں جمع ہو کر کس طرح انسانی زندگی کے لے ایک وبال اور انسانی ترقی کی راہ میں ایک بھاری رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اس لیے ابتدائی دور کے علماء اور امام اس بات کی سخت احتیاط رکھتے تھے کہ شریعت میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہ ہونے پائے۔ ان کا یہ مستقل عقیدہ تھا کہ جو چیز شریعت میں نہیں ہے اسے شرعی حیثیت دینا یا جس چیز کی شریعت میں جو حیثیت ہے اس سے زیادہ اہمیت اس کو دینا بدعت ہے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعد کی صدیوں میں اس طرف سے انتہائی غفلت برتی گئی اور بتدریج مسلمان بھی اپنی خودساختہ رسموں کے جال میں اسی طرح پھنستے چلے گئے۔ جس طرح دنیا کی دوسری قومیں پھنسی ہوئی تھیں۔ اس خرابی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں جو قومیں اسلام کے دائرے میں داخل ہوئیں ان کو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت نہ مل سکی۔ وہ اپنے ساتھ پرانے جاہلیت کے بہت سے خیالات اور بہت سے طور طریقے لیے ہوئے اسلام میں داخل ہو گئیں۔ ان کو صدہا برس سے رسمیات اور

تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بغیر ان کے لے مذہبی زندگی میں گویا لطف ہی نہ رہا۔ اسلام کی سادہ شریعت کے دائرے میں آکر بجائے اس کے کہ وہ پرانی رسموں کا بوجھ اترنے اور پرانی زنجیروں کے بند کٹنے سے اطمینان محسوس کرتیں، انھیں یہاں آتے ہیں یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کس طرح وہی بوجھ پھر اپنے اوپر لاد لیں جنھیں اسلام نے اتارا تھا اور وہی بیڑیاں پھر پہن لیں جنھیں اسلام نے کاٹا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ تو پرانی جاہلیت کی رسمیں ذرا سی ظاہری صورت بدل کر باقی رکھیں توکچھ نئی رسمیں خود ایجاد کیں ۔ یہاں تک کہ اسلام کو بھی ویسی ہی رسموں اور تہواروں کا مذہب بنا کر رکھ دیا جیسے ان کے پرانے مذہب تھے۔افسوس کہ ان نئی رسموں کی ایجادیں‌خاصی باریک بینی سے کام لیا گیا۔ قرآن اور حدیث کو اس غرض کے لیے نہ تو دیکھاگیا کہ اسلام نے انسانی زندگی کے لیے جو نظام نامہ مرتب کیا ہے اس کے اصول معلوم کیے جاتے۔ بلکہ ساری چھان بین اسی لیے کی گئی کہ کہاں سے ایک نئی رسم ایجاد کرنے کے لیے یا پرانی جاہلانہ رسموں کو جاری رکھنے کے لیے کوئی بہانہ مل سکتاہے۔ پھر اگر کسی جگہ ایک بال کی نوک کے برابر بھی کوئی اشارہ مل گیا تو اس پر ایک پہاڑ برابر عمارت تعمیر کر ڈالی گئی۔ لوگ اپنی جگہ خوش ہیں کہ اسلام میں تہواروں اور رسموں کی جو کمی تھی اس کوانہوں‌نے پورا کر لیا ہے۔ حالانکہ دراصل انہوں نے اپنی جہالت سے ایک بار پھر وہ ساری بیڑیاں پہن لی ہیں جو اللہ نے اپنی نبی کے ہاتھ سے کٹوادی تھیں اور اپنے آپ کو پھر اس جال

میں پھانس لیا ہے جس میں پھنس کر دنیا کی کوئی قوم کبھی نہ ابھر سکی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی رائے:

امام ابو العباس شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے یہ عظیم قاعدہ ذکر کیا ہے: علماء کرام اس متفق ہیں کہ جن مسائل میں لوگوں کا تنازع ہو اسے کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹانا واجب ہے، اور کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں یا دونوں میں سے ایک جو بھی فیصلہ کر دیں وہ شریعت ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ اور جس کی کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم مخالف کریں اسے پھینک دینا اور اس پر عمل نہ کرنا واجب ہے، اور جو عبادات کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ ہوں وہ بدعات ہیں ان پر عمل کرنا جائز نہیں، چہ جائیکہ ان کی دعوت دی جائے، اور ان کی مدح سرائے کی جائے۔ کہا کہ: "اے نبی ! لوگوں سے کہ دو کہ ! اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو در گزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے" (آل عمران: 31)۔ مزید فرمایا: "اے محمد ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کر لیں" (النساء: 65)۔ اس معنی اور موضوع کی آیات

بہت زیادہ ہیں۔اور یہ آیات اختلافی مسائل کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر پیش کرنے اور پھر ان کے فیصلے پر رضامندی کے وجوب پر واضح نص ہیں، اور یہی ایمان کا تقاضا ہے اور بندوں کے لیے جلد یا دیر انجام کے لحاظ سے بہتر بھی ہے۔حافظ ابن رجبؒ اپنی کتاب "لطائف المعارف" میں مندرجہ بالا کلام کے بعد اس مسئلہ کے متعلق کہتے ہیں: اور شعبان کی پندرویں رات یعنی شب.برات اہل شام میں سے خالد بن معدان،اور مکحول،اور لقمان بن عامر وغیرہ کی تعظیم کرتے ہوئے اس رات عبادت کرنے کی کوشش کرتے، اور لوگوں نے ان ہی سے اس رات کی فضیلت اور تعظیم کرنا سیکھی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ: انہیں اس سلسلہ میں کچھ اسرائیلی آثار پہنچے ہیں،۔۔۔۔اور حجاز کے اکثر علماء کرام نے اس کا انکار کیا ہے جن میں عطاء، ابن علی ملیکہ شامل ہیں،اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے اسے فقہائے مدینہ سے نقل کیا ہے، اور امام مالکؒ کے اصحاب وغیرہ کا یہی قول ہے،ان کا کہنا ہے: یہ سب کچھ بدعت ہے۔۔۔۔اور امام احمدؒ سے شب.برات کے بارے میں کوئی کلام معلوم نہیں ہے۔۔۔ حافظؒ نے یہاں تک لکھا ہے کہ :شب.برات میں نفلی نماز اروشب بیداری کرنے ییں نبی اور ان کے اصحاب سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔بس یہ باتیں مکمل طور پر ہمارے لیے کافی ہیں کہ شب.برات جس شکل میں آج منائی جاتی ہے وہ کسی بھی طرح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قابل قبول نہیںہے۔اور جس چیز کو اسلام قبول نہ کرتا ہو اور نہ ہی اس پر عمل کرنے کے لیے کہے، لیکن پھر بھی اپنی دلچسپی،دگی اور خوشی کے لیے انجام دی جائے تو

! وہ دین اسلام سے دوری ہی قائم کرنے کا ذریعہ بنے گی

:قرآن واضح راہنمائی کرتا ہے

واقعہ کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ ہماری مکمل راہنمائی فرماتے ہوئے کہتا ہے کہ: "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے" (المائدہ: ۳)

۔دین کو مکمل کر دینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظامِ فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظامِ تہذیب و تمدّن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ نعمت تمام کرنے سے م±راد نعمتِ ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے۔ اور اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے میری اطاعت و بندگی اختیار کرنے کا جو اقرار کیا تھا، اس کو چونکہ تم اپنی سعی و عمل سے سچّا اور مخلصانہ اقرار ثابت کر چکے ہو، اس لیے میں نے اسے درجہقبولیّت عطا فرمایا ہے اور تمہیں عملاً اس حالت کو پہنچا دیا ہے کہ اب فی الواقع میرے سوا کسی کی اطاعت و بندگی تمہاری گردنوں پر باقی نہ رہی۔ اب جس طرح اعتقاد میں تم میرے مسلم ہو اسی طرح عملی زندگی میں بھی میرے سوا کسی اور کے مسلم بن کر رہنے کے لیے کوئی مجبوری تمہیں لاحق نہیں رہی ہے۔مزید فرمایا: "کیا یہ لوگ

کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اِذن نہیں دیا؟" (الشوریٰ:21)۔ اس آیت میں شرکَاء سے مراد، ظاہر بات ہے کہ وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، یا جن کے آگے پوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں۔، بلکہ لامحالہ ان سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے، جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور ان فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اخلاقی اصولوں اور، تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور ضابطوں کو اپنے مذہبی مراسم اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں میں اور اپنی سیاست اور حکومت میں، اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت، ہے جس کی پیروی ان کو کرنی چاہیے۔ یہ ایک پورا کا پورا دین ہے جو اللہ رب العالمین کی تشریع کے خلاف، اور اس کے اذن کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے ایجاد کیا اور ماننے والوں نے مان لیا۔ اور یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے۔اسی جانب یہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم نے فرمایا: "جس نے بھی ہمارے اس دین میں نیا کام ایجاد کیا جو (دراصل) اس میں

نہیں تو وہ نا قابل قبول ہے" (بخاری و مسلم)۔اور حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم خطبہ میں کہا کرتے تھے: "بلا شبہ سب سے بہتر کام اللہ تعالی کی کتاب ہے، اور سب سے اچھا اور بہتر طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اور سب سے برا کام بدعت اور دین میں نیا کام ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے" (صحیح مسلم)۔

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا دائرہ

ایک وقت تھا جب ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔انگریز اپنی عیاری و مکاری "پھوٹ ڈالو راج کرو" کی پالیسی پر گامزن تھا اور یہاں کے عوام و خواص اس کے شکار تھے۔اس کے باوجود غلامی کو محسوس کیا جاتا تھا نیز غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے اور ریاست کو آزاد کرانے کے حوصلہ بلند تھے۔اس سعی و جہد میں نہ صرف ملک کے دیگر مذاہب کے لوگ سرگرم عمل تھے بلکہ مسلمان بھی اپنے سروں سے غلامی کے طوق اتارنے اور ملک کو آزاد کرانے میں ہمہ تن مصروف تھے۔پھر ایک وقت آیا کہ ہند سے انگریز کوچ کر گئے، ملک آزاد ہو گیا لیکن ساتھ ہی حادثہ عظیم بھی برپا ہوا۔مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کیا گیا اور ملک تقسیم ہو گیا۔جس طرح انگریز آزادی سے قبل عیاریوں میں مصروف رہے اسی طرح آزادی کے وقت اور اس سے ذرا قبل ملک کا باشعور عیار طبقہ مسلمانوں کو تقسیم کرنے کے درپے ہو گیا۔منافرت پر مبنی سیاست کو فروغ دیا گیا اور عظیم قربانیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے مسلمانوں کی قوت کو منتشر کرنے کی ہر ممکن سعی و جہد کی گئی۔نتیجہ پہلے پاکستان اور بعد میں بنگلہ دیش وجود میں آئے اور ان دونوں ہی ممالک کو بنانے اور قائم کرنے میں اُسی باشعور عیار منافرت پر مبنی سیاست کرنے والا طبقہ سرگرم رہا جو آج بھی مصروفِ عمل ہے۔

:مسائل جن سے کل دو چار تھے

ہندوستانی مسلمان جن مسائل جن مسائل سے دو چار ہوئے ان میں آزاد ہند کے مسلمانوں نے ہجرت کو غنیمت سمجھا۔پڑھا لکھا طبقہ اور شعور و صلاحیت کے مالک پاکستان میں پناہ گزیں ہوئے اس کے باوجود وہ ایک طویل عرصہ "مہاجر"کے نام پر ذلیل و خوار کیے گئے۔ان کو وہ حقوق نہیں دیے گئے جو ہندوستان میں آئے مہاجرین کے حصہ میں آئے۔مہاجر حقوق کی بازیابی اور اسلام سے اپنے تعلق کو اُس اسلامی ملک میں حاصل کرنے کی سعی و جہد کرتے رہے جس کی بنا ہی اسلام پر پڑی تھی۔دوسری جانب ہند میں وہ متصل علاقے اور ریاستیں جو مسلم اکثریت پر مبنی تھیں ،مسلمانوں کی ہجرت کے نتیجہ میں ، بقیہ اکثریت نے مسلمانوں کا دل کھول کر قتل عام کیا اور ہر سطح پر اسلام ،اسلامی تشخص،اسلامی آثار اور ساتھ ہی مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی منظم سعی و جہد کی گئی۔پھر ان تمام علاقوں میں جہاں مسلمان کسی بھی درجہ پسماندگی کے باوجود زندہ نظر آتے تھے ان کو باقاعدہ اور ایک منصوبہ کے تحت سلسلہ وار فسادات کی آگ میں جھلسایا گیا نیز ان کے جذبات سے کھوب کھلواڑ کی گئی۔اس کے برخلاف اسلام کے نام پر قائم کردہ ملک میں نہ صرف امریکہ اور اس کی فکر حاوی ہو گئی بلکہ عام و خواص نے مادہ پرستی کی چادر کو اوڑھنا بچھونا بنالیا، ساتھ ہی اُس نعمتِ عظیم کو پس پشت ڈال دیا جو ان کو ملی تھی۔مغربی تہذیب عام ہو چلی اور اسلام ، اسلام

پسند جماعتوں اور افراد کو ہر ممکن زیر کرنے کی وہاں بھی منظم کوششیں شروع ہو گئیں۔امریکہ جو اپنی چالوں میں بہت ہوشیار باش کہلایا وہ اپنی چالوں میں بدمست رہا۔ پہلے اُس نے مسلمانوں کے جذبات سے کھلواڑ کی اور بعد میں مسلم ممالک پر راست یا بلاواسطہ ناجائز قبضے کیے اور ان جذبات سے کھیلا گیا جن کو پروان چڑھانے میں سب سے زیادہ اگر کسی کا حصہ ہوگا تو وہ ناپاک عزائم رکھنے والے ہی کا تھا۔ نتیجہ یہ کہ مادیت میں مدہوش مسلمانوں نے مسلمانوں ہی کے جان و مال سے کھیلنا شروع کر دیا۔اور یہاں ملک عزیز ہند میں چہار طرفہ مسائل میں گھرنے کے باوجود مسلمان اپنے آپ کو قدرے بہتر کو محسوس کرنے لگے۔شاید اسی لیے کہ اس وقت جبکہ مظالم کے پہاڑ توڑے جارہے تھے انھوں نے ایک جرت مند فیصلہ کیا تھا کہ وہ رہیں گے تو اسی ملک ہند میں رہیں گے، مصائب اور آلام سے دوچار ہوں گے اس کے باوجود نعمتِ اسلام جو ان کو ملی ہے، ضائع نہ ہونے دیں گے۔ملک عزیز ہند میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دیں گے اور ان لوگوں کے درمیان اسلامی تعلیمات کو عام کریں گے جو درحقیقت اس کے مستحق ہیں۔اس طرح وہ اللہ اور اس کے بندوں کا حق ادا کرتے ہوئے ملک کو امن وامان کا گھوارہ بنانے میں اپنی جانب سے کسی بھی طرح کی کسر روانہ رکھیں گے۔

اور یہ ہمارا موجودہ دور:

گزشتہ دو دہائیوں میں ہندوستانی مسلمانوں نے ایک کے بعد ایک پریشانیوں کا سامنا کیا ہے۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ بابری مسجد کی شہادت، گجرات فسادات قابل ذکر ہیں اور اب یہ چند سالوں سے دہشت گردی کے واقعات اور اِس پس منظر میں بڑے پیانے پر مسلم نوجوانوں کی گرفتاریاں! یہ وہ واقعات ہیں جنھوں نے ایک طرف مسلمانوں کو اس ملک میں خوف وہراس میں بتلا کیا ہے تو وہیں دوسری طرف وہ عدم تحفظ کا شکار ہوئے ہیں۔ اس ملک میں گزشتہ پینسٹھ برس سے مسلمان پسماندگی اور امتیازی سلوک کا شکار رہے ہیں جس کی شہادت حکومت کی قائم کردہ سچر کمیٹی رپورٹ پیش کرتی ہے۔ یہ وہ رپورٹ تھی جس نے اہل ملک اور خود مسلمانوں کی آنکھوں پر پڑی پٹی کھول دی۔ بڑے پیانہ پر اس پر تبصرے، سیمنار اور مذاکرے ہوئے لیکن نتیجہ کے اعتبار سے کیا کچھ ہوا؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ خصوصاً آج کے حالات میں جہاں ایک طرف بنگلہ دیشی کے نام پر آسام میں مسلمانوں کے جان و مال سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ اور افسوس کہ یہ سب اسی حکومت کی پشت پناہی میں ہو رہا ہے جس نے خود سچر کمیٹی کی رپورٹ پر عمل درآمد کی بات کہی تھی۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ملک میں مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہے۔ مزید بتایا کہ مسلمان تعلیمی، سماجی اور اقتصادی طور پر بہت زیادہ پچھڑ چکے ہیں۔ سچر کمیٹی کی ہی رپورٹ نے پہلی بار اس بات کا بھی خلاصہ کیا تھا کہ ملک کی جیلوں میں مسلمانوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ یعنی پورے ملک میں مسلمانوں کی آبادی جہاں تقریباً

فیصد ہے، وہیں جیلوں میں ان کی آبادی تقریباً 22 فیصد ہے۔اس کے باوجود ملک 12 میں قیاس پر مبنی، بلاثبوت اور فرضی الزامات کے تحت مسلم نوجوانوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہے۔یہ سب کیا ہے؟ اس کا جواب کون دے گا؟ کیا یہ حکومت کی ذمہ داری نہیں کہ وہ اس پر روک لگائے؟ مزید۔برآں آج صورتحال یہ ہے کہ سامراجی ممالک کی نقالی کرتے ہوئے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں مسلمانوں کو دہشت گردی کے نام پر حراساں کیا جارہاہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو اس قدر خوف زدہ کر دیا جائے کہ وہ اپنا اسلامی تشخص ہی کھوڈالیں۔یہ وہ۔بڑے مسائل ہیں جن سے آج ملک عزیز ہند میں مسلم امہ نبرد آزما ہے۔

!خوش آئند پہلو بھی ہیں

مسائل کے باوجود چند خوش آئند پہلو بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔جن میں سب سے اہم اور خاص مسلم امہ کو امت مسلمہ ہونے کا شعور کسی نہ کسی درجہ پروان چڑھناہے۔یہ وہی احساس ہے جس کی ترجمانی قرآن حکیم میں اس طرح کی گئی ہے: "اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" (آل عمران:110)۔ اور یہی وہ نکتہ آغاز ہے جس کے نتیجہ میں نہ صرف مسلمان بلکہ محرمیوں کے شکار بقیہ اہل ملک بھی مستقبل قریب میں

انشا اللہ نجات پائیں گے۔ پھر نظر ڈالیں اُن گاؤں اور دیہاتوں کے حالات جہاں مسلمانوں کو بہ زور قوت مرتد اور مشرک بنا دیا گیا تھا تو وہ بھی آج کچھ بہتر نظر آتے ہیں۔آج اُن مقامات پر روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ مسلمانوں کے بچے قرآن پڑھ رہے ہیں،مدرسہ اور اسکول جارہے ہیں اور بذات خود ان کے اندر مسلمان ہونے کی حمیت و غیرت جاگ اٹھی ہے۔ ساتھ ہی وہ قوتیں اور طاقتیں جو کل تک مسلمانوں کو سیاسی میدانوں میں زیر کیے ہوئے تھیں ان کو آج حسرتوں میں ملوث دیکھا جا رہا ہے، اندورنی طور پر وہ خود کشمکش و انتشار کا شکار ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کے سینہ اندر سے پھٹے جا رہے ہیں۔اس کے برخلاف ملک عزیز ہند میں مسلمانوں کے درمیان ایک بار پھر سطحی صحیح لیکن سیاسی شعور بیدار ہو رہا ہے۔ وہ اپنی قوت اور طاقت کو سمجھنے لگے ہیں اور ان عَلم ، بینروں اور جھنڈوں کو اٹھانے سے گریز کر رہے ہیں جن کا بوجھ وہ گزشتہ پینسٹھ سال سے اٹھاتے آئے ہیں۔ ملک کی سیاسی، معاشی، سماجی، معاشرتی اور تمدنی صورتحال بد سے بدتر کی جانب گامزن ہے اور تجزیہ نگاروں کو اسلامی تعلیمات و نظام کے علاوہ کوئی دوسرا متبادل نظر نہیں آتا۔ایسی صورت میں اسلامی تعلیمات و نظام کی راہیں پروان چڑھ رہی ہیں۔ تعلیمی، معاشرتی اور تمدنی بنیادوں پر مسلم معاشرہ پروان چڑھ رہا ہے اس کے برخلاف دقیانوسی معاشرہ جو باطل عقائد اور ابہام پر مبنی ہے زیر ہوا چاہتا ہے۔اسلام کا خاندانی نظام مستحکم ہو رہا ہے بصورت دیگر نظام ہائے باطل کا خاندانی نظام

مغرب کی اندھی تقلید کے نتیجہ میں کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔ 11/9 اور اس طرح کے دیگر واقعات نے نہ صرف بین القوامی سطح پر بلکہ ملک عزیز ہند میں بھی اسلام کی دعوت، اس کو سمجھنے اور اس کو اختیار کرنے کے مواقع زیادہ کر دیے ہیں۔ مسلم امہ اسلام کے اجتماعی نظام سے ہم آہنگ ہو رہی ہے اور مسلکی اختلافات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ بین القوامی سطح پر اسلام کا سیاسی نظام کسی حد تک مستحکم ہونے کے نتیجہ میں امت مسلمہ کے فکر و عمل میں بھی مثبت ریوں کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ درحقیقت غلامی کے طوق جہالت اور غربت و افلاس نہ صرف جسموں پر بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر فکر و نظر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

آج نہ صرف دنیا کی بلکہ ملک عزیز ہند کی صورتحال بھی تبدیل ہوا چاہتیے اور توقع کی جاتی ہے کہ اللہ رب رحیم کی رحمتیں مستقبل قریب میں مزید نازل ہوں گی (انشاءاللہ)۔ شرط بس وہی ہے، کہا کہ: "نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے" (البقرہ: 279)۔ اور ساتھ ہی یہ قرآنی ہدایت بھی جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت بخشے جنھوں نے نعمتِ ایمان پا لینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ خود اس بات پر گواہی دے چکے ہیں کہ یہ رسول حق پر ہے اور ان کے پاس روشن نشانیاں بھی آچکی ہیں۔ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے، اسی حالت میں وہ

ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہو گی اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی " (آل عمران: 76-78)۔پس یہ دو ہدایتیں اہل ایمان کے لیے کافی ہیں ان حالات میں جن سے وہ آج دوچار ہیں۔ہدایات کی روشنی میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حق وانصاف نہ صرف خود حاصل کریں بلکہ دوسروں کے بھی کام آئیں۔ اسلام جو انسانیت کا بہی خواہ ہے اس کو مکمل طور پر اختیار کریں اور یاد رکھیں اس عمل کے نتیجہ میں وہ اللہ سے مزید قریب ہو جائیں گے۔اللہ کی پشت پناہی ان کو نصیب ہو گی اور جس کی پشت پر اللہ ہو اس سے بڑھ کر کون طاقت ور اور خوش قسمت ہو سکتا ہے! ہدایت کی کہ: " پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، اور وہ تمہیں چھوڑ دے، تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے " (آل عمران: 159)۔لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم اسلام کے پیغام کو بے کم وکاست ملک عزیز ہند میں ہر سطح پر قائم کردیں ساتھ ہی اُس تنبیہ کو یاد رکھیں جس میں انکار نعمت کے نتیجہ میں کہا کہ: " اور وہ تمہیں چھوڑ دے، تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ " (آل عمران: 160) ۔قرآن کریم پر یقین رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ قیامِ عدل کے لیے، حق وانصاف کے لیے اور امن وامان کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور ثابت کردیں کہ وہ اسلامی تعلیمات پر نہ صرف قول سے بلکہ

عمل سے بھی یقین کامل رکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مثالی کردار

اللہ تعالٰی نے انسانی کردار کے دونوں رُخ قرآن حکیم میں بیان فرما دیے ہیں۔ایک رخ، بد کردار لوگوں کا اور دوسرا نیک کردار لوگوں کا۔ بد کردار لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی تعلیمات کو بھلا کر شیطان کو اپنا رب مانتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔اس لیے آخرت میں شیطان اور وہ ایک دوسرے کے شریک ہوں گے اور ایک ساتھ جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ پھر اللہ تعالٰی متوجہ کرتا ہے، سمجھاتا ہے اور ڈراتا ہے کہ: "اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا، یہی لوگ فاسق ہیں" (الحشر: ۱۹)۔

بد کردار لوگوں کے مقابلے میں قرآن نیک صفت انسانوں اور ان کی اجتماعیت کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ کہا کہ: "البتہ جو لوگ تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرلیں، ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا" (النسائ: ۱۴۶)۔اس آیت کریمہ میں نیک صفت لوگوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے وہ کسی بھی لمحہ غفلت کا شکار نہیں ہوتے۔

وہ اللہ کو ہر معاملے میں یاد رکھتے ہیں۔ اس کی ہدایت کی روشنی میں اپنی زندگی کے روز و شب گزارتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو فوراً اللہ کی جانب پلٹتے ہیں۔ توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں سے اللہ رب العزت راضی ہوتا ہے اور ان کو اپنے انعمات سے نوازتا ہے۔ ایسا شخص، گروہ یا قوم اللہ کو پسند ہے اور وہ ان کو مومنین کے زمرے میں شامل کرتا ہے۔ مومنین وہ ہیں جو اپنے رب کی رضا کے طالب ہوتے ہیں۔ اپنے ہر عمل میں محتاط اور حساس ہوتے ہیں، یہی لوگ آخرت میں زمین کے وارث ہوں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوگا اور آخرت کی کامیابی ان ہی کے لیے ہے۔ اس طرح جو بات ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ انسان کے اچھے اعمال اس کی کامیابی کی ضمانت دیتے ہیں۔ ان اعمال کے نتیجہ میں اللہ فرد واحد سے بھی اور اُس گروہ اور قوم سے بھی راضی ہو جاتا ہے جس کا اخلاق اعلیٰ ہوتا ہے۔ اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے ان کا کردار بھی مثالی ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: "بشارت دے دو ان لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے" (الاحزاب: ۴۷)۔

عملی نمونہ کی ضرورت :

کسی بات پر عمل کرنے کے لیے پہلی ضرورت علم کی ہوتی ہے اور دوسری عمل کی

۔علم کے ذرائع محفوظ شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں اور عمل کرتے ہوئے افراد بھی اللہ کے فضل سے ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں۔یہی وہ دونوں چیزیں ہیں جن کی ہر زمانے اور ہر مقام پر اشد ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور اگر یہ دونوں چیزیں موجود ہوں تو انسان میں عمل کی تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ایک آئیڈیل انسان کی ہر محاذ پر ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔اگر یہ عملی نمونہ موجود نہ ہو تو ہر انسان اپنی عقل کے مطابق عمل کے میدان میں اتر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مختلف انسان مختلف راہیں طے کرتے ہوئے درمیان میں بہت سی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے نہ وہ خود اپنے لیے اور نہ ہی دوسروں کے لیے مثالی کردار بن پاتے ہیں۔اس لیے لازمی ہوا کہ کوئی ہستی ایسی ضرور ہونی چاہیے جو علم اور عمل دونوں میں اپنی مخصوص حیثیت رکھتی ہو۔اس ضرورت کے پیش نظر انسانوں کو بنانے والے اللہ نے خود ہی اس کا مکمل انتظام بھی فرما دیا ہے۔ اللہ نے نبیوں اور رسولوں کے سلسلے کو جاری کیا اور ان کو راست علم سے نوازا اور عمل کی توفیق دی تاکہ یہ شخصیات دنیا کے لیے نمونہ بن سکیں۔ نبیوں کے سلسلے کو ختم کرتے ہوئے آخری رسول محمد کو دنیا میں بھیجا جو قیامت تک انسانوں کے لیے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر محاذ پر مثال اور نمونہ رہیں گے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : " مومنو! اللہ کا ارشاد مانو اور پیغمبر کی فرمانبرداری کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو" (محمد: ۳۳)۔یہاں جو باتیں بیان کی گئیں ہیں اس میں پہلی بات اللہ کے واضح

احکامات پر عمل کرنا ہر مسلمان پر لازم قرار دیا ہے جس کا تعلق علم سے ہے اور دوسری بات رسول اللہ کا اسوہ ہے جس کا تعلق عمل سے ہے۔ان دونوں احکامات پر عمل کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم جو کچھ کریں گے وہ ضائع نہیں ہوگا،ہم کسی نقصان میں مبتلا نہیں ہوں گے اور ہمیں کسی طرح کا خسارہ نہیں اٹھانا پڑے گا۔اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہوگا اور آخرت میں کامیابی و سرخروئی ہمارا مقدر ہوگی۔

: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت نمونہ

انبیا کرام اور پیغمبران اسلام کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد تکمیل اخلاق تھا۔اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پہلا مقصد یہ تھا کہ انسان صرف اللہ کی بندگی کرے اور دوسرا یہ کے وہ اعلیٰ اخلاق پر فائز ہو تا کہ وہ اپنے رب کو جانے،مانے،تصدیق کرے اور عمل کرتے ہوئے دنیا میں امن و سکون برقرار رکھے۔جس مقام پر یہ دو مقاصد پورے نہیں ہوسکے ہیں اُس مقام پر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی جائے اور حصول مقصد کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کی جائیں۔یہ جدوجہد انفرادی اور اجتماعی دونوں محاذ پر انجام دی جائے۔فرد واحد کی زندگی کو بھی تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے اور معاشرہ کی صورتحال کو بدلنے کے لیے بھی کوشاں رہا جائے۔اِس نصب العین کو ہر لمحے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا جائے،اولیت اور اہمیت دی جائے اور اس سے غفلت کسی بھی درجہ میں نہ

برتی جائے۔ اس سلسلے میں یا کسی بھی معاملے میں اگر عملی نمونہ کی ضرورت محسوس ہو، تو نبی امی محمد کو دیکھا جائے ۔ اللہ تعالی فرماتا ہے کہ : وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیمٍ (القلم : ۴) ۔ "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو"۔ اس آیت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بلند اخلاق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت شخصیت تھی کہ جس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ متوازن تھا۔ لہذا ایک متوازن ذہن کی پیروی کرنا ہمارے لیے بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اور ایسے ہی انسان کی پیروی بھی کرنی چاہیے جس کا دماغ صحیح ہو، جس کی فطرت صالح ہو اور جس کا مزاج معتدل ہو۔ ہمارے لیے وہ حضرات بھی قابل نمونہ ہیں جن کو اصحاب رسول کا شرف ملا اور ہمارے وہ علماء اور امراء بھی قابل نمونہ ہیں جو اسلام پر عمل پیرا رہنے والے ہیں۔ کیونکہ یہ تمام لوگ نبی کی ذات پر خود عمل پیرا رہنے والے ہوں گے لہذا ہمارے لیے ان کی پیروی کرنا آسان ہو جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بہترین تعریف حضرت عائشہؓ نے اپنے اِس قول میں فرمائی ہے کہ :کان خلقہ القرآن۔ "قرآن آپ کا اخلاق تھا"۔ (امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی) ۔ اور اسی بات کو اللہ تعالیٰ اس طرح ارشاد فرماتا ہے کہ: وَاِنَّکَ خُلُقٍ عَظِیمٍ (القلم : ۴) "اور اخلاق تمہارے بہت (عالی) ہیں"۔ معنی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی تھی بلکہ خود اس کا مجسّم نمونہ بن کر دکھا دیا تھا اور آپ کی زندگی ہر اس شخص کے لیے نمونہ ہے جو اخلاق کے اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کی خواہش رکھتا ہو۔

جس چیز کا قرآن میں حکم دیا گیا آپ نے خود سب سے بڑھ کر اس پر عمل کیا، جس چیز سے اس میں روکا گیا آپ نے خود سب سے زیادہ اس سے اجتناب فرمایا، جن اخلاقی صفات کو اس میں فضیلت قرار دیا گیا سب سے بڑھ کر آپ کی ذات ان سے متصف تھی، اور جن صفات کو اس میں ناپسندیدہ ٹھہرایا گیا سب سے زیادہ آپ ان سے پاک تھے۔ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی خادم کو نہیں مارا، کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا، جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کبھی آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا، اپنی ذات کے لیے کبھی کسی ایسی تکلیف کا انتقام نہیں لیا جو آپ کو پہنچائی گئی ہو الا یہ کہ اللہ کی حُرمتوں کو توڑا گیا ہو اور آپ نے اللہ کی خاطر اس کا بدلہ لیا ہو، اور آپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب دو کاموں میں سے ایک کا آپ کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپ آسان تر کام کو پسند فرماتے تھا، الا یہ کہ وہ گناہ ہو، اور اگر کوئی کام گناہ ہوتا تو آپ سب سے زیادہ اس سے دور رہتے تھے" (مسند احمد)۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ "میں نے دس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے۔ آپ نے کبھی میری کسی بات پر اُف تک نہ کی،

کبھی میرے کسی کام پر یہ نہ فرمایا کہ تُونے یہ کیوں کیا، اور کا کبھی کسی کام کے نہ کرنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تونے یہ کیوں نہ کیا" (بخاری و مسلم)۔یہ وہ زندگی ہے اور اس کی مختصر جھلک جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اِس ذات کی کیا حیثیت ہے۔کیونکہ وہ آخری نبی ہے لہٰذا تمام انسانوں کے لیے اُس کی سیرت پر عمل کرنے سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دونوں محاظ پر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے،اپنے کردار کو بے داغ بنایا جا سکتا ہے اور اپنے اخلاق کو مکارم اخلاق کے مقام پر پہنچایا جا سکتا ہے۔

آپکی گھریلو زندگی :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے اس لحاظ سے بھی قابل اہم ہے کہ آپ ہمارے قائد، رہنما، رہبر اور نبی ہیں۔آپ کی زندگی ہماری اجتماعی زندگی کے لیے بھی بہت اہم ہے۔جب ہم اس لحاظ سے آپ کی زندگی کا مطالع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی گھریلو زندگی میں امہات المونین کے ساتھ حسن سلوک، ان کی تربیت ان سے محبت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرتے، بچوں سے بے انتہا محبت کرتے اور، فرماتے کہ "بچے جنت کے پھول ہیں"۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ " حضور نے اپنے دست مبارک سے اللہ تعالٰی کے راستہ میں جہاد کے علاوہ کبھی کسی کو نہیں مارا۔نہ کبھی کسی خادم کو نہ کسی عورت کو (بیوی یا باندی وغیرہ) کو"۔یہ اس طرح کے بے شمار تذکرے ہمیں سیرت اور احادیث کی کتابوں میں

مل جائیں گی۔ جن سے ہمیں راہنمائی بھی ملتی ہے، حوصلہ بھی اور شوق بھی ۔ہماری اجتماعی زندگی کا وہ حصہ جس کو ہم گھر کہتے ہیں، جہاں ماں ، باپ ، بیوی بچے، بھائی بہن اور دیگر رشتہ دار ہوا کرتے ہیں ۔ ان کے ساتھ کس طرح سے پیش آئیں اور ان کے ساتھ کون سے رویہ اور طریقہ کو اختیار کریں اس کی مکمل وضاحت ایک طرف اللہ تعالی خود اپنے قرآنِ الحکیم میں فرماتا ہے اور دوسری جانب رسول کا اسوہ ہمارے لیے راہنمائی اور راہبری کا کام کرتا ہے۔ ہمیں اس جانب غفلت نہ برتتے ہوئے ، شعوری اور سنجیدہ زندگی گزارنی چاہیے تاکہ جب ہم قیامت میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں تو کوئی اٹھنے والا ہاتھ ایسا نہ ہو جو ہماری جانب ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں کا اشارہ کرے اور اللہ کا غضب ہم پر نازل ہو۔ ہمیں ہر لمحہ اُس بڑے دن سے ڈرتے رہنا چاہیے، یہی ہماری کامیابی کا لازمی تقاضہ ہے۔

آپ کی معاشرتی زندگی :

ہم جانتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی، اور نہ ہی کبھی کسی کے حق میں بد دعا کی ۔ بہت سے واقعات آپ کی زندگی سے وابستہ ہیں جہاں لوگوں نے آپ کو تکلیفیں پہنچائیں لیکن آپ نے ہمیشہ ان لوگوں کو معاف کر دیا اور یہی تعلیم آپ نے اپنے اصحابؓ کو بھی دی۔ پڑوسیوں کے حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ کہتی ہیں حضرت عمرؓ سے

مروی ہے کہ نبی کریم نے فرمایا: "جبریل ہمیشہ مجھ کو ہمسایہ (پڑوسی) کا حق ادا کرنے کی ہدایت کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ میں نے یہ خیال قائم کر لیا کہ جبریل امین پڑوسی کو وارث قرار دیں گے" (یعنی ایک ہمسایہ کو دوسرے ہمسایہ کا وارث بنا دیں گے) بخاری و مسلم)۔ اسی طرح لوگوں کی عزت احترام کے سلسلے میں فرمایا: " کبیرہ) گناہوں میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی اپنے والدین کو گالی دے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں جب یہ کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور یہ کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے" (جامع ترمذی)۔ لوگوں سے ہمدردی کے تعلق سے اللہ کے رسول فرماتے ہیں: "جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر رحم نہیں کرتا" (جامع ترمذی)۔ اللہ تعالی قرآن حکیم میں فرماتا ہے: "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی لوگ متقی

ہیں" (البقرہ:۱۷۷)۔اس آیت کریمہ میں ایک مہذب معاشرہ کی مکمل تصویر پیش کردی گئی ہے۔بتایا گیا ہے کہ معاشرہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر کون سے کام لازم ہیں اور کس طرح وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے لوگوں کے لیے خیر ثابت ہوتے ہیں۔یہاں اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کی بات ہے،اللہ کے حقوق یعنی عبادت کا تذکرہ ہے،لوگوں کے ساتھ معاملات اور معاہدوں کو بھی بہ خوبی ادا کرنے کی بات ہے۔اس طرح کی بے شمار ہدایات واحکامات قرآن و حدیث میں موجود ہیں ان احکامات پر عمل کرنے کے نتیجہ میں صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے اُن پہلوؤں پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے جن کا تعلق حکومت اور ریاست سے ہے۔ان میں معیشیت، معاشرت، تعلیم اور سیاست موٹے طور پر آتے ہیں۔ان کے تعلق سے بھی ہمیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی زندگی میں مکمل ہدایات ورہنمائی ملتی ہے۔کہا کہ: " یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین پر اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے" (سورۃ حج:۴۱) ۔اس طرح معلوم ہوا کہ حکومت کے اختیارات حاصل ہونے کے بعد سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ با اقتدار لوگ اللہ کی زمین پر اللہ کی مرضی کو نافذ کردیں۔اور کہا کہ: اور لوط کو ہم نے حکم اور علم"

بخشا اور اسے اس بستی سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی۔ درحقیقت وہ بڑی ہی بری، فاسق قوم تھی۔ اور لوط کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ صالح لوگوں میں سے تھا" (الانبیآء: ۷۴)۔ اس طرح واضح ہوگیا کہ حصولِ علم کا مقصد یہ ہے کہ معصیت کے کاموں سے بچا جائے اور ان کاموں سے بھی گریز کیا جائے جن کی ممانعت کی گئی ہے۔ اور علم کا مقصد یہ بھی ہے کہ اپنے ربِ حقیقی کو پہنچان لیا جائے، اس پر کامل یقین کیا جائے اور ساتھ ہی اس کے تمام احکامات خوش خلقی کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ اس طرح ملک، حکومت، سیاست، معیشیت اور تعلیم کے ذریعہ ایک صالح معاشرہ تشکیل پائے گا۔ معاشرہ جب صالح ہوگا تو اس میں بسنے والے لوگ امن و سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کریں گے۔ اسلامی تعلیمات پر مبنی معاشرہ وجود میں آئے اس کی خواہش فرد واحد کو بھی ہونی چاہیے اور اسلامی اجتماعیت کو بھی۔ یہ وہ جائز خواہش ہے جس پر عمل کرکے شخص کے کردار کو بھی سدھارا جاسکتا ہے اور ملک، قوم، معاشرہ کو بھی۔

مثالی کردار کے اختیار کا نتیجہ:

یہ بات عقل سے بعید تر ہے کہ جس چیز کی ہم خواہش کریں اس کو اپنی ذات کے لیے پسند نہ کریں۔ اسلامی بنیادوں پر استوار معاشرہ کی خواہش جب ہم اپنے دل میں رکھتے ہیں تو اس کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اختیار کرنے کے لیے بھی ہمیں تیار رہنا چاہیے۔ حالات سازگار نہ ہوں تو اس کے لیے جدوجہد کرنا

چاہیے۔اس خواہش کو رکھنے والے،اس پر عمل کرنے والے اور اس کے لیے جدو جہد کرنے والے،یہ تمام ہی وہ لوگ ہیں جن سے اللہ تعالی راضی ہوا اور اس نے دنیا ہی میں ایسے لوگوں کو جنت کی بشارت ان الفاظ کے ساتھ دے دی کہ: "اور یہ جنت جس کے تم مالک کر دیے گئے ہو تمہارے اعمال کا صلہ ہے" (الزخرف:۷۲)۔ایسے لوگوں سے اللہ تعالی خوش ہوگا جو دنیا میں اخلاق کے اعلیٰ معیار پر تھے ساتھ ہی وہ اہل ایمان تھے اور جنھوں نے مومن و مسلم بندے بن کر زندگی گزاری تو ایسے لوگوں کے لیے بشارت ہے اور یہی لوگ جنت کے وارث ہوں گے۔

اللہ تعالی کہتا ہے کہ زندگی میں انجام دیا جانے والا ہر چھوٹا اور بڑا عمل جب کہ تم نے کرنے کا ارادہ کیا، قبل اُس کے،اس بڑے دن کی ہولناکی اور سختی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے جس دن نہ کوئی باپ ہوگا اور نہ کوئی ماں جو اپنی مامتا کو یاد رکھ سکے گی۔وہ دن بڑا ہی زبردست ہوگا جب کہ دیدہ پھٹے جا رہے ہوں گے۔جو کچھ یہ انسان دنیا سے کما کر لے گیا وہی اس کا کل سرمایہ حیات ہوگا بس وہی اس کے کام آئے گا۔اس بات کو بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اعمال کا دار ومدار عقیدہ کی پختگی اور اخلاق کی برتری پر منحصر ہے۔اس لیے ہمارے سارے اعمال اُس دن اِن ہی دو چیزوں کے تحت پیش کیے جائیں گے۔اللہ تعالی فرماتا ہے کہ "اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے اور ہر

شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا۔ اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہوگا" (البقرۃ: ۱۸۲)۔ وہاں جو کچھ ہم کما کرلے جائیں گے اس کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا چاہے وہ اعمال صالحہ ہوں یا پھر اعمالِ رذیلہ۔ اللہ کی عدالت میں ذرہ.برابر بھی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ قرآن کہتا ہے: "انہیں المناک عذابوں کی خوشخبری سنا دو۔ ہاں ایمان والوں اور نیک اعمال والوں کے بے شمار اور نہ ختم ہونے والا اجر ہے" (الانشقاق: ۲۴-۲۵)۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اخلاق و کردار میں سدھار پیدا کریں اور دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنے والوں میں شمار ہو جائیں۔ اس کے لیے ہمیں ایک طرف نماز سے مدد لینی ہوگی اور دوسری طرف صبر سے۔ نماز ہمارے اندر مستقل مزاجی پیدا کرنے اور فحش اور معصیت کے کاموں سے بچنے میں مدد کرے گی۔ اور صبر ہمارے اندر منزلِ مقصود تک پہنچنے میں تعاون کرے گا۔ اور ہم دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں گے (انشااللہ)۔

زندگی کا بیش قیمت زمانہ: زمانہ طالب علمی

انسان کی زندگی مختلف ادوار کا حسین امتزاج ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چند لوگ اس زندگی کے مختلف ادوار سے بھرپور استفادہ کرپاتے ہیں اور بہت سے محروم رہ جاتے ہیں۔انسانی زندگی کا آغاز بچپن سے ہوتا ہے جہاں وہ بے شمار محبت والفت کے لمحات اپنے والدین اور اجزاء واقارب کے درمیان گزارتا ہے۔یہیں سے بچے کے سیکھنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔اس دور میں بچے نہ تو اسکول جاتے ہیں اور نہ ہی کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہیں اس کے باوجود وہ اپنے آس پاس کے ماحول میں جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ان کے ذہن میں پیوست اور ان کے عمل سے ظاہر ہونے لگتا ہے۔پھر جب وہ اسکول جاتا ہے تو معاشرے کے دیگر بچوں سے اس کا واسطہ ہوتا ہے جہاں مختلف قسم کی خاموش تربیت شدہ بچے اس کو میسر آتے ہیں۔اب وہ گھریلو ماحول کے علاوہ بھی دیگر ہمسایوں سے سیکھنے کی حالت میں آ جاتا ہے۔انسانی زندگی کے مختلف ادوار اسی طرح گزرتے جاتے ہیں اور ہر دور سے انسان بہت سے تجربات حاصل کرتا ہے۔انسان کی گھریلو تربیت،اسکولی بچوں اور اساتذہ سے تعلقات،کالج اور یونیورسٹی میں ملنے والے طلبہ وطالبات ،معاشرہ جس کا وہ حصہ ہے اس کے اثرات،یہ سب مل کراس کی شخصیت بنانے وسنوارنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔بچپن میں انسان کے پاس خواہشات اور مستقبل کے منصوبے ہوتے ہیں لیکن

جوانی وہ دور ہے جبکہ اُن خواہشات اور منصوبوں پر عمل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ کر گزرتا ہے جو کچھ کہ اس نے سیکھا ہے اور جو کچھ کہ وہ کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کے یہ لمحات جنہیں بچپن اور جوانی کہا جاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسکول اور کالج و یونیورسٹی کی زندگی ،فرد واحد کے لیے نہایت بیش قیمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک طرف اسکولوں میں بچوں کی تربیت کے مختلف طریقہ استعمال کیے جاتے ہیں تو وہیں دوسری طرف کالج و یونیورسٹی میں مختلف افکار و نظریات کی تشہیر ہوتی ہے۔ اور اس تربیت و افکار و نظریات کی تشہیر کے ذریعہ زندگی کو ڈھالنے کی بھرپور کوشش و جستجو ہو تی ہے۔

! بچپن کا فلسفی، تجزیہ نگار اور تخلیق کار

بچوں کی نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ تخلیق کی قوت پیدائشی نہیں، یہ کسی میں بھی پیدا کی جاسکتی ہے، اس بارے میں امریکا کی مشہور یونیورسٹی میری لینڈ کی ماہر نفسیات ایلس ٹیسن کہتی ہیں۔ " تخلیق کے بارے میں اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک مستحکم اور کسی قدر پراسرار صفت ہے جو صرف بعض خوش نصیب لوگوں کو حاصل ہوتی ہے لیکن تحقیق نے ثابت کردیا ہے کہ تخلیقی قوت کسی میں بھی پیدا کی جاسکتی ہے "۔ اس تحقیق سے ماں باپ اور اسکولوں کی ذمے داری میں اضافہ ہوگیا ہے۔ جب ان کے بچوں کے لئے تخلیقی قوت کے تمام راستے کھلے ہیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت ایسے انداز میں کریں کہ ان کی

تخلیقی قوت بیدار ہو جائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ تخلیق ہے کیا؟ تخلیق کے معنی ہیں نئی چیز بنانا۔ اس لحاظ سے تخلیق کار کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ نئی باتیں، نئے طریقے، نئے راستے سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس میں جستجو کا مادہ ہوتا ہے۔ اس کی خیالی تصویر بنانے کی قوتِ متخیلہ بہت تیز ہوتی ہے۔ اس کی سوچ میں رکاوٹ نہیں آتی۔ وہ جمالیات کی حس کا مالک ہوتا ہے۔ وہ من موجی اور جذباتی ہوتا ہے اور فرسودہ طریقوں کو دوہرانے سے اجتناب کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں ہر بچے میں موجود ہوتی ہیں۔ نہ صرف بڑے بچے بلکہ چھوٹے بچوں میں بھی یہ تمام باتیں ہوتی ہیں۔ وہ ہر چیز ہر کام کو بغور دیکھتے ہیں، ٹوہ لگاتے ہیں، کریدتے ہیں، چھوتے، سونگھتے اور سوچتے ہیں۔ کھلونوں سے باتیں کرکے اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہیں، اسے اپنی اسکیمیں بتاتے ہیں، ایک چیز میں کئی چیزیں ڈال کر دیکھتے ہیں کہ اس سے اب کیا بنے گا۔ ایک رنگ میں کئی رنگ ملاتے ہیں۔ وہ چیزوں کو کبھی علیحدہ رکھتے ہیں تو کبھی ڈھیر لگا لیتے ہیں۔ کبھی تقسیم کرتے ہیں تو کبھی چھپا دیتے ہیں یعنی تمام امکانات پر غور کرتے ہیں۔ گویا ہر بچہ اپنے آپ میں فلاسفر، تجزیہ نگار اور تخلیق کار ہوتا ہے۔

! زمانہ جوانی و طالب علمی

ویسے تو ہر انسان مرتے دم تک طالب علم ہی ہے لیکن زمانہ طالب علمی کا وہ

دور جس میں نوجوان کالج میں داخل ہوتا ہے، ہر لحاظ سے انسانی زندگی کا ایک اہم ترین دور ہے۔ یہاں اُس پر اِس قدر پابندیاں عائد نہیں ہوتی جن کو وہ اسکول کے زمانے میں برداشت کرتا آیا تھا۔ ساتھ ہی ماں باپ اور رشتہ دار بھی اب اس کو بالغ محسوس کرتے ہوئے ان طریقہ ہائے تربیت سے گریز کرتے ہیں جن سے وہ اب تک نبرد آزما رہے ہیں۔ دونوں ہی لحاظ سے ایک نوجوان کو دوسروں کا اعتماد حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی کافی آزادیاں بھی۔ بس یہی وہ لمحات ہیں جب کہ انسان در حقیقت انسان کا شرف حاصل کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی تخلیق کی لیکن وہ اللہ کے تمام فیصلوں کو روبہ عمل لانے کے پابند بنا دیے گئے۔ اس کے برخلاف انسان کو حکم ماننے اور نہ ماننے کی آزادی دی گئی۔ بچہ جب گھر اور اسکول میں ہوتا ہے اس کو کافی حد تک والدین اور اساتذہ کے حکم بجا آوری کرنا ہوتی ہے لیکن جب وہ اسکول سے نکل کر کالج میں داخل ہوتا ہے اِس دور میں اُس پر وہ پابندیاں ختم ہونے لگتی ہیں۔ وجہ بس یہی کہ ماں باپ اور اساتذہ کو گمان ہوتا ہے کہ ان کی اب تک کی گئی تربیت رنگ لائے گی۔ ایسے وقت میں ایک نوجوان کی زندگی، اس کی پسند اور نا پسند، اس کی فکر، اس کے خیالات اور ان خیالات پر مبنی دنیا کو دیکھنے کا نظریہ۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر اس کا گرم خون اور گرم خون میں ڈوبے اس کے جذبات و احساسات اور اس کی قوت و توانائیاں۔ یہ تمام چیزیں مل کر اس کو کسی بھی رخ اختیار کرنے میں مانع نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان ملک و قوم و ملت کا مستقبل

کہلاتے ہیں، وہ جس رخ پر چل پڑیں اس رخ کی طلاطم خیز ہواؤں کا سینہ چیرتے ہوئے اور تمام دشواریوں و پریشانیوں کو بہ آسانی برداشت کرتے ہوئے آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

لیکن کوششیں رخ موڑنے کی رہی ہیں !

حقیقت یہ بھی ہے کہ زمانہ طالب علمی میں نوجوان بڑی عمر کے لوگوں کے بالمقابل زیادہ مخلص ہوتے ہیں۔ عام طور پر بڑی عمر کے لوگ اپنے مفاد کے پیش نظر ہی اقدام کرتے ہیں اس کے برخلاف طالب و نوجوان کسی قسم کے ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر نیز مستقبل کی پرواہ کیے بغیر اقدام کر گزرتے ہیں۔ اخلاص کی حد درجہ زیادتی نوجوانوں کی کمزوری کہیں یا خوبی، اِسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف طاقتیں، پارٹیاں اور تنظیمیں نوجوانوں کو اپنے مقاصد و نصب العین سے وابستہ کرتی ہیں۔ اور اگر کسی گروہ یا طاقت کو یہ محسوس ہو کہ طلبہ و نوجوانوں کا فلاں طبقہ ہمارے لیے کارآمد نہیں بلکہ الٹا وہ ہمارے نظریہ اور فکر کو بھی چیلینج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو پھر اس کو مختلف طریقوں سے زیر کرنے کی منظم سعی و جہد کی جاتی ہے۔ جو کچھ کہ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کہیں طلبہ و نوجوانوں کو عقائد کے اعتبار سے گمراہ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں تو کہیں ایکٹوزم کی غلط تشریح و تعبیر کے ذریعہ ان کی صلاحیتوں کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کیا جارہا ہے۔ کہیں طلبہ و طالبات

کے بے جا تعلقات کو وقت کی ضرورت بتا کر گمراہ کیا جا رہا ہے تو کہیں ان کو نفسیاتی ہیجان میں مبتلا معاشرہ کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہے۔ کہیں انٹرٹینمنٹ اور سماجی روابط کے نام پر اُن کے وقت اور صلاحیتوں کے رخ کو موڑا جا رہا ہے تو کہیں فحاشی، عریانیت اور ننگ و عار کو فیشن اور تہذیب جدید کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں اور زندگی کے اس خوبصورت دور میں عام طور پر بے مقصد زندگی گزارنے والے طلبہ و طالبات گمراہی کو بہ آسانی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ان میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد گمراہی میں مبتلا نہ کیے جا سکیں تو یہ طاقت و قوت کے سرچشمے ظلم و جبر اور مختلف قسم کے استحصال کو ذریعہ بناتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ ان کے قبضہ قدرت میں آ جائیں۔ ان حالات میں طلبہ و طالبات اور نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت سے بخوبی واقف ہوں۔ اور اگر وہ خود حقیقت ذات اور حقیقت خودی کی جانب پیش رفت نہ کریں تو پھر مخصوص حالات کے پیش نظر باشعور، سنجیدہ، مخلص، دیانت و امانت دار افراد و گروہ کو چاہیے کہ طلبہ و طالبات کے سامنے ان کی حیثیت واضح کر دیں۔ جن گمراہیوں، بدکرداریوں اور لایعنی و بے مقصد کاموں میں وہ مصروف عمل ہیں ان سے ان کو متنبہ کر دیں۔ ملک اور قوم و ملت کے لیے ان کو مفید بنائیں تاکہ جہاں وہ بذات خود ایک صادق و امین شخصیت بن کر ابھریں وہیں دوسری جانب ان کے ذریعہ ایک بہتر معاشرہ بھی تشکیل پائے۔ اور یہ طلبہ و طالبات ان تمام مثبت رویوں کو اختیار کریں جو ان سے توقع کی جاتی ہے۔ علامہ

اقبال جو نہ صرف شاعر مشرق بلکہ مفکر اسلام بھی کہلائے وہ مسلم نوجوانوں سے کیا امید و توقع رکھتے تھے ؟آیئے ان کے اشعار میں اس کو سمجھنے کی کوشش کریں :

تابش از خورشید عالم تاب گیر
برقِ طاق افروز از سیلاب گیر.
ثابت و سیارہ گردوں وطن
آں خداوندانِ اَقوامِ کہن
ایں ہمہ اے خواجہ ! آغوشِ خواند
پیش خیز و حلقہ در گوش تواند
جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس وآفاق را تسخیر کن

اے مردِ مسلمان ! دنیا کو روشن کرنے والے سورج سے حرارت اور چمک دمک لے "

لے۔ پانی کے سیل رواں سے اپنے گھروں کو روشن کرنے والی بجلی پیدا کر۔ آسمان پر بسنے والے ساکن اور متحرک اَجرام فلکی، جنہیں زمانہ قدیم کی قومیں اپنا معبود خیال کرتی تھیں، تمہاری کنیزیں اور تمہارے حلقہ بگوش غلام ہیں۔ تو تلاش و جستجو کا عمل جاری رکھ، اسے اپنی تدابیر سے مضبوط اور نتیجہ خیز بنا اور اس ارض و سما کو تسخیر کر"۔ اور اس سب کو کرنے کے ساتھ ساتھ اے مردِ مسلماں تو عالم انسانیت کے لیے امن و امان کو گہوارہ بن جا۔ ربِ مالکِ کائنات کو پہچان کہ جس نے تجھے پیدا کیا۔ اُس کے آگے سجدہ ریز ہو جا ان تمام معاملات میں جو کچھ کہ تو انجام دیتا ہے۔ ساتھ ہی اپنے آپ کو بھی پہچان کہ تیری یہ قوت و توانائیاں اور تیرے یہ جذبات و احساسات کہیں غلط رخ نہ اختیار کرلیں۔ اے قوی جسم و روح کے مالک نوجواں طالب علم اپنے اخلاق کو اعلیٰ اقدار پر استوار کر کہ یہی نبی امیؐ کا مقصد حیات بھی تھا۔ رب کائنات اعتراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ : وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم : ۴)۔ "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو"۔ امت کی ماں حضرت عائشہؓ نے بھی آپ کے تعلق سے یہی فرمایا ہے: :کان خلقہ القرآن۔ "قرآن آپ کا اخلاق تھا"۔ (امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ابن ماجہ، دارمی) ۔اب بس جو طالب علم بھی بوڑھاپے،زمانہ سستی کسالت انحطاط،نا قابل تلافی کمزوری، پست ہمتی اور جسم و روح کی فرسودگی کے تسلط ضعیفی سے پہلے اپنے اس دور جوانی و طالب علمی کو پہچان جائے، دور جوانی و طالب علمی کی قدر و

اہمیت اس پر واضح ہوجائے اور اس کو صحیح رخ پر قائم کرنے کا وہ تہیہ کرلے، وہ کامیاب ہوگیا۔ اور جو ایسا نہ کرکے ،زمانہ حال سے متاثر ہوکر اپنی شخصیت کو تباہی و بربادی کے راستے پر چل پڑے، درحقیقت وہ ناکام رہا۔ فیصلہ بھی خود ہی کرنا ہے اور اقدام بھی خود ہی ! دیکھنا یہ ہے تمام تر صلاحیتوں کے مالک طلبہ وطالبات اپنے مستقبل کو کس جانب گامزن کرتے ہیں۔ بس اسی سے فرد واحد، قوم وملت اور معاشرہ کا مستقبل طے ہو جائے گا۔ اللہ ہماری مدد فرمائے اور صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے (آمین)۔

لابینگ میں والمارٹ ہی نہیں اور بھی شامل ہیں

نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی اپنے مخصوص ایجنڈے پر عمل درآمد کرانے والے برسر اقتدار لوگوں کے تعاون کے حصول میں سرگرم رہتے ہیں۔اس کے لیے وہ ذمہ دار طبقہ سے روابط قائم کرتے ہیں نیز ان کو اپنا ہمنوا بنانے کی سعی و جہد کرتے ہیں۔یہ بات تو صحیح ہے کہ اگر کوئی شخص،ادارہ، گروہ یا ملک اپنے فکر و خیال کو دوسروں میں عام کرنے کے لیے گفتگو، ملاقاتیں، بحث و مباحثہ،ڈائیلوگ،مذاکرے اور سیمنار کے ذریعہ رائے عامہ ہموار کرتا ہے تو یہ مناسب طریقہ ہے۔لیکن اس کے برخلاف اگر کوئی اپنی بات، فکر و خیال اور مقاصد کے حصول کے لیے برسراقتدار لوگوں کو جائز طریقہ کار کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ استعمال کرتا ہے تو وہ نہ صرف غیر مناسببلکہ غیر دستوری بھی کہلائے گا۔اور یہی کچھ آج ہندوستان میں جہاں دنیا کی سب سے بڑی غربت زدہ آبادی پائی جاتی ہے،اس میں کیا جارہاہے۔ایک طرف لوگوں کو کاٹا اور بانٹا جارہا ہے،ان میں دوریاں بڑھائی جا رہی ہیں، ملک جن لوگوں کے تعاون سے ترقی کرتا ہے ان ہی کا کھلے عام استحصال کیا جا رہاہے،تو وہیں دوسری طرف باہری لوگوں کو ملک کی سالمیت اور معیشت میں حصہ دار بنایا جارہاہے۔یہ حالات کیسے ہندوستان کی ترقی و فلاح میں مددگار ہو سکتے ہیں؟امن و امان اور ترقی

تو اسی وقت ممکن ہے جبکہ ایسے کرپٹ اور ملک فروش لوگوں پر گرفت کسی جائے۔ لیکن یہ کام دوریوں سے نہیں بلکہ نزدیکیوں سے ہوگا۔ عوامِ ہند کو سمجھنا چاہیے کہ کچھ قوتیں ان کو تقسیم کرنے کے درپے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے ایجنڈے کو سمجھا جائے اور ایسے لوگوں کو کسی بھی سطح پر۔ برسر اقتدار نہ آنے دیا جائے جو انسانوں کو مشتعل کرنے والے، غلط فہمیاں فروغ دینے والے، نفرتیں بڑھانے والے اور ملک میں امن و سلامتی کو متاثر کرنے والے رہے ہیں۔

والمارٹ لابیئنگ اور ایس پی بی ایس پی کا انجنڈا :

اس انکشاف کے بعد ملک کی پارلیمنٹ اور اس کے باہر سیاسی طوفان بپیدا ہو گیا ہے کہ عالمی ریٹیل کمپنی والمارٹ نے گزشتہ چار سال کے وران امریکی سینیٹرس میں لابینگ کے لیے تقریباً 125 کروڑ روپے خرچ کیے ہیں۔ اپوزیشن نے راجیہ سبھا میں خوب ہنگامہ کیا ہے اور آئندہ آنے والے دنوں میں اس کے خلاف مورچہ کھولنے کی بات کہی ہے۔ بی جے پی، جنتا دل یو اور بائیں بازو کے بشمول اپوزیشن جماعتوں نے اسے ایک سنگین معاملہ قرار دیا ہے نیز وزیر اعظم سے اس بارے میں پارلیمنٹ میں بیان دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ وقفہ صفر کے دوران معاملہ اٹھاتے ہوئے اپوزیشن کے ڈپٹی لیڈر روی شنکر پرساد نے بتایا کہ وال مارٹ نے امریکی سینیٹ میں ایک رپورٹ کے ذریعہ انکشاف کیا ہے کہ اس نے ہندوستان میں کھدرے بازار میں داخلہ کے لیے لابیئنگ کی اور اس کے لیے

کروڑ روپے خرچ کیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں پارلیمنٹ میں کافی بحث 125 ہو چکی ہے لیکن امریکی سینیٹ میں پیش کردہ وال مارٹ انکشافاتی رپورٹ ایف ڈی آئی کی پالیسی پر ایک سوال کھڑا کرتی ہے۔ حکومت کا کہنا ہے کہ اس نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے لیکن ملک بھر کے اخبارات نے وال مارٹ کی جانب سے ہندوستان میں کھدرے بازار میں داخلہ کے لیے لابیئنگ کے لیے 125 کروڑ روپے خرچ کیے جانے کی رپورٹ شائع کی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں اس نوعیت کی لابیئنگ غیر قانونی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس خبر کے نتیجہ میں ہنگامہ برپا ہے۔ پرساد نے اس معاملہ کی تحقیقات کروانے اور اس کے بعد ہی پالیسی کو روبہ عمل لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ نائب صدر نشین پی جے کورین نے اس پر کہا کہ اگر ارکان یہ مسئلہ اٹھانا چاہتے ہیں تو انھیں اس کے لیے ایک نوٹس دینا چاہیے۔ سی پی آئی ایم کے سیتا رام یچوری نے رپورٹ پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ صدر ایوان کی حیثیت سے آپ خود اس اہم مسئلہ پر جواب دینے کے لیے حکومت سے کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کورین نے جواب دیا کہ اگر حکومت چاہتی ہے کہ تو وہ جواب دے گی، میں اسے مجبور نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی ایوان کی صورتحال سامنے رکھتے ہوئے وزیر پارلیمانی امور راجیو شکلا نے کہا کہ وہ متعلقہ وزیر کے علم میں یہ بات لائیں گے اور حکومت اس معاملہ کو دیکھے گی۔

والمارٹ ہی نہیں 15 کمپنیوں ملوث ہیں:

پہلے معاملہ والمارٹ کا تھا۔ گفتگو کا انحصار بھی اسی حد تک محدود تھا لیکن اب واشنگٹن
ایجنسیاں) کی رپورٹ کے مطابق والمارٹ سمیت کم از کم 15امریکی کمپنیوں نے)
میں اپنے ہندوستانی تجارتی مفادات و دیگر ایشوز پر لابنگ کے لیے کروڑوں ڈالر2012
خرچ کیے ہیں۔ لابنگ کے انکشاف سے متعلق پارلیمانی ریکارڈ کے مطابق اس طرح کی
لابنگ کرنے والی کمپنیوں میں دوا کمپنی فائزر، کمپیوٹر کمپنی ڈیل، ایچ پی، ٹیلی مواصلاتی
کمپنی کوال کام والکا ٹیل لوسینٹ، مالی خدمات فراہم کرنے والی مورگن اسٹینلی اور
پروڈنشیل فائنانشل اور الائنس آف آٹو موبائل مینو فیکچرس اور ایرو اسپیس انڈسٹریز
ایسوایشن آف امریکہ شامل ہیں۔ اسی سال امریکی ممبران پارلیمنٹ کے ساتھ لابنگ
کرنے والوں میں لابی گروپ فنانس اگزیکیٹو انٹر نیشنل بزنس راؤنڈ ٹیبل، بزنس سافٹ
ویئر الائنس اور فنانشیل سروسز فورم، اشیاء بنانے والی کارگل کولگیٹ پامولیو کے نام
ہیں۔ ریکارڈ کے مطابق بوئنگ، ایل ڈی اینڈ ٹی، اسٹار بکس، لاک ہیڈ مارٹن، ایلی للی اور
جی ای نے ہندوستان سے وابستہ خصوصی لابنگ کے ایشو پر امریکی ممبران پارلیمنٹ سے
لابنگ کی۔ اس موضوع میں بازار کو کھولنے سے وابستہ پہل اور ملک میں اپنی فروخت
اور تجارت کے مواقع کو حمایت شامل ہے۔ امریکی پارلیمنٹ کے ایوان سنیٹ و ایوان
نمائندگان میں پیش لابنگ کی وضاحت کی رپورٹ کے مطابق کم از کم 3اداروں فائنانشل
سروسز فورم، بزنس راؤنڈ ٹیبل اور فائنانشل اگزیکیٹو انٹر نیشنل نے ٹیکس اور مالیاتی بل
کی دیگر تجاویز کے

سلسلے میں لابنگ کی تھی۔ اس بل کو اسی سال پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تھا۔

ایوان بالا اور ملک کا حقیقی منظر نامہ:

گزشتہ جمعہ 7دسمبر2012 ایوان بالا یعنی راجیہ سبھا میں اس مسئلے پر حکمراں جماعت اور اپوزیشن کی طرف سے زبردست بحث دیکھنے کو ملی اور پھر ووٹ ڈالے گئے۔ جس میں اپوزیشن جماعتوں کی تحریک کے حق میں ایک سو نو جبکہ حکومت کے حق میں ایک سو تیئس ووٹ پڑے اور اپوزیشن ناکام ہو گئی تھی۔اس ناکامی میں اہم کردار بہوجن سماجی پارٹی نے ادا کیا جس نے آخری وقت میں واک آؤٹ کی بجائے ووٹ میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔اس کے برخلاف ایوان زیریں یعنی لوک سبھا میں بہوجن سماج پارٹی نے ایف ڈی آئی کی مخالفت کی تھی اور ووٹ کاسٹ کرنے کے بجائے واک آؤٹ کیا تھا لیکن راجیہ سبھا میں اگر وہ ایسا کرتی تو حکومت مشکل میں آ سکتی تھی۔شاید یہی کردار اس نے اس وقت بھی ادا کیا جبکہ ایک طرف اپوزیشن پارٹیاں وال مارٹ لابنگ کے تعلق سے اپنا مظاہرہ کر رہی تھی تو دوسری طرف بہوجن سماج پارٹی سپریمو مایاوتی نے پرموشن میں ریزرویشن سے متعلق آئینی ترمیم بل پر اپنے تیور سخت کر لیے۔اور انتباہ دیا کہ حکومت اگر بل راجیہ سبھا میں پاس نہیں کراپائی تو وہ کوئی بھی سخت فیصلہ لے سکتی ہیں۔ راجیہ سبھا میں پیر کو ایک بل پیش کیے جانے کا امکان تھا، لیکن وال مارٹ کے لابنگ کے ایشو پر ہنگامے کے سبب راجیہ سبھا کی کاروائی ملتوی کر دی گئی۔ایف

ڈی آئی پر مایاوتی نے راجیہ سبھا میں حکومت کی مدد کی تھی اور لوک سبھا میں ان کی پارٹی نے واک آؤٹ کیا تھا۔ اسی وقت مایاوتی نے واضح کر دیا تھا کہ وہ مفاد عامہ کے بلوں کے لیے حکومت کی حمایت کر رہی ہیں اور اس میں پروموشن میں ریزرویشن بل مایاوتی کے ایجنڈے میں سب سے اوپر تھا۔ ٹھیک اسی وقت جبکہ ایک جانب بی ایس پی اپنے بل پر موشن میں ریزرویشن پر ہنگامہ کر رہی تھی سماج وادی پارٹی کے ارکان نے بھی سرکاری ملازمتوں میں ترقیوں میں ایس سی ایس ٹی کے لیے تحفظات بل کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ایس پی ارکان نریش اگروال کی قیادت میں ترقی میں تحفظات نہیں چلے گا کے نعرے لگاتے ہوئے ایوان کے وسط میں پہونچ گئے۔ معاملہ وال مارٹ کے لیے لابنگ کا تھا لیکن دونوں ہی پارٹیوں ایس پی اور بی ایس پی نے شور و غل کے ذریعہ معاملہ کو دوسرا رخ دے دیا۔ اب نہیں معلوم کہ آیا واقعی یہ ذمہ داران اور ان کے ارکان اپنے ایجنڈے پر زور آزمائی کر رہے تھے یا معاملہ کو پلٹنے اور ٹھنڈا کرنے میں یو پی اے حکومت کا ساتھ دے رہے تھے!

واقعہ یہ ہے کہ زرعی پیداوار میں ہندوستان دنیا میں دوسرے نمبر ہونے کے باوجود بڑے پیمانے پر بھوک کا سامنا کر رہا ہے۔ خوراک کی کمی کے شکار بچوں کا تناسب دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے 47 فیصد بچے خوراک کی کمی کا شکار ہیں اور غربا کی تعداد افریقہ کے غریب ترین ممالک سے دوگنی ہو چکی ہے۔ ہر سال

لاکھ بچے 5 سال کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہی قابل علاج بیماریوں کی وجہ سے مر جاتے 21
ہیں۔ واقعہ کے پس منظر میں سوال یہ ہے کہ والمارٹ اور دیگر کمپنیوں کا ہندوستان میں
آنا، ان کے لیے لابیئنگ جیسی باتوں کا منظر عام پر آنا، بیرونی سرمایہ کاری میں شامل
ہو کر اسمال اسکیل انڈسٹریز کو نقصان پہنچایا جانا اور اسی طرز کے دیگر اقدامات کیا ملک
کے لیے سود مند ثابت ہو سکتے ہیں؟ اس کے باوجود کہ چین، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ میں
خوردہ فروشی کے شعبوں تک راست غیر ملکی سرمایہ کاری کو صد فی صد رسائی حاصل
ہے۔ لیکن وہاں اور یہاں میں فرق شاید یہی ہے کہ ہم بے انتہا گھپلوں اور گھوٹالوں کے
ریکارڈ محفوظ رکھتے ہیں جبکہ ان کا معاملہ ہم سے ذرا مختلف ہے!

راجستھان کا دردناک واقعہ :پچّیس ہزار دو نہیں تو دونوں ہاتھ

دس دسمبر کو انسانی حقوق کا عالمی دن قرار دیا گیا ہے۔اس دن کو انسانی حقوق کے نام سے معین کیا جانا ان کوششوں کی یاد دلاتا ہے جو انسانی حقوق کے احترام کے مقاصد سے انجام دی جا رہی ہیں۔ جس وقت اقوام متحدہ کا منشور تیار کیا جا رہا تھا اسی وقت، انسانی حقوق کا موضوع مختلف ملکوں کے نمائندوں کی توجہ کا مرکز تھا۔اسی مشترکہ نظریہ کے پیش نظر جنوری انیس سو سینتالیس میں انسانی حقوق کا کمیشن تشکیل پایا جس کے نتیجے میں انیس سو اڑتالیس مین اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک بل منظور ہوا۔اس وقت انسانی حقوق کا اعلامیہ جاری ہوئے ساٹھ سال کا عرصہ گذر چکا ہے جس کا مشترکہ مقصد ہر انسان کے لئے آزادی کی سوغات اور ظلم و ناانصافی نیز ہر طرح کے امتیازی سلوک سے پرہیز کرنا تھا۔اس کے باوجود ظلم و زیادتی اور جبر و استحصال کرنا ملکوں کے لیے اور افراد کے لیے اب عام بات ہو گئی ہے۔جہاں ایک جانب ظلم و زیادی کے خلاف انسانی حقوق کی ملکی و بین القوامی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں تو وہیں دوسری طرف اس ظلم و زیادتی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ٹھیک اسی ظلم و زیادتی اور انسانی درندگی کا ایک واقعہ راجستھان میں سامنے آیا ہے۔جس کو سن کر اور پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پچّیس ہزار دو نہیں تو دونوں ہاتھ :

ریاست راجستھان کے کرولی ضلع کے گاؤں میں ایک شخص پپّو شرما کے مخالفین نے اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے۔ کٹے ہاتھوں کے ساتھ جے پور کے اسپتال کے بستر پر پڑے پپو کا کہنا ہے کہ گاؤں کے ہی کچھ لوگ جمعہ کو زمین کے تنازعے کے سبب انہیں گھر سے اٹھا کر لے گئے اور پھر ان کے ہاتھ کاٹ دیے۔ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے مخالفین کو اپنی بوڑھی ماں اور معصوم بچوں کا واسطہ بھی دیا لیکن رحم کی اپیل بھی کام نہ آئی۔انہوں نے بتایا کہ میرا آٹھ سال کا بچہ ہنس راج اداس صورت کے ساتھ مجھے دیکھتا ہے۔ میں کتنا بدقسمت ہوں کہ اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی بھی نہیں دے سکتا۔اسپتال میں پپو کے پاس بیٹھی ان کی بوڑھی ماں کہتی ہیں" پپو میرا اکلوتا بیٹا ہے، اب مجھے بڑھاپے میں کون سہارا دے گا؟ اس کے تو ہاتھ نہیں رہے"۔ پپو کے مطابق ملزم انھیں گھر سے بلا کر ہری گوٹھیا کے یہاں لے گئے تھے اور رات بھر یرغمال بنائے رکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ اُن لوگوں نے پہلے تو انھیں ادھار لیے گئے پچیس ہزار روپے واپس دینے کو کہا۔پپّو کے مطابق بعد میں وہ لوگ ان سے جبراً زمین کے کاغذات پر دستخط کروانے لگے اور کہنے لگے، تو نے ہری کی بیٹی کے ساتھ برا سلوک کیا ہے۔ پپو کا کہنا تھا کہ جب میں نے کاغذات پر دستخط سے انکار کیا تو میرے ہاتھ ہی کاٹ دیے گئے۔پپّو شرما کے مطابق ہاتھ کاٹنے کے بعد اسے دھکا دے کر باہر کر دیا اور وہ جاتے جاتے کٹے ہاتھ اپنے ساتھ لے

گئے" میں گرتے پڑتے گھر پہنچا، مجھے لہولہان دیکھ کر ماں بے ہوش ہو گئی، پھر کسی نے ایمبولنس بلائی اور مجھے ڈاکٹر کے پاس سپوٹرا لے جایا گیا اور پھر ڈاکٹر نے مجھے جے پور بھیج دیا"۔ پولیس معاملے کی تحقیقات کر رہی ہے کہ آیا واقعی پپو نے کوئی پیسے ادھار لیے تھے یا اس نے کسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تھی یا نہیں۔

ظلم وزیادی کا ایک اور رخ بھی ہے:

ظلم وزیادتی کا دوسرا رخ وہ ہے جب کہ مظلوم و بے سہارا لوگوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ غریب و مظلوم کبھی بے عقیدہ ہونے کی وجہ سے یا کبھی مسائل میں گرفتار ہونے کی بنا پر خودکشی کر لیتے ہیں۔ ہندوستان کے نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو (این سی آر بی) نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ ملک میں ہر گھنٹے میں کم سے کم سولہ افراد کی موت خودکشی کے سبب ہوتی ہے۔ این سی آر بی کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ سال سنہ دو ہزار گیارہ میں ایک لاکھ پینتیس ہزار لوگوں کی موت خودکشی کے سبب ہوئی۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ زیادہ تر خودکشیوں کے اسباب خانگی مسائل، ناجائز حمل اور کیریئر میں ناکامی ہیں۔ سنہ دو ہزار گیارہ میں طلاق کے سبب خودکشیوں میں چوّن فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ ناجائز حمل کے سبب اموات میں بیس فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ خودکشی کرنے والوں میں سے ستّر فیصد افراد شادی شدہ

تھے اور اس معاملے میں راجستھان ایسی ریاست ہے جہاں سب سے زیادہ کنبوں نے ایک ساتھ خودکشی کی ہے۔واضح رہے کہ ہندوستان دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جہاں لوگ سب سے زیادہ خودکشی کرتے ہیں۔لندن سے شائع ہونے والے جریدے لانسٹ میں شائع تحقیقی رپورٹ جو عالمی صحت کی تنظیم ڈبلیو ایچ او نے کی ہے کے مطابق سنہ دوہزار دس میں بھارت میں ایک لاکھ نوے ہزار افراد نے خودکشی کی جبکہ عالمی سطح پر ہر سال تقریباً نو لاکھ افراد خودکشی کرتے ہیں۔راجستھان کا ہاتھ کاٹنے کا واقعہ، ہندوستان میں خودکشی کے واقعات اور اسی طرز کے دیگر واقعات ہندوستانی معاشرہ، اس کے طرز عمل اور عقائد و معاملات پر روشنی ڈالتے ہیں۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم وزیادتی کے واقعات بڑی تیزی کے ساتھ ہندوستانی معاشرہ کو برباد کر رہے

ہیں۔اس تباہی و بربادی میں جہاں ایک جانب ہندوستانیوں کے مذہبی معاملات، عقائد و نظریہ حیات کی کمزوری کی عکاسی ہوتی ہے وہیں دوسری جانب مغربی افکار کی یلغار اور اس میں ملوث طرز حیات بھی وجہ بن کر سامنے آرہی ہے۔ان حالات میں حقوق انسانی کے علمبرداروں کو چاہیے کہ اپنے افکار و نظریات میں تبدیلی لائیں۔اور ان تمام طریقوں اور رویوں میں تبدیلی لائیں جن کی تبدیلی سے مثبت نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ممکن ہے کہ حقوق انسانی کے عالمی دن تو اسی طرح 10 دسمبر کو بڑے پیمانے پر منائے جاتے رہیں اور منانے کے درمیان ظلم وزیادتیوں کے خلاف باتیں اور وعدے بھی ہوں لیکن یہ ممکن نہیں کہ ظلم وزیادتیاں کم ہوں یا ان

پر قابو پایا جاسکے۔

:یوم انسانی حقوق منانے والے ادھر بھی متوجہ ہوں

ریاست جموں و کشمیر میں سرگرم انسانی حقوق کی دو سرکردہ تنظیموں ایسو سی ایشن آف پیرنٹ آف ڈس اپیرڈ پرسنس (اے پی ڈی پی) اور انٹر نیشنل پیپلز ٹریبونل آن ہیومن رائٹس اینڈ جسٹس (آئی پی ٹی کے) نے گزشتہ 22برسوں کے دوران ریاست میں پولیس، فوج اور نیم فوجی دستوں کے ذریعہ کی جانے والی انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کے متعلق اپنی نوعیت کی پہلی مفصل رپورٹ پچھلے ہفتہ جاری کی ہے۔جس میں فوج،پولیس اور نیم فوجی دستوں کے پانچ سو افسروں اور اہلکاروں پر جنگی جرائم کے الزامات عائد کیے گئے ہیں۔رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ فرضی جھڑپوں، حراست کے دوران اموات اور جنسی زیادتیوں کے 214 معاملات میں مبینہ طور پر 335فوجی اہلکاروں، 123 نیم فوجی اہلکاروں، 111 مقامی پولیس اہلکاروں اور فوجی اداروں سے وابستہ 31 سابقہ عسکریت پسندوں کو ملوث پایا گیا ہے۔رپورٹ میں 1990 سے سال 2011تک سرکاری فورسز کی طرف سے مبینہ طور پر انجام دئے گئے 469انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے واقعات جن میں 124 ہلاکتوں 65گمشدگیوں 59 تشدد اور 9 عصمت ریزی کے کیسوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔رپورٹ میں الزام عائد کیا گیا ہے کہ 1990 میں ریاست میں مسلح جدوجہد شروع ہونے کے بعد پولیس، فورسز اور فوج کے اہلکارو افسران کے ہاتھوں بڑے پیمانے

پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں سرزد ہوئیں۔ جن میں عصمت دری، قتل، اغوا اور گرفتاری کے بعد قتل کرنے کے واقعات بھی شامل ہیں۔رپورٹ کے مرتبین میں سے ایک ہیومن رائٹس وکیل مسٹر کارتک مارو تنلا کا کہنا ہے: "ہندوستان کی اولین ترجیح انصاف فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ کشمیر پر اپنے کنٹرول کو برقرار رکھنا ہے"۔ہمارے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اول بیشتر کیسوں میں مضحکہ خیز یا مذاقیہ طور پر تحقیقات عمل میں لائی گئی اور قصورواروں کو بچانے کی کوشش کی گئی ہے، دوم نچلی عدالتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ عدالتوں نے حکومتوں کے کہنے پر کام کیا اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر پردہ ڈالنے کے حوالے سے اپنا رول ادا کیا"۔مزید کہتے ہیں: "کشمیر میں انسانی حقوق کے خلاف ورزی کے بعد انصاف فراہم کرنے کی ضرورت کو نقد معاوضہ اور تحقیقات کا نام دیا گیا ہے جبکہ اصل انصاف قصورواروں کو سزا دینا ہوتا ہے اور گزشتہ بائیس سال کا ریکارڈ ظاہر کرتا ہے کہ حکومت ہند فوج یا دوسری فورسز کے ملوث اہلکاروں کو کبھی سزا نہیں دے گی"۔ معروف صحافی اور حقوق انسانی کے کارکن گوتم نولکھا کا کہنا ہے کہ رپورٹ گو کہ ملوث افسروں اور اہلکاروں کی نشاندہی کرتی ہے، لیکن جموں کشمیر اور ہندوستان میں انصاف فراہم کرنے کے اداروں نے ان افراد کی پشت پناہی کی ہے" (افتخار گیلانی کے مضمون کا اقتباس)۔مضمون طویل ہے جس میں رپورٹ کے مزید پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور رپورٹ مضمون سے بھی زیادہ طویل ۔ضرورت ہے کہ سب سے پہلے یوم حقوق انسانی منانے والے اور اس کے بعد ہر

وہ شخص جو دوسروں کے دکھ درد اور تکلیف کو محسوس کر سکتا ہو، انہیں چاہیے کہ موجودہ حالات پر غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ یہ کون لوگ ہیں جو انسانی حقوق کو کھلے عام پامال کر رہے ہیں،اس کے باوجود نہ ان سے سوال و جواب ہوتا ہے اور نہ ہی قانونی کاروائی!

:عدل و انصاف اور اسلام

کہا کہ: " اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے" (المائدہ:۸)۔ یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو۔ تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔یعنی تمہاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی رو رعایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمہارے مدِّ نظر نہ ہو۔اس پس منظر میں مسلمان جس مقام اور جس ملک میں بھی رہتے بستے ہوں

انھیں چاہیے کہ وہ بحیثیت مسلمان اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں، ان پر عمل کریں اور دیگر رابطہ میں رہنے والے لوگوں کو بھی اس کار عظیم کا حصہ بنائیں۔نہ صرف ہندوستان بلکہ فی الوقت پوری دنیا میں ظلم وزیادتیوں کے معاملات.بڑے پیانہ پر سامنے آرہے ہیں۔ان حالات میں اسلام پر عمل کرنے والوں پر لازم آتا ہے کہ وہ سب سے پہلے خود مکمل طور پر اسلام پر عمل پیرا ہوں اور ساتھ ہی اسلامی تعلیمات جو دراصل تمام عالم انسانیت کے لیے امن کا پیغام رکھتا ہے اس کو عام کریں، پھیلائیں، سمجھایں اور منظم سعی و جہد کریں۔اسی صورت ممکن ہے کہ ملک عزیز ہند سے بھی اور دنیا کے دیگر مقامات سے بھی ظلم وزیادتی کا خاتمہ ہو جائے۔لیکن اگر مسلمانوں نے اپنا فعال کردار ادا نہیں کیا اور خود بے کار یا عضو معطل بن کر رہے تو ممکن نہیں کہ دنیا میں امن وامان قائم ہو پائے۔مسلمانوں کو چاہیے کہ موجودہ حالات ، اس کی دشواریوں اور مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے امن وامان کے لیے نہ صرف غور وفکر کریں بلکہ میدان عمل میں بھی اتر جائیں۔کیونکہ جو لوگ غور و فکر نہیں کرتے اور اپنے اعمال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے ان کے بارے میں اسلام کہتا ہے کہ انھیں کیا ہو گیا ہے کہ جانوروں کی طرح بے سوچے سمجھے زندگی گزار رہے ہیں۔ لہٰذا چاہیے کہ دنیا کے آغاز وانجام پر غور کریں ۔ عمل کی اسلام پوری آزادی دیتا ہے البتہ ہر شخص کو اس بات کی پابندی ضرور کرنی ہو گی کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے، جس سے فساد پھیلے اور معاشرہ کو نقصان پہنچے۔

پیغمبروں

کی دعوت کی اولین بنیاد توحید ہوتی تھی، یعنی یہ کہ اللہ واحد کی عبادت کی جائے۔

درحقیقت اس وقت دنیا کے طاقت ور ممالک خود ظلم کو فروغ دینے والے اور خود ہی انسانی حقوق کو پامال کرنے والے بن گئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ خود کو انسانی حقوق کا چمپیئن کہلواتے ہیں۔ اس کی واضح مثالیں فلسطین، عراق، افغانستان اور ان ہی جیسے بے شمار ممالک اور مقامات پر موجود ہیں جہاں نہ وہ صرف طاقت ور ممالک کمزوروں پر ظلم وزیادتی میں ہر لمحہ اضافہ کر رہے ہیں بلکہ انسانی جان کی بھی وہ کھلے عام بے حرمتی کر رہے ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن تمام عالم انسانیت اور برسر اقتدار لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے" (الاعراف: 56)۔ یعنی زمین کے انتظام کو خراب نہ کرو۔ انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو اللہ کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔ اور یہی مقصد ہمارا اور آپ کا بھی ہونا چاہیے۔

نعرہ آزادی نسواں کی آڑ میں

معاشرے میں موجود لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی بھی فرد کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچائیں کیونکہ ہر شخص قابل عزت و قابل قدر ہے۔ساتھ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ معاشرہ میں خوشگوار ماحول پروان چڑھانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں۔اس کے برخلاف عمل کے نتیجہ میں نہ صرف معاشرہ بلکہ اقوامِ وقت بھی ہلاک ہو جائیں گی۔لیکن معاملہ یہ ہے کہ چند لوگوں کو چھوڑ کر اکثریت اس پہلو پر نہ غور کرتی ہے اور نہ ہی عمل۔یہاں غور و فکر سے مراد عمل تبدیلی سے ہے نہ کہ اس پر مذاکرے، بحثیں، دھرنے ،ریلیاں اور اسی طرز کی دیگر سرگرمیاں۔ہمارے درمیان چند معصوم مسلمان ذہنوں کی سوچ ہے کہ اگر فرد بذات خود ٹھیک ہو جائے تو نہ صرف مسلم معاشرہ بلکہ ملک وملت کے دیگر مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔جس کے نتیجہ میں بھلائیاں فروغ پائیں گی اور برائیاں ختم ہو جائیں گی۔لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرہ یں فی الوقت موجود برائیاں کیا صرف مسلمانوں میں ہی پائی جاتی ہیں ؟اور کیا خود ہی وہ اس کے پوری طرح ذمہ دار بھی ہیں ؟فرداًفرداًاگر وہ اپنے آپ کو ٹھیک بھی کرلیں تو کیا اس سے معاشرہ اور ملک وملت کے مسائل واقعی حل ہو جائیں گے ؟ یا یہ چہار جانب پھیلی برائیاں، مسائل اور چیلینجز جو عملی سطح پر ہی نہیں فکری سطح پر بھی ہیں، اس میں مسلمانوں کی حیثیت بس

ایک فریق کے سوا کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے تمام معاملات میں مسلمان کوئی خاص رول نہیں رکھتے۔ موجودہ تعلیمی نظام اور اس کی فکر و نظر، موجودہ سیاسی نظام اور اس کی بد اخلاقیاں، موجودہ معاشی نظام اور مکمل طور پر سود پر مبنی معیشت، موجودہ معاشرتی و تمدنی نظام اور اس کے گنجلک نظریات، یہ تمام نظریہ ہائے افکار اسلام کے دیے ہوئے نہیں ہیں۔ نہ صرف اسلام بلکہ مسلمانوں کا بھی کوئی رول اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ موجودہ قوانین پر عمل کر رہے ہیں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ ان تمام افکار و نظریات کو پڑھنے، ان پر تحقیق کرنے، ان سے نبرد آزما ہونے، ان کو زندگی کے شب و روز کا حصہ بنانے کے باوجود مسلمان یا دیگر اقوام، صرف مسلمانوں کے ٹھیک ہو جانے سے ضلالت و گمراہی سے نجات پالیں گی؟ اور یہ بھی کیسے ممکن ہے کہ عقیدے کی حد تک موجودہ نظام پر یقین رکھنے والے لاعلم اور فکر و نظر سے کھوکھلے مسلمان اپنی روز مرہ کی زندگی میں یا معاشرے میں کوئی اہم رول ادا کر سکیں؟ چند عبادات تک سمٹے ہوئے لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ تبدیلی فکر و نظر اور نظام حیات میں تبدیلی کی جرت و حیثیت رکھتے ہیں، ایک غیر فطری توقع تو ہو سکتی ہے لیکن حقیقی نہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اللہ اور رسول کے احکامات کو نہ اپنی زندگی میں اور نہ ہی اللہ کی زمین پر نافذ کرنے کی سعی و جہد کرتے ہیں۔ اور اگر ٹوٹی پھوٹی فکر پائی بھی جائے تو جامع پالیسی و پروگرام کے بغیر۔ ان حالات میں ضرورت ہے ایک ایسی پختہ

فکر، پالیسی اور پروگرام مرتب دیا جائے جس میں نہ صرف مسلمان بلکہ دیگر اقوام کے افراد بھی تعاون و شراکت داری کے ساتھ تبدیلی کے لیے کوشاں ہوں۔آج یہ بحث زور پکڑتی جارہی ہے کہ اسلامی تعلیمات، اسکا نظام و طریقہ ہائے زندگی کیا صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص و محدود رہنا چاہیے یا دیگر ممالک اور ان کے قوانین میں بھی ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟حالات کے مثبت پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کو چاہیے کہ مکمل طور پر فکری اور عملی میدان میں اسلامی تعلیمات کو نہ صرف پوری طرح سے واضح کردیں بلکہ اس کے قیام و بقا کے لیے بھی سرگرم عمل ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج "جدیدیت"اس نظام فکر و نظر کی علامت بن گئی ہے جو فی الوقت رائج ہے اور جس کے قبضہ یں قوت و اقتدار بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر میدان میں جدیدیت کا غلبہ ہے۔ وہ تعلیمی میدان ہو یا سیاسی، معاشی ہو یا معاشرتی و تمدنی ہر میدان میں قوت و اقتدار رکھنے والا طبقہ جدیدیت کو اختیار کرنے میں نہ صرف عزت بلکہ اس کے تراشے و سنوارے لبادے میں ہر قسم کی خوشی بھی محسوس کرتا ہے۔برخلاف اس کے عام طبقہ جسے "عوام"کہتے ہیں، فکرِ جدیدیت کے نتیجہ میں رونما ہونے والے واقعات سے بہت حد تک اکتا چکا ہے۔یہی وجہ ہے کہحالیہ دہلی آبروریزی معاملہ میں عوام الناس کی ایک بڑی تعداد اسلامی قوانین کو لاگو کرنے کی بات کر رہی ہے۔اندرونی کسک وجذبات نہ صرف دہلی کے بلکہ پوری دنیا کے ہیں۔ کیونکہ انسان ہمیشہ ہی امن پسند رہا ہے اور اسلام و اسلامی قوانین امن کے علمبردار۔

:پرانا واقعہ نئی تاریخ کے ساتھ

16 دسمبر 2012ء کی رات ملک کی راجدھانی دہلی ییں ایک درد ناک واقعہ طالبہ کی اجتماعی آبروریزی کا سامنے آیا۔پولیس نے 6 وحشیانہ حرکت میں ملوث بدمعاشوں میں سے 4 کو چوبیس گھنٹوں میں گرفتار کر لیا۔ گرفتار شدگان میں بس کا ڈرائیور رام سنگھ، اس کا بھائی مکیش، جم انسٹرکٹر ونے شرما اور پھل فروش پون گپتا شامل ہیں۔اور جلد ہی دیگر دو بدمعاشوں کی شناخت بھی کر لی گئی۔ دریں اثنا دہلی کی ایک عدالت نے ملزم بس ڈرائیور کو آج 5 دنوں کی پولیس حراست میں بھیج دیا۔ دہلی پولیس نے میٹرو پولیٹن مجسٹریٹ نمرتا اگروال کی عدالت سے کہا کہ گرفتار دیگر 3 ملزمین رام سنگھ کے بھائی مکیش، جم انسٹرکٹر ونے شرما اور پھل فروش پون گپتا کو عدالت ییں پیش کیا جائے ۔دہلی پولیس نے کہا کہ وہ چاہتی ہے کہ اس معاملے کی سماعت فاسٹ ٹریک عدالت میں ہو، جہاں پولیس عدالت سے مجرموں کے لیے سخت سے سخت سزا یعنی عمر قید کی اپیل کرے گی، جس سے اس طرح کی حرکت کرنے والوں کو سبق مل سکے۔دوسری طرف انسانی حقوق کی تنظمییں، سماجی تنظیمیں اور سرکردہ حضرات نے اظہار افسوس وملامت کی۔احساسات کے اظہار کے لیے ریلیاں اور مظاہرے کیے، پولیس، انتظامیہ اور حکومت سے اس معاملے میں مداخلت کرنے اور مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچانے پر زور ڈالا۔ایوان بالا سے درخواست کی کہ آبروریزی جیسے معاملات جو ملک میں ہر دن .بڑھتے ہی جارہے ہیں

کے لیے سخت سے سخت قوانین نافذ کیے جائیں۔ سرکردہ لوگوں نے عمر قید اور پھانسی، جیسی سزائیں تجویز کیں۔ ریاست دہلی کی چیف منسٹر نے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اس تعلق سے خصوصی توجہ دیتے ہوئے سخت قوانین اور انتظامات کی سعی و جہد کریں گی۔ اجتماعی آبروریزی میں ملوث طالبہ کی صحت تشویش ناک حد تک پہنچ چکی ہے۔ مختلف آپریشن کے بعد بھی وہ صحت یاب ہوتی نظر نہیں آتی اور ہو بھی جائے تو ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کا جسم پوری طرح صحیح ہونے میں بہت وقت لگے گا۔ یہ ہے وہ صورتحال جو صرف ایک واقعہ کے پس منظر میں ہمارے سامنے آیا ہے نہیں تو کتنی ہی طالبات، بچیاں و خواتین اس عذاب میں آئے دن مبتلا ہوتی رہتی ہیں۔

نعرہ آزادی نسواں کی آڑ میں:

اخلاقیات سے آزاد مغربی دنیا جن نعروں کو بلند کرتی ہے ان میں سر فہرست آزادی نسواں ہے۔ اس کا مطلب قید سے آزادی بھی ہے اور اخلاقی اصولوں سے آزادی بھی ہے۔ اس لئے کہ اخلاقی اصول بھی انسان کو چند چیزوں کا پابند بناتے ہیں۔ لہٰذا اس نعرے میں مرد جو قوام بنائے گئے ہیں ان کی قوامیت سے آزادی بھی ہے تو وہیں معاشرے میں جو حدود عورت کے لیے متعین کیے گئے ہیں ان سے بھی آزادی ہے۔ عورت جو شوہر کے تئیں وفادار بنائی گئی ہے اس وفاداری سے بھی آزادی ہے تو وہیں معاشرہ میں اختلاط مرد وزن میں جو ایک مخصوص دوری قائم کی گئی ہے اس

سے آزادی بھی ہے۔ حکومت و سیاست میں مرد کے زیر نگیں آزادی بھی ہے اورمذہب جو افکار و نظریات اور میدان عمل میں حدود متعین کرتا ہے اس سے آزادی بھی ہے۔پھر یہ نعرے نہ صرف نظریاتی یا فکری حد تک ہیں بلکہ عملی میدان میں بھی وہ مثالیں قائم کی گئی جو بطور شہادت پیش کی جا سکیں۔آج "آزادی نسواں" کے نعروں کی آڑ میں عورت کو سرِ عام بازار کا کھلونا بنا دیا گیا ہے۔ساتھ ہی ایک شے جو بازار یں فروخت کی جا سکے نیز جسکا کھل کر استحصال کرنا بھی ممکن ہو۔واقعہ یہ ہے کہ یہ پاکدامن، عفت و عصمت کی علمبردار عورت کھلے عام نیلام ہو رہی ہے اور وہ ان حالات سے باخوبی واقف بھی ہے۔اس کے باوجود اس نے ان خوبصورت نعروں کی زینت بننا پسند کیا اور مسلسل کیے جا رہی ہے۔دیکھنا یہ چاہیے کہ مختلف مذاہب و تہذیب سے تعلق رکھنے والی یہ عورت اپنے رویہ میں تبدیلی کیوں نہیں لا رہی ہے۔کیا اس کی بھی کوئی معقول وجہ ہے؟معلوم ہوا کہ ایک طرف عورت کو بازار میں سرعام بے عزت کیا جاتا ہے تو وہیں دوسری طرف گھروں یں لڑکے اور لڑکیوں میں تفریق کی جاتی ہے۔مختلف انداز میں ہر مقام پر ان کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی جاتی ہے۔ کبھی شوہر اور دیگر رشتے داروں کے ذریعہ رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے،جو جانوروں سے بھی بڑھ کر نہ صرف اُن پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں بلکہ معمولی جہیز کی خاطر انھیں زندہ جلادینے تک سے گریز نہیں کرتے۔یہ اور ان جیسے بے شمار ظلم و زیادتیوں کے واقعات ہی دراصل وہ پس منظر ہے جو عورت کو آزادیِ نسواں کے نعروں کو پسند کرنے پر

مجبور کرتے ہیں۔پھر ان نعروں کی آڑ میں کہیں زمانہ حال کی ماری ہوئی تو کہیں عزت و ذلت سے ناواقف عورت ان تمام امور کو اختیار کرنے سے گریز نہیں کرتی جو آج رائج ہیں۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان نعروں کو بلند کرنے والے ،ان پر عمل کرنے والے اور ان کوفروغ دینے والے مسائل کا رونا نہیں روتے، لیکن پھر بھی وہ روتے ہیں، درد محسوس کرتے ہیں،اور مسائل کا خاتمہ چاہتے ہیں۔تو چاہیے کہ ان حالات ہیں،نہ صرف ان مخصوص لوگوں کے سامنے بلکہ عوام الناس کے سامنے بھی اس مالک برحق اللہ رب العزت کی تعلیمات کو عام کیا جائے جس نے ان تمام مسائل کا حل بہت پہلے ہی پیش کر دیا ہے۔

:متذکرہ واقعہ کے برخلاف

راجدھانی دہلی کے حالیہ واقعہ کے برخلاف یہ دوسرا واقعہ امریکی ریاست ایرزونا کا ہے ۔جہاں امریکی پولیس نے ایک یمنی طالب علم پر جنسی تشدد کی کوشش کے الزام میں پانچ امریکی طالبات کو حراست میں لیا۔ حکام کے مطابق حال ہی میں ریاست ایرزونا میں ایک کالج میں زیر تعلیم پانچ لڑکیوں نے اپنے ہم کلاس ایک یمنی طالب علم عصام الشرعبی کی رہائش گاہ میں داخل ہونے کے بعد اندر سے تالے لگا دیے اور اپنے کپڑے اتار کر اس کے کمرے میں داخل ہوگئیں۔تاہم عصام کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ عصام کی اطلاع پر پولیس نے موقع پر پہنچ کر پانچوں لڑکیوں کو حراست میں لے

لیا۔ ان کے خلاف جنسی تشدد کی پاداش میں مقدمہ درج کر لیا۔ ذرائع کے مطابق تفتیش کے بعد پانچوں لڑکیوں نے اعتراف جرم کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ عصام شرعبی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے، جس پر انہوں نے اسے رضاکارانہ طور پر کئی مرتبہ جنسی تعلقات کی پیشکش کی تھی، اُس نے یہ کہہ کر ان کی تجویز مسترد کردی تھی کہ وہ ایک دیندار مسلمان نوجوان ہے اور اس کا مذہب اسے اپنی بیوی کے سوا کسی دوسری خاتون کے ساتھ جنسی تعلقات کی اجازت نہیں دیتا۔ امریکی ریاست اریزونا میں وہ مقام ہے جہاں ہر تعلیمی سال کے اختتام پر کم وبیش پانچ ہزار طالبات عریاں دوڑ میں حصہ لیتی ہیں۔

دو متضاد واقعات کیوں؟

پہلا واقعہ ان حالات کی عکاسی کرتا ہے جس نے انسانوں کو بے لگام حیوان بنا دیا ہے۔ برخلاف اس کہ دوسرا واقعہ بھی تقریباًوہی ہے فرق بس اتنا ہے کہ چہار طرفہ پھیلی غلاظتوں میں کچھ لوگ آج بھی عقیدے اور عمل کے میدان میں مستحکم ہونے کی بنا پر ان گندیوں سے پرہیز کرنا پسند کرتے ہیں جو درحقیقت دنیا وآخرت دونوں میں ہی نقصان دہ ہیں۔ یہ کچھ لوگ کون ہیں اور ایسا کیوں کرتے ہیں؟ وجہ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ جس عقیدہ اور نظریہ پر قائم ہیں وہ حاکم برحق کا عطا کردہ ہے جس نے نہ صرف انسانوں کو پیدا کیا بلکہ انھیں صراطِ مستقیم بھی عطا کیا۔ پہلے اور دوسرے واقعہ میں ظلم و تشدد کرنے والے

نیز ظلالت و گمراہی میں مبتلا انسان اور انسانوں کے گروہ کسی مخصوص علاقہ، نظریہ، فکر اور عقیدہ سے تعلق نہیں رکھتے اس کے باوجود وہ دونوں ہی اللہ وحدہٗ لا شریک اور اس کے رسول کی تعلیمات سے دور بھاگتے ہیں۔ کبھی لاعلمی کی بنا پر تو کبھی علم ہونے کے باوجود زمانہ وقت یا نفس امارہ کے دباؤ میں آکر۔ پھر یہی وہ لوگ بھی ہیں جن کے قبضہ میں قوت و اقتدار ہے۔ قوت و اقتدار کی بنا پر ان لوگوں نے تعلیم و تربیت کا نظام کنڈر گارڈن سے لے کر اعلیٰ تعلیمی اداروں تک جو قائم کیا ہوا ہے، نتائج کے اعتبار سے نہایت عبرتناک ہے۔ پھر یہی وہ لوگ ہیں جو تعلیمی اداروں کے ماحول اور فضا کو رخ دینے والے، طلبہ و طالبات اور نوجوانوں کے حقیقی جذبات سے کھلواڑ کرنے والے، بدکاریوں پر ابھارنے والے اور بدکاریوں کو خوشنما انداز میں پیش کرنے والے، فیشن کی آڑ میں ننگ و عار کو فروغ دینے والے، انٹرنیٹ، فلموں اور ٹی وی سیریلز کے ذریعہ عریانیت اور فحاشی کو بڑھاوا دینے والے، مقاصد کے حصول کے لیے پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کا بھرپور استعمال کرنے والے ہیں اور وسائل پر بے ساختہ دولت صرف کرنے والے اور ۔ان حالات میں اگر چند نفوس اللہ وحدہ لا شریک اور اس کے حبیبِ رسول پر ایمان رکھنے والے اور احکام الٰہی پر عمل پیرا نظر آجائیں تو یہ اس حقیقی علم اور اس پر پختہ یقین کا نتیجہ ہی کہلائے گا جو چہار طرفہ پھیلی ظلالتوں کی دلدل سے بچے رہنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ وہی علم ہے جو خالقِ جن و انس اور مالک رب العالمین کا دیا ہوا

ہے، یہی وجہ ہے کہ اس پر عمل پیرا ہو کر انسان شرف و منزلت کے ادوار طے کرتا ہے، دنیا امن کا گہوارہ بنتی ہے اور ایک بہتر معاشرہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔

سینٹرل ٹیچرس ایلجبلٹی ٹیسٹ اوراساتذہ تقرری گھوٹالہ

وزیر تعلیم کپل سبل نے گزشتہ سال لوک سبھا کو بتایا تھا کہ اگلے پانچ سال کے دوران ملک بھر میں 200 نئی یونیورسٹیز اور 40 نئے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے قیام کے علاوہ اضافی IITS بھی قائم کئے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ بارہویں پنج سالہ منصوبہ میں حکومت ہند کی خاص توجہ ابتدائی، سکنڈری اور ہائیر ایجوکیشن پر رہے گی۔ جس کے تحت ابتدائی تعلیم کے ڈروپ آؤٹ 42.39% فیصد کو کم کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے گی۔ کمزور، اقلیتی اور معذور طبقہ سے تعلق رکھنے والے طلبہ پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ نیز اساتذہ کی تربیت و راہنمائی پروگرام مرتب دے کر ان کی تعلیمی استعداد بہتر بنانے کی سعی و جہد کی جائے گی۔ نیز مختلف عمر کے بچوں کے لیے الگ الگ کریکلم بنانے اور اس کو مزید مستحکم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح سکنڈری ایجوکیشن کے تعلق سے کہا گیا تھا کہ: 14 سے 16 سال کے طالبہ کے داخلہ کو 62.71% فیصد سے بڑھا کر 90% فیصد تک کیا جائے گا۔ اس کے لیے 500 کیندری ودھالیہ اور 378 نئے جواہر نویدیہ ودھالیہ قائم کیے جائیں گے۔ اساتذہ کی تربیت و راہنمائی کے یہاں بھی بڑے پیمانہ پر پروگرام چلائے جانے کی بات کہی گئی تھی۔ اس ایک سالہ گزرے عرصہ میں کیا کچھ ہوا؟ اور کون سے اہداف حاصل کیے جاسکے اس کی جانکاری تو سالانہ رپورٹ سے ہی بتائے گی۔ لیکن

فی الوقت آنے والے نئے اساتذہ کے معیار کی بات کی جائے تو ماہ دسمبر 2012 کے سینٹرل ٹیچرس ایلیجبلٹی ٹیسٹ کے نتائج نے نہ صرف حکومت ہند بلکہ تعلیم ، تعلیمی اداروں اور طلبہ وطالبات کے ساتھ ساتھ ان کے والدین کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے۔

سینٹرل ٹیچرس ایلیجبلٹی ٹیسٹ اور اس کے نتائج :

ہر زمانے میں استاد کی عزت و تکریم کی گئی ہے اور اس کی وجہ اس سوا کچھ نہیں کہ استاد ہی وہ فرد واحد ہے جو طلبہ کی فکر و نظر میں کو وسعت بخشتا ہے۔روشن مستقبل کے لیے جہاں یہ لازمی ہے کہ ملک وملت کے بچے ناخواندہ نہ ہوں وہیں یہ بھی لازم ہے کہ ان بچوں کو خواندہ بنانے والے اور ان کی تعلیم وتربیت کا فیریضہ انجام دینے والے خود بھی باصلاحیت ، باکردار اور مثبت فکر و نظر کے حامل ہوں۔اس کے برخلاف سینٹرل ٹیچرس ایلیجبلٹی ٹیسٹ (CTET) 2012 کی یہ رپورٹ مستقبل کے اساتذہ کی صلاحیتوں کو لے کر بڑا ہی شرمناک پہلو نمایاں کر رہی ہے۔ٹیسٹ کے نتائج میں 99% فیصد اساتذہ نے ناکامی کا سامنا کیا ہے۔یہ ٹیسٹ دو سطحوں کے اساتذہ سے دو الگ الگ پرچوں میں لیا جاتا ہے۔پہلا پرچہ ان اساتذہ سے تعلق رکھتا ہے جو پہلی جماعت تا پنجم میں تعلیم وتدریس کا عمل انجام دیتے ہیں تو دوسرا پرچہ جماعت ششم تا ہشتم یعنی 6-8 کلاس کے اساتذہ کے لیے لیا جاتا ہے۔سال 2012 میں پہلے پرچہ کا ٹیسٹ 2.71 لاکھ اساتذہ نے دیا اس

کے بالمقابل دوسرے پرچہ میں 5.24 لاکھ اساتذہ نے دیا۔ نتیجہ کے اعتبار سے پہلے پرچہ میں کل 2,481 تو وہیں دوسرے پرچہ میں 2,368 اساتذہ ہی کامیاب ہوئے۔ پہلے پرچے میں کامیابی صرف 0.91% فیصد ہی اساتذہ کے حصے میں آئی تو وہیں دوسری جانب 0.45% فیصد کامیابی دوسرے پرچہ کو دینے والے اساتذہ نے حاصل کی۔ سینٹرل ٹیچرس ایلیجلٹی ٹیسٹ وہ ٹیسٹ ہے جو کسی بھی سینٹرل اسکول میں استاد کی تقرری کے لیے حکومت ہند نے لازم کر رکھا ہے اس کے برخلاف دہلی میں یہ ٹیسٹ حکومت سے امداد یافتہ اسکولوں کے اساتذہ کی تقرری کے لیے بھی لازم ہے۔ نتیجہ کی روشنی میں یہ بات کھل کر عیاں ہو گئی ہے کہ ملک کے مستقبل کو سنوارنے، بنانے اور تعلیم و تربیت سے ہمکنار کرنے والے اساتذہ بذات خود باصلاحیت نہیں ہیں۔ ان حالات میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ غیر تربیت یافتہ اور تعلیم جیسے اہم پیشہ سے وابستہ یہ حضرات کس طرح ملک و ملت کے بچوں کے مستقبل کو روشن کر سکتے ہیں؟

اساتذہ تقرری گھوٹالہ:

ملک کا باشعور طبقہ سینٹرل ٹیچرس ایلیجلٹی ٹیسٹ کے ناکام اساتذہ پر ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ ایک نئے واقعہ نے ملک کے تعلیمی نظام کی چرمراتی صورتحال کو مزید دھچکہ پہنچایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سی بی آئی کے خصوصی جج ونود کمار نے ہریانہ کے سابق وزیر اعلیٰ اوم پرکاش چوٹالہ، ان کے بیٹے اور دیگر

لوگوں کو ہریانہ میں 3ہزار سے زیادہ جونیئر بیسک تربیت یافتہ (جے بی ٹی) اساتذہ53 کی غیر قانونی بھرتی کے معاملے میں تعزیرات ہند اور انسداد بد عنوانی قانون کے تحت قصوروار ٹھہرایا ہے۔ عدالت کے فیصلے کے بعد سبھی قصورواروں کو عدالتی تحویل میں لے لیا گیا۔ عدالت ان کو 22 جنوری کو سزا سنائے گی۔ سزا پر بحث19،17اور21 جنوری کو ہوگی۔ عدالت نے تعزیرات ہند کی دفعہ 120بی (مجرمانہ سازش)420 فریب دہی)467(جعلسازی)468(فریب دہی کے لیے جعلسازی)471(فرضی) دستاویزات کو اصل کے طور پر استعمال کرنا) اور انسداد بد عنوانی ایکٹ کی توضیعات کے تحت فرد جرم عائد کی ہے۔ عدالت نے اس معاملے میں 17دسمبر کو فیصلہ محفوظ کر لیا تھا۔ اس معاملے میں 62ملزمان میں سے 6کی سماعت کے دوران موت ہو گئی، جبکہ عدالت نے ایک کو بری کر دیا تھا۔ عدالت نے اس سے پہلے مسٹر چوٹالہ، ان کے بیٹے اجے چوٹالہ، آئی اے ایس سنجے دھر اور سنجیو کمار اور 51دیگر لوگوں کو خلاف بادی النظر میں ثبوت پائے تھے۔ عدالت نے آج گھوٹالے میں 16خواتین سمیت کل 55 لوگوں کو قصور وار ٹھہرایا۔ عدالت میں آج سماعت کے دوران ملزمان ان کے وکیلوں، وکلائے صفائی اور عدالت کے ملازمین کے علاوہ کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ملزموں کے رشتے داروں اور میڈیا کے نمائندوں کو بھی عدالت کے باہر رکھا گیا تھا۔ سی بی آئی نے 6جون 2008کو مسٹر چوٹالہ اور دیگر لوگوں کے خلاف اس سلسلے میں معاملہ درج کیا تھا۔ یہ گھوٹالہ1999اور2000کے دوران جے بی ٹی ٹیچروں کی تقرری کے3002

دوران کیا گیا تھا۔ فرد جرم میں کہا گیا ہے کہ ٹیچروں کی دوسری فہرست یہاں ہریانہ بھون میں 18 اضلاع کی ضلعی سطح کی کمیٹیوں کے صدر اور اراکین کی میٹنگ بلا کر تقرری کے مناسب طریقہ کار کے بغیر تیار کر دی گئی تھی۔ سی بی آئی نے الزام لگایا تھا کہ مسٹر چوٹالہ اور ان کے بیٹے نے فرضی دستاویزوں کی بنیاد پر 3002 اساتذہ کی تقرریاں کی تھیں۔ واضح رہے کہ سپریم کورٹ نے 25 نومبر 2003 کو سی بی آئی کو اس معاملے کی جانچ کا حکم دیا تھا۔ چوٹالہ اور دیگر 54 کو اس معاملے میں قصوروار ٹھہرائے جانے کے بعد اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے ہریانہ کے وزیر اعلیٰ بھوپیندر سنگھ ہڈا نے کہا "قانون اپنا کام کر رہا ہے۔ قانون کی خلاف ورزی کا نتیجہ اسی طرح سامنے آتا ہے"۔ اوم پرکاش چوٹالہ کے چھوٹے بیٹے ابھے چوٹالہ نے اس بات سے انکار کیا کہ ان کے بھائی اور والد نے ریاست میں ٹیچروں کی بھرتی میں کوئی بھی غیر قانونی کام نہیں کیا تھا۔انھوں نے کہا کہ اس معاملے میں بدعنوانی سے متعلق کچھ بھی نہیں ہے اور اس معاملے میں پیسے کا کوئی لین دین بھی نہیں ہوا۔

ماہر تعلیم و نفسیات کہتے ہیں:

تعلیم کا تعلق ماں باپ اور اساتذہ سے ہے۔ اس لحاظ سے بچوں کی نفسیات کو ہر دو سطحوں پر سمجھنا لازمی ہے۔ اگر اس سے روگردانی برتی گئی تو اس کے منفی نتائج بھی لازماً برداشت کرنے ہوں گے۔ سگمنڈ فرائڈ کے لائق ترین شاگرد

الفریڈ ریڈلر نے واضح کیا تھا کہ ہر بچے کی زندگی کے پہلے پانچ سال اس کی آیندہ زندگی کو بڑی حد تک متاثر کرتے ہیں۔ نفسیات اطفال کے جدید ماہرین بچے کی پیدائش سے بارہ سال کی عمر تک ذہن و کردار کے حوالے سے مطالعہ کرتے اور مشورے دیتے ہیں Child Guidance Clinics کا طلبا کو مشورے دینے کے لیے ابتدائی تعلیمی مراکز) قیام ترقی یافتہ ممالک میں انتہائی کام یاب تجربہ ثابت ہوا تھا) ان ماہرین کے نزدیک پانچ سے سات سال کے درمیان بچہ کتابوں کے بجائے عملی چیزوں سے زیادہ سیکھتا ہے وہ اپنی ٹیچر کی نقالی عمدگی سے کرتا ہے۔ اب ٹیچر اس کو لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری یاد کرائے یا پھر "بابا بلیک شیپ اور ہمپٹی ڈمٹی" کا رٹا لگوائے، دونوں کے لیے بچہ بہترین نقال ثابت ہوتا ہے۔اس حیثیت سے استاد کی خدمات انتہائی اہم ہوتی ہیں ۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ استاد اچھا ہو تو کمزور طالب علم کو بھی اس طرح پڑھا سکتا ہے کہ اس سے اس کا معیار تعلیم بلند ہو جائے.برخلاف اس کے استاد اچھا نہ ہو تو وہ اعلیٰ درجے کے نصاب کو بھی معمولی بنا سکتا ہے۔آج ہمارے ملک میں نہ صرف معیار تعلیم خراب ہو رہا ہے بلکہ وہ اساتذہ جو ملک کا مستقبل بنانے اور سنوارنے والے تھے ان کی کارکردگی کا گراف بھی نیچے ہوتا جا رہا ہے۔اور یہ دونوں متذکرہ واقعات اسی جانب توجہ دلا رہے ہیں۔ایک جانب مستقبل کے اساتذہ کی صلاحیتیں مشکوک ہیں تو وہیں دوسری جانب ریاستی اور مرکزی ریاستوں کی غیر اخلاقی، غیر ذمہ دارانہ اور کرپٹ شبیہ سامنے آتی ہے۔اور یہ دونوں ہی

واقعات ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہیں۔

ان حلات میں ویسے تو ہر استاد کو چاہیے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی انجام دے اور اس کے لیے اپنے آپ کو اَپ ٹو ڈیٹ رکھے۔ طلبہ سے محبت وشفقت کا رویہ اپنائیں،اور ان کی ہمہ جہت تربیت و ترقی کی کوشش کریں۔ لیکن بحیثیت مسلمان اس حصول علم و ترقی کے لیے ہر طالب علم اور استاد کو یہ بھی چاہیے کہ وہ مالک.بر حق علیم وبصیر اللہ رب العزت سے یہ دعا بھی کرتا رہے: "اے میرے رب میرے سینے کو کھول دے اور میرے کام کو (جس کا بیڑا اٹھا رہا ہوں) آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے "۔اور ساتھ ہی ساتھ اس فہم وادراک کے ساتھ اگر یہ عقیدہ بھی مضبوط تر کہ حواس، عقل و شعور، فکر و تخیل، تجربات و مشاہدات کے ساتھ خالق انسان نے اس کی رہنمائی کے لیے وحی کا ذریعہ بھی پسند کیا ہے۔وحی کا سلسلہ گرچہ خاتم النبیین پر مکمل ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کو مکمل کرتے ہوئے قرآن کی حفاظت کی خود ذمہ داری اٹھالی۔اس لحاظ سے وحی میں علم و ذریعہ علم کے اعتبار سے کوئی نقص یا خامی نہیں ہے۔پھر ساتھ ہی یہ بات کہ سارے ذرائع علم اللہ ہی کی عطا ہیں۔بس شرط واحد یہ ہے کہ حواس کا استعمال علم وحی سے حاصل کردہ شعور کی روشنی میں کیا جائے۔ان روشنیوں میں جب مزید گہرائی و بصیرت پیدا کرنے کی سعی و جہد کی جائے گی تومقاصد کے حصول میں آسانیاں پیدا ہوں گی۔ صحیح خطوط پر تعلیم و

تربیت کے مراحل طے ہوں گے۔روشن دماغ خودی ذات کے لیے بھی اور دیگر افراد کے لیے خیر ثابت ہوں گے۔ محنت و جستجو کے مراحل سے گزرا جائے گا۔اور نہ صرف استاد و طلبہ مطلوبہ معیار پر پورے اتریں گے بلکہ ایک خوشگوار معاشرہ بھی وقوع پذیر ہوگا۔

کہا کہ: "کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے یہ شایانِ شان ہے ہی نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ فرمادیں تو پھر بھی اپنے معاملے میں ان کے پاس کوئی اختیار باقی رہ جائے" (الاحزاب: 35)۔ مفہوم یہ ٹھہرا کہ اللہ اور رسول کا فیصلہ آخری ہے اور اگر اس میں بھی اپنی رائے کو شمار کر لیا جائے تو پھر یہ بات قابلِ اعتراض ہی نہیں بلکہ منافقانہ بھی ٹھہرے گی۔ اور اگر یہ احساس ذہن میں پیدا ہو جائے کہ اللہ اور رسول کے فیصلہ کے بعد بھی میرے پاس کچھ اختیار موجود ہے تو پھر ایمان کہاں رہا؟ لہٰذا ایسی حالت میں ایمان کی نفی ہو گی۔ اس ہی لیے کہا گیا کہ: "اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا ارتکاب کرے گا (تو وہ جان لے کہ) وہ بڑی صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا" (الاحزاب: 35)۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انسان کی انفرادی زندگی میں مختلف حالات و کیفیات رونما ہوتی رہتی ہیں، کبھی خوش گوار تو کبھی ناگوار۔ ان خوشگواری اور ناگواری کے دونوں ہی حالات ہیں اللہ کی رضا شامل حال رہے، اسی کے مطابق ہمیں اپنے اعمال کا احتساب لینا ہے۔ یہ آیت ایک خاص پس منظر میں نازل ہوئی تھی لیکن اس کا پیغام ہر خاص و عام حالات پر منطبق ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کے اعضاء و جوارح سے مختلف اوقات میں کچھ نہ کچھ صادر یا خارج ہوتا رہتا ہے۔ اور ان تمام

اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کو اس ایک آیت کی روشنی میں جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے کہ آیا انسان کا عمل صحیح ہے یا غلط۔ غور فرمایئے جب ہم بات کرتے ہیں اور زبان سے الفاظ نکلتے ہیں تو اس سے بھی قبل دماغ میں تحریک پیدا ہوتی ہے یعنی دماغ ان الفاظ کے نکلنے سے پہلے متحرک ہو جاتا ہے، ہونٹ حرکت میں آتے ہیں اور زبان ہلنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ یہ دماغ کا حرکت میں آنا، ہونٹوں کا ہلنا، زباں کی جمبش، ایک طرف تو اس پورے عمل میں انسان کی اپنی مرضی شامل نہیں ہے مطلب یہ کہ اگر اللہ چاہے تبھی یہ ممکن ہے کہ یہ سارے اعضاء جمبش کر سکیں ورنہ نہیں لیکن دوسری طرف الفاظ کی ادائیگی ہیں جو احتیاط برتی ہے، وہ ہمارے اختیارات میں شامل ہے۔ اور وہ یہ کہ جو الفاظ بھی نکلیں اور جو عمل بھی صادر ہو وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے سانچے میں ڈھل کر صادر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالی نے انسان کو قدرتِ اختیار عطا کی ہے اسی لیے کہا کہ: "اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا۔۔۔"۔ اختیار کیا دیا گیا ہے اور کس چیز کا؟ تو اس میں پہلی چیز جذبات ہیں کہ ان کو صحیح رخ عطا کیا جائے، پھر احساسات ہیں جو عام طور پر افکار و نظریات پر منحصر ہوتے ہیں۔ اور ان تمام چیزوں کے تعاون و اشتراک کا انحصار ہماری اس تربیت گاہ پر منحصر ہے جو ہمیں ہر لمحہ اور ہر لحظہ پستی و بلندی پر گامزن رکھتی ہے۔

:اَطِیْعُوا اللہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ

ارادہ و عمل کے اختیار کے بارے میں ایک متوازن نقطہ نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہمیں جو اختیارات حاصل ہیں وہ اتنے زیادہ بھی نہیں کہ جتنا عام آدمی سمجھتا ہے، بلکہ ہماری مجبوری کا پہلو بھی یقیناً بہت بڑا ہے۔ مثلاً ہمارا geneticsکا نظام ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمیں جو جینز (genes) ملے ہیں جن سے ہمارے جسمانی نقش و نگار اور ہماری شخصیت کے خدوخال تیار ہوتے ہیں وہ ہمارے معبودِ برحق کے عطا کردہ ہیں اور ہمیں اس معاملہ میں کسی انتخابِ اختیار کا حق نہیں دیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے معاملات میں ہم مجبور ہیں اور وہ ہمارے اختیارات سے باہر کے معاملات ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی شخصیت میں اختیار کا ایک عنصر بہر حال موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں یہ عنصر جس مقدار میں رکھا ہے اسی نسبت سے وہ اس کا محاسبہ بھی کرے گا۔ لہٰذا "اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ" کا تقاضا ہے کہ اللہ نے جو بھی اختیارات دیے ہیں اسے اپنے اختیار سے اس کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔ وہیں سے اطاعت کے حقیقی جذبہ و عمل کا آغاز ہوگا۔ معلوم ہوا کہ اگر اطاعت موجود ہے تو ایمان موجود ہے، اور اگر اطاعت نہیں تو ایمان بھی نہیں۔ یہ بات بھی عیاں رہنا چاہیے کہ ایک حقیقی ایمان ہے اور ایک قانونی ایمان، یہاں ہماری مراد حقیقی ایمان سے ہے نہ کہ قانونی ایمان سے کہ جس کی بنا پر ہم دنیا میں مسلمان کہلائے اور سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا حقیقی ایمان اور حقیقی اطاعت عمل سے ظاہر ہوگی کیونکہ

جس بات پر ایمان ہوگا اس کی نفی نہیں ہوگی۔ اسی سلسلے میں اللہ کے رسول فرماتے ہیں: "کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا، کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا اور کوئی شراب پینے والا حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا" اسی لیے دیگر احادیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ گناہ کا ارتکاب کرتے وقت ایسے شخص کا ایمان اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ اللہ کے رسول فرماتے ہیں: "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں" (شرح السنہ)۔ یعنی ایمان کا تقاضا ہے کہ خواہش نفس دین کے تابع ہو جائے اور اپنے آپ کو اطاعت کے سانچے میں ڈھال دے۔ کھانا ایک بنیادی اور فطری ضرورت ہے لیکن اس کا حصول اسی طرح ہوگا جس طرح بتایا گیا ہے یعنی پیٹ میں وہی کچھ جائے جو حلال ہو۔ اسی طرح جنسی تسکین ایک جبلی خواہش ہے، لیکن اسے صرف اس جائز راستے سے ہی پورا کیا جانا چاہیے جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے معین کر دیا گیا ہے۔ اپنے نفس کو بھی محض اس کے طبعی تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ نہ دیا جائے بلکہ اللہ کا معین کردہ حق سمجھ کر دیا جائے۔ اسی لیے اللہ کے رسول نے فرمایا: "تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، "تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔

اطاعتِ رسول کی حیثیت:

اطاعت اصلاً اللہ کی ہے اور عملاً رسول اللہ کی۔ رسول کی اطاعت کا مطلب اللہ کے اس حقیقی نمائندے کی اطاعت ہے جس کو اس نے اس اہم ذمہ داری ادا کرنے کے لیے منتخب کیا۔ معلوم ہوا کہ اطاعت اس ذات کی نہیں کی جا رہی ہے بلکہ اس نمائندے کی اطاعت کی جا رہی ہے جس کو اللہ نے اپنا پیغمبر پسند کیا۔ اس نکتہ کی وضاحت اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں خود فرماتا ہے۔ کہا کہ: "اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اِذن سے" (النسائ: 64)۔ معلوم ہوا کہ کسی رسول کی اطاعت اس کی ذاتی اطاعت نہیں ہے، بلکہ اس کی اطاعت اللہ کے رسول کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ رسول، اللہ کا نمائندہ ہے جو انسانوں تک اللہ کے پیغام کو پہنچانے کی ذمہ داری ادا کرتا ہے۔ اور کیونکہ انسانوں تک اللہ کا پیغام براہ راست نازل نہیں ہوتا اس لیے اللہ کی اطاعت رسول کی اطاعت میں شامل ہے۔ اور یہ رسول کی اطاعت در حقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ اس ہی لیے کہا گیا کہ: "جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے در حقیقت اللہ کی اطاعت کی" (النسائ: 80)۔ یہ اطاعت کس قسم کی ہونی چاہیے اور اس کے کیا تقاضے ہیں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: "اے محمد! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کر لیں" (النسائ: 65)۔ دو انسانوں کے جب معاملات کسی تیسرے کے سامنے فیصلہ کے تعلق سے پیش کیے جاتے ہیں تو وہ وقت بہت کٹھن ہوتا

ہے کیونکہ ہر مدعی دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس ہی کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے۔ایسے وقت میں فیصلہ کرنے والا اگر کوئی ہوگا تو وہ صرف وہی فیصلہ کرے گا جو اللہ اور اس کا رسول طے کر دے۔اللہ رسول طے کر دے کا مطلب ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کی روشنی میں ہی فیصلہ کیا جائے۔پھر چاہے کوئی اوپر اٹھ جائے اور کوئی نیچے ، کسی کو فائدہ حاصل ہو اور کسی کو نقصان اٹھانا پڑے، لیکن کامیاب دونوں ہی رہے کیونکہ دونوں نے بہ رضا و رغبت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں سر تسلیم خم کر دیا۔لہٰذا اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے راضی ہوگا اور اس کو انعام و اکرام سے نوازے گا۔

فتنہ منکرین حدیث:

قرآن حکیم میں اللہ فرماتا ہے: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحبِ امر ہوں" (النسائ:59)
۔یہاں اللہ کے بعد رسول کے ساتھ بھی "اَطِیعوا" کے لفظ کو دہرایا گیا ہے لیکن اُولی الَامر کے لیے لفظ "اَطِیعوا" نہیں دہرایا گیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی اطاعت بھی اپنی جگہ مستقل بِالذات اطاعت ہے اور ان کی ذمہ داری صرف اللہ کے حکم کو پہنچا دینا ہی نہیں ہے۔انکار حدیث اس دور کا خاصا بڑا فتنہ ہے اور ہمارے جدید تعلیم یافتہ لوگ اس کا جلد شکار ہو جاتے ہیں،

کیونکہ مغربی افکار کے زیر اثر اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ہونے کے باعث ان کے ذہن پہلے سے اس کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ عام طور پر ایسے ذہنوں میں حدیث کے تعلق سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ہم پر کچھ زیادہ ہی قدغنیں عائد کرنے والی چیزیں ہیں۔ لہٰذا اسلامی فکر سے دوری رکھنے والے اس فتنہ کی گرفت میں جلد آتے ہیں اور فوری اثر قبول کرلیتے ہیں۔ابوداؤدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: "لوگو آگاہ ہو جاؤ مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اسی کی مانند ایک اور شے بھی اور دیکھو ایسا نہ ہو کہ کوئی پیٹ بھرا شخص اپنے چھپّرکھٹ پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو اور لوگوں سے کہہ رہا ہو کہ دیکھو لوگو، تم پر بس اس قرآن کی پابندی لازم ہے، جو کچھ تم اس میں حلال پاؤ اسی کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسی کو حرام سمجھو۔ جان لو کہ جس طرح اللہ نے کچھ چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں اسی طرح اللہ کے رسول نے بھی کچھ چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں" (ابن ماجہ)۔

اس حدیث میں رسول اللہ سے مروی الفاظ بہت اہم ہیں کہ "انی اوتیت القران ومثلہ معہ۔۔۔" یہ الفاظ اس حقیقت پر نصِ قطعی کا درجہ رکھتے ہیں کہ وحیِ جلی (قرآن) کے علاوہ محمد رسول اللہ کو ایک وحی خفی بھی عطا ہوئی ہے اور وہ اپنی قطعیت کے اعتبار سے قرآن کے مثل ہے۔ اسی طرح "انما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ" کے الفاظ سے یہ صراحت ہوتی ہے کہ حدیثِ رسول احکامِ شریعت کا اپنی

جگہ پر ایک مستقل ذریعہ اور مستقل شعبہ ہے۔ اس اعتبار سے رسول کی اطاعت، خواہ وحی جلیپر مبنی ہو یا وحی خفی پر، بہر حال لازم ہے اور اس ضمن میں ان دونوں میں تفریق نہیں کی جائے گی۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا کہ: "ایسا نہ ہو کہ میں پاؤں تم میں سے کسی شخص کو کہ وہ اپنی کسی آرام دہ نشست پر بیٹھا ہو اور اس کو میرا کوئی حکم پہنچے جو میں نے کوئی کام کرنے کو کہا ہو یا کسی شے سے روکا ہو تو وہ کہے: میں نہیں پہنچانتا، ہم تو بس اسی شے کی پیروی کریں گے جو کتاب اللہ میں ہے" (احمد مسند، سنن ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی، بیہقی)۔ان دونوں احادیث میں ایک بات یکساں ہے اور وہ یہ کہ ایسا کرنے والے لوگ عام طور پر خوشحال اوراونچی سطح کے لوگ ہوں گے ،اور یہ وہی لوگ ہوں گے جو اللہ اور رسول کے احکامات میں تفریق کرنے کی بنا پر گمراہی میں مبتلا ہو جائیں گے۔آج انکار حدیث کے علمبردار کون ہیں یہ بہت آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ اس لیے بھی کیونکہ بے انتہا آرام و آسائش انسان کو دین پر قائم رکھنے میں مزاحمت پیدا کرتا ہے لہٰذا ایسے لوگ بہت جلد اس فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ شبہ پیش کر سکتے ہیں کہ تمام مسائلِ زندگی کے فیصلے کے لیے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی طرف کیسے رجوع کیا جائے۔ جبکہ میونسپلٹی اور ریلوے اور ڈاک کے قواعد و ضوابط اور ایسے ہی بے شمار معاملات کے احکام

سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن در حقیقت یہ شبہ اصول دین کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیّز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا مدّعی ہے، اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اس دائرے میں آزادی کا متمتع ہوتا ہے جو اس کے رب نے اسے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اصول اور قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملہ میں سب سے پہلے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے، اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اسی صورت میں آزادیِ عمل برتتا ہے، اور اس کی یہ آزادی عمل اس حجت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں شارع کا کائی حکم نہ دینا اس کی طرف سے آزادی عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے۔

انسانیت کے نام ربیع اول کا پیغام

دنیا میں جتنی بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان میں نظریہ قوت و طاقت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔اس سلسلے کے چند نظریات پر بہت ہی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ساتھ ہی اسلام کس نہج پر تبدیلی کا خواہاں ہے اس سلسلے میں بھی چند باتیں رکھی گئی ہیں۔اور یہ کوشش اس لیے ہے کہ ماہ ربیع اول میں جہاں بے شمار جلسے جلوس اور تقاریر کے ذریعہ نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے مختلف پہلو نمایاں کیے جاتے ہیں وہاں آج کے ماحول میں یہ بھی لازم آتا ہے کہ تبدیلی کا خواہاں اسلامی نظریہ عیاں کیا جائے۔تاکہ مسائل جن سے ہم آج دوچار ہیں وہ صرف مسائل ہی بن کر نہ رہ جائیں بلکہ اس کے کچھ ٹھوس اقدامات بھی سامنے آئیں۔

تبدیلی کب کہاں اور کیسے آتی ہے یہ مسئلہ صرف تھامس ہابس اور جان لاک ہی کا نہیں تھا۔بلکہ ہیگل نے تو پوری انسانی تاریخ کو "نظریات کی جنگ" کا سفر قرار دیا ہے۔اس نے کہا ہے کہ ایک نظریہ پیدا ہوتا ہے اور دنیا میں اپنے اثرات پھیلاتا رہتا ہے جسے اس نے thesis کہا۔ہیگل کہتا ہے کہ یہ اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس نظریے کی "ضد" پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہی،

کہا۔ ہیگل کے مطابق تھیس اور اینٹی تھیس میں تصادم anti-thesis جسے اس نے نمودار ہوتا ہے۔ یہ synthesis ہوتا ہے اور اس تصادم سے ایک تیسری چیز صالح یا بہترین اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہیگل کے اس نظریے کا کارل synthesis مارکس پر گہرا اثر پڑا، البتہ مارکس نے یہ کیا کہ ہیگل نے جس معرکہ آرائی کو نظریات " میں دکھایا تھا، مارکس نے اس آویزش کو طبقات میں دکھایا۔ مارکس نے " اس تبدیلی کو معنی خیز انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہیگل سر کے بل کھڑا تھا میں نے اسے سیدھا کھڑا کردیا۔

اسی طرح چین میں ماؤزے تنگ کے نظریات میں بھی طاقت کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ ماؤ کا یہ قول مشہور زمانہ ہے کہ طاقت بندوق کی نال سے برآمد ہوتی ہے۔ اگرچہ کمیونسٹ انقلابات نے خود کو "نظریاتی" کہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی نظریاتی طاقت ثانوی چیز تھی۔ ان کا اوّل و آخر طاقت تھی۔ چوں کہ ان کا آغاز طاقت تھی اس لیے ان کا انجام بھی طاقت ہی کے حوالے سے سامنے آیا۔ روس میں کمیونزم کے پاس طاقت کی قلت ہوئی تو کمیونزم معاشرے پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا اور معمولی قوت کی نذر ہوگیا۔ Counter Revolution سے سامنے آنے والے جوابی انقلاب یا بیسویں صدی کے وسط تک آتے آتے طاقت کا ایک نیا مظہر "مارشل لا" کی صورت میں سامنے آیا۔ نوآبادیاتی طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے والے تیسری دنیا کے اکثر ملکوں میں فوج سب سے منظم، باخبر، تعلیم

یافتہ اور طاقتور ادارہ تھا۔ اس ادارے نے اپنی اس حیثیت کو ملک و قوم کے حق میں استعمال کرنے کے بجائے ان کے خلاف استعمال کیا۔ ایشیا اور افریقہ کے متعدد ممالک میں مارشل لا نمودار ہوئے اور 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کا فلسفہ جگہ جگہ حقیقت بنتا نظر آیا۔

تھامس ہابس اور جان لاک کے نظریات کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ یہ نظریات محض قیاس آرائی ہیں، لیکن مارشل لا کو دیکھ کر اور برت کر بہت سے لوگ یہ گمان کرنے لگے کہ ممکن ہے تھامس ہابس اور جان لاک کے قیاسات صحیح ہوں۔ اہم بات یہ ہے کہ مارشل لانے ہر جگہ معاشرے کی تشکیلِ نو کی۔ پاکستان میں مارشل لا لگانے والے جنرل ایوب اور جنرل پرویز مشرف سیکولر تھے، چنانچہ ان کے دور میں معاشرے میں سیکولرازم کو قوت حاصل ہوئی۔ جنرل ضیاء الحق کا ذہن مذہبی تھا، ان کے دور میں معاشرے میں مذہبی رجحانات کو فروغ حاصل ہوا۔ جمہوریت اگرچہ کمیونزم اور مارشل لا کی ضد ہے، لیکن طاقت کا تصور تینوں نظاموں میں مشترک ہے۔ فرق یہ ہے کہ کمیونزم میں طاقت کا سرچشمہ کمیونسٹ پارٹی، مارشل لا میں طاقت کا سرچشمہ فوج ہوتی ہی، اور جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔ افراد اور معاشروں کو نسلی، قومی، لسانی اور مذہبی تعصبات بھی متاثر اور تبدیل کرتے رہے ہیں۔ یہودیت ایک آسمانی مذہب تھا مگر اس کے ماننے والوں نے اسے ایک نسلی مذہب بنادیا۔
ہندوازم کے بارے میں بھی

غالب گمان یہی ہے کہ وہ بھی کبھی ایک الہامی مذہب رہا ہوگا مگر ہندوازم چار ذاتوں کا مذہب بن گیا۔ ہندوستان کی تاریخ، سماجیات، یہاں تک کہ معاشیات پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ گزشتہ چار صدیوں میں یورپ کی قوم پرستی نے ایرک فرام کے مطابق 2600 جنگیں ایجاد کیں۔ ان میں 20 ویں صدی میں لڑی جانے والی دو عالمی جنگیں بھی شامل ہیں جن میں مجموعی طور پر تقریباً 7 کروڑ افراد ہلاک ہوئے، اور جنھوں نے مغرب کے فلسفہ، ادب اور سماج پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس قوم پرستی نے تیسری دنیا کے ملکوں میں بھی قوم پرستی کی تحریکیں پیدا کیں۔ ان تحریکوں نے معاشروں کی سماجی، نفسیاتی اور جذباتی ساخت کو متاثر کیا۔ جرمن ادیب ٹامس مان نے کہا تھا کہ 20 ویں صدی میں انسانی تقدیر سیاسی اصطلاحوں میں لکھی جائے گی۔ ٹامس مان کی یہ پیشگوئی بڑی حد تک درست ثابت ہوئی ہے۔ لیکن 21 ویں صدی کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں انسانی تقدیر معاشی اصطلاحوں میں لکھی جارہی ہے اور معاشیات ایک "عالمگیر مذہب" بن کرابھر رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج "عالمگیر مذہب" کی لپیٹ میں پوری دنیا آچکی ہے۔

ایسے موقع پر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ نیکی کی بنیاد پر ہونے والی تبدیلی، تقوے کے ابلاغ سے ہونے والی قلبِ ماہیت کئی کئی نسلوں تک باقی رہتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نیکی ایسا نعرہ، ایسا نظریہ اور ایسا فلسفہ ہے جو کئی

نسلوں کو اپنا اسیر کر سکتا ہے۔ مسلئہ کا حل جب پیش کیا جاتا ہے یا جن لوگوں کے پاس حل موجود ہے اور وہ اس کو لے کر آگے بڑھنے کا عزم کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو مختلف پابندیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ پھر ان کے تعلق کو امن کی بجائے دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی درمیان مذہب اسلام جو امن کا داعی ہے اس کو فرقہ وارانہ منافرت میں پیش کرنے کی سعی وجہد شروع ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں جہاد کا ذکر کرکے اسلام دشمن طاقتیں کہتی ہیں کہ اسلام تلوار اور طاقت کے زور پر پھیلا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق و باطل کا پہلا معرکہ غزوہ بدر کی صورت میں اس وقت لڑا جب باطل کی قوت حق سے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ مسلمان کافروں کے مقابلے کبھی بھی اپنے زورِ بازو پر بھروسا نہیں کرتے۔ ان کا بھروسا تھا تو اللہ پر اور ہے تو بھی اُس ہی کی امداد اور نصرت پر.... اور یہ صرف غزوہ بدر کا معاملہ نہیں، مسلمان حق و باطل کے کسی بھی معرکے میں شریک ہوں انہیں ہمیشہ اصل امید اللہ کی ذات ہی سے ہوتی ہے۔ پھر جس کا انحصار ہر صورت میں اللہ پر ہو وہ نہ طاقت پرست ہو سکتا ہے اور نہ طاقت کے ذریعے اپنے نظریے کو پھیلا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں اسلامی معاشرہ اپنی روح میں ایک جہادی اور مزاحمتی معاشرہ ہوتا ہے اور اس کی مزاحمت اپنے نفس سے لے کر بین الاقوامی زندگی تک پھیلی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے علمبردار ایک مضبوط، واضح اور مکمل نظام حیات کے فروغ و استحکام کے لیے ہر دم کوشاں رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اسلام

مکمل نظام حیات ہے جس میں معیشیت سے لے کر معاشرت اور تہذیب و تمدن کے تمام معرکے حل کیے جا سکتے ہیں۔لہٰذا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کے تحفظ و فروغ، اس کی بقا و استحکام اور اس کے قیام کے لیے سعی و جہد کرے ۔اور ایک متبادل نظام حکومت فراہم کرے جس میں عوام الناس کے لیے امن و امان ہو اور ان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ مختلف مذاہب کے لوگ اپنے مذہب پر بہ آسانی عمل پیرا رہ سکیں اور ان کا خاندان تعمیر و ترقی کی منزلیں طے کرے۔آج کے موجودہ نظام حکومت میں جہاں افلاس و غربت کی آندھیاں تھپیڑے مار رہی ہیں، جہاں لوگوں کو اپنی بنیادیں ضرورتیں پوری کرنا مشکل تر ہوا جا رہا ہے، جہاں صحت و تعلیم یہں دشواریاں لاحق ہیں۔ وہاں یہ مسلئہ نہ ربیع اول کے جلسے جلسوں میں فصاحت و بلاغت کے کارنامے دکھا کر حل ہوگا، نہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر حالاتِ حاضرہ پر گفت و شنید سے حل ہوگا ،نہ نبی کی شان میں نعت خوانی کی محفلوں سے حل ہوگااور نہ ہی متبادل نظام خود بہ خود وجود میں آکر مسائل حل کر دے گا۔ اگر یہ ممکن ہے تو اس کا آغاز تبدیلیِ قیادت کے اس نعرے سے ہونا چاہیے جو نہ صرف عملی ہو بلکہ اس کے حصول کے لیے بھی راہیں ہموار کی جا چکی ہوں۔اور یہ جب تک ممکن نہیں جب تک کہ رائے عامہ کو اس کے لیے ہموار نہ کر لیا جائے ۔لہٰذا اس اہم کام کا آغاز کرتے ہوئے ہمیں میدانِ عمل میں آنا چاہیے۔ یہی وقت کی آواز ہے اور یہی انسانیت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بھی۔پھر یہی وہ سعی و جہد ہوگی جو کسی

کونے میں بیٹھ کر عبادت کرنے کے بالمقابل عظیم کہلائے گی۔

تبدیلیِ قیادت:

تبدیلیِ قیادت سے ہماری مراد وہ قیادت ہے جو خوف خدا سے سے عاری نہ ہو۔ایسے قیادت جو خوف خدا سے عاری ہو وہ نہ تو خود اپنی ذات کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ انسانیت کو۔ لہٰذا اس پہلو پر بھی توجہ دی جائے کہ قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل کی جائے جو انسانی قوانین کے پاس و لحاظ رکھنے کے علاوہ اُس ہستی کو بھی مانتے ہوں جو خود انسانوں کا موجد اعلیٰ ہے۔ لہٰذا اس مرحلے میں قیادت کی تبدیلی ناگزیر عمل بن جائے گا۔اور یہ تبدیلیِ قیادت کا عمل اسی طرح لایا جائے گا جو موجودہ دور میں انسانوں کے لیے قابلِ قبول ہو یعنی شورائیت جس کے لیے موجودہ نظام انتخابی عمل کا نام تجویز کرتا ہے۔ ہمیں یہ بات بھی واضح کر دینی چاہیے کہ ہماری جدو جہد ہمارے اپنوں" کے خلاف نہیں ہے بلکہ دنیا کی ان طاقتوں کے خلاف ہے جو اپنے قومی و ذاتی" مفادات کی وجہ سے عالمِ انسانیت کو تباہ و برباد کرنے پر آمادہ ہیں اور اس کے لیے مختلف خوبصورت ناموں کی ٹرمس استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جو چیز آپ دنیا کو دینا چاہتے ہیں اس کے لیے سب سے پہلے آپ خود اٹھ کھڑے ہوں۔اُٹھ کھڑے ہونے سے ہماری مراد علمی و عملی پہلوؤں کا جائزہ، تجزیہ اور صورتحال سے آگاہی ہے جس کو حاصل کرنا کسی بھی جانب قدم

اٹھانے سے قبل ہونی چاہیے ۔ہم جانتے ہیں کہ سوچ سمجھے قدم صحیح راہ کو جلد پالیتے ہیں۔اس کے لیے ہمارے پاس باصلاحیت، جرات مند، بلند حوصلہ اشخاص کی کثیر تعداد ہونی چاہیے ۔جو غور و فکر کرنے اور تدبر و دانائی کو اپنا شعار بنانے والے ہوں۔ جو علم و عمل میں یکسانیت رکھتے ہوں یا پھر اس کے لیے سعی و جہد کرنے والے ہوں۔ ہمیں ان ناکارہ، بے مقصد، اور نفس پرست انسانوں کی بھیڑ کی ضرورت نہیں ہے کہ جو اعلیٰ تعلیمی اداروں کی اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں تو رکھتے ہیں لیکن اخلاق و کردار کے پیمانے پر جب ان کو تولا جاتا ہے تو ان کا وزن اس جھاگ سے ذرہ برابر بھی زیادہ نہیں ہوتا جسے سمندر جہاں چاہتا ہے پھینک دیتا ہے۔

ہمیں یہ شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ خرابی کی اصل جڑ موجودہ نظام اور اس کی پروردہ مفاد پرست، ملت فروش اور دنیا پرست قیادت ہے کہ جس پر نوٹس نہ لیا گیا تو اصلاح و فلاح کے پہلو مدھم پڑتے جائیں گے۔ ان طاقتوں کے خلاف اقدام سے ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ موجودہ فلسفہ زندگی پر تفکر کیا جائے، اس میں اصلاح کے پہلوؤں کو ابھارا جائے، اور سب سے بہتر تو یہ ہوگا کہ اسلامی فلسفہ زندگی کو نافذ العمل بنانے میں سعی و جہد کی جائے۔آج ہر طرف ظلم و بربیت کا دور دورہ ہے اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہمیں صرف اپنے طرز معاشرت کو بہتر بنانے کی فکر نے ،مسائل کو سمجھنے، ان پر غور و فکر کرنے اور ان کے

خاتمہ کی سعی و جہد کرنے سے دور کر رکھا ہے۔ لیکن اسلام کی رو سے یہ بھی ظلم ہی کی کٹھمرے میں آتا ہے جو ہم آج خود پر کر رہے ہیں۔ نبی کریم کا ارشاد ہے. برائی کو ہاتھ سے روکا جائے، اس کو زبان سے .برا کہا جائے اور اگر اتنی بھی طاقت نہ ہو تو کم از کم دل میں .برا سمجھا جائے۔ لیکن ایک لمحہ کے لیے ٹھہریں اور اپنے دل پر ہاتھ کر دیکھیں اور خود سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کیا کبھی ہم نے اس جانب توجہ کی ہے؟ اللہ تعالی فرماتا ہے :اور اگر خدا لوگوں کو ان کے ظلم کے سبب پکڑنے لگے تو ایک جاندار کو زمین پر نہ چھوڑے لیکن ان کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیئے جاتا ہے۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں نہ آگے .بڑھ سکتے ہیں (النحل: 61) ۔فرصت کے لحات کو گنوانا نادانی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جو لحات بھی مہلت کے باقی ہیں ان کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ یہی تقاضہ وقت بھی ہے اور یہی ہمارا اولین فرض منصبی بھی۔ لیکن ظلم و .بربیت سے نجات دلانے والوں کا طرز عمل بھی امن پسند ہونا چاہیے تب ہی یہ ہمارے لیے اور دوسروں کے لیے نفع بخش سودہ ثابت ہو گا!

قرآنِ حکیم میں مختلف مقامات پر فرمایا گیا ہے کہ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے' کیا تم تد.بر نہیں کرتے' کیا تم جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ انداز قرآن حکیم کا مخصوص انداز ہے جس میں لوگوں کو متوجہ کیا کہ وہ غور و فکر

کریں۔ کہا کہ کسی بھی چیز کے اقرار یا انکار سے سے سوچنا سمجھنا اور جاننا اور غور و فکر کرنا ہی در اصل تدبر ہے۔ یہی تدبر قرآن میں ایک ایسے نظریے، تفکر و فلسفہ کی تخلیق کرتا ہے، جو ملت اسلامیہ کی ذہنی' علمی' فکری' نفسیاتی' قومی' سماجی' معاشرتی' معاشی' سیاسی' دینی اور بین الاقوامی حیثیت کو مکمل طور پر جداگانہ حیثیت میں ممیّز کرتا ہے۔ یہی قرآنی نظریہ اور فلسفہ حیات ہے، یہی ملت اسلامیہ کی قرآنی تعلیم و تربیت ہے اور یہی کیفیت دینی اور ملی اساس کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ قرآن حکیم نے مزید فرمایا: ہم نے تمھیں واضح طور پر ان امور و معاملات سے آگاہ کر دیا ہے، اگر تم عقل و فکر سے کام لوگے ۔یعنی زندگی کے صحیح راستے پر گامزن رہوگے۔ اسلام اور قرآن کے نزول کے ساتھ ہی بنی نوع انسان دو مختلف نظریات اور دو حتمی مختلف طبقات میں تقسیم ہو گئے تھے ایک نظریہ ایمان لانے والوں کا دوسرا ایمان نہ لانے والوں کا۔ چنانچہ اولاد آدم دو کیمپوں میں تقسیم ہو گئی شرارِ بولہبی ایک جانب اور چراغ مصطفوی دوسری جانب' اس نظریے نے خون اور حسب و نسب کی نفی بھی کر دی۔ برادری' قبیلے اور ذات پات کو ملیامیٹ کرکے رکھ دیا۔ اس کی بہترین مثال جنگ بدر اور جنگ احد ہے جس میں نبی آخرالزماں حضور اکرم اور دوسرے صحابہ کرام کے قریبی رشتہ دار دشمن کی صف میں تھے اور ایمان لانے والے غیر رشتہ دار حضور اکرم کی صف میں موجود تھے۔ چنانچہ قرآن نے کافروں اور منافقین کے ضمن میں ملت اسلامیہ کو بڑی سختی سے متنبہ کیا ہے۔ ان کی

بغض، عداوت اور دشمنی کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آ جاتی ہیں لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ صورتحال کے پس منظر میں ضرورت ہے کہ ہر شخص بہت چوکنّا رہے ساتھ ہی ہر لمحہ اپنے اعمال کا جائزہ بھی لے، اپنے نفس کو ٹٹولے اور چیک کرے اور دیکھے کہ اسکا ہر چھوٹا یا بڑا عمل اس کو کہاں لے جا رہا ہے؟ یہی وہ پیغام ہے جو موجودہ حالات کے پس منظر میں ماہ ربیع اول اور نبی اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے ہمیں اور آپ کو حاصل کرکے میدان عمل میں اتر آنا ہے!

فکری و نظریاتی یلغار اور مسلمان

دنیا پر عظیم ترین اثرات ڈالنے والے مذہب سے تعلق رکھنے والوں نے جب اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کرنا شروع کیا تو ایک وقت وہ بھی آیا کہ مسلمان مغلوب ہوتے چلے گئے، دنیا کی باگ دوڑ ان کے ہاتھ سے لے لی گئی اور وہ تنزل کا شکار ہوئے۔ وجہ یہ کہ وہ اپنے مقصد وجود سے ناواقف ہوتے گئے یہاں تک کہ آج وہ اُس کو بھول ہی چکے ہیں۔ مسلمانوں کے وجود کا سب سے بڑا مقصد اللہ کی فرماں برداری، اس کی خوشنودی کا حصول، اس کی بادشاہی واحکام کے سامنے سپردگی ہے اور دنیا میں ہر سطح پر اللہ کی کبرائی قائم کرنا ہے۔ چونکہ یہ ایک عظیم ترین مقصد ہے لہٰذا حصولِ مقصد کے لیے ایک طویل جدوجہد کی بھی ضرورت ہے۔ ہر اس عقیدہ، تربیت، اخلاق، اغراض اور خواہشات کے خلاف جو اس میں مزاحم ہوں اور ان تمام نفسی وآفاقی (داخلی و خارجی) آلہہ و معبودانِ باطل کے خلاف جو اللہ کی فرماں برداری اور اخلاص میں حریف اور رقیب ہوں۔ اس مخلصانہ جدوجہد کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ انسان اُس اسلام سے بخوبی واقف ہو جس کی خاطر وہ مصروفِ عمل ہے۔ ساتھ ہی کفر و جاہلیت سے بھی مکمل واقفیت کی ضرورت ہے۔ تاکہ جہالت جس لباس اور جس رنگ میں بھی ظاہر ہو اس کو پہچان لے اجائے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے: "مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا جس نے اسلام میں نشو ونمو پایا

اور جاہلیت کو وہ نہیں پہنچاتا"۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسلمان زمان و مکاں کے حدود کی پابندیوں سے اوپر اٹھ کر صراط مستقیم پر قائم رہیں۔ نیز وہ اتنی ذکاوت و مستعدی اور علم رکھتے ہوں اور محنت کرنے کے لیے تیار ہوں کہ اللہ تعالٰی نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں، اور زمین میں دولت و قوت کے جو چشمے اور دفینے رکھ دیئے ہیں، ان سے کام لیتے ہوئے اِن کو اسلام کے مقاصد کے لیے مفید بنا سکیں۔

: موجودہ فکری و نظریاتی یلغار

موجودہ دور میں دنیا کے مختلف ممالک دو بڑے نظریات کی یلغار میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے ایک لبرل ازم ہے تو دوسرا سیکولر ازم۔ ضرورت ہے کہ اس فکری یلغار کا ہر سطح پر مقابلہ کیا جائے تاکہ زندگی کے تمام ہی شعبہ جیات ؛دین و مذہب، اخلاق،
سماج، تعلیم، معاش اور سیاست اس کی خباثت سے نکل کر انسانوں کو حقیقی زندگی پر عمل کرنے میں معاون و مددگار ہوں۔ نیز سرمایہ دارانہ ستعمار اور "انتہا پسندی" و "دہشت گردی" جیسے مذموم نعروں کی آڑ میں جو آج کھل کر معصوم انسانوں کا بڑے پیانہ پر استحصال جاری ہے اُس پر قابو پایا جاسکے۔ گرچہ کمیونزم اور سوشلزم کو شکست ہو گئی ہے اس کے باوجود مذکورہ دونوں نظریات اپنی نوع کے اعتبار سے اصل نظریات نہیں ہیں بلکہ لبرلزم اور سیکولرزم کے ہی محض فروع ہیں۔ ایک جانب مسلم ممالک تو وہیں دوسری جانب دنیا

کا بڑا خطہ لبرل ازم اور سیکولرازم کی جکڑ بندیوں میں بری طرح گھرا ہوا ہے۔ واقع یہ ہے کہ ایک جانب مسلم ممالک کے بیشتر سیکولر حکمران اپنے مفادات کی خاطر مغربی طاقتوں کے ہمنوا بلکہ آلہ کار بنے ہوئے ہیں تو وہیں دوسری جانب مسلمانوں کی اکثریت لبرلزم اور سیکولرزم کو نہ سمجھنے کے باعث اس لڑائی کو ایک گومگو کی حالت میں دیکھ رہی ہے۔

لبرلزم اور سیکولرزم کے وہ علم بردار جو مسلمان ممالک کے شہری ہیں عوام الناس کو ایک دھوکے میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ خدا، رسول، قرآن اور اسلام کا نام لیتے ہیں مگر عملی زندگی میں اسلامی تعلیمات کے نفاذ سے بدکتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک آدمی بیک وقت مسلمان اور سیکولر یا لبرل ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ سیاسی، ادبی، صحافتی اور ثقافتی حلقوں میں اثر و نفوذ رکھتے ہیں اور ذرائع ابلاغ اور حکومتی وسائل کو استعمال کرتے ہوئے نہایت آہستگی اور خاموشی کے ساتھ معاشرے کے تمام شعبوں سے خدا اور اسلام کو بے دخل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ سیکولرزم کی ساخت کے عین مطابق یہ سیکولر حکمران یا دانش ور مسلمانوں کے عقائد، مراسمِ عبودیت اور رسوم و رواج کی نہ صرف یہ کہ مخالفت نہیں کرتے بلکہ خود بھی ان کو اختیار کرکے عوام کو اپنے متعلق پکے مسلمان ہونے کا تاثر دیتے ہیں اور مسلمان عوام اِن سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

لبرل ازم۔ حقیقت کیا ہے؟

اور پھر 'لائبرالس (liber) ، 'لفظ 'لبرل'، قدیم روم کی لاطینی زبان کے لفظ 'لائیبر' (liberalis) سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے "آزاد، جو غلام نہ ہو"۔آٹھویں صدی عیسوی تک اس لفظ کا معنی ایک آزاد آدمی ہی تھا۔بعد میں یہ لفظ ایک ایسے شخص کے لیے بولا جانے لگا جو فکری طور پر آزاد، تعلیم یافتہ اور کشادہ ذہن کا مالک ہو۔اٹھارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد اس کے معنوں میں خدا یا کسی اور مافوق الفطرت ہستی یا مافوق الفطرت ذرائع سے حاصل ہونے والی تعلیمات سے آزادی بھی شامل کر لی گئی، یعنی اب لبرل سے مراد ایسا شخص لیا جانے لگا جو خدا اور پیغمبروں کی تعلیمات اور مذہبی اقدار کی پابندی سے خود کو آزاد سمجھتا ہو، اور لبرلزم سے مراد اسی آزاد روش پر مبنی وہ فلسفہ اور نظامِ اخلاق و سیاست ہوا جس پر کوئی گروہ یا معاشرہ عمل کرے۔ یہ تبدیلی اٹلی سے چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہونے والی تحریک احیاے علوم (Renaissance یعنی re-birth) کے اثرات یورپ میں پھیلنے سے آئی۔برطانوی فلسفی جان لاک (1620ء۔ 1704ء) پہلا شخص ہے جس نے لبرلزم کو باقاعدہ ایک فلسفہ اور طرزِ فکر کی شکل دی۔یہ شخص عیسائیت کے مروّجہ عقیدے کو نہیں مانتا تھا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ بنی نوعِ انسان کو آدم کے اس گناہ کی سزا ایک منصف خدا کیوں کر دے سکتا ہے جو انھوں نے کیا ہی نہیں۔عیسائیت کے ایسے عقائد سے اس کی آزادی اس کی ساری فکر پر غالب آ گئی اور خدا اور مذہب پیچھے رہ گئے۔انقلابِ فرانس کے فکری رہنما والٹئیر (1694ء۔ 1778ء) اور روسو (1712ء۔

ء) اگرچہ رسمی طور پر عیسائی تھے مگر فکری طور پر جان لاک سے متاثر تھے۔1778
انھی لوگوں کی فکر کی روشنی میں انقلابِ فرانس کے بعد فرانس کے قوانین میں مذہبی
اقدار سے آزادی کے اختیار کو قانونی تحفّظ دیا گیا اور اسے ریاستی ا±مور کی صورت
گری کے لیے بنیاد بنا دیا گیا۔امریکا کے اعلانِ آزادی (American Declaration
of Independence) میں بھی شخصی آزادی کی ضمانت جان لاک کی فکر سے متاثر
ہو کر دی گئی ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، وکی پیڈیا اور اوکسفرڈ ڈکشنری) ۔ دنیا کے
مختلف ممالک میں خدا، حیات بعد الموت اور دینِ اسلام کی دنیاوی امور سے متعلق
تعلیمات کے بارے میں آج جو بے اطمینانی پائی جاتی ہے، اس کا سرچشمہ یہی یورپ کی
خدا اور اس کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے برگشتہ فکر ہے جس کی ذرا سخت
قسم لبرلزم اور کچھ نرم سیکولرزم ہے۔ یہ لبرل ازم اور سیکولرازم ہی ہے جس نے
موجودہ دور میں مسلم ممالک، مسلم جماعتوں اور مسلم اداروں کو بھی عصری تعلیم میں
تصور وحی کی نہی " جیسے تعلیمی نظام کو یا تو فروغ دینے یا اس کا آلہ کار بننے پر مجبور کیا"
ہے۔ نتیجتاً ہر خاص و عام مادیت اور آوارگی و نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو گیا۔

لائحہ عمل:

آج امت کو درپیش مسائل کا واحد راستہ یہی ہے کہ حقائق اور واقعات کا جرات و

دور اندیشی اور صحیح دینی روح اور دینی بصیرت کے ساتھ سامنا کیا جائے، اور ملک میں دین کی صحیح تعلیم کے مطابق ہمہ گیر، صالح اور ضروری تبدلی کے لیے صدق دل اور اخلاص کے ساتھ کوشش شروع کی جائے۔ جن چیزوں کا ازالہ اور سدّ باب ضروری ہو ان کا سدباب کیا جائے اور جن اصلاحات کا نفاذ اور جن اسکیموں کا آغاز ضروری ہو، ان کے آغاز میں دیر نہ کی جائے۔ اسلام، قرآن اور سنتِ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی روشنی میں اور اسلامی حدود کے مطابق معاشرہ میں مساوات اور انصاف قائم کیا جائے۔ اہل ملک کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے ضروری قدم اٹھائے جائیں، کم از کم جمہور کے ہر فرد کے لیے امکانی حد تک ضروریات زندگی کا بندوبست ہو۔ اس بے جا اسراف اور حد سے بڑھی ہوئی فضول خرچی کو ختم کیا جائے جو عوام کی حقیقی ضروریات بھی پوری ہونے نہیں دیتی۔ اغنیا و اہلِ ثروت میں ایثار کا مادہ، اور ضروریات سے فاضلِ مال کے خرچ کا جذبہ اور "یسئلونک ماذا ینفقون، قل العفوا" پر عمل کرنے کا شوق ہو اور فقراء میں استغناء و خود داری اور اپنے گاڑھے پسینہ اور محنت و قابلیت سے اپنی ضروریات زندگی کے بندوبست کا جذبہ ہو۔ نظام تعلیم کو نئے سرے سے اس طرح ڈھالا جائے کہ وہ اسلام کے عقائد و اصول اور عصر جدید کے تغیرات اور علوم و سائل دونوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور دونوں کے تقاضے پورے کرتا ہو۔ اور نئی نسل میں ایک طرف ایمان ویقین اخلاقی قوت، استقامت، خود اعتمادی و خودداری اپنے دین پر غیر متزلزل یقین اور اس کے لیے قربانی کا جذبہ ہو، تو وہیں

دوسری طرف قوتِ ایجاد، فکری استقلال، بلند ہمتی اور اولوالعزمی پیدا کرنے اور جرات وذہانت کے ساتھ مغرب کا مقابلہ کرنے کا جوہر اور اوصاف پیدکیے جائیں۔اس کے لیے لازم ہے کہ ہر باشعور مسلمان ایک پھر تجدید شہادت کافریضہ انجام دیتے ہوئے منظم جدوجہدکے لیے صحیح اسلامی بنیادوں پر یا تو خود ایک گروہ مخصوص تشکیل دے بصورت دیگر موجودہ اسلامی تحریکات کو وہ حصہ بن جائے۔

وہ افراد جو یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ بذات خود ایک صالح گروہ تشکیل دیں گے یا وہ حضرات جو کسی اسلامی تحریک کاحسہ بنیں گے ، دونوں ہی طرح کے افراد کو یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ہوگی کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے کام کا کوئی ایک ہی میدان نہیں ہے، بلکہ پوری انسانی زندگی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اس کے دائرہ عمل میں آتی ہے۔

اسلام تمام انسانوں کے لیے ہے، اور ہر چیز جس کا انسان سے کوئی تعلق ہے اس کا اسلام سے بھی تعلق ہے۔ لہٰذا اسلامی تحریک ایک ہمہ گیر نوعیت کی تحریک ہے اور یہ خیال کرنا غلط ہے کہ اس تحریک میں کام کرنے کے لیے صرف خاص قابلیتوں اور خاص علمی معیارکے آدمیوں ہی کی ضرورت ہے، نہیں، یہاں ہر انسان کے لیے کام موجود ہے، کوئی انسان بیکار نہیں ہے، جو شخص جو قابلیت بھی رکھتا ہو اس کے لحاظ سے وہ اسلام کی خدمت میں اپنا حصہ ادا کرسکتا ہے۔ عورت، مرد، بوڑھا، جوان، دیہاتی، شہری، کسان،

مزدور، تاجر، ملازم، ادیب، ان پڑھ اور فاضل اجڈ، سب یکساں کار آمد اور یکساں مفید ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ جان بوجھ کر اسلام کے عقیدے کو اختیار کر لیں، اس کے مطابق عمل کرنے کا فیصلہ کر لیں، اور اس مقصد کو جسے اسلام نے مسلمانو کا نصب العین قرار دیا ہے اپنی زندگی کا مقصد بنا کر کام کرنے پر تیار ہو جائیں۔ اسے دنیا کے پورے نظامِ زندگی کو بدلنا ہے۔ دنیا کے اخلاق، سیاست، تمدن، معیشت، معاشرت، ہر چیز کو بدل ڈالنا ہے۔ دنیا یں جو نظامِ حیات خدا سے بغاوت پر قائم ہے اسے بدل کر خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے۔ اس لیے ہر شخص کو قدم آگے بڑھانے سے پہلے خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کس خارزار میں قدم رکھ رہا ہے۔ یہ وہ راستہ نہیں ہے جس میں آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹ جانا دونوں یکساں ہوں۔ نہیں، یہاں پیچھے ہٹنے کے معنی ارتداد کے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جماعت سے نکلنا ارتداد کا ہم معنی ہے، بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ خدا کے راستہ میں پیش قدمی کرنے کے بعد مشکلات، مصائب، نقصانات اور خطرات کو سامنے دیکھ کر پیچھے ہٹ جانا اپنی روح اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے ارتداد ہے۔ کہا کہ "وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ" (سورۃ الانفال: 16)۔ قدم اٹھانے سے پہلے خوب سوچ لو۔ جو قدم بڑھاؤ اس عزم کے ساتھ بڑھاؤ کہ اب یہ قدم پیچھے نہیں پڑے گا۔ جو شخص اپنے اندر ذرا بھی کمزوری

! محسوس کرتا ہو بہتر ہے کہ وہ اسی وقت رک جائے

حالات کے پس منظر میں یہ بات عام ہو چلی ہے کہ دنیا کے چودھری امریکہ کی بین الاقوامی پالیسیاں اس کو تباہی کی جانب رواں دواں کیے ہوئے ہیں۔امریکا کے معروف فلسفی اور اسرائیلی و امریکی حکومتوں کے ناقد پروفیسر نوم چومسکی نے امریکا کو "دنیا کا سب سے بڑا داداگیر ملک "قرار دیا ہے (دی روگ اسٹیٹ)۔حقیقت یہ ہے کہ سپر پاور امریکا کو زوال سے دوچار کرنے میں خود اس کی پالیسیاں اور عوامل نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ نیز ان پالیسیوں پر خود امریکا میں بھی علمی حلقوں اور عوامی سطح پر احتجاج کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اگر وہ اپنی روش نہیں بدلتا اور مجموعی طور پر دنیا میں فساد اور بگاڑ ہی کا باعث بنتا ہے تو خدا کے قانون کے تحت زوال اس کا لازمی مقدر ہے۔اس پس منظر میں ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا تو کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آئندہ کون سی قوم اٹھائی جائے گی۔ لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر مسلمانوں نے اپنے فکر و عمل میں تبدیلی پیدا نہیں کی تو ممکن ہے کہ آج سے زیادہ مسائل سے وہ دوچار ہو جائیں۔ کیوں کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے جب وہ ایک قوم کو اس کے برے اعمال کی وجہ سے گراتا ہے تو اس کی جگہ کسی ایسی قوم کو اٹھاتا ہے جو اس مغضوب قوم کی طرح بدکار اور اس کے مانند سرکش نہ ہو۔ کہا کہ: " اگر تم منہ موڑوگے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ

ہوں گے " (محمد: 38)۔

این بی ایس اے گائڈ لائنس اور ہمارا میڈیا

ہر دور میں با اختیار لوگوں کی خواہش رہی ہے کہ اقتدار ان کے ہاتھ سے نہ چھینا جا سکے ۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قوت و طاقت کے جدید ذرائع کو ہمیشہ استعمال کیا ہے۔ایک وقت تھا کہ قوت و طاقت انسانوں پر مبنی تعداد کی شکل میں درج کی جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ جسمانی طاقت جدید آلات میں تبدیل ہو گئی۔اب طاقت انسانی جسم، اس کی قوت و توانائی اور اس کی تعداد پر مبنی نہیں رہی بلکہ اُس تکنیک پر منحصر ہو گئی جہاں فرد بحیثیت قوت کوئی حیثیت رکھتا ہی نہیں ،اور اِسی کو "ڈرون "کا نام دیا گیا۔یہ ڈرون کیا ہے اس کو بھی سمجھتے چلیے۔اصل میں مخفف "میڈیم ایلٹیٹوڈ لانگ اینڈورینس "بغیر پائلٹ کے جہاز یا 'پریڈیٹر' کو دشمن کے علاقے میں فضائی جاسوسی یا نگرانی کرنے کے مقصد سے بنایا گیا تھا لیکن بعد میں اس پر اے جی ایم ہیل فائر میزائل بھی نصب کر دیئے گئے۔ 1995 سے امریکی فوج کے زیر استعمال یہ ڈرون افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں سے پہلے بوسنیا، سربیا، عراق اور یمن میں بھی استعمال کیے جا چکے ہیں۔ڈرون صرف ایک جہاز ہی نہیں بلکہ یہ ایک پورا نظام ہے۔اس پورے نظام میں چار جہاز، ایک زمینی کنٹرول اسٹیشن اور اس کو سیٹلائٹ سے منسلک کرنے والا حصہ ہوتا ہے۔اس نظام کو چلانے کے لیے پچپن افراد کا عملہ درکار ہوتا ہے۔پینٹاگن اور سی آئی اے1980 کی دہائی کے اوائل سے

جاسوسی کے لیے ڈرون طیاروں کے تجربات کر رہے تھے۔ 1990 میں سی آئی اے کو ابراہم کیرم کے بنائے ہوئے ڈرون میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ ابراہم کیرم اسرائیلی فضائیہ کا چیف ڈیزائنر تھا جو بعد میں امریکہ منتقل ہو گیا۔ ڈرون 1990 کی دہائی میں مختلف تجرباتی مراحل سے گزرتا رہا اور 1995 میں پہلی مرتبہ اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بات کا رخ ذرا تبدیل ہو گیا لیکن ضروری بھی تھا۔ بات ہو رہی تھی قوت و اقتدار کے جدید ذرائع کی اور ان بااختیار لوگوں کی جو ان کو استعمال کرتے ہیں۔

جدید جنگی ساز و سامان سے بھی زیادہ اہم قوت و اقتدار پر قابض رہنے کا ذریعہ آج میڈیا ہے، خصوصاً الیکٹرانک میڈیا۔ جس سے ہر وہ شخص مستفید ہو رہا ہے جو پڑھنا لکھنا تک نہیں جانتا لیکن گھر میں ایک ٹیلی ویژن ضرور رکھتا ہے۔ دوسری طرف پرنٹ میڈیا ہے جو سنجیدہ اور معاشرہ پر اثر انداز ہونے والے لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس تعلق سے بھی یہ بات بتاتے چلیں کہ امریکہ میں 1976ء میں کانگریس کے سامنے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ سی آئی اے اندرون ملک اور بیرون ملک صحافیوں اور اخبارات کو خریدنے کے لئے بھاری رقوم خرچ کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے 1948ء میں فرینک وینسر کی سربراہی میں سی آئی اے کا ایک باقاعدہ ذیلی ادارہ آفس آف پالیسی کارڈ ینیشن کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ اس نے امریکہ کے جن بڑے بڑے اخبارات کو خریدا ان میں نیویارک ٹائمز، نیوزویک، سی بی سی اور واشنگٹن پوسٹ کے بے شمار قابل احترام اور معزز اخبار نویس شامل تھے۔ ان اخبار نویسوں کو خبریں یا کالم تیار کرکے

دیئے جاتے تھے، جو بعض اوقات لفظ بہ لفظ اور کبھی کبھار معمولی ردوبدل کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ سی آئی اے نے اپنے اس آپریشن کو Operation Mocking Bird کا نام دیا تھا اور اس کے ذریعے میڈیا کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ 1976ء میں بڑے لرزا دینے والے حقائق کانگریس کی فرینک چرچ کمیٹی کے سامنے آئے۔ پتہ چلا کہ سی آئی اے نے تین ہزار سے زائد صحافیوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں، جو امریکی پالیسیوں یا سی آئی اے کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ سی آئی اے کے ایک اہم افسر تھامس بریڈن نے اپنے ادارے کے لامحدود اختیارات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یورپ میں وہ کسی حساب کتاب کے بغیر ایک وقت میں کسی صحافی کو پچاس ہزار ڈالر تک ادا کر دیتے ہیں، جبکہ سی آئی اے کے افسران کو صحافیوں کی خدمات حاصل کرنے اور انہیں ادائیگیاں کرنے کے لامحدود اختیارات ہوتے ہیں۔ کانگریس کو بتایا گیا تھا کہ سی آئی اے کے پاس پوری دنیا میں ہزاروں صحافیوں کا ایک ایسا نیٹ ورک موجود ہے جو اسے نہ صرف معلومات فراہم کرتا ہے، بلکہ اس کی خواہشات کے مطابق پراپیگنڈا کرکے متعلقہ ملک کی رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ نیز سی آئی اے نہ صرف اپنے مطلب کی خبروں کی اشاعت کا اہتمام کرتی ہے، بلکہ میڈیا سے ان کے کہنے پر خبریں غائب بھی ہوجاتی ہیں۔ قوت واقتدار کا یہ وہ پس منظر ہے جس میں ہم ہندوستانی نیوز براڈکاسٹنگ اسٹینڈرڈ اتھاریٹی (این بی ایس اے) کی گائیڈ لائنس کی بات کریں گے۔

:این بی ایس اے کی گائیڈ لائنس

دہشت گردی کے الزام میں زیر حراست مسلم نوجوانوں کے تعلق سے خود ساختہ قومی میڈیا (نیوز چینلز) کی جانب سے خبروں کی پیش کش میں مسلسل فرقہ وارانہ رنگ جھلکنے پر قومی اقلیتی کمیشن نے ذرائع ابلاغ سے وابستہ متعدد نگراں اداروں کو صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے قومی میڈیا کی روش میں اصلاح پر زور دیا تھا۔ اس شکایت کا نوٹس لیتے ہوئے پرائیوٹ نیوز چینلز کی نمائندہ تنظیم نیوز براڈکاسٹنگ اسوسی ایشن کے تحت نیوز براڈکاسٹنگ اسٹینڈرڈ اتھارٹی (این بی ایس اے) نے پانچ نکاتی گائیڈ لائنس جاری کرکے رپورٹنگ جیسے پیشہ کو فرقہ واریت سے پاک رکھنے کی ہدایت جاری کی ہے۔ این بی ایس اے کی جانب سے جاری کی جانے والی گائڈ لائنس میں کہا گیا ہے کہ جرائم، فسادات، افواہوں اور متعلقہ معاملات پر خبر کو فرقہ وارانہ انداز میں نشر کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ آنجہانی جسٹس جے ایس ورما کی سربراہی والے این بی اے نے اپنی ہدایات میں مزید کہا کہ جرائم (دہشت گردی) کے تعلق سے خبروں کی نشریات میں ملزمین یا مشتبہ افراد کی مذہبی حیثیت کو اجاگر نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ اس سے ہمارے ملک کا سیکولر تانا بانا بکھر جائے گا۔ ہدایت کے مطابق فرقہ وارانہ انداز میں خبروں کی نشریات کی وجہ سے جہاں ایک مخصوص فرقہ کی شبیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے وہیں ملزم کے بری ہونے کے بعد بھی یہ شناخت اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ این بی ایس اے نے 19 اپریل کو قومی اقلیتی کمیشن کے سربراہ وجاہت حبیب اللہ کے خط کے جواب میں لکھا ہے کہ "قومی

اقلیتی کمیشن کی جانب سے جانبدارانہ اور فرقہ وارانہ رپورٹنگ کے جن پہلوؤں پر اعتراض کیا گیا ہے وہ قابل تشویش ہیں۔ اسے این بی ایس اے نے نوٹس میں لیتے ہوئے گائیڈ لائنس جاری کردی ہے"۔ این بی ایس اے کے عنیین جوزف نے قومی اقلیتی کمیشن کو بتایا ہے کہ کمیشن کی جانب سے جو تشویش ظاہر کی گئی اسے ایک لیٹر نوٹ کی شکل میں نیوز براڈ کاسٹنگ اسوسی ایشن سے وابستہ تمام ایڈیٹروں اور ممبروں کو بھیج دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی این بی ایس اے کی جانب سے جاری ہداتیں بھی دی گئی ہیں۔ عنیین جوزف نے مزید بتایا کہ اسی مفہوم پر مشتمل این بی ایس اے کی جانب سے پہلے بھی گائیڈ لائنس جاری کی جاچکی ہیں مگر قومی اقلیتی کمیشن کی نشاندہی کے بعد اسے دوبارہ بہتر طریقہ سے جاری کیا گیا ہے۔

:کاٹجو کہتے رہے ہیں

واقعہ یہ ہے کہ این بی ایس اے کی گائیڈ لائنس سے قبل ملک کے دیگر ذمہ دار شخصیات کی جانب سے بھی اس طرح کی باتیں آتی رہی ہیں کہ دہشت گردی کے معاملات میں خصوصاً الیکٹرانک میڈیا اور عموماً پرنٹ میڈیا کا کردار اچھا نہیں ہے۔ ان میں سرفہرست جسٹس مارکنڈے کاٹجو کا نام ہے جنھوں نے ابھی حال ہی میں انگریزی روزنامہ "دی ہندو"کے زیر اہتمام سمپوزیم بعنوان "دہشت گردی کی رپورٹنگ...میڈیا کتنا حساس ہے؟" سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا یہ ماننا ہے کہ دہشت گردی کے حوالے سے میڈیا یہ رپورٹیں غلط رنگ سے پیش کی جاتی ہیں اور کسی ناخوشگوار واقعہ کے

فوراً بعد میڈیا خصوصاً الیکٹرانک میڈیا بالواسطہ طور پر مسلمانوں کو قصوار وار قرار دیتا ہے۔اپنے خطاب میں وہ کہتے ہیں کہ: " جب کبھی کوئی بم دھماکہ یا ایسا کوئی تخریبی واقعہ رونما ہوتا ہے تو ایک گھنٹہ کے اندر کئی ٹی وی چینل یہ بتانا شروع کردیتے ہیں کہ انڈین مجاہدین، حرکتہ المجاہدین یا جیش محمد اور لشکر طیبہ سے ای میل یا ایس ایم ایس موصول ہوا ہے۔یہاں تک کہ بعض مسلم ناموں کا ذکر کرتے ہوئے غیر ذمہ داری سے کام لیا جارہا ہے۔ای میل یا ایس ایم ایس کوئی بھی فسادی شخص کسی بھی جانب روانہ کرسکتا ہے مگر اسے بتانا شروع کرتے ہوئے آپ یہ پیام دے رہے ہیں کہ تمام مسلمان دہشت گرد ہیں، ان کے پاس بم پھینکنے کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔آپ سارے مسلم طبقہ کو عفریت بتائے ہوئے فرقہ واریت کو فروغ دے رہے ہیں"۔یاد رہے گذشتہ ماہ حیدرآباد کے دلسکھ نگر بم دھماکوں کے بعد سی این این آئی بی این کے ایک پروگرام میں کرن تھاپر کو انٹرویو دیتے ہوئے یہی باتیں کہتے ہوئے جسٹس کاٹجو نے کہا تھا کہ "انڈین مجاہدین نام کی تنظیم کا کوئی وجود نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انڈین مجاہدین زرخرید صحافیوں کی تخلیق کردہ تنظیم ہے جس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرتے ہوئے ان کے خلاف گھناؤ نی مہم چلانا ہے۔ نئی دہلی ، بنگلور، حیدرآباد یا کسی اور شہر میں جب بم دھماکہ کا واقعہ پیش آتا ہے تو ٹی وی چینلوں پر آناً فاناً مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انڈین مجاہدین ، حزب المجاہدین ، جیش محمد، لشکر طیبہ جیسی تنظیموں پر الزام عائد کیا جاتا ہے۔اِن تنظیموں پر الزام لگانے کا واحد مقصد یہی ہوتا ہے

کہ مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کیا جائے۔ ا±ن کی شبیہ بگاڑی جائے۔ انہیں ملک دشمن ثابت کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ 90 فیصد مسلمان انصاف پسند ہیں، ان کا دہشت گردی سے کوئی لینا دینا نہیں ہے"۔حالات کے تناظر میں یہ بات بھی اہم ہے کہ جس .برق رفتاری اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ہوڑ میں قیاس پر مبنی اور بلا تحقیق رپورٹیں پیش کرتے ہوئے شبیہ بگاڑنے کی منظم کوششیں کی جاتی رہی ہیں اس کے .برخلاف جب کوئی مسلم نوجوان باعزت .بری ہوتا ہے، اس وقت یہی میڈیا چینل خاموشی اختیار کرلیتے ہیں۔جب کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر آپ خبر کو خبر ہی مان کر عوام کے سامنے لا رہے ہیں تو ان خبروں کو بھی سامنے لایا جانا چاہیے جس میں ان معصوم نوجوانوں کی زندگی سے کھلواڑ کی جاتی ہے اور اس کے بعد ان کو باعزت .بری کر دیا جاتا ہے۔

:اور مخصوص رپورٹیں چھپائی بھی جاتی ہیں

واقعات کے پس منظر میں یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ملک کا الیکٹرانک میڈیا ہو یا دیگر ان ممالک کا جن پر بالواسطہ یا بلاواسطہ امریکہ اور اسرائیل کا تسلط قائم ہے یا ان کے درمیان تعلقات میں بہتری آتی جا رہی ہے۔ان کا ہدف پہلے نمبر پر مسلمان ہیں اور اس کے بعد وہ تمام افراداور جماعتیں جو ان کے شانہ بشانہ چلنا پسند نہیں کرتیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے الیکٹرانک میڈیا نے بھی اور دیگر ہمنوا ممالک نے بھی اس خبر کو پوری طرح نظر انداز کر دیا جس میں سابق امریکی

صدارتی امیدوار رون پاول نے نائن الیون حملوں کو اسرائیلی کارروائی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس انسانیت سوز واقعہ میں موساد کے ملوث ہونے کے کئی شواہد موجود ہیں۔ غیر ملکی خبر رساں ادارے کے مطابق ایک امریکی اخبار سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ نائن الیون حملوں کے حوالے سے اب کسی شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ حملے امریکہ کی اندرونی نہیں بلکہ اسرائیلی بیرونی کارروائی ہے۔ اب تک ملنے والے تمام شواہد سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد نے یہودی لابی کے ساتھ مل کر یہ کاروائی کی۔ خیال رہے کہ نائن الیون کے واقعہ کے بعد امریکہ اور نیٹو کے فوجی دستوں نے القاعدہ نیٹ ورک کو ختم کرنے کے بہانے افغانستان میں وسیع پیمانے پر خونریزی کی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اب تک ہزاروں افغان مرد خواتین اور بچے شہید اور لاکھوں افراد بے گھر ہو چکے ہیں۔ واضح رہے کہ ایران کے صدر احمدی نژاد نے نائن الیون کی برسی پر عالمی برادری کے سامنے یہ سوال رکھا تھا کہ دنیا نے گیارہ ستمبر کے واقعات کو لے کر جن دس لاکھ سے زیادہ افراد کو مارا گیا ہے ان کی بابت کیوں خاموشی اختیار کر لی گئی ہے؟ قابل ذکر ہے کہ نائن الیون حملوں کی آڑ میں عراق وافغانستان اور دنیا بھر کے مسلم ممالک میں ہزاروں افراد کے قتل عام کے بعد بھی امریکہ اس واقعہ کے بارے میں تحفظات دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

دونوں ٹاورز میں موجود فرنیچر اور دیگر سازو سامان کی حالت درست، جبکہ ہزاروں لوگوں کی لاشیں جادوئی طریقہ سے غائب ہونے سے شکوک وشبہات میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ذرائع کے

مطابق 11 ستمبر 2001 کو دہشت گرد حملوں میں گرنے والی امریکہ کی دو بڑی عمارتوں میں موجود فرنیچر و دیگر سازو سامان کی حالت سے لگتا ہے کہ عمارتیں گری ہی نہیں جبکہ انسانی لاشوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے اور ایک ہزار سے زائد لاشوں کا نام و نشان تک نہ ملنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لاشوں کو جادوئی طریقہ سے فضا میں ہی غائب کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ نہ کسی انسان کے اعضاء مل سکے اور نہ ہی ہڈی کا ٹکڑا اور نہ ہی انسانی جلد کا کوئی حصہ ثبوت کے طور پر عمارتوں میں موجود ہے۔ یہ وہ واقعہ ہے جو رون پال بیان کرتے ہیں اور یہی وہ دہشت گردی کے خلاف منظم جدوجہد ہے جہاں سے صلیبی جنگوں کا ایک بار پھر آغاز ہوا چاہتا ہے۔ اب ان جنگوں میں کون کس کا حلیف اور حریف بنے گا یہ وقت اور حالات واضح کرتے چلے جائیں گے۔ لیکن امن پسند حضرات ہر وقت اور ہر زمانے میں زندہ دل اور روشن دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقیقت اور سچائی کو واضح کرتے رہیں گے اور اُن انتہا پسندوں اور فاشسٹوں کا ساتھ نہیں دیں گے جن کا مقصد ہی اللہ کی زمین پر فساد فی الارض پھیلانا رہا ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ جن آزمائش سے بھی دوچار ہیں ان سے نکلنے کی ہر ممکن تدبیر کریں لیکن احسان کی روش پر قائم رہیں۔ کیونکہ احسان کی روش فساد سے روکتی ہے نیز ایسا شخص دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ کہا کہ: "جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند

نہیں کرتا" (القَصص: ۷۷)۔

تبدیلی قیادت ناگزیر! مگر کیسے ؟

اگر ہم نے غور و فکر کی صلاحیتوں سے کام نہ لیا تو پھر جمود ہمارا مقدر ہوگا۔ ہماری انقلابیت سرد پڑ جائے گی اور پھر منزلِ مقصود ہم سے دور ہوتی چلی جائے گی۔ اس سے محفوظ رہنے کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے عقلی و سائنسی بنیادوں پر اپنی فکر اور پروگرام کا بے لاگ تنقیدی و تجزیاتی جائزہ۔ ہمیں چاہیے کہ ہم حقیقی اور بنیادی مسائل کی نشان دہی کریں اور انہیں نئی فکر اور قوت کے ذریعے حل کرنے کی سمت میں آگے بڑھیں۔زمانہ اس پر شاہد ہے کہ ہمارے ذہن کی ساخت، سوچنے اور غور و فکر کرنے کا انداز ہمیشہ ہمارے ذاتی حالات سے متاثر رہا ہے۔آج ہم غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور یہ کوئی برائی نہیں لیکن برائی اس وقت بن جاتی ہے جب کہ ہم پس ماندگی ، اخلاقی گراوٹ، علمی فقدان، سائنسی رویہ اور رجحان کی کمی سے دوبالا ہوتے ہیں اور یہ ساری چیزیں مل کر ہماری فکر و فہم پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہماری قوتِ فیصلہ وتدبر ہم سے چھن جاتی ہے اور ہمارے نظریات اور حقیقت (idialism میں فرق رونما ہونے لگتا ہے۔ جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے (realism اور یعنی ان میں توازن قائم ہو اور ہم حقیقت پر مبنی سوچ رکھتے ہوں جو ہمارے نظریات سے مطابقت رکھتی ہو۔ یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ ہم بصیرت سے محروم نہ ہوں۔حالات حاضرہ کا تجزیہ ہو یا قرآن و

حدیث کی تفہیم و تشریح، سب کچھ بصیرت افروز نگاہوں اور انقلابی نقطہ نظر سے کیا جانا چاہیے۔اس راہ میں ہمارے لیے سب سے بڑی رکاوٹ وہ غیر متّقی، خوفِ خدا سے عاری اور اخلاص و دیانت کے ہتھیاروں سے محروم قیادت ہے جسے نہ تو قوم وملت کی کوئی فکر ہے اور نہ حالاتِ حاضرہ کی عالمانہ اور حقیقت پسندانہ بصیرت۔جب تک ہم ان موجودہ ناعاقبت اندیش قیادت کو چلانے اور قائم کرنے والوں میں شمار ہوتے رہیں گے تب تک یہ وبا ہمارے سروں پر اسی طرح منڈلاتی رہے گی۔

:انکار و اقرار کی بنیادیں

قرآنِ حکیم میں مختلف مقامات پر فرمایا گیا ہے کہ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے' کیا تم تدبر نہیں کرتے' کیا تم جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ انداز قرآن حکیم کا ایک الگ انداز ہے جس میں لوگوں کو متوجہ کیا گیا، انھیں غور و فکر کرنے کی جانب متوجہ کیا گیا ہے، ان سے کہا گیا ہے کہ کسی بھی چیز کے اقرار یا انکار سے سے پہلے ضروری ہے کہ انسان اس کے بارے میں سوچ سمجھ لے، یہی جاننا اور نہ جاننا' یہی فکر وتدبر اور یہی فکر و نظر قرآن میں ایک ایسے نظریے اور تفکر و فلسفہ کی تخلیق کرتا ہے' جو ملت اسلامیہ کی ذہنی' علمی' فکری' نفسیاتی' قومی' سماجی' معاشرتی' معاشی' سیاسی' دینی اور بین الاقوامی حیثیت کو مکمل طور پر جداگانہ حیثیت میں ممیّز کرتا ہے۔ یہی قرآنی

نظریہ اور فلسفہ حیات ہے اور یہی ملت اسلامیہ کی قرآنی تعلیم و تربیت ہے' یہی کیفیت دینی اور ملی اساس کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ قرآن حکیم نے مزید فرمایا: ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور و معاملات سے آگاہ کر دیا ہے' اگر تم عقل و فکر سے کام لوگے ۔یعنی زندگی کے صحیح راستے پر گامزن رہو گے۔ اسلام اور قرآن کے نزول کے ساتھ ہی بنی نوع انسان دو مختلف نظریات اور دو حتمی مختلف طبقات میں تقسیم ہو گئے تھے ایک نظریہ ایمان لانے والوں کا دوسرا ایمان نہ لانے والوں کا۔ چنانچہ اولاد آدم دو کیمپوں میں تقسیم ہو گئی شرارِ بولہبی ایک جانب اور چراغ مصطفوی دوسری جانب' اس نظریے نے خون اور حسب و نسب کی نفی بھی کر دی۔۔برادری' قبیلے اور ذات پات کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ اس کی بہترین مثال جنگ بدر اور جنگ احد ہے جس میں نبی
آخرالزماں حضور اکرم اور دوسرے صحابہ ِ کرام کے قریبی رشتہ دار دشمن کی صف میں تھے اور ایمان لانے والے غیر رشتہ دار حضور اکرم کی صف میں موجود تھے۔ چنانچہ قرآن نے کافروں اور منافقین کے ضمن میں ملت اسلامیہ کو بڑی سختی سے متنبہ کیا ہے۔ ان کی بغض' عداوت اور دشمنی کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آ جاتی ہیں لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

نظریہ قوت و طاقت :

تبدیلی کب کہاں اور کیسے آتی ہے یہ مسئلہ صرف تھامس ہابس اور جان لاک ہی کا نہیں تھا۔ بلکہ ہیگل نے تو پوری انسانی تاریخ کو "نظریات کی جنگ" کا سفر قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ایک نظریہ پیدا ہوتا ہے اور دنیا میں اپنے اثرات پھیلاتا رہتا ہے جسے اس نے thesis کہا۔ ہیگل کہتا ہے کہ یہ اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس نظریے کی "ضد" پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہی، جسے اس نے anti-thesis کہا۔ ہیگل کے مطابق تھیسس اور اینٹی تھیسس میں تصادم ہوتا ہے اور اس تصادم سے صالح یا بہترین synthesis نمودار ہوتا ہے۔ یہ synthesis ایک تیسری چیز اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہیگل کے اس نظریے کا کارل مارکس پر گہرا اثر پڑا، البتہ مارکس نے یہ کیا کہ ہیگل نے جس معرکہ آرائی کو "نظریات" میں دکھایا تھا، مارکس نے اس آویزش کو طبقات میں دکھایا۔ مارکس نے اس تبدیلی کو معنی خیز انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہیگل سر کے بل کھڑا تھا میں نے اسے سیدھا کھڑا کردیا۔ اسی طرح چین میں ماوزے تنگ کے نظریات میں بھی طاقت کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ ماؤ کا یہ قول مشہور زمانہ ہے کہ طاقت بندوق کی نال سے برآمد ہوتی ہے۔ اگرچہ کمیونسٹ انقلابات نے خود کو "نظریاتی" کہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی نظریاتی طاقت ثانوی چیز تھی۔ ان کا اول و آخر طاقت تھی۔ چوں کہ ان کا آغاز طاقت تھی اس لیے ان کا انجام بھی طاقت ہی کے حوالے سے سامنے آیا۔ بیسویں صدی کے وسط تک آتے آتے طاقت کا ایک نیا مظہر "مارشل لا" کی صورت میں سامنے آیا۔ نوآبادیاتی طاقتوں سے

آزادی حاصل کرنے والے تیسری دنیا کے اکثر ملکوں میں فوج سب سے منظم، باخبر، تعلیم یافتہ اور طاقتور ادارہ تھا۔ اس ادارے نے اپنی اس حیثیت کو ملک و قوم کے حق میں استعمال کرنے کے بجائے ان کے خلاف استعمال کیا۔ ایشیا اور افریقہ کے متعدد ممالک میں مارشل لا نمودار ہوئے اور 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کا فلسفہ جگہ جگہ حقیقت بنتا نظر آیا۔

اہم بات یہ ہے کہ مارشل لا نے ہر جگہ معاشرے کی تشکیلِ نو کی۔ پاکستان میں مارشل لا لگانے والے جنرل ایوب اور جنرل پرویز مشرف سیکولر تھے، چنانچہ ان کے دور میں معاشرے میں سیکولرازم کو قوت حاصل ہوئی۔ جنرل ضیاء الحق کا ذہن مذہبی تھا، ان کے دور میں معاشرے میں مذہبی رجحانات کو فروغ حاصل ہوا۔ جمہوریت اگرچہ کمیونزم اور مارشل لا کی ضد ہے، لیکن طاقت کا تصور تینوں نظاموں میں مشترک ہے۔ فرق یہ ہے کہ کمیونزم میں طاقت کا سرچشمہ کمیونسٹ پارٹی، مارشل لا میں طاقت کا سرچشمہ فوج ہوتی ہی، اور جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔ افراد اور معاشروں کو نسلی، قومی، لسانی اور مذہبی تعصبات بھی متاثر اور تبدیل کرتے رہے ہیں۔ یہودیت ایک آسمانی مذہب تھا مگر اس کے ماننے والوں نے اسے ایک نسلی مذہب بنا دیا۔

ہندوازم کے بارے میں بھی غالب گمان یہی ہے کہ وہ بھی کبھی ایک الہامی مذہب رہا ہوگا مگر ہندوازم چار ذاتوں کا مذہب بن گیا۔ ہندوستان کی تاریخ، سماجیات، یہاں تک کہ معاشیات پر

بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ایسے موقع پر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ نیکی کی بنیاد پر ہونے والی تبدیلی، تقوے کے ابلاغ سے ہونے والی قلبِ ماہیت کئی نسلوں تک باقی رہتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نیکی ایسا نعرہ، ایسا نظریہ اور ایسا فلسفہ ہے جو کئی نسلوں کو اپنا اسیر کرسکتا ہے۔ پھر جس کا انحصار ہر صورت میں اللہ پر ہو وہ نہ طاقت پرست ہوسکتا ہے اور نہ طاقت کے ذریعے اپنے نظریے کو پھیلا سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اسلامی معاشرہ اپنی روح میں ایک جہادی اور مزاحمتی معاشرہ ہوتا ہے اور اس کی مزاحمت اپنے نفس سے لے کر بین الاقوامی زندگی تک پھیلی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے علمبردار ایک مضبوط، واضح اور مکمل نظام حیات کے فروغ و استحکام کے لیے ہر دم کوشاں رہتے ہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کے فروغ، اس کی بقا، اس کے استحکام اور اس کے قیام کے لیے سعی و جہد کرے۔ اور ایک متبادل نظام حکومت فراہم کرے جس میں لوگوں کے لیے امن ہو اور ان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ مختلف مذاہب کے لوگ اپنے مذہب پر بہ آسانی عمل پیرا رہ سکیں اور ان کا خاندان تعمیر و ترقی کی منزلیں طے کرسکے۔ یہ ہے وہ تبدیلیِ قیادت کا نعرہ جس کا آغاز عملی ہونا چاہیے نہ کہ زبانی۔ اور اس مقصد کے حصول کی راہ ہمواری ذاتی فکر و عمل کی تبدیلی سے ہونا چاہیے۔ چند افراد نے جب اس تبدیلی قیادت کے عزم کا مظاہرہ کیا اور رفتہ رفتہ اس فکر کو فروغ دیا تو آج دنیا شاہد ہے کہ یہ چند افراد گروہ کثیر میں تبدیل ہوا

چاہتے ہیں۔اس کے باوجود اس گروہ میں مزید افراد درکار ہیں۔یہ فرد آپ بھی ہو سکتے ہیں !آج سعی و جہد کا آغاز میدان عمل میں اتر کر ہوگا یا کم از کم میدان عمل میں موجود صحیح فکر و عمل پر استوار لوگوں کا معاون بن کر۔یہ دونوں ہی صورتیں آپ کو گروہ کثیر سے ملحق کردیں گی۔ان حالات میں جب کہ سعی و جہد کسی کونے میں بیٹھ کر کرنے کی بجائے میدان عمل میں اتر کر یا اس سے منسلک ہو کر کی جائے تو ممکن ہے کہ یہ جدوجہد اللہ کی نظر میں تخلیہ میں ادا کی جانے والی عبادت سے بڑھ کر ہو جائے۔یہ تبدیلی قیادت کس درجہ درکار ہے ؟آیئے اس کی بھی وضاحت کرتے چلیں۔

تبدیلیِ قیادت :

تبدیلیِ قیادت سے ہماری مراد وہ قیادت ہے جو خوف خدا سے سے عاری نہ ہو بلکہ قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل کی جائے جو انسانی قوانین کا پاس و لحاظ رکھنے کے علاوہ اُس ہستی کو بھی مانتے ہوں جو خود انسانوں کا موجد اعلیٰ ہے۔لہٰذا اس مرحلے میں قیادت کی تبدیلی ناگزیر عمل بن جائے گی۔یہ تبدیلی قیادت کی سعی و جہد اس بات کی بھی وضاحت کرے گی کہ ہماری جدوجہد "اپنوں" کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان طاقتوں کے خلاف ہے جو اپنے قومی وذاتی مفادات کی وجہ سے عالمِ انسانیت کو تباہ و برباد کرنے پر آمادہ ہیں نیز اس تباہی و بربادی کو وہ خوبصورت ناموں سے تعبیر کرتے ہوئے روبہ عمل نہ

ہیں۔ دوسری جانب ایک وہ قیادت بھی آج موجود ہے جو ناکارہ، بے مقصد، اور نفس پرست انسانوں کی بھیڑ پر مشتمل ہے۔ یہ نفس پرست قائد اعلیٰ ڈگریاں رکھنے کے باوجود اخلاق و کردار کے میدان میں کورے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کی مثال سمندر پر چھائے اس جھاگ سے ذرہ برابر بھی زائد نہیں جو بلاشبہ پورے سمندر پر چھایا ہوا ہے اس کے باوجود نہ اس کا کوئی وزن ہے نہ حیثیت۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت سسک رہی ہے اور عالم انسانیت کی چیخیں چہار جانب تیز سے تیز تر ہی ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن اندھے گونگے اور بہرے قائد کہ نہ انہیں کچھ نظر آتا ہے اور نہ ہی کچھ سوجھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے، کہ یہ بے کار یا ناکارہ لوگ ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ان کی فکر کی تصحیح نہیں ہو سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیمی سندیں رکھنے والے جب عمل میدان میں آتے ہیں تو وہ دوسروں کے لیے نہیں بلکہ خود کے لیے جینا پسند کرتے ہیں۔ ان کا ہر عمل صرف ان کی ذات تک محدود رہتا ہے، اس کے فائدے اور نقصانات وہ اپنی ذات میں تلاش کرتے ہیں، اور جب کہیں بھی کسی بھی طرح کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، وہ اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے کہ دوسروں کو اس سے کس قدر نقصان پہنچے گا۔ وجہ بس اتنی کہ وہ علم سے تو بہرہ مند ہوئے لیکن وہ علم ہی ناقص تھا کہ جو ان کو صحیح راستہ پر گامزن نہ کر سکا۔ علم تو درحقیقت وہ ہے جو خود شناسی اور خدا شناسی پیدا کرنے والا ہو۔ وہ علم ہی کیا جو نہ خود سے باخبر کرا سکے، نہ خودی سے اور نہ ہی خدا سے، کہ جس نے اس کو پیدا کیا اور زمین کا نظم و نسق اس کے ذمہ کیا۔

ہمیں یہ شعور بھی بیدار کرنا ہے کہ خرابی کی اصل جڑ موجودہ نظام اور اس کی پروردہ مفاد پرست، ملت فروش اور دنیا پرست قیادت ہے کہ جس پر نوٹس نہ لیا گیا تو اصلاح و فلاح کے پہلو مدھم پڑ جائیں گے۔ ان طاقتوں کے خلاف اقدام سے ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ موجودہ فلسفہ زندگی پر تفکر کیا جائے، اس میں اصلاح کے پہلوؤ ں کو ابھارا جائے، اور سب سے بہتر یہ ہوگا کہ اسلامی فلسفہ زندگی کو نافذ العمل بنانے کی سعی و جہد کی جائے۔ آج چہار جانب ظلم و بربیت کا دور دورہ ہے اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہمیں صرف اپنے طرز معاشرت کو بہتر بنانے کی فکر نے، مسائل کو سمجھنے، ان پر غور و فکر کرنے اور ان کے خاتمہ کی سعی و جہد کرنے سے بہت دور کر رکھا ہے۔ اسلام کی رو سے یہ ظلم جو آج ہم خود پر کر رہے ہیں، کٹھہرے سے باہر ہم خود بھی نہیں۔ نبی کریم کا ارشاد ہے برائی کو ہاتھ سے روکا جائے، اس کو زبان سے برا کہا جائے اور اگر اتنی بھی طاقت نہ ہو تو کم از کم دل میں برا سمجھا جائے۔ لیکن ایک لمحہ کے لیے ٹھہریں !اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ! خود سے معلوم کریں کہ کیا کبھی ہم نے اس جانب بھی توجہ کی ہے؟ کہا کہ : "اور اگر خدا لوگوں کو ان کے ظلم کے سبب پکڑنے لگے تو ایک جاندار کو زمین پر نہ چھوڑے لیکن ان کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیئے جاتا ہے۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں نہ آگے بڑھ سکتے ہیں" (النحل:61)

۔فرصت کے لمحات کو گنوانا نادانی کے سوا اور کیا ہو

سکتا ہے؟لازم ہے کہ جو لمحات بھی مہلت کے باقی ہیں ان کا استعمال کرتے ہوئے میدان عمل میں اٹھ کھڑا ہونا چاہیے ۔یہی وقت کی آواز ہے اور یہی ہمارا اولین فرض منصبی بھی۔آج ضرورت ہے کہ ظلم و بربیت سے نجات دلانے والے امن پسند طریقہ اختیار کرتے ہوئے دوسروں کے لیے مشعل راہ بن جائیں۔اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب ہم موجودہ قیادت کو تبدیل کرنے کا عزم مسمم کرلیں!

امت مسلمہ کی شرف و منزلت کی رات

کہا کہ: سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ۔ (بنی اسرائیل :۱) "پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دُور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے، تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے"۔ پھر کہا کہ: وَلَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی۔ عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی۔ عِنۡدَہَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی۔ اِذۡ یَغۡشَی السِّدۡرَۃَ مَا یَغۡشٰی۔ مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَ مَا طَغٰی۔ لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی (النجم: ۱۳-۱۸) "اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرا لمنتہیٰ کے پاس اس کو دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چوندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں"۔ قرآنِ حکیم کی یہ دوآیات اور ان میں واقعہ معراج کا تذکرہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ یہ ایک عظیم واقعہ تھا جو اس نے اپنے نبیؐ پر ظہور فرمایا۔ یہ واقعہ مکمل طور پر احادیث کی کتب میں موجود ہے اور اس کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والے خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق

تھے۔

:پس منظر

یہ وہی واقعہ ہے جو اصطلاحاً ''معراج'' اور ''اسراء'' کے نام سے مشہور ہے۔ اکثر اور معتبر روایات کی رو سے یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیلات بکثرت صحابہ سے مروی ہیں جن کی تعداد ۵۲ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے مفصل ترین روایت حضرت انس بن مالک، حضرت مالک بن صَعصَعہ، حضرت ابو ذر غفاری اور حضرت ابوہریرہ سے مروی ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابو سعید خدری، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت عائشہ اور متعدد دوسرے صحابہ نے بھی اس کے بعض اجزاء بیان کیے ہیں۔ قرآن مجید یہاں صرف مسجد حرام (یعنی بیت اللہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک حضور کے جانے کی تصریح کرتا ہے اور اس سفر کا مقصد یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھانا چاہتا تھا۔ اس سے زیادہ کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی ہے۔ حدیث میں جو تفصیلات آئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رات کے وقت جبریل علیہ السلام آپ کو اُٹھا کر مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک بُراق پر لے گئے۔ وہاں آپ نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا کی۔ پھر وہ آپ کو عالم بالا کی طرف لے چلے اور وہاں مختلف طبقات سماوی میں مختلف جلیل القدر

انبیاء سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ آخر کار آپ انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے اور اس حضوری کے موقع پر دوسری اہم ہدایات کے علاوہ آپ کو پنج وقتہ نماز کی فرضیت کا حکم ہوا۔ اس کے بعد آپ بیت المقدس کی طرف پلٹے اور وہاں سے مسجد حرام واپس تشریف لائے۔اس سلسلے میں بکثرت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو جنت اور دوزخ کا بھی مشاہدہ کرایا گیا۔ نیز معتبر روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ دوسرے روز جب آپ نے اس واقعہ کا لوگوں سے ذکر کیا تو کفار مکہ نے اس کا بہت مذاق اڑایا اور مسلمانوں میں سے بھی بعض کے ایمان متزلزل ہو گئے۔

اس سفر کی کیفیت کیا تھی؟ یہ عالم خواب میں پیش آیا تھا یا بیداری میں ؟ اور آیا حضورؐ بذات خود تشریف لے گئے تھے یا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محض روحانی طور پر ہی آپ کو یہ مشاہدہ کرا دیا گیا؟ ان سوالات کا جواب قرآن مجید کے الفاظ خود دے رہے ہیں۔ سُبحٰنَ الّذِی اَسرٰی سے بیان کی ابتدا کرنا خود بتا رہا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا خارقِ عادت واقعہ تھا جو اللہ تعالٰی کی غیر محدود قدرت سے رونما ہوا۔ ظاہر ہے کہ خواب میں کسی شخص کا اس طرح کی چیزیں دیکھ لینا، یا کشف کے طور پر دیکھنا یہ اہمیت نہیں رکھتا کہ اسے بیان کرنے کے لیے اس تمہید کی ضرورت ہو کہ تمام کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو یہ خواب دکھایا یا کشف میں یہ کچھ دکھایا۔ پھر یہ

الفاظ بھی کہ "ایک رات اپنے بندے کو لے گیا" جسمانی سفر مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ نہ تھا بلکہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرایا۔

:قرآن و حدیث میں واقعہ کی حیثیت

مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو تمام عیبوں سے پاک ہے، جس کی ہر بات سچی ہے اور جس میں کسی بھی طرح کی تحریف ممکن نہیں ۔پھر یہ بھی کہ محمدؐ رسول اللہ اللہ کے بندے اور آخری رسول ہیں۔ وہ انسانوں میں سب سے معتبر شخصیت ہیں ۔لہٰذا قرآن کی ہر بات قابل یقین اور تمام احادیث قابل تقلید ہیں۔اسلام میں تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو شخص کسی رسول پر ایمان نہ لائے گا وہ کافر ہوگا خواہ وہ باقی رسولوں کو مانتا ہو۔ لہٰذا اگر ہم جاننا چاہیں کہ آپؐ میں اور دوسرے پیغمبروں میں کیا فرق ہے تو اس کو ہم تین باتوں کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں: ١)آپؐ ہمیشہ کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے۔٢) دیگر انبیاء کی تعلیمات اپنی خالص صورت میں محفوظ نہیں رہی۔٣) دیگر انبیاء کی تعلیمات مکمل نہیں تھی،احکام و قوانین میں ترمیم و اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن: آپؐ کو ایسی تعلیمات دی گئ جو ہر حیثیت سے مکمل تھی، اس کے بعد تمام انبیاء کی شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ اسی طرح قرآن حکیم کے تعلق سے بھی چند باتوں کا جان لینا ضروری ہے۔١) صحفِ ابراہیمؑ اب

دنیا میں موجود نہیں، رہیں تورات، زبور، انجیل تو وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس موجود ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان سب کتابوں میں لوگوں نے خدا کے کلام کو بدل ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اور دیگر کتابوں میں بہت نمایاں فرق ہو گیا ہے۔ دیگر کتابوں کے اصلی نسخے گم ہو گئے اور ترجمے رہ گئے، قرآن اُنھیں الفاظ میں موجود ہے ایک حرف بلکہ ایک شوشہ میں بھی تغیر نہیں ہوا۔ ۲) قرآن میں خالص کلام الٰہی ہمیں ملتا ہے، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت رسولؐ، سیرت صحابہ اور تاریخ اسلام سب قرآن سے بالکل الگ ہے۔ ۳) قرآن کے متعلق زبردست تاریخی شہادتیں موجود ہیں، آیتوں تک کے متعلق معلوم ہے کہ کون سی آیت کب اور کہاں نازل ہوئی۔ ۴) پچھلی کتابیں جن زبانوں میں نازل ہوئی تھیں وہ ایک مدت سے مردہ ہو چکی ہیں، اب کہیں بھی ان کے بولنے والے باقی نہیں رہے۔ ۵) دنیا کی مختلف قوموں کی کتابوں میں کسی خاص قوم کو مخاطب کیا گیا ہے، یہ کتابیں ایک خاص زمانے کے لیے تھیں، قرآن کے احکامات ہر زمانے میں ہر جگہ کے لیے ہیں۔ ۶) قرآن میں جتنی خوبیاں پچھلی کتابوں میں الگ الگ تھیں وہ سب اس میں جمع کر دی گئی ہیں اور جو خوبیاں پچھلی کتابوں سے چھوٹ گئی تھیں وہ بھی اس کتاب میں آ گئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ قرآن پر ہمارا ایمان اس حیثیت سے ہے کہ یہ خدا کا خالص کلام ہے، سراسر حق ہے، اس کا ہر لفظ محفوظ ہے، اس کی ہر بات سچی ہے، اس کے ہر حکم کی پیروی فرض ہے اور وہ ہر بات رد کر دینے کے قابل ہے جو قرآن کے خلاف ہو۔ لہٰذا قرآن و حدیث میں تذکرہ

معراج ،ثابت کرتا ہے کہ وہ ہمارے عقیدے کا حصہ ہے اور جو شخص بھی اس میں تذبذب کا شکار ہو اس کا ایمان جاتا رہے گا۔

: اللہ کے قادر مطلق ہونے کا یقین

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ انبیاء کرام کے ذریعہ مختلف امتوں کو آزمائے۔پس یہ واقعہ بھی اسی سنت کا ایک حصہ ہے کہ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ امتِ محمدیؐ کو آزمانا چاہتا ہے۔پھر نہ صرف یہ آزمائش ہے بلکہ اللہ کی قدرت،جنت و دوزخ کے وجود، جبریل امین کی حیثیت، نماز کی فرضیت اور ان جیسے دیگر معاملات سے بھی اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ اس کے نبیؐکو واقف کیا جائے۔واقعہ کا پیش آنا اور اس کا نبیؐ کے ذریعہ بیان کیا جانا، ان لوگوں کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا جن کی آنکھیں اور جن کے دل نبیؐ کی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔یہی وہ لوگ تھے اور ہیں جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ: یہ اندھے ہیں گونگے ہیں بہرے ہیں انھیں کچھ نہیں سوجھتا۔یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر ہونے،اس کی قدرت کو بیان کرنے کے لیے بھی کافی ہے،یہی وہ ذاتِ اقدس ہے جو تمام ظاہر و پوشیدہ قوتوں پر حاوی ہے۔اس واقعہ کے ذریعہ نہ صرف نبیؐکو بلکہ انسانوں کو بھی اللہ تعالیٰ وہ علم بہم پہنچانا چاہتا ہے جس کے ذریعہ اللہ کی نعمتیں واضح ہو جائیں اور انسانوں کو اُس خسارے سے بچالیا جائے جس کا مشاہدہ کرایا گیا۔یہ واقعہ آپؐ کی صداقت کی تصدیق کرتا ہے کہ آپ کے

ذریعہ بتائی گئی ہر بات سچی ہے۔لہٰذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے قول و عمل سے اس بات کی شہادت دیں کہ واقعی ہم نبیؐ کی ہر بات کو سچ مانتے ہیں۔یہ شہادت جس قدر پختہ ہوگی اسی قدر حق و باطل کی کشمکش میں نیز زمین پر اللہ کے احکامات نافذ کرنے میں سعی و جہد کرنے والوں کے لیے آسانی ہوگی۔اسی لیے کہا کہ :ہدایت ہے اُن پرہیزگاروں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے اُن کو دیا ہے ،اس میں سے خرچ کرتے ہیں (البقرہ: ۳)۔لازم ہے کہ ایسے افراد اللہ کی قادر مطلق ہستی پر ہر آن بھروسہ کریں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب کہ ایک انسان ان تمام غیب کی باتوں سے واقف ہو جائے جو اُس کو پیش آنے والی ہیں۔

:امت مسلمہ کی شرف و منزلت کی رات

عزت و ذلت ، عروج و زوال اور شرف و منزلت سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے بلندیاں عطا فرماتا ہے، جس کو چاہتا ہے دنیا میں ہی کامیابیاں عطا کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنا پسندیدہ اور محبوب بنا لیتا ہے۔انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو وہ قدر و منزلت حاصل کرے اور چاہے تو ذلیل و رسوا ہو۔ واقعہ معراج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دودھ اور شراب کے برتن میں سے کسی ایک کو لینے کے لیے کہا گیا تھا۔حدیث میں آتا ہے کہ :۔۔۔۔ باہر نکلا تو حضرت جبرئیلؑ دو برتن

لے کر آئے ایک میں شراب تھی اور ایک میں دودھ۔ میں نے دودھ پسند کیا۔۔۔ مسلم: باب ایمان: واقعہ معراج) نوویؒ کہتے ہیں: "اس روایت میں اختصار ہے اور مراد یہ ہے کہ جبریلؑ نے آپ کو اختیار دیا تھا کہ ان دونوں برتنوں میں سے جس کو چاہیں اختیار کریں۔آپ نے دودھ پسند کیا جیسے دوسری رویت ابوہریرہؓ کی صاف موجود ہے کہ آپ کو الہام ہوا کہ دودھ کے اختیار کرنے کا اور فطرت سے مراد اسلام اور استقامت ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم نے اسلام کی علامت کو اور اس پر استقامت کو اختیار کیا اور دودھ اسلام کی علامت اس وجہ سے ہوا کہ وہ پاکیزہ خوشگوار نیک انجام ہے اور شراب تو سب ناپاکیوں کی جڑ ہے اور حال اور مال دونوں میں برائیاں پیدا کرنے والی ہے"۔یہ واقعہ دلالت کرتا ہے کہ انسان کو نیکی و بدی اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔دودھ اور شراب تمثیل ہے پاکی اور ناپاکی، معروف و منکر کی یعنی انسان جس چیز کو اختیار کرے گا وہی چیز اس کے مقدر میں لکھ دی جائے گی اور پھر قدر و منزلت اور ذلت و پستی بھی اسی درجہ اس کو حاصل ہوگی۔

غور فرمائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ رات ہے جس میں پانچ وقت کی نماز فرض کی گئی۔حدیث میں آتا ہے کہ: جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ آدمی اور کفر و شرک کے درمیان فرق نماز کا چھوڑنا ہے (مسلم)۔یعنی انسان مشرک ہو کر رہے، کافر ہو کر رہے یا مومن بن کر یہ اس

بات پر منحصر ہے کہ وہ نماز ترک کرتا ہے یا وقت پر ادا کرتا ہے کیونکہ نماز کو ادا کرنا یا ترک کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ اُس رات نبیؐ کی جلیل القدر انبیاء سے ملاقات کرائی گئی یعنی ایک جانب مسلمان ان انبیاء کی تصدیق کریں گے اور دوسری جانب نبی آخرزماں صلی اللہ علیہ واسلم کے اسوہ کو اختیار کریں گے۔ پھر یہ وہ رات ہے جس میں جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا اور آپ نے سدرۃ المنتہیٰ تک کا سفر طے کیا۔ اسی رات میں پانچ وقت کی نماز فرض کی گئی اور کہا کہ جو شخص نیکی کے کام کی صرف نیت کرے اس کو ایک نیکی ملے گی اور اگر نیت پوری کرے تو دس نیکیاں ملیں گی۔ مزید یہ کہ برائی کے کام کی نیت کرے تو کچھ نہ لکھا جائے گا اور اگر برائی کے کام کو انجام دے لے تو صرف ایک ہی برائی لکھی جائے گی۔ معلوم ہوا کہ اللہ چاہتا ہے کہ بندوں پر عفو و در گزر کیا جائے، ان کے گناہ معاف کردے، ان کے نیک کاموں کی قدر کرے اور ان کو اعلیٰ مقام عطا کردے۔ یہ ہیں وہ شرف و منزلت کے پیمانے جو اُس رات عطا کیے گئے اور یہیں سے امت کے لازوال عروج کی ابتدا ہوئی۔ واقعہ معراج ہمارے عقیدہ میں پختگی پیدا کرتا ہے، اللہ اور نبی کی باتوں پر یقین کامل میں استحکام بخشتا ہے ساتھ ہی ہمارے درجات بلند کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم شرف و منزلت کے حصول کی سعی و جہد کریں یا ذلت و پستی و خواری اپنا مقدر بنائیں۔

لیکن ! واقعہ معراج کو غلط رخ دینا، اس واقعہ سے دیگر پیش نہ آنے والی باتوں کا جوڑ دینا، اس رات میں مخصوص عبادات کرنا اور اس رات ہی کو منزلت کی رات قرار دینا، یہ سب باتیں بدعت میں شمار کی جائیں جانے ولی ہیں گرچہ ہمارے شب و روز کے اعمال میں تبدیلی نہ آئے، ہم ان فرائض کو نہ انجام دیں جو ہر دن پانچ مرتبہ ہم پر با جماعت فرض ہے۔یہ واقعات شہادت کے لیے کافی ہوں گے کہ ہمارے عقائد و نظریات، افکار و خیالات اور قول و عمل میں تضاد موجود ہے۔ایمان کا لازمی تقاضہ ہے کہ جو بات اللہ و رسول کے ذریعہ بتائی جائے اس کو تسلیم کیا جائے ساتھ ہی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال لیا جائے۔

این ڈی اے وینٹیلٹر پر

ایل کے اڈوانی اور بی جے پی کے کئی قدآور رہنماؤں کی شدید مخالفت کے باوجود گجرات کے وزیراعلیٰ نریندر مودی کو بالآخر بی جے پی کی انتخابی کمیٹی کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ جس وقت گوا میں بی جے پی کی کانفرنس میں پارٹی صدر راج ناتھ سنگھ نے مودی کے نام کا اعلان کیا، بی جے پی کے سبھی وزراء اعلیٰ، رہنما اور مندوبین نے کھڑے ہو کر اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور ہال میں کئی منٹ تک تالیاں بجتی رہیں۔ مخالفت کے باوجود نتیجہ نہ نکلا تو سینیئر رہنما لال کرشن اڈوانی نے پارٹی کے تمام عہدوں سے استعفیٰ دے دیا۔ لال کرشن اڈوانی بظاہر گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کی تاج پوشی سے ناراض ہیں۔ وہ نریندر مودی کو انتخابی مہم کی مکمل ذمہ داری دیے جانے کی مخالفت کر رہے تھے اور بتایا جاتا ہے کہ اسی لیے انہوں نے گوا میں پارٹی کی قومی مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت بھی نہیں کی تھی۔ لال کرشن اڈوانی کا فیصلہ بی جے پی کے لیے بری خبر ہے کیونکہ وہ پارٹی کے بانیوں میں سے ایک ہیں اور بی جے پی کو قومی سطح پر اقتدار تک پہنچانے کا سہرا انہی کے سر باندھا جاتا ہے۔ استعفیٰ دیتے ہوئے بی جے پی کے صدر راج ناتھ سنگھ کے نام ایک خط میں اڈوانی نے کہا کہ بی جے پی نے اب جو سمت اختیار کی ہے اس میں وہ

اپنے لیے جگہ تنگ محسوس کر رہے ہیں۔ "میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اب یہ وہ اصولوں والی پارٹی نہیں رہی جو اٹل بہاری واجپئی، شیاما پرساد مکھرجی اور دین دیال اپادھیائے نے قائم کی تھی، کچھ عرصے سے مجھے پارٹی کے کام کاج کے طریقے اور اس کی سمت کو تسلیم کرنے میں دشواری ہو رہی تھی، اب زیادہ تر رہنما صرف اپنے ایجنڈے کے لیے کام کر رہے ہیں"۔ گوا کے اجلاس کے دوران پارٹی کے اندرونی اختلافات کھل کر سامنے آئے تھے اور جسونت سنگھ، یشونت سنہا اور اوما بھارتی جیسے سرکردہ رہنماؤں نے بھی اجلاس میں شرکت نہیں کی تھی۔ لال کرشن اڈوانی خود کو وزیرِاعظم کے عہدے کا دعویدار گردانتے ہیں اور مانا جاتا ہے کہ لوک سبھا میں حزبِ اختلاف کی رہنما سشما سوراج بھی ان کے "خیمے" میں شامل ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ وہی ایل کے اڈوانی ہیں جن کی قیادت میں 1990 میں "رام مندر" کی تحریک چلائی گئی تھی اور 1991 میں "رام مندر" کی تعمیر کے لیے ایل کے اڈوانی کی "رتھ یاترا" ہی نے بی جے پی کو برسرِاقتدار آنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ چھ دسمبر 1992 کو جب بابری مسجد شہید کی گئی اس وقت ایل کے اڈوانی بھی ایودھیا میں موجود تھے۔ لیکن 2009 کے پارلیمانی انتخابات کے بعد آر ایس ایس نے انہیں نوجوان رہنماؤں کے لیے 'سرپرست' کا کردار ادا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ تب سے پارٹی پر ان کی گرفت کمزور پڑی ہے لیکن انہوں نے کبھی واضح الفاظ میں یہ نہیں کہا کہ وہ اب وزیرِاعظم کے عہدے کے امیدوار نہیں ہیں۔

:استعفیٰ اور رد عمل

ایل کے اڈوانی کے استعفیٰ کے بعد رد عمل اور بیانات کا سلسلہ جاری ہے۔کانگریس کے جنرل سکریٹری دگوجے سنگھ نے بی جے پی کے صدر راج ناتھ سنگھ کو گجرات کے وزیر اعلیٰ کے خلاف یہ کہہ کر باخبر کیا کہ نریندر مودی نے اُن ہی ہاتھوں کو کاٹا ہے جنھوں نے انہیں آگے بڑھایا۔دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مودی کانگریس پارٹی کے لیے کبھی بھی خطرہ نہیں رہے ہیں۔اور ان دعووں کو خارج کیا کہ آئندہ لوک سبھا الیکشن میں راہل بنام مودی مقابلہ ہوگا۔دگوجے سنگھ نے کہا" ہم الیکشن اصولوں کی بنیاد پر لڑتے ہیں نہ کہ شخصیات کی بنیاد پر"۔وہیں پارٹی ترجمان شکیل احمد کا کہنا ہے کہ مودی کے اثرات گجرات تک محدود ہیں۔وہ صرف ان ہی لوگوں میں مقبول ہیں جن کو فرقہ وارانہ سیاست اور فرقہ پرست شخصیت پسند ہے۔لیکن اس طرح کی سیاست ہندوستان کے مزاج کے خلاف ہے۔وہیں سابق وزیر اعظم اور جنتادل سیکولر کے صدر ایچ ڈی دیو گوڑا نے سرکردہ لیڈر اڈوانی کو کنارہ لگانے پر مایوسی کا اظہار کیا۔اس کے برخلاف جنتادل یو نے این ڈی اے سے الگ ہونے کا پہلا اشارہ دیتے ہوئے کہا کہ اس این ڈی اے میں رہنا انتہائی مشکل ہے، جو لال کرشن اڈوانی کے بی جے پی کے اعلیٰ عہدوں سے استعفے اور نریندر مودی کو انتخابی مہم کمیٹی کا صدر بنائے جانے کے سبب وینٹی لیٹر سپورٹ پر ہے۔جنتادل یو کے قومی صدر شرد یادو

نے اڈوانی کے استعفے کو ایک سنگین معاملہ بتایا اور کہا کہ اڈوانی کے استعفے سے میں کافی مایوس ہوں کیوں کہ اٹل جی اور اڈوانی جی کی کوششوں سے ہی این ڈی اے بنا تھا۔ وہیں پٹنہ میں وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے کہا کہ اس ڈرامائی پیش رفت کے سبھی پہلوؤں پر تبادلہ خیال کیا جائے گا اور اپنا رخ جلد ہی واضح کریں گے۔ انہوں نے اس خبر کو بھی غلط بتایا کہ مودی کو انتخابی مہم کمیٹی کا صدر بنائے جانے کے فیصلہ سے پہلے بی جے پی صدر راج ناتھ سنگھ نے نتیش کمار سے بات چیت کی تھی۔ کے سی تیاگی نے کہا کہ جب قدآور لیڈر اور بی جے پی اور این ڈی اے کے بانی یہ کہتے ہیں کہ پارٹی کے کئی لیڈر اپنا شخصی ایجنڈا چلا رہے ہیں تو ہمارے لیے یہ انتہائی مشکل کام ہوگا کہ ہم این ڈی اے کے ساتھ رہیں۔ ان تمام منفی بیانات کے باوجود بی جے پی کے حلقہ سے باہر ایک مثبت رد عمل بھی سامنے آیا ہے۔ تمل ناڈو کی وزیر اعلیٰ اور انا ڈی ایم کے کی صدر جیہ للتا نے وزیر اعلیٰ اور بی جے پی کے "پوسٹر بوائے" کی تقرری پر انہیں مبارک باد دی جنہیں 2014 کے عام انتخابات کے لیے پارٹی کی پرچار کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا۔ جیہ للتا نے کہا کہ "مجھے مودی کے لیے بہت خوشی ہے، میں ایک اہل منتظم ہونے کے ناطے ان کی بے حد عزت کرتی ہوں"۔ انہوں نے کہا کہ میری نیک تمنائیں ہمیشہ ہی مودی کے ساتھ ہیں چاہے وہ اپنی پارٹی کے اندر ترقی پائیں یا گجرات میں الیکشن جیتیں۔ جیہ للتا کی ان نیک تمناؤں نے این ڈی اے میں شامل ہونے کا اشارہ بھی دے دیا ہے۔

:اور یہ آخری کوشش ہے

نریندر مودی کو انتخابات میں سب سے آگے رکھنے کے فیصلہ پر جشن منانے والی بی جے پی استعفٰی کی خبر سن کر حیرت زدہ ہے تو وہیں آر ایس ایس کے ترجمان نے اڈوانی کے استعفٰی کو بدقسمتی سے تعبیر کیا ہے۔ بہر حال استعفٰی کے بعد بی جے پی کے تمام بڑے لیڈر انہیں منانے میں لگے ہیں۔ استعفٰی کے فوراً بعد پارٹی صدر راج ناتھ سنگھ نے اڈوانی کا استعفٰی نامنظور کر دیا اور عوام کو یقین دلایا کہ ایل کے اڈوانی کو منا لیا جائے گا۔ درحقیقت ایل کے اڈوانی کا استعفٰی سیاسی بساط پر ان کی جانب سے آخری کوشش ہے اور تجزیہ نگاروں کا ماننا ہے کہ یہ پارٹی پر دباؤ بنانے کے لیے عہدے سے استعفٰی ہے ۔اڈوانی نے آخری داؤ کھیلتے ہوئے پارٹی کے سامنے یہ مطالبہ رکھا ہے کہ وزراتِ عظمیٰ کے لیے کسی کے نام کا اعلان نہیں کیا جائے۔ درحقیقت یہ مطالبہ رکھ کر انہوں نے خود کو وزیر اعظم کے لیے محفوظ کر لیا ہے ۔ وہیں دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ ان کی ٹیم کے لوگوں کو انتخابی مہم کمیٹی میں بھی شامل کیا جائے۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ لال کرشن اڈوانی ایک طویل مدت سے ہندوستان کے وزیر اعظم بننے کے خواہاں رہے ہیں ۔جب اٹل بہاری واجپئی ملک کے وزیر اعظم تھے، تب بھی ان کی یہی خواہش تھی مگر کیونکہ باجپئی کا قد اڈوانی سے زیادہ بڑا سمجھا جاتا تھا، اس لیے ان کی موجودگی میں اڈوانی کے لیے وزیر اعظم بننے کے امکانات نہ

بن سکے۔مگر جب واجپئی سیاسی منظر نامے سے غائب ہو گئے تو ان کے دل میں یہ خواہش ایک بار پھر شدت سے پیدا ہونا شروع ہو گئی۔2004اور2009کے پالیمانی انتخابات میں بھاجپا کی شکست نے اڈوانی کو وہ موقع نہ دیا جس کے وہ ہمیشہ خواہش مند سمجھے جاتے رہے ہیں۔اور یہ بظاہر آخری موقعہ لگتا ہے جس کو اڈوانی کسی صورت ہاتھ سے جانا نہیں دینا چاہتے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے استعفٰی سے این ڈی اے اور بی جے پی میں کھلبلی مچادی ہے۔

یہ وہ حالات ہیں جس کے سبب بظاہر ملک کی سب سے بڑی دیش بھکت سیاسی جماعت اندرونی خلفشار سے دوچار ہے ہے تو وہیں اس واقعہ نے یہ بات بھی پوری طرح واضح کردی ہے کہ یہاں ہر شخص اپنی ذات تک محدود ہے۔اندورنی طور پر ملک بے شمار مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ کہیں ملک کی سلامتی کو اندرونی اور باہری طاقتوں سے خطرہ ہے تو کہیں بے گناہ نوجوانوں کی زندگیوں سے کھلے عام کھلواڑ کی جارہی ہے۔عام شہری غربت و افلاس ، تعلیم و صحت ،بے روزگاری اور بے لگام بڑھتی مہنگائی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں الجھے ہوئے ہیں۔تو کہیں فرقہ پرست طاقتیں ملک کی اقلیتوں کو زبوں حالی سے دوچار کرنے ہیں،جمہوریت کو راست نقصان پہنچارہی ہیں۔اس سب کے باوجود ہمارے سیاستدانوں کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ ان مسائل سے کیسے نبٹا جائے گا۔یہاں ہوڑ ہے تو صرف کرسی کی،یہی وجہ ہے کہ جس نے ملک کی سب سے بڑی اپوزیشن این ڈی اے کو وینٹی لیٹر

! پر لا کھڑا کیا ہے

! مکتی کی آس میں۔۔۔۔

سولہ جون دوہزار تیرہ سے قبل وہ علاقہ جو قدرت کی بہترین خوبصورتیوں کے لیے مشہور تھا اور جہاں قدرت کے بہترین مناظر دیکھ کر لوگ محظوظ ہوتے ، لطف اندوز ہوتے، اپنی تکان دور کرتے اور مالکِ حقیقی کی کبرائی بیان کرتے تو وہیں دوسری جانب انسانوں کی ایک.ڑی تعداد ایسی بھی تھی جو اپنی حاجتیں اور ضرورتوں کے حوالے سے اِن مقامات کا سفر کرتے ، غیر اللہ کی شان میں چلی آرہی رسموں کی پابندی کرتے اور اس کے بعد کی زندگی کے لیے راہ نجات کی جستجو میں سرگرداں رہتے۔درج بالا دونوں طرح کے لوگ اس دن بھی موجود تھے کہ ایک عظیم حادثہ رونما ہوا۔ نتیجتاًاترا کھنڈ کے ہری دوار کے اطراف کا قدرتی حسن و مناظر متاثر ہو گیا۔پہاڑوں کی سنامی میں 38ہزار مربع میل کا علاقہ تباہی سے دوچار ہوااور.ری طرح نیست و نابود ہو گیا۔ریاستی حکومت اور مرکزی حکومت امدادی کاموں اور راحت رسانی میں مصروف ہو گئی ۔دوسری جانب ملک کی سپریم کورٹ نے حکومت کو راحت کاری پر توجہ دلائی اور اس ضمن میں خصوصی رپورٹ طلب کر لی۔محتاط اندازے کے مطابق اس سانحہ میں پانچ ہزار جانیں تلف ہوچکی ہیں اور دیگر اموات کی خبریں مسلسل آرہی ہیں۔ہزاروں افراد موت وحیات کی کشمکش میں آج بھی دوچار ہیں۔معاملہ یہ ہے کہ کیدار ناتھ سے لے کر ہری دوار اور اس سے آگے تک لاشیں ہی لاشیں نظر آ

رہی ہیں۔گنگا جو ایکپوتر پانی سے لبریز نہر سمجھی جاتی ہے آج اس میں تیرتی ہوئی لاشیں نظر آرہی ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ سڑکیں ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں،90دھرم شالائیں، گاؤں اور ہزاروں مکانات سیلاب کی نذر ہو چکے ہیں۔یہ وہ علاقہ ہے جہاں ملک 60 کے اکثریتی طبقہ کی عقیدت و آستھاکے مراکز ہیں۔بدری ناتھ، کیدار ناتھ،گنگوتری اور یمنوتری جیسی تیرتھ گاہیں موجود ہیں۔ہر سال لاکھوں تیرتھ یاتری اپنی نجات کے لیے چاروں دھام کی تیرتھ یاترا پر جاتے ہیں۔اس بار بھی لاکھوں تیرتھ یاتری اس سفر پر تھے کہ آفت ناگہانی کا شکار ہو گئے۔اس آفت اور تباہی نے ملک کے تمام باشندوں کو غم میں مبتلا کر دیا ہے،دنیاکے دیگر مقامات سے بھی ہمدردانِ قوم و ملت نے اپنے افسوس اور غم کے پیغامات ارسال کیے ہیں۔

:واقعہ کے اسباب جو بیان کیے جارہے ہیں

اتراکھنڈ کا یہ علاقہ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔اس پہاڑی علاقہ میں ایک طرف کنسٹرکشن مافیا نے ٹورزم کے نام پر غیر قانونی طریقہ سے بے شمار عمارتیں کھڑی کی ہیں تو وہیں دوسری طرف پہاڑوں کو غیر سائنٹیفک انداز سے بڑی تعداد میں کاٹا گیا،بڑے بڑے دھماکہ کیے گئے جس سے پہاڑ اندرونی طور پر کمزور ہو گئے،نیز وہ ندیاں اور نالے جو پانی کے بہاؤ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والی ہیں ان کی گہرائی متاثر ہوئی اورملبہ بھر گیا،جس کو بعد صاف تک

نہیں کیا گیا۔ان تینوں ہی کاموں کے نتیجہ میں ہونے والی بارش اور بادل کے پھٹنے سے چہار جانب تباہی پھیل گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ماحولیات کو خطرہ میں ڈال کر ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔کہا جا سکتا ہے کہ اترا کھنڈ کا سانحہ بھی قدرتی ماحولیاتی نظام میں دخل اندازی کا ہی نتیجہ ہے۔وہیں دوسری جانب عقیدہ و آستھااور علم نجوم کے ماہر پنڈت جے گووند شاستری کہتے ہیں کہ کیدار ناتھ میں تباہی "گرو"اور "شکر" کی دشمنی کا نتیجہ ہے۔علم نجوم میں "گرو" کو مذہب کا عنصر مانا جاتا ہے وہیں "شکر"اس کا دشمن سیارہ ہے۔یہ آستھا کی بنیاد کو کمزور کرنے کا کام کرتا ہے۔بقول شاستری جی اس سال بارش کا خدا بھی "شکر" ہی ہے،اس لیے شُکر نے پانی کو ہتھیار بنا کر عقیدہ اور آستھا پر چوٹ کی ہے۔ماحولیاتی تبدیلیوں پر تحقیق کرنے والے ایک ادارے پوٹسڈیٹم انسٹیوٹ کے پروفیسر بل ہیر اس بات پر متفق ہیں کہ مغربی ہواؤں اور مون سون کے نظام کا شدید ٹکراؤ ہی طوفانی بارشوں کی وجہ بنا ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ شدید ٹکراؤ سے ہونے والی بارشوں کا تعلق کیا گلوبل وارمنگ یا عالمی سطح پر حدت میں اضافے سے ہے؟پروفیسر بل کہتے ہیں کہ " اس مخصوص واقعے میں ہمیں نہیں معلوم لیکن ہم اپنے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل میں ایسے واقعات زیادہ تواتر کے ساتھ ہو سکتے ہیں اور عالمی حدت کے مقابلے میں یہ زیادہ نقصان دہ ہوں گے اور میرا خیال ہے کہ طبعیات کا یہ بہت جامع تجزیہ ہے"۔ماحولیاتی تبدیلی پر مختلف ممالک کے ماہرین پر مشتمل پینل

کی چوتھی جائزہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "حدت جو کہ بڑھتی ہوئی گرین ہاؤس گیسز کے اخراج سے ہو رہی ہے ایشیا میں مون سون کے موسم میں تبدیلی کا باعث ہو سکتی ہے۔ مون سون میں تبدیلی کا مطلب دورانیہ اور شدت ہے جو گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کی تفصیل پر منحصر ہے"۔گلوبل وارمنگ سے بارشوں کے اوقات میں تبدیلی آئی یا نہیں اس پر تو ابھی بحث و مباحثہ جاری ہے لیکن فضائی آلودگی نے جنوبی ایشیا میں مون سون موسم کو نقصان پہنچایا ہے۔ماحولیات پر اقوام متحدہ کی 2011 میں جاری ہونے والی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ایشیا میں مون سون کے موسم میں تبدیلی لاکھوں افراد کے معاش پر اثرانداز ہوئی ہے۔ مغربی ہواؤں کا سلسلہ جنوبی ایشیا میں کیسے پہنچا اس بارے میں ماہرین ابھی زیادہ نہیں جان پائے ہیں۔پروفیسر بل کہتے ہیں کہ " یہ (موسمی نظام) ابھی بھی علاقے میں موجود ہے جو سائنسی طور پر کافی غیر واضح ہے لیکن خطے میں کہیں سے بھی آنے والی نمی اور مون سون نظام سے ٹکرائے تو غالباً اس سے شدید بارشیں ہوں گی"۔

:حقائق کے برخلاف قرآنی نقطہ نظر

ان تمام حقائق و عقائد کے برخلاف کسی بھی طرح کی آزمائش، مصیبت، پریشانی اور حادثہ کے سلسلے میں اسلام کا نقطہ نظر اس کے برخلاف ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالی فرماتا ہے: "حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، لوگ خود ہی

اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں" (یونس: ۴۴)۔یعنی اللہ نے تو انہیں کان بھی دیے ہیں اور آنکھیں بھی اور دل بھی۔ اس نے اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز ان کو دینے میں بخل نہیں کیا ہے جو حق و باطل کا فرق دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ضروری تھی۔ مگر لوگوں نے خواہشات کی بندگی اور دنیا کے عشق میں مبتلا ہو کر آپ ہی اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہیں، اپنے کان بہرے کر لیے ہیں اور اپنے دلوں کو اتنا مسخ کر لیا ہے کہ ان میں بھلے.برے کی تمیز، صحیح و غلط کے فہم اور ضمیر کی زندگی کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ یہاں دنیا کی حقیقت اور دنیا میں رہتے ہوئے صحیح راستہ کا تعین فرد نے یا اجتماعیت نے اختیار کیا ہے یا نہیں نیز دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کے وسائل کا صحیح استعمال کا بھی بیان ہے، لیکن حقیقت میں اللہ کی وحدانیت کے اقرار کی بات ہے کہ جس کے نتیجہ میں انسان تمام تر غلطیوں سے پاک زندگی گزارتا ہے۔ دنیا میں انسان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں اور انسان پر ان نعمتوں کا حق یہ ہے کہ وہ ان کا صحیح استعمال کرے۔ جس طرح جسم سمیت انسان کا پورا وجود اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اسمیں کسی طرح کا ایسا تصرف جس میں جان کو خطرہ ہو یا کسی عضو کا اتلاف ہو جائز نہیں ہے۔ خواہ یہ تصرف اس کی اپنی ذات سے ہو یا کسی دوسرے کی جانب سے حتی کہ اگر انسان مر جائے تب بھی اس کی لاش کے ساتھ تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح دنیا میں موجود جاندار اور بے جان تمام تر اشیاء کا تصرف اور بے جا استعمال اس کو ہلاکت میں مبتلا کرے گا۔ یہی کچھ معاملہ اترا کھنڈ

کے ان علاقوں میں بھی سامنے آیا ہے جن کا تذکرہ اوپر ہوا ہے۔

: موجودہ حالات میں کرنے کے کام

ملک عزیز ہند میں دو گروہ بہت ابھرے ہوئے موجود ہیں۔ایک مسلمان تو دوسرے غیر مسلم چاہے وہ کسی بھی فکر سے وابستہ ہوں۔واقعہ کے پس منظر میں دونوں ہی گروہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ پریشان حال لوگوں کی خدمت کا کام انجام دیں۔ان کی تکلیفوں اور غموں میں اس طرح شریک ہوں کہ وہ ختم ہو جائیں یا کم از کم ان کو کسی حد تک راحت مل جائے۔یہ صحیح ہے کہ کسی بھی ملک کی حکومت اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات کی پابند عہد ہوتی ہے۔اس لحاظ سے موجودہ حالات میں حکومت اور حکومتی ادارے اپنے کاموں کو مستعدی سے انجام دے رہے ہیں، خصوصاً فوج کے وہ باجرت افراد جو ملک کو کسی بھی خطرے سے نکالنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں، یہ افراد آج قابل قدر نگاہوں سے دیکھے جا رہے ہیں۔قومی بحران سے نمٹنے کے لیے ایک جانب وزیر اعظم نے ایک ہزار کڑور کے پیکیج کا اعلان کیا ہے جس میں تقریباً ڈھیر سو کروڑ کی رقم فوری جاری کر دی گئی ہے تو وہیں دیگر ریاستوں سے بھی امداد کا سلسلہ جاری ہے۔کیونکہ خدمت اور انسانوں کی ضرورتوں میں کام آنا دراصل اللہ سے قربت کی نشانی ہے۔یہی وجہ ہے کہ فلاحی ادارے اور مسلم تنظیمیں بھی بلا لحاظ مذہب و مسلک اپنی خدمات میں سرگرم عمل ہیں۔وجہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات ان کے سامنے

پوری طرح واضح ہیں، جن پر عمل کے نتیجہ میں وہ نہ صرف اجر عظیم کے مستحق ٹھہریں گے بلکہ انسانوں میں بھی اخوت و محبت اور ہمدردی و غم خواری کے جذبات پروان چڑھیں گے۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: قیامت کے روزاللہ کہے گا اے آدم کے بیٹے میں بیمار تھا مگر تونے میری عیادت نہ کی وہ کہے گا اے رب میں کیسے تیری عیادت کرتا تو تو سارے جہان کا مالک ہے ؟ اللہ فرمائے گا تجھ کو علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اور تونے اس کی عیادت نہیں کی۔کیا تجھ کو خبر نہ تھی کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو مجھ کو اس کے پاس پاتا۔اے آدم کے بیٹے میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تونے مجھ کو کھانا نہ کھلایا؟ وہ کہے گا اے رب میں تجھ کو کیونکر کھانا کھلاتا تو تو سارے جہان کا مالک ہے۔خدا فرمائے گا کیا تجھ کو خبر نہ تھی کہ تجھ سے میرے ایک بندے نے کھانا مانگا تھا تونے اُسے نہیں کھلایا یا کیا تجھ کو نہیں معلوم تھا کہ اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ تو مجھ سے پاتا؟ ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا اور تونے نہ پلایا؟ وہ کہے گا اے رب میں تجھ کو کیسے پلاتا تو تو سارے جہان کا مالک ہے ؟ خدا فرمائے گا میرے ایک بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تونے اس کو نہیں پلایا اگر تو اس کو پانی پلادیتا تو اس کا اجر مجھ سے پاتا" (صحیح مسلم)۔حدیث کی روشنی میں خدمت خلق کے کام وہ عبادت کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں جو رب رحیم و کریم کی صفات انسانوں میں پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔دوسری طرف انسانوں کی اخروی نجات

کی سعی و جہد کرنا، یہ بھی وقت کا اہم تقاضہ ہے۔واقعہ یہ ہے کہ یہ افراد جو مسائل سے دوچار ہیں درحقیقت وہ دنیاوی و اخروی نجات ہی کے لیے سرگرداں تھے کہ حادثہ پیش آگیا اور وہ ہلاک ہو گئے یا مسائل سے دوچار ہوئے۔ جن دو گروہ کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے ان میں پہلا گروہ اس بات کا متفکر نہیں کہ وہ انسانوں کی اخروی نجات کی بھی فکر کرے۔ اور نہ یہ اس کا مقصد ہے اور نہ ہی دائرہ کار۔لیکن متذکرہ دوسرے گروہ کے مقصد و نصب العین میں یہ بات شامل ہے کہ وہ نہ صرف دنیاکے مسائل میں لوگوں کے مددگار بنیں بلکہ اخروی نجات کے لیے مزید اپنے قول و عمل سے متفکر نظر آئیں۔اس پس منظر میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ جس مقام پر بھی ہیں اور اسلام کا جتنا علم بھی رکھتے ہیں اس پر پہلے خود عمل پیرا ہوں اور ساتھ ہی لوگوں کو بھی پہنچائیں۔ خصوصاً توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد سے.برادران وطن کو متعارف کرائیں۔اگر ایسا نہیں کیا تو ہر مسلمان کو یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ قیامت میں یہی افراد اِن یہ سوال کر سکتے ہیں کہ حقیقی علم رکھنے کے باوجود تم نے ہماری اخروی نجات کا سامان کیوں بہم نہیں پہنچایا ؟ایک لمحہ آنکھ بند کیجیے، اس منظر کو اپنے سامنے رکھیے،اور جواب جو کچھ بھی بن پڑتا ہے دے ڈالیے ! سوال و جواب کے تناظر میں کیا آپ کا ضمیر مطمئن ہو گیا ہے ؟اگر آپ مطمئن نہیں تو.براہ کرم خدا کی خاطر اپنے ضمیر کی آواز کو دبایئے نہیں بلکہ میدان عمل کے لیے خود کو تیار کر لیجیے ۔ عمل کے نتیجہ میں اللہ نے چاہا تو حالات آپ کے بھی اور دوسروں کے

سازگار ہوں گے، مسائل کم ہوں گے، سکون و اطمینان چہار سو قائم ہوگا اور دنیا و آخرت
کی سرخ روئی انسانوں کے حصے میں آئے گی (انشااللہ)۔

استقبال رمضان

کسی کے آنے کی آمد عام طور پر خوشگوار ہوتی ہے اور اس کے استقبال کی تیاریاں بھی بڑے پیمانہ پر کی جاتی ہیں۔اب یہ الگ بات ہے کہ وہ آنے والا کون ہے اور اس کی تیاریاں کیسے کی جائیں۔فی الوقت ہم رمضان المبارک کی بات کر رہے ہیں اور اس کی آمد نہ صرف ایک مسلمان کے لیے بلکہ امت مسلمہ کے علاوہ دنیا کے ہر فرد کے لیے عالمی پیمانہ پر خیر و برکت والی خبر ہوا کرتی ہے۔ماہ رمضان نزولِ قرآن کا مہینہ ہے، تقویٰ، پرہیزگاری، ہمدردی، غمگساری، محبت و الفت، خیر خواہی، خدمتِ خلق، راہ خدا میں استقامت، جذبہ حمیت اور جذبہ اتحاد،اللہ اور رسول سے بے انتہا لو' لگانے کا مہینہ ہے لہٰذا اُس کے استقبال کے لیے ہمیں اپنے اندر ان صفات کو پیدا کرنے کی تیاری کرنا ہوگی جن صفات کی جانب ماہِ رمضان ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ رمضان المبارک میں :قرآن نازل ہوا، روزے فرض ہوئے، جنگ بدر پیش آئی، شبِ قدر رکھی گئی، فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا، اس کے عشروں کو مخصوص اہمیت دی گئی ، پھر اس ماہ میں زکوۃ،انفاق اور فطرے کا اہتمام کیا گیا نتیجتاً ماہِ رمضان المبارک کی عبادات کے درجات بہت زیادہ بلند کر دیے گئے۔ضروری ہے کہ ہم اِس ماہ کی حیثیت کے شایانِ شان اس کا استقبال کریں۔ قبل اس سے کہ

رمضان کی آمد آمد ہو ہم اپنے ظاہر و باطن کو اس کے لیے یکسو کر لیں۔

:رمضان المبارک کے یہ تین واقعات

رمضان المبارک کے یہ وہ تین واقعات ہیں جنھوں نے دنیا کی صورت یکسر تبدیل کر دی۔ یہ صحیح ہے کہ امت کی کامیابی مختلف ادوار میں پیش آنے والے واقعات کے پس منظر میں بنائے جانے والی حکمت عملی، پالیسی، لائحہ عمل اور تدابیر وضع کرنے کے نتیجہ میں ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ابتدائی تین واقعات وہ مینارہ ٔ نور ہیں جن کی روشنی میں یہ کام اس طرح ہو سکتا ہے کہ امت بحیثیت پوری امتِ مسلمہ اور مسلمان بحیثیت فرد کامیابی سے ہمکنار ہو۔ لہٰذا کامیابی کے حصول کے مراحل میں یہ واقعات ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔ پہلا واقعہ نزولِ قرآن ہے: واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے حیاتِ انسانی کو جلا بخشی اور دنیا کو تاریکی، گمراہی اور شرک کی جڑوں سے نجات دلائی۔ لہٰذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم قرآن کو حتی الامکان سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کو اپنی عملی زندگی کے شب و روز میں پیش آنے والے معاملات میں نافذ کریں۔ اس کے مطابق اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگیوں کو ڈھالیں۔ اس کے پیغام سے پیاسی روحوں کو تازہ دم کریں۔ اس کے قیام کی سعی و جہد کریں اور اس کو وہ اہمیت دیں جو اس کا حق ادا کر دے۔ دوسرا واقعہ جنگ بدر ہے: یہ واقعہ اُس حق و باطل کے فرق کو کھول کر رکھ دینے کا ہے جہاں حق کے علمبردار اس سعی و جہد میں اپنی تمام نعمتوں کو

اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں، جو اس نے عطا کی ہیں۔اللہ نے عقل دی ہے اور یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔جس کے ذریعہ انسان اور حیوان میں فرق نمایاں ہونا چاہیے۔اللہ نے صلاحیتیں دی ہیں جن کے ذریعہ خیر و فلاح کے کام انجام دیے جانے چاہیں۔اللہ نے علم عطا کیا ہے جس کے ذریعہ جہالت، گمراہی اور باطل نظریہ ہائے افکار سے چھٹکارا پایااور دلایا جانا چاہیے۔اللہ نے مال دیا ہے جو خدمتِ خلق اور انفاق فی سبیل اللہ کے کاموں میں استعمال کیا جانا چاہیے۔اللہ نے جان دی ہے جس کے ذریعہ نظامِ باطل کو زیر کیا جا سکتا ہے اور یہ آخری انتہا ہے۔لیکن اس آخری انتہا سے قبل لازم ہے کہ وہ کام انجام دیئے جائیں جن کا آغاز ہر شخص اپنی ذات سے کر سکتا ہے۔لیکن اللہ کی راہ میں جان دینے کا کام اجتماعی ہوگا اور یہ اُسی وقت ہوگا جب اس کا تقاضہ ہو۔فی الوقت اس کی ضرورت ملکِ عزیز میں محسوس نہیں ہوتی۔تیسرا واقعہ فتحِ مبین ہے: یہ واقعہ اس بات کی شہادت پیش کرتا ہے کہ حق کے علمبردار دنیا میں بھی سرخ رو ہوں اور آخرت کی ابدی کامیابی بھی حاصل کریں۔یہ واقعہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ اللہ کا گھر اور وہ مقام جو اللہ کی عبادت کے لیے مختص کر لیا گیا ہو وہ شرک اور بت پرستی سے پاک رہنا چاہیے۔یہ زمین اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص ہے لہٰذا اس میں باطل سے سودے بازی نہیں کی جا سکتی۔یہ زمین وہ ہے جہاں اللہ کے نام لینے والے اللہ کے آگے سر بجود ہوتے ہیں، اس کی بڑائی اور کبریائی بیان کرتے ہیں، اس سے اپنی توقعات وابستہ کرتے ہیں، اپنے

گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں،اور اسلامی فکر میں اجتماعی روح پروان چڑھاتے ہیں۔یہ واقعہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ مسلمان اگر دنیا میں کسی بھی مرحلے میں کامیابی حاصل کریں تو وہ مزید اللہ کی بڑائی بیان کرنے والے بن جائیں، ان کی کبر غرور و تکبر کے محرکات سے اکڑیں نہیں بلکہ مزید وہ اللہ کے آگے جھک جانے والا بن جائیں۔فائدہ یہ ہوگا کہ اُن میں انسانوں سے مزید خیر خواہی کے جذبات ابھریں گے جس کی آج شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔یہ تین واقعات اس جانب بھی متوجہ کرتے ہیں کہ ماہ قرآن کے استقبال ،اس سے استفادہ اور اس کے بعد کے ایام میں ہمیں اپنے ظاہر و باطن میں وہ محرکات پیدا کر لینے چاہیں،جن کے اختیار کے نتیجہ، ہیں،اللہ اور اس کے بندوں کے ہم محبوب بن جائیں۔

:یکسو ہو جایئے

آج اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی بقا و تحفظ کے لیے ان اقدامات کی ضرورت ہے جو دنیا میں رواج پا چکے ہیں تو یہ نہ صرف ہماری کم عقلی ہوگی بلکہ دین کی تعلیمات سے دوری بھی نمایاں کرے گی۔علمی میدان میں ترقی، معاشی میدان میں ترقی، عورتوں کی آزادی اور بالادستی، صنعت و حرفت میں پیش قدمی، سائنس و ٹیکنالوجی میں دریافتیں، چاند اور مریخ پر کمندیں، یہ اور ان جیسے تمام نعروں میں اس وقت تک کوئی دم نہیں ہے جب تک کہ وہ اسلام کے سانچے میں نہ

ڈھلے ہوں۔ ہم دینی مدارس کھولتے ہیں، کلمہ اور نماز کی تبلیغ کرتے ہیں، فسق و فجور کے خلاف وعظ و تلقین کرتے ہیں اور گمراہ فرقوں کے خلاف مورچے لگاتے ہیں۔

حاصل ؟؟۔ حاصل یہ کہ بس جس رفتار سے دین مٹ رہا ہے اور مسلمانوں کی عملی زندگی سے دُور ہوتا جا رہا ہے اس کے مٹنے میں ذرا سستی آ جائے اور زندگی کو سانس لینے کے لیے ذرا کچھ دن اور میسر آ جائیں۔ لیکن یہ امید کبھی نہیں کی جا سکتی کہ اللہ کا دین غالب آ جائے یا اللہ کا کلمہ عوام الناس کے دلوں کی دھڑکن بن جائے۔ پھر یہ خیال کہ موجودہ نظام تو ان ہی بنیادوں پر قائم رہے، مگر اخلاق ، معاشرت، معیشیت، نظم و نسق یا سیاست کی موجودہ خرابیوں میں سے کسی کی اصلاح ہو جائے گی، تو یہ بھی کسی تدبیر سے ممکن نہیں۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نظامِ زندگی کی بنیادی خرابیوں کی آفریدہ اور پروردہ ہیں اور ہر خرابی کو دوسری بہت سی خرابیوں کا سہارا مل رہا ہے۔ ایسے حالات میں جامع فساد کو رفع کرنے کے لیے ایک جامع پروگرام ناگزیر ہے، جو جڑ سے لے کر شاخوں تک پورے توازن کے ساتھ اصلاح کا عمل جاری کرے۔ وہ کامل پروگرام کیا ہے؟ اس سے قبل یہ سوال اہم بن جاتا ہے کہ آپ فی الواقع چاہتے کیا ہیں؟ اس موقع پر ہم یہ بتاتے چلیں کہ اسلام اور جاہلیت کا ملا جلا مرکب، جو اب تک ہمارا نظامِ حیات بنا ہوا ہے، زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ یہ اگر چلتا رہا تو دنیا میں بھی ہماری کامل تباہی کا موجب ہوگا اور آخرت میں بھی!

:داعی حق بن جایئے

انسان جب کسی کا غلام بن جائے تو لازم ہے کہ اس کو غلامی سے نکالا جائے۔ انسان جسمانی اور عقلی بنیادوں پر آزاد پیدا کیا گیا ہے اور ساتھ ہی وہ اللہ کا بندہ بھی ہے۔ لہٰذا اس کے جسم اور اس کی فکر کو ہر سطح پر غلامی سے نجات دلانا اولین فریضہ ہے۔ ڈی کنڈیشنگ جسے عرفِ عام میں تطہیرِ فکر و قلب کہہ سکتے ہیں، یہ عمل انسان کو ہر طرح کی نفسیاتی غلامی کے خاتمے کا عمل ہے۔ لیکن یہ عمل انہی افراد کو نفسیاتی غلامی سے آزاد کر سکتا ہے جن میں یہ خواہش موجود ہو۔ جس شخص میں یہ جذبہ ہی نہ ہو اسے آزاد کروانا بہت مشکل ہے۔ ڈی کنڈیشنگ کا عمل، نفسیاتی آزادی کا عمل یا تطہیرِ فکر و قلب کا عمل ان لوگوں کے لیے آسان ہے جو داعی الالخیر کی ذمہ داری انجام دیتے ہیں۔ اور یہی ا وقت کا تقاضہ بھی ہے کہ ہم داعی حق بن جائیں۔ لیکن داعی حق کے لیے لازم ہے کہ وہ غیر ضروری بحث و مناظرے سے بچے۔ دین کے بہت سے پرجوش داعی خواہش رکھتے ہیں کہ مخاطب چند گھنٹوں میں تبدیل ہو کر ان کا نقطہ نظر قبول کر لے۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ داعی حق کے لیے اخلاصِ نیت پہلی شرط ہے تو وہیں دوسری یہ کہ کارِ دعوت کا مقصد کسی شخص کو گھیر گھار کر اپنے نقطہ نظر پر قائل یا لاجواب کرنا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ داعی کا کام صرف اتنا ہے کہ جس بات کو وہ حق سمجھتا ہے، اسے احسن طریقہ سے اپنے دوسرے بھائی تک پہنچا دے۔ داعی کو کبھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اور

نہ ہی اپنے مخاطب کو راست یا بلاواسطہ ایسی تنقید کا نشانہ بنانا چاہیے جس کے نتیجہ میں ضد پیدا ہونے کا امکان ہو۔ کیونکہ ضد، انانیت اور ہٹ دھرمی، کبھی سیدھے راستے کی راہنمائی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا رمضان المبارک کا استقبال ہمیں اس طرح کرنا چاہیے کہ ہم پر یہ واضح ہو جائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا مقصد کیا تھا۔

پھر جب یہ بات واضح ہو جائے کہ نبی کریم کی آمد کا مقصد کیا تھا تو استقبال کریں رمضان المبارک کا اپنے قول سے، اپنے عمل سے، اسلامی نظریہ حیات کو عام کرکے اور ان طریقوں کو اختیار کرکے جو ہم پر لازم آتے ہیں۔ استقبال کریں رمضان المبارک کا اِس عہد و پیمان کے ساتھ جس کے نتیجہ میں ہماری زندگیاں نہ صرف ہمارے متعلقین کے لیے بلکہ عوام الناس کے لیے بھی سود مند ثابت ہوں اور استقبال کریں رمضان المبارک کا کہ یہ استقبال امت کے عروج کا ذریعہ بن جائے۔ سلمان فارسیؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ شعبان کی آخری تاریخ کو نبی کریم نے خطبہ دیا جس میں فرمایا: "اے لوگو! ایک بڑی عظمت والا، بڑی برکت والا مہینہ قریب آگیا ہے۔ وہ ایسا مہینہ ہے جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ میں روزہ رکھنا فرض قرار دیا ہے اور اس مہینہ کی راتوں میں تراویح پڑھنا نفل قرار دیا ہے (یعنی فرض نہیں ہے بلکہ سنت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے)۔ جو شخص اس مہینہ میں کوئی ایک نیک

کام اپنے دل کی خواہش سے بطور خود کرے گا تو وہ ایسا ہوگا جیسے کہ رمضان کے سوا اور مہینوں میں فرض ادا کیا ہو، اور جو اس مہینہ میں فرض ادا کرے گا تو وہ ایسا ہوگا جیسے رمضان کے علاوہ دوسرے مہینہ میں کسی نے ستّر (70) فرض ادا کیے۔اور یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔اور یہ مہینہ معاشرے کے غریب او حاجتمندوں کے ساتھ مالی ہمدردی کا مہینہ ہے" (بیہقی فی شعبان الایمان)۔پس یہ وہ عبادات ہیں جن کو اختیار کرنا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے۔پھر یہی استقبال ہے اور یہی استفادہ !

امن کا مہینہ رمضان المبارک

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ ابن آدم کا ہر کام، اس کے لیے ہے، مگر روزہ میرے لیے ہے اور میں خود اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ ڈھال ہے اور جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ اس دن فحش بات نہ کرے، شور نہ کرے، اگر کوئی اسے گالی دے یا لڑائی لڑے تو دو مرتبہ کہہ دے کہ میں روزے دار ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، روزے دار کے منہ کی مہک اللہ کے نزدیک مشک کی بو سے زیادہ خوشبو دار ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: جب افطار کرتا ہے تو افطار پر خوش ہوتا ہے اور جب اپنے رب سے ملے گا تو اپنے روزے پر خوش ہوگا" (الفتح الربانی: ترتیب مسند احمد) ۔ حدیث نبویؑ کی روشنی میں رمضان کے مہینہ کی فضیلت، روزہ کی اہمیت اور اس کے فوائد،اللہ سے قربت اور اس کے مخصوص حکم کی بجاآوری کے نتیجہ میں رب العالمین کی تجلی اور اس سے حاصل ہونے والی لا محدود خوشی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مسلمان کے لیے روزہ نہ صرف عبادت ہے بلکہ اس کی فلاح ،ترقی اور ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ روزہ کے دوران اس کی شخصیت خود اس کے لیے اور عالم انسانیت کے لیے امن و امان کا ذریعہ بنتی ہے وہیں اس میں یہ بات بھی پوشیدہ ہے کہ امن و امان کے قیام کے بغیر انسان کا ارتقاء رک جاتا ہے، وہ ترقی نہیں کر پاتا

اور نہ ہی وہ اللہ کا قرب حاصل کر پاتا ہے۔ حدیث میں یہ بات بہت صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ جب تم روزہ کی حالت میں ہو اور کوئی تم سے بد کلامی کے ساتھ پیش آئے یا لڑائی کرے تو اس سے کہہ دیا جائے کہ میں روزہ سے ہوں۔ روزہ سے ہوں یعنی اس حالت میں نہیں ہوں کہ تم سے تمہارے اس غلط رویہ کا غلط انداز سے جائز بدلہ لوں بلکہ بہتر یہ ہے کہ تم روزہ جیسی مخصوص عبادت میں خلل نہ ڈالو۔ میرا تعلق اس وقت راست اللہ سے منسلک ہے اور میں دورانِ عبادت اس تعلق کو منقطع نہیں کرنا چاہتا۔

:روزہ دن بھر کی عبادت

ہم جانتے ہیں کہ جب بندہ نماز میں اللہ کے سامنے ظاہری و باطنی طور پر تعلق استوار کر لیتا ہے تو دورانِ نماز وہ لوگوں سے بات چیت نہیں کرتا،اللہ کی جانب رخ کرنے کے بعد اِدھر اُدھر نہیں دیکھتا،اگر کوئی بدکلامی کرنے یا لڑنے جھگڑنے پر آ جائے تو بحالت نماز اس سے پرہیز کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح روزہ کی حالت میں بھی بندہ عبادت میں ہوتا ہے، اللہ سے اس کا تعلق استوار ہو چکا ہوتا ہے،لہٰذا روزہ کی حالت میں وہ لڑائی جھگڑے،بدکلامی وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے اور اپنی عبادت میں خلل ڈالنے والوں سے نرمی اختیار کرتے ہوئے کہہ دیتا ہے کہ میں روزہ سے ہوں یا میں روزہ دار ہوں ۔سلامتی ہو تم پر اور اللہ تعالی تم کو ہدایت عطا فرمائے ۔اگر ایک مرتبہ ایسا کرنے پر وہ اپنے رویہ سے

گریز نہیں کرتا تو اس کو دوبارہ متوجہ کیا جاتا ہے۔اسی طرح روزے کے ڈھال ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ روزہ نفسانی شہوت سے بچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ روزہ کا مقصد صرف کھانا پینا ترک کر دینا نہیں، بلکہ دوسرے گناہوں اور اخلاقی خرابیوں سے بھی گریز کرنا ہے۔ حدیث میں روزے کے ڈھال ہونے کا بیان ہے اور کہا گیا کہ جب تم روزے سے ہو تو فحش بات نہ کرو اور شور و شغب نہ کرو۔ پھر جب تم کو پرہیز کرنے کی عادت ہو جائے گی تو یہی تمہاری ڈھال ہوگی جو تمہاری حفاظت کرے گی ہر اس برائی سے جس سے اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) منع کرتا ہے۔

:رمضان کے عشروں کی حقیقت

رمضان کے مہینہ کو اللہ رب العزت نے تین عشروں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ہر عشرہ دس دن) کی خاص فضیلت ہے۔پہلا عشرہ رحمت کا ہے، دوسرا مغفرت کا اور تیسرا) عذاب جہنم سے نجات کا ہے۔ پہلے عشرہ کی ابتدا ہی سے اللہ رب العالمین کی بے انتہا رحمتوں کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا ظاہری مشاہدہ اس طرح ہوتا ہے کہ امت مسلمہ سے تعلق رکھنے والا ہر عام و خاص بندہ اللہ کی عبادت میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے۔اس کو اس مشینی دور میں جہاں ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے اور انسان ماڈی ترقی کے لیے جنونی حد تک سرگرم عمل ہے، اللہ تعالیٰ اس کو توفیق بخشتا ہے کہ وہ اس بھنور سے نکل کر نیکی کے موسم بہار میں عبادت کی

جانب راغب ہو، نیکی کے کام انجام دے، روزے داروں کا روزہ کھلوائے، برائیوں اور معصیت کے کاموں سے پرہیز کرے، غریبوں، مسکینوں، حاجتمندوں کی مدد کرے، بے انتہا فیاضی کا مظاہرہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں سمیٹتا چلا جائے۔اس طرح جب وہ ان کاموں میں مصروف ہو جائے گا اور اللہ کی عبادت کو شعوری طور پر انجام دینے والا بن جائے گا تو نہ صرف رحمت بلکہ اس کی مغفرت بھی کی جائے گی۔صراط مستقیم پر خود چلنے اور معاشرہ میں لوگوں کو تعاون کرنے کے نتیجہ میں جو معاشرہ وجود پذیر ہوتا ہے اس کا لازمی تقاضہ ہے کہ ایسے افراد کو جہنم سے بچا لیا جائے۔مزید اس آخری عشرہ میں شب قدر کی تلاش، اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی، آئندہ اپنی زندگی کو اللہ کے بتائے طریقہ پر استوار کرنے کا عہد، قرآنِ حکیم کا مطالعہ، یہ سب مل کر اس کے لیے نجات کا سامان بہم پہنچانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔اس طرح اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے مہینہ کے اختتام پر اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

تقویٰ کیا ہے؟

زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے، دونوں طرف افراط و تفریط، خواہشات اور میلاناتِ نفس، وساوس اور ترغیبات، گمراہیوں اور نافرمانیوں کی خار دار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔اس راستے پر کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے چلنا اور اطاعتِ حق کی راہ سے ہٹ کر بد اندیشی و بد کرداری کی جھاڑیوں

میں نہ الجھنا، یہی تقویٰ ہے۔اور یہی وہ عظیم مقصد ہے جس کے حصول کے لیے اور اس پر آئندہ کار بند رہنے کی تیاری کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کیے ہیں۔ یہ وہ مقوی دوا ہے جس کے اندر خداترسی و راست روی کی قوت بخشنے کی خاصیت ہے۔ مگر فی الواقع اس سے یہ قوت حاصل کرنا انسان کی اپنی استعداد پر موقوف ہے۔ اگر آدمی روزے کے مقصد کو سمجھے اور جو قوت روزہ دیتا ہے اس کو لینے کے لیے تیار ہو اور روزے کی مدد سے اپنے اندر خوف خدا اور اطاعتِ امر کی صفت کو نشو و نما دینے کی کوشش کرے تو یہ چیز اس میں اتنا تقویٰ پیدا کر سکتی ہے کہ صرف رمضان ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی سال کے باقی گیارہ مہینوں میں وہ زندگی کی سیدھی شاہراہ پر دونوں طرف کی خار دار جھاڑیوں سے اپنے دامن کو بچائے ہوئے چل سکے۔ اس صورت میں اس کے لیے روزے کے نتائج (ثواب) اور منافع (اجر) کی کوئی حد نہیں۔ لیکن اگر وہ اصل مقصد سے غافل ہو کر محض بھوک پیاس ہی کو روزہ سمجھے اور تقویٰ کی صفت حاصل کرنے کی سعی و جہد نہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے نامۂ اعمال میں بھوک پیاس اور رات جگے کے سوا اور کچھ نہیں پا سکتا۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی کا ہر عمل خدا کے ہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے، ایک نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک پھلتی پھولتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ مستثنیٰ ہے، وہ میری مرضی پر موقوف ہے، جتنا چاہوں اس کا بدلہ دوں" (متفق علیہ)۔یعنی بحالت روزہ جس شعور اور مشقت سے وہ نبرد آزما ہو گا اسی قدر اس کا اجر اس کو حاصل ہو

گا۔

:عبادات کی حکمت

اسلام میں جو اعمال اور عبادات فرض یا واجب کیے گئے ہیں ان میں بے انتہا حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ دراصل اللہ تعالٰی نے اپنے بندوں پر مخصوص توجہ فرماتے ہوئے اُن کے لیے وہی اصول و ضوابط مقرر فرمائے ہیں جو بندے کی دنیاوی اور اخروی کامیابی و سعادت کا ذریعہ بنے۔ اللہ تعالٰی کے دربار میں مقبول عبادت کا سب سے اہم اور بنیادی قاعدہ خلوصِ نیت ہے۔ اگر عبادت کا بنیادی محرک رضائے الٰہی نہ ہو تو اس عبادت کی نہ کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی کوئی ثواب ۔ اللہ کے رسولؐ فرماتے ہیں "کتنے ہی روزہ دار ہیں جنھیں ان کے روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ نہیں ملتا"۔ دوسری اہم بات یہ کہ اسلام عبادت گزاروں کو نا قابل برداشت مشقت میں نہیں ڈالتا بلکہ عبادت میں آسان شرائط کے ساتھ رخصت بھی فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی بیمار ہے تو مخصوص دنوں میں روزہ سے رخصت کی آزادی ہے کہ جب اللہ تعالٰی اس کو صحت مند کردے تو اس کی تلافی کرے۔ اگر تندرستی کی امید نہیں ہے تو فدیہ ادا کرے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ بلا عذر عبادات سے محرومی دراصل انسان کی ابدی محرومی کا سبب بنتی ہے اور یہی محرومی انسان کو دنیا و آخرت کے خساروں سے بھی دوچار کرے گی ۔ آخری بات یہ کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اُن تمام

عبادات کے گہرے اثرات مرتب ہونے چاہیں جو وہ شب و روز انجام دیتا ہے۔ یہ فرائض محض عبادت برائے عبادت نہیں، بلکہ اُخروی فلاح کے ساتھ ساتھ دنیاوی کامیابی و کامرانی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اسلام نے کوئی ایسا عمل فرض نہیں کیا جس کے نتائج انسان کی عملی زندگی میں ظاہر نہ ہوں۔ شریعت نے اگر کسی چیز کا حکم دیا ہے تو وہ سراسر خیر ہی ہے اور بندوں سے اس کا راست تعلق ہے اور اگر کسی عمل سے منع کیا ہے تو صرف اس لیے کہ وہ انسان اور انسانی معاشرہ کے لیے ضرر رساں ہے۔ ارشاد ربانی ہے: "(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور بندشیں کھولتا ہے، جن میں جکڑے ہوئے تھے" (اعراف:۷:۱۵۷)۔

رمضان کا پیغام:

معلوم ہوا کہ یہ مہینہ ہدایت حاصل کرنے اور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہونے کا ہے۔اس ماہ مبارک میں معاشرہ میں ایک ایسی فضاء قائم ہو جاتی ہے جس میں ہر طرف بندے سکون و عافیت اور محبت و ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔لڑائی جھگڑے اور بد کلامی سے گریز کرتے ہیں،آپس میں ملتے جلتے اور روزہ داروں کے

افطار کا اہتمام کرتے ہیں۔قرآنِ حکیم کی نہ صرف تلاوت کرتے ہیں بلکہ اس کا شعوری طور پر مطالع بھی کرتے ہیں ۔قرآنی احکامات کو اپنی زندگی میں رائج کرتے ہوئے تقویٰ کی اعلی صفت سے ہمکنار ہونے کی سعی و جہد کرتے ہیں۔ نتیجتاً ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو اسلامی معاشرہ کا عکاس ہے۔یہ مہینہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ.برادرانِ وطن کے لیے بھی یہ پیغام رکھتا ہے کہ دراصل اسلام ہی امن واماں کے قیام کا ذریعہ بن سکتا ہے۔اس امن واماں کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے لازم ہے کہ پہلے مسلمان اور بعد میں دیگر اقوام اسلامی نظام کے قیام میں سعی و جہد اور تعاون پیش کریں۔اس امید کہ ساتھ کہ یہ امن واماں جو رمضان المبارک میں قائم ہے وہ آئندہ گیارہ مہینہ بھی .برقرار رہ سکتا ہے گرچہ اُن سازشوں کو منظر عام پر لانے خود مشکوک نہ ٹھہریں جن پر ریاستی سطح پر امن واماں.برقرار رکھنے کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

رمضان، قرآن اور ہمارا طرز عمل

انسان کی یہ فطری خواہش ہے کہ وہ فی الوقت جس مقام پر ہے اُس سے کہیں اوپر اٹھ جائے یعنی وہ ترقی، کامیابی، نصرت اور فلاح کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ جائے جہاں پہنچ کر لوگ اس کی عزت و تکریم کریں اور ذلت و رسوائی سے وہ کوسوں دور ہو۔ لیکن یہ سب کیسے حاصل ہوگا؟ اس کا کوئی واضح، مدلل اور ٹھیک جواب وہ نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترقی و کامیابی اور عزت و تکریم کے لیے مختلف طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کبھی وہ رائج الوقت طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے ان لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی سعی و جہد کرتا ہے جو اس کی نظر میں "کامیاب " کہلاتے ہیں تو کبھی ان طریقوں کو استعمال کرتا ہے جو عرف عام میں "کامیابی " کی منزل تک لے جانے میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں "کامیاب" وہ شخص ٹھہرتا ہے جو معاشی طور پر نہ صرف مستحکم ہو بلکہ ذاتی مفاد کی خاطر دوسروں کا استحصال بھی بہ خوبی کرنا جانتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کامیابی کی دوڑ میں آج اخلاقی حدود کی کوئی حیثیت نہیں اور زندگی کا ہر شعبہ اخلاقی حدود سے آزاد ہے۔ "سمجھدار اور کامیاب" لوگوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ اخلاقی حدود کی پابندی ناکامی کا سبب بنتی ہے لہٰذا سیاست و معیشت میں خصوصاً اور خاندانی نظام میں عموماً ان حدود و قیود سے پاک رہنا چاہیے۔ تب ہی ممکن ہے

کہ انسان خوشیاں سمیٹ سکے اور زندگی جو "ایک بار" ملی ہے اس سے بھرپور لطف اندوز ہوا جاسکے۔اور یہ جو چہار طرفہ مسائل ہیں مثلاً" دہشت گردی"، بد امنی،مذہبی جنون،فرقہ واریت،روایت پسندی،دقیانوسیت اور پھر یہ مسائل بھی جن میں بے سکونی،ڈیپریشن، نفسیاتی بیماریاں اپنے عروج پر پہنچ چکی ہیں یہ سب اُن ہی بیماریوں کا منبع ہے جن کو اخلاقی حدود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لہٰذا اُن لوگوں کی جڑہی کاٹ دی جائے جو اس طرح کی باتیں، وعظ و نصیحت اور متبادل پیش کرتے ہیں۔معاملہ یہ ہے کہ آج دنیا مٹھی میں بند" ہونے کی مانند ہے۔فکر و عمل کوئی بھی ہو پلک جھپکتے رد عمل سامنے" آجاتا ہے۔لہٰذا ! " سمجھدار "لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ خواہشات کے حصول کے لیے ان طریقوں کو اختیار کریں جن کے اختیار سے اُن پر آنچ نہ آئے۔ساتھ ہی دوسروں کو بھی "ذاتی خواہشات کے حصول"پر متحد کرنا آسان اور ممکن ہو۔معلوم ہوا کہ بہت ہی واضح طور پر آج دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ایک زندگی کے تمام شعبہ حیات میں اخلاقی حدود و قیود کی پابندی کرنے والے افراد و اقوام پر تو دوسرے وہ جو اخلاقی حدود و قیود کو ریاست اور فرد کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

:وہ دور بھی ایسا ہی تھا

جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور آپؐ نے اسلام کی دعوت پیش کی اس وقت بھی کچھ ایسے ہیحالات تھے۔زنا اور بدکاری کو نکاح کا

درجہ دیا جاتا اور معاشرہ اس طرح کے نکاح کو تسلیم بھی کرتا، بچیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا اور اس میں اپنی بڑائی اور خوبی سمجھی جاتی، قبائلی عصبیت اپنے عروج پر تھی اور ایک نہ ختم ہونے والا لڑائیوں کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا، شراب نوشی عام بات تھی جس کے نتیجہ میں بدکاریاں مزید فروغ پاتیں، انسانوں کے انسان ہی غلام تھے، رعایا درحقیقت ایک کھیتی تھی جو حکومت کے لیے محاصل اور آمدنی فراہم کرتی اور حکومتیں اسے لذتوں، شہوتوں، عیش رانی اور ظلم و جور کے لیے استعمال کرتیں، شرک اور بت پرستی اپنے عروج پر تھی، نذرانے اور قربانیاں پیش کی جاتیں اور حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے ان سے فریاد اور التجائیں کی جاتیں، سودی لین دین اور معاشی استحصال کا بازار گرم تھا، فال گیری، کاہنوں، نجومیوں کی خبروں پر ایمان اور بد شگونی کا رواج عام تھا، عقیدہ اور فکر کی گمراہیاں اس قدر عام تھیں کہ تصورِ آخرت ایک مذاق بن چکا تھا۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار گمراہیاں، ظلالتیں، بدکاریاں اور زیادتیاں تھیں جس کے نتیجہ میں وہ معاشرتی اور تمدنی سطح پر اخلاقی حدود و قیود سے یکسر عاری تھے۔ ساتھ ہی یہودی مذہب محض ریاکاری اور تحکم بن گیا تھا، یہودی پیشوا اللہ کی بجائے خود رب بن بیٹھے تھے۔ عیسائیت ایک نا قابل فہم بت پرستی بن گئی تھی، اس نے اللہ اور انسان کو عجیب و غریب طرح سے خلط ملط کر دیا تھا۔ باقی ادیان کا حال بھی مشرکین جیسا ہی تھا کیونکہ ان کے دل یکساں تھے، عقائد ایک سے تھے اور رسم و رواج میں ہم آہنگی تھی۔ ان ہی حالات میں نزول

!قرآن کا واقعۂ عظیم رونما ہوا، یہ وہ واقعہ تھا جس نے دنیا کی کایا پلٹ دی

: تبدیلیٔ عظیم کا لازمی تقاضہ ہے کہ

قرآن وہ فرقانِ عظیم ہے جس نے انسان پر دنیا اور آخرت کی حقیقتوں کو بہت ہی واضح انداز میں کھول کر رکھ دیا، جم غفیر جن تاریکیوں میں مبتلا تھی اس کے سامنے وہ روشنی منور کی جس کے ذریعہ صراط مستقیم عیاں ہو گئی۔کامیابی اور ناکامی کی راہیں متعین کیں اور ذلت ورسوائی سے نکال کر عزت وشرف کا مقام بخشا۔اس عظیم تبدیلی کا لازمی تقاضہ تھا کہ انسانوں کے گروہوں پر قرآن کے کچھ حقوق لازم کر دیے جائیں۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار خطبے میں) ارشاد فرمایا: " یہ کتاب الٰہی (تمہارے ہاتھوں میں) اللہ تعالی) کی رسی ہے، جس نے اسکی اتباع کی وہ راہ ہدایت پر گامزن رہا اور جس نے اسے چھوڑ دیا اس نے راہ ضلالت اختیار کی" (صحیح مسلم)۔معلوم ہوا قرآن حکیم اللہ تعالٰی کا وہ حقیقی کلام ہے جو اس کے بندوں کی طرف نازل کیا گیا ہے،اب جو شخص اور قوم اس کو مضبوطی سے تھامے گی وہ کامیاب ٹھہرے گی اور جو اس کو پس پشت ڈالے گا وہ ہلاک ہو جانے والا ہے۔اسی بات کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ کے رسولؐ نے حج الوداع کے موقعہ پر ایک عظیم مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑ رہا اللہ (i ، ہوں کہ اگر اسے مضبوطی سے تھامے رہے تو کبھی بھی گمراہ نہیں ہوگے

اس کے نبیؐ کی سنت"۔ یہ کتابِ عظیم یقیناً ہماری ہدایت کی ضامن ہے (ii کی کتاب اور لیکن ساتھ ہی شرط یہ ہے کہ اس کے حقوق و آداب کو ملحوظ رکھا جائے۔ قرآن کے پانچ اہم حقوق ہیں، جن کا جاننا اور ان پر عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

پہلا حق اس پر ایمان لانا ہے: ہر شخص پر واجب ہے کہ اس کتاب کے کلام الٰہی ہونے اور رہتی دنیا تک تمام لوگوں کیلئے کتاب ہدایت ہونے پر ایمان لائے۔ کہا کہ : " اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔" (سورۃ النساء : ۱۳۶)۔ ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، جو لوگ اس کو حق کو نہیں مانتے ان سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے اُسے سچے دل سے مانے۔ پوری سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ مانے۔ اپنی فکر کو، اپنے مذاق کو، اپنی پسند کو، اپنے رویّے اور چلن کو، اپنی دوستی اور دشمنی کو، اپنی سعی و جہد کے مصرف کو بالکل اس عقیدے کے مطابق بنالے جس پر وہ ایمان لایا ہے۔ آیت میں خطاب ان تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنی کے

لحاظ سے ”ماننے والوں“ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ دوسرے معنی کے لحاظ سے وہ سچے مومن بن جائیں۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی ایمان کی متقاضی ہے کہ یہ کتاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئیس سالہ نبوی زندگی پر محیط ہے، یہ کتاب آج بھی بغیر کسی کمی اور زیادتی کے اسی حالت میں ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے جس طرح یہ پہلی دفع نازل ہوئی تھی۔ اس میں مذکور ہر چیز کی تصدیق کی جائے، ہر حکم اور ہر نہی کو حق اور عدل وانصاف پر مبنی برحق مانا جائے نیز اس میں جو چیز حلال ہے اسے حلال اور جو چیز حرام ہے اسے حرام سمجھا جائے، نیز اس کتاب کو قیامت تک کیلئے کتاب ہدایت سمجھا جائے۔ یہ کتاب آخری رسول محمدؐ پر نازل ہونے والی آخری کتاب اللہ ہے لہذا اب اسے کسی نبی کی تعلیم منسوخ نہیں کر سکتی۔

دوسرا حق اس کی تلاوت ہے: ایمان کا لازمی تقاضہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھا جائے۔ کس طرح پڑھا جائے؟ کہا کہ: "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اس پر سچّے دل سے ایمان لاتے ہیں۔ اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویّہ اختیار کریں، وہی اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں" (سورۃ البقرۃ: ۱۲۱)۔ مزید کہا کہ: " اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھہر ٹھہر کر اسے لوگوں کو سناو" (بنی اسرائیل: ۱۰۲)۔ اسی طرح ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا: "اور قرآن کو خوب ٹھہر

ٹھہر کر پڑھو" (المزمل: ۴)۔ یعنی تیز تیز رواں دواں نہ پڑھو، بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زیادہ سے ادا کرو اور ایک ایک آیت پر ٹھہرو، تاکہ ذہن پوری طرح کلام الٰہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات و صفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت و ہیبت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کی رحمت کا بیان ہے تو دل جذباتِ تشکر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں اس کے غضب اور اس کے عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ کہیں کسی چیز کا حکم ہے یا کسی چیز سے منع کیا گیا ہے تو سمجھا جائے کہ کس چیز کا حکم دیا گیا ہے اور کس چیز سے منع کیا گیا ہے۔ غرض یہ قرات محض قرآن کے الفاظ کو زبان سے ادا کر دینے کے لیے نہیں بلکہ غور و فکر اور تدبر کے ساتھ ہونی چاہیے۔تب ہی ممکن ہے کہ قرآن سمجھ کر پڑھنے سے فرد میں یکسر تبدیلی واقع ہو جائے۔

تیسرا حق اس پر عمل ہے: کتاب اللہ پر ہم ایمان لے آئے، اس کا مطالعہ بھی کیا، اب لازم آتا ہے کہ اس پر عمل بھی کیا جائے۔ کیونکہ ایمان اور علم کے باوجود اگر عمل نہ ہو تو حامل قرآن کی مثال بھی ان ہی لوگوں جیسی ہوگی جن کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہا کہ: "جن لوگوں کو توراۃ کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔" (الجمعۃ: ۵)۔اس آیت کے عام معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں پر توراۃ کے علم و عمل، اور اس کے مطابق دنیا کی ہدایت کا بار رکھا گیا تھا، مگر نہ

انہوں نے اپنی اس ذمہ داری کو سمجھا اور نہ ہی اس کا حق ادا کیا۔ مثال میں گدھے کا تذکرہ کیا، یعنی جس طرح گدھے پر کتابیں لدی ہوں اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اسی طرح یہ توراۃ کو اپنے اوپر لادے ہوئے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ کتاب کس لیے آئی ہے اور ان سے کیا چاہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج حامل قرآن بھی اس سے کچھ مختلف نظر نہیں آتے۔ قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اس کے باوجود ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبہ حیات میں اسلامی زندگی کا رنگ نہیں جھلکتا۔ یہ پہلو قابل توجہ ہے، خاص کر اِس موقع پر جبکہ رمضان المبارک میں قرآن سننے اور پڑھنے کا بڑے پیانہ پر عمل جاری ہے۔

چوتھا حق اس پر تدبر و تفکر ہے: قرآن کہتا ہے: "اِن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نورِ بصارت سلب کرلیا اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔ یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے، یہ بجلی کے کڑاکے سن کے اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں اور اللہ ان منکرین حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ گویا

عنقریب بجلی اِن کی بصارت اچک لے جائے گی۔جب ذرا کچھ روشنی انہیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دور چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں" (البقرہ:۱۷-۲۰)۔اور کہا کہ:" یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں" (سورۃ ص:۲۹)۔مزید فرمایا:"کیا اِن لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا، یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟" (محمد:۲۴) ۔سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ اور اس طرح کی مثالیں کیوں دی گئیں ہیں؟ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم قرآن کی ہر ہر آیت پر رک رک کرتدبر و تفکر کریں، اپنا اور حالات کا جائزہ لیں اور فکر و عمل کی راہ کو صحیح خطوط پر متعین کر لیں۔

پانچواں حق اس کی تعلیم و تبلیغ ہے:ان تمام باتوں کے بعد قرآن کا اگلا حق یہ ہے کہ اس کے پیغام کو عام کیا جائے۔اللہ کے رسولؐ فرماتے ہیں:" تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے" (صحیح بخاری)۔اور اللہ تعالیٰ متنبہ کرتا ہے کہ:" ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب تم پر نازل ہوں تو کفار تمہیں ان سے باز رکھیں۔اپنے ربّ کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو اور اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔فرماں روائی

اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو" (القصص:۸۷-۸۸)۔ یہ وہ باتیں جو کافی ہیں ان لوگوں کے لیے جو رمضان المبارک میں قرآن کے حقوق ادا کرنے کا عہد مصمم کیا چاہتے ہیں۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے دنیا و آخرت کی کامیابی لکھ دی گئی ہے!

زکوۃ: دین کا اہم ستون

"اے ایمان والو! اللہ کا ٹھیک ٹھیک تقویٰ اختیار کرو اور دنیا سے نہ رخصت ہو مگر اس حال میں کہ تم "مسلم" ہو اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ۔۔۔۔۔۔۔اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلاف میں مبتلا ہو گئے" (آل عمران: ۱۰۵-۱۰۲)۔یہ آیتیں مدینہ کی زندگی یعنی ۳ھ میں نازل ہوئی تھیں۔یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کی تاسیس و تعمیر ابتدائی مرحلوں سے گزر رہی تھی۔عین اس زمانہ میں یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامت دیں اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں۔یہاں دو باتیں بہت واضح انداز میں بیان کردی گئیں ہیں۔۱) تقویٰ کا التزام اور ۲) مضبوط و منظم اجتماعیت۔اقامت دین کے معنی ہیں کہ اللہ کے دین کو قائم کر دیا جائے۔سب سے پہلے فرد اپنی ذاتی زندگی کے شب و روز کے اعمال میں اس کا اہتمام کرے اور اسی کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں اس کے قیام کی سعی و جہد کی جائے۔اس کے لیے لازم ہوگا کہ اللہ کا "تقویٰ" اختیار کیا جائے اور اپنی آخری سانس تک ہر آن اور ہر لحہ ایک "مسلم" بن کر زندگی گزاری جائے۔تقویٰ کا پورا عملی مفہوم جو قرآن کی زبان میں بیان ہوا ہے اس سے شمہ برابر بھی کم

نہیں کہ اللہ کے تمام احکام کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے۔اس کے کسی امر کو چھوڑنے سے بھی ڈرا جائے اور اس کے کسی نہی کے کر گزرنے سے بھی خوف کھایا جائے۔ اسی طرح مسلم کے معنی بھی قرآنی بیانات کی روشنی میں سچے فرماں بردار اور مخلص اطاعت شعار کے ہیں یعنی مسلم وہ شخص ہے جس نے احکام خداوندی کے سامنے اپنی گردن رضاکارانہ جھکا دی ہو۔اسلام جن عبادات کی طرف بندہ مومن کو راغب کرتا ہے اس کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والا مسلم بندہ بن جائے۔

: زکوۃ کی اہمیت

لغوی اعتبار سے زکوۃ کے معنی بڑھوتری اور اضافے کے اور دوسرے معنی پاک و صاف ہونے کے ہیں۔شرعی اصطلاح کے مطابق زکوۃ میں دونوں ہی مفہوم پائے جاتے ہیں۔زکوۃ کی ادائیگی سے بقیہ مال پاک صاف ہو جاتا ہے اور عدم ادائیگی سے اس میں غرباء و مساکین کا حق شامل رہتا ہے جس سے بقیہ مال ناپاک ہو جاتا ہے۔قرآن مجید میں عموماً جہاں بھی نماز کا ذکر یعنی اقامت صلوٰۃ کا حکم آیا ہے، زکوۃ کی ادائیگی کا حکم بھی ساتھ ساتھ ہے۔ دو درجن سے زائد مقامات پر قرآن حکیم میں اقیموا الصلاۃ کے ساتھ واتواالزکوۃ کا حکم دیا گیا ہے۔قرآن حکیم کے اس اسلوبِ بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس قدر دین پر عمل کرنے کے تعلق سے نماز کی اہمیت ہے، اتنی ہی اہمیت زکوۃ کے قیام اور ادا کرنے کی

ہے۔ دونوں ہی اجتماعی سعی و جہد کا تصور پیش کرتے ہیں اور دونوں ہی فرد واحد کی انفرادی عبادت کی بجائے اجتماعی عبادت کے قائل ہیں۔ بندہ مومن نماز قائم کرنے اور اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے لیے جدوجہد کرے لیکن وہ اس بات سے بھی واقف نہ ہو کہ زکوۃ کے نظام کو برپا کرنا، لوگوں سے وصول کرنااور اس کے لیے نظام قائم کرنا بھی لازمی جز ہے، تو یہ بات افسوس ناک ہوگی۔ پھر جس طرح ترک نماز انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے ٹھیک اسی طرح زکوۃ بھی شریعت میں اتنا ہی اہم مقام رکھتی ہے کہ اس کی ادائیگی سے انکار، اعراض وفرار مسلمانی کے زمرے سے نکال دینے کا باعث بن جاتا ہے۔یہی وجہ تھی کہ خلیفہ راشد، صدیق اکبر حضرت ابو بکرؓ نے اپنے دور خلافت میں ان لوگوں سے قتال کیا، جنھوں نے نماز اور زکوۃ میں تفریق کرکے زکوۃ کی ادئیگی سے انکار کر دیا تھا۔اسی لیے حضرت فاروقؓ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! اصل میں اللہ نے ابو بکرؓ کا سینہ (جہاد کے لیے) کھول دیا، تو میں نے جان لیا کہ وہی موقف ابو بکر) حق ہے"۔اور اس طرح گویا اس امر پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم) اجمعین کا اجماع ہوگیا کہ زکوۃ کی ادائیگی سے قولاً یا عملاً انکار، اسلام سے خروج کا باعث ہے۔اللہ کے رسولؐ فرماتے ہیں: "اللہ نے زکوۃ اسی لیے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے بقیہ مال کو پاک کر دے" (سنن ابو داؤد)۔لہٰذا جس طرح نماز برائیوں اور فحش کاموں سے انسان کو پاک و صاف کرتی ہے اور اس کے قلب کی تطہیر کرتی ہے ٹھیک اسی طرح انسان کے مال کو پاک کرنے کا ذریعہ زکوۃ

ہے۔ وہ مال جو وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے خود پر اور اپنے اعزا و اقارب پر خرچ کیا جاتا ہے اور جس سے دیگر کام بھی انجام دیے جاتے ہیں۔اس کو خرچ کرنے سے پہلے پاک کر لینا اور پاک مال کو اپنے لیے اور دوسروں کے لیے استعمال کرنا بھی نہایت ہی ضروری ہے۔

دیگر امتوں میں زکوۃ کا نظم:

زکوۃ اور نماز دین کے ایسے ارکان ہیں جن کا ہر دور میں اور ہر مذہب میں آسمانی تعلیمات کے پیروکاروں کو حکم دیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ دونوں فریضے ایسے ہیں جو ہر نبی کی امت پر عائد ہوتے رہے ہیں اور اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے نبی آخری الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا خاتمہ اور دین کی تکمیل کرتے ہوئے ان احکامات کو جاری رکھا گیا۔ قرآنِ حکیم میں حضرت ابراہیم، ان کے بیٹے حضرت اسحاق اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ سے نیکیوں کے کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے کا حکم دیا اور وہ ہمارے عبادت گزار بندے تھے" (الانبیاء: ۷۳)۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: "وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوۃ کا حکم دیا کرتے تھے اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے" (مریم: ۵۵)۔قرآن کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: "میں اللہ کا بندہ ہوں، اس

نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور نبوت سے سرفراز کیا ہے اور میں جہاں کہیں بھی ہوں، مجھے بابرکت بنادیا ہے اور جب تک میں زندہ ہوں، مجھے نماز اور زکوۃ کی وصیت فرمائی ہے" (مریم: ۳۱-۳۰)۔ پھر اسی طرح قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل کو جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا تھا، ان میں یہ حکم بھی تھا: "اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو" (البقرہ: ۴۳)۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے خطاب فرماتا ہے: "اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوۃ ادا کرتے رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لاتے رہے اور ان کی مدد کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ کو بہتر قرض دیتے رہے تو یقیناً میں تمہاری برائیاں تم سے مٹادوں گا اور تمہیں ان جنتوں میں لے جاؤں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں" (المائدہ: ۱۲)۔ یہ تمام آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پچھلی امتوں پر بھی نماز ادا کرنے اور زکوۃ ادا کرنے کا حکم دیا تھا، پھر جن لوگوں نے اس میں تحریف نہیں کی اور اس کے احکامات پر عمل کرتے رہے، وہی مسلم کہلائے اور ان کو آخرت کی ہمیشگی نصرت و کامرانی کی بشارت دے دی گئی۔ لیکن جنھوں نے اس کے برخلاف عمل کیا اور اپنی مرضی سے دین کے کچھ حصے پر عمل کرتے رہے اور کچھ کو چھوڑ دیا تو ایسے لوگوں نے اللہ کے احکامات پر اس طرح عمل نہیں کیا جس طرح ایک مسلم بندہ عمل کرتا ہے۔ یہی واقعہ جب صدیق اکبرؓ کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے ایسے مسلمانوں سے جہاد کیا، یہاں تک کہ وہ تائب ہوگئے اور نماز اور زکوۃ دونوں کو ادا کرنے والے بن گئے۔

: مضبوط و منظم اجتماعیت

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ بار ہا اس جانب توجہ فرماتا ہے کہ اے مومنو! اللہ کی بندی اختیار کرو۔اس کے لیے صبر اور نماز سے مدد لو، نماز قائم کرو اور زکوۃ دو۔ نماز اور زکوۃ کے نظام پر ہم جس قدر بھی غور کریں تو یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف یہ عبادات اللہ سے قرب کا ذریعہ بنتی ہیں اور دوسری طرف ہماری نظر میں جو غیر اہم چیزیں اہم بن گئی ہیں ان کی اہمیت کم کرتے ہوئے اللہ کے احکام پر کاربند رہنے میں مدد کرتی ہیں۔ نماز ہو یا زکوۃ، یہ دونوں ہی عبادات بندہ مومن کو اجتماعی زندگی کی دعوت دیتی ہیں۔ ایسی اجتماعیت جو منظم بھی ہو اور مضبوط بھی۔ پھر یہ احکام کہ: " اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ" یہی ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی گزارنی چاہیے، ان کا ہر عمل اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انجام دیا جانا چاہیے۔ اس کی روح وہ نماز ہے جب کہ مسلمان دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے گھر میں باہم ملتے ہیں، ایک دوسرے کی خبر گیری کرتے ہیں، اور اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ہم نہ صرف اللہ کے لیے مخلص ہیں بلکہ بندگان اللہ کے لیے بھی مخلص ہیں۔ پھر اسی چیز کو زکوۃ کے اجتماعی نظام کے ذریعہ بھی وہ ثابت کردیتے ہیں۔ چاہے وہ زکوۃ جمع کرنے کے نظام کے قیام کے تعلق سے ہو یا خرچ کرنے کے تعلق سے۔ اس کے ذریعہ وہ ایک

پورا نظام برپا کرتے ہیں اور اس کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ نیز سچے، ایماندار اور اللہ کے سامنے جوابدہ رہنے کے جذبہ سے سرشار لوگوں کے گروہ کو پروان چڑھاتے ہیں اور اُن کی مدد کرتے ہیں۔ یہ اجتماعیت ایسی ہوتی ہے جس میں کہیں دراڑ نہیں پائی جاتی، یہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ہوتی ہے، اور اس سے وابستہ افراد گروہ در گروہ ٹولیوں اور گروپوں میں تقسیم نہیں ہوتے، ممکن ہے کہ اختلاف رائے رکھتے ہوں اس کے باوجود اللہ کے احکام پر عمل کرنے والے اور ان احکامات کے نفاذ میں ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے اللہ تعالی جنت کی بشارت دیتا ہے۔

: قرآنی تنمبیہات

قرآن کہتا ہے: "جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے اور نماز پڑھتے رہے اور زکوۃ دیتے رہے ان کو ان کے کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا اور (قیامت کے دن) ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے" (البقرہ: ۲۷۷)۔ مزید کہا: "تمہارے دوست تو خدا اور اس کے پیغمبر اور مومن لوگ ہیں جو نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے اور خدا کے آگے) جھکتے ہیں" (المائدہ: ۵۵)۔ مزید فرمایا: "خدا کی مسجدوں کو وہ لوگ آباد) کرتے ہیں جو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان لاتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ یہی لوگ امید ہے کہ ہدایت یافتہ لوگوں میں (داخل) ہوں" (التوبہ: ۱۸)۔ ایک اور

جگہ ارشاد فرمایا کہ: "اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا رحم کرے گا۔ بے شک خدا غالب حکمت والا ہے" (التوبہ: ۷۱)۔ پھر کہا کہ: "یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے" (الحج: ۴۱)۔ ایک اور جگہ متنبہ کیا گیا کہ دیکھو مومن وہ ہیں: "وہ جو نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں" (النمل: ۳)۔ یہ اور اس طرح کی بے شمار آیات ہیں جن میں مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ مسلم بندوں کی جہاں صفات بیان کی گئی ہیں وہاں اور دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ یہ تذکرہ کر دیا گیا ہے کہ وہ لوگ ایسے اور ایسے ہوتے ہیں، ایسے ہیں اور ایسے ہونے چاہئیں۔ جو اپنی نمازوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے مالوں کو پاک کرنے کا بھی بھرپور خیال رکھتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مومن وہ نہیں ہو سکتا جو اپنی نمازوں کی پابندی نہ کرتا ہو اور ساتھ ہی اپنی زکوۃ نہ ادا کرتا ہو۔ بس یہ بات ہمارے غور و فکر کرنے کے لیے اور ساتھ ہی اپنی ذات کا محاسبہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ آیا یہ صفات ہمارے اندر موجود ہیں یا ان سے ہم غفلت برت رہے ہیں۔ کسی کام کہ کسی مخصوص مرحلے میں انجام نہ دے پانا غفلت میں

شمار نہیں ہوتا۔ ہاں وہی کام اگر مستقل نہ انجام دیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی کہ ایسا شخص اس کام اور اس کی اہمیت سے واقف نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اُس کام سے غفلت برت رہا ہے۔ لیکن ایک ایسا شخص جو واقفیت رکھنے کے باوجود اس کام کو نہ انجام دے تو پھر یہ بات ایسی ہوگی جیسے کوئی بغاوت پر اتر آئے۔اور یہ ممکن نہیں کہ ایک بندہ مومن جو اللہ کی صفات سے واقف ہو اور اس کی رحمت اور اس کی جباریت کا علم رکھتا ہو اس کے باوجود بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو ایسا شخص کافر ہی ہو سکتا ہے !اس بات سے ہم اچھی طرح واقف ہیں کہ انسان کے اعمال؛ اس کے کردار، خیالات اور اس کے عقائد کے اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں۔پس ہم کیا کہتے ہیں اس سے زیادہ اہم یہ بات ہے !!کہ ہم کیا کرتے ہیں اور کیا کر رہے ہیں

:احادیث صحیحہ میں زکوۃ کا تذکرہ

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں کہ جب میں اس کو کروں تو جنت میں داخل ہوں۔آپ نے فرمایا کہ: "تو اللہ کی عبادت کر اور کسی کو اس کا شریک نہ بنا اور فرض نماز قائم کر اور فرض زکوۃ ادا کر اور رمضان کے روزے رکھ" تو اس اعرابی نے کہا قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں اس پر زیادتی نہ کروں گا۔جب وہ چلا گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایاکہ: "جس شخص کو کوئی جنتی دیکھنا اچھا معلوم ہو تو وہ اس شخص کو دیکھے" (صحیح بخاری)۔ حضرت ابوہریرہؓ ہی سے ایک اور رویت مروی ہے انھوں نے کہاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے اور عرب کے بعض قبیلہ کافر ہوگئے، تو عمرؓ نے کہاکہ آپ لوگوں سے کس طرح جنگ کریں گے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاکہ میں حکم دے گیا ہوں کہ لوگوں سے جہاد کروں یہاں تک کہ وہ لَاإلہ اِلّااللہ کہیں، جس نے لَاإلہ اِلّااللہ کہااس نے مجھ سے اپنی جان و مال بچالیا مگر کسی حق کے عوض اور اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا واللہ میں اس شخص سے جہاد کروں گا جن نے نماز اور زکوۃ کے درمیان تفریق ڈالی۔ زکوۃ تو مال کا حق ہے بخدا اگر انھوں نے ایک رسی بھی روکی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیتے تھے تو اس کے نہ دینے سے میں ان سے جنگ کروں گا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایاکہ بخدا اللہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھول دیا تھا۔ تو میں نے جان لیاکہ یہی حق ہے۔ (صحیح بخاری)۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں انھوں نے بیان کیاکہ رسولؐ اللہ نے فرمایا: "جس کو اللہ تعالی نے مال دیا اور اس نے زکوۃ نہ ادا کی تو اس کا مال گنجے سانپ کی شکل میں اس کے پاس لایا جائے گااس کے سر کے پاس دوچینیاں ہوں گی۔ قیامت کے دن اس کا طوق بنایا جائے گا، پھر اس کے دونوں جبڑوں کو ڈسے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں، پھر قرآن کی آیت پڑھی اور وہ لوگ جنہیں

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مال عطا کیا اور وہ اس میں بخل کرتے ہیں وہ اسے اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں بلکہ یہ برا ہے اور قیامت کے دن یہی مال ان کے گلے کا طوق ہوگا" (صحیح بخاری)۔ حضرت ابوہریرہؓ ہی سے یہ روایت بھی مروی ہے، کہا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا: "جس نے پاک کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اللہ صرف پاک کمائی کو قبول کرتا ہے، پھر اس کو خیرات کرنے والے کے لیے پالتا رہتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے بچھڑے کو پالتا ہے یہاں تک کہ وہ خیرات پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے" (صحیح بخاری)۔ جہاں یہ احادیث ہمارے اندر مال و دنیا کی رغبت کم کرتی ہیں، اللہ کا تقویٰ پیدا کرتی ہیں اور جہنم کے عذاب سے ڈراتی ہیں، وہیں یہ احادیث ہمارے اندر جنت کی محبت پیدا کرتی ہیں، اللہ سے تعلق قائم کرنے میں مدد کرتی ہیں اور اپنے مال کو بطور زکوۃ اور بطور صدقہ و خیرات خرچ کرنے پر ابھارتی ہیں۔ ان احادیث کا علم ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے اور ہمیں اپنی کامیاب بندوں میں شمار کر لے!

انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب :

اسلام میں زکوۃ ایک طے شدہ مقدار میں اور ایک طے شدہ مدت (ایک سال مکمل ہونے پر) میں ادا کرنے کی عبادت ہے۔ لیکن اسلام بندگان اللہ کو اپنی شخصیت میں مزید بہتری پیدا کرنے کی طرف ابھارتا ہے اور اس کے لیے وہ کہتا ہے کہ یہ تو

ایک لازمی عبادت ہے جو مسلمانوں کی اجتماعیت سے وابستہ ہر فرد کے لیے ضروری ہے جبکہ وہ صاحبِ نصاب ہو، لیکن یہ کافی نہیں۔انسان کے اندر دنیا کی رغبت کم کرنے اور مال کی محبت گھٹانے کے لیے مزید اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی حاجت ہے جس کے فوائد انسان کو خود ہی حاصل ہوں گے۔اور فائدہ یہ ہوگا کہ یہ مال جس میں لوگوں کے حقوق ہیں وہ حقوق ادا ہو سکیں گے، ساتھ ہی یہ مال آخرت کی ہولناکیوں اور عذابِ جہنم سے چھٹکارے کا ذریعہ بنے گا۔قرآن نے کہا کہ: "ہم نے اِن (اہل مکہ) کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ایک باغ کے مالکوں کو آزمائش میں ڈالا تھا، جب انھوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور وہ کوئی استثناء نہیں کر رہے تھے۔رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کوئی کٹی ہوئی فصل ہو۔ صبح سویرے ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر پھل توڑنے ہیں تو سویرے سویرے اپنی کھیتی کی طرف نکل چلو۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج کوئی مسکین تمہارے پاس باغ میں نہ آنے پائے۔وہ کچھ نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے صبح سویرے جلدی جلدی اس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ (پھل توڑنے پر) قادر ہیں۔مگر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے "ہم راستہ بھول گئے ہیں، نہیں، بلکہ ہم محروم رہ گئے"۔ان میں سے جو سب سے بہتر آدمی تھا اس نے کہا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے"؟۔وہ پکار اٹھے پاک ہے ہمارا رب، واقعی ہم

گناہ گار تھے" (القلم ۲۹-۱۷)۔ پھر سورۃ المعارج میں اللہ تعالیٰ بخیل اور معصیت زدہ لوگوں کی مزید مثال پیش کرتا ہے، فرمایا گیا کہ: "انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں، جو اپنی نمازوں کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں، جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا مقرر حق ہے، جو روزِ جزا کو برحق مانتے ہیں، جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی بے خوف ہو" (المعارج: ۲۹-۱۹)۔ یہ دونوں آیات مسلمانوں کو انفاق فی سبیل اللہ کی جانب ابھارتی ہیں ساتھ ہی متنبہ کرتی ہیں کہ اگر تم لوگوں نے اللہ کی دی ہوئی امانت میں سے محرومین اور سائل کا حق ادا نہیں کیا اور ان لوگوں کی مدد نہیں کی جو حاجت مند ہیں تو اللہ تعالیٰ اس دی ہوئی امانت اور انعام کو واپس لے لے گا۔ پھر تمہاری وہی حالت ہوگی جس کا تذکرہ ان آیات میں اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کے تعلق سے بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے انسان کبھی بھی اس زعم میں مبتلا نہ ہو کہ اس کو جو مال و دولت اور اولاد کی شکل میں رزق مہیا کیا گیا ہے وہ اس کی خود کی کمائی ہے۔ بلکہ اس کو ہمہ وقت یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ وقتی چیزیں ہیں، نہ صرف یہ ملی ہوئی چیزیں وقتی ہیں بلکہ یہ زندگی بھی وقتی ہے، جو بہت ہی قلیل ہے۔ انھیں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کو بھی ذہن میں تازہ کر لینا چاہیے کہ زکوٰۃ جو ایک طے شدہ مدت میں طے

شدہ مقدار ہے، اس کو ادا کرنے کے علاوہ بھی انسان کو وقتاً فوقتاً اللہ کی راہ میں انفاق فی سبیل اللہ کرتے رہنا چاہیے اس توقع کے ساتھ کہ اس کے ذریعہ جنت کا حصول آسان ہونے کے امکانات ہیں، بشرطیکہ اس انفاق میں خلوص نیت بھی شامل ہو۔

عقلیت پسندوں کے گروہ اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ عقل سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہے اور جو بات عقل میں نہ سما سکے اس کی بھی کوئی حیثیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آخرت، جنت و دوزخ، ملائکہ، تقدیر، وحی اور اس طرح کے دیگر اسلامی عقائد کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا اگر کوئی صاحب عقل انکار نہ کرے تو اس سے آگے بڑھ کر ان عقائد کی سائنسی اور عقلی بنیادوں پر توضیح بیان کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو بات وہ اپنے قول و عمل سے بیان کر رہے ہیں اس ہی کو دنیا بھی تسلیم کر لے۔ اس کا ایک مقصد اپنی حیثیت منوانا اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنا ہوتا ہے تو دوسرا مقصد اسلامی تعلیمات، عقائد اور نظریات سے دوری پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ جو بات انسان ثابت نہ کر سکے وہ حقیقت نہیں۔ جس کو ثابت کیا جا سکتا ہے، جس کے ثبوت انسان تلاش کر چکا ہے اور جو تجربات کی روشنی میں پرکھی جا چکی ہے بس وہی سچ ہے۔ ایسے لوگوں کے بھٹکنے کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کو اپنا رب اور رسولؐ کو اپنا رہبر تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن افسوس! صد افسوس ان اشخاص پر جو اللہ کو بھی مانتے ہیں اور رسولؐ کو بھی لیکن اس کے باوجود یہ لوگ بھی وہی طریقہِ استدلال اختیار کرتے ہیں جو منکرینِ حق اختیار کرتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: "دیکھو، تمہارے

پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں،اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا، میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں" (الانعام: ۱۰۴)۔ معلوم ہوا کہ عقلِ سلیم حق کو حق تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے اور جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں ان کو یہ توفیق حاصل بھی ہو جاتی ہے کہ وہ عقل کا صحیح استعمال کر سکیں اور جو چیزیں اللہ نے دنیا میں انسانوں کے غور و فکر کے لیے پیدا کیں ہیں ان کو دیکھیں، سمجھیں اور تسلیم کر لیں۔ لیکن خدا سے بغاوت کے نتیجہ میں ان کی عقلیں کام نہیں کرتیں اور وہ حق دیکھنے اور جاننے کے باوجود صحیح نتائج اخذ نہیں کرپاتے۔ لہٰذا خدا کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دیے ہوئے غیبی علم پر بھی ایمان لایا جائے۔ کہا کہ: "یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیز گار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں" (البقرہ: ۲)۔

:شب قدر

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اِذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوعِ فجر تک" (القدر: ۵-۱)۔ قدر کے معنی بعض مفسرین نے تقدیر کے لیے ہیں، یعنی وہ رات جس میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لیے

فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کی تائید سورۃ دُخان کی یہ آیت کرتی ہے: "اس رات میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے" (آیت: ۵)۔ بخلاف اس کے امام زُہری کہتے ہیں کہ قدر کے معنی عظمت و شرف کے ہیں، یعنی وہ بڑی عظمت والی رات ہے۔ اِسی معنی کی تائید اِسی سورۃ کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ: "شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے"۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی رات ہے ؟اس سلسلے میں حضرت عُبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ شب قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق ہے، اکیسویں، یا تیئسویں، یا پچیسویں، یا ستائیسویں، یا انتیسویں، یا آخری (مسند احمد)۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ " شب قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں تلاش کرو" (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی)۔ یہ وہ عظیم رات ہے جس میں تمام حکیمانہ امور کا فیصلہ ہوا۔ اس رات میں قدریں، بنیادیں اور پیمانے وضع ہوئے، اس رات میں افراد کی قسمتوں سے بڑھ کر قوموں، نسلوں اور حکومتوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا، بلکہ اس سے بھی زیادہ عظیم امر، حقائق، طور طریق اور قلوب کی قدریں طے ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ اس رات کی قدر بے انتہا ہے اور اگر اس کو کوئی بنا عزر حاصل کرنے کی سعی نہ کرے تو وہ اللہ کی نصرت و تائید سے محروم ہے۔ انس بن مالکؓ نے سے بیان کیا ہے، آپؐ نے فرمایا: " تمہارے اوپر یہ مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے، اور اس میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو اس سے محروم رہ گیا، وہ تمام ہی خیر سے محروم رہ گیا، اور اس

سے وہی شخص دور رہتا ہے جو خیر سے محروم ہے" (سنن ابن ماجہ)۔

: شب قدر کے اعمال

صحیحین کی روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا: "جس کسی نے شب قدر میں اللہ کی عبادت ایمان اور احتساب کی حالت میں کی، اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے "۔ کہا کہ جو عبادت بھی کی جائے وہ ایمان اور احتساب کی حالت میں ہو۔ ایمان کا مطلب ہے کہ شب قدر جن عظیم مطالب و معانی سے وابستہ ہے (دین، وحی، رسالت اور قرآن) انھیں ہم ذہن میں تازہ کریں اور احتساب کا مطلب ہے کہ عبادت صرف اللہ کی رضا کے لیے اخلاص کے ساتھ ہو۔اس صورت میں قلب بیدار ہوگا، عبادت کی حقیقت واضح ہو گی نیز قرآنی تعلیمات اور احکامات پر عمل درآمد آسان ہو جائے گا۔
اس کے برخلاف اظہارِ عبادت قلب میں وہ قوت پیدا نہیں کر سکتی جو مطلوب ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ: " جب رمضان کا آخری عشرہ آ جاتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تہہ بند مضبوط باندھتے (بہت زیادہ مستعد ہو جاتے) رات کو خوب جاگتے اور گھر والوں کو بھی جگاتے" (صحیح بخاری)۔ اس حدیث سے تین باتیں واضح آخری عشرہ میں روزہ داروں کو اس بات کا شعوری علم ہونا چاہیے کہ یہ (i ہوتی ہیں آخری عشرہ دیگر عشروں کے بالمقابل زیادہ اہمیت رکھتا ہے لہٰذا اس میں پوری توجہ اور مستعدی کے ساتھ پہلے گزرے دو عشروں کے مقابلہ زیادہ عبادت کا اہتمام کیا جانا دن کی مصروفیت کو جاری (ii چاہیے۔

رکھتے ہوئے رات میں عبادت زیادہ کی جائے اور یہ عبادت تب ہی ممکن ہے جب کہ اور آخری بات ، عبادت خود بھی کی جائے (iii اس کے لیے ذہنی تیاری کر لی گئی ہو۔ اور اس پر بھی توجہ دی جائے کہ ہمارے بیوی، بچے اور گھر میں رہنے والے دیگر افراد بھی اِس عبادت سے فیض یاب ہوں۔ اس کے لیے پہلے عملی نمونہ ہمیں خود پیش کرنا ہوگا تب ہی ممکن ہے کہ دوسروں کے لیے قابل تقلید بن سکیں۔اور یہ حقیقت ہے کہ عملی نمونہ بہ نسبت قولی نصیحت کے زیادہ پُراثر ہوتی ہے۔

: اعتکاف

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ رمضان کے عشرے میں اعتکاف کرتے تھے۔جب بیسویں رات گزر جاتی اور اکیسویں رات آ جاتی تو اپنے گھر واپس آ جاتے اور جو لوگ آپ کے ساتھ اعتکاف میں ہوتے وہ بھی واپس ہو جاتے۔ایک مرتبہ ایک رمضان میں آپ اس رات کو اعتکاف میں رہے جس میں آپ واپس ہو جاتے تھے۔اس کے بعد آپ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور جو کچھ اللہ نے چاہا اس کا حکم دیا پھر فرمایا "اس عشرے میں اعتکاف کرتا تھا مگر اب آشکارا ہوا کہ اس آخری عشرے میں اعتکاف کروں، اس لیے جو لوگ میرے ساتھ اعتکاف میں ہیں وہ اپنے اعتکاف کی جگہ میں ٹھہرے رہیں اور مجھے خواب میں شب قدر دکھائی گئی، پھر وہ مجھ سے بھلا دی گئی۔ اس لیے اسے آخری عشرے اور ہر طاق راتوں میں تلاش کرو اور میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ پانی اور کیچڑ میں سجدہ کر رہا

ہوں" پھر رات میں آسمان سے پانی برسا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کی
جگہ سے مسجد ٹپکنے لگی وہ اکیسویں رات تھی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آپ نماز
صبح سے فارغ ہوئے اور آپ کا چہرہ کیچڑ اور پانی سے بھر ہوا تھا، (صحیح بخاری)۔ دوسری
روایت حضرت عائشہؓ سے ہے کہ نبیؐ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے تھے،
یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو اٹھالیا پھر آپ کے بعد آپ کی بیویاں بھی اعتکاف کرتی
تھیں، (صحیح بخاری)۔ ان دونوں احادیث سے جو باتیں سمجھ میں آتی ہیں وہ یہ ہیں :
پہلے رسولؐ اللہ دوسرے عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے لیکن اب جب کہ ان پر (i
حقیقت آشکارا ہو چکی اور شب قدر کو بتا دیا گیا کہ وہ آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے
ہے تو ضروری ہوا کہ آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے ہوئے شب قدر کی تلاش کر لی
رسولؐ اللہ کو شب قدر بتائی گئی تھی لیکن (ii جائے اور اس کی برکات حاصل کی جائیں۔
پھر اس کو بھلا دیا گیا، یہ اللہ کی مصلحت ہے تاکہ مسلمان زیادہ سے زیادہ عبادت کر
سکیں اور انھیں اس کا بھرپور فائدہ اس دن حاصل ہو جبکہ اعمال نامہ بند کر دیے جائیں
رسولؐ اللہ کی ازواج بھی اعتکاف کرتی تھیں اس لیے ہمارے گھر کی عورتیں (iii گے۔
آخری بات یہ کہ اسلام نے (iv جن کے لیے ممکن ہو وہ بھی اس کا ضرور اہتمام کریں۔
رہبانیت (ترکِ دنیا) سے منع کیا ہے لیکن یہ انسانی خواہش کہ وہ اپنے رب سے گوشہ
تنہائی میں گفتگو کرے اور اس کے حضور گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور
آئندہ کے لیے اطاعت و وفاداری کا عہد و پیمان

کرے، اعتکاف کو مستحب قرار دے کر انسان کی اس خواہش کی تکمیل کی گئی ہے۔

: شب قدر کی دعا

قرآن و حدیث میں دعاؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس مرحلے میں کون سی دعا کا اہتمام کیا جائے۔وہ مرحلہ جب کہ انسان کو ایک عظیم رات میں عبادت کرنے اور اپنی حاجات اور مناجات پیش کرنے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ہزار مہینوں سے بہتر رات جب کہ روح اور فرشتے اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔ جس رات طلوع فجر تک سراسر سلامتی ہی سلامتی ہے۔جس رات انسان کی تقدیر کے فیصلے کیے جاتے ہوں۔اگر وہ رات انسان کو مل جائے تو غور فرمایئے کہ کس قدر خوشی اس پر طاری ہوگی۔پھر اس مرحلے میں انسان چاہے گا کہ اس کو وہ کچھ مل جائے جس کی وہ آرزو کرتا ہے۔اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ انسان کی خواہشیں لازوال ہیں۔اس پس منظر میں اگر وہ دعائیں کرنے بیٹھے تو طویل دعائیں مانگنے کی توقع ہے۔ لیکن غور فرمایئے کہ اللہ کے رسولؐ نے اس رات کے ملنے پر کون سی دعا کے اہتمام کا تذکرہ کیا ہے؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ !اگر مجھے شب قدر نصیب ہو جائے تو کیا دعا کروں؟فرمایا " اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌ تُحِبُّ العَفوَ فَاعفُ عَنِّی۔ کہا اے اللہ! تو بہت معاف کرنے والا ہے،معافی کو پسند کرتا ہے،تو میری خطائیں معاف فرما " (ابن ماجہ)۔

: دعا کی حقیقت و اہمیت

حضورؐ اکرم نے دعا کو مغزِ عبادت قرار دیا ہے۔ بندہ جب اللہ کے آگے اپنی حاجات پیش کرتا ہے، اس سے اپنی امیدیں وابستہ کرتا ہے اور دوسرے تمام رب سے تعلق منقطع کر لیتا ہے، یہی وہ مرحلہ ہے جہاں توحید و اخلاص کا اظہار ہو جاتا ہے اور جب بندہ اللہ کو واحد رب تسلیم کر لے تو اس سے بلند تر کوئی عبادت نہیں۔ محی الدین ابن عربی کہتے ہیں کہ جس طرح جسم کے تمام اعضا ہڈیوں کے مغز سے قوت حاصل کرتے ہیں اسی طرح دعا وہ مغز ہے جس سے عابدوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریمؐ نے قرآن کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے دعا کو عین عبادت بھی کہا ہے۔ کہا: "اور تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ میری عبادت سے گھمنڈ کرتے ہیں وہ عنقریب ذلت و خواری کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے" (المومن: ٦٠)۔ اللہ کا اپنے بندوں سے مطالبہ ہے کہ وہ اس سے اور صرف اسی سے دعا مانگیں اور مدد کے لیے اسی کو پکاریں۔ اس لیے کہ سب کچھ اسی کے دستِ قدرت میں ہے اور اس کائنات میں اس کی مشیت کے بغیر ایک پتا بھی اپنی جگہ سے ہِل نہیں سکتا، اور اس لیے بھی کہ دعا عبادت ہے اور عبادت کسی دوسرے کی جائز نہیں۔ اور کہا کہ: "اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو، جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور

خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے" (الاعراف: ۵۶-۵۵)۔ دعا کے سلسلے کی یہ بات بھی اہم ہے کہ دعا غیر اللہ سے نہ مانگی جائے، یہ دعا صرف قولی ہی نہیں بلکہ عملی بھی ہونی چاہیے کیونکہ اعمال انسان کی فکر و عقیدہ کا اظہار ہوتے ہیں۔ کہا کہ: "اور اللہ کو چھوڑ کر کسی، ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اگر تو ایسا کرے گا ظالموں میں سے ہوگا" (یونس: ۱۰۶)۔

یوم الجر

مختلف مذاہب کے ماننے والے جو تہوار مناتے ہیں اس کے ذریعہ ایک جانب وہ اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں تو وہیں دوسری جانب ان کے عقائد وافکار اور طور طریق کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور یہ تہوار مذہب کا ترجمان بنتے ہیں۔یہ بات قابل غور ہے کہ مختلف قسم کے تہوار کسی نہ کسی مخصوص تاریخی واقعے، شخصیت یا کسی خاص کامیابی کی یاد سے منسلک ہوتے ہیں۔ پھر یہی وہ تہوار ہیں جن کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں یا تو اس مذہب اور اس کی فکر سے قربت قائم کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور دل مائل ہوتا ہے یا پھر ان طور طریقوں کو دیکھ کر کراہت محسوس ہوتی ہے اور دوری اختیار کرنے کا دل چاہتا ہے۔ اسلام وہ عالمگیر دین ہے جو قیامت تک تمام اقوام کے لیے کامیابی وفلاح کا پیغام دیتا ہے اور اس میں کامیابی وناکامی اور خوشی ورنج کا دارومدار تقویٰ اور نیکی پر ہے۔اسلام کے ماننے والوں کے لیے سب سے بڑی خوشی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ بندہ مومن اپنے شب وروز کے جو کام انجام دے رہا ہے اس کے نتیجہ میں وہ للہ کا مقرب بندہ بن جائے نیز للہ اور رسولؐ کے احکامات پر عمل کرنا آسان ہوجائے۔للہ کے رسولؐ فرماتے ہیں کہ جب نیکی کرکے تجھے خوشی ہو اور برائی کرنے سے رنج ہو تو، تو مومن ہے۔بندہ مومن ہر کام کرنے سے قبل اور بعد اپنے دل کا جائزہ لیتا ہے اور پھر

اس کے ذریعہ یا تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے یا پھر توبہ و استغفار کا رویہ اختیار کرتا ہے۔

: عید الفطر احادیث کی روشنی میں

انس بن مالکؓ رویت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسولؐ للہ عید الفطر کے دن جب تک چند چھوہارے نہ کھالیتے، عید گاہ کی طرف نہ جاتے اور چھوہارے طاق عدد میں کھاتے (صحیح بخاری)۔جابرؓ نے کہا کہ جب عید کا دن ہوتا تو نبیؐ واپسی میں راستہ بدل کر جاتے (صحیح بخاری)۔حضرت جابر بن عبدللہؓ سے روایت ہے کہ میں رسولؐ للہ کے ساتھ عید کے دن نماز کے لیے حاضر ہوا تو آپؐ نے خطبے سے پہلے اذان اور اقامت کے بغیر نماز پڑھائی۔ پھر بلالؓ پر ٹیک لگائے کھڑے ہو گئے، للہ پر تقویٰ کا حکم دیا اور اس کی اطاعت کی ترغیب دی اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کی پھر عورتوں کے پاس جا کر ان کو وعظ و نصیحت کی اور فرمایا کہ صدقہ کرو کیونکہ تم میں سے اکثر جہنم کا ایندھن ہیں، عورتوں کے درمیان سے ایک سرخی مائل سیاہ رخساروں والی عورت نے کھڑے ہو کر عرض کیا کیوں یا رسولؐ للہ؟ فرمایا: کیونکہ تم شکوہ زیادہ کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری، حضرت جابر فرماتے ہیں وہ اپنے زیوروں کو صدقہ کرنا شروع ہو گئیں، حضرت بلالؓ کے کپڑے میں اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں ڈالنے لگیں (صحیح مسلم)۔ام عطیہؓ سے روایت ہے کہ ہمیں نبی کریمؐ نے حکم دیا کہ ہم کنواری، جوان اور پردے والیاں عیدین کی

نماز کے لیے جائیں اور حائضہ عورتوں کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کی عید گاہ سے دور رہیں صحیح مسلم)۔ حضرت انس بن مالکؓ نے اپنے غلام ابن ابی عتبہ کو زاویہ گاؤں میں نماز) پڑھانے کا حکم دیا تو ابن ابی عتبہ نے حضرت انسؓ کے گھر والوں اور بیٹوں کو جمع کیا اور سب شہر والوں کی تکبیر کی طرح تکبیر اور نماز پڑھی اور عکرمہؓ نے کہا "گاؤں کے لوگ عید کے روز جمع ہوں اور دو رکعت نماز پڑھیں جس طرح امام پڑھتا ہے "اور عطا رحمہ للہ نے کہا "جب کسی کی نماز فوت ہو جائے تو دو رکعت نماز ادا کر لے" (صحیح بخاری) ۔ عروہ بن زبیر ، حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ابو بکرؓ آئے اور میرے پاس انصار کی دو لڑکیاں جنگ بعاث کے دن کا شعر گا رہی تھیں، اور ان لڑکیوں کا پیشہ گانے کا نہیں تھا، تو ابو بکرؓ نے فرمایا کہ یہ شیطانی باجہ اور رسولؐ للہ کے گھر میں ؟ اور وہ عید کا دن تھا، رسولؐ للہ نے فرمایا کہ اے ابو بکرؓ ! ہر قوم کی عید ہوتی ہے اور آج ہم لوگوں کی عید ہے (صحیح بخاری)۔ صحیح مسلم میں اتنا اضافہ اور ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ: ہر قوم کے لیے عید ہوتی ہے اور یہ ہماری خوشی کا دن ہے۔

عید گاہ جانے سے قبل کوئی میٹھی (i : درج بالا احادیث سے چند باتیں واضح ہوتی ہیں عید کے دن عید گاہ (ii چیز ضرور کھانی چاہیے بہتر ہوگا کہ کھجور یا چھوہارے ہوں۔ جانے اور آنے کے راستے الگ الگ ہونے چاہیں۔اس بنا پر کہ وہاں

کے رہنے والے انسان اور جنات اور فرشتے طاعات و نیکیوں پر گواہ بن جائیں، یا اس بنا پر کہ دونوں راستوں کے رہنے والوں کو برکتیں حاصل ہوں، یا اس بناپر کہ دونوں راستوں میں شعائر اسلام کا اظہار ہو، وغیرہ۔

iii) عید کی نماز کے بعد امام تقویٰ اور نیکی کی ترغیب دلائے اور مقتدی اس کو بغور سنیں اور اس پر عمل کرنے کی سعی کریں۔

iv) اگر عید کے دن نماز فوت ہو جائے تو چاہیے کہ دو رکعت نماز پڑھ لی جائے، یہی مناسب طریقہ ہے۔

v) عیدین کی نماز میں عورتیں بھی شامل ہوں اور ان کی نماز کا الگ اہتمام کیا جاے نیز عورتیں اُن باتوں کا پاس و لحاظ رکھیں جو اسلام کو مقصود ہیں۔

vi) عید کے دن خوشی کا اظہار ہونا چاہیے اور اس کے لیے جائز طریقوں کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔یہ تمام کام اس لیے اختیار کیے جائیں کہ آج کا دن ہمارا عید کا دن ہے اور عید خوشی کا دن ہے ۔پھر یہی وہ طریقہ ہے جس کو اختیار کرنے سے اللہ اور اس کا رسولؐ بھی خوش ہوتا ہے۔

اجر و مغفرت کا اعلانِ عام:

عید الفطر کا دن مومنین کو پورے ایک ماہ رمضان المبارک کی عبادات کے بعد نصیب ہوتا ہے۔رمضان المبارک میں وہ اپنے آپ کو ظاہری اور باطنی طور پر پاک کرتے ہیں اور اللہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ ان بندوں سے راضی ہوتا ہے۔ صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے اور معدؓ بن اوس

انصاری اپنے والد حضرت اویسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب عید الفطر کا دن آتا ہے تو خدا کے فرشتے تمام راستوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں اے مسلمانو! رب کے پاس چلو جو بڑا کریم ہے، نیکی اور بھلائی کی راہ بتاتا اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دیتا ہے اور اس پر بہت انعام سے نوازتا ہے، تمہیں اس کی طرف سے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا تو تم نے روزے رکھے اور اپنے رب کی اطاعت گزاری کی۔ تمہیں اس کی طرف سے تراویح پڑھنے کا حکم دیا گیا تو تم نے تراویح پڑھی سو اب چلو اپنا انعام لو۔ اور جب لوگ عید کی نماز پڑھ لیتے ہیں تو ایک فرشتہ اعلان کرتا ہے۔اے لوگو! تمہارے رب نے تمہاری بخشش فرمادی پس تم اپنے گھروں کو کامیاب و کامران لوٹو یہ عید کا دن انعام کا دن ہے۔ اس اجر و انعام اور رحمت و مغفرت کے تعلق سے یہ اضافہ بھی ملتا ہے کہ، جب لوگ عید گاہ میں آجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے: جن مزدوروں نے اپنا پورا کام کیا ہو اس کی مزدوری کیا ہے! فرشتے عرض کرتے ہیں اس کی مزدوری یہ ہے کہ اسے پورا اجر دیا جائے، تب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ جن لوگوں نے روزے رکھے اور نمازیں پڑھیں ان کے عوض میں، میں نے انہیں مغفرت سے نواز دیا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا بے انتہا کرم ہے کہ وہ ہمیں دنیا میں بھی خوشیاں مہیا کراتا ہے،ان اعمال کے بدلہ جو دنیا میں ہم نے کیے ہیں اور آخرت کا اجر تو اجرِ

عظیم ہوگا۔ہم نے رمضان میں روزے رکھے اور عبادات انجام دیں اس کا نتیجہ ہے کہ للہ نے بغیر دیر کیے ہی ہمیں ہماری مزدوری کی اجرت دے دی۔یہی للہ کی سنت ہے اور اس ہی طریقہ کو مسلمانوں کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔بے انتہا خوشیاں اور مسرتوں سے بھرپور عید سعید خصوصاًامت مسلمہ اور تمام ہی انسانیت کے علمبرداروں کو مبارک باد کا پیغام پیش کرتی ہے۔اچھا ہوگا کہ یہ عید انسانوں کے لیے خیر وبرکت کا ذریعہ بن جائے اور انسانوں کی انسانوں سے جو دوریاں پیدا ہو رہی ہیں ان میں کمی واقع کردے،یہی ہماری خواہش اور یہی ہماری دعا ہے۔ للہ تعالیٰ ہماری عبادات کو قبول فرمائے اور دنیا اور آخرت میں متقیوں کا امام بنائے (آمین)۔

اس عید سعید کے موقع پر ہمیں اپنے ان اسلام پسند بھائیوں کو بھی نہیں بھلانا چاہیے جو آج تنگ دستی اور تشدد کا شکار ہیں۔ان میں بطور خاص مصر و شام کے مظلوم مسلمان ہیں تو وہیں فلسطین، عراق، افغانستان، بنگلہ دیش اوردیگر وہ ممالک جہاں مسلمانوں پر صرف اس بنا پر ظلم ڈھایا جارہا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں،جو اپنی بقااور وجود کی جدو جہد کررہے ہیں یا اسلامی تشخص کے فروغ میں مصروف عمل ہیں۔ للہ تعالیٰ ان سب کا حامی ومددگار ہواور ان کو دنیا ہی میں وہ کامیابی عطا کردے جس کے بعد ان کا ہر غم ہلکا ہوجائے اور چہار سو امن وامان اور سکون میسر آجائے۔ساتھ ہی ملت اسلامیہ

کے وہ تمام لوگ جو کہیں بھی اور کسی بھی ملک میں للہ کے دین کے قیام کی جدو جہد میں مصروفِ عمل ہیں اور باطل قوتیں ان کی سرکوبی میں لگی ہوئی ہیں، ایسے تمام لوگوں کے لیے بھی ہماری دعا ہے کہ للہ تعالیٰ ان کی سعی و جہد کو قبول فرمائے، ان کے درجات دنیا وآخرت میں بلند کردے اور وہ فتح نصیب کرے جس کا وعدہ اُس نے اپنے نیک بندوں سے کیا ہے۔ للہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ وقت جلد آئے جب کہ اسلام کو غلبہ عطا ہو اور للہ کی زمین پر للہ کی کبریائی بیان کی جائے۔ للہ اکبر للہ اکبر لا الہ الا للہ وللہ اکبر للہ اکبر وللہ الحمد۔

! قیام عدل کے لیے احتجاج و مظاہرے

مہذب معاشرے کا ظلم وزیادتی کے خلاف آواز بلند کرنا ہمیشہ سے ایک پسندیدہ عمل سمجھا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آفاقی قوانین اور رائج الوقت قوانین میں یہ پرامن مظاہرے بنیادی حقوق میں شامل ہیں جس کو کسی صورت چیلینج نہیں کیا جا سکتا ۔احتجاج دراصل بالا دست یا کسی خاص گروہ یا فرد کی کسی ناپسندیدہ بات یا عمل کے خلاف تقریراً، تحریراًرائج الوقت طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے اپنے غم و غصہ کا اظہار ہے۔جو درحقیقت زماں و مکاں کی قیود سے مبراہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں ہوتے رہے ہیں تاکہ ظلم وزیادتی اورجبر واستحصال کا خاتمہ ہواور عوام الناس امن وسکون کے ساتھ اپنے شب و روزکے معاملات مکمل کر سکیں۔اس کے برخلاف جن لوگوں نے بھی پرامن احتجاج و مظاہروں کو روکنے اور ختم کرنے کے لیے قولی یا عملی مثالیں قائم کیں وہ تاریخ میں جابر اور متشدد کہلائے۔پھر اس عمل سے نہ صرف انھوں نے اپنے ظلم کی داستانیں لکھیں بلکہ معاشرے کو بھی طوائف الملوکی کے حوالے کردیا۔نتیجہ میں ظلم بڑھتا گیااور انسانوں کی بیش قیمت جانوں کی قدر باقی نہ رہی اورظالم امن پسند تو مظلوم موردالزام ٹھہرائے جانے لگے۔معاملہ آگے.بڑھا تو ظلم و زیادتی کی تعریف ہی تبدیل کردی گئی۔نہ صرف تبدیل کردی گئی بلکہ اب اپنی پسند اور ناپسند نیز اپنے فائدے اور نقصان کو

پیش نظر رکھتے ہوئے عملی اقدامات کیے جانے لگے۔آج ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں جہاں بہت ہی شد و مد کے ساتھ ظلم کو زبان و قلم سے تو ظلم کہنے کی کچھ جرات بظاہر کی جاتی ہے لیکن عمل کے میدان اُس سے یکسر مختلف ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج نہ ظالم لوگوں کی گرفت کی جاتی ہے، نہ ان پر روک لگائی جاتی ہے، نہ ان کے خلاف کوئی اقدام کیا جاتا ہے، نہ ان کی جڑ کمزور کی جاتی ہے اور نہ ہی ان سے لا تعلق ہوا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ سب تعلقات اور معاملات جاری رہتے ہیں جو قبل از مسلۂ تھے۔

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ایک واقعہ یاد دلاتا ہے ،فرمایا: "یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتے داروں کے ساتھ ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوۃ دینا، مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔ پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانہ اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔ مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو، اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو، ظلم وزیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو، اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے

تمہارے پاس آتے ہیں، تو ان کی رہائی کے لیے فدیہ کالین دین کرتے ہو، حالانکہ انہیں ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا، تو کیا تم کتاب کیایک حصّے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصّے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے، جو تم کر رہے ہو۔۔۔۔ یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے آخرت بیچ کر دنیا کی زندگی خرید لی ہے، للہذا نہ اِن کی سزا میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ انہیں کوئی مدد پہنچ سکے گی" (البقرہ: ۸۴-۸۶)۔اس پورے واقعہ میں توجہ دلائی گئی ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخوبی واقف ہے۔ لہٰذا اگر تم آخرت پر ذرا بھی یقین رکھتے ہو تو اپنے شب و روز کے معاملات میں تبدیلی لے آؤ۔ ورنہ وہ وقت دور نہیں جبکہ تمہارے اعمال کا حساب کر دیا جائے گا۔

: مظاہرے اور احتجاج کا عقلی جواز

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانون کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی" (المائدہ: ۳۲)۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا

منحصر ہے اس پر کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقاء و تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیاتِ انسانی کے احترام سے اور ہمدردیِ نوع کے جذبہ سے خالی ہے، لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے، کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افرادِ انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے، کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقاء کا انحصار ہے۔ یہ وہ عقلی جواز ہے جو ہر مرحلہ میں قیام عدل و انصاف کے لیے جمع ہونے والوں کو حوصلہ فراہم کرتا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دو نہیں بلکہ متعدد مقامات پر قرآن حکیم میں قیام عدل و انصاف کی بات کہی ہے اور لوگوں کو آگاہ کیا ہے کہ وہ ظلم و زیادتی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو ممکن ہے کہ وہ بھی آنے والی تباہی اور اللہ کے غضب میں مبتلا ہو جائیں۔فرمایا: "جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو خلق خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے کے لیے اٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دو" (آل عمران: ۲۱)۔ یہ طنزیہ اندازِ بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جن کرتوتوں

پر وہ آج بہت خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت خوب کام کر رہے ہیں، انہیں بتا دو کہ تمہارے ان اعمال کا انجام یہ ہے۔مزید فرمایا: "رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے" (النساء: ۹۳)۔یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں بھی جلد یا دیر ذیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں تو ان کے لیے عذاب عظیم تیار ہی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے جو کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ (یعنی عملی جدوجہد) سے روکنے کی کوشش کرے اور اگر ایسا نہ کرسکے تو اپنی زبان سے (تنقید و مذمت کے ذریعے) روکے اور اگر اپنی زبان سے بھی روکنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو (کم از کم اس برائی کو) اپنے دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کم زور ترین درجہ ہے"۔قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم کا ناپسند کرتا ہے اور ان لوگوں کی مدد فرماتا ہے جو ظلم و زیادتی کے خلاف سعی و جہد کرنے والے ہیں۔چونکہ ظلم وزیادتی کو دیکھنا اور اس پر خاموش تماشائی بنے رہنا اپنے آپ میں ظلم ہے۔لہٰذا یہ وہ جواز ہے جو کسی بھی طرح کے ظلم وزیادتی کے خلاف اٹھنے والی آواز کو تقویت فراہم کرتا ہے۔اس کے برخلاف ایمان کا باقی رہنا ہی مشکوک ہوجاتا ہے۔ موجودہ حالات کے تناظر میں چاہیے کہ ہم اپنے معاملات، احساسات، جذبات، خیالات اور فکر و نظر

کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہم موجود ظلم وزیادتی اور جبر واستحصال کے خلاف کیا کچھ کر رہے ہیں؟

: تعصب سے پاک سعی و جہد کا آغاز

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" (آل عمران: ۱۱۰)۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ گروہ کہاں پایا جاتا ہے؟ کیا کسی خاص علاقہ یا مقام پر یا ہر وہ شخص اس گروہ کا حصہ ہے جو نیکوں کے فروغ اور برائیوں کے ازالہ کے لیے کوشاں ہے؟ سوال کے جواب میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ گروہ آفاقی ہے اور ہر وہ شخص اس کا حصہ ہے جو اسلامی تعلیمات کے فروغ میں مصروفِ عمل ہے۔ لہٰذا یہ بات ذہنی عیاشی اور غیر منطقی موشگافیوں کے ماسوا اور کچھ نہیں کہ واضح طور پر اسلامی خطوط پر گامزن افراد اور جماعتوں کو تقسیم کیا جائے، ان کے کاموں میں تعاون نہ کیا جائے، ان سے دوری اور علیحدگی اختیار کی جائے اور ملت جو پہلے ہی مختلف فرقوں میں تقسیم ہے اس کو مزید تقسیم کرنے کے ہم درپے ہوں۔ مسلمان تو وہ ہے جو ہر اس آواز پر لبیک کہنے کو تیار ہے جو ظلم وزیادتی کے خلاف اٹھنے والی ہو، مظلوموں کو ان کا حق دلانے والی ہو، استحصال جو چار سو بڑھتا ہی جا رہا ہے اس کے خاتمہ میں ہمہ تن مصروف عمل

ہو۔اس کی واضح مثال وہ بڑا معاہدہ ہے جس میں طے ہوا کہ "ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا" اور اس معاہدے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک تھے، یہ معاہدہ سیرت میں حلف الفضول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ پاک و صاف شبیہ رکھنے والے ہر فرد اور گروہ کا ساتھ دیں جو قیام عدل کے لیے مصروف ہے۔ لیکن اگر ہم فرقوں اور گرہوں میں تقسیم ہوئے،ظالم کے ہاتھ کو پکڑنے کی کوشش نہ کی،اتحاد و اتفاق کو برقرار نہ رکھا اور امن و امان اور قیام عدل کے لیے کوشاں افراد، گروہ اور جماعتوں کا نہ خود ساتھ دیا بلکہ روکا بھی تو خدا کی قسم ایسے لوگ انتشار پھیلانے والوں میں شمار کیے جائیں گے۔ ضرورت ہے کہ ہر طرح کے تعصب سے پاک ہو کر قیام عدل کی کوششوں میں ہم بھی سرگرم عمل ہو جائیں۔تب ہی ممکن ہے کہ ہم ان متعصب لوگوں میں شمار نہ کیے جائیں جو انسانوں کی نظروں میں حقیر اور اللہ کی نظر میں ذلیل و خوار ہونے والے ہیں۔

فرقہ وارانہ ماحول اور حل کی ممکنہ تدابیر

آسام کے وزیر اعلیٰ ترون گگوئی نے کہا ہے کہ جنوبی آسام کے سلچر کے ایک ہندو مندر کو کل ناپاک کرنے کے پس پشت وشو ہندو پریشد کا ہاتھ ہے۔ اس نے لوگوں کو تشدد کے لیے اکسایا۔ مسٹر گگوئی نے ایک پریس کانفرس میں بتایا کہ سلچر میں واردات کے پیچھے وی ایچ پی ہے۔ رونگپور علاقے میں تین مندروں میں جانوروں کا گوشت پائے جانے کے بعد سلچر میں کشید گی ہے۔ پولیس نے مندر کو ناپاک کرنے کی اطلاع کے بعد جمع ہوئے لوگوں کو ہٹانے کے لیے ہوائی فائرنگ کی۔ دفعہ 144 کے تحت سلچر میں حکم امتناعی نافذ کرنے کی ہدایت دی اور کسی بھی طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے بھاری سیکورٹی فورس کو تعینات کر دیا۔ مسٹر گگوئی نے کہا کہ ریاستی حکومت کو اطلاع ملی ہے کہ وی ایچ پی ریاست میں سماجی ہم آہنگی کو بگاڑنے کی کوشش کر رہی ہے اور سلچر کی واردات کے لیے بھی وہی ذمہ دار ہے۔ ریاست میں الیکشن میں ٹکٹ کے بعد مبینہ طور پر بی جے پی ، وی ایچ پی کے ساتھ سازش کرکے سماجی تناؤ پیدا کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ایودھیا پریکرما بھی سیاسی فائدہ لینے کی ہی ایک کوشش ہے۔انہوں نے کہا کہ ضلع انتظامیہ کو سبھی تخریب کار اور فرقہ پرست طاقتوں سے مضبوطی سے نمٹنے کی ہدایت دے دی گئی ہے خواہ وہ کسی بھی تنظیم یا گروپ کے ہوں۔ وہیں این ڈی ٹی وی ویب سائٹ کے مطابق

علاقہ میں تشدد کے دوران پچاس افراد زخمی ہوئے ہیں جن میں بیس پولیس اہلکار بھی شامل ہیں۔ واقعہ کے پس منظر میں گزشتہ سال آسام کے کوکراجھر کے فسادات کو بھی یاد کر لینا چاہیے جہاں کثیر تعداد میں انسانی جانیں لاحق ہوئیں ،بڑے پیمانہ پر لوگوں کے گھر اجاڑے گئے ،عبادت گاہوں کو مسمار کیا گیا اور یہ سلسلہ ایک طویل مدت چلتا رہا یہاں تک کہ اہل ملک اور دیگر ممالک نے اس جانی و مالی نقصان کا نوٹس لیا۔ صوبہ کا مزید مطالعہ جس کو اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یو این ڈی پی نے کیا ، کی روشنی میں ہندوستانی ریاستیں گجرات ، یوپی ، مغربی بنگال اور آسام کے دیہی علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں میں غربت کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ سروے میں مذہب کی بنیاد پر بھی معلومات یکجا کی گئیں جہاں یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ آسام کے شہری علاقوں میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مسلمانوں میں سب سے زیادہ غربت ہے جبکہ سب سے کم غربت عیسائیوں میں ہے۔ اب جبکہ حالیہ واقعہ پر فوری گرفت حاصل کر لی نیز شر پسندوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ فوری گرفت اُس وقت کیوں نہیں کی گئی جبکہ کوکراجھار فسادات کے نتیجہ میں ایک مخصوص فرقہ کے لوگ خوف و ہراس میں مبتلا تھے اور انسانی جانیں لگاتار ہلاک ہو رہی تھیں ؟

دوسرا واقعہ اترپردیش سے ہے۔ واقعہ چوراسی کوسی پریکرما پر روک کا ہے جہاں ریاستی حکومت نے نظم و نسق برقرار رکھنے اور کسی بھی طرح کے تشدد پھیلنے

جیسے واقعات سے بچنے کے لیے مکمل مستعدی کا اظہار کرتے ہوئے اجودھیا کی جانب جانے والے تمام 42 راستوں کو سیل کر دیا، گاڑیوں کی چیکنگ کی، سنتوں کو گرفتار کر لیا، ملحق ریاستوں کی سرحدوں پر چوکسی بڑھا دی، پریکرما کے مد نظر اجودھیا کو پوری طرح چھاؤنی میں تبدیل کر دیا، چپے چپے پر خفیہ میکنزم اور پولس اہلکاروں کی تعیناتی کی گئی۔ ضلع انتظامیہ نے اشوک سنگھل، پروین توگڑیا، چمپت رائے، ڈاکٹر ولاس داس ویدانتی اور سوامی چنمیا نند سمیت 300 لوگوں کا گرفتاری وارنٹ تیار کیا۔ عارضی جیلیں بنائی گئیں نیز کئی اضلاع میں سنتوں کو ان کے آشرم میں ہی نظر بند کر دیا۔ بعد میں سرگرم لیڈران کو گرفتار کیا گیا اور ان تمام امور پر عمل درآمد ہوا جو طے کیے گئے تھے۔ اس موقع پر بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ وہی ریاست اور وہی حکومت ہے جس کے دور اقتدار میں اب تک چھوٹے بڑے تقریباً چالیس فسادات ہو چکے ہیں جن میں نو بڑے فسادات: کوسی کلاں، بریلی، کانپور، الہ آباد، پرتاپ گڑھ اور دیگر شامل ہیں۔ واقعہ کی روشنی میں ان سارے فسادات کو منصوبہ بند کہا جانا چاہیے جسے حکومت کی جانب سے مسلمانوں کے لیے تحفہ کہا جائے تو بھی بجا نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں نے مارچ 2012 میں اختتام پذیر اترپردیش اسمبلی انتخابات میں بڑھ چڑھ کر سماج وادی پارٹی کو ان کے کیے گئے وعدوں کے پیش نظر ووٹ دیا اور توقع کی کہ یہ حکومت مسلمانوں کے لیے کسی حد تک بہتر ثابت ہوگی۔ بار بار کبھی پارٹی نمائندگان کے ذریعہ تو کبھی دیگر ذرائع سے یہ بات

سامنے آئی کہ مسلم مخالف فسادات کا نہ رکنا اورافسران کا بے لگام ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ سماج وادی پارٹی کا افسران پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔اُس میں کتنی سچائی تھی ہم نہیں جانتے لیکن سوال یہاں کھڑا ہوتا ہے جبکہ ایک منظم کوشش "چوراسی کوسی پریکرما" کو ناکام بنانے کے لیے ریاستی حکومت نے لائحہ عمل تیار کیا اور وہ کامیاب ہو گئی۔پولیس وہی، افسران وہی اور انتظامیہ بھی وہی۔پھر یہ سب کیسے کنٹرول ہوا جو پہلے متعدد مقامات نہ ہو سکا تھا؟یہ کوشش تو بڑی منظم تھی جسے پورا ملک دیکھ رہا تھا لیکن سابقہ کوششیں تو اتنی منظم بھی نہیں تھیں!

مسائل میں کسی حد تک ہمارا رویہ بھی شامل ہے:

معاملہ یہ ہے کہ یورپ کے انڈسٹریلائیزیشن سے لے کر آج تک معاش کی تلاش میں انسان کی حیثیت مشینوں کے ایک پارٹ سے زیادہ کچھ نہیں رہی۔جب تک وہ پارٹ اپنے کام کو بہتر انداز میں ادا کرتا ہے تب تک وہ قابل ستائش، نہیں تو ٹھیک اسی طرح ان کارخانوں اور انڈسٹریز میں لگی مشینوں کے بے کار پارٹ سے تبدیل کر دیا جاتا ہے جیسے کہ ایک ناکارہ اور بے جان شے ء۔حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک طویل عرصہ سے تعلیم کا مقصد بچوں کو صرف انجینئر بنانا رہا ہے۔وجہ یہ کہ تلاش معاش میں آسانی ہوتی ہے نیز معاشرے میں "رائج عزت "میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ آج کے انجینئرس اُس نظام کا حصہ ہیں جہاں

ان کی شناخت بحیثیت انسان نہ ہو کر ایک مشینی روبوٹ سے زیادہ کچھ نہیں۔ پھر جس تیزی سے ہمارے ملک میں ملٹی نیشنل کمپنیاں آئیں اور آرہی ہیں نیز دیگر ممالک کی کمپنیوں کی ضرورتیں پوری کرنے جیسی خدمات انجام دی جارہی ہیں، ان کی ضرورتیں اور ٹائمنگ کے نتیجہ میں معاشرہ سے ہمارا تعلق کم سے کمتر ہوتا جارہا ہے۔ وہیں دوسری جانب انٹرنیٹ کی آمد اور اس کے پھیلاؤ نے ایک ورچول ورلڈ (غیر حقیقی دنیا) قائم کی جس میں آج ہر شخص منہمک اور سرگرداں ہے۔ معلوم نہیں یہ وقت اور صلاحیتوں کا، زیاں ہے یا دور جدید کے ترقی یافتہ انسان کی شناخت، یہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اِسی انٹرنیٹ اور سوشل نیٹ ورکنگ نے حالیہ دنوں میں بڑی کرامت خیزیاں برپا کی ہیں۔ ایک جانب سوشل نیٹ ورکنگ نے چھوٹے بڑے انقلابات " عرب بہار" میں نمایاں کردار ادا کیا ہے تو وہیں دوسری جانب بہت ہی طاقتور اور ذاتی مفاد میں مبتلا میڈیا پر بھی شکنجہ کسنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ نتیجتاً ہر سطح کے افراد آج انٹرنیٹ اور سوشل نیٹ ورکنگ کی گرفت میں ہیں۔ فوائد کے باوجود یہی انٹرنیٹ اور سوشل نیٹ ورکنگ ہے جس نے معاشرے سے انسان کے تعلق کو بہت محدود کر دیا ہے۔ پھر آرام و آسائش میں اضافہ، محدود تعلقات اور معاشرتی مسائل سے کنارہ کشی، ہی وہ اسباب بنے جنھوں نے بے شمار نئے مسائل کو جنم دیا۔ متذکرہ دو واقعات نے ہمارے وقت کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ آج ہمارے پاس جدید مسائل کے حل کے لیے نہ غور و فکر کا وقت ہے اور نہ ہی اس کے خاتمہ کا عزم۔ ظاہر ہے کہ

معاشرہ اور معاشرہ میں پائے جانے والے رویوں سے حکومتیں بھی واقف ہیں۔اس ہی لیے وہ جب چاہتی ہیں مسائل پر جلد قابو پالیتی ہیں اور جب چاہتی ہیں نظر انداز کرتی ہیں۔کیونکہ وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ معاشرہ کن لغویات میں مبتلا ہے۔انھیں یہ بھی معلوم ہے یہ معاشرہ آج ان افراد پر مشتمل ہے جو کسی بھی بڑے سے بڑے مسلۂ کا حل صرف ایک یا چند دنوں پر مشتمل مظاہرہ سمجھتا ہے،انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ مسلۂ حل ہوتا ہے یا نہیں بلکہ بعض اوقات یہی مظاہرے ان کی تشہیر وترقی کا ذریعہ بنتے ہیں اور مظاہرین بس اسی کامیابی پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔تو پھر کیا غرض ہے کہ حکومت یا حکومت کے کارندے کسی بھی مسلۂ پر سنجیدگی اختیار کریں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ وقت، حالات اور نفع و نقصان کے پیش نظر جمع گھٹائی جاتی ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ آسام اور اترپردیش کے حالیہ واقعات اور اس کے کنٹرول کرنے کا رہاہے۔ضرورت ہے کہ ہم اپنے رویوں میں تبدیلی لائیں۔جزوقتی مسائل اور جز وقتی حل پر مطمئن نہ ہوں۔بلکہ جس مسلۂ سے بھی وابستہ ہوں اس کے اختتام تک سعی و جہد کرنے کا عزم لے کر اٹھیں۔تب ہی ممکن ہے کہ ملک اور اہل ملک ترقی اور خوشحالی کی جانب گامزن ہو سکیں گے۔

کرنے کے کام:

جزوقتی مسائل اور ان کے حل کے لیے پہلی اور لازمی بات قرآن حکیم کا وہ اصول

اور قاعدہ ہے جس میں فرمایا: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو" (الحجرات: ۶)۔ دوسری بات اسلامی معاشرے میں عدل و انصاف اور مساوات کی ہے۔ معاشرے میں رہنے والے تمام انسانوں کی جان و مال قابل احترام ہے۔ قرآن اور احادیث کے مطابق رنگ، نسل، خاندان، مذہب کے لحاظ سے کوئی کسی سے کم تر نہیں۔ بحیثیت انسان سب کے حقوق برابر ہیں۔ آزاد، غلام، مرد و عورت، امیر و غریب، چھوٹا بڑا سب برابر ہیں۔ مجرم کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو اس کو سزا ملنی چاہئے، سوائے اس کے کہ مظلوم خود اپنی مرضی سے ظالم کو معاف کر دے۔ موجودہ حالات اور آئندہ آنے والے دنوں میں محسوس ہوتا ہے کہ ملک عزیز میں شر پسند عناصر مزید کوشش کریں گے کہ ماحول خراب ہو، فرقہ وارانہ تصادم میں مزید اضافہ ہو، کمزوروں اور مظلوموں پر اور ظلم ڈھایا جائے، امن و آشتی کے ماحول کو مکدر کیا جائے نیز ان جیسے دیگر مقاصد کے حصول کے لیے مزید کوششیں کی جائیں۔ ان حالات میں قرآنی تعلیمات اور امن و امان کی خاطر مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ کہیں بھی اور کسی بھی معاملے میں جہاں ان کو بھڑکانے اور اکسانے کی کوششیں کی جا رہی ہوں، اپنے حواس اور جذبات کو کنٹرول میں رکھیں، معاملہ کی خوب اچھی طرح تحقیق کر لیں، حکومتی سطح پر جو ادارے مسائل کے حل کے لیے موجود ہیں ان کو استعمال کریں، ایک مخصوص منفی جذبہ سے سرشار گروہ سے نفرت کے نتیجہ میں دیگر امن پسند عوام سے دوری نہ اختیار کریں بلکہ ان سے قربت اختیار

کریں، قربت کا لازمی تقاضہ ہے کہ دلوں میں کدورت نہ ہو، لوگوں کے کام آئیں، ان کے حق میں دعائے خیر کریں، ساتھ ہی مقامی و علاقائی سطح پر ایسے پلیٹ فارم تیار کریں جہاں لوگوں میں برائی اور شر انگیزی کے بالمقابل امن و امان قائم کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہو۔

جز وقتی مسائل اور ان کے جز وقتی حل کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ مسائل کے حتمی حل کے لیے کوشاں ہوں۔اس کے لیے لازم ہے کہ جن دو رویوں کا تذکرہ کیا گیا۔یعنی تعلیم کا معاشی نظریہ اور وقت اور صلاحیتوں کا غیر مناسب استعمال جس میں معاشرہ سے لا تعلقی خود ایک بڑا مسلئہ بنتا جا رہا ہے اس پر قابو پایا جائے۔ تعلیم کے معاشی نظریہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف اور صرف بہتر معاش کا حصول ہی نہ رہے بلکہ تعلیم سے انسان میں جو تبدیلیاں مقصود ہیں وہ بھی پیش نظر ہوں۔ساتھ ہی اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے عصری تعلیم کے ان سبجیکٹس کو بھی اختیار کیا جائے جو انسان کو ایک مشین نما روبوٹ نہیں بلکہ معاشرہ سے راست تعلق قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔یہ وہ سبجیکٹس ہیں جو معاشرتی مسائل کو ایڈریس کرتے ہیں، معاشرہ میں اور حکومتی اداروں میں ان مقامات پر لے جانے کا ذریعہ بنتے ہیں جہاں عہدے مسائل کے حل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔مطلب صاف ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی اور پروفیشنل علوم کے علاوہ آرٹس، سوشل سائنس اور زبان و ادب پر

بھی توجہ دی جائے تاکہ فرد معاشرتی مسائل سے آگاہی کے علاوہ راست تعلق بھی قائم کر سکے۔ پھر ان خدمات کی انجام دہی میں نہ صرف غور و فکر کرے بلکہ ذاتی کردار بھی ادا کر سکے۔ لازم ہے کہ سب سے پہلے ہماری فکر اور نظریہ تبدیل ہو۔ اور اس تبدیلی فکر سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ سائنس و ٹیکنالوجی اور پروفیشنل علوم سے لا تعلق ہوا جائے بلکہ اگر ایک گھر میں دو بچے ہوں تو سائنس و ٹیکنالوجی اور آرٹس اور سوشل سائنس کے نسبت کو برقرار رکھا جائے۔ ممکن ہے اس طرح مسائل پر قابو پایا جا سکے گا جبکہ ان علوم کے حصول، اس میں انفرادیت، مہارت اور بلندی کے ساتھ ساتھ اخلاق حسنہ سے بھی فرد اپنی ایک خاص پہچان بنا چکا ہوگا۔ کیونکہ اخلاق حسنہ سے مبرا کوئی علم کسی بھی زمانے میں نفع بخش نہیں ہو سکتا!

!آشاآستھاشردھا: سب پامال ہوئی

انسان کے فکر و قلب میں یہ عقیدہ ہر لمحہ جاگزیں ہے کہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کا وجود ہے بلکہ اس نے ابلیس اور اس کے ساتھیوں کے پھیلائے شر کے خلاف رسولوں کے سلسلے کو بھی جاری کیا۔ اللہ کی تعلیمات کو انسانوں تک پہنچانے کا ذریعہ رسول بنے۔اور رسولوں تک معزز ملائکہ نے اللہ کی تعلیمات پہنچانے کی اہم ذمہ داری انجام دی۔ آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جس معزز فرشتہ نے اللہ کی تعلیمات پہنچائیں ان کا نام حضرت جبریل ہے۔جبریلؑ نے اللہ کے اذن سے محمدؐ تک تک جو تعلیمات پہنچائیں یہ وہی ہدایات اور احکامات ہیں جسے عام لفظوں میں قرآن کہا گیا۔اس طرح یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے اللہ ہے،اس نے اپنے کاموں کی انجام دہی کے لیے ملائکہ بنائے،رسولوں تک معزز ملائکہ اللہ کی ہدایات پہنچانے کا ذریعہ بنے،چند رسولوں پر اللہ کی تعلیمات کتاب کی شکل میں نازل ہوئیں،اورہدایت و رہنمائی کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے آخری کتاب جو آج دنیا میں موجود ہے اس کا نام قرآن ہے۔لہٰذا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اللہ،ملائکہ،کتاب،رسول، آخرت ، تقدیر اورابدی زندگی پر ایمان لایا جانا ناگزیر ہے،کیونکہ قرآنی تعلیمات ٹھیک اُسی طرح آج بھی موجود ہیں جس طرح وہ اپنے نزول کے وقت سنی،پڑھی اور لکھی گئیں تھیں۔اور اس لیے بھی کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری رب العالمین نے

خود اپنے ذمہ لے لی ہے۔لہٰذا یہ وہ عقیدہ ہے جس کو سب سے مضبوط بنیادوں پر استحکام حاصل ہے۔اس کے برخلاف رائج دیگر خدائی تعلیمات میں یہود و نصاریٰ کے عقائد ہیں جو درحقیقت خلط ملط ہو چکے ہیں، نہ انھیں آج کوئی مضبوط بنیاد ددرکار ہے اور نہ ہی استحکام۔ان دو عقائد کے برخلاف ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو قیاس پر مبنی خدائی تعلیمات کا دعویٰ کرتا ہے یہ سب سے کمزور عقیدہ رکھنے والوں کا گروہ ہے۔دوسرے لفظو میں یہ وہ افراد ہیں جن کا درحقیقت کوئی عقیدہ ہی نہیں،وقت حالات واقعات اور ذاتی فوائد و نقصانات کے تحت یہ عقائد مسلسل اور لگاتار تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔اور آخری گروہ ان افراد پر مشتمل ہے جو متذکرہ تین گرہوں کے عقائد کا سرے سے ہی انکار کرتا ہے۔اس گروہ کا بھی تیسرے گروہ کی طرح کوئی وجود نہیں،لیکن دنیاکے مختلف مقامات پر وسائل پر قابض ہونے کے نتیجہ میں ان کا خیال بھی کسی حدتک ایک عقیدہ کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ایسے لوگوں کو ملحد،ناستک atheist یا free-thinkerکے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

:معزز و معتبر ہونے کا ڈھونگ

قیاسات پر مبنی خدائی تعلیمات کے دعویدارایک جانب اپنے ناپاک عزائم کو برسرپیکار لانے کی منظم سعی و جہد کرتے ہیں تو وہیں دوسری جانب ان کے پاکھنڈ کا شکار ہونے والے بنا غور وفکر،بلا تحقیق صحیح و غلط کی تمیز کیے

بغیر جب شخصیات کو معزز و معتبر گردانتے ہیں تو کبھی دیر یا جلد جب حقیقت ان پر آشکارا ہوتی ہے،ایسی صورت میں ان بھکتوں اور عقیدت مندوں کو بڑی ٹھیس پہنچتی ہے ۔اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے افراد نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو کر عام لوگوں پر و دیگر مذہبی رہنماؤں پر اعتماد کھو بیٹھتے ہیں۔یہاں تک کہ بعض اوقات وہ مذہب سے بھی نالاں ہو جاتے ہیں۔پھر جس عقیدت اور اندھی تقلید میں وہ سرگرداں تھے مخصوص واقعہ یا واقعات کے نتیجہ میں مخصوص پیر یا سنت کے فکر و اعمال سے اعلان برات کرتے ہیں۔وجہ یہ ہے ان کی آنکھ پر بندھی عقیدت کی اندھی پٹی کھل چکی ہوتی ہے۔کچھ ایسا ہی واقعہ حالیہ دنوں ہندوستان میں ایک معزز و معتبر سمجھے جانے والے بابا،آسا رام اور ان کے بھکت کے ساتھ ہوا۔معاملہ آبرو ریزی کی شکار 16 سالہ نابالغ لڑکی کا ہے جس کے والد،والدہ،بھائی اور خود وہ متاثرہ سنت آسارام باپو کو خدا مان کر اُن کی لگن میں پاگل تھے۔واقعہ یہ ہے کہ اُسی متاثرہ لڑکی کے والد نے واقعہ سے قبل شاہجہاں پور میں آشرم کے لیے زمین خریدوائی۔لاکھوں روپے باپو کی خدمت میں خرچ کیے لیکن اندھی عقیدت میں انہیں سنت کے اندر بیٹھا راکشس کبھی دکھائی نہیں دیا۔بیٹی کے ساتھ آبرو ریزی واقعہ گزرنے کے باوجود والد کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ "ان کا خدا" ایسا بھی کر سکتا ہے۔لیکن جب بیٹی کو اعتماد میں لے کر پوچھا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار چھوٹ پڑی۔بولی باپو،باپو نہیں بہروپیا ہے،راکشس ہے۔

اس موقع پر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ باپو کون ہیں؟آسارام کا اصل نام آسومل سروملائی ہے۔پاکستان کے سندھ میں پیدا ہونے والے 72 سالہ آسارام نے اپنے 37 سال کے سنت کیریر کی سلطنت میں دنیا بھر میں 425آشرم اور50 سے زیادہ گروکل، ویدانت کمیٹیاں،17000 بال سنسکار مراکز اور ہیں۔باپو کی جائداد کا مجموعی 1400 طور پر 8000 کروڑ روپے کا تخمینہ لگایا جارہا ہے۔بچپن سے مذہبی رجحان رکھنے والے آسومل (آسارام) نے ماں کے کہنے پر لکشمی دیوی سے شادی بھی کی لیکن بعد میں میں گھر چھوڑ کر نینی تال میں سوامی لیلا شاہ باپو مہاراج کے آشرم میں چلے 1968 گئے۔گرو لیلا شاہ جلد ہی ان کی حرکتوں کو پہنچان گئے اور آشرم آنے پر پابندی لگادی،اس کے باوجود ایک بار آسارام آشرم آئے اور پھر اس گرو نے آشرم سے باہر نکال دیا۔اس کے بعد آسومل گجرات کے احمد آباد آئے اور وہاں سابرمتی ندی کے کنارے موئیرا گاؤں میں 1971 میں پہلا آشرم کھولا اور پروچن دینے شروع کیا۔ میں گجرات کے بیجاپور میں آسارام پر ایک شخص کے قتل کا الزام بھی لگا۔بیجاپور 1959 کے سابق گارڈر جکت بھائی کا کہنا ہے کہ 1959 میں آسومل شراب کا کاروبار کرتے تھے اور ایک دن زیادہ شراب پینے کی وجہ سے پرشورام نام کے ایک شخص کے ساتھ مل کر ایک دیگر شخص کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔2000ء میں گجرات کے ضلع نوساری کے بھیروی گاؤں میں آشرم کی زمین ہڑپ لینے کا الزام لگا اور اس کے اگلے ہی سال 2001 میں مدھیہ

پردیش کے رتلام میں آشرم کے لیے دی گئی ساتھ ہی تقریباً700 ایکڑ زمین بھی غصب کرنے کا الزام ہے۔2008 میں گجرات آشرم میں دو طلباء کے قتل کے الزام نے کافی طول پکڑا۔ نیز آسارام کے خلاف صرف احمد آباد میں ہی 16 مقدمے درج ہیں۔آسارام کے پرانے ساتھی امرت نے بھی الزام لگایا ہے کہ آسارام کئی لڑکیوں کے ساتھ ایسی حرکتیں کرچکا ہے اور ایک لڑکی کا تو قتل بھی ہوچکا ہے۔آسارام کے قریبی راجو چانڈک نے بھی کہا ہے کہ اُس نے آسارام کو راجستھان میں ایک خاتون کے ساستھ جنسی تعلق قائم کرتے دیکھ لیا تھا جس کی وجہ سے اسے آسارام سے نفرت ہوگئی۔حالیہ معاملہ میں بھی آسارام کے سیوادار شوانے ابتدائی پوچھ گچھ کے دوران پولیس کو بتایا ہے کہ وہ کئی عورتوں سے اکیلے ملتے تھے۔دوسری طرف آسارام کو 14 ستمبر تک جیل ہوچکی ہے لیکن قانونی چارہ جوئی جاری ہے۔اس بیچ جودھپور پولیس کو آسارام کی گرفتاری پر دھمکیاں بھی ملیں نیز ڈی سی پی اجے لانبا کو دھمکی بھرے فیکس بھیجے گئے۔ساتھ ہی معاملہ دبانے کے لیے آسارام کے حامیوں نے رشوت کی بھی پیشکش کی۔سرکاری وکیل آنند پروہت نے بدھ کی صبح آسارام کی ضمانت کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اگر آسارام کو ضمانت پر رہا کیا جاتا ہے تو وہ معاملے کو متاثر کر سکتے ہیں۔وہیں آسارام کے حامیوں نے متاثرہ کے کنبے کے رشتے داروں پر دباؤ بنانا شروع کر دیا ہے۔لڑکی کے والد نے بتایا کہ دہلی میں ان کی سسرال میں بھی آسارام کے کچھ لوگ پہنچ گئے اور انھوں نے ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ لڑکی کے والد کو سمجھائیں کہ وہ

سی بی آئی جانچ کی رٹ نہ لگائیں۔ منھ بند نہیں کیا تو سات پشتوں کو بھگتنا پڑے گا۔ متاثرہ کے والد نے کہا کہ ان کے سبھی رشتے دار بہت ڈرے ہوئے ہیں اور انہیں اپنی جان کی فکر ستا رہی ہے۔ متاثرہ کے والد نے یہ بھی بتایا کہ آسارام کی جانب سے انہیں پیسوں کی بھی پیشکش کی گئی ہے۔اور یہ وہی آسارام ہیں جن کے خلاف تعزیرات ہند کی دفعہ 376،342،506 اور 509، پریونشن آف چلڈرین فرام سیکسول آفینسز ایکٹ (پی او سی ایس او) کے دفعہ 8 اور جوینائل جسٹس ایکٹ کے دفعہ 23 اور 26 کے تحت الزامات عائد کیے گئے ہیں۔آسام رام باپو کو سمن جاری کرنے کے علاوہ مدھیہ پردیش کے چنڈی واڑہ گروکل کے مینجر، ہوٹل وارڈن اور آشرم کے خاص نگراں کو بھی نوٹس جاری کیے گئے ہیں، جو 15 اگست کو جودھپور کے منائی آشرم میں موجود تھے جب یہ مبینہ جنسی استحصال کا معاملہ پیش آیا تھا۔آج پرنٹ والیکٹرانک میڈیا اس موضوع پر بہت کھل کر بات کر رہا ہے۔ نیز اُس کی کوشش ہے کہ ایسے ڈھونگی سنتوں اور باباؤں سے عوام ہوشیار رہیں۔ معاملہ یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں نے نہ صرف اپنی بلکہ دیگر قیاس پر مبنی مذہبی گروؤں سے وابستہ آشا،آستھا اور شردھا سب کو پامال کر دیا ہے! اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں جب کہ عوام بری طرح مذہب اور مذہبی لوگوں کے بارے میں الجھن میں مبتلا اور کنفیوژ ہے، کون انکا پرسان حال ہوگا؟ کیا متاثرہ افراد اور ان کی تبدیلیٔ فکر سے وابستہ افراد الحاد کا شکار ہوں گے؟ یا کوئی ہے جو ان کی دنیا و آخرت کی نجات کا ذریعہ بنے گا؟

در حقیقت معزز و معتبر کون ہے؟

کہا کہ: " عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے" (النساء: ۱۳۹)۔ "عزت" کا مفہوم عربی زبان میں اردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اردو میں عزّت محض احترام اور قدر و منزلت کے معنی میں آتا ہے مگر عربی میں عزت کا مفہوم ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ عزت "نا قابلِ ہتک حرمت "کے ہم معنی ہے۔اور اللہ کے بعد قابل قدر و عزت اس کے انبیا و رسل ہیں اور اس کے بعد وہ لوگ جو قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے والے ہیں۔ کیونکہ قرآن ہی وہ سرچشمۂ علم ہے جو در حقیقت قابل اعتبار و لائق احترام ہے۔فرمایا: "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔ وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے، وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے جس روز وہ اس سے ملیں گے ان کا استقبال سلام سے ہوگااور ان کے لیے اللہ نے بڑا با عزت اجر فراہم کر رکھا ہے" (الاحزاب: ۴۴۔ ۴۲)۔ یہ ہیں وہ اعمال و انعامات جن پر عمل پیرا ہوئے بغیر نہ اس زندگی میں اور نہ ہی ابدی زندگی میں قدر و منزلت مل سکتی ہے۔مزید فرمایا: "جو کوئی عزت چاہتا ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔ اس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ صرف

پاکیزہ قول ہے، اور عمل صالح اس کو اوپر چڑھاتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو بیہودہ چال بازیاں کرتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا مکر خود ہی غارت ہونے والا ہے" (فاطر:۱۰)۔ (21)۔ قرآنی تعلیمات کے پس منظر میں جن لوگوں کا مکر غارت ہو رہا ہے اس سے آج پورا معاشرہ واقف ہے۔ اللہ کے ہاں جھوٹے اور خبیث اور مفسدانہ اقوال کو کبھی عروج نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں تو صرف وہ قول عروج پاتا ہے جو سچا ہو، پاکیزہ ہو، حقیقت پر مبنی ہو، اور جس میں نیک نیتی کے ساتھ صالح عقیدے اور صحیح طرز فکر کی ترجمانی کی گئی ہو۔ پھر جو چیز ایک پاکیزہ کلمے کو عروج کی طرف لے جاتی ہے وہ قول و عمل میں مطابقت ہے۔ جہاں قول بڑا پاکیزہ ہو مگر عمل اس کے برخلاف وہاں قول کی پاکیزگی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ محض زبان کے بڑی باتیں کرنے سے کوئی کلمہ بلند نہیں ہوتا۔ اسے عروج پر پہنچانے کے لیے عمل صالح کا زور درکار ہے۔ اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن مجید قول صالح اور عمل صالح کو لازم و ملزوم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ کوئی عمل محض اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے صالح نہیں ہو سکتا جب تک اس کی پشت پر صالحہ عقیدہ بھی نہ ہو۔ اور کوئی عقیدہ صالحہ ایسی حالت میں معتبر نہیں ہو سکتا جب تک کہ آدمی کا عمل اس کی تائید و تصدیق نہ کر رہا ہو۔ ایک شخص اگر زبان سے کہتا ہے کہ میں صرف اللہ وحدہ لاشریک کو معبود مانتا ہوں، مگر عملاً وہ غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اس کے قول کی تکذیب کر دیتا ہے۔ ایک شخص زبان سے کہتا ہے کہ

میں شراب کو حرام مانتا ہوں، مگر عملاً وہ شراب پیتا ہے تو اس کا محض قول نہ خلق کی نگاہ میں مقبول ہو سکتا ہے نہ خدا کے ہاں اسے کوئی قبولیت نصیب ہو سکتی ہے۔ مزید ہوشیار کرتے ہوئے اور جہنم کو ہولناکیوں کو یاد دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : "زقّوم کا درخت گناہ گار کا کھاجا ہوگا، تیل کی تلچھٹ جیسا، پیٹ میں اس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔ (اور کہا جائے گا) پکڑو اسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اس کو جہنم کے بیچوں بیچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔ چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تُو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے" (الدخان : ۵۰-۴۲)۔ یہ وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے عبرت ناک اور معتبر کلمات ہیں جنھوں نے خوب کھول کر واضح کر دیا ہے کہ عزت کیا ہے اور ذلت کیا ! حقیقی عزت کن لوگوں کو ملتی اور ملنے والی ہے اور کون ہیں جن کو قابل احترم سمجھنا چاہیے ۔ ساتھ ہی دنیا میں ذلیل و خوار ہونے والے کون ہیں اور وہ کون ہیں جن کا پیچھا ابدی زندگی میں بھی ذلیل و خواری سے سوا اور کچھ نہیں۔ پس ! متذکرہ واقعہ، حالات و پس منظر، متاثرہ افراد، مجرمین و ملزمین اور دیگر اہل نظر تمام لوگوں پر یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ درحقیقت آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔ اور یہ ابدی کامیابی اور قدر و منزلت اُن لوگوں سے عقیدت کے نتیجہ میں نہیں ملنے والی جو درحقیقت برائی کا سرچشمہ ہیں۔ جبکہ نہ ہی ان تعلیمات کی کوئی حیثیت اور نہ ان ہی کی کوئی حقیقت

ہے۔اور نہ ہی ان افراد اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے کامیابی ملنے والی ہے جن کو گرچہ صحیح اور واضح تعلیمات دی گئیں تھیں لیکن انھوں نے اس کا بوجھ اپنے کاندھوں پر نہیں اٹھایا اور اسی لیے وہ اللہ کی نظر میں ذیل و خوار ہوئے۔کامیابی، عزت اور نجات اگر ملے گی تو صرف اور صرف ان تعلیمات کے ذریعہ جو آج بھی بالکل ٹھیک، واضح اور اپنے اعتبار کے لحاظ سے سب سے مستحکم ہیں ۔چونکہ یہ وہ تعلیمات و ہدایاتِ ربانی ہیں جن کے ٹھیک اور محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔لہٰذا اس سے بہتر کوئی علم نہیں کہ جس پر یقین کامل ہو اور جس پر عمل پیرا ہوا جائے!

! نائن الیون منظر و پس منظر

دنیا جانتی ہے کہ نائن الیون آغاز مکمل طور پر دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے تھا۔پھر یہ نہ صرف آغاز تھا بلکہ ان لوگوں کو الگ چھانٹ کر رکھ دینے کی کسوٹی بھی تھی جو ایک طرف نائن الیون کے بہانے ایک دوسرے کی پیٹھ تھپتھپانے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے اور ایک دوسرے کو مزید مضبوط کرنے کی غرض سے منظر عام پر آئے ہیں دوسری طرف وہ لوگ بھی اسی بہانے سامنے آئے جو بظاہر ملت کے بہی خواہ ہیں لیکن درپردہ وہی ہیں جو ملت کے بد خواہ بھی ہیں۔اس پس منظر میں چند لوگ ظاہر ہو چکے اور کچھ باقی ہیں۔چند خاموش رہے اور کچھ بول اٹھے لیکن اس سب کے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی منظر عام پر آئے جو حق و انصاف کی بات کرنے والے تھے۔اور یہ وہ لوگ ہیں جو گرچہ بکھرے ہوئے ہیں، منظم نہیں ہیں اس کے باوجود وہ حق کے علمبردار ہیں انہیں اشخاص میں ایک نام "رابرٹ فسک" ہے۔جن کا صاف کہنا ہے کہ دنیا ایک بڑے مقصد کے تحت دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی غرض سے 9/11 کا واقعہ اسٹیج پلے کیا گیا۔اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان سوالوں کے جواب دیے جائیں جن سے دنیا واقف ہوا چاہتی ہے۔

معروف برطانوی صحافی رابرٹ فسک کا ایک آرٹیکل آگیا جو 25/ اگست 2007ء کو
میں شائع ہوا تھا۔ (THE INDEPENDENT) برطانوی اخبار ''دی انڈیپینڈنٹ
"EVEN I QUESTION" THE TRUTH ABOUT 9/11 ،آرٹیکل کا عنوان ہے
مجھے بھی نائن الیون کی ''حقیقت'' پر شک ہے) مضمون کے آغاز میں رابرٹ فسک)
کہتا ہے۔''میں جہاں کہیں بھی جاتا اور مشرق وسطیٰ پر کوئی لیکچر دیتا ہوں، ہمیشہ سامعین
کے ہجوم میں سے ایک نہ ایک ''ہذیانی کیفیت میں مبتلا'' شخص اٹھ کھڑا ہوتا اور غضب
ناک لہجے میں مجھ سے سوال کرتا ہے۔ ''تم کھل کر صاف صاف لفظوں میں کیوں نہیں
بتاتے کہ نائن الیون کس کا کیا دھرا ہے؟ سچ بولتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو؟ کیوں نہیں
بتاتے کہ بش انتظامیہ (یا سی آئی اے یا موساد یا کسی بھی اور) نے ٹوئن ٹاورز اڑا
دیئے؟ تم نائن الیون کے پس پردہ چھپی اصل حقیقت لوگوں کو کیوں نہیں بتاتے؟''
ایسے ہی ایک لیکچر کے دوران ایک شخص نے یہی کچھ دہرایا۔ میں نے دبے لفظوں میں
کہا کہ اسکا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے تو وہ گالیاں دیتا اور غصے میں کرسیوں کو ٹھڈے
مارتا ہوا ہال سے باہر نکل گیا''۔آگے چل کر رابرٹ فسک لکھتا ہے۔ ''لیکن میں واقعی
مسلسل تبدیل ہوتے سرکاری موقف سے پریشان ہوں۔ میں ان عمومی سوالوں کا ذکر نہیں
کر رہا کہ پینٹاگون پر حملہ کرنیوالے طیارے کے اجزاء، جیسے انجن وغیرہ کہاں غائب ہو
گئے؟ پینسلوانیا کی فلائٹ 93 کی تحقیقات میں شامل سرکاری افسران کے منہ کیوں سی
دیئے گئے ہیں؟ جب یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ طیارہ (فلائٹ 93) پورے کا پورا ایک
کھیت

میں آ گرا تو پھر اس کا ملبہ میلوں دور تک کیوں پھیلا ہوا تھا؟... میں تو ٹوئن ٹاورز کے بارے میں صرف سائنسی نقطہ نظر سے سوالات رکھتا ہوں۔ مثلاً یہ درست ہے کہ تیل زیادہ سے زیادہ 820 ڈگری سینٹی گریڈ کی حرارت پیدا کرتا ہے تو پھر ٹوئن ٹاورز کے وہ فولادی بیم کیسے پگھل کر ٹوٹ گرے جنہیں پگھلنے کیلئے 1480 سینٹی گریڈ کی حرارت چاہیے؟ اور یہ سب کچھ صرف آٹھ سے دس سیکنڈ کے دوران ہو گیا اور تیسرے ٹاور، ورلڈ ٹریڈ سینٹر بلڈنگ 7 یا سالمن۔ برادرز بلڈنگ کی کہانی کیا ہے جو پانچ بجکر بیس منٹ پر، صرف 6.6 سیکنڈ کے اندر خود اپنے ہی قدموں پر ڈھیر ہو گئی؟ یہ اتنی عمدگی کے ساتھ کیونکر زمیں بوس ہو گئی جبکہ اسے کسی طیارے نے چھوا بھی نہیں؟ امریکن نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اسٹینڈرڈ اینڈ ٹیکنالوجی سے کہا گیا تھا کہ وہ تینوں عمارتوں کی تباہی کے اسباب کا تجزیہ کرے۔ انہوں نے آج تک ورلڈ ٹریڈ سینٹر 7 کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ مکینیکل انجینئرنگ کے دو ممتاز امریکی پروفیسر جو بہر حال ہذیانی اور جنونی نہیں، اس بنیاد پر قانونی چارہ جوئی کر رہے ہیں کہ یہ رپورٹ فراڈ اور دھوکے پر مبنی ہو سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں صحافیانہ نقطہ نظر سے بھی نائن الیون کے بارے میں کئی شکوک و شبہات ہیں۔ چلیں رپورٹرز کی ان ابتدائی رپورٹس کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ انہوں نے ٹاورز کے اندر زور دار دھماکے سنے تھے، ممکن ہے وہ فولادی بیم تڑخنے کی آوازیں ہوں اور پھر یہ ابتدائی رپورٹ کہ ٹوئن ٹاورز کے نواح میں مین ہٹن کے علاقے میں، طیارے کے عملے میں شامل کسی

خاتون کی لاش ملی تھی جس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ مان لیتے ہیں کہ یہ سب سنی سنائی کہانیاں ہیں۔ جیسے سی آئی اے نے شروع میں جن عرب خود کش ہائی جیکروں کی فہرست جاری کی تھی ان میں سے تین ابھی تک زندہ سلامت ہیں اور مشرق وسطی میں امن چین سے رہ رہے ہیں لیکن اس پراسرار خط کی کہانی کیا ہے جو امریکی انتظامیہ کے مطابق مصری نژاد ہائی جیکر عطا محمد نے اپنے ساتھیوں کو لکھا تھا اور جس میں اس نے اپنے ساتھیوں کو فجر کی نماز پڑھنے کی تلقین کے ساتھ ساتھ نماز کی پوری عبارت بھی سکھائی تھی، کیا کسی مسلمان کو اسکی ضرورت ہوتی ہے؟

مجھے دہرانے دیجئے کہ میں سازشی کہانیوں پر یقین کرنے والا نہیں، لیکن دنیا کے ہر شخص کی طرح مجھے بھی پتہ چلنا چاہیے کہ نائن الیون کی اصل کہانی کیا ہے، کیونکہ اسی سے اس احمقانہ جنونی جنگ کا شعلہ بھڑکا جسے ''وار آن ٹیرر'' کا نام دیا گیا ہے اور جس نے افغانستان، عراق اور بڑی حد تک مشرق وسطی میں تباہی مچا دی ہے۔ بش کے ایک مشیر کارل روو نے ایک بار کہا تھا۔ ''اب ہم ایک عظیم الشان طاقت ہیں۔ ہم اپنی حقیقتیں خود تخلیق کرتے ہیں'' درست، لیکن ہمیں بھی تو کچھ بتا دیجئے تاکہ لوگ گالیاں دینا اور کرسیوں کو ٹھڈے مارنا چھوڑ دیں۔'' یہ اس رابرٹ فسک کے مضمون کے اقتباسات ہیں جو صحافت کی دنیا میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ یہ شخص مذہباً اور نسلاً انگریز ہے، نہ لبی

عبا پہنتا ہے نہ سر پر سیاہ بھاری پگڑی رکھتا ہے اور نہ ہی کسی اسلامی جماعت سے اس کا کوئی دور کا رشتہ ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو طالبان اور القاعدہ سے بھی کوئی رشتہ و تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن یہ وہ شخص ہے جو کھلی آنکھوں سے سب کو دیکھنے اور تعصب سے پاک واقعات کا تجزیہ کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ کہتا ہے: مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ''نائن الیون'' کی سازش کا تانا بانا بننے والوں میں سے کسی کا ضمیر چیخنے لگے گا اور وہ دیوانوں کی طرح گریباں چاک کئے، دہائی دیتا ہوا مین ہٹن کی سڑکوں پر نکل آئے گا کہ ''یہ سب ہمارا کیا دھرا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس آگ سے بچاؤ جو میرے اندر بھڑک رہی ہے'' لیکن لبرل فاشسٹ اس وقت بھی امریکی چہرے کی کالک دھونے کے لیے دلائل تراشنے لگیں گے کیونکہ ان کا رزق اسی چاکری میں لکھ دیا گیا ہے اور مردار خوری کی جبلت رکھنے والا گدھ، کبھی اپنے اندر شاہین کی خصلت پیدا نہیں کرسکتا۔

رچرڈ فالک بھی یہی کہتے رہے:

متذکرہ واقعہ اور رابرٹ فسک کے تجزیہ کے علاوہ اقوام متحدہ کے اہلکار رچرڈ فاک نے بھی 11/9 کے حادثہ کو امریکی منصوبہ قرار دیا تھا۔ فلسطین میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی تفتیش کے لیے مقرر خصوصی تفتیشی افسر رچرڈ فاک نے اپنے بلاگ میں لکھا تھا کہ 11/9 کا حادثہ امریکی حکومت کا تیار کردہ ہے اور

یہ اس حادثہ کے حقائق پر امریکی حکام نے جانتے بوجھتے ہوئے پردہ ڈالا ہے۔انھوں نے اپنے بلاگ میں مغربی ذرائع ابلاغ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ 9/11 کے حادثہ کے بعد جاری کئے گئے سرکاری بیانات میں واضح تضادات موجود تھے جنھیں نظر انداز کر دیا گیا اور سچ کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔یہاں بھی یہ واضح رہنا چاہیے کہ رچرڈ فالک بہ ذات خود ایک امریکی یہودی ہیں لیکن وہ اسرائیل کی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔وہ امریکا کی پرنسٹن یونیورسٹی میں بین الاقوامی قانون کے پروفیسر ایمریطس ہیں۔انہوں نے بیس کتابیں لکھی ہیں یا وہ ان کے معاون مصنف ہیں اور تقریباً بیس کتب کے وہ مدیر یا معاون مدیر ہیں۔اس سب کے باوجود توجہ طلب پہلو ہے کہ جب ایک یہودی نے غیر جانب داری کا رویہ اختیار کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو بہ خوبی انجام دینے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اس کو اپنے عہدے سے برطرف کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ سوال یہ ہے کہ حقیقت کو حقیقت بیان کرنے کی جرت کے عوض اگر اتنی بڑی سزا دی جائے تو پھر کیوں تنقید و آزادی کے علمبردار اپنے اوپر آنچ آتے ہی دوسروں کی تمام آزادیاں سلب کر لیتے ہیں!!

اور رون پال بھی اسی پر مہر ثبت کرتے ہیں:

واقعات کے پس منظر میں یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ملک عزیز کا میڈیا ہو یا

دیگر اُن ممالک کا جن پر بالواسطہ یا بلاواسطہ امریکہ اور اسرائیل کا فکری تسلط قائم ہوتا جا رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ پالیسیز نافذ ہوتی جا رہی ہیں جن کا ہدف پہلے نمبر پر مسلمان ہیں اور اس کے بعد وہ تمام افراد اور جماعتیں ہیں جو اقتدار پر مبنی نظام و افراد کی کمیوں پر سوالات کھڑے کرتی ہیں یا ان کے شانہ بشانہ چلنا پسند نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے الیکٹرانک میڈیا نے بھی اور دیگر ہمنوا ممالک نے بھی اس خبر کو پوری طرح نظر انداز کر دیا جس میں سابق امریکی صدارتی امیدوار رون پاول نے نائن الیون حملوں کو اسرائیلی کارروائی قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس انسانیت سوز واقعہ میں موساد کے ملوث ہونے کے کئی شواہد موجود ہیں۔ غیر ملکی خبر رساں ادارے کے مطابق ایک امریکی اخبار سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ نائن الیون حملوں کے حوالے سے اب کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ حملے امریکہ کی اندرونی نہیں بلکہ اسرائیلی بیرونی کارروائی ہے۔ اب تک ملنے والے تمام شواہد سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد نے یہودی لابی کے ساتھ مل کر یہ کاروائی کی۔ خیال رہے کہ نائن الیون کے واقعہ کے بعد امریکہ اور نیٹو کے فوجی دستوں نے القاعدہ نیٹ ورک کو ختم کرنے کے بہانے افغانستان میں وسیع پیمانے پر خونریزی کی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اب تک ہزاروں افغان مرد خواتین اور بچے شہید اور لاکھوں افراد بے گھر ہو چکے ہیں۔ واضح رہے کہ ایران کے صدر احمدی نژاد نے نائن الیون کی برسی پر

عالمی برادری کے سامنے یہ سوال رکھا تھا کہ دنیا نے گیارہ ستمبر کے واقعات کو لے کر جن دس لاکھ سے زیادہ افراد کو مارا گیا ہے ان کی بابت کیوں خاموشی اختیار کر لی گئی ہے؟ قابل ذکر ہے کہ نائن الیون حملوں کی آڑ میں عراق وافغانستان اور دنیا بھر کے مسلم ممالک میں ہزاروں افراد کے قتل عام کے بعد بھی امریکہ اس واقعہ کے بارے میں تحفظات دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ معاملہ یہ ہے کہ دونوں ٹاورز میں موجود فرنیچر اور دیگر سازو سامان کی حالت درست، جبکہ ہزاروں لوگوں کی لاشیں جادوئی طریقہ سے غائب ہونے سے شکوک و شبہات میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ "ذرائع کے مطابق 11، ستمبر 2001 کو دہشت گرد حملوں میں گرنے والی امریکہ کی دو بڑی عمارتوں میں موجود فرنیچر و دیگر سازو سامان کی حالت سے لگتا ہے کہ عمارتیں گری ہی نہیں جبکہ انسانی لاشوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے اور ایک ہزار سے زائد لاشوں کا نام و نشان تک نہ ملنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لاشوں کو جادوئی طریقہ سے فضا میں ہی غائب کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ نہ کسی انسان کے اعضاء مل سکے اور نہ ہی ہڈی کا ٹکڑا اور نہ ہی انسانی جلد کا کوئی حصہ ثبوت کے طور پر عمارتوں میں موجود ہے"۔ یہ وہ واقعہ ہے جو رون پال بیان کرتے ہیں اور یہی وہ دہشت گردی کے خلاف منظم جدوجہد ہے جہاں سے صلیبی جنگوں کا ایک بار پھر آغاز ہوا چاہتا ہے۔ اب ان جنگوں میں کون کس کا حلیف اور حریف بنے گا یہ وقت اور حالات واضح کرتے چلے جائیں گے۔ اس سب کے باوجود امن پسند حضرات ہر وقت اور ہر زمانے میں زندہ دل اور روشن

دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقیقت اور سچائی کو واضح کرتے رہیں گے اور اُن انتہا پسندوں اور فاشسٹوں کا ساتھ نہیں دیں گے جن کا مقصد ہی فساد فی الارض پھیلانا اور امن وامان کو خراب کرنا ہے۔

ان حالات میں مسلمانوں کو چاہیے کہ احسان کی روش پر قائم رہتے ہوئے جن آزمائشوں سے بھی آج وہ دوچار ہیں ان سے نکلنے کی ممکنہ تدابیر اختیار کریں۔ احسان کی روش پر اس لیے قائم رہیں کیونکہ احسان کی روش ہی فساد فی الارض سے روکتی ہے لوگوں کے درمیان اخوت و محبت کے جذبہ کو پروان چڑھاتی ہے، ضرورت مندوں کی مدد کا جذبہ پیدا کرتی ہے،اور احسان ہی وہ ذریعہ ہے جو دنیا و آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے۔ کہا کہ: "جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دُنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا" (القصص:۷۷)۔آج دنیا یہ بھی دیکھ چکی ہے کہ " عوام کی حکومت عوام کے ذریعہ کے نعرے بلند کرنے والے اپنے ہی خول میں کس قدر تنگ نظر ثابت ہوئے ہیں۔اور " وجہ یہ ہے کہ ان نعروں کی آڑ میں وہ اپنے مفاد کے لیے سرگرم عمل ہیں۔آج دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ ایک اہم ترین ملک جہاں جمہوری نظام کے تحت حکومت منتخب ہوئی اس کو کس طرح ختم کروا دیا جاتا ہے! درحقیقیت آج اُس جمہوری نظام اور اُس پر عمل پیرا افراد کی

شدت سے کمی محسوس کی جارہی ہے جو اپنے قول و فعل میں یکسانیت رکھنے والے ہوں۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے لوگوں کی تلاش جاری رکھی جائے۔ کیا آپ کو اپنے آس پاس اقدار پر مبنی سیاست میں سرگرم افراد نظر آتے ہیں؟

ریپ کی سزا پھانسی! منظور نہیں جب تک کہ۔۔۔۔

16 دسمبر 2012ء کی رات ملک کی راجدھانی دہلی میں ایک دردناک واقعہ طالبہ کی اجتماعی آبروریزی کا سامنے آیا۔پولیس نے 6 وحشیانہ حرکت میں ملوث بدمعاشوں میں سے 4 کو چوبیں گھنٹوں میں گرفتار کر لیا تھا۔ گرفتار شدگان میں بس کا ڈرائیور رام سنگھ، اس کا بھائی مکیش، جم انسٹرکٹر ونے شرما اور پھل فروش پون گپتا شامل تھے۔ جلد ہی دیگر دو ملزمین کی شناخت بھی کر لی گئی۔اس طرح کل چھ افراد کو گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔ مخصوص واقعہ کی فاسٹ ٹریک عدالت نے پیشی در پیشی اور ساعت در ساعت کے دوران معاملہ کے ہر پہلو کو سمجھنے اور غور و فکر کے بعد فیصلہ سنایا۔ فیصلہ وہی تھا جس کا مطالبہ متاثرہ کے والدین، سماجی تنظیمیں اور ملک کی عوام چاہتی تھی۔ گرچہ یہ فیصلہ سنادیا گیا ہے لیکن ملزمین کو یہ حق حاصل ہے کہ اعلیٰ عدالت میں ایک بار پھر رحم کی فریاد کرتے ہوئے فیصلہ پر نظرثانی کی درخواست دے سکیں۔ متاثرہ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا وہ انتہائی بدبختانہ اور شرمناک تھا، ساتھ ہی جس ذہنی اور جسمانی تکلیف کا وہ شکار ہوئی وہ بھی حد درجہ افسوس ناک تھا، متاثرہ کا ہر ممکن طریقہ سے علاج کیا جاتا رہا لیکن جسم میں پھیلے زہر کی وجہ سے آخرکار وہ اس دنیا سے چل بسی۔ لہٰذا معاملہ ایک جانب

اجتماعی آبروریزی کا ٹھہرا تو ہیں دوسری جانب قتل اور اقدام قتل کا بھی بن گیا۔ اس پورے واقعہ میں جس طرح عوام نے متاثرہ سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا اور مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچانے، عمر قید یا پھانسی کی سزا تجویز کرنے جیسے معاملات سامنے آئے وہ بھی قابل ستائش ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ساکیت کی فاسٹ ٹریک عدالت کے ایڈیشنل سیشن جج یوگیش کھنہ نے اس معاملے کو نادر ترین قرار دیتے ہوئے چاروں قصوروار اکشے ٹھاکر (28)، ونے شرما (20)، پون گپتا (19) اور مکیش سنگھ (26) کو موت کی سزا سنائی۔ جسٹس کھنہ نے پہلے چاروں ملزمین کو اجتماعی عصمت دری، قتل، اقدام قتل، غیر فطری جنسی تعلقات قائم کرنے اور شواہد مٹانے کا قصوروار قرار دیا تھا۔ اور بعد میں سزا کی نوعیت پر وکیل استغاثہ اور دفاعی وکیل کی دلیلیں سننے کے بعد عدالت نے فیصلہ محفوظ کر لیا۔ معاملے کی سماعت تقریباً 9 مہینے میں مکمل ہوئی۔ چونکہ فیصلہ پر ملک ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں لہٰذا فیصلہ آنے پر تمام ہی حق پسند افراد نے خیر مقدم کیا۔ چھ میں سے چار کے خلاف پھانسی کی سزا طے ہوئی۔ وحشیانہ واردات کے اصل ملزم رام سنگھ نے 11 مارچ، [illegible] کو جوینائل بورڈ نے 31 اگست کو قصوروار ٹھہرا کر اصلاح گھر بھیج دیا۔ اور یہی وہ کمسن مجرم ہے جس پر لڑکی کے ساتھ سب سے زیادہ وحشیانہ سلوک کرنے کا الزام ہے۔

: کیا ریپ کی سزا پھانسی مناسب ہے؟ جبکہ

اس پورے واقعہ، فیصلہ اور حتی الامکان عمل درآمد کے باوجود سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا دیگر ریپ کے قصورواروں کو اس سے کوئی سبق حاصل ہوگا؟کیا یہ اور اس طرح کے فیصلوں سے ریپ کی تعداد میں کمی آئے گی؟اور یہ سوال اس لیے اٹھتا ہے کہ آج ہم جس معاشرے کا حصہ ہیں وہاں ہر آن ظلم وزیادتیوں کا بازار گرم ہے، یہاں لوگوں کے بنیادی حقوق کھلے عام سلب کیے جاتے ہیں، خاندانی نظام منتشر ہوا چاہتا ہے،.برائیوں کو اب.برائی نہیں سمجھا جاتا بلکہ وہ فیشن بن چکی ہیں۔" زناں "اور" ریپ "میں فرق کیا جاتا ہے، عفت و عزت کی زندگی گزارناایک عیب سمجھا جاتا ہے ذمہ داریاں بوجھ سمجھی جانے لگی ہیں یہی وجہ ہے کہ خاندانی رشتہ اور وہ جذبات سرد پڑتے جارہے ہیں جو ایک مستحکم معاشرے کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ نتیجتاً عریانیت اور فحاشی عام ہوچکی ہے،مذہبی گرواور سنت معصیت سے بھری گندی دلدل میں لت پت ہیں، یہاں ولادت سے قبل ہی اولاد کو بے دریغ قتل کیا جاتا ہے اور ہر قسم کا ڈر اور خوف دولت کی ریل پیل میں ختم ہوا چاہتا ہے۔ مقصد حیات عیش پرستی میں تبدیل ہو چکا ہے، مذہبی بنیادیں یا تو نہایت کمزور ہیں یا نا ہیں ہی نہیں ۔یہاں الحاد عام ہوا چاہتا ہے ، جدیدیت ایک خاص پس منظر پیش کی جانے لگی ہے اور آخرت کا تصور نا پختہ بنیادوں پر استوار ہے۔یہ اور ان جیسے بے شمار مسائل ہیں جہاں عام انسان رہتا بستا اور زندگی گزارتا ہے اس کے باوجود یہاں.برائی کو.برائی

کہتے ہوئے نہ صرف ڈر محسوس ہوتا ہے بلکہ نشاندہی کرنے والوں کو ڈرایا اور دھمکایا بھی جاتا ہے۔ان حالات میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ برائیوں کو روکنے کا ذریعہ کون بنے گا؟ حکومت ،مذہبی گرو، سماجی خدمت گار، جدیدیت کے علمبردار، غیر حکومتی ادارے اور این جی اوز یا عام شہری؟ معاملہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد اور حکومتی و غیر حکومتی ادارے جو برائیوں پر روک لگا سکتے ہیں، وہ خود برائی کو اس درجہ برائی تسلیم نہیں کرتے جو مطلوب ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ملزم جرم کر گزرتا ہے، لوگ واقف ہو جاتے ہیں،اُس لمحہ ہماری آنکھیں کھلتی ہیں لیکن قبل از وقت نہ ہمارے لیے وہ برائی ہوتی ہے اور نہ ہی کسی درجہ میں جرم۔یہ وہ پس منظر ہے جس میں حکومت اور حکومتی ادارے چاہے وہ انتظامی امور سے تعلق رکھتے ہوں یا عدلیہ اور مقننہ میں سے ہوں،لیو اِن ریلیشن پر پابندی کی بات نہیں کرتے۔۔برخلاف اس کے لیو اِن ریلیشن کو قانونی جواز فراہم کیا جاتا ہے۔ہومیو سیکسیو لٹی کو فرد واحد کا ذاتی معاملہ گردانتے ہوئے بتاتے ہوئے اجازت دی جاتی ہے، کو ایجو کیشن کو کسی بھی درجہ میں برائی کا ذریعہ نہیں مانتے ،ڈریس کوڈ کو قید و بند کے متعارف سمجھتے ہیں،پرنٹ والیکٹرانک میڈیا میں بڑھتی فحاشی و عریانیت پر قدغن نہیں لگاتے،شراب اور دیگر نشیلی اشیاء جو حقیقتاً برائی کی جڑ ہیں پر پابندی نہیں لگاتے۔ایڈس جیسے مہلک مرض پر قابو پانے کے لیے کھلے عام تعلیمی، اداروں و دیگر مقامات پر مفت وہ چیزیں فراہم کی جاتی ہیں جس سے معاشرہ نہ صرف کھوکلا ہوتا ہے بلکہ انتہائی

ذلت و پستی کا شکار بھی ہوتا ہے۔وہیں دوسری طرف ویسٹرانائیزیشن کو خوبی گردانتے ہوئے ہر سطح پر نقل کیا جاتی ہے۔اس کے باوجود کہ وہ واقف ہیں کہ جن کی نقل کی جارہی ہے اسی معاشرے میں بہت پہلے خاندانی نظام منتشر ہو چکا ہے،لاوارث اور حرام اولادوں کی تعداد ہر آن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ نتیجتاً وہاں بھی اور یہاں بھی کرائم ریٹ بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے ۔افسوس کا مقام ہے کہ اسذلت و پستی کی زندگی گزارنے اور معاشرے میں بڑھتی برائیوں سے واقفیت کے باوجوداہل علم اور عوام کسی بھی سطح پر متذکرہ موضوع پر سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے ۔اور اگر کوئی ان موضوعات پر گفتگو کرتا ہے تواس فکر اور اس سے وابستہ افراد کو دقیانوسی ،غیر مہذب اور متشدد جیسے القاب سے متعارف کیا جاتا ہے۔ان حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ "زنا" اور" ریپ" کے واقعات رک جائیں یا ختم ہو جائیں؟

ظلم کے پرستایہی طریقہ اختیار کرتے آئیں ہیں :

حالات کے پس منظر میں جب کبھی آبروریزی کا واقعہ یا واقعات سامنے آتے ہیں تو کبھی معصوم تو کبھی شاطر دماغ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی "ریپ"کے مجرمین کے لیے اسلامی قانون نافذ ہونا چاہیے ۔لیکن کیا کبھی کسی نے یہ سوچنے کی بھی زحمت کی کہ اسلامی قوانین میں زنا کی سزا سنگسار کیوں ہے؟کیا اسلامی قانون کی رو سے جو شخص بھی زنا کا مرتکب ہوگا وہ سنگسار ہی

ہوگا گرچہ وہ تمام برائیاں، غلاظتیں اور گمراہیاں جو زنا کا ذریعہ بنتی ہیں ایسے ہی جاری رہیں جس طرح آج ہمارے ملک میں عام ہیں؟ کیا ان ذرائع پر پابندی لگائے بغیر ہی یہ قانون نافذ ہو جائے گا؟ یا ان ذرائع پر بھی وہی قانون اور حکومت و ریاست پابندی لگائے گی جو زنا کی سزا سنگسار بتاتی ہے؟ اگر ایسا ہوتا کہ برائیاں تو اسی طرح عام ہوتیں جس طرح آج ہمارے درمیان چار سو موجود ہیں، ان پر کسی سمت سے کوئی پابندی بھی عائد نہ ہوتی، اس کے باوجود زنا کے مرتکب لوگوں کو سنگسار کیا جاتا، تو کیا اس پس منظر میں یہ سزا خود ایک عظیم ظلم نہ ٹھہرتی؟ کیا یہ گمان کہ وہ خدا جو انسانوں سے ان کے ماں باپ سے بھی حد درجہ محبت کرنے والا ہے نعوذ باللہ انسانوں پر ایسا ظلم کر سکتا ہے؟ نہیں! ایسا نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس برائی کو ختم کرنا چاہتا ہے جو انسان کو دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی سے دوچار کرنے والی ہیں۔ اسی لیے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایات واضح الفاظ میں آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ رہتی دنیا تک کے انسانوں کو فراہم کر دی ہے، کہا کہ: "اے نبیؐ، ان سے کہو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں: یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے، اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی، اور کسی جان کو، جسے اللہ نے

محترم ٹھہرایا ہے، ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو" (الانعام:۱۵۱)۔یہ وہ موٹی موٹی خرابیاں اور برائیاں ہیں جن کا تذکرہ بطور تذکرہ نہیں ہے بلکہ اسلامی نظام و حکومت کی موجودگی میں ان پر ہر ممکن گرفت کی جائے گی، برائیوں کو فروغ دینے والے ہر ممکن ذریعہ پر روک لگائی جائے گی، ساتھ ہی خدا اور آخرت کے اسلامی تصور سے لوگوں کو روشناس کرایا جائے گا۔اور اِن تمام مراحل سے گزرنے کے بعد بھی اگر کوئی زنا کا مرتکب ہوتا ہے،اس وقت اس کو کھلے عام سنگسار کیا جائے گا۔اس لیے کہ مجرمین کو سزا ملے اور اس لیے بھی کہ دیگر افراد منظر کو دیکھ کر برائی کی شدت سے نہ صرف متعارف ہوں بلکہ اس کے قریب بھی نہ جائیں۔درحقیقت یہ وہ برائی ہے جو نہ صرف متاثرین اور اس میں ملوث افراد کے درمیان اپنے خبیث اثرات چھوڑتی ہے بلکہ معاشرے کے ہر فرد کے لیے فکری و عملی ہلاکت کا بھی سبب بنتی ہے۔ لہٰذا پہلے برائی کی شدت سے متعارف کرایا، اس کے پھیلاؤ پر گرفت کی گئی، اور بعد میں انجام سے ڈرانے کے علاوہ یہ بھی بتا دیا کہ دراصل یہ اللہ کی واضح ہدایات و حدود ہیں، ان سے گریز صرف وہی شخص و اقوام کر سکتی ہیں جو سمجھ بوجھ سے کام نہ لیں۔اس کے برخلاف اگر برائی میں لذت محسوس کی جائے، ذرائع پر گرفت نہ کی جائے،اور پھر بھی "ریپ" کی سزا پھانسی یا اسلامی قوانین پر عمل درآمد کی صدا بلند کی جائے تو ایسے لوگ ہی دراصل ظلم کے پرستار کہلائیں گے۔لیکن اگر ماحول ساز

گار ہوچکا ہو، دلوں میں خوف خدا بیٹھ گیا ہو، جہنم کی ہولناکیوں اور جنت کے خوشنما مناظر سے لوگ نہ صرف واقف بلکہ ایمان بھی لے آئے ہوں یا حالات یہ ہوں کہ لوگ بیعت لے رہے ہوں، تو قرآن حکیم فرماتا ہے کہ : "اے نبی، جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی، اور کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کرو، یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے المتحنہ : ۱۲)۔ یہ وہ تعلیمات اور حالات ہیں جن میں نہ صرف اللہ تعالیٰ لوگوں کی) مغفرت فرمائے گا بلکہ تبدیلی افکار و اعمال کے نتیجہ میں ایک صالح معاشرہ بھی وجود میں آئے گا۔ اور یہی وہ حالات ہیں جن کی آج شدت سے کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ لیکن سوچنے سمجھنے والے دماغ "یا تو مسلہ اور اس کے حل سے واقف نہیں یا نبی رحمت محمد " صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض و حسد کے نتیجہ میں قرآنی تعلیمات و سنت رسولؐ کی روشنی میں مکمل طور پر عمل درآمد کا جذبہ نہیں رکھتے یا پھر وہ چاہتے ہی نہیں کہ ان تعلیمات کو متعارف و نافذ کیا جائے۔ حالات کے پس منظر میں یہ وہ بڑی رکاوٹ ہے جو کسی بھی مسلہ کا واضح اور حتمی حل پیش نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود ہدایت کے خواہشمند و طلبگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور اے نبیؐ ! میرے بندے

اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انہیں بتادو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔
پکارنے والا جب مجھ پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں
چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ (یہ بات تم انہیں سنا دو)
شاید کہ وہ راہِ راست پالیں" (البقرہ: ۱۸۶)۔

!ایڈوائزری، کمیشن، آرڈیننس کی بھرمار

کیا انتخابات قریب ہیں؟

دہشت گردی کے الزام میں بے گناہ مسلم نوجوانوں کی ہونے والی گرفتاریوں پر قدغن لگانے اور جیلوں میں بند بے گناہ مسلم نوجوانوں کو رہا کرانے کے لیے مرکزی وزیر .برائے امور داخلہ سشیل کمار شندے نے تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو ایڈوائزری جاری کی ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ دہشت گردی کے الزام میں بے گناہ مسلمانوں کو گرفتار نہ کیا جائے، جو بھی دہشت گردی کے الزام میں جیلوں میں بند ہیں ان کے مقدمات کی سماعت کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کی جائیں، ان کے لیے خصوصی سرکاری وکیل مقرر کیے جائیں اور تعصب کی بنیاد پر بے گناہ مسلم نوجوانوں کو گرفتار کرنے والے پولیس افسران کے خلاف سخت اور جلد کارروائی کی جائے نیز بے گناہ رہا ہونے والے نوجوانوں کو معقول معاوضہ دیا جائے اور ان کی بازآبادکاری کو یقینی بنایا جائے۔ خبر کے مطابق آر ایس ایس اور بی جے پی کی دہشت گردانہ سرگرمیوں کو بے نقاب کرنے والے سشیل کمار شندے کے اس عمل نے ایک بار پھر قومی سیاست میں ہلچل پیدا کردی ہے اور بی جے پی کو بے چین کر دیا ہے۔اس ہدایت سے پریشان بی جے پی نے ایک بار پھر سشیل

کمار شندے سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا ہے۔ وزیر داخلہ نے وزرائے اعلیٰ کو بھیجے گئے اپنے مکتوب میں لکھا ہے کہ اب تک کئی ایسے معاملے منظر عام پر آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم نوجوانوں کو پولیس نے غلط طریقہ سے گرفتار کر لیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کچھ مسلم نوجوانوں کو محسوس ہو رہا ہے کہ انھیں جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا ہے اور انھیں بنیادی حقوق سے محروم کیا گیا ہے۔ لہٰذا حکومت کو یہ یقینی بنانا ہے کہ کوئی بھی بے قصور شخص بلاوجہ گرفتار نہ کیا جائے۔ اپنے مکتوب میں شندے نے یہ بھی کہا ہے کہ حکومت دہشت گردی سے مقابلہ کرنے کے لیے ہر سطح پر پابند عہد ہے لیکن اس کی وجہ سے بے گناہ گرفتار ہوں یہ مناسب نہیں۔ انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت تک مختلف نمائندگان کے ذریعہ یہ شکایت پہنچائی گئی ہے کہ تفتیشی ایجنسیوں کے ذریعہ بے قصور مسلم نوجوانوں کو مبینہ طور پر پریشان کیا جا رہا ہے لہٰذا اس پر قابو پایا جانا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ ملی جماعتوں اور سیکولر تنظیموں کی جانب سے بار بار یہ شکایت کی جا رہی تھی کہ دہشت گردی کے الزام میں بے گناہ مسلم نوجوانوں کی گرفتاری عمل لائی جاتی ہے جس سے مسلمانوں میں خوف وہراس کا ماحول رہتا ہے۔ اسی کے پیش نظر مرکزی حکومت نے قومی تفتیشی ایجنسی (این آئی اے) کے تحت دہشت گردی کے الزام میں گرفتار نوجوانوں کے لیے 39، فاست ٹریک [illegible] مثبت نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں۔ جماعتوں کی شکایت پر مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور کے رحمٰن خان نے مرکزی حکومت سے سفارش کی

تھی کہ وہ اس پر غور کرے اور مناسب قدم اٹھائے۔ بی جے پی کے ترجمان پر راجیو پرتاپ روڈی نے کہا کہ مرکزی وزیر کسی ایک طبقہ کا وزیر نہیں ہوتا بلکہ جب وہ حلف لیتا ہے تو پورے ملک کے لیے لیتا ہے لہٰذا ایڈوائزری میں یہ کہنے کے بجائے کہ بے گناہ مسلمانوں کو گرفتار نہ کیا جائے، یہ کہنا چاہیے کہ ملک کے کسی بے گناہ شہری کو گرفتار نہ کیا جائے۔انھوں نے کہا کہ سشیل کمار شندے کو اس غلطی کے لیے فوری طور پر استعفیٰ دینا چاہیے۔

:اور واقعہ بھی یہی ہے

یہ بات جو آج ملک کے مرکزی وزیر برائے امور داخلہ سشیل کمار شندے کے سمجھ میں آئی وہ صد فی صد صحیح ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ملک میں ایک طویل عرصہ سے مسلمانوں کے ساتھ سوتیلا پن برقرار ہے۔نہ صرف سوتیلا پن برقرار ہے بلکہ ایک مخصوص فکر و نظر رکھنے والے دشمنی کا اظہار بھی ہر ممکن طریقہ سے کرتے آئے ہیں۔اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معتدل مزاج اور مفاہمت پسند حضرات کی اس ملک میں کمی نہیں ہے۔اس کے برخلاف مسلم نمائندوں کو جو آج بھی اور کل بھی کسی نہ کسی سیاسی جماعت اور نظم و نسق کے ادارے سے وابستہ رہے، چاہیے کہ ذاتی نفع و نقصان سے اوپر اٹھ کر ملت کے مسائل میں بھی دلچسپی لیں۔اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کے مسائل کو حل کریں اور دیگر کو نظرانداز بلکہ معنی یہ ہیں کہ آپ ہی وہ ناسور نہ

بن جائیں جو مسلمانوں کے مسائل پر گفتگو اور نمائندگی کرنے کے باوجود مسلمانوں کو ہی پریشانی میں ڈالنے کا سبب بن جائیں۔دوسری جانب شندے صاحب کے ایڈوائزری خط اور اس میں دی گئی ہدایات کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کو حقیقت قبل از وقت سمجھ میں نہیں آئی ؟اُس وقت جبکہ شر پسند اور شدت پسند جماعتیں اور افراد کے نام بڑے زور شور سے اردو اخبارات کی سرخیوں میں تھے اور اس وقت جبکہ بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کے خلاف عوام احتجاج میں مصروف تھے اور کہے جا رہے تھے کہ یہ جھوٹ پر مبنی انکاؤنٹر ہے۔لیکن ہم شندے صاحب کے اس وقت کے معاملات کو اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ بذات خود وہ اس وقت اس عہدے پر فائض نہیں تھے اور اس لیے بھی کہ یہ سرخیاں اردو اخبارات کی تھیں جو آج بھی رہتی ہیں لیکن چونکہ اردو اخبارات وزرات داخلہ کے آفس میں آتے ہیں نہیں، اس لیے کون برسر عہدہ افراد کو مطلع کرے گا؟کیا انگلش اور ہندی کے اخبارات ؟جو متعلقہ مسائل پر گفتگو ہی نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو عموماً واقعہ کے برخلاف یا وہ الیکٹرانک میڈیا جو تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنے میں ہی اپنی ٹی آر پی بڑھانا چاہتا ہے یا پھر وہ دیگر ذمہ داران اور معاونین جو مسلہ سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے آئے ہیں!

واقعہ کے پس منظر میں یہ بات بھی جان لینا چاہیے کہ اس ملک میں مسلمانوں کو

آزادی سے لے کر آج تک دوسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا رہا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ بہت منظم اور منصوبہ بند انداز سے ان کی جان و مال کو نقصان پہنچایا جاتا
ہے۔آزادی کے بعد مقاصد کے حصول کے لیے فسادات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا تو آج دہشت گردی کے نام پر مسلم نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہے۔معاملہ یہ ہے کہ یہ چند سو یا ہزار نوجوان نہیں ہیں جن کو بے قصور اور بلا جواز گرفتار کیا گیا اور وہ مختلف اذیتوں سے دوچار ہیں بلکہ اس کرب و آزمائش میں بیس کروڑ پر مشتمل ہند کی مسلم امت بھی خوف و ہراس میں مبتلا ہے۔ساتھ ہی معتدل اور سیکولر افراد کی ایک بڑی تعداد بھی جو ملک میں امن و امان اور بھائی چارے کی خواہاں ہے۔باوجود یہ کہ یہ وہ اقلیت ہے جو ملک عزیز ہند کی دوسری سب سے بڑی اکثریت ہونے کے باوجود سچر کمیٹی رپورٹ کی روشنی میں میدانِ عمل کے ہر شعبہ حیات میں حد درجہ ذلت و پستی کا شکار ہے۔اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ یہ ذلت و پستی کا اندازہ لگانے والے خود وہی ہیں جنھوں نے گزشتہ 70 سالوں میں پہلے مسلمانوں کو اس مرحلہ میں پہنچایا، بعد میں اس کا اعتراف کیا اور اب اسی رپورٹ کی آڑ میں ووٹ کی سیاست میں مصروف ہیں۔

کیا کانگریس اور اس کے حلیف ایشوز غصب کرتے رہے ہیں؟

واقعہ کے پس منظر میں اور ملک کے موجودہ حالات کے تناظر میں ،بوکھلاہٹ میں

مبتلا یو پی اے حکومت گزشتہ چند دنوں سے مسلسل نئے نئے آرڈیننس، کمیشن، بیانات، متذکرہ وزیر داخلہ کا ایڈوائزری خط اور یہ ساری کوششیں کیا آئندہ سال ہونے والے پارلیمنٹ انتخاب اور اس سے قبل مخصوص ریاستوں کے انتخابات کے پس پردہ اقدامات کی گواہی نہیں دے رہی ہیں؟ یا دیگر سیاسی اور سماجی جماعتوں اور اداروں کے ذریعہ اٹھائے گئے مطالبات کا منھ بند کرانے کے مترادف ہے؟ یا پھر اپوزیشن میں بیٹھی سیاسی جماعتوں کے ایشوز اور ایجنڈوں کو غصب کرنا ہے جن کی بنا پر وہ آئندہ ہونے والے انتخابات میں ووٹ کی سیاست کرنا چاہتے ہیں؟ حکومت کے تابڑ توڑ بلوں کو پاس کرانے اور بیانات سے تو بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب 2014 اور اس سے قبل ہونے والے انتخابی اکھاڑے میں دیگر سیاسی طاقتوں کو پچھاڑنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور تذبذب کی وجہ یہ ہے کہ ٹھیک یہی روش گزشتہ انتخابی موسم میں یو پی اے کے دیگر حلیف بھی اختیار کرتے آئے ہیں۔ اس کی حالیہ مثال اترپردیش کی سماج وادی پارٹی ہے جس نے بلا جواز قیاس پر مبنی دہشت گردی کے معاملات میں قید و بند میں مبتلا مسلم نوجوانوں کو آزاد کرنے کی بات کہی تھی لیکن ریاستی حکومت نے اس معاملے میں سنجیدگی اختیار نہیں کی برخلاف اِس کے اُسی حکومت کے دور میں مسلمانوں کو لگاتار اور مسلسل جانی و مالی نقصانات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

اس موقع پر یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشیں کر لینی چاہیے کہ درحقیقت کانگریس

پارٹی اور ان کے حلیف جو یو پی اے میں آج اور پہلے شامل رہے ہیں وہ بھی راست یا بلاواسطہ بی جے پی کے ایشوز کو غصب کرتے آئے ہیں۔ جواز یہ ہے کہ شہید بابری مسجد کا فیصلہ اس خوبی کے ساتھ سابقہ اترپردیش حکومت کے دوران عدلیہ نے پیش کیا جس کے نتیجہ میں بی جے کا ایک اہم ایجنڈا اس کے ہاتھ سے چھن گیا۔ گرچہ آج بھی وہ بابری مسجد کا مسلہ اٹھاتے رہتے ہیں لیکن بی جے پی اور اس کے اس ایشو میں تال میل اس طرح برقرار نہیں ہے جس طرح عدلیہ کے فیصلہ سے قبل موجود تھا۔ ٹھیک اِسی روش کو برقرار رکھتے ہوئے مسلمانوں کا ایک اہم مسلہ فی الوقت نوجوانوں کی بلاجواز پکڑ دھکڑ ہے، اس کو بھی موجودہ اترپردیش حکومت نے انتخابات سے قبل کامیابی کا اہم مدّا سمجھتے ہوئے اٹھایا اور بڑے مارجن سے کامیابی درج کروائی۔ ان دو واقعات کے پس منظر میں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں ہی حکومتیں یو پی اے کا حصہ ہیں۔ اور اب یو پی اے حکومت اور ان کے وزراء کے ذریعہ جو کوششیں جاری ہیں اس سے یہی لگتا ہے کہ یہ سب آئندہ ہونے والے انتخابات سے قبل کی تیاریاں ہیں۔ ورنہ پانچ سال گزارنے کے بعد ان باتوں کا یاد آنا کچھ اچھا شگون نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہم ایک بار پھر ان بیانات، احکامات اور آرڈیننس کا خیر مقدم کرتے ہیں جن کا تذکرہ گزشتہ دنوں اور آج کل کیا جا رہا ہے۔ لیکن حالات کے پس منظر میں مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں اور افراد کو یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ مسلمانوں کے حقیقی ایشوز کو بہت خوبی کے ساتھ غصب کیے جانے کا

کھیل جاری ہے۔ لہٰذا اگر وہ بھی دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح مسلمانوں کے جذبات سے کھلواڑ کرنا چاہتے ہیں تو ان میں اور دیگر میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ درحقیقت آج ہند میں مسلم نوجوانوں کا مسئلہ ایک اہم اور بڑا مسئلہ ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ملک وملت کا مسئلہ صرف ایک یہی رہ گیا ہے، جسے ہر کوئی لیے بھاگے جا رہا ہے اور وہ بھی اس طرح جیسے کوئی لاوارث اولاد کہ جس پر قبضہ کی خواہش ہر سیاسی پارٹی اور شخص اپنا حق سمجھنے لگا ہے۔ برخلاف اس کے ملک وملت کے اور بھی مسائل ہیں جن سے مسلمانوں اور ملک کا راست یا بلاواسطہ تعلق ہے۔ ضروری ہے کہ ان ایشوز کو بھی اٹھایا جائے اور ان کے حل کی بھی ممکنہ تدابیر بیان کی جائیں۔ تب ہی محسوس ہوگا کہ آپ مخلص ہیں اور تب ہی آپ میں اور دوسروں میں فرق کیا جا سکے گا!

! رمی: غیر اللہ سے اعلان برات

جس طرح کسی علم کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بنیادی فلسفہ سے واقفیت ہو ٹھیک اسی طرح مذاہب جن عبادات و اعمال کا تقاضا کرتے ہیں،ان کے بنیادی فلسفہ سے واقفیت بھی لازم ہے ۔فائدہ یہ ہوگا کہ عمل میں تشنگی نہیں رہے گی اور نتائج کے اعتبا سے بھی فرد کی ذات اور ملت میں وہ نتائج نمودار ہو جائیں گے جو مطلوب ہیں۔اب اگر کوئی عمل عبادت کے دائرہ میں بھی آتا ہواور خشوع و خضوع کے ساتھ انجام بھی دیا جائے اس کے باوجود نتائج ظاہر نہ ہوتے ہوں تو معنی یہی ہوں گے کہ آیا فرد یا ملت نے اس کو بنا سوچ سمجھے ہی انجام دیا ہے یا واقعی وہ لایعنی عمل ہے جس کو عبادت کا درجہ دیا جا رہا ہے۔آج مختلف مذاہب کے افراد بے شمار اعمال عبادات کے نام پر انجام دیتے ہیں ۔دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ اعمال جن کو "عبادت" کہا جا رہا ہے کیا واقعی فرد میں مثبت تبدیلی لا رہے ہیں یا لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں ؟یا پھر بس چند اعمال ہیں جو کبھی شائستہ اور کبھی ناشائستہ انداز میں انجام دیے جاتے ہیں اور نتیجہ کے اعتبار سے وقت گزاری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔اس کے برخلاف اسلام نے جن اعمال کو عبادات کا درجہ دیا ہے اس کے ذریعہ فرد واحد اور اجتماعیت دونوں ہی اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے کامیابی کی

جانب گامزن ہوتے ہیں۔چونکہ ان عبادات کو انجام دیتے ہوئے تہذیب و شائستگی کا مکمل اظہار ہوتا ہے نیز کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوتا جس سے یہ کہا جاسکے کہ اسلام بھی دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے کہ جس میں نہ فرد کی شخصیت نکھرتی ہے اور نہ ہی معاشرہ مثبت تبدیلیوں کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا ہے۔یہی معاملہ اس عظیم عبادت کا ہے جسے "حج " کہا جاتا ہے۔

: عشق و محبت کا عظیم نظارہ

بندہ مومن جب حج کا ارادہ کرتا ہے اسی وقت سے ایک تڑپ اس کو اندر سے بے چین کیے رہتی ہے۔ عظیم عبادت کو انجام دینے کی تڑپ، اللہ کے گھر کی زیارت کی تڑپ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر

مبارک میں قدم رکھنے کی تڑپ، ابراہیم خلیل علیہ السلام کے بنائے گھر کو دیکھنے کی تڑپ، ان وادیوں، سحراؤں اور پہاڑوں کے مشاہدے کی تڑپ جہاں ایک عظیم واقعہ رونما ہوا تھا۔اور بندہ مومن کا یہ عشق و محبت اس کو بے چین کیے رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اس مقام کو نہ پہنچ جائے۔حدود حرم میں داخل ہوتا ہے اور بہت ہی خوبصورت اور قیمتی کپڑے اتار پھینکتا ہے اور دو اَن سلی چادریں جو کفن سے مشابہ ہیں، زیب تن کرتا ہے۔پھر جیسے ہی وہ اللہ کے گھر میں داخل ہوتا ہے آنکھیں اشک بار ہو اٹھتی ہیں، خانہ خدا میں قدم رکھتے ہی بندہ مومن پتھروں سے بنی ایک عمارت کے گرد چکر لگانا شروع کر دیتا ہے۔ایک گوشے میں ایک

پتھر نسب دیکھتا ہے جس کی جانب وہ دیوانہ وار لپکتا ہے اور بے اختیار چومنے لگتا ہے۔ صفا و مروہ کے درمیان دو پہاڑ کہ جن کے درمیان وہ دوڑتا ہے۔ پھر وہ اپنے سر کے بال جن کو اس نے اپنی زیب وزینت سمجھ کر بنا سنوار کر رکھتا تھا انہیں استرے سے منڈوادیتاہے۔ پھر منا کی طرف بھاگتا، خیمے گاڑتااور عرفات میں شام تک قیام کرتا ہے۔ پتھر کے ستون کو کنکریاں مارتا اور شیطان مردود پر لعنتیں بھیجتا ہے۔اور آخر میں اللہ کی خوشنودی اور جذبۂ للٰہیت سے سرشار ہو کر جانور کی قربانی کرتا ہے۔اور اس سب کے درمیان اس کی زبان پر جو کلمات رواں ہوتے ہیں وہ بس یہی کہ : "لبیک الھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک،ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک"۔ایسے موقع پر دنیاوی فلسفیوں میں سے اگر کوئی یہ پوچھے کہ رقت و گریہ زاری ، دنیا کی بے ثباتی اور یہ دیوانہ وار فنا فی الرض کی کیفیت کیوں تم پر طاری ہو گئی ہے؟تو اس کے پاس عقلی طور پر جواب نہ بن پڑے گا۔ وہ بے ساختگی کے ساتھ اگر کچھ کہے گا بھی، تو بس یہی کہ مجھے کچھ پتہ نہیں۔یہ میرے محبوب کا وہ گھر ہے جسے آج میں جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں ۔ یہ وہی گھراور مقام ہے جس کی آرزو ساری زندگی دل میں پرورش پاتی رہی اور زندگی کے یہ لحات عمر بھر کی تمنا کا حاصل ہیں۔ جن کے لیے میں نے ہزاروں میل کی مسافت طے کی اور سفر کی صعوبتیں و تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ یہاں عقل نہیں بلکہ عشق و محبت ہے جس نے یہ سب مجھے کرنے پر اکسایا اور میں نے بالکل ویسا ہی کیا جیسے میرے محبوب کی چاہت تھی۔ یہاں آ کر میں

رویا گڑگڑایا، خطاؤں سے معافی طلب کی اور اس عبادتِ عظیم کو انجام دینے کی ہر ممکن سعی و جہد کی جو میرے ربِ کریم کو پسند ہے۔

:مقاصدِ حج

حج کے ذریعے امتِ مسلمہ کی ہر نسل اپنے اسلاف کے کارناموں اور ان کے تاریخی ورثے سے روشناس ہوتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ کس طرح ابراہیمؑ نے اپنے ربِ رحیم کے اشارے پر اپنی بیوی اور بچے کو ایک بنجر وادی میں بسایا، اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی سعی کی، کعبہ تعمیر کیا، لوگوں کو حج کی جانب بلایا، اور مکہ کو امن و سکون کا گھوارہ بنانے کی دعا کی۔ اسی طرح مکے کی پہاڑیاں اللہ کے آخری نبی محمدؐ اور ان کے جاں نثار ساتھیوں کی جدوجہد، قربانیوں، ان پر ہونے والے مظالم اور آخر میں ان کی ہجرت کی داستان بیان کرتی ہیں۔ ساتھ ہی حج کا مقصد تقویٰ کا حصول، دنیا سے بے انتہا لگاؤ میں کمی اور روحانیت کو فروغ دینا ہے۔ بندہ اپنے رب کی رضا کے لئے دنیا کی زینت کو خود پر حرام کرتا ہے۔ وہ اپنا میل کچیل دور نہیں کرتا، ناخن نہیں کاٹتا، جائز جنسی امور سے گریز کرتا مختصر لباس زیب تن کرتا، برہنہ پا اور ننگے سر ہو کر روحانی مدارج طے کرتا ہے یہاں، تک کہ اللہ کا تقرب اس کو حاصل ہو جائے۔ حج ان عبادات کا مجموعہ ہے جس میں نماز انفاق، ہجرت، بھوک و پیاس، مجاہدہ، جہاد، زہد و درویشی، قربانی، صبر و شکر سب، شامل ہیں۔ فریضہ حج ان تمام عبادات کو انجام

دینے کا موقع کافراہم کرتا ہے جو انسان کی روحانی بیماریوں کے لئے اکسیر کا کام کرتا ہے۔ اسی طرح تکمیل ذات اور تطہیر فکر و عمل بھی حج کے مقاصد میں سے ایک ہے۔ جس کے ذریعہ انسان کو روحانی تطہیر کا موقع فراہم ہوتا ہے تاکہ وہ گناہوں سے پاک ہو کر اپنی اصل فطرت پر لوٹ آئے۔ حج مومن کو اس کے ازلی دشمن ابلیس کے خلاف تمثیلی جنگ میں برسرپیکار کرتا ہے۔ وہ ابلیس جس نے انسان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا، اسے حقیر سمجھا، جنت سے نکلوایا اور پھر دنیا میں گھات لگا کر بیٹھ گیا تاکہ اسے اپنے رب کے سامنے نااہل اور ناکام ثابت کردے۔ حج اسی ازلی دشمن کی شناخت کراتا، اسکے چیلنج کی یاد دلاتا اور اس کو سنگسار کرکے طاغوتی رغبات کو کچلنے کا درس دیتا ہے۔

: رمی' اعلان برات '

اور شبِ مزدلفہ! وہ شب ہے جبکہ دشمن سے مڈبھیڑ ہونے میں بس اب ایک رات باقی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ عرفات کے میدان سے اگلے مورچے پر جانا جہاں اوپر کھلا آسمان ہے، نیچے کوئی بستر نہیں۔ مگر کیا ہوا؟ چند لمحوں کی بات ہے پھر یہ شیطان اور نفس کے خلاف معرکہ آرائی ختم ہوگی اور یہ مجاہد خدا کے انعام سے سرفراز ہوگا۔ صبح ہوئی اور تاریکی ختم ہوگئی۔ اسی طرح قیامت کی صبح بھی ہوگی اور ظلم و عدوان کے اندھیرے مٹ جائیں گے۔ آج گھمسان کا رن پڑنے والا ہے۔ آج وہ دشمن سامنے ہے جس نے ہمارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا، ان سے

پوشاکیں چھین لیں، ہابیل و قابیل کولڑوادیا،اور پھر کثیر خلقت کو شرک ،زنا اور قتل پر اکسا کر خدا کی راہ سے برگشتہ کردیا۔آج یہ حاجی اسی راہ پر ہیں جہاں چار ہزار سال قبل ابراہیمؑ تھے۔جب انہوں نے اسماعیلؑ کو لیا اور انھیں قربان کرنے کے لئے آگے بڑھے۔اسی اثنا میں ابلیس آدھمکا اور ابراہیمؑ کے کان میں سرگوشی کی کہ پاگل ہوئے ہو؟کیا اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے قتل کروگے ؟ابراہیمؑ نے اس پر سنگباری کی اور دھتکار دیا۔آج اس بندۂ خدا کو بھی شیطانی وسوسوں سے مغلوب نہیں ہونا ہے بلکہ اسے سنگسار کرکے طاغوت کا انکار کرنا ہے۔کنکریاں مار کر آج اعلان براء ت کیا جائے گا۔پھر جب کنکریاں مار دی گئیں تو تلبیہ ختم ہوا کیونکہ شیطان کی ناک رگڑی جاچکی اور رحمان کا بول بالا ہوا۔لیکن کیا کبھی ہم نے غور کیاکہ وہ لوگ جو فی الوقت اِس رکن کو انجام نہیں دے رہے ہیں ،یا وہ لوگ جنھوں نے کبھی اس رکن کو انجام دیا تھا،یا وہ لوگ جو اس رکن کو انجام دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ،یا وہ لوگ جو انجام دینے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے ۔ایسے تمام لوگ فی الوقت کیا کریں ؟کیا وہ طاغوت کا انکار نہیں کریں گے ؟کیا وہ شیطانی وسوسوں سے اسی طرح مغلوب ہوتے رہیں گے جیسا کہ ہو رہے ہیں ؟نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہم سب کو جو مخصوص رکن کو انجام دے رہے ہیں اور نہیں دے رہے ہیں، تمام ہی مسلمان طاغوتی نظام،افکار و خیالات اور فکر و نظر کا اپنے رویہ سے انکار کریں گے۔ لیکن کیا ایسا ہو رہا ہے؟موجودہ حالات میں یہ سوال بہت اہم بن جاتا ہے۔

عہد حاضر میں مسلمانوں کی صورتحال تشویش ناک ہے، چہار جانب سے مظلومین پر ظلم وزیادتیوں کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں لیکن پھر بھی ہمیں اپنے اعمال وافکار پر نظر ثانی کا موقع نہیں ملتا، کیوں؟ایسا کیوں ہے؟شاید اسی لیے کہ یہ عبادات جو ہم انجام دے رہے ہیں،اس کے باوجود ہمارا تعلق اپنے خدا سے وہ نہیں رہا جو مطلوب ہے۔ہم مساجد میں تو بندگان خدا ہیں لیکن مسجد کی چہار دیواری سے باہر نکلتے ہی بندگان نفس بن جاتے ہیں۔درحقیقت آج یہ وہ بیماری جس نے ہمارے ایمان کو حد درجہ کمزور کر دیا ہے۔ہم ہی میں سے بہت سے ایسے مسلمان ہیں جو ظالم و جابر لوگوں کا تعاون کرتے ہیں، خصوصاً ان لوگوں کا جو ملتِ اسلامیہ کو منتشر کرنے کے درپے ہیں۔نہ صرف منتشر بلکہ اس کے وجود کو ہی مٹادینا چاہتے ہیں۔لہٰذاایسے لوگوں کی نمازیں اور ان کے روزے ان کی قربانیاں اور ان کے حج کسی کام نہ آئیں گے کیونکہ وہ اپنے افکار واعمال سے ان لوگوں کی مدد کررہے ہیں جو اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کے خلاف سعی و جہد کرنے والے ہیں۔پھر یہ جن کی مدد کر رہے ہیں انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دراصل یہ وہی ظالم و جابر ہیں جنھوں نے پے درپے انبیاء ورسل کا قتل کیا نتیجتاً ان کے حصہ میں گمراہی لکھ دی گئی۔خدا کی قسم انبیا ورسولوں کے قاتلوں کی مدداور اس کے نتیجہ میں ایک ذراسا نام ونمود،نہ اِس دنیا میں اور نہ ہی اُس دنیا میں کسی کام آئے گا۔حالات کے پس منظر میں اور مخصوص

عبادت کو انجام دیتے ہوئے لازم ہے کہ کسی بھی واقعہ کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کرکے نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ جب کسی واقعہ ہی کو نہیں بلکہ قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کے کسی حصے کو بھی سیاق و سباق سے الگ کرکے پڑھا، سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے تو اس کے وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جو ہونے چاہیں۔ برخلاف اس کہ گمراہ کن لوگ اسی ذریعہ سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور اپنے لیے مزید گناہ سمیٹتے جاتے ہیں۔ پس یہی معاملہ فریضہ حج و قربانی کی ادائیگی کا بھی ہے کہ جس کو اگر اس کے حقیقی پس منظر اور تقاضوں سے علیحدہ کرکے سمجھا جائے تو مطلوبہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے لیکن اگر اس کے حقیقی فلسفہ کو خوب اچھی طرح اپنے ظاہر و باطن میں اتار لیا جائے تو ممکن ہے کہ آنے والا حج اور ادا کی جانے والی قربانی ہمارے لیے ایک نئی زندگی کی شروعات کا ذریعہ بنے گی۔ اس زندگی کا جہاں ہر غیر اسلامی افکار و نظریات سے اعلان برات علی الاعلان اظہار کیا جائے گا۔

ملک کا مستقبل اور متوقع دو لیڈران کا رویہ

کسی بھی معاشرے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تہذیب و ثقافت پر نظر ڈالی جائے کیونکہ ہر معاشرہ اپنی مقدس تہذیب و ثقافت کا عکاس ہوتا ہے۔کچھ یہی حال ہندوستان اور "ہندوستانی معاشرہ" کی ہے۔ گرچہ ہندوستانی معاشرہ مختلف نوع ثقافتوں کا ایک ملا جلا مرکب ہے اس کے باوجود یہ اکثریت و اقلیت میں تقسیم ہے۔اکثریت ان لوگوں کی جو ایک خاص فکر و عمل کے علمبر دار ہیں اور ہند میں رہنے کی وجہ سے اپنے آپ کو "ہندو "کہتے ہیں تو اقلیت ان کی جو اپنا تشخص برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور خود کو مسلمان کہلانا پسند کرتے ہیں۔لیکن ان دو متضاد معاشروں کو باہم ملانے اور یکسانیت پیدا کرنے کی کوششیں وقتاً فوقتاً جاری رہی ہیں۔ مقصد کے حصول کے لیے کبھی "گنگا جمنی تہذیب "کا لفظ استعمال کیا گیا تو کبھیکوشش کی کہ " کومن پرسنل لاء " متعارف و مقبول کیا جائے ۔اس کے باوجود ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی جدوجہد میں مصروف لوگوں کو کامیابی نہیں مل سکی۔شاید اس لیے کہ اقلیتی طبقہ اپنی پہچان برقرار رکھنا چاہتا ہے یا پھر شعوری و لاشعوری طور پر افکار و نظریات کی سرد جنگ مانع رہی ہے۔ گرچہ ہند کے رہنے والے اب تک سب "ہندو" نہیں بن سکے لیکن معاشرتی بنیادیں وتصورات، رسم و رواج اور سماجی نظام نے اپنی سطح تک ہر دو معاشروں پر اپنے اثرات ضرور مرتب کر

لیے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ عمل کی حد تک مسلمان معاشرہ جو درحقیقت اسلامی معاشرہ کا عکاس ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہے۔اوراس کی خطرناک تصویر یہ ہے کہ فکر و نظر میں بھی مسلمان اسلامی معاشرہ کے قیام میں سرگرم نہیں ہیں۔پس یہ لمحۂ فکر یہ ہے جس پر توجہ نہ کی گئی تو جو کچھ باقی ہے اس کے مٹنے کا بھی اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔آج ضرورت ہے کہ اِسی پس منظر میں ملک کی سیاست کو بھی سمجھا جائے۔

سردار پٹیل کے سوانح نگار کہتے ہیں:

سردار پٹیل کو لے کر بی جے پی کے وزیر اعظم کے عہدے کے امید وار نریندر مودی اور کانگریس کے درمیان چل رہی رسہ کشی کے پس منظر میں پٹیل کی مشہور سوانح عمری لکھنے والے راج موہن گاندھی نے کہا ہے کہ پٹیل کبھی بھی مودی کو اپنا نظریاتی جانشین نہ مانتے اور انہیں مودی کے مسلمانوں کے تئیں رویے سے بہت دکھ ہوتا۔ ملک کے پہلے وزیر داخلہ سردار پٹیل کی سوانح عمری لکھنے والے اور مہاتماگاندھی کے پوتے راج موہن گاندھی نے کہا کہ پٹیل ایسا بالکل نہیں مانتے کہ 2002 میں گجرات کے فسادات کے وقت مودی نے اپنا راج دھرم پوری طرح ادا کیا تھا۔ اس جملہ کا استعمال اس وقت کے وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے مودی کی مذمت کرنے کے لیے کیا تھا۔ راج موہن گاندھی نے کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ پٹیل صرف ایک ساستداں کے طور پر

ہی نہیں بلکہ گجرات کے باشندہ ہونے کی وجہ سے بھی اس بات سے بہت مایوس، دکھی اور پریشان ہوتے کہ ایسے واقعات گجرات میں نہیں ہونے چاہیے تھے اور اس وقت کی حکومت اسے روکنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ایک پروگرام میں بات کرتے ہوئے راج موہن گاندھی نے کہا کہ بی جے پی کے حامیوں کی طرف سے یا خود ہی خود کو پٹیل کا جانشین سمجھنے والے مودی، پٹیل کو نہ تو صحیح طریقے سے سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کا حق نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر مودی اس تصویر پر ابھرے ہوتے تو بہت اچھا ہوتا، لیکن دو وجوہات سے وہ شکست کھا جاتے ہیں۔ پٹیل نے گاندھی اور انڈین نیشنل کانگریس کی سرپرستی میں ایک شاگرد کی طرح ترقی کی۔ مودی نے یہ شروعات آر ایس ایس کی سرپرستی میں کی۔ یہ ایک بہت بڑا فرق ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ ایک شخص کے طور پر پٹیل ہمیشہ سے ایک گروپ کی تعمیر کرنے والے ہیں، دوسرے لوگ ان کے روز مرہ کی زندگی میں اہم کردار رکھتے تھے، جبکہ مودی ایسے ہیں کہ میں چاہوں گا کہ وہ ایسے ہی رہیں۔ راج موہن گاندھی نے کہا کہ پٹیل کو کانگریس کا رکن ہونے پر فخر تھا اور انھوں نے یہ قبول کیا تھا کہ نہرو کو وزیر اعظم بنانے کا مہاتما گاندھی کا فیصلہ درست تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ نہرو کو بین الاقوامی سطح پر مزید شناخت حاصل تھی۔ مرد آہن کے نام سے جانے جانے والے پٹیل نے 1947 کے فسادات کے دوران آر ایس ایس کے کاموں کی تعریف کی تھی، لیکن گاندھی کے قتل کے بعد پٹیل کا رخ بدل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اس ہندوستانی نظریاتی تنظیم کے دشمن نہیں تو سخت

مخالف ضرور تھے۔

!اور جالندھر میں پٹیل کی مورتی

جالندھر، ریاست پنجاب میں چل رہی سیاست کے دوران ریاستی کانگریس کے سینئر لیڈر وریندر شرما مطالبہ کر رہے ہیں کہ میونسپل کارپوریشن کے اسٹور میں رکھی پٹیل کی کانسہ کی مورتی کو شہر کے پٹیل چوک پر نصب کیا جائے۔ لیکن جہاں ایک جانب بی جے پی کی قیادت والی جالندھر نگر نگم فی الحال 6 سال پرانی پٹیل کی کانسہ کی مورتی کو تلاش کرنے میں ناکام ہے۔ وہیں دوسری جانب دونوں پارٹیوں کے لیڈران ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے نظر آ رہے ہیں۔ کانگریسی کہتے ہیں کہ بی جے پی کے لیڈران نے ہی مورتی کو گم کرکے اسے نیست و نابود کر دیا ہے اور شہر کے میئر کو بتانا چاہیے کہ آخر پٹیل کی مورتی کہاں ہے؟ تو بی جے پی کہتی ہے کہ گجرات میں پٹیل کی مورتی کا سنگ بنیاد رکھتے ہی کانگریسیوں کو پٹیل کی یاد آ گئی۔ معاملہ یہ ہے کہ پٹیل کے انتقال کے بعد 1950 میں پٹیل کی ایک مورتی کو ریلوے اسٹیشن پر لگایا گیا تھا۔ ریلوے کی مخالفت کے بعد کی وجہ سے تین سال بعد اسے پرانے ڈی سی آفس واقع میونسپل دفتر میں لگوا دیا گیا۔ بعد میں دقت ہونے کی وجہ سے 1973 میں مورتی کو وہاں سے ہٹا دی گئی اور تب سے یہ کارپوریشن کے اسٹور میں رکھی ہوئی تھی۔ اور اب جب اس کو پٹیل چوک پر لگانے کی بات آئی تو وہ ملی نہیں۔ اس پورے واقعہ کے پس

منظر میں بہت اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اس ملک مین پٹیل اور اس کی مورتی کی حیثیت کیا ہے۔اس کے باوجود آج کل مورتیوں کے ملک میں پٹیل کی مورتی پر سیاست جاری ہے!

سقوط حیدرآباد بھی پس منظر میں ہے!

مرد آہن "کو اگر سقوط حیدرآباد وغیرہ کے پس منظر میں سمجھا جائے تو شاید ممکن ہے" کہ نریندر مودی،ان کی فکر،ان کے ماضی و مستقبل کے عزائم کو سمجھنے میں بھی آسانی ہو۔17،جنوری 1948ء کو، ممبئی میں 50 ہزار سے زائد اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے وزیر داخلہ ہند سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کہا تھا "گاندھی جی عدم تشدد اور کچھ نہ کرو کی تلقین کرتے ہیں مگر ہم نے حکومت سنبھالی ہے اور ہمارے ملک میں گڑبڑ ہوتی ہو یا ملک کے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو تو اس کی ذمہ داری ہم پر ہے اور ہم خاموش نہیں رہ سکتے "۔ساتھ ہی 15،اگست1948ء کو یوم آزادی ہند کے موقع پر نائب وزیراعظم ہند سردار ولبھ بھائی پٹیل نے نشری تقریر میں کہا تھا" کشمیر میں ابھی جنگ جاری ہے اور جہاں تک حیدرآباد کا تعلق ہے وہ ایک ناسور بن گیا ہے جس کا زہر بقیہ ہندوستان میں بدستور سرایت کرتا جا رہا ہے۔حکومت ہند کو اس بات کا اعتماد ہے کہ وہ کشمیر اور حیدرآباد کے مسائل کو آنے والے دنوں میں حل کرلے گی"۔مزید8،اگست 1948ء کو ہندوستانی پارلیمنٹ میں وقفہ سوالات میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نائب وزیراعظم ہند نے

بتایا کہ "حکومت کو جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان سے ظاہر ہے کہ اب تک 8، لاکھ ہندوستانی مسلمان حیدرآباد میں پناہ گزینوں کی صورت میں منتقل ہو چکے ہیں اور حکومت ہندوستانی مسلمانوں کی پناہ گزینوں کی صورت میں منتقلی کے انسداد کیلیے ممکنہ تدابیر پر غور کر رہی ہے "۔ سطور بالا کی تفصیلات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نائب وزیراعظم و وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے سقوط حیدرآباد میں کس حد تک اپنا نظری اور عملی کردار ادا کیا تھا! سقوط حیدرآباد، تاریخ کا ایک قابل لحاظ سفر طے کر چکا ہے جس کی تفصیلات میں بہت کچھ کہنا سننا باقی ہے۔ اب ہمارے لئے یہ سوال ہی اہم رہ گیا ہے کہ حیدرآباد کے مسلمان سقوط حیدرآباد کے تاریخی المیہ سے کیا سبق سیکھ سکتے ہیں؟ جبکہ مورخین کا پہلا اصرار یہی ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ میں گزرے ہوئے واقعات سے سیکھا جائے کیونکہ وہ ایسے تجربات ہوتے ہیں جن کے استعمال سے تاریخی بصیرت اور شعور پیدا ہوتا ہے اور انسانی مستقبل کو ایک بامعنی سمت دی جا سکتی ہے۔ اس پس منظر میں مستقبل کو بامعنی بنانے کیلیے ، بہادر یار جنگ کے الفاظ بھی ہمیں یاد رکھنا پڑیں گے ، بشرطیکہ ہم اپنے تاریخی شعور سے کام لینا چاہتے ہوں ۔ انھوں نے کہا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اگر آپ نے فوراً حالات حاضرہ سے واقف ہو کر اپنے امراض" اور کمزوریوں کا علاج نہ کیا تو صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے

اقتباس: سقوط حیدرآباد میں سردار پٹیل کا رول،بشکریہ تعمیر نیوز)۔) "

مستقبل اور متوقع دو لیڈران کا رویہ
:

یہ وہ مکمل پس منظر، پیش منظر اور حالات ہیں جن کی روشنی میں سردار پٹیل، ان کی فکر، ان کے منصوبہ اور ذمہ دارنہ کردار بحیثیت وزیر داخلہ ہند ا بھر کر سامنے آتا ہے۔شاید اُسی پس منظر میں بی جے پی کے موجودہ "مرد آہن "اپنی ذمہ داری کو جوان کو پارٹی کی جانب سے 2014الیکشن کے تعلق سے دی گئی ہے، کا احساس رکھتے ہوں گے۔جس طرح ملک کی سالمیت اور یکجہتی کو برقرار رکھنے کے لیے سردار پٹیل نے بہت کم وقت میں اپنا کردار بخوبی ادا کیا ٹھیک اسی طرح مودوی اور ان کی پارٹی کے افراد اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا چاہتے ہوں گے !لیکن یہ ہمارا اور عوام کا قیاس ہے کہ وہ ایسا اور ایسا کرنا چاہتے ہیں یا کرنا چاہتے ہوں گے۔۔برخلاف اس کے جس طرح گزشتہ دنوں ایک طرف اپنی تقریروں میں انھوں نے ایک نہیں مختلف مواقعہ پر اپنی کم علمی کا اظہار کرتے ہوئے تاریخ اور تاریخی واقعات و شخصیات کو مجروح کیا ہے وہیں دوسری طرف گودھرا اور گجرات میں انسانی جانوں کی ہلاکت اور بحیثیت وزیر اعلیٰ پورے معاملے کو کنٹرول کرنے میں ناکامی بھی لازماًہمارے سامنے رہنا چاہیے۔صرف ان دو واقعات کا اگر بغور مطالعہکیا جائے توثابت ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں وہ ملک اور اہل ملک کے حق میں سود مند ثابت نہیں ہو سکتے۔دوسری طرف خاندانی سیاست کے وارث راہل گاندھی جوایک طویل عرصہ سے سیاست میں داخلہ

لیے ہوئے ہیں اس کے باوجود وہ اپنی پہچان بنانے میں ناکام رہے ہیں۔اس کی ایک مثال سابقہ اترپردیش کی ریاستی ذمہ داری اور اس میں ناکامی ہے تو وہیں حالیہ دنوں لکھی لکھائی تحریروں کو تقریوں میں منتقل کرتے ہوئے مظلوم مظفر نگر کے مسلمانوں کا تخریب کاری طاقتوں سے رابطہ میں رہنے کا الزام ہے۔اس واقعہ نے جہاں ایک جانب مظلوم مسلمانوں کے زخموں پر مزید نمک مرچ چھڑکنے کا کام کیا ہے وہیں دوسری جانب وہ اپنی سیاسی ناتجربہ کاری کا بھی اظہار کرچکے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب کانگریس اور بی جے پی کے ان دو لیڈران میں سے کون مستقبل قریب میں ملک کی باگ دوڑ سنبھالتا ہے۔ لیکن ان دونوں ہی لیڈران پر اہل ملک کو اطمینان نہیں ہے۔اور اگر یہ واقعہ ہے تو پھر کیا ہونا چاہیے ؟یہ فیصلہ بھی قبل از وقت ضروری ہے!

اصلاح کا زیادہ حق دار فرد نہیں نظام ہے

کہتے ہیں جمہوری حکومت میں مقننہ یعنی پارلیمنٹ یا اسمبلی، انتظامیہ اور عدلیہ نظم مملکت کے تین اہم ادارے یا ستون ہیں جن کے سہارے جمہوری نظام کی تاسیس ہے۔البتہ چوتھا ستون وہ زندہ ضمیر و متوازن میڈیا ہے جو اس پورے نظام کو غلطیوں سے پاک کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔اس طرح یہ چار ستون مل کر دیدہ زیب جمہوری عمارت کو قابل رہائش بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔ایک طرف جمہوری ملک ،ریاست کی ترقی و خوشحالی، لوگوں کی فلاح وبہتری، تعمیر و تصعید، امن و قانون کی بر قراری اور حقوق واختیارات کی ادائیگی میں متذکرہ تین اداروں کا اہم رول ہوتا ہے وہیں دوسری طرف صاف وشفاف انتظامی مشنری، گڈ گورننس اور عوامی خوشحالی کے مفاد میں یہ انتہائی ناگزیرامر ہے کہ میڈیا بھی احسن طریقہ سے اپنی ذمہ داری ادا کرتا رہے۔

دراصل صحافت کسی بھی معاملے کی تحقیق اور پھر اسے صوتی، بصری یا تحریری شکل میں بڑے پیمانے پر قارئین، ناظرین یا سامعین تک پہنچانے کے عمل کا نام ہے۔ساتھ ہی حکومتی اداروں کی کارکردگی، تجارت اور پیشہ وارانہ صورتحال سے آگاہی،اور معاشرہ میں انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو بھی صحافت اجاگر کرتی

ہے۔ لیکن سب سے اہم نکتہ جو صحافت سے منسلک ہے وہ واضح اور بالکلٹھیک بنیادوں پر عوام کوانجام پذیر ہر خبر سے باخبر رکھنے کا ہے۔ اس پس منظر میں صحافت ایک مقدس پیشہ ہے اور جو شخص اس کام کو انجام دے وہ قابل قدر ٹھہرتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں صحافت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ کی درج ذیل آیات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریقِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی پٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے" (النساء: ۱۳۵)

۔مزید فرمایا: " اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خداترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے (المائدہ: ۸)

۔سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں: "ان آیات میں یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو۔ تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمہیں

اس بات پر کمربستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔ ساتھ ہی تمہاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی رو رعایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمہارے پیشِ نظر نہ ہو"۔

اِس پس منظر میں اس وقت تک کوئی بھی معاشرہ بیرونی سازشوں، خفیہ تدبیروں اور نقصاندہ عناصر سے محفوظ رہ سکتا ہے جب تک کہ حق و انصاف کا فریضہ ادا کرنے والے اپنی ذمہ داریاں بحسن خوبی انجام دیتے رہیں۔ اس کے برخلاف عمل کے نتیجہ میں وہ افراد اور ادارے جو حق و انصاف کے قیام میں تعاون کرنے والے ہیں، نہ صرف خود ذلیل و خوار ہونگے بلکہ اپنے دور رس منفی اثرات بھی مرتب کریں گے۔ لیکن چونکہ حق و انصاف کا قیام نہایت مشکل کام ہے لہذا معاشرے اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ایک ایسا نظام برپا کرے جس میں ہر فرد تنقید سے بالاتر نہ ہو۔ گرچہ وہ شخص یا ادارہ بااقتدار ہو، حکومت سے وابستہ ہو، مذہبی امور میں اپنی مخصوص پہچان رکھنے والا ہو یا اُن اداروں سے وابستہ ہو جو خود اس نظام کے قیام و استحکام میں معاون و مدد

ہوں۔ اس پس منظر میں جمہوری نظام میں قانون یعنی مقننہ اور صحافت سے وابستہ افراد سر فہرست اس ذمہ داری کو ادا کرنے والے ہیں۔ اور اس کے بعد مذہب کا درجہ آتا ہے جو موجودہ قانون کی رو

سے فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ جمہوریت کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ فردِ واحد مذہب پر عمل پیرا ہے یا نہیں اور مذہبی تعلیمات اور افراد کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا بھی ہے یا نہیں۔اور یہی وہ سب سے اہم نکتہ ہے جو آج کسی بھی دنیاوی نظامِ کو غلطیوں سے پاک رکھنے میں ناکام ہے۔ موجودہ جمہوری نظام کی ناکامی کی ایک وجہ جہاں الٰہی احکامات سے دوری اختیار کرنا ہے تو وہیں یہ حقیقت بھی ہے کہ ایک طویل عرصہ سے اسلامی تعلیمات کے علاوہ کوئی اور الٰہی ہدایت و رہنمائی موجود بھی نہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بااقتدار افراد و طاقتیں اس نظام رحمت کو اپنی ذات اور مفاد کے پس پشت زحمت گردانتی آئی ہیں اور یہی کچھ وہ آج بھی کر رہی ہیں۔

موجودہ ہندوستان اور اس کی معاشرتی بنیادیں بہت کمزور ہو چکی ہیں۔جمہوریت جو ملک عزیز میں رائج ہے اور جمہوری نظام جس پر عمل درآمد ایک طویل عرصہ سے جاری ہے، اس کی ناکامیاں بہت حد تک کھل کر سامنے آچکی ہیں۔ان تمام ناکامیوں کی کوئی ایک وجہ نہیں ہے بلکہ مختلف محاذ پر مختلف کوتاہیاں اور کمیاں ہیں جس کی بنا پر یہ نظام خود ہی اپنے خاتمہ کی جانب رواں دواں ہے۔ لیکن توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ اگر واقعی ایسا ہے، جو واقعہ بھی ہے، تو پھر اس وقت جب کہ یہ نظام مزید بگاڑ میں مبتلا ہو جائے گا تب متبادل کیا ہوگا؟ یہ وہ سوال ہے جس پر غور و فکر کرنے والوں کو لازماً سوچنا، چاہیے۔ہم سب جانتے ہیں کہ

موجودہ جمہوری نظام ظلم وزیادتیوں کو فروغ دینے میں معاون ہے، نہ صرف فرد کا استحصال اس کا خاصہ ہے بلکہ معاشرہ کی قدریں جو کمزور ہو رہی ہیں اس میں بھی اس کا بھرپور کردار ہے۔اور جو واقعات گزشتہ چند دنوں میں ہندوستان میں منظر عام پر آئے انھوں نے متذکرہ خیال کو پختگی بخشی ہے۔انہی واقعات میں جہاں ایک جانب ہندوستان کی سپریم کورٹ کے ریٹارڈ جج پر زیر تربیت خاتون وکیل نے جنسی استحصال کا سنگین الزام لگایا ہے۔وہیں سماج کے سنگ رکشک اور پچھڑی ذاتوں کو برابری کے حقوق دلانے والے سیاسی رہنما اور ممبر پارلیمنٹ دھننجے سنگھ پر ایم ایل اے بنانے کا لالچ دے کر اپنے حامی کی بیوی کے ساتھ بندوق کی نوک پر جسمانی رشتہ بنانے کا الزام ہے۔مذہبی گرو آسارام اور اس کے بیٹے پر جنسی زیادتیوں کے الزامات اور اب بدعنوانی کے خلاف آواز اٹھانے والے "تہلکہ میگزین" کے تیز و طرار ایڈیٹر ترون تیج پال پر ان ہی کے دفتر کی ایک جونیئر خاتون صحافی نے جنسی استحصال کا جو الزام لگایا ہے اس نے پوری صحافت کو کٹھرے میں کھڑا کر دیا ہے۔اور حالیہ معاملہ اس لیے بھی سنگین اور سنجیدہ ہے کیونکہ متاثرہ ترون تیج پال کی بیٹی کی سہیلی ہے۔ان حالات میں مسلمان جس مقام پر اور جس حیثیت سے بھی موجود ہوں۔لازم ہے کہ ہر شخص اسلامی تعلیمات کو سمجھے عمل سے تبلیغ کرے اور ساتھ ہی اسلام کو ایک مکمل نظام رحمت سمجھتے ہوئے اس کے ہر پہلو پر عمل کی راہیں نہ صرف تلاش کرے بلکہ بھرپور تعاون بھی دے۔چاہے مسلمان نظام باطل میں ہوں یا یا دار الکفر میں، دونوں

ہی مقامات پر اسلامی نظام حیات کا فروغ اور قیام کی منظم سعی و جہد ہر شخص پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا آج چہروں کی تبدیلی کی بجائے نظام کی تبدیلی اور فرد کی اصلاح کی بجائے نظام کی اصلاح زیادہ ضروری اور لازمی عمل ہے۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں!

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ان سے پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں ؟" (الزُمَر: ۹)۔مزید کہا کہ : "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں" (فَاطِر: ۲۸)۔ معلوم ہوا کہ علم سے مراد فلسفہ و سائنس اور تاریخ و ریاضی وغیرہ درسی علوم نہیں ہی بلکہ صفات الٰہی کا علم ہے قطع نظر اس سے کہ آدمی خواندہ ہو یا ناخواندہ۔جو شخص خدا سے بے خوف ہے وہ علّامہ دہر بھی ہو تو اس علم کے لحاظ سے جاہل محض ہے۔اور جو شخص خدا کی صفات کو جانتا ہے اور اس کی خشیت اپنے دل میں رکھتا ہے وہ اَن پڑھ بھی ہو تو ذی علم ہے۔علم کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس کو اگر حل کر لیا جائے تو پھر زندگی کا مقصد حل ہو جاتا ہے اور اگر اس کے جواب میں تردّد اور تذبذب ہو،تامل و شک و شبہ ہو،اندیشہ خوف اور ڈر ہو تو پھر زندگی کا ہر کام ایک لا حاصل عمل ہوگا جو یقین و اعتماد پر نہیں بلکہ گمان،شک و شبہ اور وہم پر منحصر ہوگا۔ نتیجتاً انسان کی فکر اس کا نظریہ اس کا عمل اور اس کی شخصیت سب کچھ مجروح ٹھہرے گی۔یہ معاملہ تو ایک انسان کا ہے لیکن اگر انسانوں کے گروہ اس پر عمل پیرا ہوں تو وہ گروہ کے گروہ اور وہ اجتماعیت مکمل طور پر ناکامی کا شکار ہوگی۔وہ لوگ جو اس نظریہ اور فکر کے علمبردار ہیں وہ خود بہ خود ایک عرصہ

بعد ثابت کر دیں گے کہ ان کی بات میں وزن نہیں۔ اور جس بات میں وزن نہ ہو اس کے پیش کرنے والوں کی نہ وقعت ہوتی ہے اور نہ ہی قدر و منزلت۔ کہا کہ: "اور لُوط کو ہم نے حکم اور علم بخشا اور اُسے اُس بستی سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی۔۔۔۔ درحقیقت وہ بڑی ہی بُری، فاسق قوم تھی" (الانبیا: ۷۴)۔ "حکم اور علم بخشا" بالعموم قرآن مجید میں نبوت عطا کرنے کا ہم معنی ہوتا ہے۔ "حکم" سے مراد حکمت بھی ہے، صحیح قوت فیصلہ بھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سند حکمرانی (Authority) حاصل ہونا بھی۔ رہا "علم" تو اس سے مراد وہ علم حق ہے جو وحی کے ذریعہ عطا کیا گیا ہو۔ قرآن کی روشنی میں یہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علم وہ ہے جو اللہ کے ذریعہ انبیا علیہ السلام کو حاصل ہوا اور جس میں ذرہ برابر کمی بیشی کیے بنا اللہ کے بندوں کو پہنچا دیا گیا ہو۔ اب جو حکمتِ خداوندی سے محروم ہو، جس میں قوتِ فیصلہ نہ پایا جاتا ہو اور جس کے پاس "علم" ہی نہ ہو وہ کیونکر صحیح الدماغ ٹھہرے گا اور کیونکر وہ علم کی بنا پر صحیح فیصلہ کر سکے گا۔ یہی وجہ رہی کہ جن لوگوں نے بھی "علم" کے بغیر مسائل کو حل کیا وہ نفسانی خواہشات کے علمبردار بن گئے۔ پھر انھوں نے نفسانی خواہشات کی تشنگی کو دور کرنے کے لیے خواہشاتِ نفس کی اس قدر بندگی کی کہ وہ انسانوں کے زمرہ سے نکل کر حیوان، اور بعض مواقع پر حیوانوں کو بھی شرمسار کرنے والے ٹھہرے۔ فی الوقت ہم اپنی بات کے پس منظر میں ہم جنس پرستی کے اُس اہم موضوع کو اٹھانا چاہتے ہیں جس کی زد میں آج بڑے پیمانہ پر

نوجوان نسل گمراہی کا شکار ہو رہی ہے۔

:ہم جنس پرستی پر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلے

ہندوستانی تعزیرات کی دفعہ 377 کے تحت ایک ہی جنس سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے درمیان جسمانی تعلقات کو جرم قرار دیا گیا ہے اور اس فعل کے لیے انہیں دس سال کی سزا سنائی جا سکتی ہے۔ دراصل دفعہ 377 تقریباً ڈیڑھ سو برس پرانا ایک قانون ہے جس کے تحت صرف مرد اور عورت کے درمیان روایتی اور مروجہ جنسی تعلق کو ہی جائز جنسی فعل مانا گیا ہے۔ جبکہ دوسرے تمام طریقوں کو نہ صرف غیر فطری قرار دیا گیا ہے بلکہ انہیں غیر قانونی اور قابل سزا عمل کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ گزشتہ ہائی کورٹ فیصلہ جس میں ہم جنس پرستی اختیار کرنے والوں کو آزادی فراہم کی گئی تھی اور جس کے خلاف ہندو، عیسائی اور مسلم مذہبی تنظیموں نے چیلینج کیا تھا، سپریم کورٹ آف انڈیا نے اپنا رخ واضح کردیا ہے۔ 2009 میں ناز فاؤنڈیشن اور دیگر کی مفاد عامہ کی عرضی پر فیصلہ سناتے ہوئے دہلی ہائی کورٹ نے کہا تھا کہ ہم جنس پرستی کو تعزیرات ہند کی دفعہ 377 کے تحت جرم کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کے خلاف مسٹر کوشل، مسٹر تراچی والا اور کئی دیگر غیر سرکاری اور مذہبی تنظیموں نے سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ چار سالہ طویل مدت کے بعد سپریم کورٹ آف انڈیا نے ہائی کوٹ کے اس حکم کو کالعدم قرار دے دیا جس

میں اس نے باہمی رضامندی سے ہم جنس پرستی کو جرم کے دائرہ سے باہر کردیا تھا۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ میں جسٹس سنگھوی نے فیصلہ کی تلخیص پڑھ کر سناتے ہوئے کہا کہ ہم جنس پرستی کے تعلقات کو جرم کے دائرہ سے باہر رکھنے کے ہائی کورٹ کے فیصلہ کو منسوخ کیا جاتا ہے۔ تاہم عدالت نے کہا کہ پارلیمنٹ متعلقہ دفعہ کو ہٹانے کے سلسلے میں کوئی قانونی فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہے۔ عدالت نے کہا کہ پارلیمنٹ کو دفعہ 377 کو منسوخ کرنے کا اختیار ہے لیکن جب تک سزا سے متعلق یہ دفعہ موجود ہے، تب تک عدالت اس طرح کے جنسی تعلقات کو قانونی طور پر تسلیم نہیں کرسکتی۔ عدالت عظمی کے اس فیصلہ کے بعد اب ہم جنس پرستی ایک بار پھر جرم کے دائرہ میں آگئی ہے۔ حالاں کہ ہم جنس پرستی کی حمایت کرنے والی تنظیموں نے کہا کہ وہ سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے خلاف نظر ثانی کی عرضداشت دائر کریں گے۔ اس پورے واقعہ کے پس منظر میں غور فرمائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اِن جیسے تمام مطالبات حقیقت میں اس وقت ہی اٹھائے جاتے ہیں جب کہ "علم" کو پس پشت ڈالتے ہوئے غیر فطری خواہشات کو فوقیت دی جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مطالبات ان لوگوں کی جانب سے اٹھائے جاتے ہیں جو عام طور پر پڑھے لکھے، دقیانوسی خیالات سے بالاتر اور روشن دماغ و روشن خیال تصور کیے جاتے ہیں۔ اور جن کا دعویٰ ہے کہ "علم" کی تشکیل وحی کے بغیر ممکن ہے۔

!علم کی تکمیل وحی کے بغیر ممکن ہے، ایک کھوکلا دعویٰ

17 ویں اور 18 ویں صدی کے مفکرین نے مغرب میں برپا ہونے والے مذہب [عیسائیت] اور جدیدیت کی کشمکش کے دوران اس بات کا دعویٰ کیا کہ علم کی تشکیل وحی کے بغیر خالصتاً عقل کی بنیادوں پر کی جاسکتی ہے۔ اس دعوے کا اصل محرک وہ بے اطمینانی تھی جو ان مفکرین کو مذہب عیسائیت کے ایمانیات سے تھی ۔یعنی انھیں مذہب سے یہ شکایت تھی کہ اس میں ایمان پہلے لایا جاتا ہے اور عقل کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ لہٰذا انھیں اس بات پر اصرار تھا کہ عقل کو بنیاد بنا کر ایک ایسے علم کی تعمیر کی جاسکتی ہے جو نہ صرف آفاقی ہوگا بلکہ ہر قسم کے ایمانیات، نظریات و مفروضات سے پاک بھی ہوگا۔ اور اگر ایسا کرنا ممکن ہے تو پھر وحی کو علم کی بنیاد بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کو ہر قسم کی مذہبی جکڑ بندیوں سے آزاد کرکے ایک ایسے برتر اور اعلیٰ مقصد کے حصول کی طرف گامزن کیا جانا چاہیے جو سب کی فلاح کا باعث ہو۔ اس کے لیے انھوں نے استقرائی نظریہ سائنس کی مدد لی۔ استقرائی منطق کے نظریے کے مطابق سائنس کا آغاز مشاہدے سے ہوتا ہے، یعنی سائنس حصولِ علم کا ایسا طریقہ ہے جس میں مشاہدات کی بنیاد پر نظریات قائم کیے جاتے ہیں۔ ان مشاہدات کی بنیاد انسان کے حواس خمسہ پر ہے یعنی سماعت، بصارت، لمس، سونگھنا اور چکھنا۔ دعوی یہ ہے کہ ان حواس خمسہ سے حاصل ہونے والے مشاہدات کو بنیاد بنا کر آفاقی نوعیت کے نظریات قائم کرنا ممکن ہے۔ لیکن جب ان بنیادوں پر معاشرتی نظریات قائم کیے

گئے تو وہ کھوکھلے ثابت ہوئے۔یہی وجہ ہے کہ آج مغرب اور مغربی فکر کے علمبردار دنیا کے ہر حصے میں معاشرے کو صحیح رخ دینے میں ناکام رہے ہیں اور معاشرتی برائیاں بڑے پیمانہ پر پروان چڑھی ہیں۔معاشرتی خرابیوں کا نتیجہ ہے کہ خاندان منتشر ہوئے اور فرد اور معاشرہ اخلاقی زوال میں مبتلا ہو گیا۔نفس اور نفسانی خواہشات کو فوقیت دینے کا نتیجہ تھا کہ انسان کا ہر عمل اس کے مفاد کے گرد ہی ٹھہر کر رک گیا۔محبت و ہمدردی اور احساس ذمہ داری کے رجحانات تبدیل ہوئے اور دوسروں کے حقوق بڑے پیانے پر پامال کیے گئے۔پھر وہی چیز صحیح ٹھہری جس میں ایمانیات، عقائد، اور غیب پر ایمان کی نفی کی گئی تھی اور ان ہی چیزوں کو فروغ دیا گیا جس میں ذاتی غرض اور ذاتی مفاد کو اولیت دی گئی ہو اور جس میں خواہشاتِ نفس کو تسکین مل جائے۔پھر جن لوگوں نے ذاتی مفاد کی خاطر مذہب سے دوری ایک مخصوص وقت اور حالات میں حاصل کی تھی اب ان کے درمیان ہی ہر فرد اپنی ذاتی غرض کو اولیت دینے لگا۔رائے عامہ اور فرد کی ذاتی آزادی کو بنیاد بنا کر......جہاں بھی چند لوگ کسی خاص مطالبے کو لے کر اکھٹے ہو گئے انھوں نے قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے...اپنے مخصوص مفاد کے لیے قوانین تبدیل کروالیے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج تک مغربی معاشرے میں جتنے انقلابات آئے وہ سارے معاشی انقلابات تھے جن کے پیچھے محرومیاں اور طبقاتی انتقام کارفرما تھے۔ان

معاشروں میں مادی آسائشیں اور سہولیات ضرور موجود ہیں مگر انسان کی تعلیم وتربیت میں روحانی تسکین اور تعمیر چونکہ عنقا ہے اسلئے وہ نت نئے جسمانی اور نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتے چلے جارہے ہیں۔ کارل مارکس، لینن اور فریڈرک اینجلز وغیرہ جیسے کمیونسٹ انقلابی مفکرین نے جب سرمایہ داریت کے چنگل سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈنا شروع کیا تو انھوں نے ایک نیا معاشی نظریہ دیا جس میں انفرادی ملکیت کے تصور کی نفی کی گئی ۔ معاشی مساوات پر مبنی یہ نظریہ چونکہ محروم المعیشت لوگوں کے دلوں کی آواز تھی اس لئے اسے بظاہر پذیرائی ملی اور اس کے نتیجے میں وہاں سوشلسٹ انقلاب بھی برپا ہوگیا لیکن منزل چونکہ معاشی ضرورت کی تکمیل تک محدود تھی اس لئے وہاں مذہب سے بغاوت نے لوگوں کو اللہ کے وجود کا منکر بھی بنادیا۔ صاف ظاہر ہے جس معاشرے میں اللہ ہی نہ رہے وہاں الوہی اخلاقیات و قیودات کیسے بچ سکتی تھیں۔ چنانچہ خاندانی نظام یوں بکھرا کہ "عورت" ماں، بہن اور بیٹی کے تقدس سے بھی محروم ہوگئی۔اور آج جو کچھ ہندوستان میں ہو رہاہے اور جس میں ہر طبقہ کے افراد خواہشات نفس کے پیچھے سرگرداں ہیں وہ یہی ثابت کرتا ہے کہ الہامی ہدایات سے بے زار معاشرہ حد درجہ ذلت و پستی میں مبتلا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج چاہے وہ مذہبی گروہوں، سیاستداں ہوں، قانونی چارہ جوئی میں اور بظاہر عدل و انصاف کے قیام میں مصروف قانون و مقننہ کے افراد ہوں یا دیگر مختلف طبقہ حیات سے وابستہ ذمہ دار افراد، آج ان کی مثال اس بد ذات درخت کی سی ہے جو زمین کی

سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے اور جس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے۔

اسلام نے مرد و عورت کو بڑے پیانے پر حقوق فراہم کیے اور ساتھ ہی راہنمائی کی کہ نامحرم مرد و خواتین جائز حدود سے تجاوز نہ کریں۔ پھر پاک باز اسلامی معاشرے کے قیام و استحکام کے لیے کہا کہ مرد اپنی نظروں کو نیچی رکھیں اور عورتیں حجاب اختیار کریں ساتھ ہی وہ مرد و خواتین جو بلوغت کو پہنچ چکے ہوں وہ شادی کر لیں۔ اس کے برخلاف مغربی مفکرین نے نا محرم عورت و مرد کے درمیان اسلامی تعلیمات کا مکمل بائیکاٹ کرتے ہوئے غیر اخلاقی بنیادوں پر ایک دوسرے کے درمیان نزدیکیاں پیدا کیں اور ساتھ ہی کھلے مواقع بھی اور اس کو انھوں نے "حقوقِ نسواں" کا نام دیا۔ ایک طرف انھوں نے شادی کے معتبر رشتے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا تو دوسری طرف عورت کی عفت و عصمت پامال کرتے ہوئے اسے بے حجاب بنایا۔ اِس کے لیے انھوں نے "حقوقِ نسواں" کے اِس نام نہاد نعرے کی آڑ میں عورت کے ساتھ بے انتہا ظلم کیا ہے۔ کہیں اُسے مرد بنا کر نسائیت یا عورت پن سے محروم کر دیا۔ کہیں اُس پر معاش کا بوجھ ڈال دیا تو کہیں اُسے ایک شے یا product بنا دیا۔ اللہ رب رحیم نے مرد و عورت کے پر جو ذمہ داریاں عائد کی تھیں وہ متاثر ہوئیں۔ حاصل یہ کہ عورتیں اپنی ذمہ داریاں اور وہ اخلاقی معیار برقرار نہ رکھ سکیں جو مطلوب تھا۔ آج مغربی دنیا میں خاندانی نظام مکمل طور پر منتشر ہو چکا ہے اور اس کے راست اثرات معاشرتی زندگی پر نمودار

ہو چکے ہیں۔ موجودہ مغربی معاشرے میں کروڑوں بچے ایسے ہیں جنہیں ماں باپ کی محبت کا کوئی تجربہ ہی نہیں۔ مغرب میں کروڑوں والدین ایسے ہیں جن کے لیے وہ خدمت ایک خواب ہے جو اولاد سے مخصوص ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی معاشرے نفسیاتی اور جذباتی تسکین کے لیے ترس گئے ہیں اور طرح طرح کے نفسیاتی' ذہنی اور جذباتی عوارض نے انہیں گھیر لیا ہے۔ یہی وہ نفسیاتی، جذباتی اور ذہنی دباؤ ہے جس کی وجہ سے آج ان کے زیادہ تر فیصلے غلط رخ ہی اختیار کرتے ہیں۔ وہ جو فیصلہ بھی کرتے ہیں وہ ان کی اِس متذبذب زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ ایسے معاشرے اور ایسے اقتدار پذیر لوگوں سے مرعوب ہو کر اگر کوئی اپنے گھر، خاندان اور بیوی بچوں کو اُس رخ پر چلانے کا خواہاں ہو! تو وہ کیا کہلائے گا؟ کیا اُس شخص کا دماغی توازن برقرار کہلائے گا جس کے سامنے شواہد موجود ہوں اور پھر بھی نہ وہ اس کے منفی اثرات کو دیکھ سکتا ہو اور نا ہی محسوس کر سکتا ہو۔ کیا ایسے خبط الحواس لوگوں کی ہر معاملہ میں پیروی کی جانی چاہیے؟ اِن کے مطالبے ہم جنس پرستی کی بھی؟ نہیں، ہرگز نہیں، اس کے برخلاف حالیہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کی ہم ستائش کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ عدلیہ مستقبل میں بھی صحیح فیصلوں پر قائم رہے گی!

! الیکشن 2014،اقلیتیں اور متبادل کی تلاش

ملک میں فی الوقت 2014 کے پارلیمنٹری الیکشن قریب ہیں۔الیکشن کے پیش نظر خصوصاً اقلیتوں پر نظر کرم پڑ رہی ہے۔پیش نظر یہ ہے کہ اقلیتیں ان کو نظر انداز نہ کریں بلکہ پارٹی سے مضبوط رشتہ قائم کرتے ہوئے اس کا ووٹ بینک بن جائیں۔یہی وجہ ہے کہ چہار جانب سے محبت،اظہار ہمدردی اور مسائل کے حل کے بازار لگائے جا رہے ہیں اور محسوس ہوتا ہے ہر طرف غیر معمولی اخوت و محبت کا ماحول پروان چڑھ رہا ہے۔بی جے پی کے قومی نائب صدر اور پارٹی میں مسلم چہرہ کے طور پر دیکھے جانے والے مختار عباس نقوی ایک انٹرویو میں پارٹی میں داخل ہوتے وقت کے حالات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں" جس وقت میں پارٹی میں شامل ہوا اس وقت اور آج کے حالات میں کافی فرق ہے۔اس وقت مسلمانوں میں بی جے پی کے تئیں بے پناہ نفرت تھی ،اور بی جے پی کے ساتھ کھڑا ہونا اس وقت کافی مشکل تھا۔میرا ایک گراؤنڈ سماج وادی یوا جن سبھا اور جے پی آندولن سے تھا،میں نے بی جے پی میں یوا مورچہ سے اپنا سفر شروع کیا اور آج میں بی جے پی کی تمام اعلیٰ کمیٹیوں میں ہوں۔پہلے کے مقابلے میں حالات بدلے ہیں اور مسلمانوں کا بھی رویہ بی جے پی کے تئیں وہ نہیں ہے جو پہلے تھا۔دراصل ہمارے حریفوں نے یہ ماحول بنایا کہ بی جے پی مسلمانوں کی دشمن ہے اور کانگریس دوست"۔عباس نقوی کی گفتگو سے

معلوم ہوتا ہے کہ دراصل اس وقت اور آج کے حالات کافی تبدیل ہو چکے ہیں۔آج مسلمانوں کی بی جے پی کے تعلق سے غلط فہمیاں دور ہوئیں ہیں، مسلمان بی جے پی سے دوستانہ تعلقات بڑھا رہے ہیں۔ نتیجتاً بی جے پی بھی اپنے رویہ میں تبدیلی لائی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بی جے پی نے مسلمانوں پر بھروسہ کا اظہار کرتے ہوئے پارٹی میں اعلیٰ سطحی ذمہ داریاں سونپی ہیں۔لہذا مسلمانوں کو مزید اب بی جے پی سے دور نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس میں شامل ہوتے ہوئے اپنا اور دیش کا ارتقاء ہی مطمح نظر رکھنا چاہیے۔

دوسری جانب ملک کو ایک نئی پارٹی کی شکل میں ملنے والی اے اے پی کہتی ہے کہ : ہمہ جہت ترقی کے لیے ملک کی روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، ٹھیک اُسی روایت کو جس کی پیداوار گاندھی جی، مولانا آزاد، مولانا مظہر الحق تھے، جو کسی ذات، مذہب یا علاقہ کے لیڈر نہیں بلکہ ملک کے لیڈر تھے۔ان کی یہی بات کسی حدتک درست کہی جا سکتی ہے۔لیکن یہ بات کہ آپ کسی خاص طبقے کے مسائل پر توجہ مرکوز کرنے سے گریز کر رہی ہے، اس لیے مسلمانوں کی شرکت بھی آپ میں ہونی چاہیے نیز آپ کسی شناخت کے ساتھ نہیں چلنا چاہتی اور نہ ہی ہندو مسلم کی بات کرتی ہے بلکہ انسانیت اور تمام لوگوں کی بات کرتی ہے۔پھر یہ بھی کہ جب عام لوگوں کے مسائل حل ہوں گے تو مسلمانوں کے مسائل بھی خدو بخود حل ہو جائیں گے، مناسب نہیں ہے۔ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے وہ مزید کہتے ہیں کہ عام

آدمی کی سیاست کرکے ہم نے اُس سیاسی روایت کو توڑنے کی کوشش کی ہے جس میں پارٹی فرقہ پرستی، بھگوا کرن (زعفرانی سیاست) سماج کو توڑنے، ذات پات اورمذہب کے سہارے انتخابات لڑتی تھی۔ میٹنگ میں موجود مسلمانوں سے یہ سوال بھی کیا گیا کہ آپ کو اب تک آزادی کے بعد انتخابات سے کیا فائدہ ملا ہے؟ یہ اس گفتگو اور میٹنگ کا ماحاصل ہے جو اے اے پی کے نیشنل ایگزیکٹیو ممبر اور بہار امور کے انچارج اجیت جھا نے منعقد کی تھی اور جس میں مسلمانوں کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مقصد عام آدمی پارٹی میں مسلمانوں کی شرکت اور اس کے ایجنڈے پر زور دینا تھا۔

تیسری جانب وہ تمام پارٹیاں ہیں جن کا نقطۂ آغاز اترپردیش یا ہندی بیلٹ رہا ہے۔ لہٰذا ان تمام ریاستی پارٹیوں کا بھی یہی ماننا ہے کہ ماضی میں اقلیتوں کے مسائل کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ لازم ہے کہ ان کے مسائل پر توجہ دیتے ہوئے حل کی جانب پیش قدمی کی جائے۔ لیکن مختلف اوقات میں برسر اقتدار ان پارٹیوں کی جانب سے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی کہ دور اقتدار میں اقلیتوں کے لیے ان کی جانب سے کیا اور کس طرح کی توجہ دی گئی اور وہ کون کون سے مسائل تھے جن کے حل کی جانب انھوں نے نہ صرف پیش قدمی کی بلکہ نتائج کے اعتبار سے اقلیتوں کو مطمئن بھی کیا؟ان پارٹیوں میں سرفہرست یوپی کی سماج وادی پارٹی ہے۔ جس کے موجودہ دور اقتدار میں سو سے زائد فسادات ہوئے

اور حالیہ مظفر نگر قتل و غارت گری میں انتظامیہ کی جانب سے بے قابو متعصبانہ رویہ کا اظہار نہ صرف کھلی شہادت بلکہ ثبوت بھی فراہم کرتی ہے کہ وہ کس حد تک اقلیتوں کے مسائل کو حل کرنے کی جانب متوجہ ہیں۔ لیکن پھر بھی مذہبی و غیر مذہبی شناخت رکھنے والے لیڈران کہتے نظر آرہے ہیں کہ اس سب لاپرواہی کی وجہ ریاستی سرکار نہیں بلکہ مقامی انتظامیہ کی ناکامی کا نتیجہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ مقامی انتظامیہ کیا ریاستی انتظامیہ کے ماتحت نہیں ہے؟ وہیں اپنی 58 ویں سالگرہ کے موقع پر رمابائی امبید کر میدان میں منعقد بی ایس پی کی 'ساؤدھان مہاریلی' کو مخاطب کرتے ہوئے سابق وزیر اعلی اترپردیش مایاوتی خود کو مسلمانوں کا رہنما بتانے کی کوشش کرتی نظر آرہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں بی ایس پی کو مسلمانوں کے کثیر ووٹ ملنے سے بی جے پی اور دیگر فرقہ پرست طاقتیں کمزور ہو جائیں گی۔ بی جے پی پر حملہ بولتے ہوئے کہتی ہیں مرکز میں اسی پارٹی کے دور اقتدار میں بہت سے دہشت گردانہ واقعات ہوئے تھے۔ نیز اترپردیش میں تو اسی پارٹی کی حکومت کے دور میں اجودھیا میں بابری مسجد گرا کر فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کی گئی۔ ان تمام حقائق کو آشکارا کرنے کے باوجود لیکن وہ بھول جاتی ہیں کہ خود ان کے دور اقتدار میں الٰہ آباد ہائی کورٹ "آستھا" کے سہارے بابری مسجد تنازع کو کس طرح حل کرتا ہے اور وہ یا ان کی پارٹی اس فیصلہ کے خلاف آواز تک نہیں اٹھاتی۔

ہندوستانی اقلیتوں میں سرفہرست مسلمان ہیں۔اور مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کا خود کا کوئی واضح، منظم اور صبر آزما جدوجہد سے خالی ایجنڈا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آزادی سے قبل اور بعد جس پارٹی نے بھی انھیں اپنی جانب متوجہ کیا یا دوسرے الفاظ میں جس پارٹی نے بھی اپنے لچھے دار ایجنڈے کے ساتھ انھیں آواز دی ، مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان کی طرف لبیک کہتا ہوا نظر آیا۔متذکرہ گفتگو بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ درحقیقت اصل دلچسپی ملک سے ہونی چاہیے کسی مخصوص طبقے کے مسائل سے نہیں مسلمانوں کا مسئلہ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے بلکہ ان کے بھی ویسے ہی روٹی کپڑا اور مکان، کے مسائل ہیں جس طرح دیگر شہریوں کے۔جبکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ایک مخصوص نظریہ کے حاملین بھی یہی کہتے آئے ہیں، ممکن ہے ان کے کہنے کے انداز میں فرق رہا ہو، لیکن ان کا کہنا بھی یہی ہے "کہ ذات اور عقیدہ کو نظرانداز کرکے یا اوپر اٹھ کر ہر شخص کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا جائے کہ بھارت کے تمام لوگوں کی یہ عظیم ذمہ داری ہے کہ وہ اس حقیقت کو مانیں کہ بھارت 'راشٹر' کے تئیں غیر معمولی جذبہ کو ابھارا جائے۔ساتھ ہی اقلیتوں کے طریقہ عبادت (intense devotion) حوالگی life کی عزت کرتے ہوئے بھی راشٹر کی روایات، تاریخ، نظریہ زندگی (جیون دھارا یا آدرشوں اور اقدار سے انھیں محبت اور احترام کرنے کی تعلیم دی ، attitudes) جائے اور ان کی آرزوؤں کو راشٹر کی آرزوؤں میں مدغم کرنے کا نظم کیا جائے"۔ مخصوص نظریہ کے حاملین ملکی سطح پر "یک رنگی" کے خواہش مند ہیں، جس کے

بعد ملک میں ایک ہی سماج ، ایک ہی قوم اور ایک ہی کلچر کا اظہار ہوگا اور شاید اسی بات کا اظہار گاندھی جی اور مولانا آزاد کی مثال دیگر روایت کو آگے بڑھانے کی جانب کی گئی ہے۔ہم نہیں جانتے کہ اجیت جھا اور مخصوص نظریہ کے حاملین کے درمیان فکری ہم آہنگی کس حد تک پائی جاتی ہے، اس کے باوجود جو ظاہر ہے وہ کچھ واضح بھی نہیں۔

موجودہ صورتحال کے پیش نظر آئندہ پانچ سالہ حکومت کی تشکیل کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سی پارٹییا الائنس ہوگا جسے اہل ملک آئندہ حکومت کی باگ دوڑ دینے کے لیے راضی ہوں گے۔لیکن وہ کوئی بھی حکومت ہو اور کوئی بھی الائنس، اقلیتوں کو ماضی قریب کے نہ صرف وعدوں بلکہ نتائج کو بھی نہیں بھولنا

چاہیے۔اقلیتوں کو چاہیے کہ وہ واضح مقاصد اور صبر آزما جدوجہد کے ساتھ چندیا کوئی ایک پلیٹ فارم تیار کریں۔جہاں اگر فوری نہ صحیح تو دیر سے ہی ،اہل ملک اور ان کے خود کے مسائل بھی حل ہوتے نظر آئیں۔گزشتہ ستر سال سے جیسے حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں آئندہ بھی بنتی اور بگڑتی رہیں گی۔لیکن یہ سوال کہ عام انسانوں کے مسائل جن میں اقلیتوں کے مسائل سرفہرست ہیں وہ کب اور کیسے حل ہوں گے؟شاید یہی وہ متبادل ہے جس کی تلاش آج بھی جاری ہے!

الیکشن 2014 اور نوجوان !

فی الوقت ہندوستان میں انتخابات کا بازار سرگرم ہے۔چہار جانب سیاسی جلسے، جلوس، ریلیاں ،نعرے، وعدے، ایک دوسرے کی پول کھولنے اور ایک دوسرے کی حقیقت عیاں کرنے میں سیاسی و غیر سیاسی تقریباً سبھی لوگ سرگرم ہیں۔کہا جارہا ہے کہ سولہویں لوک سبھا انتخابات اپنے آپ میں مخصوص ہے کیونکہ اس مرتبہ :i) الیکشن میں 114 ملین رائے دہندگان ہوں گے جو یورپ کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہیں۔اس معنی میں 2014کے انتخابات دنیاکے سب سے بڑے انتخابات رہیں گے۔ 18 (ii سے 19 سال کے رائے دہندگان میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔اس عمر کے لوگ تقریباً23 ملین ہیں جو مجموعی رائے دہندگان میں 2.88 فیصد ہیں۔iii) الیکشن کمیشن کے مطابق اس الیکشن میں گزشتہ کے مقابلہ 100 ملین ووٹر زیادہ ہوں گے۔iv) اس مرتبہ الیکشن کمیشن نے ہیجڑوں کے لیے بھی ایک الگ زمرہ 'دیگر' کے نام سے بنایا ہے۔اس دیگر زمرے میں آنے والے رائے دہندگان کی تعداد28,314 ہوگی۔ v) اس مرتبہ 10 فیصد رائے دہندگان پہلی مرتبہ ووٹ ڈالیں گے۔اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان کی نصف آبادی 25 سال سے کم ہے اور یہ نئے رائے دہندگان انتخابی عمل کو متاثر کرنے میں کافی اہم کردار ادا کریں گے۔ہماری گفتگو کا بھی یہی وہ اہم نکتہ ہے جس پر ہم اپنی

بات آگے بڑھائیں گے۔

چند دن بعد ہونے والے الیکشن کی خوبیوں میں ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ملک میں ایک نئی پارٹی اپنی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے جو گزشتہ پارلیمانی الیکشن میں موجود نہیں تھی۔اس پارٹی کی فی الوقت ایک حیثیت یہ بھی ہے کہ یہ پارٹی موجود ملک کی دو بڑی سیاسی پارٹیوں کانگریس اور بی جے پی ، دونوں ہی کے خلاف آواز اٹھاتی نظر آرہی ہے وہیں دوسری طرف دیگر ریاستی پارٹیوں سے بھی اس کا اشتراک نہیں ہوا ہے۔اس لحاظ سے یہ پارٹی اپنی شناخت بنانے کی دوڑ میں سب سے آگے ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ وقت میں یہ کیا کردار ادا کرنے والی ہے! یہ پارٹی عام آدمی پارٹی کے نام سے جانی جاتی ہے اور اس کے لیڈر اروند کجریوال ہیں۔بی جے پی کے وزیر اعظم کے عہدے کے امیدوار نریندر مودی کے 'گجرات ترقی ماڈل 'کا انھوں اپنے دورے میں باریکی سے مطالع کیا ہے۔مندرا تعلقہ (گجرات) میں کسانوں سے ملنے کے بعد کہا کہ مودی وکاس پرش ہیں، لیکن صرف ادانیوں اور امبانیوں کے لیے'۔ان کے مطابق' گجرات حکومت (جس کے وزیر اعلیٰ بی جے پی کے وزیر اعظم کے دعویدار بھی ہیں)کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھنے والے بڑے صنعت کاروں اور سرمایہ کاروں نے زمین تحویل میں لینا شروع کر دی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ گویا گجرات کی ساری زمین فروخت پر ہے۔اسی طرح 'اںڈاسا' میں سکھ کسانوں کی زمین کے متعلق بھی ان کا یہی کہنا ہے

۔گجرات حکومت سکھ کسانوں کو ان کی زمین نہیں دینا چاہتی ہے۔گجرات حکومت نے 2010 میں ان کی زمین سیل کردی، وہ عدالت کے پاس گئے اور انھوں نے بڑے وکیلوں کو رکھ لیا تاکہ سکھ کسان اپنی زمین سے محروم رہیں۔وہیں اسی عام آدمی پارٹی کے ایک دوسرے لیڈر منیش سسودیا نے گجرات دورے کے دوران ٹوئیٹ کرکے یہ اطلاع دی کہ ان کی کار پر حملا کیا گیا، اس کے شیشے چکنا چور ہو گئے اور حملے کے لیے انھوں نے بی جے پی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔لیکن اس سے بھی بڑی بات جو انھوں نے کہی وہ یہ کہ گجرات میں پولیس میری جاسوسی کر رہی ہے۔گجرات میں گزشتہ شام سے میں جن لوگوں سے مل رہا ہوں، پولیس انہیں پریشان کر رہی ہے، پوچھ گچھ کر رہی ہے اور دھمکی دے رہی ہے۔وہیں کجریوال کا بھی یہ الزام تھا کہ گجرات میں حکومت کے ترقیاتی کاموں کے جائزے کو مودی روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔
متذکرہ واقعہ کے بعد ایک لائیو شو میں کسی نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ اگر بقول آپ کے گجرات حکومت اپنی ریاست کے شہریوں کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہے، پھر کیوں، وہ تین مرتبہ سے بڑی اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل کرتی آئی ہے؟سوال کے جواب میں کجریوال کا کہنا تھا کہ ریاست میں کوئی بھی مضبوط اپوزیشن نہیں ہے،کانگریس کو یا تو مختلف مقامات پر خرید لیا گیا ہے یا پھر ڈرا دھمکا کر انھیں ابھرنے نہیں دیا جاتا۔اس بات میں کتنی سچائی ہے ہم نہیں

جانتے لیکن اس بات سے ضرور اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک کا پلاننگ کمیشن جب غربت کی حد 28 اور 32 روپے طے کرتا ہے تو پورا ملک اُس کے اِس طرز عمل کی مزمت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ انصاف سے بالاتر ہے کہ ایک کمزور شخص حد درجہ غربت میں مبتلا ہو۔ان حالات میں 28 یا 32 روپے طے کرکے غربت کے گراف کو کم کرنے کی ناکام کوشش کی جائے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مناسب پالیسی اختیار کرتے ہوئے غربت کے پیمانے کچھ اور طے کیے جاتے،ایسے حد درجہ غریب لوگوں کو مزید سہولیات فراہم کی جاتیں، لیکن حکومت ہے کہ وہ نہ صرف اس بات کو نظر انداز کر رہی ہے بلکہ غریبکی غربت کا مزاق اڑاتے ہوئے اس غیر منصفانہ حد بندی پر اپنی مہر بھی ثبت کر رہی ہے جو کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جب گجرات میں حکومت غربت کا پیمانہ صرف 11 روپے طے کرتی ہے تو چہار جانب خاموشی چھا جاتی ہے !ایسا کیوں ہے؟ کیا اس بات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ میڈیا گجرات حکومت کی مٹھی ہے یا ان لوگوں کی گرفت میں جو نریندر مودی کو بی جے پی کے وزیر اعظم کا عہدہ دلاتے ہیں، مودی کو اڈوانی پر فوقیت دیتے ہیں، مرلی منوہر جوشی کو راضی یا پابند کرتے ہیں کہ وہ وارانسی کی سیٹ مودی کے لیے چھوڑ دیں۔ معلوم ہوا میڈیا جملہ تمام بڑی قوتوں کی سرپرستی میں اپنے پروگراموں کو چلاتی ہے،ان کے نفا اور نقصان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی مختلف رپورٹیں اور پروگرام سامنے لاتی ہے،اورجب اور جیسے چاہیں اچھے کو برا اور برے کو اچھا ثابت کرنے اور کرانے کی صلاحیت

رکھتےہے۔میڈیا خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کی اسی صلاحیت واہمیت کا ہی اندازہ کرتے ہوئے مرکزی وزیر برائے صحت غلام نبی آزاد نے این ایس یو آئی کے ایک پروگرام میں دعویٰ کیا کہ " میڈیا کے ایک حصے نے یو پی اے حکومت کی حصولیابیوں کو نظرانداز کرنے میں حریف سیاسی جماعتوں سے ہاتھ ملا لیا ہے۔انھوں نے کہا کہ آج سماج ایسا ہو گیا ہے کہ آپ ٹی وی پر کوئی جھوٹ 10 مرتبہ دکھایئے اور لوگ اس پر یقین کرلیں گے۔ کسی جلسہ عام میں کوئی جھوٹ 100 مرتبہ بولیے اور لوگ سوچیں گے کہ یہ صحیح ہے۔آزاد نے کہا کہ مختلف پیمانوں پر گجرات کے نام نہاد ترقی ماڈل کو دیگر ریاستوں سے نیچے کا درجہ دیا گیا ہےجبکہ کئی ریاستوں میں اس سے بہتر ماڈل موجود ہیں"اس کے باوجود میڈیا ان ریاستوں اور ان کے لیڈران کو بطور ماڈل سامنے نہیں لاتی۔یہ وہ پس منظر اور حقیقت ہے جس میں آج نوجوانوں کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

ہندوستان کی تمام ہی سیاسی پارٹیاں اپنی طلبہ تنظیمیں رکھتی ہیں۔ان طلبہ تنظیموں میں SFI,ABVP,NSUI,TCP,BVS,AISA,BCJD,CJD,CLJ, خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ان تنظیموں کے علاوہ بھی ایک بڑی CRJ,MSF,OCP,SCS,TRVS تعداد ان طلبہ تنظیموں کی آج ہندوستان میں موجود ہے جو یا تو سیاسی پارٹیوں سے وابستہ نہیں یا اگر ہیں تو دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر سیاسی پارٹی اپنی مخصوص پہچان کے ساتھ مخصوص ایجنڈے پر کاربند

ہے۔اس پس منظر میں متذکرہ طلبہ تنظیمیں اور ان سے وابستہ طلبہ و نوجوان، کہا جا سکتا ہے کہ مخصوص نظریہ و فکر کے لیے سرگرم عمل ہیں اور یہی ان کی پہچان ہے۔ معلوم ہوا کہ ہندوستان کی نصف آبادی 25 سال سے کم ہے اور یہ نئے رائے دہندگان جو تقریباً 10 فیصد ہیں، قبل از وقت ہی ان کی فکری، نظریاتی اور جذباتی وابستگیاں موجود ہیں۔لہٰذا یہ وہ تعداد نہیں ہے جو ہونے والے انتخابی عمل میں ملک کے نقشہ پر کوئی مخصوص تبدیلی لاسکے گی۔البتہ وہ نوجوان جو قابل ذکر نہیں ہیں یا دوسرے معنی میں فی الوقت اپنی مخصوص سیاسی و غیر سیاسی پہنچان نہیں رکھتے وہی وہ ٹارگیٹ ہیں جن پر تمام سیاسی پارٹیوں کی توجہ مرکوز ہے۔بظاہر اس کھیل میں عام آدمی پارٹی اور طلبہ و نوجوانوں کا تال میل کافی بہتر محسوس ہو رہا ہے۔دیکھنے میں یہ بھی آرہا ہے کہ نوجوان بڑی تعداد میں اس پارٹی سے وابستہ ہو رہےہیں اس امید کے ساتھ کہ اے اے پی ملک میں ایک اچھی اور صاف ستھری حکومت دینے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔اور بطور نمونہ پارٹی لیڈر کجریوال ان کے رول ماڈل ہیں۔وہیں کجریوال گرچہ نوجوان نہیں لیکن ان کی حکمت عملی اور سرگرمیاں جس میں دھرنے، مظاہرے،جذبات سے بھری تقریریں،ہر کسی پر بلا خوف الزام دھرنے،اور ماضی سے چھٹکارا پاتے ہوئے حال پر تکیہ کرنے جیسی خوبیاں نوجوانوں کو خوب متاثر کر رہی ہیں اور وہ اس پارٹی سے وابستہ ہو رہے ہیں۔لہٰذا وہ طلبہ و نوجوان جو فی الوقت غیر منظم ہیں اور کسی سیاسی یا غیر سیاسی پارٹی تنظیم کا حصہ نہیں وہ عام آدمی پارٹی

کی جانب تیزی سے قدم بڑھا رہے ہیں وہ بھی بلا ارادہ اور غیر شعوری طور پر اے اے پی کی پالیسیوں اور نظریہ کے حامل ہیں۔پھر وہ کون سی تعداد بچتی ہے جسے ملک کا 50 فیصدیا اس سے زائد کہا جا رہا ہے؟شاید یہ وہ قلیل ترین تعداد ہے جو کہیں اور کسی % سے وابستہ نہیں ،ساتھ ہی بری طرح سے کنفیوژ بھی ہے۔

طلبہ و نوجوانوں کے تعلق سے یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ اپنی عمر سے بڑے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ مخلص ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اندر اٹھنے والے احساسات،خیالات اور جذبات کو چھپا نہیں پاتے۔اورجب یہ چھپانے کا مرحلہ شروع ہوتا ہے بس یہی وہ دور ہے جس میں عام طور پر اخلاص میں کمی آنی شروع ہو جاتی ہے۔انسان نفع و نقصان کے پیش نظر معاملات طے کرتا ہے اور اس کی سرگرمیاں انھیں نفع و نقصان کے بھنور میں الجھا کر رکھ دیتی ہیں۔اور اگر اس حد درجہ اخلاص کے ساتھ غیر شعوری جذبات بھی شامل ہو جائیں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاملات بگڑ جاتے ہیں۔نتائج وہ نہیں آپاتے جو مطلوب ہیں، یہ بدلے ہوئے نتائج کبھی خوشگوار ہوتے ہیں تو کبھی تباہی کا پیش خیمہ۔لہذا نوجوانوں کو اور سرپرست تنظیموں کو چاہیے کہ وہ ایک ایسا لائحہ عمل تیار کریں جس کے نتائج دیر یا سویر مثبت ہی نکلیں،اور یہ ممکن بھی ہے۔لیکن اندیشہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں منفی کو بھی لوگ مثبت ثابت کیا جاتا ہے اور نوجوان اپنے غیر ذمہ دارانہ عمل کے نتیجہ میں ان سے قربت اختیار کرتے ہیں

جو ہمیشہ ہی مہلک ثابت ہوئے ہیں۔ان حالات میں ماضی کا مطالعہ کرتے ہوئے نتائج اخذ کیے جانے چاہیں۔لہذا اگر آپ نوجوان ہیں اور ماضی کا مطالع کرنے کے بعد حال کے نتائج سے مطمئن بھی ہیں تو قدم آگے بڑھایئے نہیں تو بہتر یہی ہے کہ ایسی تنظیم یا سیاسی پارٹی کا حصہ بننے سے دور ہی رہا جائے جو ملک ، اہل ملک اور سماج و تمدن کے لیے تباہ کن ہو۔کیونکہ کبھی قدم آگے بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے تو کبھی قدموں کو روک دینے سے بھی عافیت نصیب ہوتی ہے۔الیکشن قریب ہیں اور الیکشن کے موقع پر ہر شخص کو ووٹ دینا چاہیے تاکہ اس کے اختیار کا صحیح استعمال ہو لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس طرح ووٹ کی ادائیگی ایک جمہوری ملک میں ضروری سمجھی جاتی ہے سیاسی پارٹیوں میں بھی شمولیت اختیار کرنے کو ضروری سمجھا جائے۔ہمارے فہم میں ووٹ کا صحیح استعمال تب ہی ممکن ہے جبکہ آپ کسی بھی سیاسی پارٹی سے اس درجہ وابستہ نہ ہوں کہ آپ اور آپ کی فکر مفلوج نظر ہو جائے۔اس حالت میں ترقی نہیں بلکہ تنزلی ہی خیال کی جائے گی!

تبدیلی قیادت ناگزیر

تبدیلی کب کہاں اور کیسے آتی ہے یہ مسئلہ صرف تھامس ہابس اور جان لاک ہی کا نہیں تھا۔ بلکہ ہیگل نے تو پوری انسانی تاریخ کو ''نظریات کی جنگ'' کا سفر قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ایک نظریہ پیدا ہوتا ہے اور دنیا میں اپنے اثرات پھیلاتا رہتا ہے جسے اس نے thesis کہا۔ ہیگل کہتا ہے کہ یہ اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس نظریے کی ''ضد'' پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہی، جسے اس نے anti-thesis کہا۔ ہیگل کے مطابق تھیس اور اینٹی تھیس میں تصادم ہوتا ہے اور اس تصادم سے ایک تیسری چیز synthesis نمودار ہوتا ہے۔ یہ synthesis صالح یا بہترین اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہیگل کے اس نظریے کا کارل مارکس پر گہرا اثر پڑا، البتہ مارکس نے یہ کیا کہ ہیگل نے جس معرکہ آرائی کو ''نظریات'' میں دکھایا تھا، مارکس نے اس آویزش کو طبقات میں دکھایا۔ مارکس نے اس تبدیلی کو معنی خیز انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہیگل سر کے بل کھڑا تھا میں نے اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔ اسی طرح چین میں ماؤزے تنگ کے نظریات میں بھی طاقت کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ ماؤ کا یہ قول مشہور زمانہ ہے کہ طاقت بندوق کی نال سے برآمد ہوتی ہے۔ اگرچہ کمیونسٹ انقلابات نے خود کو ''نظریاتی'' کہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان

کی نظریاتی طاقت ثانوی چیز تھی۔ ان کا اوّل و آخر طاقت تھی۔ چوں کہ ان کا آغاز طاقت تھی اس لیے ان کا انجام بھی طاقت ہی کے حوالے سے سامنے آیا۔ بیسویں صدی کے وسط تک آتے آتے طاقت کا ایک نیا مظہر ''مارشل لا'' کی صورت میں سامنے آیا۔ نوآبادیاتی طاقتوں سے آزادی حاصل کرنے والے تیسری دنیا کے اکثر ملکوں میں فوج سب سے منظم، باخبر، تعلیم یافتہ اور طاقتور ادارہ تھا۔ اس ادارے نے اپنی اس حیثیت کو ملک و قوم کے حق میں استعمال کرنے کے بجائے ان کے خلاف استعمال کیا۔ ایشیا اور افریقہ کے متعدد ممالک میں مارشل لا نمودار ہوئے اور 'جس کی لاٹھی اُس کی بھینس' کا فلسفہ جگہ جگہ حقیقت بنتا نظر آیا۔

اہم بات یہ ہے کہ مارشل لا نے ہر جگہ معاشرے کی تشکیلِ نو کی۔ پاکستان میں مارشل لا لگانے والے جنرل ایوب اور جنرل پرویز مشرف سیکولر تھے، چنانچہ ان کے دور میں معاشرے میں سیکولرازم کو قوت حاصل ہوئی۔ جنرل ضیاء الحق کا ذہن مذہبی تھا، ان کے دور میں معاشرے میں مذہبی رجحانات کو فروغ حاصل ہوا۔ جمہوریت اگرچہ کمیونزم اور مارشل لا کی ضد ہے، لیکن طاقت کا تصور تینوں نظاموں میں مشترک ہے۔ فرق یہ ہے کہ کمیونزم میں طاقت کا سرچشمہ کمیونسٹ پارٹی، مارشل لا میں طاقت کا سرچشمہ فوج ہوتی ہی، اور جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔ افراد اور معاشروں کو نسلی، قومی، لسانی اور مذہبی

تعصبات بھی متاثر اور تبدیل کرتے رہے ہیں۔ یہودیت ایک آسمانی مذہب تھا مگر اس کے ماننے والوں نے اسے ایک نسلی مذہب بنادیا۔ ہندوازم کے بارے میں بھی غالب گمان یہی ہے کہ وہ بھی کبھی ایک الہامی مذہب رہا ہوگا مگر ہندوازم چار ذاتوں کا مذہب بن گیا۔ ہندوستان کی تاریخ، سماجیات، یہاں تک کہ معاشیات پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ موجودہ دور میں عالمی طاقتوں کے ذاتی مفادات اور پس پردہ سرمایہ دارانہ ذہنیت نیسیاسی اسلام کے سلسلے میں اس گمان کو بڑھاوا دینے میں ہر ممکن کوشش کی ہے اسلام اپنے نظریات، تعلیمات اور نظام کو بطور قوت غالب کرنے کے درپے ہے۔ برخلاف اس کے ایسے موقع پر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ نیکی کی بنیاد پر ہونے والی تبدیلی، تقوے کے ابلاغ سے ہونے والی قلبِ ماہیت کئی نسلوں تک باقی رہتی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ نیکی ایک ایسا نعرہ، ایسا نظریہ اور ایسا فلسفہ ہے جو کئی نسلوں کو اپنا اسیر کرسکتا ہے۔ پھر جس کا انحصار ہر صورت میں اللہ پر ہو وہ نہ طاقت پرست ہوسکتا ہے اور نہ طاقت کے ذریعے اپنے نظریے کو پھیلا سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اسلامی معاشرہ اپنی روح میں ایک جہادی اور مزاحمتی معاشرہ ہوتا ہے اور اس کی مزاحمت اپنے نفس سے لے کر بین الاقوامی زندگی تک پھیلی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے علمبردار ایک مضبوط، واضح اور مکمل نظام حیات کے فروغ واستحکام کے لیے ہر دم کوشاں رہتے ہیں۔اس صورت میں ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کے فروغ، اس کی بقا، اس کے استحکام اور اس کے قیام کے لیے سعی و جہد کرے۔اور

ایک ایسا متبادل نظام حکومت فراہم کرے جس میں ایک طرف لوگوں کو امن و امان میسر ہو تو وہیں دوسری طرف ان کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری ہو سکیں۔ مختلف مذاہب کے لوگ اپنے مذہب پر بہ آسانی عمل پیرا رہ سکیں تو وہیں ان کا خاندان تعمیر وترقی کی منزلیں طے بھی کر سکے۔ تبدیلی قیادت کے عملی نعرہ کے ساتھ جس سعی و جہد کا آغاز کیا جائے گا ممکن ہے کہ یہ جدوجہد اللہ کی نظر میں تخلیہ میں ادا کی جانے والی عبادت سے بڑھ کر ہو جائے !

تبدیلیِ قیادت ! کن معنی میں ؟ :

تبدیلیِ قیادت سے ہماری مراد وہ قیادت ہے جو خوف خدا سے سے عاری نہ ہو۔ بلکہ قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل کی جائے جو انسانی قوانین کا پاس و لحاظ رکھنے کے علاوہ اُس ہستی کو بھی مانتے ہوں جو خود انسانوں کا موجد اعلیٰ ہے۔ یہ تبدیلی قیادت کی سعی و جہد اس بات کی بھی وضاحت کرے گی کہ ہماری جدوجہد "اپنوں" کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان طاقتوں کے خلاف ہے جو اپنے قومی و ذاتی مفادات کی وجہ سے عالمِ انسانیت کو تباہ و برباد کرنے پر آمادہ ہیں نیز اس تباہی و بربادی کو وہ خوبصورت ناموں سے تعبیر کرتے ہوئے روبۂ عمل ہیں۔اس پس منظر میں آج جو قیادت موجود ہے ،ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ناکارہ، بے مقصد، اور نفس پرست انسانوں کی بھیڑ پر مشتمل ہے۔ یہ نفس پرست قائدٗ اخلاق و کردار کے میدان میں نہایت پستی میں مبتلا ہیں۔ان کی

تعلیم و تربیت کی مثال سمندر پر چھائے اس جھاگ سے ذرہ برابر بھی زائد نہیں جو بلاشبہ پورے سمندر پر چھایا ہوا ہے اس کے باوجود نہ اس کا کوئی وزن ہے نہ حیثیت۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت سسک رہی ہے اور عالم انسانیت کی چیخیں چہار جانب تیز سے تیز تر ہی ہوتی جارہی ہیں۔ لیکن اندھے، گونگے اور بہرے قیادت کے علمبردار ہیں کہ نہ انہیں کچھ نظر آتا ہے اور نہ ہی کچھ سوجھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ بے کار یا ناکارہ لوگ ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ان کی فکر کی تصحیح نہیں ہو سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیمی سندیں رکھنے والے جب عمل میدان میں آتے ہیں تو وہ دوسروں کے لیے نہیں بلکہ خود کے لیے جینا پسند کرتے ہیں۔ ان کا ہر عمل صرف ان کی ذات تک محدود رہتا ہے، فوائد و نقصانات وہ اپنی ذات میں تلاش کرتے ہیں، اور جب کہیں بھی کسی بھی طرح کا فائدہ حاصل ہوتا محسوس کرتے ہیں، اس صورت وہ اس بات کی ذرا برابر پروا نہیں کرتے کہ دوسروں کو اس سے کس قدر نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وجہ بس اتنی کہ وہ علم سے تو بہرہ مند ہوئے لیکن وہ علم ہی ناقص تھا کہ جو ان کو صحیح راستہ پر گامزن نہ کر سکا۔ علم تو درحقیقت وہ ہے جو خود شناسی اور خدا شناسی پیدا کرنے والا ہو۔ وہ علم ہی کیا جو نہ خود سے باخبر کرا سکے، نہ خودی سے اور نہ ہی خدا سے، کہ جس نے اُس کو پیدا کیا اور زمین کا نظم و نسق اس کے ذمہ کیا۔

ہمیں یہ شعور بھی بیدار کرنا ہے کہ خرابی کی اصل جڑ موجودہ نظام اور اس کی

پروردہ مفاد پرست، ملت فروش اور دنیا پرست قیادت ہے کہ جس پر نوٹس نہ لیا گیا تو اصلاح و فلاح کے پہلو مدھم پڑ جائیں گے۔ ان طاقتوں کے خلاف اقدام سے ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ موجودہ فلسفۂ زندگی پر تفکر کیا جائے، اس میں اصلاح کے پہلوؤں کو ابھارا جائے، اور سب سے بہتر یہ ہوگا کہ اسلامی فلسفۂ زندگی کو نافذ العمل بنانے کی سعی و جہد کی جائے۔ آج چہار جانب ظلم و بربیت کا دور دورہ ہے اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہمیں صرف اپنے طرز معاشرت کو بہتر بنانے کی فکر نے، مسائل کو سمجھنے، ان پر غور و فکر کرنے اور ان کے خاتمہ کی سعی و جہد کرنے سے بہت دور کر رکھا ہے۔ اسلام کی رو سے یہ ظلم جو آج ہم خود پر کر رہے ہیں، کٹھہرے سے باہر ہم خود بھی نہیں۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے برائی کو ہاتھ سے روکا جائے، اس کو زبان سے برا کہا جائے اور اگر اتنی بھی طاقت نہ ہو تو کم از کم دل میں برا سمجھا جائے۔ لیکن ایک لحہ کے لیے ٹھہریں ! اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ! خود سے معلوم کریں کہ کیا کبھی ہم نے اس جانب بھی توجہ کی ہے؟ کہا کہ : "اور اگر خدا لوگوں کو ان کے ظلم کے سبب پکڑنے لگے تو ایک جاندار کو زمین پر نہ چھوڑے لیکن ان کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیئے جاتا ہے۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں نہ آگے بڑھ سکتے ہیں" (النحل:٦١)۔ فرصت کے لحات کو گنوانا نادانی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ لازم ہے کہ جو لحات بھی مہلت کے باقی ہیں ان کا استعمال کرتے ہوئے میدان عمل میں اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ یہی وقت کی آواز ہے اور یہی

ہمارا اولین فرض منصبی بھی۔آج ضرورت ہے کہ ظلم و بربیت سے نجات دلانے والے امن پسند حضرات دوسروں کے لیے مشعل راہ بن جائیں۔اس پورے پس منظر میں 2014 کے پارلیمانی الیکشن اور تبدیلی قیادت کے ایک "بہت قلیل مرحلے "میں اپنی حیثیت اور اہمیت کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔اس وقت ملک اور اہل ملک کے مفاد میں جو کوششیں اور نتائج بھی آپ سامنے لا سکتے ہوں ، منظم سعی وجہد کے ساتھ اپنا کردار ادا کریں۔لیکن اس قلیل عملی مصروفیت کے بعد خدا کے واسطے پھر پانچ سال کے لیے بے عمل نہ ہو جایئے گا !

ظلم و زیادتی اور نظریہ عدل و انصاف

دنیا میں جو عمل بھی انجام دیا جاتا ہے اس کی عموماً دو وجوہات ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ وہ عمل اپنے سے بالاتر قوت سے ڈر کر انجام دیا جائے۔یعنی عمل اس لیے انجام دیا جا رہا ہے کہ نفی کے نتیجہ میں بالاتر قوت اُس کی گرفت کرے گی لہٰذا انجام کے لحاظ سے عمل وہی کیا جائے جس سے گرفت ممکن نہ ہو۔دوسرے یہ کہ وہ عمل اس لیے انجام دیا جا رہا ہے کہ بالاتر قوت اُس عمل سے خوش ہوگی۔نتیجہ کے اعتبار سے اِس بات کی توقع ہے کہ کچھ نہ کچھ فائدہ بھی ہوگا بصورت دیگر گرفت سے بچ جائیں گے۔یہ خوف و گرفت اور خوشی و انعام کا معاملہ آج نہیں ہر دور میں موجود رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں قوت و اقتدار کی غیر معمولی اہمیت رہی ہے۔لیکن یہ قوت و اقتدار کس نوعیت کا ہے، یہ افراد اور گروہوں کے عقیدہ اور نظریات پر انحصار کرتا ہے۔ایک گروہ کا ماننا ہے کہ قوت و اقتدار ہر دور اور ہر مقام پر صرف اور صرف اس ذات اقدس،اللہ رب العزت کا ہے جو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے۔تو وہیں دیگر افراد اور ان کے منتشر العقیدہ گروہوں کا نظریہ ہے کہ قوت و اقتدار اور سلطنت اُس کی ہے جس کے ہاتھ میں آج ملک کی باگ دوڑ ہے۔لہٰذا وہی وہ آخری اور فیصلہ کن طاقتیں ٹھہریں جن کے ہاتھ میں ہر معاملے کا حتمی حل موجود ہے۔قوت و اقتدار کے یہ دو نظریہ افراد اور گروہوں

کے اعمال پر بھی اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔آخری الذکر یہی وہ باطل نظریات ہیں جن کے ہاتھ میں آج نہ صرف اقتدار موجود ہے بلکہ ان کے اثرات سے ہر شخص دوچار بھی ہے۔قوت واقتدار کے اس بگڑے ہوئے نظریہ کے تحت دنیا میں آج جو سلطنتوں قائم ہیں، خصوصاً ان ہی مقامات پر ظلم وزیادتیوں کے پہاڑ بھی توڑے جارہے ہیں اور نتیجہ کے اعتبار سے عدل وانصاف کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ظلم وزیادتیاں جب اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہیں اقتدارِ حقیقی اُن افراد اور گرہوں کو اپنی گرفت میں لینے سے نہیں چوکتی۔کوئی دوسری قوت موجودہ اقتدار کامتبادل ٹھہرتی ہے۔اور یہ ظلم کے علمبردار تاریخ کے صفحات بن جاتے ہیں۔اس موقع پر بحیثیت قاری یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہم جس زماں و مکاں میں بھی موجود ہیں اور جتنی اور جس قدر قوت واقتدار بھی ہمیں حاصل ہے، ہم اس کا استعمال کیا اور کس طرح کر رہے ہیں؟لیکن اس سے قبل کہ سوال کا جواب اپنی ذاتی زندگی کے شب و روز میں تلاش کریں قرآن حکیم کی سورۃ حدید کی ابتدائی آیات کے معنی ومفہوم کو سمجھتے چلیں!

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ هُوَ الْاَوَّلُ

وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (الحدید:۱-۳)۔ " اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے۔ اور ہی زبردست دانا ہے۔ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے، زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے، اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی، اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی، وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ کی تفسیر جید عالم دینجو بیان کرتے ہیں وہ اس طرح ہے۔ لفظ هُوَ کو پہلے لانے سے خود بخود حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ عزیز اور حکیم ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی ایسی ہستی ہے جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ عزیز کے معنی ہیں ایسا زبردست اور قادر و قاہر جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جس کی مزاحمت کسی کے بس میں نہیں ہے، جس کی اطاعت ہر ایک کو کرنی ہی پڑتی ہے خواہ کوئی چاہے یا نہ چاہے، جس کی فرمانی کرنے والا اس کی پکڑ سے کسی طرح بچ ہی نہیں سکتا۔ اور حکیم کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت اور دانائی کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی تخلیق، اس کی تدبیر، اس کی فرمانروائی، اس کے احکام، اس کی ہدایات، سب حکمت پر مبنی ہیں۔ اس کے کسی کام میں نادانی اور حماقت و جہالت کا شائبہ تک نہیں ہے۔

اس مقام پر ایک لطیف نکتہ اور بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ قرآن

مجید میں کم ہی مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی صفت عزیز کے ساتھ قوی، مقتدر، جبار اور ذو انتقام جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے محض اس کے اقتدار مطلق کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ صرف ان مواقع پر ہوا ہے جہان سلسلہ کلام اس بات کا مقتاضی تھا کہ ظالموں اور نافرمانوں کو اللہ کی پکڑ سے ڈرایا جائے۔ اس طرح کے چند مقامات کو چھوڑ کر باقی جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے عزیز کا لفاظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں اس کے ساتھ حکیم، علیم، رحیم، غفور، وہاب اور حمید میں سے کوئی لفظ ضرور لایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی ہستی ایسی ہو جسے بے پناہ طاقت حاصل ہو مگر اس کے ساتھ وہ نادان ہو، جاہل ہو، بے رحم ہو، در گزر اور معاف کرنا جانتی ہی نہ ہو، بخیل ہو، اور بدسیرت ہو تو اس کے اقتدار کا نتیجہ ظلم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ قرآن کے اس بیان کی پوری اہمیت وہ لوگ زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو حاکمیت (Sovereignty) کے مسئلے پر فلسفہ سیاست اور فلسفہ قانون کی بحثوں سے واقف ہیں۔ حاکمیت نام ہی اس چیز کا ہے کہ صاحب حاکمیت غیر محدود اقتدار کا مالک ہو، کوئی داخلی و خارجی طاقت اس کے حکم اور فیصلے کو نفاذ سے روکنے، یا اس کو بدلنے، یا اس پر نظر ثانی کرنے والی نہ ہو، اور کسی کے لیے اس کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہو۔ اس غیر محدود اقتدار کا تصور کرتے ہی انسانی عقل لازماً یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا اقتدار جس کو بھی حاصل ہوا سے بے عیب اور علم و حکمت میں کامل ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر اس اقتدار کا حامل

نادان، جاہل، بے رحم، اور بد خو ہو تو اس کی حاکمیت سراسر ظلم و فساد ہو گی۔ اسی لیے جن فلسفیوں نے کسی انسان، یا انسانی ادارے، یا انسانوں کے مجموعے کو حاکمیت کا حامل قرار دیا ہے ان کو یہ فرض کرنا پڑا ہے کہ وہ غلطی سے مبرا ہو گا۔ مگر ظاہر ہے کہ نہ تو غیر محدود حاکمیت فی الواقع کسی انسانی اقتدار کو حاصل ہو سکتی ہے، اور نہ یہی ممکن ہے کہ کسی بادشاہ، یا پارلیمنٹ، یا قوم، یا پارٹی کو ایک محدود دائرے میں جو حاکمیت حاصل ہو اسے وہ بے عیب اور بے خطا طریقے سے استعمال کر سکے۔ اس لیے کہ ایسی حکمت جس میں نادانی کا شائبہ نہ ہو اور ایسا علم جو تمام متعلقہ حقائق پر حاوی ہو، سے پوری نوع انسانی ہی کو حاصل نہیں ہے کجا کہ وہ انسانوں میں سے کسی شخص یا ادارے یا قوم کو نصیب ہو جائے۔ اور اسی طرح انسان جب تک انسان ہے اس کا خود غرضی، نفسانیت، خوف، لالچ، خواہشات، تعصب، اور جذباتی رضا و غضب اور محبت و نفرت سے بالکل پاک اور بالاتر ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ ان حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھ کر غور کرے تو اسے محسوس ہو گا کہ قرآن اپنے اس بیان میں در حقیقت حاکمیت کا بالکل صحیح اور مکمل تصور پیش کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "عزیز" یعنی اقتدار مطلق کا حامل اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے، اور اس غیر محدود اقتدار کے ساتھ وہی ایک ہستی ایسی ہے جو بے عیب ہے، حکیم و علیم ہے، رحیم و غفور ہے اور حمید و وہاب ہے۔

اس پوری گفتگو کے بعد آیئے سوال کی طرف پلٹتے ہیں۔ دنیا پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ آج کسی بھی مقام پر حکومت و ریاست اور افراد و گروہوں کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بظاہر وہ اختیارات و اقتدار حاصل نہیں ہیں جس کے نتیجہ میں انسانیت امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام میں معاون ثابت ہو۔ اس کے باوجود ہر شخص کو وہ بے تحاشہ اختیارات حاصل ہیں جن کے استعمال سے وہ اپنے بیوی بچوں، رشتہ داروں اور معاشرے کے دیگر افراد و گروہوں کو نہ صرف ظلم وزیادتی سے نجات دلا سکتے ہیں بلکہ عدل و انصاف کے قیام میں معاون بھی بن سکتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ان کی اپنی فکر میں تضاد نہ ہو۔ لہٰذا یہ سوچ اور فکر کے حالات کا رونا رو کر ہم دنیا و آخرت میں کامیاب ٹھہریں گے، ایک بگڑی ہوئی سوچ ہی کہلائے گی۔ لازم ہے کہ ہم عہد کریں جو اختیارات آج جس درجہ میں بھی ہمیں حاصل ہیں ان کو ہم ضائع نہیں کریں گے ساتھ ہی آغاز بتدریج کریں گے۔ جہاں ہماری ذات غائب نہیں بلکہ اپنی اصل میں ہر لمحہ و ہر لحظہ بہت واضح اور موجود نظر آئے گی۔

! فرعونِ وقت اور نوجوان

قرآن حکیم وہ زاد راہ ہے جو ہمیں زمان و مکاں کی قیود سے نکال کر ایک لازوال زمانے میں داخل کرتا ہے۔قرآن نہ صرف لازوال زمانے کے حالات، واقعات اور معاملات سے واقف کراتا ہے بلکہ صحیح و غلط اور نیکی و معصیت کی واضح تعلیمات متعین انداز سے پیش بھی کرتا ہے۔انھیں واقعات میں ایک واقعہ فرعون کا بھی ہے۔یہ واقعہ سورۃ قصص کی ابتدائی آیات میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔"ہم موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک تمہیں سناتے ہیں، ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے جو ایمان لائیں۔واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی۔اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا" (القصص: ۳-۴)۔سورہ میں بہت تفصیل سے واقع کو بیان کیا گیا ہے نیز اس سورہ کے علاوہ قرآن حکیم میں تقریبا ۵۶ مقامات پر فرعون اور اس کی فرعونیت کا تذکرہ ہے۔فرعون علم حقیقی کی روشنی میں ایک شرانگیز اور فسادی بادشاہ تھا جس نے اہل ملک پر بے انتہا زیادتیاں کیں۔یہاں تک کہ انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے خوب ذلیل کیا۔ان تمام ظلم وزیادتیوں کے نتیجہ میں فرعون کا کیا حشر ہوا یہ

بھی ایک عبرتناک واقعہ ہے۔ خصوصاً ان اشخاص اور گروہوں کے لیے جو خود کو آج فرعون کی اولاد کہنا پسند کرتے ہیں اور ان کے لیے بھی جو ظلم وزیادتی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے ہیں۔ موجودہ حالات میں "فرعون" ایک استعارہ ظلم وزیادتی ہے۔ اور عموماً ہر اس شخص کو جو ظلم وزیادتی میں حدیں پار کر بیٹھے "فرعونِ وقت" سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

قرآن حکیم ہی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ دورجبر واستبداد تشدد و ظلم زیادتی کے دور میں انسانی گروہ میں سے اگر کسی سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ نوجوان ہیں جو ہر زمانے میں ناگفتہ بہ حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔یہی بات قرآن بھی ہمیں ان الفاظ میں بتاتا ہے۔" (پھر دیکھو کہ) موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنہیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکتے نہیں ہیں" (یونس: ۸۳)۔واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں پرخطر حالات کا حق ادا کرنے کی توفیق سن رسیدہ لوگوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہتی کہ وہ آسانی سے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ٹھیک یہی واقعہ مکہ کی آبادی میں اس وقت بھی

پیش آیا جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت دینے کے لیے اٹھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے جو لوگ آگے بڑھے تھے وہ قوم کے بڑے بوڑھے اور سن رسیدہ لوگ نہ تھے بلکہ چند باہمت نوجوان ہی تھے۔ وہ ابتدائی مسلمان جو ان آیات کی نزول کی وقت ساری قوم کی شدید مخالفت کے مقابلے میں صداقت اسلامی کی حمایت کر رہے تھے اور ظلم و ستم کے اس طوفان میں جن کے سینے اسلام کے لیے سپر بنے ہوئے تھے، ان میں مصلحت کوش بوڑھا کوئی نہ تھا۔ سب کے سب جوان لوگ ہی تھے۔ علی ابن ابی طالبؓ، جعفرؓ طیار، زبیرؓ، سعد بنؓ ابی وقاص، مُصعَبؓ بن عُمیر، عبداللہؓ بن مسعود جیسے لوگ قبول اسلام کے وقت ۲۰ سال سے کم عمر کے تھے۔ عبد الرحمٰنؓ بن عوف، بلالؓ، صُہَیبؓ کی عمریں ۲۰ سے ۳۰ سال کی درمیان تھیں۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ، زید بن حارثہؓ، عثمان بن عفانؓ اور عمر فاروقؓ، ۳۰ سے ۳۵ سال کے درمیان عمر کے تھے۔ ان سے زیادہ سن رسیدہ ابوبکر صدیقؓ تھے اور ان کی عمر بھی ایمان لانے کے وقت ۳۸ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ابتدائی مسلمانوں میں صرف ایک صحابی کا نام ہمیں ملتا ہے جن کی عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تھی، یعنی حضرت عبیدہ بن حارثؓ مطّلبی۔ اور غالباً پورے گروہ میں ایک ہی صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر تھے، یعنی عَمّار بن یاسرؓ۔

اس پورے پس منظر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہر زمانے میں اگر کوئی

انسانی گروہ انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ نوجوان ہیں۔ نتیجہ کے اعتبار سے تاریخ شاہد ہے کہ نوجوانوں کی منظم سعی و جہد کبھی ضائع نہیں ہوئی۔ پھر اگر وہ اخلاقی حدود کا پاس و لحاظ رکھنے والے نیز اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نوجوان ہوں، تو ایسے لوگوں کے ذریعہ جو سعی و جہد کی جائے گی وہ تمام عالم انسانیت کے لیے امن و امان ثابت ہو گی۔ معلوم ہوا کہ نوجوان ہی کسی قوم و ملت کا مستقبل سنوارنے کا حوصلہ رکھتے ہیں لیکن وہی ہیں جو کسی بھی تہذیب و تمدن کی یلغار میں دوسروں کے مقابلہ سب سے پہلے متاثر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نوجوانوں کی صلاحیتوں، ان کے افکار و نظریات اور ان کے اعمال کی تصحیح پر نہ صرف زور دیا ہے بلکہ ان کے جذبات کو صحیح رخ دینے کا ایک مکمل پروگرام بھی مرتب کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ ملت کے نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد آج بے مقصد زندگی سے دوچار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بے مقصد زندگی سے دوچار نوجوان موجودہ حالات اور اس کی شر انگیزیوں سے واقف نہیں۔ برخلاف اس کے معاملہ یہ ہے کہ اقتدار پر قابض قوتوں نے نوجوانوں کو آج زندگی کے ہر میدان میں گمراہ کرنے کی بہت منظم منصوبہ بندی کر لی ہے۔ معاملہ یہ بھی نہیں ہے کہ گمراہ کن منصوبہ بندی کسی خاص طبقہ، قوم و ملت کے لیے تیار کی گئی ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نوجوان چونکہ کسی بھی انقلاب کا پیش خیمہ ہوتے ہیں لہذا تمام ہی طبقات، گروہ اور نظریات سے وابستہ نوجوانوں کو کچھ اس طرح زندی کے حقیقی مسائل سے دور رکھا جائے جس کے نتیجہ میں انھیں

موجودہ افکار و نظریات اور اس پر مبنی خامیوں سے بھرپور اقتدار سے کوئی واسطہ ہی نہ رہے۔اور اگر ایسا ہوگا جو واقعہ بھی ہے تو پھر کسی بھی بااقتدار طبقہ کے لیے کوئی بڑا چیلینج نہیں رہے گا۔زمانہ اس بات کی کھلی شہادت پیش کر رہاہیکہ نوجوانوں کی غفلت نے آج نہ صرف ان کی ذاتی زندگیوں کو متاثر کیا ہے بلکہ ان کی غفلت ہی کے نتیجہ میں معاشرہ بھی سماجی و اخلاقی انحطاط سے دوچار ہے۔دنیا کا دانشور طبقہ موجودہ حالات سے بخوبی واقف ہے اس کے باوجود سند یافتہ افراد حقیقی علم سے بے بہراہ ہونے کے نتیجہ میں یا جرات اظہار کی کمی نے ان کی زبانوں پر تالے چڑھا دیے ہیں۔ نتیجتاً ظلم و زیادتیاں اور جور و استبداد کا بازار خوب گرم ہے۔

ان حالات میں بحثیت نوجوان لازم ہے کہ صلاحیتیں جو کچھ بھی موجود ہیں،ان کو ضائع نہ کیا جائے اور فرعون وقت جو تباہ کاریاں پھیلانے میں سرگرم ہے اس کا خاتمہ کیا جائے یا کم از کم اس کی شدت میں ہی کمی لائی جائے۔اس سلسلے میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے، یہ تو ہر فرد اپنی صلاحیتوں اور مصروفیت کے پیش نظر طے کرے گا لیکن یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں کی اہم ترین ذمہ داریوں میں سے ایک ضروری ذمہ داری یہ ہے کہ اصلاح پسندوں کا ساتھ دیا جائے۔ جو لوگ برائیوں کے فروغ میں سرگرم ہیں ان کے اس عمل کے خلاف ہم سرگرم ہوں اور جو بھلائیوں کے فروغ میں

کوشاں ہیں، ہم بھی کاندھے سے کاندھا ملا کر اپنے شب و روز کے اعمال کی تصحیح کرتے جائیں۔فرعون وقت خوب سرگرم ہے!اس بات سے ہم بخوبی واقف ہیں لیکن اصلاح حال کے لیے ہم کیا کچھ کر رہے ہیں؟اس پہ نظر کون رکھے گا!!

لبرل ازم یا انکارِ خداوندی

دنیا پر عظیم ترین اثرات ڈالنے والے مذہب سے تعلق رکھنے والوں نے جب اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کرنا شروع کیا تو ایک وقت وہ بھی آیا کہ مسلمان مغلوب ہوتے چلے گئے، دنیا کی باگ دوڑ ان کے ہاتھ سے لے لی گئی اور وہ تنزل کا شکار ہوئے۔ وجہ یہ کہ وہ اپنے مقصد وجود سے ناواقف ہو چلے تھے۔ اور یہ واقعہ کل کا نہیں آج کا ہے۔ ان حالات نبٹنے کے لیے لازم ہے کہ مسلمان اُس اسلام سے بخوبی واقف ہوں جس کی خاطر وہ مصروفِ عمل ہوا چاہتے ہیں۔ نیز کفر و جاہلیت سے بھی مکمل واقفیت لازم ہے۔ تاکہ جہالت جس لباس اور جس رنگ میں بھی ظاہر ہو اس کو پہچان لیا جائے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے: "مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا جس نے اسلام میں نشو و نمو پایا اور جاہلیت کو وہ نہیں پہنچانتا"۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسلمان زمان و مکاں کے حدود کی پابندیوں سے اوپر اٹھ کر صراط مستقیم پر قائم رہیں۔ نیز وہ اتنی ذکاوت و مستعدی اور علم رکھتے ہوں اور محنت کرنے کے لیے تیار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں، اور زمین میں دولت و قوت کے جو چشمے اور دفینے رکھ دیئے ہیں، ان سے کام لیتے ہوئے اِن کو اسلام کے مقاصد کے لیے مفید بنا سکیں۔

آج دنیا کے مختلف ممالک دو بڑے نظریات کی یلغار سے دوچار ہیں۔ان میں ایک لبرل ازم ہے تو دوسرا سیکولر ازم۔ضرورت ہے کہ اس فکری یلغار کا ہر سطح پر مقابلہ کیا جائے تاکہ زندگی کے تمام ہی شعبہ‌حیات ؛دین و مذہب، اخلاق، سماج، تعلیم، معاش اور سیاست اس کی خباثت سے نکل کر انسانوں کو حقیقی زندگی پر عمل کرنے میں معاون و مددگار ہوں۔ساتھ ہی سرمایہ دارانہ ستعماراور "انتہا پسندی" و "دہشت گردی" جیسے مذموم نعروں کی آڑ میں مظلومین کا بڑے پیانہ پر جو آج استحصال جاری ہے اُس پر قابو پایا جا سکے۔گرچہ کمیونزم اور سوشلزم کو شکست ہو گئی ہے اس کے باوجود مذکورہ دونوں نظریات اپنی نوع کے اعتبار سے اصل نظریات نہیں ہیں بلکہ لبرلزم اور سیکولرزم کے ہی محض فروع ہیں۔ان حالات میں مسلم ممالک ہوں یا دیگر،دونوں ہی لبرل ازم اور سیکولرازم کی جکڑ بندیوں میں بری طرح گھرے ہوئے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ مسلم ممالک کے بیشتر سیکولر حکمراں ذاتی مفادات کے پیش نظر مغربی طاقتوں کے ہمنوا بلکہ آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔وہیں دوسری جانب مسلمانوں کی اکثریت لبرلزم اور سیکولرزم کو نہ سمجھنے کے باعث اس لڑائی کو ایک گومگو کی حالت میں دیکھ رہی ہے۔لبرلزم اور سیکولرزم کے وہ علم بردار جو مسلمان ممالک کے شہری ہیں عوام الناس کو دھوکے میں مبتلا کیے ہوئے ہیں۔یہ لوگ خدا، رسول، قرآن اور اسلام کا نام لیتے ہیں مگر عملی زندگی میں اسلامی تعلیمات کے نفاذ سے بدکتے ہیں۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک آدمی بیک وقت مسلمان اور سیکولر یا لبرل ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ سیاسی ، ادبی، صحافتی اور ثقافتی حلقوں میں اثر و نفوذ رکھتے ہیں اور ذرائع ابلاغ اور حکومتی وسائل کو استعمال کرتے ہوئے نہایت آہستگی اور خاموشی کے ساتھ معاشرے کے تمام شعبوں سے خدا اور اسلام کو بے دخل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ سیکولرزم کی ساخت کے عین مطابق یہ سیکولر حکمراں یا دانش ور مسلمانوں کے عقائد، مراسم عبودیت اور رسوم و رواج کی نہ صرف یہ کہ مخالفت نہیں کرتے بلکہ خود بھی ان کو اختیار کرکے عوام کو اپنے متعلق پکے مسلمان ہونے کا تاثر دیتے ہیں اور مسلمان ہیں کہ ان سے لگاتار دھوکا کھائے جا رہے ہیں۔

اور پھر 'لائبرالس (liber) 'لفظ 'لبرل'، قدیم روم کی لاطینی زبان کے لفظ 'لائیبر سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے "آزاد، جو غلام نہ ہو"۔ آٹھویں (liberalis) ' صدی عیسوی تک اس لفظ کے معنی ایک آزاد آدمی ہی تھا۔ بعد میں یہ لفظ ایک ایسے شخص کے لیے بولا جانے لگا جو فکری طور پر آزاد، تعلیم یافتہ اور کشادہ ذہن کا مالک ہو۔ اٹھارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد اس کے معنوں میں خدا یا کسی اور مافوق الفطرت ہستی یا مافوق الفطرت ذرائع سے حاصل ہونے والی تعلیمات سے آزادی بھی شامل کر لی گئی، یعنی اب لبرل سے مراد ایسا شخص لیا جانے لگا جو خدا اور پیغمبروں کی تعلیمات اور مذہبی اقدار کی پابندی سے

خود کو آزاد سمجھتا ہو، اور لبرلزم سے مُراد اسی آزاد روش پر مبنی وہ فلسفہ و نظامِ اوراخلاق و سیاست ہوا جس پر کوئی گروہ یا معاشرہ عمل کرے۔یہ تبدیلی اٹلی سے چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہونے والی تحریک احیاے علوم (یعنی rebirth of renaissance)) کے اثرات یورپ میں پھیلنے سے آئی۔برطانوی فلسفی جان لاک (1620ء ۔1704ء) پہلا شخص ہے جس نے لبرلزم کو باقاعدہ ایک فلسفہ اور طرزِ فکر کی شکل دی۔یہ شخص عیسائیت کے مروجہ عقیدے کو نہیں مانتا تھا کیونکہ وہ کہتا تھا کہ بنی نوعِ انسان کو آدم کے اس گناہ کی سزا ایک منصف خدا کیوں کر دے سکتا ہے جو انھوں نے کیا ہی نہیں۔عیسائیت کے ایسے عقائد سے اس کی آزادی اس کی ساری فکر پر غالب آ گئی اور خدا اور مذہب پیچھے رہ گئے۔انقلابِ فرانس کے فکری رہنما والٹیر (1694ء ۔1778ء) اور روسو (1712ء ۔1778ء) اگرچہ رسمی طور پر عیسائی تھے مگر فکری طور پر جان لاک سے متاثر تھے۔انھی لوگوں کی فکر کی روشنی میں انقلابِ فرانس کے بعد فرانس کے قوانین میں مذہبی اقدار سے آزادی کے اختیار کو قانونی تحفظ دیا گیا اور اسے ریاستی اُمور کی صورت گری کے لیے بنیاد بنا دیا گیا۔امریکا کے اعلانِ آزادی میں بھی (American Declaration of Indipendence) شخصی آزادی کی ضمانت جان لاک کی فکر سے متاثر ہو کر دی گئی ہے (انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا، وکی پیڈیا اور اوکسفرڈ ڈکشنری) ۔دنیا کے مختلف ممالک میں خدا، حیات بعد الموت اور دین اسلام کی دنیاوی امور سے متعلق تعلیمات کے بارے میں آج جو بے

اطمینانی پائی جاتی ہے، اس کا سرچشمہ یہی یورپ کی خدا اور اس کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے برگشتہ فکر ہے جس کی ذرا سخت قسم لبرلزم اور کچھ نرم سیکولرزم ہے۔ یہ لبرل ازم اور سیکولرازم ہی ہے جس نے موجودہ دور کے عصری تعلیمی اداروں میں "تصور وحی کی نہی" جیسے تعلیمی نظام کو یا تو فروغ دینے یا اس کا آلہ کار بننے پر مجبور کیا ہے۔ نتیجتاً ہر خاص و عام مادیت اور آوارگیٔ نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو گیا۔

آج امت کو درپیش مسائل کا واحد راستہ یہی ہے کہ حقائق اور واقعات کا جرات و دور اندیشی اور صحیح دینی روح وبصیرت کے ساتھ سامنا کیا جائے۔ ملکِ عزیز میں دین کی صحیح تعلیم کے مطابق ہمہ گیر، صالح اور ضروری تبدلی کے لیے صدق دل اور اخلاص نیت کے ساتھ کوشش کی جائے۔ جن چیزوں کا ازالہ اور سدّ باب ضروری ہو ان کا سد باب کیا جائے اور جن اصلاحات کا نفاذ اور جن اسکیموں کا آغاز ضروری ہو، ان کے آغاز میں دیر نہ کی جائے۔ اسلام، قرآن اور سنت رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی حدود کے مطابق معاشرہ میں مساوات اور انصاف قائم کیا جائے۔ اہل ملک کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے ضروری قدم اٹھائے جائیں، کم از کم جمہور کے ہر فرد کے لیے امکانی حد تک ضروریات زندگی کا بندوبست ہو۔ اس بے جا اسراف اور حد سے بڑھی ہوئی فضول خرچی کو ختم کیا جائے جو عوام کی حقیقی ضروریات بھی پوری ہونے نہیں دیتی۔ اغنیا و اہل

ثروت میں ایثار کا مادہ، اور ضروریات سے فاضل مال کے خرچ کا جذبہ اور "یسئلونک ماذا ینفقون، قل العفوا" پر عمل کرنے کا شوق ہو۔ فقراء میں استغناء و خودداری اور اپنے گاڑھے پسینہ اور محنت و قابلیت سے اپنی ضروریات زندگی کے بندوبست کا جذبہ ہو۔ نظام تعلیم کو نئے سرے سے اس طرح ڈھالا جائے کہ وہ اسلام کے عقائد و اصول اور عصر جدید کے تغیرات اور علوم و سائل دونوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور دونوں کے تقاضے پورے کرتا ہو۔ نئی نسل میں ایک طرف ایمان و یقین ،اخلاقی قوت، استقامت، خود اعتمادی و خودداری ،اپنے دین پر غیر متزلزل یقین اور اس کے لیے جذبۂ قربانی ہو۔تو وہیں دوسری طرف قوتِ ایجاد، فکری استقلال، بلند ہمتی اور اولوالعزمی پیدا کرنے اور جرات و ذہانت کے ساتھ مغرب کا مقابلہ کرنے کا جوہر اور اوصاف پیدا کیے جائیں۔اس کے لیے لازم ہے کہ ہر باشعور مسلمان ایک پھر تجدید شہادت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے منظم سعی و جہد کا آغاز کرے۔ حصول مقاصد کے لیے لازم ہے کہ صحیح اسلامی بنیادوں پر مسلمان یا تو خود ایک گروہ مخصوص تشکیل دیں بصورت دیگر موجودہ اسلامی تحریکات کا وہ حصہ بن جائیں !

ذرا ایک لمحہ ٹھہر کر انتظار ہی کر لیا جائے !

16مئی 2014 کی صبح ہندوستانی سیاست کی ایک اہم صبح تھی۔ گرچہ اس صبح کا سبھی کو انتظار تھا لیکن ملک کی دو اہم سیاسی جماعتوں میں برسر اقتدار کانگریس اور اس کی حریف بھارتی جنتا پارٹی کا انتظار کچھ مخصوص ہی انداز کا تھا۔ سیاسی مبصرین اور تجزیہ نگاروں کا کہنا تھا کہ چونکہ اس مرتبہ کانگریس ایک بڑی ناکامی کا سامنا کرنے جا رہی ہے لہذا دوسروں کے مقابلہ وہ زیادہ فکر مند ہے۔ تو وہیں بھارتی جنتا پارٹی اور اس کے قائم کردہ محاذ این ڈی اے کے لوگ گزشتہ پارلیمانی نتائج کے مقابلہ اس مرتبہ خود کو زیادہ بہتر محسوس کر رہے تھے۔ اس خوشی اور فکر مندی کے پس پردہ ہندوستانی سیاست کی وہ خاموش تبدیلی تھی جس کا انتظار شاید کہ ایک طویل عرصہ سے کیا جا رہا تھا۔ 2014 کے پارلیمانی انتخابات میں ووٹروں کی تعداد 81 کروڑ سے زیادہ (کل 81,45,91,184) تھی جو یورپی یونین کی پوری آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ 10اپریل 2014 کو دہلی و دیگر ریاستوں میں پہلے مرحلے کے ووٹنگ کا آغاز ہوا تھا جسے کل 9 مرحلوں میں 12مئی 2014 کو مکمل کیا گیا۔ اس پورے عمل میں الیکشن کمیشن کے مطابق سب سے زیادہ 66.38% فیصد ووٹنگ ہوئی۔ یہ وہ ریکارڈ ہے جو 1984 میں اُس وقت کے وزیر اعظم اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ہونے والی

فیصد ووٹنگ کا ریکارڈ ٹوٹنے کی شکل میں سامنے آیا۔الیکشن کمیشن ہی کے مطابق 64%
اس بار کل 55.1 کروڑ ووٹروں نے ووٹ ڈالا جو 2009 کے پارلیمانی انتخابات کے
مقابلے 32% فیصد زیادہ ہے۔یہ انتخابات اس لحاظ سے بھی اہم تھے کہ اس مرتبہ
ووٹر 18 سے 19 سال کی عمر کے تھے، جن میں 58.6% فیصد مرد 2,31,61,296
جبکہ 41.4% فیصد خواتین ووٹرز رہیں۔ تجزیہ کاروں کے مطابق انتخابی نتائج کی کنجی ان
ہی نئے ووٹروں کے ہاتھ میں تھی۔بڑی ریاستوں میں اس مرتبہ مغربی بنگال (81.8
فیصد)، اڈیشا (74.4% فیصد) اور آندھرا پردیش (74.2% فیصد) بالترتیب سب سے %
زیادہ ووٹ ڈالے گئے۔اسی کے ساتھ اترپردیش میں 58.6% فیصد جبکہ بہار میں
فیصد پولنگ عمل میں آئی۔حکومت ہند نے اس بار انتخابات پر کل 56.5%3426
کروڑ روپے خرچ کیے جو 2009 کے 1483 کروڑ روپے کے مقابلے % 131 فیصد
زیادہ ہے۔

مئی 2014 کی صبح سے ووٹنگ کے نتائج سامنے آنے شروع ہوئے تو تقریباً تین 16
ہی گھنٹوں میں نظروں پر چھائے دھندلکے صاف ہونے لگے۔وہ تمام ایگزٹ پولز جن
کو عام طور پر نہ صرف عوام بلکہ سیاسی دوڑ میں موجود پارٹیاں بھی غلط بتا رہی تھیں، سچ
ہوتے نظر آنے لگے۔اور شام تک تقریباً تمام ہی دعوے غلط ثابت ہو گئے۔کانگریس
پارٹی اور اس کی اتحادی پارٹیوں کو غیر متوقع ناکامی سامنے آئی تو وہیں وہ تیسرا محاذ جو
گرچہ باقاعدہ محاذ کی شکل اختیار نہ کرسکا

تھا، کل نتائج آنے سے قبل ہی ڈھیر ہو گیا۔اترپردیش میں برسراقتدار "سماج وادی پارٹی کو بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو وہیں دوسری طبقاتی کشمکش پر منحصر" بہوجن سماج پارٹی" کی شکست فاش ہوئی ۔بہار میں برسراقتدار "جنتا دل یونائیٹڈ" کو پارلیمنٹ کی ایک بھی سیٹ حاصل نہ ہو سکی ۔تو وہیں دوسری جانب "راشٹریہ جنتا دل" جس توقع کے ساتھ مصروف عمل تھی، وہ ناکام ٹھہری۔ملک کی سب سے بڑی پارٹی "کانگریس آئی کے بھی بری طرح قدم ڈگمگائے۔نوبت یہاں تک آئی کہ پورے ہندوستان سے " پارلیمنٹ کی کل 44 سیٹیں ہی مل سکیں۔جبکہ اس پارٹی کی تاریخ کا سب سے افسوسناک کی لیڈرشپ بھی ہاتھ سے چلی گئی۔دہلی (apposition) پہلو یہ ابھرا کہ حزب اختلاف راجستھان اور گجرات میں بی جے پی کو کل سیٹیں (100%) حاصل ہوئیں ۔تو وہیں، اترپردیش میں 80 میں سے 73 اور بہار میں 40 میں سے 31 سیٹیں جیت کر پارٹی نے کامیابی کا جشن منایا۔انتہا یہ کہ ان مقامات پر جہاں بی جے پی نے آج تک کوئی ایک سیٹ بھی نہیں حاصل کی تھی ،ایسے دو مقامات مغربی بنگال اور تمل ناڈو میں بھی پارٹی کو ایک ایک سیٹ حاصل ہو گئی۔بی جے پی کو 2014 کے پارلیمانی الیکشن میں 282 سیٹیں ملیں تو وہیں ان کے اتحاد این ڈی اے کو 334 سیٹیں حاصل ہوئیں۔سیاسی بساط پر پھیلے اس پورے کھیل میں اگر عام آدمی پارٹی کو نظرانداز کیا جائے تو بات ہی پوری نہ ہو سکے گی۔ملک کی راجدھانی دہلی سے اپنی پہچان بنانے والی اس پارٹی نے دہلی میں تو کوئی سیٹ حاصل نہیں کی البتہپنجاب سے 4،سیٹیں

جیت لوگوں کو حیران کر دیا۔

16 مئی 2014 کے نتائج کے بعد جب کہ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ بنا گٹھ جوڑ اب بھارتی جنتا پارٹی کی حکومت بننا طے ہے تو امریکہ کے صدر براک اوباما نے متوقع وزیر اعظم نریندر مودی کو عام انتخابات میں ان کی جماعت کی کامیابی پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے امریکہ آنے کی دعوت دی۔ 'وہائٹ ہاؤس' سے جاری بیان کے مطابق امریکی صدر نے امید ظاہر کی کہ ہندوستان اور امریکہ کے درمیان اسٹریٹجک تعلقات کو آگے بڑھانے کے لیے وہ اور مودی مستقبل میں مل کر کام کریں گے۔ قبل ازیں وہائٹ ہاؤس کے ترجمان نے نریندر مودی کو ان کی جماعت کی عام انتخابات میں شاندار کامیابی پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر مودی کو امریکہ آنا ہو تو انہیں ویزہ جاری کر دیا جائے گا۔ خیال رہے کہ 2002 میں گجرات میں ہونے والے مسلم مخالف فسادات میں نریندر مودی کے مبینہ متنازع کردار پر امریکہ نے 2005 میں انہیں ویزہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان فسادات میں لگ بھگ ایک ہزار افراد ہلاک ہوئے تھے۔ مودی پر الزام لگتا رہا ہے کہ انہوں نے بطور وزیر اعلیٰ گجرات ان فسادات کی روک تھام میں غفلت برتی تھی اور فسادیوں کی بلواسطہ حوصلہ افزائی کی تھی۔ نریندر مودی کے خلاف ان الزامات کا چرچہ حالیہ پارلیمانی انتخابات کے دوران بھی رہا تھا۔ لیکن مودی ہمیشہ ان الزامات کی تردید کرتے رہے ہیں۔ ترجمان کا کہنا تھا کہ ہندوستان

میں نئی حکومت کے قیام کے بعد امریکہ نو منتخب وزیر اعظم اور ان کی کابینہ کے ساتھ قریبی تعاون برقرار رکھنے کا خواہاں ہے تاکہ دو طرفہ تعلقات کو مزید مضبوط اور مستحکم کیا جا سکے۔وہیں دوسری جانب نواز شریف نے بھی نریندر مودی کی کامیابی کے بعد ٹیلی فون پر انہیں مبارکباد دیتے ہوئے پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ماضی میں دس برس تک ہندوستان کا وزیر اعظم رہنے والے من موہن سنگھ بار بار دعوت کے باوجود شاید رائے عامہ کے خوف کی وجہ سے پاکستان کا دورہ نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن قیاس کیا جا رہا ہے کہ مودی پاکستان کا دورہ کر سکتے ہیں۔سیاسی مبصرین کا ماننا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں دائیں بازو کی حکومتیں ہی دونوں ملکوں کے درمیان کوئی معاہدہ کروانے کی کوشش کر سکتی ہیں۔اس سلسلہ میں 1999 کی بس ڈپلومیسی کا حوالہ دیا جاتا ہے جب بی جے پی کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے لاہور کا دورہ کیا تھا اور اس وقت بھی پاکستان میں نواز شریف ہی وزیر اعظم تھے۔

فی الوقت ہندوستانی سیاست میں بڑی ہل چل مچی ہوئی ہے۔اور بی جے پی کی نمایاں کامیابی کا راز جاننے کا شاید ہر وہ شخص، طبقہ اور گروہ خواہش مند ہے جو اپنی تمام کوششوں کے باوجود الیکشن میں بری طرح سے ناکام ہوا ہے۔اس میں چند باتیں تو عیاں ہیں جس میں اولذکر میڈیا کا مشکوک کردار ہے تو وہیں دولت کا لامحدود استعمال۔لیکن اس کے علاوہ بھی ناکامی کا سامنا کرنے والی

پارٹیوں و دیگر سیکولر طبقات کو ان باتوں کے جاننے کا اشتیاق ہے جنھوں نے بی ایس پی اور لیفٹ جیسی کیڈر بیس پارٹیوں کا 2014 کے پارلیمانی انتخابات میں نتائج کے اعتبار سے بالکل ہی خاتمہ کر دیا ہے۔ وہیں متفکر وہ بھی ہیں جنہوں نے بڑے طمطراق کے ساتھ "نیتا جی" کو بطور وزیر اعظم پیش کیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس طرح بہار میں یونائیٹڈ جنتا دل کے چیف منسٹر نے استعفا دیا اور اس کے بعد سابقہ خاندانی سیاست کے ماہرین یک جٹ ہونے کی بات کر رہے ہیں۔ کیا اس طرح کی مثالیں مزید قائم ہوں گی؟ ہمارے خیال میں سیاسی بساط پر قیاس آرائیوں سے بہتر ہے کہ ذرا ایک لمحہ ٹھہر کر انتظار ہی کر لیا جائے!

! فحاشی و عریانیت کے فروغ میں میڈیا کی حصہ داری

ملک عزیز میں جس طرح منشیات کا کاروبار حکومت کی سرپرستی میں جاری ہے ٹھیک اسی طرح فحاشی و عریانیت بھی عروج پر ہے۔اس کے باوجود نہ اہل اقتدار اور نہ ہی سرکردہ حضرات اس ناسور کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔رہے وہ بے یارومددگار افراد و گروہ جو اس کے خلاف آواز اٹھاتے بھی ہیں تو ایک طرف میڈیا ان کی زبانوں پر تالے لگادیتی ہے وہیں "مہذب افراد و گروہ" بھی ان کی کبھی کھلے تو کبھی ڈھکے چھپے انداز سے مخالفت ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میڈیا جو عوام کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہے، رائے عامہ ہموار کرنے اور کرانے میں اپنا موثر کردار ادا کرتی ہے، سرمایہ داروں کے غلط رویوں پر لگام کستی ہے، ملک اور معاشرہ کو صحیح بنیادوں پر استحکام بخشتی ہے، وہی میڈیا تعاون کی شکلیں اختیار کرتے ہوئے فحاشی و عریانیت کے خلاف آواز اٹھانے والے کمیاب افراد کو سہارا دیتی تو یہ آواز نہ صرف دیگر لوگوں کو بھی متوجہ کرتی بلکہ ان غیر اخلاقی و غیر قانونی کاموں میں ملوث رہنے والوں پر بھی شکنجہ کستی جو اس سیلاب کے پھیلاؤ کا ذریعہ بنتے ہیں۔برخلاف اس کے حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف میڈیا سماج میں پھیلتے اس ناسور کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی مطلوبہ حد تک مدد نہیں کرتی وہیں دوسری طرف اس غیر اخلاقی عمل کے فروغ میں وہ بھی خود

شریک ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ فحاشی و عریانیت کے بڑھتے سیلاب پر روک لگائی جا سکے گی؟ساتھ ہی قابل توجہ اور عبرتناک پہلو یہ بھی ہے کہ آج اس غیر اخلاقی، غیر سماجی اور غیر انسانی عمل کو وہ پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا تعاون فراہم کر رہا ہے جہاں نہ صرف قوم پرست ، سوشلسٹ، کمیونسٹ اور عام آدمی بلکہ ملک کے تقریباً تمام ہی افکار و نظریات کے حاملین وابستہ ہیں، نیز یہ میڈیا نہ صرف ملک کا رجسٹرڈ بلکہ لائسنس یافتہ بھی ہے۔ہماری مراد ملک کے انگلش اور ہندی زبانوں میں شائع ہونے والے روزناموں سے ہے ساتھ ہی وہ دیگر علاقائی زبانوں کے اخبارات ،جرائد، رسائل اور نیوز و انٹر ٹینمنٹ چینلس ہیں جو اعمال فاحشہ کے فروغ میں سرگرداں ہیں اور جنہیں ملک عزیز ہند میں لائسنس یافتہ کی حیثیت سے قانونی بھی جواز حاصل ہے۔

فحاشی و عریانیت کے پھیلتے ناسور کے نتیجہ میں عموماً سماج کا ہر طبقہ اور خصوصاً سماجی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور طبقہ بری طرح متاثر ہے۔ہر دن اعمال بد کے مظاہرہ سامنے آتے ہیں۔ چھوٹی بچیوں، جوان بہنوں اور ملک و معاشرہ کی ماؤں کے ساتھ گھناؤنا فعل انجام دیا جاتا ہے۔ نتیجتاً ان کی عزت و وقار مجروح ہوتا ہے، ذہنی جسمانی اور معاشرتی سطح پر انہیں مختلف طرح کی اذیتیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یہاں تک متاثرین کو زندگی گزارنا دشوار ہو جاتا ہے،ان کی خوشیاں غارت اور ان کا مستقبل داؤ پر لگ جاتا ہے۔اس پس منظر میں

میڈیا جو کبھی مضامین، تبصرے، جائزے تو کبھی ٹی وی پر بحث و مباحثہ میں سرکاری و نیم سرکاری ذمہ داران سے ان کی ناکامی پر سوال اٹھاتا ہے،اگر وہ خود اس برائی کے فروغ میں حصہ دار ہو تو کیونکر اس بے باکانہ انداز میں سوال کرنے کا حقدار ہے؟معاملہ یہیں میڈیا پر ہونے والی بحثوں تک نہیں رکتا بلکہ جہاں ایک حکومت دوسری حکومت کو ریاستی حکومتیں تو کبھی مرکزی حکومت)کٹھمرے میں کھڑا کرتی ہے وہیں سرکردہ) حضرات اور عوام بھی ایک دوسرے پر لعن طعن میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔اس پس منظر میں تصور فرمائیں کہ برائی کے خلاف فکری و نظریاتی اور عملی ذہن سازی کرنے والے (رائے عامہ ہموار کرنے والے)ادارے اگر خود ہی برائی کے فروغ کا ذریعہ بنیں تو پھر کون صحیح نہج پر معاشرہ اور عوام کی رہنمائی کر سکے گا؟

موجودہ دور میں "خدمت "کے کاموں نے کاروبار کی شکل اختیار کر لی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ میڈیا جو کل تک خبر یعنی واقعہ کو غلط بیانی سے پاک کرتے ہوئے لوگوں کو حقیقت سے روشناس کرانے کی اہم ترین خدمت انجام دیتا تھا۔آج اسی خدمت نے جب کاروبار کی شکل اختیار کر لی تو پھر اس کے زوال کی انتہا بھی نہ رہی۔یہاں تک کہ آج برائیوں کے فروغ میں جن لوگوں کا سب سے بڑا حصہ کہا جا سکتا ہے، یہ وہی ہیں جو "خدمت " کو پیشہ کے طور پر انجام دینے والے سرکردہ، بااختیار،اور صحیح و غلط کے فیصلہ صادر کرنے والے میڈیا مالکان کہلاتے

ہیں۔ باالفاظ دیگر یہ وہ سرمایہ دار ہیں جنہیں ہر خدمت خوبصورت ناموں سے فروخت کرنا آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انگلش زبان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اخبار "دی ٹائمس آف انڈیا" جب برائیوں کو بھی خبر کی شکل میں شائع کرنے لگے تو یہ برائیاں گھروں میں پہنچ کر، معصوم بچوں و بچیوں کے ذہنوں کو پراگندہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔نوجوانوں کے جذبات کو مشتعل کرتا ہے۔ جس کے نتائج سماج میں پھیلنے والی غیر اخلاقی و غیر قانونی سرگرمیوں کی شکل میں جلد ہی ہمارے سامنے آتے ہیں۔اگر آپ صرف اس ایک اخبار کی ویب سائٹ کا جائزہ لیں تو محسوس کریں گے کہ وہ تمام تصاویر، اسٹوریز، ویڈیوز یہاں موجود ہیں، جو معاشرہ کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔اس کے علاوہ "دی ہندوستان ٹائمس" اور دیگر رجسٹرڈ انگلش اخبارات بھی کچھ کم نہیں۔ دوسری جانب ملک کی سرکاری زبان "ہندی" میں شائع ہونے والے اخبارات کے ذریعہ بے لگام ہوتی برائیاں جو پروان چڑھ رہی ہیں ان پر بھی کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ لہذا وہ بھی اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں، یہاں تک کہ انگلش وریاستی زبانوں کے میڈیا سے بھی کچھ آگے ہی نظر آتے ہیں۔ فیشن، انٹرٹینمنٹ، فوٹوز، بالی ووڈ،اور اسی طرز کے دیگر صفحات میں وہ جس بے توجہی کے ساتھ تصاویر اور اسٹوریز لوڈ کرتے ہیں ،اس سے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اِن اخبارات کی کوئی اخلاقی حدود بھی ہیں یا اخبارات کے مالکان نے اپنے اخبار کے لیے کوئی اخلاقی ضابطہ بھی طے کیا ہے۔ ملک عزیز ہند میں زبان کی قید سے باہر جو

اخبارات بھی شائع ہوتے ہیں،اس سے ایک قدم آگے جب وہ اپنی ویب سائٹس بناتے ہیں اور متعلقہ صفحات پر چیزیں محفوظ بھی کرتے جاتے ہیں،اس مرحلے میں ویب سائٹس کے یہ صفحات کسی قدر زیادہ ستم قاتل بنتے ہیں جو شائع شدہ اخبار کی شکل میں نہیں ہوتے۔اور اگر شائع ہونے اخبارات کے مقابلہ آن لائن زیادہ دیکھے اور پڑھے جاتے ہوں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان برائیوں کا دائرہ کس قدر وسیع ہو جائے گا۔وہیں دوسری طرف ہمارے وہ نیوز چینلس جو دن رات خبریں دکھاتے ہیں وہ بھی خبروں کے درمیان فحش و عریاں اشتہارات دکھا کر لوگوں کو گمراہ کرنے سے پرہیز نہیں کرتے۔پھر شائع ہونے واخبات ہی کی طرح اگر ان نیوز چینلس کی ویب سائٹس کا جائزہ لیا جائے تو تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی مخصوص صفحات کسی پورنوگرافی ویب سائٹ سے کچھ کم نہیں۔جملہ معترضہ کے طور پر ہم بتاتے چلیں کہ جن اخبارات،رسائل اور نیوز چینلس کے فحاشی و عریانیت کو فروغ دینے والے صفحات کا یہاں تذکرہ کیا گیا، مضمون میں ان صفحات کو ویب ایڈریس کے ساتھ بطور حوالہ دینے کا ارادہ بھی رکھتے تھے،، لیکن ایک تو یہ محسوس ہوا کہ جن باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان سے عموماً لوگ واقف ہیں ،دوسرے یہ کہ وہ مزید برائی کو فروغ دینے کا ذریعہ بن سکتے ہیں،بس اسی خیال سے حوالہ دینے سے پرہیز کیا گیا ہے۔

ملک عزیز ہند سے یہ وہ چند جاری ہونے والے اخبارات،رسائل،ویب پورٹل،نیوز

چینلس اور ان کی ویب سائٹس ہیں جو حکومت کی اجازت سے اور باقاعدہ رجسٹرڈ ہونے کی بنا پر تحریر کا ذریعہ بنی ہیں۔برخلاف اس کے ایک جانب انٹرنیٹ کے ذریعہ دنیا کا ہر اخبار، رسالہ اور نیوز چینل یا کم از کم اس کی ویب سائٹس پر موجود مواد تک ہر شخص پہنچنے میں کامیاب ہے تو وہیں غیر قانونی میڈیا کے ذریعہ انجام دی جانے والی سرگرمیاں جو لامحدود ہیں ،کا تذکرہ کیا جانا ہی عبث ہے۔لہذا تاریخ کے جس دور سے ہم دوچار ہیں ،اس میں گزشتہ تہذیبوں کا جائزہ لیا جائے یا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں گزشتہ اقوام کی بداخلاقیوں وبداعمالیوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔دونوں ہی صورتوں میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر دور کے بد اخلاق و بد کردار کارنامہ نہ صرف آج موجود ہیں بلکہ تیز رفتاری کے ساتھ جاری و ساری بھی ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ غلاظت سے کراہیت اختیار کی جائے۔نا یہ کہ غلاظت کے ڈھیر پر زندگی بسر کرتے ہوئے خوشبو و بدبو اور گندگی و صفائی میں تمیز کرنا ہی بھول جائیں۔اس تعلق سے تبدیلی کے خواہاں،برائیوں سے بچنے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اصلاح پسندوں کے لیے اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث کافی ہے جس میں برائی کے قریب بھی نہ جانے کی بات کہی گئی ہے اور جس کا اطلاق آج میڈیا پر بھی ہونا چاہیے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ دور حاضر میں انجام دی جانے والی بہت سی سرگرمیوں پر اصلاح پسندوں کا یعنی ان لوگوں کا جو برائی کو برائی سمجھتے ہیں،کا کنٹرول نہیں ہے۔اس کے باوجود اپنی ذات پر لازماً ہمارا کنٹرول رہنا

چاہیے۔ساتھ ہی اگر ہمیں یہ احساس بھی ہوجائے کہ ایک.برائی نہ صرف ہماری ذات کو متاثر کرتی ہے بلکہ گھر،گلی ، محلّہ اور سماج بھی اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔تو یہ احساس کافی ہے ان حوصلہ مند اور جرات مندانہ اقدام کرنے والوں کے لیے جو نہ صرف اپنی ذات کے تعلق سے ہر وقت متوجہ رہتے ہیں بلکہ موجودہ قوانین کی مدد سے ان نام نہاد مہذب افراد اور گروہ کے اقدامات پر بھی لگام کس سکتے ہیں جو نہ صرف غیر اخلاقی حرکتوں کے نتیجہ میں لگاتار اپنی ذات پر ظلم کرنے میں مصروف ہیں بلکہ سماج کو بھی غلط رخ دینے کا ذریعہ بنتے ہیں۔یاد رکھیں سماج میں پھیلنے والا ناسور مذہب کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ بلا مذہب نوع انسانی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔لہٰذا فحاشی و عریانیت اور دیگر.برائیوں کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو مذہب اور دیگر سماجی و طبقاتی کشمکش اور اس کی جکڑبندیوں سے اوپر اٹھ کر ایک پلیٹ فارم پر متحد ہونا چاہیے۔تب ہی ممکن ہے کہ ہمارے وہ ننھے بچے جو نہ صرف ہمارا بلکہ اس ملک کا بھی مستقبل ہیں.برائی کو.برائی سمجھ سکیں گے۔لیکن اگر یہ تذکرے آگے نہ.بڑھے تو عین ممکن ہے کہ یہ تمیز بھی جاتی رہے کہ.برائی کیا ہے اور بھلائی کیا؟اور ایک وقت وہ بھی آئے کہ ہم اپنے ہی گھروں میں خود اپنی ہی آنکھوں سے اہل خانہ کو ان تمام اعمال فاحشہ میں ملوث پائیں جن سے بچنے کی ہم آج گفتگو کر رہے ہیں۔ذلت و رسوائی کی اُس حالت میں نہ ہم زندہ ہی رہ سکیں گے اور نہ مرتے ہی بنے گا !

!یوم آزادی کا خطاب اور ملک کو درپیش مسائل وچیلنجز

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ہر دور میں فرقہ پرستی کا زہر منظم انداز میں گھولا جاتا رہا ہے۔جس کے نتیجہ میں نہ صرف اہل ملک حد درجہ پریشان رہے ہیں بلکہ امن وامان اور ترقی و خوشحالی بھی متاثر ہوئی ہے۔شاید اسی کا اظہار یوم آزادی کے موقع پر ملک کے وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں کیا ہے۔تقریر میں اس بات کا بھی تذکرہ ہے کہ غربت کے خاتمہ اور تعمیر وترقی کے لیے ہر شہری کو اپنی سطح پر منظم جدوجہد کرنی چاہیے۔وزیر اعظم نے معاشرے کی اس سوچ پر بھی سوالیہ نشان کھڑا کیا جہاں بیٹوں کو بڑھاپے کا سہارا سمجھا جاتا ہے۔برخلاف اس کے پانچ پانچ بیٹے ہونے اور بنگلہ وآسائشوں کے باوجود ماں باپ اولڈ ایج ہوم یا ودھوا آشرم میں رہتے ہیں ۔وہیں ملک میں بڑھتے عصمت دری کے واقعات ،نکسلی تشدد،بدعنوانی،ذات پات اور جنین کشی کی مذمت کے بھی تذکرے ہوئے ہیں۔متذکرہ نکات کے علاوہ بھی دیگر نکات پر وزیر اعظم نے اظہار خیال کیا ہے۔خاصیت بیان کرنے والوں نے اس تقریر کی یہ خوبی بھی بیان کی ہے کہ یہ بنا تحریر کی ہوئی رواں تقریر تھی جو گزشتہ سالوں بلٹ پروف شیلڈ میں بند ہو کر کی جانے والی تقاریر کے برخلاف کھلے آسمان میں تسلسل کی جانے والی تقریر تھی۔گرچہ یہ عمل کوئی غیر معمولی یااہم نہیں لیکن ظاہر و باطن کے فرق سے معصوم عوام کو متاثر

کرنے کا لازماً عمل تھا۔شاید اسی جانب وزیر اعظم کے خطاب پر تنقیدی نقطہ نظر سے کانگریس پارٹی کے جنرل سکریٹری شکیل احمد نے کہا کہ یہ تقریر صفراثرات والی تھی ۔جس میں کوئی نیا خیال ، نئی پہل،اور نئی اسکیم نہیں تھی۔نیز فرقہ پرستی کے مسئلہ پر وزیر اعظم پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ مودی کو یاد رکھنا چاہیے کہ بی جے پی کی سیاست ہی فرقہ پرستی پر منحصر ہے۔دوسری جانب پارٹی ترجمان اور سابق مرکزی وزیر منیش تیواری نے کہا کہ نئے وزیر اعظم کا یہ پہلا یوم آزادی کا خطاب تھا اور توقع تھی کہ وہ اگلے پانچ سالوں کے لیے کچھ نظریہ پیش کریں گے۔لیکن بد قسمتی کی بات ہے کہ وزیر اعظم چھوٹے موٹے مسائل میں الجھ کر رہ گئے اور موقع کے مطابق خود کو پیش نہیں کر پائے۔ ویں یوم آزادی کے موقع پر ملک کی تمام ہی ریاستوں میں آزادی کی تقریب پر 68 امن ماحول میں جوش وخروش کے ساتھ منائی گئی۔اس کے باوجود کشمیر میں عام ہڑتال کی کال پر جہاں ایک جانب یوم سیاہ منایا گیا وہیں بخشی اسٹیڈیم میں وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ نے ترنگا لہرایا اور عوام کو خطاب کیا۔اس دوران موبائل فون اور انٹرنیٹ کی سہولیات معطل رکھی گئیں اور حساس قصبوں میں سخت سیکورٹی پابندیاں نافذ رہیں۔دریں اثنا جمعرات کو پاکستان کے یوم آزادی کے موقع پر سری نگر اور کئی دیگر مقامات پر ہند مخالف گروپوں کے کارکنوں نے پاکستان کے پرچم لہرائے جنھیں فوراً ہی پولیس نے ہٹا لیا۔

یہ صحیح ہے کہ وزیر اعظم کا یوم آزادی کے موقع پر کیا جانے والا خطاب ملک کی موجودہ صورتحال،، مسائل اور چیلنجیز کا کسی حد تک عکاس ہے۔جہاں اس بات کا شدت سے اظہار کیا گیا ہے اہل ملک پوری طرح امن و امان کی زندگی سے محروم ہیں۔وجہ؟ وجہ سب کو معلوم ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ کوششیں ہی دراصل مسائل اور چیلنجیز میں اضافہ کا سبب ہیں۔یہ مسائل معاشی بھی ہیں اور سیاسی بھی،معاشرتی بھی ہیں اور تمدنی بھی، طبقاتی کشمکش اور ذات پات کی تقسیم بھی ان مسائل کا ایک جز ہے تو وہیں اندورنی اور بیرونی قوتوں کے مراکز سے اٹھنے والے چیلینجز بھی۔لیکن وزیر اعظم کی تقریر میں خصوصاً وہ مسائل جن کا تذکرہ معاشرہ سے ہے، قابل توجہ ہیں۔اور ان کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ مسائل ہمارے خود کے پیدا کیے ہوئے ہیں نہ کہ کسی اور نے ہم پر تھوپے ہیں۔جس کا تذکرہ وزیر اعظم نے بیٹے اور بیٹیوں کے فرق، جنین کشی اور اولڈ ایج ہوم یا ودھوا آشرم کی شکل میں کیا ہے۔وہیں خواتین کے تعلق سے غیر ذمہ دارانہ رویوں،اُن کی عفت و عصمت سے کھلواڑ اور ملک میں بڑھتے عصمت دری کے واقعات ہیں۔نیز ملک کی سلامتی و اتحاد سے متعلق مسائل جس میں خصوصاً وزیر اعظم کے ذریعہ نکسلی تشدد کا تذکرہ تو وہیں یوم آزادی کو یوم سیاہ منانے والوں کا مسلہ بھی میڈیا کے ذریعہ سامنے آیا۔تذکروں سے آگے سوال یہ ہے کہ کیا مسائل کو بیان کر دینا مسئلہ کا حل ہے؟یا اس کے لیے سنجیدہ کوششیں اور پیش رفت تذکروں میں جان پیدا کر سکتی ہیں؟یوم آزادی کی تقاریر ہر سال اہل

ملک سنتے آئے ہیں۔ جس میں کبھی کسی مسئلہ کو تو کبھی کسی اور مسئلہ کو حل کرنے نیز ملک کی ترقی ، فلاح و بہبود ، بھائی چارہ اور آپسی اتحاد کی بات کی جاتی رہی ہے۔ لیکن ہر تقریر اور اس کے بعد ایک مدت گزرنے کے باوجود نہ صرف یہ کہ مسائل جوں کے توں برقرار رہتے ہیں بلکہ ہر سال مسائل میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

انہی مسائل میں ملک کا ایک بڑا مسئلہ فرقاوارانہ کشیدگی اور فسادات ہیں۔ جو نہ صرف آزادی سے قبل بلکہ بعد بھی بہت ہی منظم انداز میں (well planned,well-designed and well engineered) ہوتے رہے ہیں۔ پھر متاثرین فسادات کے حالات کے پیش نظر کبھی دکھ، تو کبھی افسوس، رنج، ندامت، کے احساسات سامنے آتے ہیں ۔اس کے باوجود نہ ملک میں فرقہ پرستی میں کمی آئی اور نہ ہی فرقہ وارانہ فسادات ختم یا کم ہی ہوسکے ہیں۔ وہیں یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ملک میں فرقہ پرست طاقتوں کی نگاہ میں ہندوتو نظریہ کے فروغ میں اگر کوئی سب سے بڑی رکاوٹ ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ اور موجودہ ہندوستان میں ہندوتو کے نظریہ کے حامل ، سنگھ کے سابق پرچارک اور گجرات کے سابق وزیر اعلیٰ، سنگھ کی مخصوص کوششوں کے نتیجہ ہی میں ملک کے وزیر اعظم کی کرسی تک پہنچے ہیں۔ نیز سنگھ کا خود اعتراف ہے کہ اُس نے اِس الیکشن میں اپنی چالیس ذیلی تنظیموں کو بی جے پی کی جیت کو یقینی بنانے کے لیے سرگرم رکھا

تھا۔شاید انہیں کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ملک میں مسلمانوں کے خلاف کھلے عام اور بے دھڑک زہریلے الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں۔ کہیں ان کو ملک کا غدار کہا جا رہا ہے تو کہیں ملک سے ہجرت کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ کہیں کہا جا رہا ہے کہ اگر مسلمان گجرات کے فسادات بھول چکے ہوں تو مظفر نگر فسادات تو ضرور یاد ہوں گے تو کہیں کچھ اور تو کہیں کچھ اور۔اور ان تمام حالات پر نظر رکھنے، مکمل معلومات رکھنے اور پوری طرح واقف ہونے کے باوجود اگر پھر بھی امن و امان خراب کرنے والوں پر شکنجہ نہ کسا جائے تو یہ کیسے یقین کیا جاسکے گا کہ ملک میں فرقہ پرستی کے خاتمے کے لیے وزیر اعظم یا ان کی حکومت سنجیدہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دورِ حکومت میں صرف ایک ہی ریاست اترپردیش میں اب تک تقریباً600 سے زائد فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد کے واقعات رونما ہو چکے ہیں۔اس کے باوجود مرکزی حکومت ان کشیدگیوں اور تشدد کے واقعات پر قابو پانے میں ناکام نظر آتی ہے۔دوسری جانب جب ان فسادات کو روکنے کے لیے "انسداد فرقہ وارانہ تشدد بل" پیش کرنے اور پاس کرنے کی بات کی جاتی ہے تو اس صورت میں گزشتہ اور موجودہ دونوں ہی حکومتوں کے رویے اور سنجیدگی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔اگر واقعی موجودہ حکومت ملک میں امن امان کی خواہاں ہے

توضروری تھا کہ فوری اقدامات کرتے ہوئے نہ صرف اس بل کو پارلیمنٹ میں پیش کرتی ، بحث کرواتی بلکہ اس بل کی منظوری میں ہر ممکن تعاون بھی کرتی۔درحقیقت فرقہ واریت کے یہ بڑھتے واقعات نہ صرف ہندوستان

جیسے سیکولر ملک کی پیشانی پر بد نما داغ ہیں بلکہ نقصان کے اعتبار سے بھی سراسر اہل ملک ہی خسارہ میں ہیں۔اس سب کے باوجود فکری، نظریاتی اور عملی غیر سنجیدگی کو جذباتی تقاریروں سے حل کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں،جو کسی بھی لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔یہ خیال کہ ملک کی معیشت مستحکم ہو۔اور ہندوستان سارک ممالک،ایشیائی ممالک اور دیگر اقتدار کے مراکز پر اخلاقی و معاشی برتری حاصل کرے،اچھا ہے! لیکن جب تک کہ اہل اقتدار جو آج ملک کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں،قول و عمل میں یکسانیت قائم نہیں کرلیتے،خیال خیال ہی رہے گا عملی شکل نہ اختیار کرسکے گا۔

اندورنی مسائل کے علاوہ ہندوستان فی الوقت بیرونی مسائل اورچیلنجیز سے بھی دوچار ہے۔جس میں خصوصیت کے ساتھ چین سے لگے ہندوستانی باڈر ہیں۔جہاں چین تیز رفتاری کے ساتھ ہندوستان کی جانب اپنے قدم بڑھانے میں مصروف ہے۔اس کی تازہ مثال وزیر اعظم شی جنپنگ کے ذریعہ تبت میں ایک اور ریل لائن بچھانے کی اجازت کی شکل میں سامنے آئی ہے۔یہ ریل لائن سکم کے قریب ہوگی اور اس سے فوج اور فوجی سازوسامان کو ہندوستان میں پہنچانا آسان ہوجائے گا۔اس کے علاوہ بھی چین، بھوٹان اور نیپال تک ریل لائن بچھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔جس کا مقصدان ناقابل رسائی علاقوں میں ریل لائن بناکر وہ اپنی اسٹریٹیجک صورتحال کو مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ پھر ایک طرف جہاں چین،تبت پر اپنی پکڑ بنانے اور

ہندوستان کے سامنے چیلنج پیش کرنے کے ارادے سے۔بڑے پیمانہ پر ہائی وینز اور ریل لائنز بناتا جا رہا ہے۔وہیں دوسری طرف دیگرپڑوسی ممالک کی غیر مستحکم حکومتیں بھی ہندوستان کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔اس پورے پس منظر میں جہاں اندورنی و بیرونی مسائل ،خطرات، اورچیلنجیز سامنے ہیں وہاں صرف جوشیلی تقریریں کر دینا، نہ مسائل کا حل ہیں اور نہ ہی مسائل کے حل میں پیش رفت کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔تصور فرمائیں ایک ایسا ملک جہاں زندگی کی معمولی ضرورت "بیت الخلا "تک پوری نہ ہو سکتی ہو۔اور جس ضرورت کو پورا کرنے کا عزم یوم آزادی کے موقع پر ترنگا لہراتے ہوئے لال قلعہ سے وزیر اعظم اپنی تقریر میں کریں۔کیا ایسا ملک اور اس کے وہ دیگر مسائل جن کا تذکرہ کیا گیااور جن کا نہیں کیا گیا،صرف تقریروں سے حل ہو جائیں گے ؟خصوصاًاس صورت میں جبکہ نہ حکومت اور نہ ہی حکومتی ادارے عملی تبدیلیوں کا مظاہرہ کریں!

! وزراء اعلیٰ کی ہوٹنگ اور نفرت کا رستا ناسور

دنیا میں سب سے آسان کوئی چیز ہے تو وہ نفرت کی آگ بھڑکانا ہے۔برخلاف اس کے محبت اور جذبہ خیر سگالی اور اخوت و ہمدردی کو پروان چڑھانا ایک دشوار ترین عمل ہے۔ اس کے باوجود دشوار گزار عمل پر قائم رہنے والوں کو عوام پسند کرتے ہیں۔بالفاظ دیگر ہر شخص محبت کا بھوکا ہے اور نفرت کی بجائے محبت ہی کو پسند کرتا ہے۔لیکن دوسری جانب "خواص" جو تعداد میں بہت ہی کم ہوتے ہیں نفرت کی آگ بھڑکانے کے عمل میں داخل ہو جائیں تو ان کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ عوام کی پسند و ناپسند کو تہہ و بالا کرنا اور تغیر لانا آسان ہو جائے۔اور غالباً یہی خواص کا خاصہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کی موجودہ فکر اور طرز عمل میں تبدیلی اس انداز سے لائیں کہ لوگ خود اپنی ہی تبدیلی شدہ فکر و عمل میں کوئی بہت بڑا فرق محسوس نہ کر سکیں۔اب یہ تبدیلی چاہے مثبت ہو یا منفی !

گزشتہ دنوں ملک کے وزیر اعظم نے مختلف ریاستوں کے دورے کیے ۔جہاں انہوں نے مرکزی و ریاستی حکومت کے ذریعہ چلائے جانے والے پروجیکٹس کا افتتاح کیا۔ساتھ ہی جھارکھنڈ کے دورے کے دوران انہوں نے اس بات کی بھی یقین دہانی کرائی کے وہ جھارکھنڈ کے لوگوں کے اس پیار اور لگاؤ کا مناسب معاوضہ

ادا کریں گے جس کے نتیجہ میں ان کی پارٹی کو پارلیمانی انتخابات میں مکمل اکثریت حاصل ہوئی ہے۔ بھارت تارہ میدان میں مقامی باشندوں کے جم غفیر سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ وہ یہاں کے باشندوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بے حد خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ مزید کہا کہ اگر اس کے معدنیات اور قدرتی وسائل کو استعمال میں لایا جائے تو گجرات کا درجہ بھی اس کے بعد ہوگا۔ اور چونکہ اب ریاست سن بلوغ کو پہنچ رہی ہے اور اس کے 18 مکمل ہونے [illegible] کے لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ 18 سال پورے ہونے [illegible] کیسا دیکھنا پسند کرتے ہیں؟ دوسری جانب وزیر اعظم کے رانچی کے پروگرام میں جھارکھنڈ کے وزیر اعلیٰ ہیمنت سورین کو ہوٹنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ سورین جیسے ہی بولنے کے لیے کھڑے ہوئے لوگ مودی- مودی کے نعرے لگانے لگے۔ درمیان میں کچھ لوگوں نے ریاستی حکومت مخالف نعرے بھی لگائے۔ شور بڑھتا دیکھ کر اسٹیج پر بیٹھے وزیر اعظم نے ہاتھوں سے اشارہ کیا اور لوگوں کو پرسکون کرایا۔ اس کے بعد سورین اپنی تقریر مکمل کر سکے۔ وزیر اعظم کی رخصتی کے بعد وزیر اعلیٰ نے میڈیا سے کہا کہ یہ وفاقی ڈھانچے پر چوٹ ہے۔ انہوں کہا کہ ایک اہم اسٹیج پر جس طریقہ سے ایک جماعت کے لوگوں نے ہوٹنگ کی یہ سسٹم کے ساتھ استحصال ہے ساتھ ہی سرکاری اسٹیج پر سیاست کی جا رہی ہے۔

اس پورے مسئلہ پر جھارکھنڈ کی حکمراں پارٹی جھارکھنڈ مکتی مورچہ (جے ایم

ایم) نے دھمکی دی کہ اگر پی ایم مودی معافی نہیں مانگیں گے تو مرکز کے کسی بھی وزیر کو جھارکھنڈ میں گھسنے نہیں دیا جائے گا۔بھٹاچاریہ نے مرکزی حکومت اور بی جے پی کے ہر پروگرام کی جھارکھنڈ میں مخالفت کرنے کی بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ بی جے پی کو بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔ادھر کانگریسی لیڈر امبیکا سونی نے سورین کی ہوٹنگ پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ سرکاری اسٹیج کا غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔انھوں نے کہا کہ ہوٹنگ کسی کے لیے بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مودی جہاں بولنے والے ہوں وہاں دس ہزار کی بھیڑ میں پانچ سو اپنے آدمی ہم بھی بھیج سکتے ہیں اور ان کے خلاف نعرے لگوا سکتے ہیں۔لیکن ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ وہیں وزراء اعلیٰ کی سرکاری اسٹیج پر ہوئی ہوٹنگ پر بولتے ہوئے این ڈی اے کے حلیف اور شری منی اکالی دل کے سپریمو پرکاش سنگھ بادل کا کہنا ہے کہ یہ عمل غیر جمہوری ہے اور اخلاقی گراوٹ کا عکاس ہے۔یاد رہے کہ گزشتہ دنوں ہریانہ کے کیتھل میں بھی ایسا ہی واقعہ نیشنل ہائی وے کے سنگ بنیاد کے پروگرام میں جب بھوپیندر سنگھ ہڈا لوگوں سے خطاب کر رہے تھے اسی وقت مودی حامیوں نے ہڈا کی ہوٹنگ شروع کر دی تھی۔اس کے بعد ہڈا نے اعلان کیا کہ وہ اب کبھی بھی وزیر اعظم کے ساتھ پروگرام میں نہیں جائیں گے۔ جھارکھنڈ میں وزیر اعلیٰ کی ہوٹنگ سے قبل سورین کی پارٹی نے وزیر اعظم کو خط لکھ کر کہا تھا کہ ہڈا کے ساتھ ہوا "واقعہ" رانچی میں دوہرایا جانا نہیں چاہیے ورنہ اس کی رائے اچھی نہیں

ہوگی۔جے ایم ایم کے سکریٹری جنرل سپریو بھٹا چاریہ نے وزیر اعظم کے نام لکھے اپنے خط کو میڈیا میں بھی جاری کیا تھا۔اس کے باوجود ملتا جلتا واقعہ رانچی میں بھی رونما ہوا۔اب سوال یہ ہے کہ وزیر اعظم کے چاہنے والے کیا خود ہی وزیر اعظم کو بدنام کرنے کی سازش رچ رہے ہیں؟یا پھر وزیر اعظم کو یہ عمل پسند ہے،جس کی بنا پر یکے بعد دیگرے وہی عمل دہرایا جاتا جسے لوگ پسند نہیں کرتے؟

اس مخصوص واقع کے علاوہ ہندوستان میں فی الوقت دو باتیں اور تیزی سے گردش کر رہی ہیں۔ایک : "ہر ہندوستانی ہندو ہے"،دوسرا: "لوَ جہاد"۔یہ دونوں باتیں کیا ہیں؟اور ان باتوں کے بیان کرنے کا مقصد کیا ہے؟اگر ان سوالوں پر غور کیا جائے تو جو بات پہلے مرحلے میں ہر شخص کے ذہن میں آسکتی ہے وہ یہ کہ یہ دونوں ہی باتیں انسانوں کو انسانوں سے دور کرنے کی ہیں۔پہلی بات جس میں یہ کہا جارہا ہے کہ ہر ہندوستانی ہندو ہے،اور وہ بھی اس بناپر کیونکہ وہ ہندوستان کا شہری ہے ،بے معنی بات ہے۔کیونکہ جس ملک اور دیش کی بات کی جاتی ہے اور جس دیش بھکتی کی باتیں زبانوں سے دہرائی جاتی ہیں ،اس ملک کا نام تو دراصل " بھارت،انڈیااور ہندوستان "تینوں ہی ہیں۔لہٰذا اس ملک کے رہنے والے یا تو ہندوستانی ہو سکتے ہیں،بھارتی ہو سکتے ہیں یا پھر انڈین۔لیکن یہ تینوں ہی نام ملک سے وابستگی کو واضح کرتے ہیں ،ساتھ ہی ساتھ کسی حدتک اس ملک کے

کلچر، تہذیب اور ثقافت کے بھی عکاس ہیں۔اس کے باوجود نہ ملک اور نہ ملک کا ہر شہری ہی مذہبی بنیادوں پر خود کو "ہندو" کہلوانا پسند کرتے ہیں۔کیونکہ "ہندو" دراصل نام ہے اس فکر و عمل اور طرز زندگی کا جو دیگر مذاہب کے ماننے والوں میں واضح فرق رونما کرتی ہے۔اسی لیے خود ہندو اپنے مذہب کے خانے میں ہندو لکھواتے ہیں اور شہریت کے خانے میں بھارتی، ہندوستانی یا انڈین۔اور نہ ہی ان دیگر ممالک میں مذہب اور شہریت کے خانے میں یکساں اندراج ہوتا ہے، جن کا تذکرہ کیا گیا یا کیا جاتا ہے۔رہی بات "لوَ جہاد" کی۔تو یہ بات بھی دوریاں پیدا کرنے ہی کی ہے۔ہندوستانی قانون میں بلوغت کی عمر طے کر دی گئی ہے۔نیز ہر بالغ اور عاقل شہری کو یہ قانونی اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس مرد اور عورت کو اپنا شریک حیات بحیثیت شوہر اور بیوی پسند کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔پھر یہاں بھی جن باتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے ان میں نہ کوئی دم ہے اور نہ ہی کوئی حقیقت ۔لہٰذا اگر کوئی حقیقت کسی کے سامنے موجود ہو تو اس کے لیے اسی ملک کے قانون ساز اداروں نے اسے مکمل اختیارات بھی دیے ہیں کہ وہ حقیقت پیش کرے اور قانون کی روشنی میں فیصلہ حاصل کر لے ۔لیکن تذکرہ برائے نفرت ہو تو یہ خود ایک غیر قانونی عمل کہلائے گا!

ملک کے موجودہ حالات اور اس پورے پس منظر میں جہاں نفرت کی آگ بھڑکانے اور لوگوں پر ظلم و تشدد کا بازار گرم کرنے میں ،افراد، گروہ اور مخصوص فکر و

نظر کے حاملین منظم سعی و جہد میں مصروف ہیں۔اور جہاں دوریاں پیدا کی جارہی ہوں یا واقعات اور کوششوں کے نتیجہ میں انسان ،انسانوں ہی کی جان و مال اور عزت و آبرو کو داؤ پر لگانے کا کام کرنے لگیں۔ان حالات میں ضرورت ہے کہ ایسے چند افراد بھی منظر عام پر آئیں جو منفی حالات کا مقابلہ آپسی بھائی چارے اور محبت واخوت کے ماحول کو پروان چڑھا کر دیں۔بلکہ اُن افراد کی بھی ضرورت ہے جن کے وجود کا مقصد ہی امن و امان کا قیام ہو اور جو ملک اور معاشرہ کو صحیح رخ دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔سوال یہ ہے کہ وہ کیا ممکنہ کام ہو سکتے ہیں جن کے فروغ سے نفرت کم ہوگی اور دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہو سکتی ہیں؟اس میں سب سے پہلا عمل تو ان حضرات کا ہے جو ناپسندیدہ واقعات کو صرف اس لیے بیان کرتے ہیں کہ واقعہ رونما ہو چکا ہے، لہٰذا اس کے بیان میں کوئی حرج نہیں ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک غیر مناسب عمل۔اگر کوئی ناپسندیدہ واقعہ رونما ہوتا بھی ہے تو صرف ان متعلقہ افراد کو ہی اطلاع دی جانی چاہیے جو اس کے حل میں مثبت کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔دوسرے مرحلہ میں وہ تمام اعمال داخل ہیں جہاں انسانوں کو انسان سمجھا جائے۔انہیں ذات ،برادری اور مذہب وملت میں تقسیم نہ کیا جائے۔اور جب ایک انسان اپنے پیشہ اور وسائلِ زندگی کے تغیر کے باوجود انسان ہی سمجھا جانے لگے تو اس کی عزت اور وقار کو ویسے ہی سربلند رکھا جائے ، جیسی سربلندی اور عزت ہم اپنے لیے دوسروں سے چاہتے ہیں۔پھر انسانوں کے دکھ درد میں شامل ہونا،ان کے مسائل

کے حل میں کوشاں ہونا اور انہیں بلا تفریق مذہب و ملت، اپنے ہی جیسے انسان سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کا پہلا انسانی جوڑا جو اس پوری انسانی آبادی کے وجود کا ذریعہ ہے، وہ ایک ہی تھا۔ اب اگر کسی کو تحقیق ہی کرنی ہے تو وہ تحقیق کرے کہ وہ پہلا انسانی جوڑا کس مذہب، ملت، ملک، فکر و نظر اور عقیدے کو ماننے والا تھا؟ جن کی اولا آج ہم اور آپ ہیں۔ لہذا انسانیت کی بنیاد پر اور ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے ناطے ہمیں اپنے ہر بھائی اور بہن کی خوشی اور غم میں شریک رہنا چاہیے۔ اُس کی خوشیوں میں شامل ہو کر خوشیوں کو فروغ دینا چاہیے۔ اور اُن کے غم دکھ اور درد میں شامل ہو کر ہلکان کی ہر سنجیدہ کوشش کرنی چاہیے۔ خصوصاً اُن، حالات میں جبکہ نفرت کے فروغ ہی میں کچھ لوگ باقاعدہ مصروف ہوں۔ ایسے حالات میں جہاں یہ ضروری ہے کہ نفرت پھیلانے والوں پر قانونی کارروائی کی جائے۔ وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ مزید سنگین حالات پیدا ہوں سے قبل ہی منفی اثرات کو زائل کرنے کی مخلصانہ اور سنجیدہ ہر ممکن سعی و جہد کی جائے۔ کیونکہ جن پودوں کی کاشت ہی گندے پانی میں ہوئی ہو ان سے اچھی فصل کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ برخلاف اس کے آج ایسی فصل پروان چڑھانے کی ضرورت ہے جس کے استعمال سے نہ صرف انسان بلکہ دیگر مخلوقات بھی اطمینان و سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔

ہنسا، اہنسا اور مسلمان !

ہندوستان میں گاندھی جی کو بابائے قوم (راشٹرپتا) کا لقب حاصل ہے۔گاندھی جی نے ملک کی آزادی کے لیے ستیہ گرہ کو اپنا ہتھیار بنایا۔ ستیہ گرہ، ظلم کے خلاف عوامی سطح پر منظم عدم تشدد پر مبنی تحریک تھی ۔کہتے ہیں اسی تحریک کی بنا پر ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی۔لیکن انہیں گاندھی جی کو 30،جنوری 1948 کو ایک ہندو قوم پرست ناتھورام گوڈسے نے قتل کر دیا۔گاندھی جی کی فکر کا کل انحصار ہی اہنسا پر تھا۔اس کے باوجود اہنسا کا نظریہ ایک طویل جدوجہد کے بعد بھی بظاہر ناکام نظر آتا ہے۔اور تشدد جو کبھی شخص واحد سے وابستہ تھا آج ایک نظریہ بن چکا ہے۔گزشتہ کئی صدیوں سے عموماً دو ہی گروہ دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ایک وہ لوگ جنہیں فکری و نظریاتی کہا جاتا ہے۔یعنی وہ ہر معاملہ میں ایک واضح سوچ کے ساتھ عمل کے دائرہ میں داخل ہوتے ہیں۔دوسرے وہ جو فکر و نظر سے عاری ہوتے ہیں۔یعنی معاملہ کے وقت ہی اپنی سوچ کا برملا اظہار کرتے ہیں اور اسی کے مطابق عمل بھی۔پہلی قسم کے لوگ نہ صرف اپنی ذات سے بہت حد تک واقف ہوتے ہیں بلکہ دنیا میں اپنے وجود کے تعلق سے بھی فکر مند نظر آتے ہیں۔وہیں دوسری قسم کے لوگ نہ اپنی ذات سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے وجود کو پہچانتے ہیں۔پہلی قسم کے لوگ دنیا کے نظام و انصرام کو چلانے کی

صلاحیت رکھتے ہیں۔وہیں دوسری قسم کے لوگ جاری و ساری دنیا میں فی زمانہ اپنے آپ کو حسب حال ڈھالنے میں ہی مصروف نظر آتے ہیں۔پہلی قسم کے لوگ دنیا کی امامت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔وہیں دوسری قسم کے لوگ ماتحت کی حیثیت سے زندگی کے شب و روز گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ہندوستان میں بھی انہیں دو قسم کے مختلف افراد و گروہ موجود ہیں۔اس کے باوجود پہلی قسم کے لوگ معدود چند کے سوا کچھ زیادہ نہیں ۔برخلاف اس کے دوسری قسم کے لوگ ہی دراصل گردش ایام میں چہار جانب پھیلے ہوئے ہیں۔جن کی موجودگی ہی پہلی قسم کے لوگوں کو برقرار رکھنے کا اصل ذریعہ ہے۔

ابتدائی گفتگو کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ ملک عزیز کی باگ دوڑ فی الوقت اُن افراد کو حاصل ہوئی ہے جو ہر معاملہ میں اپنی ایک واضح پالیسی رکھتے ہیں۔یعنی بااقتدار پارٹی جسے عموماً بی جے پی کے نام سے جانا جاتا ہے وہ ایک فکری و نظریاتی سیاسی پارٹی ہے۔لہٰذا وہ افراد اور گروہ جو دوسری قسم کے ہیں،انہیں ہر معاملہ میں برسر اقتدار نظریاتی گروہ سے ایک واضح فکر و عمل کی توقع رکھنی چاہیے۔اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو سمجھئے کہ ایک سعی لاحاصل ہوگی ساتھ ہی وقت کا زیاں بھی۔شاید کچھ اسی قسم کی رپورٹیں آج کل خصوصاً اردو اخبارات اور عموماً میڈیا کے دیگر ذرائع سے موصول ہو رہی ہیں۔جن میں ایک جانب یہ بتانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ بابری

مسجد کی شہادت کے ذمہ دار کلیان سنگھ کو موجودہ حکومت نے گزشتہ دنوں ان کی مخصوص صلاحیتوں کے پیش نظر راجستھان کا گورنر بنادیا ہے۔وہیں مظفر نگر فساد کے ملزم اور بی جے پی کے رکن اسمبلی سنگیت سوم کو زید پلس سیکورٹی فراہم کی ہے۔اور اس کے لیے وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ان کی جان کو خطرہ ہے۔دوسری جانب بی جے پی کے اِس عمل سے اتفاق نہ رکھنے والی سیاسی پارٹیوں نے کہیں آرٹی آئی کے ذریعہ سوالات اٹھائے تو کہیں دعویٰ کیاگیا ہے کہ حکومت کے اس طرح کے قدم سے ملک کے سیکولر تانے بانے کو براہ راست خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔الزم یہ ہے کہ بی جے پی کے متعلقہ رکن اسمبلی نے متنازعہ ویڈیو اَپ لوڈ کرکے مظفر نگر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں فسادات بھڑکائے تھے۔یہ اور اسی طرح کے دیگر الزامات میں انہیں قومی سلامتی کے قانون (این ایس اے) کے تحت گرفتار بھی کیا گیا تھا۔لیکن ہائی کورٹ نے بعد میں اسے واپس لے لیا تھا۔اترپردیش جہاں یہ واقعہ رونما ہوا وہیں کی برسر اقتدار سماج وادی پارٹی کے ترجمان اور ریاستی وزیر راجندر چودھری کا الزام ہے کہ مرکزکے اس طرح کے قدم سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ وہ جرائم پیشہ افراد کی سرپرستی کر رہا ہے جو فسادات کے لیے ذمہ دار ہیں۔وہیں کانگریس کے ریاستی ترجمان امرناتھ اگروال نے بھی کہا کہ مرکزی حکومت اپنے شخص کو اتنی سخت سیکورٹی کیسے فراہم کر سکتی ہے جو فسادات بھڑکانے کا ملزم ہے؟حکومت کے اس فیصلہ پر دیگر اپوزیشن پارٹیوں نے بھی سخت رد عمل ظاہر کیا ہے۔ہر عمل سے پریشان رہنے

والے بی جے پی کے اس عمل سے بھی پریشان ہیں جس میں پارٹی کے قومی صدر امت شاہ نے پارٹی کے پارلیمانی بورڈ کی تشکیل نو کرکے سینئر لیڈران اٹل بہاری واجپئی، لال کرشن اڈوانی اور ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کو بورڈ سے خارج کرکے ایک علاحدہ پلیٹ فارم مارگ درشک منڈل' میں شامل کردیا ہے۔ ساتھ ہی بی جے پی کے اندرونی معاملوں' میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ بات بھی پریشان کن ثابت ہو رہی ہے کہ یوگی آدتیہ ناتھ کو یوپی ضمنی انتخابات کی تشہیری کمان کیوں سونپی گئی؟ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ گورکھپور سے ایم پی یوگی آدتیہ ناتھ کو یہ ذمہ داری اس وقت سونپی گئی ہے جب کہ وہ ایک اشتعال انگیز ویڈیو کو لے کر تنازعات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی حزب اختلاف کا کہنا ہے کہ یوگی آدتیہ ناتھ کو تشہیری مہم کی کمان سونپنے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بی جے پی مسلم مخالف چہروں کو الیکشن میں اتار کر ووٹ کی صف بندی میں مشغول ہے۔ چونکہ آدتیہ ناتھ پر فساد بھڑکانے کا الزام بھی عائد ہے جو عدالت میں زیر سماعت ہے۔ لہٰذا این ڈی ٹی وی کی گروپ ایڈیٹر برکھا دت سے بات کرتے ہوئے یوگی کا کہنا ہے کہ ویڈیو کو جوڑ توڑ کر تیار کیا گیا ہے، جس کی فورنسک جانچ لازماً کرائی جائے۔ اس سب اتھل پتھل میں سپریم کورٹ آف انڈیا نے اپنے تاریخی فیصلے میں وزیر اعظم اور وزرائے اعلیٰ کو مشورہ دے دیا ہے کہ مجرمانہ معاملوں اور بدعنوانی کے معاملات کا سامنا کر رہے لوگوں کو وزیر نہ بنایا جائے۔ چیف جسٹس کی صدارت میں پانچ ججوں کی بینچ نے رائے دی ہے کہ داغدار

لوگوں کو وزیر نہیں بنانا چاہیے۔ عدالت کی رائے کا اثر مودی سرکار کے موجودہ 14 کابینی وزراء پر پڑ سکتا ہے، ان میں اوما بھارتی بھی شامل ہیں۔ جن پر قتل کے 2 معاملوں سمیت 13 معاملے درج ہیں۔ بینچ نے یہ ہدایت اس مفاد عامہ کی رٹ پر جاری کی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مرکز اور ریاستی سرکاروں کو مجرمانہ پس منظر والے افراد کی تقرری نہ کرنے کی ہدایت دی جائے۔

ملک کے موجودہ حالات کے تذکرے کے بعد حالیہ دنوں چند ریاستوں میں ہونے والی ضمنی انتخابات اور ان کے نتائج نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس "مودی فیکٹر" کی بات لوک سبھا الیکشن میں کی جارہی تھی وہ اب کمزور ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں بی جے پی پر چڑھا نشہ ضمنی انتخابات کے نتائج سے کسی حد تک ٹوٹ گیا ہے۔ بہار میں لالو نتیش اتحاد نے غیر این ڈی اے والی سیاسی پارٹیوں اور عوام کو مثبت اشارے دیے ہیں۔ وہیں کانگریس پارٹی کو راحت ملی ہے اور عام آدمی پارٹی فی الوقت منظر سے غائب ہے۔ ان نتائج سے بی جے پی حامیوں کو ایک بات اور جو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ یہ کہ گزشتہ دنوں لوک سبھا انتخابات میں اُسے مثبت سے زیادہ منفی ووٹ ملے تھے۔ مینڈیٹ بی جے پی کو فتح سے ہمکنار کرنے سے زیادہ یو پی اے کو شکست دینے کا تھا۔ بہر حال بی جے پی اور ان کے حلیفوں کو یہ پیغام خوب اچھی طرح مل چکا ہے کہ وہ ان نتائج کے منفی اثرات پر سنجیدگی سے غور کریں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھیں کہ سیاست میں کوئی

کامیابی مستقل نہیں ہوتی۔

دوسری طرف ضمنی انتخابات کے نتائج نے خصوصاً مسلمانوں کو یہ پیغام بھی دیا ہے کہ گزشتہ دنوں جس طرح بی جے پی کی کامیابی اور سیکولر اتحاد کی ناکامی کا ٹھیکرا مسلمانوں کے سر پھوڑا جا رہا تھا،ایسا معاملہ اب نہیں ہے۔چونکہ سیکولر اتحاد کو مختلف مقامات پر کامیابی ملی ہے، لہٰذا اس کامیابی میں مسلمانوں کا کوئی خاص کردار نہیں ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ اس وقت بھی تھا جب غیر یو پی اے اتحاد کو کامیابی ملی تھی۔اس کے باوجود ایک جانب مسلمانانِ ہند خود تو وہیں دوسری جانب ناکامی سے ہمکنار افراد اور پارٹیاں بھی خصوصاً مسلمانوں کو ہی موردِ الزام ٹھہرا رہی تھیں۔اور آخری بات یہ کہ چونکہ فی الوقت ملک کے موجودہ مسائل کے حل میں شعوری طور پر ہندی مسلمان کوئی موثر کردار ادا نہیں کر رہے ہیں۔لہٰذا اُن کو کسی قیمت اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ دیگر افراد، گروہ، سیاسی پارٹیاں یا حکومتِ وقت اُنہیں کسی قسم کی اہمیت دے گی۔ہندوستانی مسلمان ملک و معاشرہ میں اہمیت اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب کہ ایک جانب وہ خود اپنی حیثیت سے بہ خوبی واقف ہوں۔وہیں دوسری جانب مسائل کے حل میں موثر کردار ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔لیکن افسوس کہ سب سے مستحکم فکر و نظر کے حاملین ہی درحقیقت فکر و نظر سے عاری ہیں۔پھر کیونکر وہ یہ توقع رکھتے ہیں کہ دنیا انہیں اہمیت دے

!یا ان کی شناخت کو برقرار رکھا جائے

! مسائل کے حل میں مسابقت کیجئے

بقول شخصے دنیا پہلے دوستوں اور دشمنوں میں بٹی ہوئی تھی۔ مختلف بلاک ایک دوسرے کے دشمن سمجھے جاتے تھے۔ لیکن زمانہ کی کروٹ کے ساتھ ہی اب نہ فرد اور نہ ہی بلاک دشمن اور دوست سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ درحقیقت سب ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اورایک دوسرے کے حریف اور مسابقت کرنے والے (competitor)
بھی۔ اب لوگوں میں بھی اور گروہ، ممالک اور بلاک میں بھی ایک دوسرے سے مسابقت میں لوگوں کوزیادہ دلچسپی ہوگئی ہے۔ عام آدمی جس کو ملکی سطح پر فیصلوں سے دور رکھا جاتا تھا، اب حکمراں مجبور ہوئے ہیں کہ ان کو فیصلوں میں شریک کریں۔ ان دو بنیادی تصورات کو پیش نظر رکھتے ہوئے موجودہ دور کے مواصلاتی انقلاب پر بھی نظر رہنی چاہیے۔ جس کی بنا پر ہی دراصل یہ تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ جہاں ذات پات، رنگ و نسل اور عقیدہ و مسلک کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق برتی جاتی تھی، وہاں لوگ دیکھ رہے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں صلاحیت، کردار اور کارکردگی کی بنیاد پر آگے بڑھنے کے مواقع سب کو حاصل ہیں۔ لہذا غیر فطری سماجی تقسیم پر مبنی سماج کے پسماندہ و دیگر کمزور طبقات کی خواہش ہے کہ ان کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ ہو۔ اس پورے پس منظر میں دیکھا جائے تو رابطہ جو پہلے بھی بہت اہم تھا مزید اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ رابطہ نہ صرف افراد کا بلکہ ان کے

افکار و نظریات اور شب و روز میں انجام پانے والے عملی رویوں کا بھی۔ترقی و خوشحالی اور کامیابی و سربلندی کے لیے لازم ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کے روابط بہت ہی مستحکم ہوں۔اب یہ رابطہ جس قدر مضبوط ہوگا اسی قدر اس کے مثبت نتائج بھی رونما ہو سکیں گے۔

دوسری جانب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج اسلام اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے والوں کو حد درجہ ذلیل و رسوا کرنے کے مختلف طریقہ رائج ہو چکے ہیں۔ان حربوں میں سرفہرست وہ لوگ ہیں جنھیں اسلام اور اسلامی تعلیمات سے نفرت ہے۔یہ نفرت کس بنا پر ہے؟اس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔لاعلمی ، حسد و کینہ ،اقتدار کا جنون،یا وہ اقتدار جس کے ملنے کی انہیں توقع ہے،وغیرہ مختلف وجوہات ممکن ہیں۔لیکن ان نفرت کرنے والوں کے بھی دو گروہ ہیں۔ایک وہ بااقتدار گروہ وحکومتیں جنھیں ہم یہود و نصاریٰ اور ان کے حواریوں کے نام سے جانتے ہیں۔وہیں دوسری جانب نفاق میں مبتلا مسلمانوں کے وہ افراد اور گروہ جنھیں اسلام کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔برخلاف اس کے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دنیا بدی و خیر کی ایک امتحان گاہ ہے۔اور ہم سب اسی امتحان سے گزر رہے ہیں۔اب امتحان سے گزرتے ہوئے کامیاب ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ امتحان لینے والے نے جو طریقہ بتایا ہو، اس کے مطابق عمل کیا جائے۔قرآن و حدیث کی روشنی میں پر امن رہنے کا مسلک، کوئی مصلحت کی بات

نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی تعلیمات اس کی قائل ہی نہیں کہ طاقت و تشدد کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اور یہی دراصل اصول ہے۔ اس کی واضح مثال نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مکی دور ہے۔ اور اس دور میں مسلمانوں پر ہو رہے مظالم کے بے شمار اندوہ ناک واقعات۔ واقعہ یہ ہے کہ جس مقام اور گروہ کی جانب سے بھی تشدد کا استعمال شروع ہوتا ہے، عقلی استدلال اور اخلاقی اقدار کی اثر پذیری ختم ہو جاتی ہے۔ غالباً ۱۹۶۵ یا ۱۹۶۶ کی بات ہے۔ کچھ عرب نوجوان مولانا مودودیؒ سے ریاض میں ملے۔ انھوں نے مولانا سے کہا کہ "آپ اپنے ملک میں الیکشن میں حصہ لے سکتے ہیں، اور الیکشن میں تقریریں کر سکتے ہیں۔ آپ کے ملک میں جمہوریت ہے لیکن ہم لوگ تو یہ سب نہیں کر سکتے۔ ہم لوگ مجبور ہیں کہ خفیہ تحریک چلائیں۔ اور جب خفیہ تحریک چلائیں گے تو اس میں تشدد تو استعمال کرنا پڑے گا"۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ اس طریقہ سے جو تبدیلی لائیں گے، وہ اسلامی نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طریقہ سے جو اقتدار حاصل کرے گا وہ اقتدار باقی رکھنے کے لیے بھی یہی طریقہ استعمال کرے گا۔ آپ نے متعدد ایسے انقلابات دیکھے ہوں گے۔ ایسے انقلابات میں سب سے پہلے جو آدمی مارا جاتا ہے، وہ انقلاب لانے والے کا قریبی ساتھی ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ وہ انقلاب یا وہ تبدیلی جو خفیہ سرگرمیوں اور تشدد سے آئے، اس میں یہ بات بہت اہم ہوتی ہے کہ کوئی آدمی دشمن سے نہ مل رہا ہو، کوئی اس کی خبر نہ دے رہا ہو، کوئی اپنے کو اقتدار میں لانے کی کوشش نہ کر رہا ہو۔ جیسے ہی ایسا شبہ

ہوتا ہے، قتل کے علاوہ اس کو خاموش کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔خلاصہ یہ کہ انہوں نے کہا کہ ہم جو تبدیلی چاہتے ہیں، وہ ان لوگوں کے ذریعہ ہی آسکتی ہے جو راضی خوشی اسلام کو قبول کریں۔یعنی اس اسلام کی روشنی میں جس کے معنی ہی "امن "کے ہیں۔لہذا امن و امان برقرار رکھتے ہوئے ، رائج الوقت پر امن طریقہ سے نظام کی اصلاح کی جدو جہد کی جانی چاہیے۔

رابطہ کی اہمیت اور نظام کی پر امن طریقہ سے اصلاح کرنے والوں کے سامنے یہ حقیقت بھی خوب واضح رہنی چاہیے کہ آج انسان جن مسائل سے دوچار ہے، وہ کسی مسلک یا مذہب کے مسائل نہیں ہیں ۔بلکہ من جملہ انسانوں کے مسائل ہیں۔مثلاً اگر خاندان کا ادارہ تباہ ہو رہا ہے تو یہ صرف کسی مخصوص ملک یا مذہب یا مسلک کا مسئلہ نہیں ہے۔اس مسئلہ سے تمام ہی مذاہب اور طبقات و نظریات سے وابستہ لوگ متاثر ہیں۔اسی طرح لڑائی جھگڑا، ظلم وزیادتی، نا انصافی اور امن وامان کے خاتمہ سے تمام ہی لوگ متاثر ہیں۔وہیں امیر اور غریب کے درمیان غیر منصفانہ بڑھتی خلیج سے بھی جو لوگ متاثر ہیں ان میں مذہبی ، نظریاتی و مسلکی بنیادوں پر کسی قسم کی آپ تقسیم نہ پائیں گے ، سوائے اس کے کہ وہ سب ایک اہم مسئلہ سے دوچار ہیں۔نیز دیگر سیاسی معاشی اور سماجی سطح کے مسائل جن میں فحاشی و عریانیت اور کرپشن جیسے مسائل بھی، ہیں، سے ملک کا ہر طبقہ رو برو ہے۔ان حالات میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مسائل کا حل دنیا کے تمام

ممالک اور مخصوص ملک کے تمام شہریوں کے لیے ،چند لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔برخلاف اس کے مسائل سے دوچار آپ بھی ہیں اور وہ بھی ،یعنی دونوں ہی ہیں۔لہٰذا مسائل کے حل میں بھی دونوں کو ہی مل جل کر کوششیں کرنی ہوں گی۔اور اگر ایسانہیں کیا گیا یعنی دونوں نے مل کر کوششیں نہیں کیں، تو مسائل کے حل میں جس کا جس قدر حصہ ہوگا،اسی قدر اس سے مستفیض ہونے کا حقدار بھی وہی ہوگا۔ایسی حالت میں جمود میں مبتلا لوگوں کو کسی قسم کا گلا نہیں کرنا چاہیے۔

اور آخری بات یہ کہ جب اس بات کا احساس ہو جائے کہ انسانوں کے مسائل انسانوں کے میل جول اور آپسی تعاون واشتراک سے ہی حل ہوتے ہیں۔تو اُس وقت اس بات کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے کہ ہماری کوششوں کا محور و مرکز کیا ہے؟آیا ہماری کوششیں حکومتوں اور حکمرانوں سے الجھنے میں صرف ہو رہی ہیں؟ یا ہماری مرکز توجہ عامتہ الناس ہیں؟واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت مسائل سے ہی نالاں ہے۔وہیں دوسری جانب جو لوگ مسائل اور اس کے حل پر گفتگو کرتے ہیں ان کی کوششوں کا ایک تہائی حصہ وسائل کی فراہمی میں تو دیگر ہنگامی و غیر مستقل کاموں اور حکومتوں سے الجھنے میں گزر جاتا ہے۔عامتہ الناس جو درحقیقت ہماری مرکز توجہ ہونے چاہیے۔جن سے آغازِ روابط تا مسائل کے حل تک ،لگاتار اور مسلسل ربط و تعلق اور تعاون واشتراک ہونا چاہیے،وہ کمزور نظر

آتا ہے۔اس پس منظر میں اسلامی نظام کے فروغ میں مصروف عمل رہنے والوں کو چاہیے کہ وہ غور کریں، محاسبہ کریں اور ذاتی احتساب کے ساتھ امت کے اجتماعی احتساب کا بھی نظم کریں کہ شخصے واحد اور بحیثیت اجتماعیت، کس درجہ ہم دوسروں کے حریف اور مسابقت میں سرگرداں ہیں؟اگر اس کا تشفی بخش جواب مل جائے تو بہت خوب ! لیکن اگر جواب ممکن نہ ہو تو پھر لازماً بحیثیت انسان،انسانوں کے مسائل اور اُن کے حل کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔درحقیقت یہی ہمارے وجود اور تشخص و بقا کا ذریعہ بھی بنے گا۔بصورت دیگر بہتر ہوگا کہ آپ ملکی و بین الاقوامی سطح پر مزید ذلت ورسوائی سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔کیونکہ جمود کا نتیجہ انحطاط ہے اور انحطاط کا لازمی نتیجہ ہر سطح پر مغلوبیت ہی ہوتا ہے۔

فتنوں کے دور میں "اسلامی اسٹیٹ" کا شوشہ !

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (اسنا) نے 11/9 سانحہ کے تیرہ سال مکمل ہونے پر منعقدہ پریس کانفرس میں امریکہ سمیت دنیا بھر میں کہیں بھی اسلام کے نام پر دہشت گردی کی کارروائیوں کی مذمت کی ہے۔ سوسائٹی کے اہم اراکین نے اس بات پر زور دیا کہ اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے اور دین اسلام میں دہشت گردی کی کارروائیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ شرکاء کی جانب سے بطور خاص عراق میں آئی ایس آئی ایس، یا دولت اسلامیہ کی کارروائیوں پر احتجاج درج کرایا گیا اور کہا گیا کہ دولت اسلامیہ ایک شدت پسند گروپ ہے جس نے اسلامی نظام کے نفاذ کے نام پر گزشتہ کچھ عرصہ میں شام اور عراق کے بڑے علاقوں پر اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ دراصل یہ جو کچھ بھی کر رہی ہے وہ اسلام کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ ساتھ ہی نئی نسل کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ اس شدت پسند تنظیم کی کسی بات پر بھی کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان کے نظریات و عقائد اسلام سے متصادم ہیں۔ دوسری جانب 11/9 سانحہ کے تیرہ برس مکمل ہونے پر امریکی صدر بارک اوبامہ نے اپنے خطاب میں خبردار کیا کہ عراق اور شام میں یہ شدت پسند تنظیمیں اسلامی اصولوں کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت امریکہ کو سب سے بڑا خطرہ داعش ہی سے ہے۔ لہٰذا یہ جنگجو جہاں بھی ہوں گے

انہیں نشانہ بنایا جائے گا نیزان جنگجوؤں کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے گا۔مزید کہا کہ دولت اسلامیہ کے خلاف امریکہ کی فضائی کارروائی پہلے ہی سے جاری ہے جس کے دوران عراق میں شدت پسندوں کے ٹھکانوں اور دیگر اہداف پر گزشتہ ماہ سے اب تک ڈیڑھ سو سے زیادہ فضائی حملے کیے جا چکے ہیں۔اوباما نے کانگریس پر زور دیا کہ وہ ایسے شامی باغیوں کے لیے تربیتی پروگراموں کی توثیق کرے ،جو شامی صدر بشارالاسد کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کے خلاف بھی نبرد آزما ہیں۔اسی اثناء میں مشرق وسطی میں امریکہ کے اتحادی ملک سعودی عرب نے ان باغیوں کی تربیت کے لیے پیشکش کردی ہے۔صدر نے کہا کہ دولت اسلامیہ کے خلاف امریکی کارروائی عراق اور افغانستان میں جنگ سے مختلف ہوگی جس کی تفصیلات وہائٹ ہاوس اور کانگریس مل کر طے کریں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلام تشدد کی اجازت نہیں دیتا۔کسی مقصد کو حاصل کرنے کا راستہ افہام و تفہیم،دعوت و تبلیغ اور ترغیب ہے نہ کہ تشدد۔دینی مقاصد کے لیے تو تشدد کا استعمال بالکل ہی نامناسب ہے کیوں کہ تشدد، جبر واکراہ کا آلہ ہے۔برخلاف اس کے دین میں جبر واکراہ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔اللہ تعالی فرماتا ہے: "دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرے اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا

ہے" (البقرہ:٢٥٦)۔اسلام مرحمت و شفقت، رواداری اور نرم روی اور عفوودرگزر پر مبنی ہے۔توڑ پھوڑ، درشتی اور سخت گیری اس کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی ہے۔اسی تعلق سے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نرم خو ہے، نرم خوئی کو پسند کرتا ہے۔وہ نرم خوئی کے نتیجہ میں وہ کچھ دے دیتا ہے جو شدت پر نہیں دیتا، نہ کسی اور طریقہ پر دیتا ہے" (مسلم)۔قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بات خوب عیاں ہو جاتی ہے کہاسلام نے تشدد سے منع کیا ہے۔برخلاف اس کے آج زمانے میں چہار جانب تشدد کا بازار گرم ہے۔تشدد بھڑکانے کے نئے نئے حربے اور طریقہ ایجاد ہو چکے ہیں۔ساتھ ہی زبان و عمل پر گرفت نہ ہونے کی بنا پر بے لگام زبانیں اور غیر اخلاقی اعمال، تشدد کے فروغ میں معاون بن رہے ہیں۔ان تمام باتوں کے پیش نظر دیکھنا یہ چاہیے کہ دنیا آج جس فساد فی الارض میں مبتلا ہے اس کے فروغ میں اگر ایک جانب مسلمانوں کی حصہ داری مان بھی لی جائے تو وہیں دوسری جانب دیگر بااقتدار حکومتیں، گروہ اور افراد کی جانب سے کیے جانے والے تشدد میں کون کس سے آگے ہے؟ یہ فیصلہ کیسے ہوگا اور کون کرے گا؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی جانب سے تشدد کیا جا رہا ہے وہاں بھی درحقیقت مسلمان ہی جان و مال کے نقصانات سے دوچار ہیں۔اور جہاں راست مسلمانوں پر تشدد کیا جا رہا ہے وہاں تو ہر سطح پر نقصان مسلمانوں کو ہی اٹھانا پڑ رہا ہے۔اس صورت میں کیا یہ ممکن نہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے اور ایک بڑے مقصد کے حصول کے لیے، بھٹکے یا

بھٹکائے ہوئے مسلمانوں کو کام میں لایا جا رہا ہے؟اگر ایسا ہے، جس کے کچھ اشارے سامنے بھی آئے ہیں، تو پھر کیوں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم امن کے علمبردار ہیں؟اور کیوں امن کی بانسری بجا کر نفرت کی آگ بھڑکانے کا عمل جاری ہے؟ہم نہیں جانتے کہ دنیا میں کہاں کیا ہو رہا ہے، کون ہے جو نفرت کے فروغ میں سرگرم ہے۔تو وہ کون ہے جو تشدد کو فروغ دینے کے بعد ،اُس کی آڑ میں اپنے اہداف بخوبی حاصل کرتا جا رہا ہے۔لیکن جس ملک ہندوستان کے ہم شہری ہیں وہاں کے حالات سے واقفیت کی بنا پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو رہی ہے کہ تشدد کے فروغ میں ایک مخصوص طبقہ اپنے تمام تر وسائل و صلاحیتوں کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ممکن ہے اس طبقہ کے علاوہ بھی اور گروہ سرگرم ہوں اور "ان اور "میں مسلمان بھی کسی درجہ میں ملوث پائے جائیں۔لیکن صرف مسلمان ہی تشدد کی جڑ ہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔

رہی بات عالمی پیمانہ پر تشدد کے فروغ،11/9کے سانحہ اور داعش کی تو اس میں اپنی یعنی عام مسلمانوں کی رائے کی بجائے،ہم ان افراد کی آراء پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں، جن کی آنکھوں کے سامنے یہ واقعات رونما ہوئے ،اور جو کسی حد تک ہم سے زیادہ معاملات سے واقفیت رکھتے ہیں۔معروف.برطانوی صحافی رابرٹ فسک کا مضمون جو اس نے 25،اگست 2007 میں برطانوی اخبار The Indipendent نے شائع کیا۔وہ کہتا ہے کہ "میں واقعی مسلسل تبدیل ہوتے سرکاری موقف سے پریشان ہوں

میں ان عمومی سوالوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں کہ پنٹاگون پر حملہ کرنے والے طیارے کے اجزاء، جیسے انجن وغیرہ کہاں غائب ہو گئے؟ پینسلوانیا کی فلائٹ 93 کی تحقیقات میں شامل سرکاری افسران کے منہ کیوں سی دیے گئے؟ میں تو ٹوئن ٹاورز کے بارے میں سائنسی نقطہ نظر سے سوالات رکھتا ہوں۔ مثلاً یہ درست ہے کہ تیل زیادہ سے زیادہ 820 ڈگری سینٹی گریڈ کی حرارت پیدا کرتا ہے تو پھر ٹوئن ٹاورز کے وہ فولادی بیم کیسے پگھل کر ٹوٹ گرے جنہیں پگھلنے کے لیے 1480 سینٹی گریڈ کی حرارت چاہیے؟" اور یہ سب کچھ صرف آٹھ سے دس سیکنڈ کے دوران ہو گیا اور تیسرے ٹاور، ورلڈ ٹریڈ سینٹر بلڈنگ 7 یا سالمن براردز بلڈنگ کی کہانی کیا ہے جو پانچ بجکر بیس منٹ پر، صرف 6.6 سیکنڈ کے اندر خود اپنے ہی قدموں پر ڈھیر ہو گئی؟ یہ اتنی عمدگی کے ساتھ کیونکر زمیں بوس ہو گئی جبکہ اسے کسی طیارے نے چھوا بھی نہیں؟ امریکن نیشنل انسٹیٹیوٹ آف اسٹینڈرڈ اینڈ ٹیکنالوجی سے کہا گیا تھا کہ وہ تینوں عمارتوں کی تباہی کے اسباب کا تجزیہ کرے۔ انہوں نے آج تک ورلڈ ٹریڈ سینٹر 7 کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ رابرٹ فسک کے علاوہ اقوام متحدہ کے اہلکار رچرڈ فاک نے بھی 11/9 کے حادثہ کو امریکی منصوبہ قرار دیا تھا۔ اور اپنے بلاگ میں لکھا تھا کہ 11/9 کا حادثہ امریکی حکومت کا تیار کردہ ہے اور اس حادثہ کے حقائق پر امریکی حکام نے جانتے بوجھتے پردہ ڈالا ہے۔ سابق امریکی صدارتی امیدوار رون پاول نے بھی نائن الیون حملوں کو اسرائیلی کارروائی قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس انسانیت

سوز واقعہ میں موساد کے ملوث ہونے کے کئی شواہد موجود ہیں۔۔۔اب تک ملنے والے تمام شواہد سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد نے یہودی لابی کے ساتھ مل کر یہ کاروائی کی ہے۔رہی بات داعش تو سابق سی آئی اے کانٹریکٹر،اسٹیون نے پرلیس ٹی وی، کیلیفورنیا کو اپنے ٹیلی فونک انٹرویو میں کہا(Steven Kelley) کیلیے کا بنایا ہوا ہے اور وہی اس کی فنڈنگ بھی (US) مکمل طور پر یونائیٹڈ اسٹیٹ ISIL ہے کہ گروپ پیش قدمی کر رہا ہے اور وہ جلد ISIS کر رہا ہے۔۔۔ساتھ ہی کیلیے کا کہنا ہے کہ ہی بہت آسانی سے شام کے صدر بشارالاسد کی فوجوں پر فتح حاصل کرلے گا۔وہیں ایرانی وزرات خارجہ کی ترجمان مرضیہ افتخار نے کہا ہے کہ ویلز میں گزشتہ ہفتہ نیٹو سربراہ اجلاس کے بعد اعلان کردہ داعش مخالف بین الاقوامی اتحاد سے متعلق غیر یقینی کی صورت حال پائی جاتی ہے اور دہشت گردی کی بنیادی وجوہ کی بیخ کنی کے لیے اس اتحاد کی سنجیدگی اور اخلاص کے بارے میں بھی سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔انہوں نے کہا کہ اتحاد میں شامل بعض ممالک عراق اور شام میں دہشت گردوں کو مالیاتی اور سیکورٹی امداد مہیا کررہے ہیں۔اور بعض ممالک کو یہ توقع ہے کہ ان دونوں ممالک میں ان کے مفادات کے مطابق سیاسی تبدیلی آجائے گی۔مرضیہ کی باتوں میں حقیقت موجود ہے کیونکہ طالبان کے بارے میں بھی عام خیال یہی ہے کہ کل اسی امریکہ بہادر نے افغانستان میں طالبان کو مدد پہنچاکرایک جانب یو ایس ایس آر کا شیرازہ بکھیرا تو وہیں آج اُن ہی طالبان سے مذکرات بھی جاری ہیں۔لیکن

ہائے افسوس "اسنا" کے ذمہ داران، عالم اسلام کے مسلمانان و دیگر امن پسند افراد کی بصارت پر کہ یہ ان تمام باتوں کو بلا ثبوت تسلیم کر لیتے ہیں جن کو دنیا آسانی سے تسلیم نہیں کرتی!

!کیاآنکھوں پر بندھی پٹّی کھلا چاہتی ہے

حالیہ ضمنی انتخابات میں نتائج کے اعتبار سے اتر پردیش، راجستھان اور گجرات قابل تذکرہ ہیں۔ وہیں مغربی بنگال اس لحاظ سے قابل توجہ بنا کہ ملک کی بااقتدار سیاسی پارٹی بی جے پی کو ریاست میں 15 سال بعد ایک بار پھر اپنا کھاتہ کھولنا کا موقع ملا ہے۔اتر پردیش میں کل 11،میں سے 7+1 سیٹوں پر سماج وادی پارٹی کامیاب ہوئی، وہیں بی جے پی کو صرف 4 سیٹیں حاصل ہو سکیں۔ راجستھان میں کانگریس کو 3 اور بی جے پی کو 1 سیٹ ملی۔ وہیں ریاست گجرات جہاں ایک طویل عرصہ سے کانگریس بری طرح شکست سے دوچار تھی، اس مرتبہ 3 سیٹیں حاصل ہوئی ہیں۔ دیکھا جائے تو بااقتدار بھارتیہ جنتا پارٹی کے بقول جو ملک کی حکومت چلاتے ہوئے، عوام کے لیے بے پناہ خدمات انجام دے رہی ہے، "سب کا ساتھ ،سب کا وکاس" نعرے کے ساتھ ،سب کی ترقی کے لیے سرگرم عمل ہے،کے تمام دعوں کے باوجود نتائج نے کامیابی کے بجائے ناکامی کا ہی سامنا کرایا ہے۔ درحقیقت ناکامی نے سوچنے کے موقع بھی فراہم کیے ہوں گے ۔ وہیں سماج کو منتشر کرنے والوں اور نفرت کی آگ بھڑکانے والو ں کو صدمہ بھی پہنچا ہے۔ دوسری طرف نتائج نے امن پسند حلقوں میں خوشی کی ایک خاموش لہر پیدا کی ہے نیز ایک بار پھر ان تمام سیاسی پارٹیوں کو حوصلہ فراہم کیا ہے جو گزشتہ لوک سبھا الیکشن میں بری طرح ناکامی کے سبب

مایوسی سے دوچار تھیں۔

ضمنی انتخابات نے خصوصاً ایک بار پھر کانگریس میں جان ڈال دی ہے۔ہریانہ اور مہاراشٹر میں ہونے والے انتخابات میں کارکنوں کے حوصلہ بلند ہوئے ہیں وہیں مودی حکومت کے 100 دن مکمل ہونے پر، ان کی کارکردگی کا احاطہ کرتے ہوئے 16 صفحات پر مشتمل "سیاہ کتاب" بھی کانگریس کی جانب سے منظر عام پر آئی ہے۔کتاب میں بی جے پی کے انتخابی نعروں پر طنز کرتے ہوئے مودی حکومت کو "کھوکھلے وعدوں والی ناکارہ حکومت "کا لقب دیا گیا ہے۔دوسری طرف بی جے پی کے اندر سے بھی ناقص کارکردگی اور نفرت آمیز مہم کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔بی جے پی کے رکن پارلیمنٹ شتروگھن سنہا نے ضمنی انتخابات میں بی جے پی کی ناقص کارکردگی پر کہا کہ تجربہ کار لیڈروں کو درکنار کرنا بی جے پی اور آر ایس ایس کو مہنگا پڑ رہا ہے۔وہیں حکومت میں وزیر مینکا گاندھی نے اترپردیش میں پارٹی کی شکست کے بعد اپنے بیٹے کو اتارنے کا مطالبہ شروع کر دیا ہے۔ نفرت جس کا ایک چہرہ ہی آدیتہ ناتھ جیسے بی جے پی کے بے لگام قائد ہیں،اور انہیں قائدین کی قیادت میں اترپردیش میں بی جے پی کو ضمنی انتخابات میں زبردست ناکامی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔اس کے باوجود بی جے پی کے بے لگام ممبران پارلیمنٹ اپنی زبانوں پر لگام کسنے سے قاصر ہیں۔ متھرا،اترپردیش سے بی جے پی کی ممبر پارلیمنٹ ہیما مالنی نے ورنداون میں بسی بیواؤں کو لے کر

بھی ایک متنازعہ تبصرہ کر دیا ہے۔بقول ان کے بہار اور بنگال کی بیواؤں کو اپنی اپنی ریاستوں میں ہی رہنا چاہیے اور ورنداون میں آکر بھیڑ نہیں لگانی چاہیے۔بہار اور بنگال کی بیواؤں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ بیوائیں وہیں کیوں نہیں رہتیں؟وہاں بھی اچھے مندر ہیں۔توجہ فرمائے اس پس منظر میں کہ بیوہ جو ہندوسماج میں ایک اچھوت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے،اور اسی بیوا کا ایک زمانے میں ستی ہوجانا ہی بہتر حل سمجھا جاتا تھا۔آج اُس بیوہ کے دکھ درد میں شریک ہونے،سماج میں عزت کا مقام دلانے کی بجائے مزید ذلت سے دوچار کرنے کا عمل جاری ہے۔اور یہ سب ان لوگوں کی جانب سے ہو رہا ہے جو صرف نعروں ہی کے ذریعہ سب کا ساتھ اور سب کا وکاس چاہتے ہیں جبکہ ان کے قول و عمل میں بے تحاشہ تضاد موجود ہے۔

ضمنی انتخابات میں عوام کی جانب سے جہاں یہ واضح کر دیا گیا کہ صرف نعروں کی بنیاد پر امن قائم کرنے والے ہی دراصل فرقہ پرستی کے فروغ میں معاون بن رہے ہیں،لہٰذا ان کو دوبارہ اقتدار میں نہ آنے دیا جائے۔وہیں ملک کے میڈیا کی حقیقت بھی سامنے آگئی ہے۔حقیقت کیا ہے؟حقیقت یہ ہے کہ میڈیا جس کے ذمہ مثبت رائے ہموار کرنا، امن وامان کے قیام میں معاون ومددگار بننے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے،وہی میڈیا آج ان دونوں محاذ پر ناکام نظر آرہاہے۔یہ ناکامی دراصل کچھ لوگوں کی کامیابی ہے یا واقعی میڈیا کی ناکامی؟یہ وہ اہم

سوال ہے جس پر چند لمحے ٹھہر کر میڈیا کے مالکان، میڈیا کے ذمہ داران، اور خود ان لوگوں کو غور و خوض کرنا چاہیے جو میڈیا سے کسی بھی سطح پر کہیں نہ کہیں وابستگی رکھتے ہیں۔واقعہ یہ ہے ملک کا میڈیا آج زیادہ تر وہی چیزیں دکھاتا ہے جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں۔برخلاف اس کے میڈیا چینل کی جانب سے کرائے جانے والے ڈبیٹ اور ڈسکشنس میں وہ باتیں سننے کو ملتی ہیں جو نفرت کے فروغ میں معاون و مددگار بن رہی ہیں۔یہ ڈبیٹ کیوں کروائے جاتے ہیں؟ان میں مخصوص لوگوں کو ہی کیوں بلایا جاتا ہے؟اور ایک مخصوص قسم کے لوگوں کو کیوں نہیں بلایا جاتا ہے؟کیا ملک کی راہنمائی ،اس کو چلانے اور مسائل کے حل چند مخصوص لوگوں کے پاس ہی ہیں؟یا دیگر افراد، گروہ، سماج کے سوچنے سمجھنے والے لوگ اور عوام بھی ان معاملات میں کوئی رائے رکھتے ہیں؟یہ وہ عمومی سوالات ہیں جس پر ہم سب کو سوچنا اور غور و فکر کرنا چاہیے۔یہ صحیح ہے کہ میڈیا پر بندشیں مناسب نہیں ہیں،اور چونکہ میڈیا رائے عامہ کے فروغ میں ایک اہم ترین کردار ادا کرنے والا ادارہ ہے۔لہٰذا جب کبھی میڈیا پر پابندی کی بات اٹھتی ہے تو عوام و خواص سب مل کر میڈیا کے حق میں کھڑے نظر آتے ہیں۔لیکن افسوس وہی میڈیا جس کے حق میں بلا لحاظ مذہب و ملت، ملک کے تمام عوام ایک ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں، عوام میں نفرت کے فروغ کو پروان چڑھانے کا منفی کردار ادا کر رہا ہے۔یاد فرمائیں آج سے چھ سال قبل بٹلہ ہاؤس انکاونٹر کا معاملہ ہمارے میڈیا ہی کے ذریعہ ملک

کے ہر عام و خاص کے سامنے آیا تھا۔ جس وقت یہ واقع رونما ہوا تھا اس دن میڈیا کے تمام چینل یک زبان مختلف بے تکی رپورٹوں کو پیش کرنے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں کوشاں تھے۔ اور اس کے بعد جب یہ معاملہ عدالت میں گیا، عوام و خوص کے ذریعہ مختلف سوالات کھڑے کیے گئے، انکاونٹر کی عدالتی جانچ کی بات کی گئی، تو ہمارا میڈیا خاموش نظر آیا۔ حقوق انسانی کی کارکن منیشا سیٹھی جو بٹلہ ہاؤس انکاونٹر معاملہ کی حقیقت سامنے لانے میں کوشاں ہیں، کے مطابق بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی رپورٹ اور پولیس کی کہانی میں کئی تضادات سامنے آچکے ہیں۔ اس سلسلے میں مرکزی حقوق انسانی کمیشن کی رپورٹ سرسری ہے، اچھی طرح نہ تو عدالتی اور نہ ہی مجسٹریٹ انکوائری ہوئی ہے۔ انکوائری کے لیے ہر جگہ سے مطالبہ ہونے کے باوجود اس کی انکوائری نہ کیا جانا بے حد افسوسناک ہے۔ مینشا کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں دو کیس بنے تھے، ایک انسپکٹر موہن چند شرما کی موت اور دوسرے دہلی بلاسٹ کیسیز کے سلسلے میں، لیکن ساجد اور عاطف کی موت کے بارے میں اب تک کوئی مقدمہ درج نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی انکوائری ہوئی ہے۔ انکوائری نہ ہونا ہی ایک بہت بڑا سوال کھڑا کرتا ہے۔ وہیں دوسری جانب ملک غداری اور ملک میں دہشت گردی جیسے معاملات میں آٹھ آٹھ، دس دس سال اور اس سے کچھ کم یا زیادہ وقت جیلوں میں گزارنے والے افراد جب باعزت بری ہوتے ہیں، تو کیا ہمارا میڈیا پکڑے جانے کے وقت جس قدر سرگرم تھا اس کا عشر عشیر ہی اُن کی باعزت بری کی خبر جلی یا خفی حرفوں میں سامنے لاتا ہے؟

اور آخری بات جو ضمنی انتخابات کے نتائج میں سامنے آئی ہے وہ یہ کہ ملک کے عوام نفرت کی بنیاد پر سیاست کرنے والوں کے دام میں زیادہ دن اور پھنسنے والے نہیں ہے۔شائد یہی وجہ ہے کہ حالیہ بہار کے ضمنی انتخابات اور آئندہ ہونے والے اسمبلی انتخابات کے پیش نظر بی جے پی کے لیڈر سشیل کمار مودی اب کہتے نظر آرہے ہیں کہ یوگی آدتیہ ناتھ پارٹی کا چہرہ نہیں ہیں،اور اگر بہار میں انہوں نے ویسی باتیں کہی ہوتیں، جیسی یوپی میں کہی ہیں تو میں ان کی زبردست مخالفت کرتا۔دوسری طرف ریاست گجرات کے سابق وزیر اعلیٰ اور ملک کے وزیر اعظم بھی ایک پرائیوٹ نیوز چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے ملک کے مسلمانوں کو محب وطن قرار دے رہے ہیں اور کہ رہے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے وطن کے لیے ہی جیتے ہیں اور اسی کے لیے مریں گے۔ان دو بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ خواب خرگوش میں سونے والے نیند سے بیدار ہوا چاہتے ہیں۔لیکن یہ بیداری کتنے دن برقرار رہے گی،اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔وہیں ہم یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ وزیر اعظم نے موجودہ بیان سے قبل اور کتنی مرتبہ ملک کے مسلمانوں کی حب الوطنی کے تعلق سے اپنے بیانات جاری کیے ہیں۔تحقیق کرنے والوں کو تحقیق کرنی چاہیے کہ کیا آج سے پہلے بھی یہ باتیں اُن کی جانب سے سامنے آئی ہیں؟اگر ہاں تو بہت خوب لیکن ،اگر نہیں تو کیا آج ملک کے وزیر اعظم کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھلا چاہتی ہے؟یا اس میں بھی کوئی دہری

پالیسی اپنائی جارہی ہے !

محمد آصف اقبال

maiqbaldelhi@gmail.com

maiqbaldelhi.blogspot.com

! نظام کی اصلاح و اعتماد بحالی

دنیا کے مختلف ممالک میں نظام کی اصلاح ایک مستقل اور بتدریج عمل ہے۔ جس قدر نظام درست، چست، منظم اور اقدار پر مبنی ہوگا اسی قدر ملک بھی پائیدار و مستحکم کہلائے گا۔ دنیا کے وہ ممالک جہاں آبادی کے تناسب سے نظام کو چلانے والے مقدار یا صلاحیتوں کے اعتبار سے کم ہیں، وہاں مسائل کا حل بھی ممکن نہیں ہے۔ برخلاف اس کے مسائل کے حل میں ایک جانب جہاں انسانی وسائل بھرپور ہونے چاہیں، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ موجود انسانی وسائل کو قابل قدر اور قابل استعمال بنایا جائے۔ بالفاظ دیگر انسانی وسائل کی تربیت اور اصلاح کا عمل ایک مستقل جاری وساری رہنے والا عمل ہے۔ ہندوستان میں گزشتہ تین دہائیوں سے خصوصاً اور عموماً آزادی کے بعد ہی سے پولیس نظام کی اصلاح کی کوششیں جاری ہیں۔ پولیس وہ ادارہ ہے جو نہ صرف نظام کو درست رکھنے، نظم و نسق چلانے، انسانی مسائل کے حل میں بہترین کارکردگی انجام دینے میں سرگرم رہتا ہے بلکہ سماج میں پھیلی برائیوں کے خاتمہ کے لیے بھی پوری طرح مستعد رہنے والا ادارہ ہے۔ لیکن چونکہ نظام میں بگاڑ ایک حقیقت ہے لہذا اس ادارہ میں بھی مختلف وجوہات کی بنا پر خامیاں محسوس کی جاتی رہی ہیں۔ وہ مختلف وجوہات کیا ہیں؟ ان کا ہم بعد میں تذکرہ کریں گے۔

نے سپریم کورٹ میں PCUL فی الحال "فرضی انکاؤنٹر" کے تعلق سے ایک رضاکار تنظیم
ایک اپیل برائے ممبئی، جس میں 1995 اور 1997 کے درمیان 99 مڈبھیڑوں میں
افراد کے مارے جانے سے متعلق دائر کی تھی۔ اپیل کا فیصلہ سناتے ہوئے سپریم 135
کورٹ آف انڈیا نے 32 صفحاتی فیصلہ کے ساتھ پولیس نظام کی اصلاح سے متعلق راہنما
ہر انکاؤنٹر کی جانچ سی آئی ڈی یا (i : ہدایات جاری کی ہیں۔ یہ ہدایات اس طرح ہیں
جانچ ختم ہونے تک اس میں شامل پولیس اہلکاروں کو (ii آزاد ایجنسی سے کرائی جائے۔
تعزیرات ہند کی دفعہ 176 کے تحت ہر انکاؤنٹر (iii پر موشن یا بہادری ایوارڈ نہیں ملے گا۔
ہر انکاؤنٹر کے بعد ہتھیار اور گولیاں (iv کی جوڈیشیل مجسٹریٹ سے جانچ لازمی ہوگی۔
انکاؤنٹر کی (vi ہر انکاؤنٹر کی ایف آئی آر درج کرانی لازم ہوگی۔ (v جمع کرانے ہوں گے۔
جانچ رپورٹ ہر 6 ماہ میں متعلقہ ریاستی انسانی حقوق کمیشن کو بھیجنی ہوگی۔ سپریم کورٹ
کی ہدایات کے مطابق اب اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ ہر انکاؤنٹر کی آزاد ایجنسی سے
جانچ کرائی جاے۔ یہ جانچ تیزی سے پوری کی جائے۔ اگر کوئی پولیس اہلکار فرضی مڈبھیڑ
میں ملوث پایا جائے تو اس کے خلاف قانونی اور محکمہ جاتی کارروائی ہو۔ اس بات کو بھی
یقینی بنایا جائے کہ ایف آئی آر، ڈائری کی انٹری اور پنچ نامہ اور اسکیچ وغیرہ، متعلقہ
عدالت کو بھیجنے میں تاخیر نہ ہو۔ موت کے بعد ملزم یا مجرم کے سب سے قریبی رشتہ
دار کو جلد از جلد واقعہ

کی بابت مطلع کیا جائے۔ وہ لوگ جو صرف اس ہی پر منحصر تھے، انہیں معاوضہ پانے کا پورا حق ہوگا۔ اگر کسی کو انکاؤنٹر کے فرضی ہونے کا شک ہو تو وہ سیشن کورٹ میں شکایت درج کرا سکتا ہے۔ سپریم کورٹ کا کہنا ہے کہ رہنما ہدایات کی سختی سے ہر حال مین اور ہر کیس میں پابندی کی جائے۔ کورٹ کے فیصلے کے مطابق سی آئی ڈی یا کسی اور اسٹیشن کی پولیس ٹیم اپنے سینئر پولیس افسر کے نگرانی میں انکوائری کرے گی۔ وہ شواہد جمع کرے گی جس میں خون، بال، جائے وقوع کی مٹی کے ذرات کے علاوہ واردات کے عینی گواہوں کو ان کے پورے نام، پتے، اور ٹیلی فون نمبروں کے ساتھ تفصیلات موجود ہوں۔ ان کے بیانات لے گی، ان لوگوں کا بھی بیان لیا جائے گا جو انکاؤنٹر میں شریک تھے۔ جو انکاؤنٹر کی تفصیلات، اس کا مقصد، مقام، نقشہ کے ساتھ اور اگر ممکن ہو تو انکاؤنٹر کے سین کا فوٹو اور ویڈیو یا کچھ جسمانی شہادت، موت کا وقت، اس کے علاوہ جو بھی ممکن ہو اس کی تفصیل جمع کرے گی، تاکہ اس موت کے تمام حقائق سامنے آسکیں۔ زخمی مجرم یا متاثر کو ہر طرح کی طبّی امداد مہیا کرائی جائے نیز اس کا بیان مجسٹریٹ یا علاج کرنے والے ڈاکٹر درج کریں گے۔ یہ وہ تفصیلی رہنما ہدایات ہیں جن کے تحت فرضی انکاؤنٹر پر قابو پائے جانے کی کوشش مقصود ہے۔

درج بالا سپریم کورٹ کی رہنما ہدایات ایک تاریخی ساز فیصلہ ہے۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ پولیس نظام کی اصلاح پہلی مرتبہ ہو رہی ہے بلکہ یہ

عمل تقریباً سو سال پرانا ہے۔ پولیس نظام کی اصلاح ہندوستان میں آزادی سے قبل انگریزوں کے زمانے سے آج تک جاری ہے۔ بے شمار کمیشن قائم ہو چکے ہیں اور تجاویز، مشورے اور تربیت و تنظیم کے پروگرام چلائے جا چکے ہیں۔ مختصراً ہم اب تک قائم کمیشنز اور کیمیٹیز کا تذکرہ مناسب سمجھتے ہیں تاکہ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے کہ یہ نظام اور اس کی اصلاح کسی ایک مخصوص وقت میں مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔ 1855ء میں تین ممبران پر مشتمل ایک کمیشن پولیس ٹارچر سے متعلق ریکارڈ میں آیا ہے۔ 1860ء میں پہلی مرتبہ باضابطہ پولیس کمیشن قائم ہوا۔ 1861ء میں پولیس ایکٹ بنا۔ جس میں فیصلہ لیا گیا کہ ریاستیں پولیس پر کنٹرول رکھیں گی۔ آزادی کے بعد 1950ء میں شہریوں کے بنیادی حقوق سے متعلق بل پاس ہوا۔ 1958 تا 1970 ریاستی حکومتوں کے تحت مختلف پولیس کمیشنز قائم ہوئے۔ جن میں پولیس کارکردگی، ان کے مسائل، افرادِ قلت وغیرہ سے کو سدھارنے کی بات کی گئی۔ 1964ء میں کرپشن سے متعلق سنتھانم کمیٹی قائم ہوئی۔ کمیٹی کی سفارشوں کی روشنی میں سنٹرل ویجلینس کمیشن قائم ہوا۔ 1967ء میں اصلاح انتظامیہ کمیشن قائم ہوا۔ جس میں ڈسٹرکٹ پولیس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی نگرانی کا فیصلہ لیا گیا۔ 1971ء گور کمیٹی قائم ہوئی۔ جس میں موجودہ پولیس والوں کی ٹریننگ کو مزید بہتر بنانے کی بات سامنے آئی۔ 1977ء میں شاہ کمیٹی قائم ہوئی۔ 1977-81ء کے دوران نیشنل پولیس کمیشن قائم ہوا۔ 1993ء میں نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن قائم ہوا۔ یہ کمیشن ہیومن رائٹس ایکٹ کی حفاظت کے لیے قائم کیا

گیا تھا۔ جس کا ایک بڑا مقصد بنیادی حقوق کی پامالی کی شکایتوں کا جائزہ لینا تھا۔ 1996ء سپریم کورٹ میں PIL میں سابق ڈائیریکٹر جنرل آف پولیس، پرکاش سنگھ نے ایک میں نیشنل پولیس کمیشن کی رکمینڈیشنس اور اس کو بہتر بنانے کے تعلق PIL داخل کی۔ سے سوالات اٹھائے گئے۔ دس سالہ طویل کورٹ پر سیڈنگس کے بعد عدالت نے کئی قائم (Ribeiro Committee) کمیٹیاں قائم کیں۔ 1998ء میں ریبی رو کمیٹی ہوئی۔ اسی کمیٹی کے تحت 1861ء کا پولیس ایکٹ تبدیل ہوا۔ 2000ء میں پدمانابھیہ قائم ہوئی۔ جس میں سب انسپیکٹرس کے (Padmanabhaiah Committee) کمیٹی اضافہ کی بات سامنے آئی۔

2004ء میں آفیسرس جائزہ کمیٹی قائم ہوئی۔ 2005ء میں پولیس مشن اور پولیس ایکٹ ڈرافٹنگ کمیٹی قائم ہوئی۔ جس میں اکیسویں صدی کے چیلنجز اور ان کے حل پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ 2006ء میں سپریم کورٹ نے مداخلت کرتے ہوئے بتاریخ 22 ستمبر 2006ء کو رہنما ہدایات جاری کیں۔ جس میں درمیانی اعلیٰ پولیس آفسران کے تبادلہ، ریاستی حکومت اور پولیس کمشنر کی تقرری کا معاملہ، پولیس پٹرولنگ اور چھان بین کے الگ شعبہ کا قیام، وغیرہ فیصلے لیے گئے۔ 2013ء میں جسٹس جے ایس ورما کمیٹی قائم ہوئی۔ یہ کمیٹی دسمبر 2013ء میں دہلی اجتماعی عصمت دری واقعہ کے بعد قائم ہوئی۔ کمیٹی نے کرمنل لاء سے متعلق فاسٹ ٹریک ٹرائیل اور سزا سے متعلق اپنی تجاویز پیش کیں۔ 2013ء میں پارلیمنٹ نے کرمنل

لاء (ردوبدل) ایکٹ 2013ء پاس کیا۔ جس میں خواتین پر ہو رہے مظالم و جنسی زیادتیوں سے متعلق فیصلے لیے گئے۔ یہ وہ پورا پس منظر ہے جو یہ عیاں کرتا ہے کہ حالیہ سپریم کورٹ کی راہنما ہدایات برائے فرضی انکاؤنٹر اُس مسلسل اصلاح عمل کا ایک قدم ہے جو پولیس کی بہتر کارکردگی کی جانب رواں ہے۔ تاکہ ایک جانب پولیس کی کارکردگی بہتر ہو تو وہیں دوسری جانب شہریوں کا پولیس کے تعلق سے اعتماد بھی بحال کیا جا سکے۔ کیونکہ جس ملک کے شہریوں کا اعتماد، جرائم و مظالم کے خاتمہ کے لیے قائم شدہ ادارہ پر ہی متزلزل ہو اس ملک میں قیام امن کی بات ایک مذاق کے سوا اور کچھ نہیں کہلائے گی۔ لیکن یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ قیام امن کا ادارہ یعنی پولیس خود مختلف طرح کے دباؤ میں رہتے ہوئے سرگرمیاں انجام دیتا ہے۔

ایسوسیئشن فار ڈیموکریٹک ریفارمس کے جائزے کے مطابق ملک کے حالیہ لوک سبھا الیکشن میں پرچہ نامزدگی داخل کرنے 5,380ء امیدواران میں سے % 17ء فیصد امیدواران نے اپنے افیڈیوٹ میں مجرمانہ الزام میں ملوث ہونے کا اقرار کیا ہے وہیں 10%ء فیصد ایسے امیدواران بھی تھے جو بڑے جرائم، جیسے قتل، زنا وغیرہ میں ملوث تھے۔ جائزے کے اس مختصر ترین حصہ کی روشنی میں اس بات کا باخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس ملک کی سب سے بڑی قانون ساز باڈی میں حصہ داری میں شریک ہونے والے افراد کی صورتحال ایسی ہو۔ وہاں بے شمار جرائم

ومظالم میں ملوث افراد کی تعداد کیا کچھ ہو سکتی ہے۔ معاملہ یہیں نہیں رکتا بلکہ اس سے آگے چُھٹ بھیّے نیتا اور مختلف قسم کے جرائم پیشہ افراد کا دباؤ بھی کہیں نہ کہیں پولیس کے کام کاج میں نہ صرف رکاوٹ بنتا ہے بلکہ کوموں کو نتائج کے اعتبار سے متاثر بھی کرتا رہا ہے۔ اس پس منظر میں جہاں ملک کے ہر شہری کو اپنے اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری کے لیے سرگرم رہنا چاہیے وہیں قیام امن سے وابستہ پولیس افسران کو بھی ہر ممکن تعاون فراہم کیا جانا چاہیے۔ تب ہی ممکن ہے کہ مسائل کے حل میں، نظام کی اصلاح میں اور شہریوں و پولیس ہر دو سطح پر اعتماد بحالی میں پیش رفت سامنے آئے!

!مہاراشٹر کا سیاسی منظر نامہ اور مسلمان

دنیا میں عموماً وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ایک جانب اپنے مقصد و نصب العین پر ثابت قدم رہیں تو وہیں دوسری جانب مقصد و نصب العین کے حصول میں آنے والی رکاوٹوں کا جرت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے منزل مقصود کی جانب پیش قدمی کرتے چلے جائیں۔یہ وہ بنیادی اصول ہے جس پر ہر زمانے میں شخص، گروہ اور اقوام کامیابی حاصل کر سکتی ہیں۔گرچہ ناکامی کسی کو پسند نہیں ،اس کے باوجود فی زمانہ کسی بھی سطح پر بااقتدارافراد و گروہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے جو کل ان کے اقتدار میں حائل ہو کر انہیں کمزور کر سکتے ہیں۔یہی وہ کشمکش اقتدار ہے جو کسی کو ترقی تو کسی کو تنزلی کی طرف لے جاتا ہے۔یہ حصولِ اقتدار کا نشہ ہی ہے کہ کل تک جو دوست تھے وہ آج دشمن نظر آتے ہیں تو وہیں دشمن دوست محسوس ہونے لگتے ہیں ۔ معاملہ ادور کا نہیں اقتدار کا ہے، کیونکہ ہر دور میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔کچھ ایسی ہی صورتحال حالیہ دنوں ہونے والے مہاراشٹر اسمبلی الیکشن کیہے۔

مہاراشٹر کے دو بڑے گروپ جو اب چار بن چکے ہیں ، موجودہ الیکشن کے دوران خوب ایک دوسرے پر زبانی جنگ میں مصروف ہیں۔ایک جانب کانگریس اور این سی پی پر

شدید حملہ کرتے ہوئے وزیر اعظم کہ رہے ہیں کہ مہارشٹر میں متذکرہ پارٹیوں کی حکومت "لوٹو، باٹو، ٹیکس" (ایل بی ٹی) میں مصروف رہی ہے۔کانگریس اور این سی پی دونوں کا کردار، رویہ اور دل ایک سا ہے، وہ راشٹر وادی (وطن پرست) نہیں بلکہ بھرشٹ وادی (بدعنوان) ہیں۔وہیں دوسری جانب آل انڈیا کانگریس پارٹی کی صدر سونیا گاندھی نے بی جے پی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ بی جے پی دو فرقوں کے درمیان تفریق پیدا کرکے گندی سیاست کو پروان چڑھا رہی ہے، یہ فرقہ پرست پارٹیاں ملک میں انارکی پھیلانا چاہتی ہیں، ملک کے جمہوری نظام کے تانے بانے کو بکھیرنے کی کوشش کر رہی ہے، مودی نے محض عوام کو گمراہ کرکے اکثریت حاصل کی ہے،بی جے پی نے محض جھوٹے وعدے کیے جو حقیقت آج سامنے آرہی ہے۔ تیسری جانب بی جے پی کی حلیف شیو سینا گزشتہ بہار اور یوپی کے ضمنی انتخابات کے نتائج اور کمزور ہوتے مودی فیکٹر کو پیش نظر رکھتے ہوئے بی جے پی سے حالیہ اسمبلی انتخابات میں دوری بنائے رکھنا چاہتی ہے۔وہ یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ گزشتہ 15،سالوں سے برسر اقتدار کانگریس ،این سی پی، اینٹی کمبینسی فیکٹر کی وجہ سے حکومت نہیں بنا پائیں گے، ساتھ ہی ان کے ووٹ شیئر میں بھی کمی درج ہو سکتی ہے۔جس کا راست فائدہ بی جے پی اور شیوسینا کو مل سکتا ہے۔اور اس میں بھی شیوسینا کو زیادہ اور بی جے پی کو کم ہی سیٹیں ملنے کی توقع ہے۔لہٰذا شیوسینا ،بی جے پی کا اتحاد ٹوٹ چکا ہے۔اور اب شیوسینا کے ادھو ٹھاکرے اپنے ہی رشتہ کے بھائی اور مہاراشٹر نو نرمان سینا

ایم این ایس)کے سپریمو راج ٹھاکرے کے ساتھ اپنا دکھ درد باٹتے اور ہاتھ ملاتے (دکھائی دے رہے ہیں۔

دوسری طرف مہاراشٹر الیکشن کے ساتھ ہی اتر پردیش اور بہار کی سیاست اور اس میں موجود سماجی ،معاشی، معاشرتی نیز طبقاتی کشمکش پر مبنی سماج اور ذات و برادری میں مبتلا سیاست اپنے کچھ نئے رنگ دکھا رہی ہے۔ریاست میں ایک بار پھر اعلیٰ ذات والوں کے خلاف اتحاد سامنے آ رہا ہے۔یہ اعلیٰ ذات والے درحقیقت منو وادی فکر پر مبنی سیاسی لیڈران ہیں جن کے خلاف چند نئے اتحاد ابھرتے نظر آ رہے ہیں۔ان میں سرفہرست ریاست بہار ہے جس میں جنتا دل یونائیٹڈ کے نتیش کمار ہیں تو وہیں راشٹریہ جنتا دل کے صدر لالو پرساد یادو کا اتحاد ہے۔یہ اتحاد حالیہ ضمنی انتخابات میں اپنے اثرات ثابت کر چکا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ این ڈی اے سے ملحقہ لوک جن شکتی پارٹی کے لیڈر رام ولاس پاسوان نے دعویٰ کیا ہے کہ بہار میں جنتا دل متحدہ (جے ڈی یو) اور راشٹریہ جنتا دل (آر جے ڈی) اتحاد زیادہ وقت تک نہیں ٹک پائے گا۔پاسوان کا کہنا ہے کہ جب سیلاب کا پانی تیزی سے آتا ہے تو سانپ، بچھو اور چوہے سب ایک ساتھ کسی درخت پر چڑھ جاتے ہیں اور اسی پر رہتے ہیں۔اسی طرح جے ڈی یو اور آر جے ڈی نریندر مودی کی لہر کی وجہ سے جمع ہوئے ہیں لیکن ان کا اتحاد ٹکنے والا نہیں ہے۔وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟اس کو باآسانی گزشتہ ضمنی انتخابات کے نتائج کی روشنی

میں سمجھا جا سکتا ہے جہاں غیر بی جے پی اتحاد کو دس میں سے چھ سیٹوں پر کامیابی ملی تو وہیں بی جے پی اتحاد کو اسمبلی کی صرف چار سیٹیں ہی حاصل ہو سکی ہیں۔دوسری جانب اترپردیش میں ساجوادی پارٹی سپریمو ملائم سنگھ یادو اور جنتا دل (متحدہ) کے صدر شرد یادو نے آج مشترکہ طور پر نریندر مودی حکومت کو اس کی ناکامی بالخصوص بین الاقوامی خارجہ پالیسیوں پر تنقید کا نشانہ بنایا۔نویں بار پارٹی کے صدر منتخب ہونے کے بعد ملائم سنگھ نے کہا کہ جو گرجتے ہیں وہ وہ برستے نہیں اور بی جے پی حکومت مرکز میں عوام کے لیے کام کرنے میں ناکام ہو گئی ہے۔ساتھ ہی نوجوانوں سے کہا کہ ان شرپسند عناصر کے خلاف متحد ہوں جو ہمارے سماج کو تقسیم کرنے پر آمادہ ہیں۔وہیں سماج وادی پارٹی کے قومی کنونشن میں شرد یادو کی موجودگی کو موجودہ سیاسی ہلچل سمجھا جا رہا ہے۔جے ڈی یو کے صدر شرد یادو نے کانگریس کو ساس اور بی جے پی کو بہو قرار دیتے ہوئے دونوں کو گنگا میں بہادینے کی عوام سے اپیل کی۔شرد یادو نے کہا کہ کانگریس اور بی جے پی کی پالیسی ملک کے لیے نقصان دہ ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ منموہن حکومت ریل، دفاع اور انشورنس سیکٹر میں غیر ملکی سرمایہ کاری لانا چاہتی تھی لیکن وہ صرف چاہتی تھی اور نریندر مودی نے وزیر اعظم بنتے ہی اسے نافذ کر دیا۔انہوں نے این ڈی اے حکومت پر خارجہ پالیسی میں تبدیلی لانے کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ مسٹر مودی کے امریکہ اور جاپان دورے بے نتیجہ رہے ہیں۔فی الوقت سیاسی گلیاروں میں رونما ہونے والی یہ وہ

تبدیلیاں ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اگر مہاراشٹر کی ایک بار پھر سے بات کریں اور اس میں مسلمانوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ریاست میں 13.4% فیصد مسلمان آباد ہیں ۔ریاست میں 40 اسمبلی سیٹوں پر مسلمانوں کے ووٹ اثر انداز ہوتے ہیں،اور وہ کسی بھی پارٹی کے امیدوار کو کامیابی و ناکامی سے دوچار کر سکتے ہیں۔اس کے باوجود ریاست کی چار بڑی پارٹیوں نے گزشتہ 2004 میں 20 سیٹوں پر مسلمان امیدواران کو ٹکٹ دیے تو وہیں 2009 میں صرف 18،امیدوان کوہی پارٹی [illegible] ہو سکا۔ گزشتہ دو الیکشن میں کانگریس نے کل 25،این سی پی نے 10، شیو سینا نے 2 اور بی جے پی نے صرف 1،امیدوار میدان میں اتارا ہے۔اگر ریاست [illegible] سکتی درپیش مسلمانوں کے مسائل پر غور کیا جائے تو اتنی بات کافی ہوگی کہ فی الوقت ریاست میں مسلمانوں کی تعداد 13.4% فیصد ہے۔برخلاف جیلوں میں بند مسلمانوں کی تعداد 32.4% فیصد ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ سے متاثر ہو کر ٹاٹا انسٹیٹیوٹ آف سوشل سائنسز نے پچھلے سال مہاراشٹر کی متعدد جیلوں کا سروے کیا تھا اور ان میں بند مسلم قیدیوں کی صورتِ حال کو جاننے کی کوشش کی تھی۔ تحقیق کے دوران مسلم قیدیوں سے متعلق حقائق جو سامنے آئے ہیں وہ اس طرح ہیں : ممبئی سنٹرل اور تھانے سنٹرل جیل میں مسلم قیدیوں کی کل تعداد 52 فیصد ہے اور یہ تمام قیدی انڈر ٹرائل ہیں۔ پورے مہاراشٹر میں 18 سے 30 سال کی عمر

کے جتنے بھی قیدی ہیں، ان میں مسلم قیدیوں کا حصہ 65.5 فیصد ہے۔ یہ مسلم قیدی یا تو اَن پڑھ ہیں یا پھر انہوں نے صرف پرائمری اسکول تک تعلیم حاصل کی ہے۔ گرفتاری کے وقت بہت کم مسلم ایسے تھے جو بے روزگار رہے ہوں، بلکہ زیادہ تر کچھ نہ کچھ کما ضرور رہے تھے اور ان کی ماہانہ آمدنی 2000 روپے سے لے کر 5000 روپے تک تھی۔ تحقیق میں یہ بھی پتہ چلا کہ جو مسلم نوجوان گرفتار کیے گئے وہ اپنی فیملی میں کمانے والے واحد فرد تھے اور پوری فیملی کا پیٹ اُن کی کمائی سے ہی بھرتا تھا۔ جن مسلم قیدیوں کا انٹرویو کیا گیا ان میں سے 75.5 فیصد ایسے تھے، جنہیں پہلی بار گرفتار کیا گیا تھا، یعنی وہ کرمنل بیک گراؤنڈ کے نہیں تھے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ زیادہ تر معاملوں میں قیدیوں نے اپنی گرفتاری کے لیے ناقص پولس سسٹم کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جرم کرنے سے باز آنا چاہتے ہیں، لیکن ایک بار جرم کر دینے اور گرفتار ہو جانے کے بعد ان کے علاقہ میں جب بھی کرائم کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو پولس پہلے انہیں ہی گرفتار کرتی ہے، جس کی وجہ سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار جیل پہنچ جاتے ہیں اور جرائم کی دنیا سے پیچھا نہیں چھڑا پاتے۔ کچھ مسلم قیدیوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ پولس کے متعصبانہ رویہ کی وجہ سے مسلمانوں کو بار بار گرفتار کیا جاتا ہے۔ آر ٹی آئی معلومات کے مطابق مہاراشٹر میں ہر تیسرا قیدی مسلم فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ مبصرین کے مطابق یہ حالات بالکل ایسے ہیں جیسے امریکہ میں سیاہ فام قیدیوں کے ہیں۔ امریکی

جیلوں میں قید 23 لاکھ لوگوں میں سے تقریبا نصف تعداد سیاہ فام قیدیوں کی ہے جبکہ آبادی میں ان کا حصہ صرف 13 فیصد ہی ہے۔ معلومات میں مزید کہا گیا ہے کہ یہ اعدا و شمار مسلمانوں کی دہشت گردی کے الزامات کے تحت گرفتاری سمیت دیگر چھوٹے موٹے اور سنگین جرائم کے متعلق ہیں۔ مسلمانوں کے لاتعداد مسائل اور ان میں سنگین ترین مسئلہ جیلوں میں بند، صعوبتوں سے دوچار مسلمان قیدیوں کی کثیر تعداد توجہ دلاتی ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ بڑی سیاسی پارٹیوں کو لگاتار کامیاب بنانے کے عمل پر غور کرنا چاہیے۔اور دیکھنا چاہیے کہ دیر سے ہی صحیح لیکن کیا موجودہ سیاسی پارٹیوں کے علاوہ بھی کوئی متبادل مسلمان رکھتے ہیں؟یا گزشتہ کی طرح فی الوقت اور آئندہ بھی اپنی کسمپرسی پر توجہ نہ دیتے ہوئے صرف دوسروں سے ہی یہ توقع رکھیں گے کہ وہ آپ کے حق میں اور آپ کے لیے اپنی نیندیں حرام کریں !

! تشدد اور انسانی حیات کی ناقدری

ہر زمانے میں انسانی حیات بہت قیمتی اور نایاب چیز سمجھی جاتی رہی ہے اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ ظلم بھی انسانی جان ہی پر ہوتا آیا ہے۔زمانہ جسے سائنسداں مہذب اور غیر مہذب کے زمرے میں تقسیم کرتے ہیں،اُس "غیر مہذب" دور میں بھی انسانی جان کی اتنی زیادہ ناقدری نہیں کی گئی جتنی کہ آج کے مہذب انسان،انسانی جانوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ گرچہ یہ مہذب اور غیر مہذب کی تقسیم ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے اور یہ باتیں انسان کی لاعلمی کی دلیل ہیں۔ کیونکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالی فرماتا ہے : "اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے "یعنی تخلیق کے وقت ہی اسے علم عطا کیا گیااور علم کی بنا پر وہ پہلے ہی دن سے مہذب بھی ٹھہرا۔پھر یہ تہذیب و تمدن، علم و معرفت اور عزت و شرف کی حدیں اس وقت مکمل کردی گئیں جب نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ،خطبہ حجتہ الوداع کے موقع پر موجود اور غیر موجود تمام انسانوں کو ہدایت فرمارہے تھے "آج تم سب پر ایک دوسرے کا خون عزتیں اور مال حرام ہے خبردار ! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو"۔ لیکن جو خدا اور نبی کی تعلیم کے علمبردار ہیں وہ بھی اور جو خدائی تعلیم سے واقف تو ہیں لیکن اس کو رب العالمین کی تعلیم نہیں مانتے،دونوں ہی ، علم حقیقی کو پس پشت ڈالتے ہوئے

ظلم و تشدد میں مصروف عمل ہیں۔انسان کی عزت ،اس کی آبرو،اس کا وقاراور اس کی جان کی قدر نہیں کرتے۔ ساتھ ہی اس کو حد درجہ ذلیل و حقیر گردانتے ہوئے اس کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ سوچیے اور غور فرمایئے کیا حد درجہ بداعمالیوں میں مبتلا لوگ مہذب کہلائے جا سکتے ہیں؟یا ایسے لوگوں سے کسی خیر کی توقع کی جانی چاہیے؟خیر کی توقع تو تب ہی ممکن ہے جب کہ انسان اپنی ذات کے لیے جو پسند کرے وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرتا ہو۔ایک ایسا شخص، گروہ یا فکر جو اپنے لیے خیر لیکن دوسروں پر ظلم کرنے والی ہو وہ کبھی بھی قابل توجہ یا و قابل عمل نہیں بن سکتی۔
حالیہ دنوں ایک کے بعد ایک دو واقعات ایسے گزرے ہیں جہاں انسانی جان کی حد درجہ پامالی سامنے آئی ہے۔ایک واقعہ حیدرآباد کے صدیق نگر میں واقع مہدی پٹنم گیریسن کیمپ کا ہے جہاں گیارہ سالہ بچہ شیخ مصطفیٰ کو دو فوجی جوانوں نے کیمپ میں بلایا،مارا پیٹا،زخمی کیا اور بعد میں اس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔تو دوسرا واقعہ بہار کے روہتاس ضلع کے کاراکاٹ تھانہ علاقہ کے موہن پور گاؤں میں پندرہ سالہ بچے کی بکری کسی کے کھیت میں تھوڑا بہت چر گئی، تو پہلے ان لوگوں نے بچے کو زدکوب کرکے خوب مارا پیٹا،بری طرح زخمی کیا اور بعد میں گھر میں داخل ہو کر بچہ پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی۔یہ دونوں ہی واقعات نہایت دردناک،افسوناک،اور معاشرہ کی خطرناک صورتحال کے

عکاس ہیں۔پہلا بچہ شیخ مصطفیٰ ،اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا تو دوسرا بچہ سماج کے کمزورترین' دلت طبقہ 'سے تعلق رکھتا تھا۔سوال یہ نہیں ہے کہ اقلیتوں اور دلتوں پر ہو رہے مظالم کیوں بڑھتے جارہے؟اور ان کے خلاف کسفکر کا غلبہ ہے جو یہ واقعات چند دنوں کے وقفہ سے بالترتیب سامنے آئے ہیں۔بلکہ سوال یہ ہے کہ کیاہندوستانی معاشرہ میں کمزوروں اور بے سہارالوگوں کے حقوق ختم کیے جارہے ہیں؟معصوم بچے جو درحقیقت اپنی معصومیت سے دوسروں کو متاثر کرتے ہیں،ان کے تعلق سے بھی جذبہ ہمدری و محبت کا خاتمہ ہو رہاہے؟اور کیوں مہذب انسان حیوانوں سے بھی بدتر ثابت ہوتے جارہے ہیں؟یہ وہ اہم سوالات ہیں کہ جن پر اگرتوجہ نہیں دی گئیاوران باطل افکار و نظریات کو ختم کرنے کی جانب منظم و موثر پیش قدمی نہیں کی گئی تو مستقبل قریب میں ہندوستان،جس کی گنگا جمنی تہذیب پوری دنیا میں مشہور ہے،خطرے میں پڑ جائے گی۔ضرورت ہے کہ اس جانب بلالحاظ مذہب وملت ہر شخص اور گروہ متوجہ ہو۔

متذکرہ حالات میں پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ بگڑتے حالات کو کیسے قابو میں لایا جاسکتا ہے؟اس کا کم از کم ہم مسلمانوں کے پاس بہت موثراورآسان حل موجود ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی انسان سے پیدا کیا،پھر اس کا جوڑا بنایا پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پیدا کیے" (النساء:۱)۔یہاں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ دراصل

انسانوں کا سلسلہ ایک ہی ماں باپ سے شروع ہوا ہے۔لہٰذا تمام انسان ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں،ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی حیثیت سے انہیں ایک دوسرے کا خیر خواہ ہونا چاہیے۔دوسری بات جو بتائی گئی وہ یہ کہ: "ہم نے بنی آدم کو شرف و عزت بخشی اور خشکی و سمندر میں انہیں سواری دی اور پاکیزہ رزق دیا اور اپنی اکثر مخلوق پر انہیں فضیلت دی" (بنی اسرائیل: ۷۰)۔یعنی ایک انسان دوسرے انسان کو حقیر نہ جانے،ایک دوسرے کو عزت و تعظیم دے، کسی کا ناحق قتل نہ کیا جائے اور کسی کو ذلیل و رسوا نہ کیا جائے، چھوت چھات، بھید بھاؤ اور اونچ نیچ کا خاتمہ ہو۔ان دو قرآنی آیات کی روشنی میں یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی شرف و عزت بخشی ہے لہٰذا ایک انسان دوسرے انسان کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے اور اس کے ساتھ ہمدردی اور جذبہ خیر خواہی کے ساتھ پیش آئے۔اب اگر مسلمان خود ان تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہوں تو پھر انہیں یہ امید کیونکر رکھنی چاہیے کہ دوسرے ان کے ساتھ ہمدری رکھیں گے؟رہی بات مسلمان خود کو کمزور سمجھتے ہوئے اپنے سے بالاتر کے ساتھ بہتر رویہ اختیار کرے تو یہ اس شخص، افراد، یا گروہ ہی کی اخلاقی پستی کہلائے گی۔اور جو اخلاقی اعتبار سے پست ہوں انہیں کوئی کیوں قدر کی نگاہ سے دیکھے گا؟معاملہ تو جب ہے جبکہ آپ کسی مقام پر بہتر پوزیشن میں ہوں اور اپنے سے کمزور تر شخص یا گروہ کو احترام بخشیں،نرم خوئی کا رویہ اختیار کریں،اور ان کی دنیاوی اور اخروی ضروریات کو پورے کرنے میں اپنی

تمام تر صلاحیتیں صرف کردیں۔اس پس منظر میں دیکھا جائے تو آج بھی ہندوستانی مسلمان ، سماج کے اس کمزور ترین طبقے کے ساتھ جسے عرف عام میں دلت کہا جاتا ہے، مثبت رائے وررویہ اختیار نہیں کرتے۔جو قوم یا اس کا ایک بڑا حصہ سماجی لحاظ سے پسماندہ طبقوں کے ساتھ رواداری سے نہ پیش آتا ہو،ان کو عزت ووقار نہ بخشتا ہو،ان کے ساتھ ملنا جلنا، کھانا پینا، رہنا سہنا،اور معاملات سے ہچکچاتا اور دور رہتا ہو ، وہ کیونکر یہ چاہتا ہے کہ بااقتدار اشخاص ان کے ساتھ رواداری کا معاملہ کریں گے؟ہم یہ نہیں کہتے کہ مسلمانوں کو جو حقوق اس ملک میں بحیثیت شہری حاصل ہیں انہیں کوئی پامال کر سکتا ہے،یا اگر کسی وقت یا لمحہ کیے جائیں تو انہیں خاموشی سے قبول کر لینا چاہیے۔نہیں ایسا نہ ہے اور نہ ہی ہونا چاہیے۔ملک کا ایک قانون ہے اور اسی قانون کی روشنی میں یہاں ہر طبقے اور مذہب کے ماننے والوں کو حقوق بھی دیے گئے ہیں۔اور یہ حقوق ملک کے دستور نے دیے ہیں، کسی شخص یا گروہ یا مخصوص فکر و نظر کے حاملین نے عطا نہیں کیے۔لہذا کسی کو بھی ہرگز یہ حق بھی نہیں پہنچتا کہ انہیں پامال کرنے کی جرات بھی کرے۔لیکن ہم صرف خود کو اور اپنے قارئین کو اس جانب متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ جس خدا نے انسانوں کو بحیثیت انسان برابر پیدا کیا،ان کو عزت و شرف بخشا،انہیں ہم کیوں نظر انداز کرتے ہیں؟ہم ان لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا اور تعلقات بنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں جو کسی بھی سطح پر باحیثیت ہیں، گرچہ وہ کسی قدر انسانیت سوز اعمال انجام دیتے آئے ہوں۔اگر ایسا ہے، جو

واقعہ بھی ہے، تو پھر لازماً ہمیں خدائی تعلیم سے بغاوت کے نتیجہ میں خدا کے خوف اور اس کے عذاب کے لیے تیار رہنا چاہیے۔اور در حقیقت آج ہم اسی عذاب میں مبتلا ہیں۔ حالات و واقعات کی روشنی میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ایک بار پھر ہم اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں۔اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کریں۔بحیثیت مسلمان خود کو پوری طرح سے اللہ کے آگے جھکنے والا بنا دیں۔ساتھ ہی اللہ کے بندوں کے لیے فکرمندی ہمارا شیوہ ہو۔جہاں کہیں بھی انسانی حقوق کی پامالی ہمارے سامنے آئے اس کے خلاف نہ صرف آواز بلند کریں بلکہ پر امن طریقہ سے نتائج خیز سعی و جہد بھی ہماری ذمہ داری ہے۔تشدد کے خاتمہ اور انسانی حقوق کی پامالی کے تعلق سے ہی اللہ کے رسولؐ نے خطبہ حجتہ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا: " کسی انسان پر جسمانی و ذہنی تشدد نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اُسے بے عزت کیا اور دھمکایا جائے گا۔ کسی سے زبردستی اقبال جرم نہیں کرایا جاسکتا"۔اگر ان تعلیمات کے برحق ہونے کا ہمیں کامل یقین ہے تو پھر لازم ہیکہ ہم انسانی جان کو محترم جانتے ہوئے، نہ صرف اس پر تشدد سے پرہیز کریں بلکہ اپنے ہی جیسے کمزور سماجی اعتبار سے پچھڑے لوگوں کو عزت دیں تاکہ خدا بھی ہمیں عزت سے نوازے!

! شعور و لاشعور اور اسمبلی الیکشن

دور جدید ہو یا ماضی کے گزرے ہوئے حالات، فی زمانہ بے شمار کام وقت کے متقاضی سمجھتے ہوئے انجام دیے جاتے ہیں۔کاموں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اگر وہ کام انجام نہ دیئے جائیں تو مسائل میں ہر دن اضافہ ہی ہوتا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ ہر کام کے انجام دینے کے پس پشت کچھ مقاصد و عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔اور ہر مقصد ایک واضح اور متعین فکر کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔لہٰذا مقصد جس کو کبھی بیان کیا جاتا ہے اور کبھی نہیں بھی،اِس سے زیادہ اہمیت اُس فکر کی ہوتی ہے، جس کی بنا پر وہ مقصد وجود میں آیا ہے۔لہٰذا مقصد سے بالاتر فکر ہوئی،اور فکر یعنی نظریہ یا وہ بنیادی اصول جن کے ماتحت مقصد کے حصول کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔لیکن اگر فکر واضح نہ ہو،اس کو کھل کر بیان نہ کیا جائے، فکر پر پردہ ڈالا جائے یا فکر کے بیان میں دشواریاں لاحق ہوں،تو پھر ان تمام صورتوں میں مقصد بھی غیر واضح ہی کہلائے گا۔اور عموماً فکر و نظر کا انحصار متعلقہ فرد یا گروہ کے ماضی، حال اور مستقبل کے حالات وتعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے۔مثلاًایک ایسا شخص جس کو وطن سے بے انتہا محبت ہے وہ ہر کام کے آغاز میں وطن کو پیش نظر رکھے گا،کہ آیا جو کام انجام دیا جارہا ہے یا پیش نظر ہے اس سے وطن کو فائدہ ہوگا یا نقصان۔ایسا

شخص وطن پرست یا قومیت کے نظریہ کا حامل کہلاتا ہے۔یہی اس کی فکر ہے، یہی نظریہ اور یہی اس کے تحت انجام دیے جانے والے کاموں کا مقصد بھی۔ یہ قوم پرست جب صرف اپنی قوم کے لیے بھلا چاہتاہے تو دیگر اقوام کے بنیادی حقوق کو پامال کرنے سے بھی ذرا نہیں ہچکچاتا۔اس کی زندہ مثال امریکہ ہے، جس نے امریکی قوم کے مفاد کے لیے آج بے شمار ممالک کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے۔لہٰذا کسی مخصوص نظریہ کے فروغ میں انجام دی جانے والی سرگرمیاں، مخصوص نظریہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی انجام دی جائیں گی۔کام چاہے کوئی بھی ہو اور اُس کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے۔اس پس منظر میں ہم جیسے عام شخص کے لیے یہ بات جاننا نہایت مشکل ہو جاتی ہے کہ فلاح و بہبود کے نام پر سرگرمیاں جو دن رات ہمارے سامنے انجام دی جا رہی ہیں، کس فکر و نظریہ کے ماتحت ہیں؟اور وہ کون اشخاص یا گروہ ہے جس کے ساتھ ہمیں تعاون و اشتراک کرنا چاہیے؟برخلاف اس کے کن لوگوں سے ہمیں دور رہنا چاہیے ؟فیصلے کے اس مرحلے میں ، ہم جیسے لوگ ناواقفیت کی بنا پر ایک اعجیب گومگو کی حالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔درحقیقتیہ ایک پیچیدہ اور دشوار گزار مرحلہ ہے۔اس کے باوجود عموماً دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ ایک بڑی اکثریت، نظریہ، فکر اور مقاصد کو پس پشت ڈالتے ہوئے، مختلف افراد اور گروہ کے ساتھ تعاون و اشتراک کرتا ہے۔دوسری جانب لاشعوری میں انجام دی جانے والی سرگرمیاں جس میں ایک شخص یا گروہ اپنا وقت صلاحیت اور مال سب کچھ صرف کرتا ہے، نتیجہ کے اعتبار سے ایک لایعنی عمل،

کے سوااور کچھ بھی نہیں ہے۔

ابتدائی گفتگو کے بعد ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم اس شعوری کیفیت سے دوچار ہوں، جس کے نتیجہ میں انجام دینے والے اعمال ہر لحاظ سے سود مند ثابت ہو سکتے ہیں۔لازم ہے کہ اس کے لیے ہمیں شعور کی وسعتوں کو سمجھنا ہوگا، یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ دراصل شعور کے معنی و مفہوم کیا ہیں۔اور جب انسان کو شعور حاصل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اور اس سے قبل ،دونوں ہی حالتوں میں انسان کے ذریعہ انجام دیے جانے والے اعمال کی کفیت کیا ہوتی ہے؟آ ییۓ آج اسی خشک موضوع پر کچھ طبع آزمائی کریں۔

شعور اپنے آپ سے اور اپنے ماحول سے باخبر ہونے کو کہاجاتا ہے۔ طب اور نفسیات کی ایک (Mind) میں اس کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے: "شعور اصل میں عقل (Self- فہم الذاتی ،(Subjectivity) ایسی کیفیت کو کہاجاتاہے جس میں ذاتیت اور آگاہی (Sapience) دانائی ،(Sentience) ملموسیہ ،(awarness و ماحولی حالتوں (Onself) کی خصوصیات پائی جاتی ہوں اور ذاتی (Perception) میں ایک ربط موجود ہو۔آگاہی دراصل کسی حس کو سمجھنے کا عمل ہوتاہے جو دماغ میں انجام دیاجاتاہے باالفاظ دیگر آگاہی کسی حس سے پیدا ہونے والا عقلی تاثر ہوتاہے۔جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ شعور کس طرح جاری رہتا ہے تو ہمیں چار حالتوں کا علم ہوتا ہے:

ہر حالت کسی نہ کسی شخص کے شعور کا جزو ہوتی ہے۔ فرض کریں درس کے کمرے ۱-
میں بہت سے خیالات وافکار موجود ہیں، میرے بھی اور آپ کے بھی۔ ان میں سے بعض باہم مطابق و متحد ہیں اور بعض متصادم۔ یہ جس قدر باہم اور ایک دوسرے سے الگ ہیں اسی قدر مسلسل و مربوط بھی ہیں۔ کیا اُس کمرے میں کوئی ایسا بھی خیال ہے جو کسی شخص کا خیال نہ ہو؟ اس کے دریافت کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کیوں کہ ایسے خیال کا ہم کو کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ اس لیے جن شعوری حالتوں سے ہم بحث کرتے ہیں وہ ظاہر ہے شخصی شعوراوراذہان ذوات کے اندر پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ہر ذہن اپنے خیالات وافکار کو اپنی حد تک ہی رکھتا ہے۔

ہر شخص کے شعور میں حالتیں ہمیشہ متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ۲-
ایک نفسی حالت ایک بار طاری ہونے کے بعد دوسری بار اس طرح سے نہیں پلٹ سکتی کہ بعینہٖ ایسی ہی ہو جیسی پہلی مرتبہ تھی۔ جو چیزیں جوانی میں ولولہ انگیز ہوتی ہیں وہ بڑھاپے میں بے معنی اور تکلّفی نظر آنے لگتی ہیں۔

ہر شخص کا شعور محسوس طور پر مسلسل ہوتا ہے۔ ایک شخص رات میں سوتا ہے، اس کا ۳-
ذہنی شعور اور ذہنی تعلق نیند کے دوران منقطع ہو جاتا ہے لیکن جب وہ سو کر اٹھتا ہے تو اس کا شعور ماضی، شعور حال سے مل جاتا ہے۔ اس کو وہ تمام حالتیں یاد ہیں جو سونے سے قبل کی تھیں۔ زمانہ ماضی کی حالتیں زمانہ حال کی ذہنی حالت سے لازماً مل جاتی ہیں۔

اپنے معروض کے بعض اجزا کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۔۴
بعض اجزا کی طرف مائل نہیں ہوتا اور ہر وقت معروض کے بعض اجزا کو لیتا ہے اور
بعض کو رد کر دیتا ہے۔ یعنی ہر شخص ہر لحظہ ان اجزا میں بعض کا انتخاب کرتا رہتا ہے۔
شعور کی یہ حالتیں جن سے ہر شخص متاثر ہوتا ہے، اسی کے ذریعے اس کا قلب و ذہن بھی
متاثر رہتا ہے۔ اس کا آغاز کسی چیز کے محسوس کرنے سے ہے اور اختتام کسی عمل کے
مکمل ہونے پر۔ قرآن جب کہتا ہے کہ "یہ اندھے ہیں، گونگے ہیں، بہرے ہیں، انھیں
کچھ نہیں سوجھتا" تو اس صورت میں قرآن انسان کے اُس شعور کی حالت کا ذکر کرتا ہے،
جس میں سب کچھ دیکھنے، سننے اور مشاہدہ کے باوجود انسان ایک طرح کی بے ہوشی
لاشعوری) میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کو درک حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ آگاہی حاصل)
کرپاتا ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ایسے افراد کا تذکرہ کرتا ہے:۔" بھلا سوچو، جو شخص
منھ اوندھائے چل رہا ہو وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اٹھائے سیدھا ایک
ہموار سڑک پر چل رہا ہو؟ ان سے کہو۔ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، تم کو سننے
اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے، سمجھنے والے دل دیے۔ مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے
ہو" (الملک: ۲۲)۔ یہاں جو صورت حال بیان کی گئی ہے اس میں بھی انسان کی
دو حالتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک شعوری اور دوسری لاشعوری۔ شعوری حالت میں

وہ اپنی زندگی اور اس کے نشیب وفراز کو سوچ سمجھ کر اور علم کی روشنی میں انجام دیے جانے والا عمل کرتا ہے وہیں دوسری حالت یہ ہے کہ ایک انسان بے سوچے سمجھے اور لاعلمی میں اپنی پوری زندگی گزار دیتا ہے۔ گفتگو کے اس پورے پس منظر میں موجودہ حالات میں مسلمانان ہند کو اپنے شب وروز کا جائزہ لینا ہوگا اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ کن مقامات سے اپنی وابستگیاں اختیار کیے ہوئے ہیں؟ مہاراشٹر کے الیکشن ختم ہو چکے ہیں، مسلمانوں نے مختلف وجوہات کی بنا پر اپنے ووٹوں کو مختلف پارٹیوں کے حوالے اس امید کے ساتھ کیا تھا کہ وہ سیکولر ملک میں سیکولر طاقتوں کو اپنا تعاون دیں گے۔ لیکن آج نام نہاد سیکولر جماعتیں فرقہ پرست طاقتوں کو اپنا تعاون پیش کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ شعور و لاشعور کے اس گنجلک عمل میں جھارکھنڈ اور دہلی کے الیکشن بھی قریب آیا چاہتے ہیں۔ وہیں دوسری طرف ملک کی تہذیب وثقافت اورتاریخ کا رخ موڑنے کا کھیل بھی ،بہت ہی منظم انداز میں جاری ہے۔ان حالات میں وقت کا تقاضہ ہے کہ ایک بار پھر ووٹ کے استعمال کرنے والوں کو قبل از وقت کچھ بڑے فیصلہ لے لینا چاہیے!

! صالح معاشرہ۔ وقت کی ضرورت

انبیا کرام اور پیغمبران اسلام کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد تکمیل اخلاق تھا۔اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پہلا مقصد یہ تھا کہ انسان صرف اللہ کی بندگی کرے اور دوسرا یہ کے وہ اعلیٰ اخلاق پر فائز ہو تاکہ وہ اپنے رب کو جانے،مانے، تصدیق کرے اور عمل کرتے ہوئے دنیا میں امن و سکون برقرار رکھے۔جس مقام پر یہ دو مقاصد پورے ہوتے نہ نظر آئیں اس مقام پر مقاصد کی تکمیل کے لیے نہ صرف جدوجہد کی جائے بلکہ تمام صلاحیتیں جو اللہ کی عطا کردہ ہیں انہیں بھی استعمال میں لانا چاہیے۔فرد واحد کی زندگی میں بھی تبدیلی لائی جائے اور معاشرہ کی صورتحال کو بدلنے کے لیے بھی کوشاں رہا جائے گا۔ساتھ ہی ہر اس موقع پر جبکہ ایک عملی نمونہ کی ضرورت ہو، تو نبی امّی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو سامنے رکھنا چاہیے۔اللہ تعالی فرماتا ہے کہ "اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو" (القلم: ۴)۔آیت میں رسول اللہ کے اعلیٰ اخلاق کے تذکرے سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی شخصیت نہایت صحیح الدماغ، سلیم الفطرت تھی جس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ متوازن تھا۔اور دنیا بھی اسی شخص کی پیروی پسند کرتی ہے جس کا دماغ صحیح ہو، جس کی فطرت صالح ہو اور جس کا مزاج معتدل ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بہترین تعریف حضرت عائشہؓ نے اپنے اِس قول میں فرمائی ہے کہ "قرآن آپ کا اخلاق تھا"۔ (امام احمد، مسلم، ابوداؤد، نَسائی، ابن ماجہ، دارمی)۔ معنی یہ کہ رسول اللہؐ نے دنیاکے سامنے محض قرآن کی تعلیم ہی پیش نہیں کی بلکہ خود اس کا مجسّم نمونہ بن کر دکھادیا۔قرآن میں جس چیز کا حکم دیاگیا آپ نے خود سب سے بڑھ کراس پر عمل کیا، جس چیز سے اس میں روکا گیاآپ نے خود سب سے زیادہ اس سے اجتناب فرمایا، جن اخلاقی صفات کو اس میں فضیلت قرار دیاگیا سب سے بڑھ کرآپ کی ذات ان سے متصف تھی، اور جن صفات کو اس میں ناپسندیدہ ٹھہرایاگیا سب سے زیادہ آپ ان سے پاک تھے۔دوسری روایت میں حضرت عاشۃؓ فرماتی ہیں کہ "رسول اللہؐ نے کبھی کسی خادم کو نہیں مارا، کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا، جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کبھی آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا، اپنی ذات کے لیے کبھی کسی ایسی تکلیف کا انتقام نہیں لیا جو آپ کو پہنچائی گئی ہو الّا یہ کہ اللہ کی حُرمتوں کو توڑا گیا ہو اور آپ نے اللہ کی خاطر اس کا بدلہ لیا ہو، اور آپ کا طریقہ یہ تھاکہ جب دو کاموں میں سے ایک کاآپ کو انتخاب کرنا ہوتا توآپ آسان تر کام کو پسند فرماتے تھا، الّا یہ کہ وہ گناہ ہو، اور اگر کوئی کام گناہ ہوتا توآپ سب سے زیادہ اس سے دور رہتے تھے" (مسند احمد)۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ "میں نے دس سال رسول اللہؐ کی خدمت کی ہے۔آپ نے کبھی میری کسی

بات پر اف تک نہ کی، کبھی میرے کسی کام پر یہ نہ فرمایا کہ تو نے یہ کیوں کیا، اور کا کبھی کسی کام کے نہ کرنے پر یہ نہیں فرمایا کہ تو نے یہ کیوں نہ کیا" (بخاری و مسلم)۔ یہ ہے وہ زندگی اور اس کی مختصر جھلک جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس ذات کی کیا حیثیت ہے۔ نبیؐ کی سیرت پر عمل کرنے سے انفرادی اور اجتماعی دونوں محاظ پر کامیابی ممکن ہے، کردار بے داغ بن سکتا ہے اور مکارم اخلاق کے اعلیٰ مقام تک پہنچا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ کی زندگی ہمارے لیے اس لحاظ سے بھی قابل اہم ہے کہ آپ ہمارے قائد، رہنما، رہبر اور نبی ہیں۔ آپ کی زندگی ہماری اجتماعی زندگی کے لیے بھی بہت اہم ہے۔ جب ہم اس لحاظ سے آپ کی زندگی کا مطالع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی گھریلو زندگی میں امہات المونین کے ساتھ حسن سلوک، ان کی تربیت، ان سے محبت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرتے، بچوں سے بے انتہا محبت کرتے اور فرماتے کہ "بچے جنت کے پھول ہیں"۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ " حضور نے اپنے دست مبارک سے اللہ تعالی کے راستہ میں جہاد کے علاوہ کبھی کسی کو نہیں مارا۔ نہ کبھی کسی خادم کو نہ کسی عورت کو (بیوی یا باندی وغیرہ) کو"۔ یہ اس طرح کے بے شمار تذکرے ہمیں سیرت اور احادیث کی کتابوں میں ملتے ہیں جن سے ہمیں نہ صرف راہنمائی ملتی ہے بلکہ جذبے بیدار اور حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ ہماری اجتماعی زندگی کا وہ حصہ جس کو ہم گھر کہتے ، ہیں، جہاں ماں ، باپ

بیوی بچے، بھائی بہن اور دیگر رشتہ دار ہوا کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کس طرح سے پیش آئیں اور ان کے ساتھ کون سا رویہ اور طریقہ اختیار کریں اس کی مکمل وضاحت ایک طرف اللہ تعالی قرآنِ الحکیم میں فرماتا ہے وہیں دوسری جانب رسول اللہ کا اسوہ ہماری راہنمائی اور راہبری فرماتا ہے۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی ، کسی بھی سطح پر غفلت نہ برتیں ، شعوری اور سنجیدہ زندگی گزاریں تاکہ جب ہم قیامت میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں تو کوئی اٹھنے والا ہاتھ ایسا نہ ہو جو ہماری جانب ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں کا اشارہ کرے اور اللہ کا غضب ہم پر نازل ہو جائے۔ ہمیں ہر لمحہ آخرت کے دن سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

ہم جانتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی، اور نہ ہی کبھی کسی کے حق میں بد دعا کی۔ بہت سے واقعات آپ کی زندگی سے وابستہ ہیں جہاں لوگوں نے آپ کو تکلیفیں پہنچائیں لیکن آپ نے ہمیشہ ان لوگوں کو معاف کر دیا اور یہی تعلیم آپ نے اپنے اصحابؓ کو بھی دی۔ پڑوسیوں کے حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ کہتی ہیں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم نے فرمایا: "جبریل ہمیشہ مجھ کو ہمسایہ (پڑوسی) کا حق ادا کرنے کی ہدایت کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ میں نے یہ خیال قائم کر لیا کہ جبریل امین پڑوسی کو وارث قرار دیں گے" (یعنی ایک ہمسایہ کو دوسرے ہمسایہ کا وارث بنا دیں گے) (بخاری و مسلم)۔ اسی طرح لوگوں کی عزت احترام کے سلسلے میں

فرمایا: "کبیرہ گناہوں میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی اپنے والدین کو گالی دے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں جب یہ کسی کے باپ کو گالی دیاتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور یہ کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے" (جامع ترمذی)۔ لوگوں سے ہمدردی کے تعلق سے اللہ کے رسول فرماتے ہیں: "جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتااللہ اس پر رحم نہیں کرتا" (جامع ترمذی)۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے: "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یومِ آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں، اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں" (البقرہ:۱۷۷)۔ اس آیت کریمہ میں ایک مہذب معاشرہ کی مکمل تصویر پیش کردی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ معاشرہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر کون سے کام لازم ہیں اور کس طرح وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے لوگوں کے لیے خیر ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کی بات ہے، اللہ کے حقوق یعنی عبادت کا تذکرہ

ہے، لوگوں کے ساتھ معاملات اور معاہدوں کو بھی بہ خوبی ادا کرنے کی بات ہے۔اس طرح کی بے شمار ہدایات واحکامات قرآن و حدیث میں موجود ہیں ان احکامات پر عمل کرنے کے نتیجہ میں صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے ان پہلوؤں پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے جن کا تعلق حکومت اور ریاست سے ہے۔ان میں معیشت، معاشرت، تعلیم اور سیاست موٹے طور پر آتے ہیں۔ان کے تعلق سے بھی ہمیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی زندگی میں مکمل ہدایات و رہنمائی ملتی ہے۔فرمایا: " یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین پر اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے" (سورۃ حج: ۴۱) ۔نیز فرمایا: "اور لوط کو ہم نے حکم اور علم بخشا اور اسے اس بستی سے بچا کر نکال دیا جو بدکاریاں کرتی تھی۔ درحقیقت وہ بڑی ہی بری، فاسق قوم تھی۔اور لوط کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ صالح لوگوں میں سے تھا" (الانبیآء: ۷۴)۔ معلوم ہوا کہ حصولِ علم کا مقصد معصیت کے کاموں سے بچنا اور ان کاموں سے گریز کرنا ہے جن کی ممانعت کی گئی ہے۔ علم کا مقصد یہ بھی ہے کہ اپنے ربِ حقیقی کو پہنچانا جائے، اس پر کامل یقین کیا جائے نیز اس کے تمام احکامات خوش خلقی کے ساتھ ادا کیے جائیں۔اس طرح ملک، حکومت، سیاست، معیشت اور تعلیم کے ذریعہ ایک صالح معاشرہ تشکیل پائے

گا۔ معاشرہ صالح ہوگا تو اس میں بسنے والے لوگ امن و سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کریں گے۔ اسلامی تعلیمات پر مبنی معاشرہ وجود میں آئے اس کی خواہش فرد واحد کو بھی ہونی چاہیے اور اسلامی اجتماعیت کو بھی۔ یہ وہ جائز خواہش ہے جس پر عمل کے نتیجہ میں شخصیتیں نکھریں گی، فساد فی الارض ختم ہوگا وہیں دوسری جانب معاشرہ اور ملک بھی صحیح راہ پر گامزن ہو جائے گا۔

!تاریخ کے اوراق اور موجودہ صورتحال

تیرہویں صدی کے وسط میں بنو عباس کا آخری خلیفہ مستعصم باللہ بغداد میں حکمران تھا،جب ہلاکو کی زیر قیادت منگولوں (تاتاریوں) نے اسلامی خلافت کے سب سے بڑے مرکز پر حملہ کیا۔ فتح کے بعد ہلاکو خان نے مستعصم باللہ کو کھانے پر بلایا لیکن کھانے کے لیے کوئی چیز دینے کے بجائے خلیفہ کے سامنے سونے اور چاندی کے ڈھیر رکھ دیئے۔ جو تاتاری فوج نے خلیفہ کے محلات سے لوٹے تھے اور کہا "جناب عالی ! آپ نے جو کچھ جمع کر رکھا تھا اب اسے تناول فرمایئے" خلیفہ اسلام نے کہا "میں سونا کس طرح کھا سکتا ہوں؟" اس پر ہلاکو نے کہا تو پھر آپ نے اسے اتنی حفاظت اور اہتمام سے کیوں رکھا ہوا تھا؟ ہلاکو نے محل کے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور سیم وزر و جواہرات سے لبریز بڑے بڑے آہنی صندوقوں کی طرف تلوار سے اشارہ کرتے ہوئے گرفتار خلیفہ سے کہا "آپ نے ان صندوقوں کے فولاد سے اپنی فوج کے لیے تیروں کے سوفار کیوں نہ بنوائے اور یہ تمام سونا و جواہرات اپنے سپاہیوں میں تقسیم کیوں نہ کیے اور آپ نے پہاڑوں کے دامن میں باہر نکل کر مجھے پہلے سے روکنے اور مقابلے کی کوشش کیوں نہ کی؟" خلیفہ نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا "مشیت ایزدی یہی تھی" تاتاریوں کے سپہ سالار نے کہا اچھا تو اب ہم جو سلوک آپ سے کریں اسے بھی مشیت الہٰی سمجھئے۔اس کے بعد ہلاکو نے خلیفہ اور

اس کے بیٹوں کو نمدے میں زندہ لپیٹ کر نمدے کو سی دیا اور پھر خونخوار تاتاری سپاہیوں نے اس نمدے پر گھوڑے دوڑائے۔اس طرح خلیفہ اور اس کی اولاد کو گھوڑوں کے سموں کے نیچے مکمل طور پر روند ڈالا گیا۔

یہ سب کیونکر ہوا؟وجہ وہی جس سے ہر زمانے میں مسلمانوں کو سابقہ رہا ہے۔یعنی تفرقہ بازی، گروہ بندی ، باہمی آویزش اور خانہ جنگی۔خلیفہ کے بڑے بیٹے امیر ابوبکر اور وزیر ابن علقمی کے درمیان انتہائی دشمنی تھی۔اس کے باوجود ابن علقمی نے خلیفہ کو اس طرح سے اعتماد میں لیا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں سے زیادہ علقمی پر اعتماد کرتا تھا۔گرچہ باطنی فرقہ کا قلعہ الموت ہلاکو خان نے فتح کر لیا تھا لیکن وہیں دوسری طرف ہلاکو خاں کو ابن علقمی نے بغداد پر حملے کی خفیہ دعوت بھی دے دی۔ساتھ ہی اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ اگر ہلاکو خان بغداد پر حملہ آور ہوتا ہے تو اسے وہ بڑی آسانی سے فتح کر لے گا اور اس سلسلے میں اس کی ہر ممکن مدد بھی کی جائے گی۔وہیں دوسری طرف خلیفہ وقت کو علقمی نے سمجھایا کہ یہاں دار السطنت میں ہمارے اتنے سارے لشکر بے کار تنخواہیں وصول کر رہے ہیں، اگر یہ باہر جائیں گے تو کچھ کام کریں گے ۔اس لیے دوراندیشی اور دانش مندی کا تقاضا ہے کہ ان لشکروں کو ان کے سرداروں کے ساتھ مختلف سمتوں میں کسی نہ کسی مشن پر بھیج دیا جائے، اس طرح خزانے کی بھی بچت ہوجائے گی ۔ بہی خواہوں نے بار بار خلیفہ کو ابن علقمی کی باتوں میں

نہ آنے کا مشورہ دیا اور لشکروں کو فوری دارالحکومت میں طلب کیے جانے کو کہا۔ لیکن خلیفہ نے جواب دیا کہ پہلے وہ اپنے دانا وزیر سے مشورہ کرنا پسند کرے گا۔ علقمی نے خلیفہ کو تسلی دی اور کہا، بھلا منگولوں کی فوج بغداد پر کیسے غالب آسکتی ہے؟ اگر محض ہماری عورتیں اور نابالغ بچے بھی مکانات اور دیواروں پر چڑھ کر کھڑے ہو جائیں اور ایک ایک اینٹ پھینکیں تو منگول لشکر تباہ ہو جائے گا۔ خلیفہ کو ایسی ہی خواب آور باتوں کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی خوب صورت کنیزوں کے ہجوم میں واپس جاکر موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ دوسری طرف علقمی کے ہلاکو کے ساتھ رابطے بھی جاری رہے۔ اُس کے خط بھی پکڑے گئے اور خلیفہ کو پیش کیے گئے لیکن خلیفہ نے مخالفوں کی دشمنی قرار دے کر کوئی توجہ نہ دی۔ ابن علقمی کو خلیفہ کے بیٹے کے ساتھ پرخاش تھی، وہ خلافت کا بھی خیر خواہ نہ تھا، اس نے خلافت کو زک پہنچانے کا ناپاک منصوبہ بنایا تھا جو اس کی توقع سے بڑھ کر کامیاب ہوا۔ بلکہ ایسا کامیاب ہوا کہ خلافت کا نام ونشان نہ رہا اور مسلمانوں کو پہلے چنگیز کے ہاتھوں اور بعد میں ہلاکو کے ہاتھوں ایسی چوٹ لگی کہ ان کی بحیثیت ایک عظیم ملت کے ذہنی و روحانی خوداعتمادی ختم ہو گئی۔ آٹھ صدیاں گزر گئیں لیکن چوٹ کی تکلیف ہنوز تازہ ہے۔ اقبال نے خودی کا درس دیا لیکن خوداعتمادی شاید آج بھی بحال نہ ہو سکی ہے۔ احساس کہتری موجود ہے بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ تاتاریوں کو کبھی "یاجوج ماجوج" سمجھا گیا، کبھی قریب قیامت کی علامت، کبھی محض غیر

مہذب اور سفاک لٹیرے۔تاتاریوں نے دنیاکے عظیم حصہ کو فتح کیا تھا اور ان کا دبدبہ تمام دنیاپر قائم ہوا۔ان کے مذہب میں کوئی چیز حرام نہ تھی، تمام جانور بلکہ انسانی گوشت بھی ان کے نزدیک حلال تھا۔شادی بیاہ اور نکاح کے جھگڑے میں نہیں پڑتے تھے،ایک عورت کے کئی شوہر ہو سکتے تھے۔۔۔۔"یہ تھے وہ تاتاری جنھوں نے رہی سہی خلافت کا خاتمہ کیا۔

تاریخ کے ان اوراق کو پلٹے ہوئے مسلمانوں کواپنی موجودہ صورتحال پر بھی غور کرلینا چاہیے۔حالات یہ ہیں کہ مسلمانان ہند کوآج اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔سب سے بڑی نعمت اسلام کی ہے،جس کی بناپر وہ اس ملک میں اپنی مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔وہیں علم حقیقی،قرآن و حدیث کا علم،ایک ایسی نعمت ہے جو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کواپنی واضح ہدایات اور رسولِ وقت کے ذریعہ فراہم کی ہے،یہ نعمت آج بھی میسر ہے۔دوسری نعمتیں جو گرچہ یکساں انداز میں سب کے پاس موجود نہیں،اس کے باوجود بڑے شہروں میں کافی حدتک مسلمان مال ثروت سے رکھتےہیں،امت کی موجودہ نسل صلاحیتوں سے مالا مال ہے،اور اس سے بھی آگے بڑھ کرملت اسلامیہ ہند کوایک ایسا ملک فراہم کیاگیا ہے،جس کے افراد مہذب ہیں ساتھ ہی بڑی تعداد میں نجات کے حصول میں سرگرداں اور اخروی کامیابی کے خواہاں بھی ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ موجودہ دور میں اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ کو ہر ممکن طریقہ سے بگاڑنے کا عمل بھی

بہت منظم انداز میں جاری ہے۔جس کے نتیجہ میں ایک عام شخص لا تعلقی،لاعلمی اور غلط فہمیوں کی بنا پر حقیقت سے ناآشنا ہے۔لیکن اگر اس لاتعلقی کو تعلق میں تبدیل کیا جائے،لاعلمی کے اندھیروں کو علم کی روشنی فراہم کی جائے،اور غلط فہمیاں جو منصوبہ بند پھیلائی جارہی ہیں،انہیں محبت وقربت اور علم کے ذریعہ دور کیا جائے،تو وہ دن دور نہیں جبکہ فساد پھیلانے والے ناکام ہوں اور وہ امن وامان قائم ہوجائے جس کی تمنا ہر شخص اپنے دل میں لیے پھرتا ہے۔لہٰذا اگر مسلمانان ہند خلیفہ مستعصم باللہ اور ابن علقمی اور اہل بغداد کے متذکرہ پیرایوں کو نہ بھولے ہوں تو چاہیے کہ وقت جو میسر ہے اسے بیکار نہ جانے دیا جائے۔تہیہ کریں کہ ہم ،کم از کم توحید ،رسالت اور آخرت کے اسلامی تصور سے ،برادران وطن کو آگاہ کریں گے،جہاں اور جس حال میں بھی ہیں اسلامی زندگی ہی بسر کریں گے،نہ خود اپنے اعمال سے اور نہ دوسروں کی چالوں میں آکر اسلامی تعلمات کو زندگی سے ترک کریں گے، اور نہ خود اسلام کو اپنے قول و عمل سے زک پہنچائیں گے اور نہ ہی ابن علقمی جیسے اسلام ، اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظام سے بغض رکھنے والوں کا ساتھ دیں گے۔

اب ذرامزید آنکھیں کھول کر اپنی ذات کا محاسبہ کیجئے اوردیکھے کہ آج ہم کیا کچھ کر رہے ہیں؟کن لوگوں کے جھنڈے اور علم ہم اپنے ہاتھوں میں اٹھائے پھر تےہیں؟ وہ کون سے نعرے ہیں جو ہماری زبانوں پر جاری ہیں،ہمارے دل و

دماغ اور ہمارا قیمتی وقت وصلاحیتیں کہاں صرف ہو رہی ہیں؟بغض، حسد، کینہ ہم خود پروان چڑھا رہے ہیں یا وہ دوسرے ہیں جو ان کاموں کو انجام دے رہے ہیں،افتراق و انتشاراور پراگندگیکا ہم خود شکار ہیں یا دوسرے ہیں جو ہمارے درمیان پروان چڑھا رہے ہیں،اور ان جیسے دیگر اعمال کے نتیجہ میں ہم خود اپنی ذات کو دھوکہ دے رہے ہیں یا اپنے حال و مستقبل کو؟ساتھ ہی مختصر جائزے واحتساب کے بعد یہ بھی دیکھے کہ ہم دوسروں کے لیے کیا کچھ خدمات انجام دے رہے ہیں؟کیا ہم خود کے لیے جی رہے ہیں یا خدمات کے نتیجہ میں دوسروں کے سامنے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں؟جو محروم ہیں ان کی بات نہ بھی کریں تو جن کو میسر ہے وہ بھی کہیں خود ہی تو سونا و چاندی اور روپیہ و پیسہ دستر خوان پر سجا کر کھانے کے لیے تیار تو نہیں؟گفتگو کے نتیجہ میں ممکن ہے کسی کے ذہن میں اچانک یہ سوال بھی ابھر جائے کہ ان حالات میں ہم کیا کریں؟توپہلی بات یہ کہ ہماری گفتگو کا محور ومرکز ہر لمحہ وہر لحظہ تنقید برائے تنقید نہیں ہونا چاہیے۔ہمیں ہر موقع پر بنا سوچ سمجھے کسی کی ہاں میں ہاں بھی نہیں ملانا ہے،نیز امت کے ہر شخص کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتیں عطا کی ہیں،ساتھ ہی اخلاص بھی۔ہمیں ان دو پہلوؤں پر ایک لمحہ رک کر دیکھنا چاہیے کہ ہمارا رویہ دوسروں کے سلسلے میں کیا ہے؟یعنی اعتماد بحالی اور دوسروں پر مکمل اعتماد ہمارا شیوہ ہے یا نہیں؟اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ ہم اللہ پر کامل یقین اور منظم منصوبہ بندی کے ساتھجہد مسلسل کا

حوصلہ رکھتے ہوں۔ پھر یہی وہ نکتہ آغاز ہے جو "ہماری "کامیابی کا پیش خیمہ ہوگا۔" ہماری
یعنی امن و امان کے خواہاں ۔ یعنی وہ لوگ جو فساد فی الارض میں مبتلا نہیں ہیں ! "

! جدیدیت، دقیانوسیت اور آستھا

جدید بھارت کی وزیر تعلیم اسمرتی ایرانی صاحبہ اپنی تقدیر اور مستقبل قریب میں سیاسی کیریئر کو جاننے کے لیے راجستھان کے بھیل واڑا میں پنڈت نتّھو لال ویاس کے گھر کیا گئیں کہ حزب اختلاف اور وہ لوگ جو ان کے نظریہ سے اختلاف رکھتے ہیں، نے ان کے سامنے سوالات کی بھرمار کردی ساتھ ہی انہیں دقیانوسی خیالات کی حامل قرار دے ڈالا۔اس میں پیش پیش تو دراصل میڈیا ہی تھا، جو اگر اس خبر کو عام نہ کرتا تو عوام تک اس بڑے پیانہ پر نہ پہنچتی لیکن دوسری جانب ملک سے دلچسپی رکھنے والے اوراس کے حال و مستقبل کی بھلائی میں سرگرم رہنے والے دیگر افراد و گرہ بھی تھے جو ان کے اس عمل پر نکتہ چینی میں مصروف تھے۔لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے اس خبر کی تائید کی اور کہا کہ فرد کی ذاتی زندگی اور اس میں انجام دی جانے والی سرگرمیوں پر تنازعہ کھڑا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔بھیل واڑ میں اسمرتی کی آمد پر پنڈت جی نے ان کی تقدیر سلیٹ پر لکھ کر پیشین گوئی کی کہ آنے والے دنوں وہ ملک کی صدر بنیں گی۔یاد رہے کہ یہ وہی اسمرتی ایرانی ہیں جنھوں نے 2004 میں گجرات میں ہونے والے فسادات کے لیے سابقہ وزیر اعلیٰ گجرات، نریندر مودی کی کھل کر مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ انہیں اس سلسلے میں لازماً استعفیٰ دینا چاہیے، ساتھ ہی انہوں نے بھوک

ہڑتال پر بیٹھنے کی بات بھی کہی تھی۔ لیکن بعد میں اپنے بیان کو واپس لیا اور کہا کہ میں نے گجرات کے بارے میں جو بیان دیا تھا، میں اسے واپس لیتی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ پارٹی کی ایک ذمہ دار ممبر ہونے کے ناطے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لیکن ایک بار پھر اسمرتی ایرانی صاحبہ موضوع بحث اس وقت بنیں جب موجودہ حکومت نے انہیں مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کا عہدہ دیا، اور ان کی تعلیمی صلاحیت پر سوالات کھڑے ہوئے۔ یہ بات سامنے آئی کہ الیکشن کمیشن کو جمع کیے اپنے کاغذات نامزدگی میں خود کو انہوں نے بارہویں پاس لکھا لیکن بعد میں انہوں نے اسکول آف اوپن لرننگ سے کامرس کی ایک سالہ پڑھائی مکمل کی۔ بی بی سی سے بات کرتے ہوئے این سی ای آر ٹی کے ڈائیریکٹر رہے ڈاکٹر جے ایس راجپوت اسمرتی کی ادھوری پڑھائی کو بطور وزیر ان کے کام میں رکاوٹ نہیں مانتے، اور کہتے ہیں کہ وزرات تو موضوعات کی معلومات رکھنے والے کئی ماہرین کی مدد سے چلتا ہے۔ اس سب کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ اس اہم عہدہ پر رہتے ہوئے ایرانی نے حالیہ واقعہ کے پس منظر میں ملک کی شبیہ متاثر کی ہے، وہیں تعلیم اور فروغ انسانی وسائل میں کس نہج پر کام کیا اور کروایا جا رہا ہے، اس پر بھی کہیں نہ کہیں روشنی پڑتی ہے۔ اسمرتی کے تعلق سے یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ 2001 میں شادی شدہ زبین ایرانی (پارسی) سے انہوں نے شادی کی۔ جبکہ اسمرتی بچپن ہی سے راشٹریہ سوم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کا حصہ رہی ہیں، ان کے دادا سوم سیوک رہے ہیں اور ان کی والدہ بھی جن سنگھ کی ممبر

رہی ہیں۔اس لحاظ سے اسمرتی کا فکری و نظریاتی رشتہ آر ایس ایس سے بہت پختہ ہے۔برخلاف اس کے وہ بی جے پی کے ایجنڈے "ہندوؤں کی شادی دیگر مذاہب کے لوگوں سے نہیں ہونی چاہیے" سے شاید اتفاق نہیں رکھتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ دقیانوسیت اور جدیدیت ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں،اور دونوں ہی کی اساس مذہبی عصبیت اور عقل پرستی ہے۔درحقیقت جدیدیت کلیسائی جبر و استبداد کے رد عمل میں پیدا شدہ ایک مغربی فکر و تحریک ہے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے یورپ میں حد درجہ دقیانوسیت اور روایت پرستی پائی جاتی تھی جس کی بنیاد پر اہل کلیسا نے وہاں کے باشندوں کو ظلم کے خونیں پنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ لہٰذا اس تحریک نے عہد وسطیٰ کو تاریک دور قرار دیا اور مذہبی عصبیتوں ، روایت پسندی اور تنگ نظری کے خاتمے کو اپنا ہدف بنایا۔ جدیدیت کی اس تحریک کی نظریاتی بنیادیں فرانسس بیکن، این ڈی کارٹ، تھامس ہولبس وغیرہ کے افکار میں پائی جاتی ہیں جن کا نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ دنیا اور کائنات عقل، تجربہ، اور مشاہدے کے ذریعے قابل دریافت ہے اور اس کے تمام حقائق تک سائنسی طریقوں سے رسائی ممکن ہے۔ اس لیے حقائق کی دریافت کے لیے کسی اور سرچشمے مثلاً وحی یا نبوت کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کا وجود ہے۔ صرف وہی حقائق قابل اعتبار ہیں جو عقل، تجربہ اور مشاہدے کی کسوٹیوں پر کھرے ثابت ہوں۔۔برخلاف اس کے علم کے حصول کے دو ذریعے ہیں ایک علم وہ ہے جو عقل

اور حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرا وہ جس کی بنیاد ایمان اور وجدان پر ہے۔ لہٰذا تعلیم کا حقیقی مقصد انسانی سیرت و کردار کی تعمیر کرکے اس کی تسخیرِ حیات کی صلاحیت کو تقویت پہنچانا ہے اور اس کے ساتھ ہی خدا، کائنات، اور انسان کو ایک کلی نظام کی حیثیت سے دیکھنا ہے۔ چنانچہ محض مادی یا روحانی تعلیم کو مقصود ٹھہرا لینا درست نہیں۔ کیونکہ روح اور مادہ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور تعلیم کا فرض ہے کہ تن اور من دونوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھے اور جسمانی و روحانی تقاضوں کو یکساں اہمیت دے۔ ساتھ ہی تعلیم کا مقصد انسان کو تسخیر کائنات کے لئے تیار کرنا بھی ہے اور اسے ایسے سانچے میں ڈھالنا ہے کہ وہ خود کو مفید شہری بنا کر صالح معاشرے کو وجود میں لانے میں مدد دے۔

سچائی کی اضافیت کا نظریہ اسلامی نقطہ نظر سے ایک باطل نظریہ ہے۔ اسلام اس بات کا قائل ہے کہ عقل انسانی کے ذریعے مستنبط حقائق یقیناً اضافی ہیں اور شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہیں۔ اس حد تک مابعد جدیدیت اسلامی فکر سے ہم آہنگ ہے لیکن اسلام کے نزدیک جن حقائق کا سرچشمہ وحیِ الٰہی ہے وہ حتمی اور قطعی ہیں۔ ان کی جزوی تشریحات و تعبیرات (جس میں فہم انسانی اور عقل انسانی کا دخل ہے) تو اضافی ہو سکتی ہیں، لیکن ان کے واضح معنی ہر اعتبار سے حتمی اور قطعی ہیں۔ مزید یہ بات کہ انسانی عقل حتمی نہیں ہے اور بسا اوقات دھوکا

کھا جاتی ہے، اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کوئی نئی فکر نہیں ہے۔ جدیدیت نے جس طرح عقلِ انسانی کو حتمی اور قطعی مقام دیا اور عقلیات کو حتمی سچائی کے طور پر پیش کیا، اس پر مابعد جدیدی مفکرین سے بہت پہلے اسلامی مفکرین نے جرح کی۔ بلکہ یہ مبحث صدیوں قبل امام غزالی اور امام ابن تیمیہ کے افکار میں بھی ملتا ہے۔ امام غزالی نے تہافۃ الفلاسفہ میں ارسطو کی منطق پر خود اسی منطق کے اصولوں کا استعمال کرتے ہوئے جو تنقید کی ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ عقل کے ذریعے معلوم حقائق کو محض واہمہ قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کائنات کی وسعتیں اور وقت لا محدود ہے اور انسانی عقل لا محدود کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس کے مشاہدات اضافی ہیں اور ان مشاہدات کی بنیاد پر اخذ کردہ نتائج بھی اضافی ہیں۔ اپنی کتاب معیار العلم میں اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے مختلف مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ انسانی حسیات کے ذریعے حاصل شدہ معلومات اکثر اوقات دھوکے کا باعث ہوتی ہے۔ صرف آنکھ سے دیکھا جائے تو ستارے چھوٹے ذرات معلومات ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً ان میں سے کئی ستارے زمین اور سورج سے بھی بڑے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظر آنے والے حقائق بھی ضروری نہیں کہ حقائق ہوں۔ وہ محض حقیقت کا سایہ یا واہمہ ہو سکتے ہیں۔ حسیات کا دھوکا عقل سے معلوم ہوتا ہے اور عقل کا دھوکا کسی ایسے ذریعے سے معلوم ہوگا جو عقل سے بالاتر ہے، یعنی وحیِ الٰہی۔ جدید اسلامی مفکرین نے بھی جدیدیت پر کلام کرتے ہوئے عقل کی

تحدید اور عقل کے ذریعے معلوم حقائق کے اضافی ہونے کو ثابت کیا ہے۔ معروف علماء کا استدلال ہے کہ : "انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہے۔ جو چیز خدا کی طرف سے ہوگی اس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانے میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے مصنف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو او جھل رہ گیا۔۔۔ ان کے (علمی قیاسات) غلط ہونے کا اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا، اور تاریخِ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو بالآخر غلط ثابت نہیں ہوئے ہیں۔علامہ اقبال فرماتے ہیں : عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد

سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

اسلام کا نقط نظر یہ ہے کہ علمِ حقیقی (یا حتمی اور قطعی سچائی) کا سر چشمہ باری تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس نے اپنے علم سے انسان کو اتنا ہی معمولی سا حصہ بخشا ہے جتنا وہ چاہتا ہے: "جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے او جھل ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے اور لوگ اس کے علم میں کسی

چیز پر بھی حاوی نہیں ہو سکتے بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا
چاہے" (البقرہ: ۲۵۵)۔اس طرح جو حقائق علم حقیقی کے سرچشمہ یعنی باری تعالی کی
جانب سے وحیِ الٰہی یا اس کے پیغمبر کی منصوص سنت کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے
ہیں اور ان کے ماسوا دنیا میں حقیقت کے (absolute truth) ہیں وہ حتمی صداقت
جتنے دعوے پائے جاتے ہیں، اگر وہ وحیِ الٰہی سے متصادم ہیں تو وہ باطل مطلق
ہیں ۔اس پورے پس منظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ (absolute false)
دقیانوسیت کی نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ ہی وجود!

!کل سے سبق لیتے ہوئے آج کی فکر کی جانی چاہیے

711ء کا واقعہ ہے جب طارق بن زیاد نے صرف سات ہزار مسلمان سپاہیوں کے ساتھ اندلس میں قدم رکھا اور وہ عظیم واقعہ نمودار ہوا جس نے تاریخ رقم کی۔ اندلس سمندر کے کنارے پر تھا اور آنے والی فوج پانی کے راستے آئی تھی، لہٰذا طے ہوا کہ یا تو فتح حاصل کریں گے یا پھر جام شہادت گلے لگائیں گے۔ لہٰذا جن کشتیوں سے سمندر عبور کیا تھا انہیں جلا دیا گیا۔ وادی لکتہ کے پاس ایک لاکھ عیسائیوں اور بارہ ہزار مسلمانوں کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ لیکن جلد ہی طارق محلاتی سازشوں کا شکار ہوا۔ اور وہ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد جنھوں نے اندلس فتح کیا تھا دربار خلافت میں ذلیل ہوئے۔ بعد میں عبد العزیز بن موسیٰ نے اندلس کی فوج کی کمان سنبھالی اور انتہائی مضبوط قلعے تسخیر کیے، لیکن اسے بھی حاسدوں کا شکار ہونا پڑا اور خلیفہ سلیمان نے حکم دیا کہ عبدلعزیز کا سر کاٹ کر دمشق روانہ کیا جائے۔ جرم یہ تھا کہ اس نے قانون بنایا تھا کہ اگر کوئی عیسائی غلام اسلام قبول کرلیتا تو اسے آزاد سمجھا جاتا اور اس کی آزادی کی ضمانت حکومت دیتی۔ اُس زمانے میں بے شار غلام تھے چنانچہ اس کے چند روزہ دور میں اندلس کی مقامی آبادی کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ پھر یہ قتل دار الحکومت دمشق کی خلافت کے دائرہ اثر سے باہر نکلنے کا ذریعہ

بنا۔اور ساتھ ہی یمانی، قیسی، بربروں کے درمیان نہ صرف تنازعات اٹھ کھڑے ہوئے بلکہ مسلمانوں کے اندر ہی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ایسے موقع پر عیسائی غور سے اِس منظر کو دیکھتے رہے۔وہ کبھی کسی فریق کا ساتھ دیتے کبھی کسی کا۔یہاں تک کہ عبدالرحمٰن سوم کا سنہری دور آیا لیکن انہیں بھی اپنے دور میں عیسائی باغیوں اور فتنہ انگیزوں کے خلاف مسلسل کاروائی میں مصروف رہنا پڑا۔علاوزہ ازیں اب مسلمان اندلس صرف اپنے دفاع میں لگے تھے،انہیں قدرت نے تبلیغ اسلام و توسیع سلطنت کا موقع دیا لیکن افسوس انہوں نے یہ موقع کھو دیا تھا۔عبدالرحمٰن سوم ہی کے دور میں مشہور جنگ الخندق میں مسلمانوں کو شدید ترین نقصان پہنچا۔جنگ عیسائیوں کے قلعہ سموار کے قریب ہوئی،اور تقریباً پچاس ہزار مسلمان خندق میں گر کر ڈوب گئے اور بھاگنے والے قتل ہوئے۔آخری ایام میں اموی خلیفہ ہشام ثانی اپنے حاجبوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہا۔حکومت ان کے حاجب چلاتے اور وہ خود شراب کی لذتوں میں غرق رہتا۔حاجب عبدالرحمٰن نے تو باقاعدہ لکھوالیا کہ وہ حکومت کرنے کا اہل نہیں رہا، اس لیے تمام اختیارات خلافت حاجب کو منتقل ہو گئے اور وہ نااہل بلآخر قتل کر دیا گیا۔

یہ صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جبکہ اندلس میں مسلمانوں کے اقبال کا سورج نصف انہار تک پہنچا ہوا تھا۔نہ اس دور سے پہلے اور نہ ہی بعد میں وہ عروج حاصل ہوا جو اُس وقت موجود تھا۔لوگ مادی اعتبار سے خوشحال تھے، تجارت ترقی پر

تھی،آبادی مہذب تھی، شہروں میں تفریح گاہوں اور باغوں کی کثرت تھی، غرناطہ، قرطبہ، بلنسیہ، اشبیلیہ، طلیطلہ کے شہر اپنی مثال آپ تھے۔وادی الکبیر کے دونوں طرف تیس میل تک میوہ دار درخت ملک ملک سے منگوا کر لگائے گئے تھے۔دارالحکومت قرطبہ کی تو شان ہی کچھ اور تھی۔آبادی ایک ملین تھی، مکانات کی تعداد بیس ہزار، مساجد تین ہزار تھیں، حمام تین سو کے قریب تھے۔اسی طرح ایک اور خوبصورت مضافاتی بستی الزھرا تھی جہاں شاہی محلات تھے۔شاہی لائبریری میں چھ لاکھ تک جلدیں موجود تھیں، جامع مسجد قرطبہ اپنی وسعت اور خوبصورتی میں بے مثال تھی، اس کی چھت چودہ سو ستونوں پر کھڑی تھی، یہاں بہترین یونیورسٹی قائم تھی جہاں دنیا کے کونے کونے سے علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھانے آتے۔اس سب کے باوجود بدقسمت مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ انعامات کی قدر نہ کی، خوشحالی اور مادی عروج کے خوشنما مناظر میں گم ہو کر وہ ایسے غافل ہوئے کہ اپنے اصل مقصد کو فراموش کر بیٹھے۔اور محض امن وسکون کی خاطر متعصب عیسائی حکمرانوں کی من پسند شرائط پر دوستی کے معاہدے کرنے والے (حالانکہ اُن عیسائی حکمرانوں نے ہمیشہ ان معاہدوں کی خلاف ورزی کی) مسلمان حکمرانوں کی غلطیوں، مقاصد سے انحراف اور عیش پسندی کی بہت بڑی سزا ملی۔نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ امراء نے بغاوت کرکے خودمختار سلطنتیں قائم کرلیں جو خود ہی ایک دوسرے سے آپس میں لڑتے رہتے۔آخرکار مسلمان اندلس بھر سے، سمٹ سمٹا کر غرناطہ کی آخری مسلمان ریاست کی حدود میں جمع ہو

گئے۔ اتنے چرکے سہنے کے بعد ان میں بربر و عرب کا امتیاز مٹ چکا تھا، انہوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ دشمن کے نزدیک نہ وہ عرب تھے، نہ بربر، نہ یمانی، نہ شامی، فقط مسلمان تھے، اور یہی ان کا قصور تھا۔ لیکن دشمن سے رحمدلی کی امیدیں وابستہ کرنے والوں کو وقت اور تقدیر نے کبھی نہیں بخشا۔ جب مواحدین کی خلافت ختم ہوئی اور اسلامی اندلس کی مختلف چھوٹی بڑی مملکتیں آپس میں ٹکرانے لگیں تو انہیں اسی قسم کی غلط فہمی ہوئی تھی، یہ غلط فہمی اس وقت دور ہو گئی جب دشمن نے لالچ، جھانسہ اور سازش کے بعد ایک کے بعد دوسری ریاست کو تر نوالہ بنانا شروع کیا۔ اندلس کے مسلمانوں پر فتنوں کی ژالہ باری شروع ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی دنیا میں بھی دوزخ کا نقشہ قوموں کو دکھایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "یہی وہ دوزخ ہے جس کے متعلق تمہیں بتا دیا گیا تھا" (القرآن)۔

اور پھر اپنے آخری سو سالوں میں غرناطہ کے حکمرانوں نے طاقتور عیسائی حکمرانوں کی زیادہ سے زیادہ خوشامد اور نئے سے نئے ایسے معاہدے کر کے اپنے اقتدار کا بچاؤ کیا جن میں غیرت اسلامی کو داؤ پر لگا دیا گیا۔ امیر یوسف محمد ابن الاحمر نے جب محمد ہشتم کی فوج کو شکست دے کر غرناطہ میں قدم رکھا تو اس نے اپنا فرض سمجھا کہ اپنے عیسائی آقاؤں کو اپنی وفاداری کا یقین دلائے تاکہ انہیں ان کی طرف سے کسی قسم کی شکایات کا موقع نہ ملے۔ چنانچہ اس

نے عیسائی حکمرانِ قسطلہ کو خط لکھا: "میں یوسف محمد ابن الاحمر بادشاہ غرناطہ تمہارا مطیع وفرمانبردار، عقیدت و نیاز مندی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں سیدھا غرناطہ آیا اور یہاں کے تمام امراء اور علمانے مجھ کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا، یہ دن مجھ کو خدا کے فضل اور تمہاری عنایت و مدد سے نصیب ہوا ہے"۔ یہاں تک کہ غرناطہ کی کشتی میں جگہ جگہ سراخوں نے بڑے شگاف کی شکل اختیار کر لی۔اور ان حالات میں غرناطہ ایک طرف نزع کی حالت میں آخری ہچکیاں لے رہا تھا تو وہیں مسلمان عظیم المیے سے بے خبر آپس میں لڑ رہے تھے۔ سکرات موت تک کی کہانی میں کوئی نئی بات نہ تھی، وہی کچھ ہوا جو ہمیشہ کسی قوم کو مرگ کے جانگسل لمحے میں پیش آتا رہا ہے۔1489ء میں فرڈی نینڈ نے قلع بسط کا محاصرہ کیا۔ مسلمانوں نے مختصر مزاحمت کے بعد یہ قلعہ عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔فرڈی نینڈ نے وعدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کے جان ومال کو نہیں چھیڑا جائے گا لیکن طاقتور معاہدوں کی کب پروا کرتے ہیں۔فرڈی نینڈ نے قلعہ میں داخل ہو کر قتل عام کا حکم دیا اور مسلمانوں کی تمام جائیداد حملہ آوروں میں بانٹ دی۔اب اسی غرناطہ میں مسلمان محاصرے میں تھے۔ابو عبداللہ پر ملکہ ازابیلا اور فرڈی نینڈ کے ٹڈی دل متحدہ لشکر کی یلغار ہو چکی تھی۔یہ وہی ابو عبداللہ تھا جس نے باپ کے خلاف اقتدار کے لالچ میں بغاوت کی تھی، چچا الزاغل کے ساتھ جنگیں لڑی تھیں، مسلمانوں کو آپس میں لڑایا تھا،ہمیشہ عیسائیوں سے مدد کی بھیک مانگتا رہا تھا اور اب وہی عیسائی حقِ ہمسائگی اچھی طرح ادا کرنے کے

لیے غرناطہ کے قلعہ کے درازوں پر دستک دے رہے تھے۔ عیسائیوں نے مجبور نہیں کیا تھا لیکن ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن ابو عبداللہ نے ساٹھ دن کی مقررہ معیاد سے پہلے ہی 2 جنوری 1492ء کو غرناطہ دشمن کے حوالے کر دیا۔ یکم جنوری اور 2 جنوری کی درمیانی شب مسلمانوں کے لیے قیامت کے مناظر کی رات تھی تو وہیں ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کے لیے یہ عید کی رات تھی۔ مصنف ایس پی اسکاٹ لکھتا ہے: 2 "جنوری 1492ء کی تاریخ میں جب شاہی خاندان اپنا زرق برق لباس پہنے مسرت نعروں کے ساتھ قصر الحمرا کی طرف بڑھا تو الحمرا کا دروازہ آہستگی سے وا ہوا۔ چند خوبصورت نوجوان گھوڑوں پر سوار آداب بجانے کے لیے آگے آئے، انہوں نے رنگا رنگ ریشمی ملبوسات پہن رکھے تھے۔ ان کے ہتھیاروں اور زرہ بکتروں میں جواہرات چمک رہے تھے۔ ان استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے بدقسمت ابو عبداللہ اور باقی سب اس کے امرا تھے"۔ آج فاتحِ غرناطہ کو قصر الحمرا میں داخل ہوتے دیکھ ابو عبداللہ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور اس کے گھوڑے کی باگ تھام لی، ساتھ ہی اندلس کی آٹھ سو سالہ اسلامی روح پرواز کر گئی۔ غرناطہ کی چابیاں کانپتے ہاتھوں سے دشمن کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ابو عبداللہ نے کہا: "یہ چابیاں اندلس میں عربوں کی حکمرانی کی آخری نشانی ہیں، آپ انہیں لے لیجیے کیونکہ خدا کی مشیت کے مطابق ہمارا ملک، مال اور جانیں سب آپ کی ملکیت میں ہیں"۔

واقعہ بطور تاریخ دانی نہیں پیش کیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ملت آج جس بے راہ روی میں مبتلا ہے، بے مقصدیت جس کی پہچان ہے، اور اسلام اور اسلامی تعلیمات سے دوری جس کی "شان" بنی ہوئی ہے، اس پر توجہ دی جائے۔ لازم ہے کہ اسلامی تعلیمات سے نہ صرف واقف ہوا جائے بلکہ عمل بھی کریں۔ ساتھ ہی اُن پیاسی روحوں کو اسلامی تعلیمات سے سیراب کیا جائے، جو مکتی کی آس میں معلوم نہیں اس ملک میں کیا کچھ کرتے ہیں۔ کیونکہ مادی وسائل نہ کل کارآمد ہوئے اور نہ ہی آج کارآمد ثابت ہوں گے، جبکہ اسلامی اخلاق و اقدار کے فروغ میں فرد واحد اور بحیثیت پوری ملت سعی و جہد میں مصروف عمل نہ ہو جائے۔ لہذا کل سے سبق لیتے ہوئے آج کی فکر کی جائے۔ فکر کا پہلا قدم اسلامی تعلیمات سے وابستگی و عمل ہے۔ تو وہیں دوسرا قدم قیام عدل کے لیے اپنی تن آسانیوں کو قربان کرنا ہے۔ ممکن اس طرح نفرتوں کی دیواریں ٹوٹیں، آپسی محبت و اعتماد پروان چڑھے اور بحیثیت انسان بلا امتیار مذہب و ملت ہم دوسروں کے لیے کارآمد ثابت ہو جائیں!

گھر واپسی' یا مقصد سے وابستگی'!

انسان کی سرگرمیاں واضح کرتی ہیں کہ اس کی زندگی کا مقصد و نصب العین کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی یہ سرگرمیاں خاموشی کے ساتھ ، ہلکے انداز میں تو کبھی بہت کھل کر منظم انداز میں انجام دی جائیں۔ سرگرمیوں کا دائرہ اور طریقہ کار کیا ہوگا یہ فرد یا گروہ پر منحصر ہے۔ پھر سرگرمیاں انجام دیتے ہوئے دیگر افراد و گروہ کے جذبات کا خیال رکھا جائے گا یا نہیں؟ حقوق جن کی ضمانت ملک کے آئین میں درج ہے، مقاصد کے حصول میں وہ پامال کیے جائیں گے یا نہیں؟ کوئی ایسا عمل یا طریقہ تو نہیں اختیار کیا جائے گا کہ جس سے امن و امان متاثر ہو، آپسی محبت اور بھائی چارے کا خاتمہ ہو، یا پھر فرقہ وارانہ ہم آہنگی جو برقرار ہے اس پر زد پڑے، یہ اور اِن جیسے تمام معاملات کے صوابدید وہ افراد و گروہ ہیں جو ایک مخصوص مقصد و نصب العین کے لیے مجتمع و سرگرم عمل ہوئے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ مقصد و نصب العین سے لگاؤ ہے، طریقہ کار جو طے کیا گیا ہے اس پر حد درجہ اعتماد ہے، فکر اور نظریہ کے فروغ میں منزل مقصود پر غیر متزلزل نگاہ، اور کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے نصب العین کی جانب پیش قدمی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔ یہ تمام باتیں مل کر فرد و گروہ میں خود اعتمادی بحال کرتی ہیں۔ لہٰذا ایسے افراد منزل کی جانب جب قدم بڑھاتے ہیں تو ہر لمحہ اور ہر

لحظہ وہ ان رکاوٹوں کو بھی خوب اچھی طرح سے محسوس کرتے ہیں جو کل ان کی راہ میں مشکلات بن کر سامنے آنے والی ہیں۔یہی وہ شعور نصب العین ہے جو زندگی ہی میں فرد و گروہ کو کامیابی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔کچھ ایسے ہی مقاصد موجودہ ہندوستان کی حالیہ حکومت کے بننے سے قبل اور اس کے بعد مخصوص فکر و نظریہ سے وابستہ افراد کے دل و دماغ میں سمائے ہوئے ہیں،جس کی جانب وہ لگاتار پیش قدمی کیے جارہے ہیں۔

گفتگو کا پس منظر گزشتہ دنوں آگرہ کی ایک کچی بستی میں رہنے والے تقریباً 50، غریب مسلمان خاندانوں کو 'گھر واپسی' کے نام پر ہندو بنانے کا دعویٰ ہے۔تقریب کی تصاویر اخبارات میں شائع ہوئی تھیں جن میں ٹوپی پہنے ہوئے کچھ مسلمان ایک ہندو مذہبی تقریب میں حصہ لیتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔جس کے بعد پارلیمنٹ میں زبردست ہنگامہ ہوا اور حزب اختلاف کی جماعتوں نے حکمراں بی جے پی پر ملک کے سیکولر اصولوں سے کھلواڑ کرنے کا الزام لگایا۔برخلاف اس کے جن مسلمانوں کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ انھوں نے خود اپنی مرضی سے ہندو مذہب قبول کیا تھا،ان کا اب الزام کہ انھیں دھوکے سے تقریب میں بلایا گیا تھا اور تنظیم کے مقامی رہنماؤں نے انھیں راشن کارڈ اور شناختی کارڈ بنوانے کا لالچ دیا تھا۔وہیں دوسری طرف بجرنگ دل کے مقامی رہنما 'اجو چوہان کا کہنا ہے مسلمانوں نے اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کیا تھا اور اب وہ 'خوف

کی وجہ سے ان پر الزام لگا رہے ہیں۔اس کے برعکس مقامی مسلمانوں کا کہنا ہے کہ وہ خوف کی وجہ سے تقریب میں شریک ہوئے تھے اور انھیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ انھیں ہندو بنایا جارہا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ کوڑا اٹھانے کا کام کرتے ہیں اور تعلق مغربی بنگال اور بہار سے ہے۔ ضلعی انتظامیہ نے اس سلسلے میں ایک مقدمہ قائم کیا ہے کیونکہ ملک میں لالچ دے کر مذہب تبدیل کرانا ایک جرم ہے اور مذہب تبدیل کرنے سے پہلے ضلعی انتظامیہ کو مطلع کرنا ضروری ہے۔وہیں دوسری طرف ایسی ہی ایک مزید تقریب کے انعقاد کی تیاریاں جاری ہیں۔اور اسی سلسلے میں سرگرم وشو ہندو پریشد کے برج صوبے کے صدر پرمود جاجو کا کہنا ہے کہ علی گڑھ میں مجوزہ کرسمس کے موقعہ پر منعقد ہونے والے پروگرام کو تبدیلی مذہب کہنا غلط ہے۔کیونکہ ہم صرف ان لوگوں کو واپس بلا رہے ہیں،جو پہلے مختلف وجوہات کی بنا پر ہندو مذہب کو چھوڑ کر گئے تھے۔لہٰذا یہ گھر واپسی کا پروگرام ہے۔پروگرام کے تعلق سے تیاری یہ ہے کہ اگر حکومت پروگرام پر پابندی لگاتی ہے اور ہندو رہنماؤں کی گرفتاری ہوتی ہے،تب بھی پروگرام میں لوگ پہنچیں گے۔اس کے لیے دو دو تین تین ٹیمیں تیار کی جارہی ہیں۔چاہے شکل بدل کر جانا پڑے یا دیگر کسی بھی طرح،مگر پروگرام ضرور ہوگا۔ایک لمحہ کے لیے ٹھہریں اور توجہ فرمائیں کیا یہ دل و دماغ پر چھائی دھن نہیں؟جس کا گرچہ طریقہ بھی غلط اور مقصد بھی غلط،اس کے باوجود منظم منصوبہ بندی اور حد درجہ مقصد سے وابستگی نے افراد و گروہ کو

حوصلہ بخشتا ہے، یہاں تک کہ وہ ہر مسئلہ سے الجھنے کے لیے قبل از وقت اپنے آپ کو تیار پاتے ہیں۔

چونکہ گفتگو "گھر واپسی" کی ہو رہی ہے، لہٰذا یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ جن لوگوں کو وہ گھر آنے کی دعوت دے رہے ہیں، یا دیگر مذاہب کے لوگوں کو ایک بار پھر، بقول شخصے گھر واپسی کروائی جا رہی ہے، اس گھر واپسی میں، گھر سے بھاگنے اور گھر چھوڑنے کی اصل وجہ کیا ہے؟ یہ جاننا اس سے زیادہ اہم ہے، کہ 'انہیں' گھر واپسی کروائی جائے۔ تصور کریئے ایک ایسے گھر کی، جو صرف تصورات میں موجود ہو لیکن حقیقت میں وہ گھر ہو ہی نہیں۔ جس طرح انٹرنیٹ کی تصوراتی دنیا میں آپ کے دوست احباب کی ایک طویل فہرست موجود ہے، لیکن جب جنازہ اٹھایا جائیتو اس طویل فہرست کے احباب میں سے کوئی بھی آپ کو کاندھا دینے والا نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح وہ گھر جس میں واپسی کی بات کہی جا رہی ہے، جنازہ دفن ہونے کے بعد، اچانک اس تصوراتی گھر کا غائب ہو جانا یا وجود ہی نہ پایا جانا۔ اگر یہی گھر واپسی ہے، تو ایسے گھر میں واپسی کا کیا حاصل؟ لیکن معاملہ درحقیقت یہ نہیں ہے، معاملہ تو پیٹ سے وابستہ ہے، اور وہ بھی ایسے شکست خوردہ بھوک کے ماروں کا جن کے دن کا آغاز و اختتام ہی روٹی کے چند ٹکڑوں سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جب "انہیں" معمولی درجے کے سہارے دینے کے وعدے کیے گئے، تو انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ ان کے سروں کو ٹوپیاں سے

کیوں ڈھانکا جارہا ہے، وہ اس ہون میں گھی اور تیل کیوں چھڑک رہے ہیں جو ان کے شب وروز کا حصہ نہیں، وہ کیوں ایسے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں جو ان سے مخلصانہ ہمدردی رکھتے ہی نہیں۔ وہ تو صرف بھوک وپیاس کے مارے ہوئے تھے، گندگی اور کوڑے کی بدبو دن رات برداشت کرنے والے، حقیقی زندگی کی خوشبوئیں سے محروم تھے۔ سورج کی تیز تپش اور قلب وروح تک کو منجمد کرنے والی ٹھنڈ، جن کے دلوں اور دماغوں کو منجمد کرچکی ہو وہ کیا جانیں "تشخص" کس بلا کا نام ہے۔اس سب کے باوجود جب حقیقت سے وہ واقف ہوئے، تو وہ بے چین اور بے قرار ہو گئے۔ رب العالمین کے سامنے روئے اور گڑگڑائے، جو غلطی ناواقفیت کے بناپران سے سرزد ہو گئی تھی اس کی تلافی کے لیے دعائیں کیں، بلاآخر ڈھونگ سے پردہ اٹھ گیااور حقیقت پوری طرح آشکارا ہوئی۔اس موقع پر بات یہیں ختم نہیں ہوتی، سوال یہ بھی اٹھنا چاہیے کہ جس ملت کا وہ سرمایہ ہیں، کیا وہ ملت ان پر توجہ دے رہی ہے؟ قوم وملت کے جیالے، اُن لوگوں کے خلاف محاذ کھولنے کو تیار ہیں، جو ملت کے افراد کو کبھی ڈرادھماکر تو کبھی لالچ دے کر، 'گھرواپسی' کی بات کرتے ہیں۔ لیکن اِس ملت کے وہ خوشحال افراد جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے بے انتہا نوازا ہے، نعمتوں کا ایک حقیر حصہ بھی بھوک وپیاس اور گھروں سے محروم لوگوں پر خرچ کرنے کو تیار نہیں۔ہاں اگر ان کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے تو پہلے وہ خدا کے عطا کردہ جسم اور اس کی توانائیوں پر ایک طویل لیکچر دے کر خوب ذلیل کرتے ہیں، اور بعد میں حقارت

بھری نظروں کے ساتھ روپیہ دو روپیہ تھماتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ توجہ فرمائیں اللہ کی نظر میں ذلیل و حقیر کون ہے؟ وہ جو وسائل زندگی سے محروم ہیں یا وہ جو سب کچھ رکھنے کے باوجود، محرومین و مستحقین کو نہ کچھ دینے کو تیار ہیں اور نہ ہی ان کے لیے کچھ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟ اور یہ کچھ دینا اور کرنا، صرف مال و دولت سے ہی متعلق نہیں ہے، بلکہ اللہ کی عطا کردہ وہ تمام نعمتیں اس میں شامل ہیں جنہیں ہم، وقت، صلاحیت، اثر و رسوخ اور علم و ہنر وغیرہ سے جانتے ہیں۔ کیا کوئی ایسا ہندوستان میں مسلمان ہے جو لینے والوں کی بجائے دینے والوں میں شمار ہوتا ہو، جس کا ہاتھ نیچے والوں کی بجائے اوپر والوں میں ہو، اور پھر بھی وہ، محرومین و مستحقین کے لیے کچھ نہ کرسکے؟ نہیں ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔ چاہے وہ مرد ویا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، اگر اللہ نے اسے اوپر ہاتھ والوں میں شامل کیا ہے، تو وہ بہت کچھ کرسکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اپنے آس پاس نگاہ دوڑائی جائے، حقیقت سے واقفیت حاصل کی جائے، اسلام سے شعوری وابستگی اختیار کی جائے، اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم عمل ہوا جائے۔ لیکن کچھ عرصہ مزید ایسا نہیں کیا گیا تو وہ دن بھی دور نہیں جبکہ چیخنے چلانے والے گلے مدھم پڑجائیں، جو نعمتیں میسر ہیں وہ واپس لے لی جائیں، اور چند لمحے نہیں گزریں کہ اوپر والے ہاتھ نیچے اور دینے والے ہاتھ مانگنے والوں میں شمار ہوجائیں۔ کیونکہ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی، اور جن مشکلات میں انسان دوچار ہوتا ہے، درحقیقت وہ اس کے اپنے ہی اعمال ہوتے

ہیں، جو اسے بلندیوں سے پستیوں میں اور عزت سے ذلت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ نیز آزمائشیں اور مشکلات جن سے انسان دوچار ہوتا ہے وہ بھی خود اسی کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔یہی بات اللہ تعالی قرآن حکیم میں فرماتا ہے: "اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جارہا ہے انہی اعمال کا دیا جارہا ہے جو تم کرتے رہے ہو" (الصّٰفّٰت: ۳۹)۔ لہٰذا ہر دو پہلوؤں پر توجہ دی جانی چاہیے۔ضرورت مندوں کی مدد اور ذلت و پستی سے نکالنے کی منظم سعی و جہد کے ساتھ بندگان خدا کو اسلام سے شعوری واقفیت پہنچائی جائے۔سب سے پہلے واقعہ کے پس منظر میں متاثرہ افراد اور ان جیسے دیگر افراد کو ہدف بنایا جائے ساتھ ہی بلا تفریق مذہب و ملت تمام انسانوں کی " حقیقی گھر واپسی" کرائی جائے۔ ممکن یہ عمل اللہ کو پسند آجائے اور ذلت و خواری سے اللہ ہمیں محفوظ کر دے!

! خوشحالی وترقی یا تنزلی میں گامزن ہندو پاک

درحقیقت ہندوستان و پاکستان دو الگ ملک ہیں۔اس کے باوجود کبھی ایک ہونے کے نتیجہ میں ،دونوں ہی میں بہت سی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔یہ مماثلتیں جہاں مثبت ہیں وہیں منفی بھی ہیں۔ منفی مماثلتوں میں غربت،جہالت اور ظلم وزیادتیاں عام ہیں۔اسی کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ دنوں پشاور،پاکستان کے آرمی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والے معصوم طلبہ پر جان لیوا حملہ ہوا،جو انتہائی قابل مذمت ہے۔مذمت کی ایک وجہ نہتے بچوں پر حملہ ہے تو وہیں دوسری طرف وہ بچے علم کے حصول میں سرگرداں تھے۔ جس کے لیے خود نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین کی ہے۔ایک ایسے عمل میں مصروف بچے جو دینی اعتبار سے بھی قابل قدر ہے،چند لوگ جان لیوا حملہ کریں، بچوں کی معصومیت ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہ رکھے،پھر بھی انہیں غلط نہ کہا جائے ،یہ ممکن ہی نہیں ہے۔لہذا سانحہ کے بعد ہندو پاک کے تمام مسلم قائدین نے متفقہ طور پر نہ صرف حملہ کو غیر اسلامی،غیر شرعی اور انسانیت سوز کہا بلکہ ایسے لوگوں کو مکمل سزا دی جائے،اس کی بھی اپیل کی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں اسلام اور اسلامی تعلیمات سے لاتعلقی ایک عام بات ہو گئی ہے۔وہیں دوسری طرف اسلامی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا،اس کی تفہیم و تشہیر غلط انداز سے کرنا،اور عمل کے معاملہ میں بالکل ہی منفی رویے

اختیار کرنا، نہ صرف اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ بن رہے ہیں بلکہ غلط فہمیوں کے فروغ میں بھی کارگر ثابت ہو رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ عمل انہیں مقاصد سے کیا گیا ہو یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ متعلقہ افراد حقیقی اسلام ہی سے نابلد ہونے کے نتیجہ میں کسی اور کا لقمہ تر بنے ہوئے ہوں۔کچھ ایسے لوگوں کا لقمہ تر جن کے وجود کا مقصد ہی

اسلام،اسلامی تعلیمات اور اس کے فروغ میں رکاوٹیں ڈالنا ہے۔اس واقعہ اور ان جیسے دیگر واقعات کے پس منظر میں لازماً اس جانب بھی توجہ دینی چاہیے کہ کس طرح یہ ممکن ہے کہ چند لوگ اسلام کا نام لے کر ہر دو محاذ پر مسلمانوں کے قتل عام میں مصروف ہیں؟کیونکہ جن لوگوں نے یہ واقعہ انجام دیا،بقول شخصے وہ ان پر جاری ظلم کا بدلہ تھا،لیکن بدلہ کس سے لیا جائے اور کس سے نہیں،کیا انہیں نہیں معلوم کے اسلام اس کی واضح تعلیمات رکھتا ہے۔بدلہ تو صرف اُس شخص ہی سے لیا جا سکتا ہے جس نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے،وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ہی نہیں ،ان سے کیونکر بدلہ لیا جائے گا؟اس پس منظر میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس حملہ کے پیچھے بھی غیر اسلامی سوچ کرفرما رہی ہے۔ اور وہ لوگ جو بظاہر اسلام کا نام لے کر یہ اور ان جیسے دیگر غیر شرعی و غیر اسلامی کاموں میں ملوث ہیں وہ نہ اسلام اور نہ ہی مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں۔بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود اُن لوگوں کی مدد کر رہے ہیں جو اسلامی نظام اور اسلامی تعلیمات سے بغض رکھتے ہیں۔

دوسری جانب ہندوستان میں ٹھیک تحفظ اقلیت کے عالمی دن کو مناتے ہوئے ایک طرف حکومت ہند، اقلیتوں کی ترقی و خوشحالی کی بات کرتی ہے۔تو دوسری جانب دھرم جاگرن سمیتی کے علاقائی سربراہ راجیشور سنگھ کھلے عام کہتے ہیں کہ 31دسمبر 2021ء سے قبل ،ملک مسلمانوں اور عیسائیوں سے پاک ہو جائے گا۔وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے بتاتے ہیں کہ ان کی تنظیم نے اب تک تین لاکھ مسلمانوں اور عیسائیوں کو دوبارہ ہندو بنایا ہے۔اور ان کی تنظیم ملک کو 'ہندو راشٹر' بنانے کے لیے پر عزم ہے۔ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمان یا عیسائی بننے والوں کے لیے ہمارے دلوں میں نرم گوشہ ہے اور ان کو دوبارہ ہندو مذہب اختیار کرنے کے لیے تمام سہولیات دی جائیں گی۔دوسری جانب آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اسسٹنٹ جنرل سکریٹری محمد عبدالرحیم قریشی کہتے ہیں کہ سنگھ پریوار دراصل ان پروگراموں اور بیانوں کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ملک کے عوام اور بالخصوص مسلمانوں کی جانب سے یہ مطالبہ اٹھے کہ تبدیلی مذہب کو منع کرنے کا قانون بنایا جائے کیونکہ سنگھ پریوار جانتا ہے کہ کائنات کو پیدا کرنے والے کی عبادت کرنے والا کبھی کسی آدمی ، کسی پتھر یا کسی مورتی کی عبادت کا قائل نہیں ہوسکتا۔جانتا ہے کہ بہت سے ہندو اسلام کی صداقت اور سچائی سے متاثر ہوکر ہندو دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کر رہے ہیں۔دراصل اس کو روکنا سنگھ پریوار کا مقصد ہے اور اسی لیے یہ فضا پیدا کی

جا رہی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ تبدیلی مذہب پر ہم کوئی پابندی نہیں چاہتے۔ اگر کوئی شخص جس کا نام مسلمانوں جیسا ہو، بغیر دباؤ اور بغیر لالچ کے اپنی مرضی اور خوشی سے ہندو بنتا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ کیونکہ ہم کو یقین کامل ہے کہ مسلمان صرف اپنے پیدا کرنے والے یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ لہٰذا ایک مخلوق دوسری مخلوق کی عبادت پر کبھی بھی آمادہ نہیں ہو سکتی۔ وہیں دوسری طرف اجودھیا کے بڑے سادھوؤں نے آر ایس ایس اور اس سے متعلق تنظیموں کی طرف سے جبراً تبدیلی مذہب کرانے پر نہ صرف سخت اعتراض کیا ہے بلکہ کہا ہے کہ ان حرکتوں سے ملک میں تقسیم کی سیاست کو تقویت ملے گی۔ یہ بات بھی آپ کے علم میں رہنی چاہیے کہ آل انڈیا اکھاڑہ پریشد میں کل ۱۳،اکھاڑے شامل ہیں .جس میں ۷،شیو، ۳ ،ویشنو اور ۳،سکھوں کے ہیں.کونسل کے [illegible] شمار اجودھیا کے سب سے زیادہ با اثر سادھوؤں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ مذہب ایک ذاتی عقیدہ ہے، کسی کو اس میں مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے۔ آر ایس ایس اور اس سے منسلک ونگ اقلیتوں کی جبراً تبدیلی مذہب کروا کر سخت جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہ مجرم ہیں اور ان پر ایف آئی آر درج ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کے تعلق سے تصویر کا یہ دوسرا رخ ہے۔ جس کی نہ صرف تعریف کی جانی چاہیے بلکہ اس غلط فہمی کو بھی دور کرنا چاہیے کہ ، ہندوستان کا رہنا والا ہر ہندو فرقہ پرست ہے اور اقلیتوں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ یہاں اسی ملک میں ایسے بے شمار ہمارے غیر مسلم دوست و احباب اور

برداران وطن موجود ہیں،جو فرقہ پرستی کو نہ صرف برا سمجھتے ہیں بلکہ اس کے خلاف کھلے عام اپنی آواز بھی بلند کرتے ہیں۔

ہند و پاک کی ان دو صورتحال کے پس منظر میں اگر یہ بات سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ یہ ممالک ترقی و خوشحالی کی جانب گامزن ہیں یا تنزلی کی طرف۔تو اس سے قبل یہ جاننا اہم ہوجائے گا کہ ترقی و خوشحالی دراصل ہے کیا؟ہمارے خیال میں کسی بھی ملک کے نظم و نسق،ترقی و خوشحالی اور ارتقاء کو سمجھنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ متعلقہ ملک میں اقلیتوں اور سماجی اعتبار سے کمزور طبقات و گروہ کی صورتحال پر نظر ڈالی جائے۔اگر ملک کی اقلیتیں اور کمزور طبقات خوشحال ہیں،تو سمجھئے وہ ملک حقیقی ارتقاء کی جانب پیش رفت کر رہا ہے۔برخلاف اس کے وہ ملک انتشار میں مبتلا ہے اور مخصوص لوگوں کی ترقی یا خوشحالی اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ برسراقتدار گروہ یا افراد مستقبل میں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔اس موقع پر سوال یہ اٹھتا ہے کہ خوشحالی کیا ہے اور کیامیابی کس بلا کا نام ہے؟تو خوشحالی سے مراد،فرد یا گروہ کو ملنے والے وہ تمام اختیار ات ہیں جن کی بنا پر وہ ہمہ جہت ترقی کر سکیں۔اس ترقی میں بنیادی نکتہ مذہب پر عمل آوری واس کا قیام ہے تو وہیں نظریات کی ترسیل بھی دوسرا جز ہے۔دوسری جانب کامیابی سے مراد علمی ،فکری اور اخلاقی اقدار کا فروغ ہے۔پھر یہی وہ دو بنیادیں ہیں جن کی بنا پر زماں و مکاں کی قیود سے

باہر وسائل زندگی کو باخوبی استعمال کرتے ہوئے ہر ملک اپنی معیشت مستحکم کرتا ہے ساتھ ہی سائنس و ٹیکنالوجی کا بھی بھرپور استعمال کیا جاسکتا ہے۔برخلاف اس کے معاملہ قابل توجہ ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو حقیقی ترقی اور حقیقی کامیابی کے خواہاں ہیں۔ خوشحالی وکامیابی کے ان دو مفروضات پر آگے بڑھتے ہوئے موجودہ دور میں یا اس سے قبل ترقی یافتہ قوموں اور ملکوں پر نظر ڈالیں تو صاف محسوس ہوگا، کہ کہیں نہ کہیں ان دو بنیادی نکتوں کی بنا پر مختلف قومیں ، نظریات اور اس کے حاملین ترقی سے دوچار ہوئے تو وہیں اِن کو چھوڑنے یا نظر انداز کرنے کے نتیجہ میں ، تنزلی میں مبتلا ہوگئے۔اقتدار آیا اور گیا بھی، ملک فتح ہوئے اور چھینے بھی گئے ،غلازمی کی زنجیریں کبھی کٹیں توپھر بیڑیاں پہنائی بھی گئیں، یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ فرد و گروہ ایک حالت سے نکل کر دوسری حالت میں جاتے رہے۔ گفتگوکے پس منظر میں یہ سوال بھی اہم بن جاتا ہے کہ کیاایک کامیاب اور فاتح قوم ہمیشہ اُن اعلیٰ صفات سے متصف رہتی ہے ، جن کی بنا پر کسی زمانے میں وہ کامیابی سے دوچار ہوئی تھی ؟اس کا ایک جواب توابن خلدون نے قوموں کے عروج وزوال کے باب میں یہ دیا ہے کہ ہر فاتح قوم کے تین ادوار ہوتے ہیں۔پہلا وہ جبکہ وہ بے دریغ قربانیوں کے نتیجہ میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔دوسرا: کچھ عرصہ ہی گزرتا ہے کہ قربانیاں دینے والے آنکھوں سے

اوجھل ہونے لگتے ہیں اور موجودہ لوگ آسائش میں مبتلا ہو کر کامیابی کے سواد اعظم کو بھلا بیٹھتے ہیں۔اور تیسرا دور وہ ہوتا ہے جبکہ حقیر وذلیل لوگ مسندوں پر آبیٹھتے ہیں، یہ لوگ قربانیوں اور اعلیٰ صفات سے بالکل ہی نابلد ہوتے ہیں۔ ظلم وزیادتیوں کا دور دورہ ہوتا ہے اور ایک بار پھر کوئی دوسرا گروہ عظیم قربانیاں دیتے ہوئے کامیابی سے دوچار ہوتا ہے۔ابن خلدون کے تجزیہ کے علاوہ مختصر ترین دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بحیثیت قوم ایک گروہ کے معیار اخلاق میں جس رفتار سے تنزلی آتی ہے ٹھیک اسی رفتار سے کامیابی بھی ناکامی میں تبدیل ہوتی ہو جاتی ہے۔اخلاقی تنزلی کے باوجود مخصوص گروہ برسر اقتدار رہتا ہے یہاں تک کہ کوئی دوسرا گروہ اخلاقی اعتبار سے اس پر فوقیت حاصل نہ کرلے۔آج مسلمانوں کو اپنے اخلاقی معیارات پر لازماً توجہ دینی چاہیے۔کیونکہ یہی توجہ، غور وفکر،اور تبدیلی ،کل آپ کو ہر میدان میں کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ایک ایسی کامیابی جہاں ہر فرد امن وامان محسوس کرے گا!

! ہند میں زوال سے نکلنے کا راستہ

یہ احساس کہ ہندوستان انگریز کی غلامی سے نجات پا کر ایک فلاحی اسٹیٹ کی حیثیت سے تمام اقوام کی ترقی و خوشحالی کا ذریعہ بنے گا، ایک ایسا نظریہ تھا جس کی بنیاد پر ملک کے تمام ہی لوگوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت جنگ آزادی میں سعی و جہد کی تھی۔ لیکن جب آزادی نصیب ہوئی یا اس کے آثار نمایاں ہوئے تو ملک تقسیم کی باتیں کی جانے لگیں۔ بلا آخر اپنوں یا غیروں کے تعاون سے ملک تقسیم ہوا۔ ٹھیک اسی وقت ایک آواز یہ بھی آئی کہ ملک جن بنیادوں پر تقسیم کیا جا رہا ہے، وہ مناسب نہیں
ہے۔ دوسری طرف ملک کو غلامی سے آزادی دلانے میں ملک کی دونوں ہی اقوام ہندو مسلم ایک ساتھ سعی جہد میں مصروف تھے، اور غلام بنانے والوں نے دونوں ہی کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی ملک آزاد ہوا اور وہ کومن ایجنڈا مکمل ہوا، یعنی غلامی سے نجات کا ایجنڈا، ٹھیک اسی وقت یہ دو طبقات بھی الگ ہو گئے یا کروا دیئے گئے۔ اب ہندوستان میں اکثریت بحیثیت قوم ہندو ٹھہرے تو وہیں مسلمان اقلیت۔ پھر ایک قوم، ایک مقصد، اور غلامی سے نجات میں دونوں کی سعی و جہد اور قربانیوں کی لازوال داستانیں نہیں رہیں بلکہ معاملہ اب ایک ہی ملک میں اکثریت اور اقلیت میں بدل گیا۔ اور وہ جنہوں نے قوم پرستی کے اجتماعی

رویہ پر اپنی بنیاد رکھی تھی ، وہ قومی جنگ، جسے وہ بڑے جوش وخروش سے لڑرہے تھے، جن جمہوری اصولوں پر ہندوستان کا سیاسی ارتقاجاری تھا،اور مسلمانوں نے قومی حیثیت اختیار کرتے ہوئے جن مطالبات کی فہرست تیار کی تھی،وہ پوری تصویر وقت کے ساتھ ساتھ دھندلی ہوتی گئی۔یہاں تک کہ وہ پورا پس منظر ہی غائب کیا جانے لگاکہ جس میں ہندواور مسلمان ایک ساتھ ایک ہی جوش وجذبہ سے سرشار غلامی سے نجات میں سرگرداں تھے۔پھر یہ کوششیں مزید تیز ہوئیں یہاں تک کہ مسلمانوں کو اب مکمل طور پر ہی منظر نامہ سے غائب کیا جانے لگا۔اپنے ہی ملک میں آج مسلمانوں کی حیثیت صرف اقلیت کی سی ہے اور وہ بھی ایسی اقلیت جو اکثریت کی خیرات پر جینے والی ہو۔

ہندوستان کو بحیثیت ہندواسٹیٹ بنانے کی آوازیں گرچہ پرانی نہیں ہیں۔اس کے باوجود یہ آوازیں کبھی زور سے آتی ہیں تو کبھی دھیمی بھی پڑتی ہیں۔لیکن ان آوازوں کے مدھم اور بلند ہونے کے ساتھ ہی حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ آوازیں لگاتار جاری ہیں۔اس موقع پر سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ سلسلہ کیوں جاری رہااور یہ آوازیں جو آج ایک نظریہ بن چکی ہیں کیونکر پختہ ہوئیں؟پختگی کی ایک وجہ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم ہے۔تو وہیں تقسیم میں ہندو اکثریت والے علاقے ہندوؤں کو ملے اور مسلم اکثریتی علاقہ مسلمانوں کو۔پھر چونکہ ہندو علاقہ ہندوستان ، مسلم علاقہ پاکستان کے بالمقابل بہت بڑا تھا،لہٰذا یہ

آوازیں نہ صرف آوازیں رہیں بلکہ ایک نظریہ میں تبدیل ہوگئیں۔جس کا شور آج کچھ زیادہ ہی محسوس کیا جارہا ہے۔مزید یہ کہ موجودہ حکومت اور اس حکومت میں مخصوص نظریہ اور فکر کے حاملین کی کثرت بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ ہندوستان کو ایک ہندواسٹیٹ بننا چاہیے۔اور یہ ان لوگوں کی خواہش ہے جوجو برسوں سے نظریہ کے فروغ میں رنگ بھرنے کے لیے اپنی زندگیوں تک کو وقف کر چکے ہیں۔لہٰذا یہ ایک فطری خواہش ہے جن کا آسرا موجودہ حکومت ہے۔اُنہیں امید ہے کہ یہ حکومت نہ صرف اس نظریہ کو فروغ دے گی بلکہ بڑی حد تک تعاون بھی کرے گی۔پھر ساتھ ہی اقلیتوں کو ایک طے شدہ حد تک سمیٹ کر رکھ دینا،ان کے اختیارات کو محدود کرنا یا ان کو اقلیت کے زمرے سے ہی خارج کرنا،وغیرہ جیسے معاملات بھی آگے بڑھیں گے۔ممکن ہے اسی بنا پر کسی نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ اقلیتوں کو آبادی کے کون سے تناسب کے بعد اقلیت کے زمرے سے ہٹایا جانا ممکن ہے؟توجہ فرمائیے یہ سوال معصومانہ سوال نہیں تھا،بلکہ یہ سوال کل پھر اٹھایا جائے گا،اورمزید قوت کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔اس معمولی سوال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ملک جس جانب تیزی سے گامزن ہے،ساتھ ہی مخصوص نظریہ و فکر اور مقصد سے وابستگی رکھنے والوں کے حوصلہ کس درجہ بلند ہوا چاہتے ہیں۔

دوسری طرف یہ بات بھی مسلمانان ہند کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جس طرح

وہ بے فکری، غیر ذمہ دارانہ رویہ اور لاشعوری کی زندگی سے دوچار ہیں، ان حالات میں اگر کل ملک کے ہندو جو اکثریت میں ہیں، ہندوستان کو ہندو اسٹیٹ بنانا چاہیں، تو پھر کوئی نہیں جو انہیں اس فیصلہ سے روک سکے گا۔ اور اگر ایسا ہوا، جو گرچہ ایک مفروضہ ہی صحیح، تو پھر اقلیت کی جداگانہ قومیت اور مخصوص قومی مطالبات کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ کیونکہ ایک قومی اسٹیٹ مخصوص قومیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے مطالبات پورے نہیں کرتی، بلکہ وہ تو یہ کوشش کرتی ہے کہ اسے تحلیل کرکے اپنے اندر ھضم کرلے، یا پھر اگر وہ اپنی شناخت برقرار رکھنے کی کوشش کرے تو سختی سے پیش آتے ہوئے دبا دیا جائے یا اسے باقاعدہ فنا ہی کردیا جائے۔ واقعہ کے برخلاف مسلمان کہیں نیشنلسٹ تو کہیں کمیونسٹ پہچان بنانے میں سرگرم ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح انگریزی دور میں خان بہادر طبقہ اپنی حیثیت اور شناخت قائم کرچکا تھا۔ اب اگر وہ قوم جس کی ایک بڑی تعداد پہلے مسٹر اور مس بن چکی ہے، آج اگر وہ مہاشے اور شریمتیاں بن گئیں، تو یہ کچھ نیا نہیں ہے۔ لیکن توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ معاملہ اگر زبان کی حد تک ہوتا، اور الفاظ کو زبانوں میں ہی بدلا گیا ہوتا، تو کچھ فرق نہیں پڑتا تھا لیکن اگر ان کی معاشرت، خیالات اور انفرادی واجتماعی طرز عمل ہی تبدیلی ہوچکا ہو یا جاری ہو، تو یہ صورتحال تشویشناک ہے۔ لہٰذا جس حالت سے وہ دوچار ہیں کوئی دوسرا نہیں نکال سکتا۔ اور ویسے بھی کسی دیگر فکر و نظر کے ہمنوا کو کیا دلچسپی کہ وہ مسلمانوں کو زوال سے نکالے

انہیں تو خود ہی اپنی صورتحال پر غور و خوض کرنا ہوگا۔اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ زوال جس میں مسلمانان ہند آج مبتلا ہیں،اس سے نکلنے کا کیا راستہ ہے؟جواب میں تین صورتوں پر غور کیا جاسکتا ہے،جو پہلے بھی بیان کیے جا چکے ہیں۔ایک یہ کہ نیشنلسٹ،کیمونسٹ اور نہ جانے کن کن ناموں سے اپنی شناخت بنانے والے مسلمان،اپنی سابقہ روش وپالیسی پر قائم رہتے ہوئے ہندو قومیت میں جذب ہونے پر تیار ہو جائیں۔دوسرے یہ کہ مسلم قوم پرستی کی موجودہ روش پر بدستور چلتے رہیں یہاں تک کہ مٹ جائیں۔اور تیسرے یہ کہ قوم پرستی اور اس کے طور طریقوں اور اس کے دعوؤں اور مطالبوں سے توبہ کرکے اسلام کی رہنمائی قبول کرلیں،جس کا تقاضہ ہے کہ مسلمان اپنی قومی اغراض کے لیے سعی و جہد کرنے کی بجائے اپنی تمام کوششوں کو صرف اسلام کی اصولی دعوت پر مرکوز کردیں اور من حیثیت القوم اپنے اخلاق،اعمال اور اجتماعی زندگی میں اس کی شہادت دیں جس سے دنیا یقین کرکے کہ فی الواقع یہ وہ قوم ہے جو اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ محض دنیا کی اصلاح کے لیے جینے والی ہے اور درحقیقت جن اصولوں کو یہ پیش کررہی ہے وہ انسانی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی طور پر نہایت اعلیٰ و ارفع بنادینے والے ہیں۔

یہ وہ دور ہے جس میں مسلمان آزادی تا حال سارے تجربات کرکے دیکھ چکے ہیں۔کبھی کمنسٹوں کی طرف لپکے،کبھی نیشنلسٹوں کی طرف اور کبھی دیگر آسراؤں

پر اپنے گھٹنے اور سر ٹیکے۔ لیکن یہ تاریخ نہیں ہے بلکہ کل ہی کی بات کہ ویسٹ بنگال، جس میں تقریباً 30 فیصد مسلمان آباد ہے، وہاں مسلمان معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور روزگار جیسے اہم محاذ پر حد درجہ پسماندگی کا شکار ہوئے اور ہیں۔ اور وہ سارے افکار و نظریات اور ان سے وابستہ تحریکات جن کی گفتگو کا آغاز تا اختتام ہی پسماندہ، کمزوروں ضرورتمندں اور محنت کش طبقہ کی آواز بلند کرنے میں صرف تھی، مسلمانوں کی ترقی و، فلاح و بہبود میں کسی بھی درجہ مددگار نہ ثابت ہوئی۔ اسی طرح دیگر مقامات جس میں اہم ترین اترپردیش و اطراف کی ریاستیں ہیں، نیشلسٹوں، سوشسلٹوں اور نہ جانے کن کن ناموں سے اپنی ہی زبان سے تعریفیں بیان کرنے والوں نے مسلمانوں کو ہر سطح پر نقصان پہنچایا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ معاملہ صرف مسلمانوں کی حد تک ہی خراب نہیں ہے۔ بلکہ وہ جو خود کو اکثریت سمجھتے یا انہیں سمجھایا جاتا ہے، وہاں بھی قدیم طبقاتی کشمکش جاری ہے، جو کسی بھی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی، اور ان کی ٹھیک وہی حالت زار، برقرار ہے جو کل یعنی آزادی سے پہلے بھی تھی۔ معلوم ہوا کہ موجودہ جمہوریت اور ظاہری مساوات صرف فریب نظر اور دھوکہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی وہی بے انصافیاں بدستور جاری ہیں جو کل تھیں ساتھ ہی وہ ناہمواریاں اور تفریقیں بھی برقرار ہیں جو آزادی سے قبل پائی جاتی تھیں۔ پھر اہم سوال یہ بھی اٹھنا چاہیے کہ آزادی نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں یا دوسرے الفاظ میں ملک

کی اکثریت اور اقلیت کو کیا دیا؟اس موقع پر مسلمانوں ، ملک عزیز ہند میں اپنی حیثیت لازماً سمجھنا ہوگی۔اور یہ بات بھی خوب اچھی طرح سمجھنا ہوگی کہ بحیثیت مسلمان ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہیں اور جن فرائض میں اللہ تعالیٰ نے ان کو باندھ کر رکھا ہے،اس سے چھٹکارا اور نجات کسی حال میں نہیں ہے۔ہاں اگر وہ موجودہ حالات میں قیام عدل اور ناانصافیوں کے خلاف اٹھیں،ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا عزم مصمم کریں اور ایک منصوبہ بند سعی و جہد کے ساتھ کوششوں کا آغاز کریں تو وہ دن دور نہیں جبکہ وہی دوسروں کے دکھ درد کا سہارا بنیں گے ساتھ ہی اپنی پریشانیوں کا بھی مداوا کر سکیں گے۔کام کا آغاز قول و عمل کے مظاہرے کے ساتھ ہونا چاہیے اور کام کا آغاز اس مقام سے کیا جائیجہاں وہ خود رہتے بستے ہیں۔پھر یہی اخلاص پر مبنی سعی و جہدان کے وجود اور شناخت کو برقرار رکھنے کا بھی ذریعہ بن جائے گی (انشاءاللہ)!

! سال نو دیکھیے کس دھوم سے آغاز ہوا

ہندوستان کی ریاست گجرات میں پولیس کی فرضی شدت پسندوں کے خلاف کارروائی کے ایسے دو ویڈیو منظر عام پر آئے ہیں جن میں دہشت گردوں کو مسلمانوں کے حلیہ میں پیش کیا گیا ہے۔تازہ ترین ویڈیو گذشتہ ہفتہ نرمدا ضلع میں کی جانے والی ایک مشق کی ہے جس میں پولیس مختصر مقابلے کے بعد دو فرضی دہشت گردوں کو قابو کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور انھیں یہ نعرے بلند کرتے ہوئے سنا جا سکتا ہے کہ "چاہو تو ہمیں مار ڈالو۔۔۔۔ اسلام زندہ باد"۔اس سے پہلے ریاست کے سورت ضلع میں بنائی جانے والی ایک ویڈیو منظر عام پر آئی تھی جس میں پولیس کے ذریعہ پکڑے جانے والے تین افراد نے اس طرح کی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں جیسی عام طور پر مسلمان پہنتے ہیں۔ یہ بھی ایک مشق تھی اور دہشت گردوں کا کردار بھی پولیس والے ہی نبھا رہے تھے۔نرمدا واقعہ کے بعد پولیس سپرنٹنڈنٹ جے پال سنگھ راٹھور نے کہا ہے کہ مجھے میڈیا کے توسط سے پتہ چلا ہے، اگر ایسا ہوا ہے تو ہم اس کی جانچ کرائیں گے اور ذمہ دار لوگوں کے خلاف ضروری کارروائی کریں گے۔ مسٹر راٹھور نے کہا کہ فرضی مشق معمول کے مطابق پولیس کے ذریعہ کی جاتی ہے۔دوسری جانب ریاست کی وزیر اعلیٰ آنندی بین نے بھی معذرت کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی مذہب کو دہشت گردی سے جوڑنا غلط ہے اور پولیس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔اس کے

باوجود ہندوستان میں پولیس پر اکثر مذہب کی بنیاد پر تعصب کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ خود حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق ملک کی جیلوں میں مسلمانوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سال 2013 ء میں وزیر اعظم منموہن سنگھ نے ملک کے اعلیٰ پولیس افسران سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اقدامات کریں۔ لیکن متذکرہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اقدامات کیے گئے ہیں یا جاری ہیں، وہ کافی نہیں ہیں۔

حالیہ برسوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اگر کسی ایک واحد مسئلے نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے تو وہ دہشت گردی کا مسئلہ ہے۔ دہشت گردی کے واقعات کی ذمہ داری عموماً مسلم شدت پسندوں پر ڈالی جاتی ہے۔ پھر مختلف واقعات میں سینکڑوں مسلم نوجوانوں کو گرفتار کیا جانا ایک عام بات بن چکی ہے۔ لیکن تفتیش کے عمل میں خرابی اور بعض واقعات غلط ثابت ہونے کے سبب ملک کے مسلمانان خفیہ ایجنسیوں اور پولیس کے بارے میں مکمل طور پر شک و شبہات میں مبتلا ہیں۔ گرچہ اقلیتی کمیشن کے سابق چیرمین اور ماہر قانون طاہر محمود کہتے ہیں کہ ملک میں مرکز سمیت ریاستی اور مقامی حکوتیں ہیں اور مسلمانون کے بارے میں ضروری نہیں ہے کہ ہر حکومت کی سوچ ایک جیسی ہو لیکن یہ سوچنا کہ ان کے خلاف کوئی سازش کی جارہی بالکل غلط ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان میں

جب بھی مسلمانوں پر ہونے والی زیادتیوں کا ذکر آتا ہے تو یہاں پولیس کا جانبدارانہ اور متعصبانہ رویہ بھی ایک سوال کی طرح اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اور یہ عام مشاہدہ ہے کہ اکثر فرقہ وارانہ فسادات اور ملک کی داخلی سلامتی کے معاملے میں پولیس کا کردار مشکوک رہتا ہے۔خاص طور پر مظلوم طبقہ ، مسلمان اور اقلیتیں پولیس کے کردار سے یقین کی حد تک شاکی ہیں۔ہندوستان کی تین ریاستوں کے ڈائریکٹر جنرلوں نے بھی اپنی مشترکہ رپورٹ میں یہ واضح کردیا ہے کہ مسلمانوں کو پولیس پر پورا اعتماد نہیں ہے۔اوراس اعتماد میں کمی کی دو بڑی وجوہات ابھر کر سامنے آئی ہیں۔۱) پولیس میں مسلمانوں کا آبادی کے تناسب سے کم نمائندگی کا ہونا ہے۔۲) فسادات کے دوران پولیس کا برتاؤ مسلمانوں کے تئیں مساوی نہیں ہوتا ہے۔اور یہ عام مشاہدہ ہے کہ کسی بھی فساد یا دھماکہ کے بعد اکثر و بیشتر پولیس مسلمانوں کو ہی گرفتار کرتی ہے۔مظلوم ہوتے ہوئے بھی وہ طویل مدت تک عدالتوں کی کارروائی میں مبتلا رہتے ہیں،جس کے نتیجہ میں نہ صرف ان کی ذاتی زندگی بلکہ ان کا گھر اور مقامی آبادی تک ذلت و رسوائی سے دوچار ہوتی ہے۔اکثر پولیس ہی مسلمانوں کے جذبات اور ان کے مذہبی عقائد کو بھی مجروح کرتی ہے،جس کے نتیجہ میں مسلمانوں اور پولیس کے درمیان عدم اعتماد پروان چڑھتا ہے۔لہذا جہاں پولیس میں مسلمانوں کا تناسب بڑھنے سے امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے جذبات اور عقائد کو سمجھنے میں مدد ملے گی وہیں عدم اعتماد کی وجوہات پر قابو پانے کے نتیجہ میں اور فسادات میں

منصفانہ طریقہ اختیار کرتے ہوئے داخلی نظام بھی مستحکم ہوگا۔

فرضی انکاؤنٹر بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔اس "فرضی انکاؤنٹر"کے تعلق سے گزشتہ دنوں نے سپریم کورٹ میں ایک اپیل برائے ممبئی دائر کی تھی ،جوPUCLایک رضاکار تنظیم اور1997کے درمیان99مڈبھیڑوں میں 135افرادکے مارے جانے سے 1995 متعلق تھی۔اپیل کا فیصلہ سناتے ہوئے سپریم کورٹ آف انڈیا نے 32صفحاتی فیصلہ کے :ساتھ پولیس نظام کی اصلاح سے متعلق راہنما ہدایات جاری کی تھیں۔جو اس طرح ہیں جانچ ختم ہونے تک (iiہر انکاؤنٹر کی جانچ سی آئی ڈی یا آزاد ایجنسی سے کرائی جائے۔ (i تعزیرات (iiiاس میں شامل پولیس اہلکاروں کو پرموشن یا بہادری ایوارڈ نہیں ملے گا۔ ہر (ivہند کی دفعہ176کے تحت ہر انکاؤنٹر کی جوڈیشیل مجسٹریٹ سے جانچ لازمی ہوگی۔ ہر انکاؤنٹر کی ایف آئی آر (vانکاؤنٹر کے بعد ہتھیار اور گولیاں جمع کرانے ہوں گے۔ انکاؤنٹر کی جانچ رپورٹ ہر 6ماہ میں متعلقہ ریاستی انسانی (viدرج کرانی لازم ہوگی۔ حقوق کمیشن کو بھیجنی ہوگی۔ سپریم کورٹ کی ہدایات کے مطابق اب اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ ہر انکاؤنٹر کی آزاد ایجنسی سے جانچ کرائی جاے۔یہ جانچ تیزی سے پوری کی جائے۔اگر کوئی پولیس اہلکار فرضی مڈبھیڑ میں ملوث پایا جائے تو اس کے خلاف قانونی اور محکمہ جاتی کارروائی ہو۔اس بات کو بھی یقینی بنایا جائے کہ ایف آئی آر،ڈائری کی انٹری اور پنچ نامہ اور اسکیچ وغیرہ، متعلقہ

عدالت کو بھیجنے میں تاخیر نہ ہو۔ موت کے بعد ملزم یا مجرم کے سب سے قریبی رشتہ دار کو جلد از جلد واقعہ کی بابت مطلع کیا جائے۔ وہ لوگ جو صرف اس ہی پر منحصر تھے، انہیں معاوضہ پانے کا پورا حق ہوگا۔ اگر کسی کو انکاؤنٹر کے فرضی ہونے کا شک ہو تو وہ سیشن کورٹ میں شکایت درج کراسکتا ہے۔ سپریم کورٹ کا کہنا ہے کہ رہنما ہدایات کی سختی سے ہر حال مین اور ہر کیس میں پابندی کی جائے۔ کورٹ کے فیصلے کے مطابق سی آئی ڈی یا کسی اور اسٹیشن کی پولیس ٹیم اپنے سینئر پولیس افسر کے نگرانی میں انکوائری کرے گی۔ وہ شواہد جمع کرے گی جس میں خون، بال، جائے وقوع کی مٹی کے ذرات کے علاوہ واردات کے عینی گواہوں کو ان کے پورے نام، پتے، اور ٹیلی فون نمبروں کے ساتھ تفصیلات موجود ہوں۔ ان کے بیانات لے گی، ان لوگوں کا بھی بیان لیا جائے گا جو انکاؤنٹر میں شریک تھے۔ جو انکاؤنٹر کی تفصیلات، اس کا مقصد، مقام، نقشہ کے ساتھ اور اگر ممکن ہو تو انکاؤنٹر کے سین کا فوٹو اور ویڈیو یا کچھ جسمانی شہادت، موت کا وقت، اس کے علاوہ جو بھی ممکن ہو اس کی تفصیل جمع کرے گی، تاکہ اس موت کے تمام حقائق سامنے آسکیں۔ زخمی مجرم یا متاثر کو ہر طرح کی طبی امداد مہیا کرائی جائے نیز اس کا بیان مجسٹریٹ یا علاج کرنے والے ڈاکٹر درج کریں گے۔ لیکن اس پوری تفصیل کے بعد بھی کہا جاسکتا ہے کہ پولیس کے متصبانہ رویہ کا خاتمہ نہیں ہو سکا ہے، خصوصاً گجرات پولیس کے ذریعہ کی گئی مشق، اس میں استعمال کی جانے والی ٹوپی، ڈائیلاگ اور خاص طبقہ کا حلیہ یہ واضح کرتا ہے

کہ اس عمل کے پیچھے ایک مخصوص فکر کارفرما ہے۔اور اُس مخصوص فکر کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں ہے کہ فرضی انکاؤنٹر کا خاتمہ ہو جائے؟آخری بات یہ کہ جو واقعہ سامنے آیا یعنی گجرات پولیس کے ذریعہ کی گئی مشق اور اس کا طریقہ، دراصل ایسے ہی واقعات مسلمانوں یا ملک کی اقلیتوں کو پولیس پر اعتماد بحالی میں رکاوٹ کا سبب ہیں۔ساتھ ہی ملک عزیز ہند میں جس امن و امان و نظام پر اعتماد کی ضرورت ہے وہ پوری نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہر سطح پر موجود تعصب کو نہ ختم کیا جائے۔اور اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ اُس حکومت کی ناکامی ہوگی جو "سب کا ساتھ سب کا وکاس"کا نعرہ لگاتی ہوئی آئی ہے۔پھر یہ ناکامی ہی دراصل اس فکر و نظریہ کی ناکامی ہوگی جس کی کامیابی کے لیے.بڑی تعداد میں مخصوص فکر و نظر سے وابستہ افراد اپنی زندگیوں تک کو وقف کیے ہوئے ہیں۔

چارلی ہیبڈو: وحشت میں مبتلا نفرت کے پرستار

دنیا میں اسلام کو جس بڑے پیمانہ پر بدنام کرنے کی سازشیں رچی جارہی ہیں،اس کے نتیجہ میں یہ بات باآسانی کہی جاسکتی ہے کہ آج دنیا اسلام سے مکمل طور پر خوف زدہ ہے۔یہ خوف فطری بھی ہے اور منطقی بھی ،تہذیبی بھی ہے اور نظریاتی بھی۔اور اسی خوف کا نتیجہ ہے کہ وحشت جس میں دنیا مبتلا ہے ،اُس چہار طرفہ وحشت کو لفظ "دہشت" سے تبدیل کیا جارہا ہے۔درحقیقت آج جبکہ ہر سطح پر اسلام کی نظریاتی و تہذیبی برتری ثابت ہو چکی ہے، ٹھیک اسی وقت، مد مقابل بالادستی ثابت کرنے کی غرض سے بااقتدار طبقہ اور متکبر اشخاص مختلف طریقہ ہائے پروپیگنڈے کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔دلائل سے خالی اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا افراد فی زمانہ ہر ممکن طریقہ اختیار کرتے آئے ہیں۔اس کے باوجود آج جو طریقہ اختیار کیا جارہا ہے وہ اپنے آپ میں مخصوص ہے۔غرض صرف یہ ہے کہ مد مقابل اسلامی افکار و نظریات ، طریقہ ہائے حیات اور تہذیب و تمدن کو کسی بھی طرح دنیاکے سامنے آنے سے روکا جائے۔لہٰذا اسی کا نتیجہ ہے کہ دھیمی آواز کا جواب چیخنے چلانے سے اور گفتگو کا جواب دھمکیوں سے دیا جاتا ہے۔وہیں فرد واحد یا قوموں کے باطن میں موجود نفرت وکدورت اُن کے اقوال وافکار سے پوری طرح جھلک رہی ہے۔حق کا قتل ناحق سے اور ضمیر کی آواز

کو دبایا جارہا ہے۔ساتھ ہی ہر وہ حربہ استعمال کیا جاتا ہے جس سے دلیل کی روح کچلی جا سکے۔گرچہ یہ کوششیں پہلے بھی جاری رہی ہیں اس کے باوجود اسلامی اصولوں نے ہر دور میں برتری حاصل کی ہے۔

1936ء کا سال،یورپ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے درمیان انتہائی پریشان حال تھا۔ڈارون کی بندر تھیوری چھائی ہوئی تھی۔انسان نسلی اور قومی سطح پر ٹکڑوں میں تقسیم تھا۔مابعد جدیدیت کا فلسفہ سارتر اور کامیو جیسے منکرین مذہب پروان چڑھا رہے تھے۔اہل کلیسا اخلاقی زوال میں مبتلا تھے اور "روشن خیال" یورپ میں مذہب کا قتل کر رہے تھے۔اسی ماحول میں قدآور شخصیت،ادیب اور دانشور جارج برناڈ شا نے ایک انوکھی بات کہی تھی۔شا نے کہا تھا"اگر کوئی مذہب آئندہ سو سال میں یورپ یا کم از کم برطانیہ پر حکومت کر سکتا ہے تو وہ اسلام ہے"۔اس وقت یہ پیشین گوئی عام انسان نے دیوانہ کی بڑ کے سوا کچھ نہ سمجھی۔اس کے باوجود مغربی دانشواران اسی وقت چوکنے ہوگئے تھے۔دوسری عالمی جنگ ختم ہوئی، مسلمان کالونیاں برطانیہ اور فرانس کی گرفت سے آزاد ہونے لگیں۔دوسری جانب مغربی مورخ اور فلسفی برٹرینڈ رسل نے History of Western Philosophy میں لکھا: "ہمارے (یورپی) Dark Ages تاریک زمانے 699ء سے 1000ء تک پھیلے ہیں۔یہ وہی زمانہ ہے جبکہ ہندوستان سے اسپین تک اسلام کی عظیم الشان تہذیب پھل پھول رہی تھی۔ہمیں لگتا ہے کہ مغربی یورپ کی تہذیب ہی

اصل تہذیب ہے، مگر یہ بہت تنگ اور محدود خیال ہے"۔تاریخ آگے بڑھی تو عالمی جنگوں سے پریشان حال دانشواران نے فلسفہ مابعد جدیدیت میں انسان کی رہی سہی وقعت اور عزت بھی ختم کر دی۔ فلسفہ کی اسی موت نے یورپ کو تہذیبی بحران میں مکمل طور پر مبتلا کر دیا۔اور آج یورپ اور امریکہ سمیت مغرب کے تمام بڑوں پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ خدا تک لے جانے والی عیسائی و یہودی بنیادیں، بے بنیاد، جڑکٹی، مسخ شدہ اور دلیل سے خالی ہیں۔برخلاف اس کے اسلامی تعلیمات اصل، جامع اور مکمل ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی انقلاب کا سپہ سالار نپولین بونا پارٹ،انیسویں صدی کے اوائل میں کہتا ہے کہ : "مجھے امید ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب میں دنیا کے تمام ملکوں کے ذہین ترین انسانوں کو متحد کر کے ایک ایسی حکومت مستحکم کروں گا جس کی بنیاد قرآن کے اصولوں پر رکھی جائے گی،قرآن واحد سچائی ہے جو انسانوں کو حقیقی خوشی فراہم کرتا ہے"۔ گرچہ نپولین اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا،اس کے باوجود آج بھی دنیا حقیقی مسرت کے حصول میں سرگرداں ہے۔ لیکن اسلام کے سوا کوئی ایک نظریہ ایسا نہیں ہے جو انسان کو حقیقی خوشی و کامیابی فراہم کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ناکام و نامراد افراد و گروہ،اور وہ طبقات و نظریات کے حاملین جو نہ صرف خود بلکہ دنیا کو بھی نفسیاتی خوف میں مبتلا کرنے کے درپے ہیں، اپنی تمام کوششوں کے باوجود نامراد ثابت ہو رہے ہیں۔

اور غالباً یہی وہ پس منظر بھی ہے جس میں فرانس کے دارالحکومت پیرس میں توہین رسالت کے مرتکب فرانسیسی ہفت روزہ چارلی ہیبڈو (Charele Hebdo) کے صدر دفتر میں تین نقاب پوش افراد اس وقت داخل ہو گئے جب جریدے کا مدیر خاص Stephae Charboner اپنے عملے کے ساتھ اجلاس میں مصروف تھا۔اس نشست میں وہ تین کارٹونسٹ (خاکہ نویس) بھی موجود تھے جنھوں نے توہین رسالت پر مبنی خاکے بنائے تھے۔نامعلوم بندوق بردار افراد نے مدیر سمیت چاروں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جبکہ ان کی حفاظت پر مامور پولیس اہلکار جو اس واردات میں زخمی ہو گیا تھا حملہ آوروں کے ہاتھوں مارا گیا۔بعد میں ان افراد کو چند گھنٹوں کی جستجو کے بعد مار گرایا گیا۔اس کے باوجود اس واقعہ پر مختلف دانشواران نے نہ صرف سوالات کھڑے کیے ہیں بلکہ وجوہات بھی بیان کی ہیں۔لیکن ایک اہم سوال جو ان جیسے تمام ہی واقعات میں یکساں ہے وہ مجرمین کو زندہ نہ پکڑنا اور مار گرانا ہے، جس کے بعد نہ ان سے سوالات کیے جانے کی نوبت آتی ہے اور نہ ہی کسی اور قسم کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔اس پورے واقع کے پس منظر میں وجوہات جو بیان کی جا رہی ہیں ان میں پہلی وجہ یہ کہ یورپ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی آبادی فرانس میں ہے، لہذا اسلامی تہذیب کے فروغ سے لوگوں کو خوفزدہ کیا جانا الممکنات میں سے ایک ہے۔جس کا راست فائدہ ان طاقتوں کو پہنچے گا جو اپنے ذاتی فوائد کے لیے عوام الناس کے افکار و خیالات ، تمدن و معاشرت اور غیر اخلاقی واستحصال پر مبنی سیاست و معیشت پر گرفت بنائے رکھنا چاہتے

ہیں۔دوسری وجہ یہ بتائی جارہی ہے کہ گزشتہ دنوں فرانس کی پارلیمنٹ نے فلسطینی ریاست تسلیم کی تھی۔ تیسری وجہ یورپی یونین میں دہشت گردی کی جنگ کے خلاف سب سے اونچی آواز فرانس کی ہے۔پیرس حملے سے اسلام مخالف جنگ کے خلاف فرانس کی آواز دب سکتی ہے۔یورپ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی یورپی آبادی شدید معاشرتی اور نظریاتی دباؤ کا شکار ہو سکتی ہے۔اس سب کے باوجود اسلامی تہذیب اپنی علمی اور نظریاتی بالادستی قائم کیے ہوئے ہے اور اسلام اپنی واضح تعلیمات کے نتیجہ میں پھل پھول رہا ہے۔جس کی زندہ مثال اسلام اور اس کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منفی پروپیگنڈہ کے حوالے سے انتہائی نمایاں اور پیش پیش رہنے والے ڈچ سیاست داں اور ہالینڈ کی دائیں بازو کی سیاسی جماعت گریٹ ولڈرز پارٹی کے ممتاز لیڈر ارنوڈ وان ڈورن ،بدنام زمانہ شاتم رسول ہے۔جس کا کہنا ہے کہ اسلام دشمنی کے بعد جب میرے خلاف دنیا بھر میں مہم شروع ہوئی تو اس نے میری آنکھیں کھول دیں۔میں نے اسلام اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہر ممکن ذرائع سے معلومات حاصل کیں۔علماء اور اسکالرز سے تبادلہ خیال بھی کیا۔قرآن کریم کی تعلیمات اور احادیث رسول کا تجزیہ بھی کیا۔لہٰذا مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر جو بڑی غلطی بلکہ گناہ کبیرہ سرزد ہوا ہے،اس کے نتیجہ میں میرا دل بار بار مجھے لعنت ملامت کرتا رہا۔آخر کار دل کی دنیا بدلی ،آنکھوں پر عصبیت اور تنگ نظری کا پردہ ہٹا،حقیقت اور سچائی کی روشنی پہنچی،تو میں

نے اپنے گمراہ کن عقائد و نظریات سے تائب ہونے میں دیر نہیں کی اور اسلام قبول کر لیا۔ڈورن کا کہنا ہے کہ ان کی سیاسی پارٹی اسلام دشمنی میں اتنی زیادہ آگے نکل گئی تھی کہ انہوں نے از خود حقیقت کی تہہ میں جانے اور صداقت تلاش کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور آخر کار گمراہی کا خاتمہ ہوگیا۔

آج آزادیٔ اظہار خیال کے تعلق سے ان ممالک سے زیادہ یہ کون جانتا ہے کہ آزادیٔ اظہار خیال کسی فرد یا ادارے کو کسی کی ہتک عزت، کردار کشی اور رسوائی کی اجازت نہیں دیتا۔ جسٹس ہولمیز (Justice Holmes) نے آزادیٔ اظہار خیال کی حدود متعین کرتے ہوئے واضح کیا تھا کہ اگر کوئی شخص ایک بھرے تھیٹر ہال میں اٹھ کر آگ آگ کا شور مچانے لگے تو یہ آزادیٔ تقریر نہیں ہوگی۔علاوہ ازیں جرمنی میں نازی نظریے کی اشاعت ممنوع ہے بلکہ سابق مغربی جرمنی میں کمیونسٹ نظریات کے حامل اساتذہ کو جامعات میں ملازمت نہیں دی جاتی تھی۔جنگ عظیم میں لارڈ برٹرینڈ رسل کو کیمبرج یونیورسٹی سے اس لیے نکال دیا گیا تھا کہ انہوں نے کہا تھا کہ یہ جنگ جمہوریت یا آزادی کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ ملک گیری کی ہوس کی تکمیل کے لیے لڑی جا رہی ہے،اس پر انہیں قید کر لیا گیا تھا۔اسی طرح امریکہ میں اشتراکیت کی تبلیغ جرم تھی اور اب بھی ہے۔لیکن جہاں ایک جانب متذکرہ جریدے نے 2009ء میں اسّی سالہ کارٹونسٹMaurice Sinet کو نہ صرف اس لیے نوکری سے نکال دیا تھا کہ سامی مخالف (یہودی مخالف) کارٹون

بنایا تھا بلکہ کارٹونسٹ پر نسلی منافرت انگیزی کے الزامات لگا کر اسے عدالت میں بھی گھسیٹا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت یورپ کا آزادیٔ اظہار کا حق کس نے اور کیوں چھین لیا تھا؟ برخلاف اس کے آج آزادیٔ اظہار کے نام پر یورپ و امریکہ کے تمام ہی بڑے چھوٹے اخبارات اور ان کی ویب سائٹس پر گستاخانہ خاکے جاری کیے جا رہے ہیں۔ اہم ناموں میں بی بی سی، گارجین، یو ایس اے ٹوڈے، ایل اے ٹائمز، وال اسٹریٹ جرنل، واشنگٹن پوسٹ، ڈیلی بیسٹ، ہفنگٹن پوسٹ، سی بی ایس نیوز وغیرہ شامل ہیں۔ اور جو اخبارات اب تک اس مہم میں شامل نہیں ہوئے ہیں وہ بھی جلد شامل ہو سکتے ہیں۔ بڑا سوال یہ ہے کہ وحشت میں مبتلا نفرت کے پرستاروں کو حقیقی امن اور حقیقی خوشی کون فراہم کرے گا!

!میڈیا قیام عدل وامن واماں کا ایک موثر ذریعہ۔۔۔ لیکن

کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کا ایک اہم ستون میڈیا ہے۔جس کے ذریعہ حق وانصاف کی آواز بلند کی جاتی ہے، صحیح خبر کو شائع کیا جاتا ہے اور غلط خبروں یا جھوٹ پر مبنی باتوں کی حقیقت سامنے لائی جاتی ہے۔ساتھ ہی قیام عدل وانصاف میں میڈیا اہم کردار ادا کرتا ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے وہ کس حد تک قابل اعتبار ہے؟میڈیا کا جو کردار ہونا چاہیے ،کیا آج وہ اپنے کردار کو ادا کر رہا ہے ؟ سوال کے جواب میں یہ بات بھی لازماً سامنے آنی چاہیے کہ میڈیا جسے آج عوام الناس کی رائے عامہ ہموار کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے،وہ خود کس کے اختیار ہے ۔ باالفاظ دیگر مختلف زبانوں میں جاری اخبارات ورسائل اور نیوز وانٹرٹمینمنٹ چینلس کے مالکان کون ہیں؟حکومت؟فلاح عام اور قیام امن میں مصروف افراد و گروہ؟یا وہ تجارت پیشہ افراد جو ہر چیز کی بازار میں قیمت لگانے سے نہیں چوکتے؟ساتھ ان افراد پر بھی گفتگو ہونی چاہیے جو میڈیا میں اپنی پیشہ وارانہ خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے مقاصد و نصب العین کیا ہیں؟غیر مساویانہ و دولت کا حصول؟یا ایک عظیم مقصد کو انجام دیتے ہوئے شب و روز کی ضروریات کی تکمیل؟یہ اور ان جیسے بے شمار سوالات ہیں جو آج میڈیا کے کردار کے سلسلے میں اٹھتے ہیں ۔ لہٰذا سوالات کے پس منظر میں وہ لوگ بھی

چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے جو اس پیشہ کو اختیار کرتے ہیں۔

گزشتہ دنوں یہ خبر اہم تھی کہ اسرائیل کے وزیر اعظم بن یامین نیتن یاہو نے ہیگ' میں قائم بین الاقوامی فوج داری عدالت (آئی سی سی) کو متنازع بنانے اور' عدالت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کرنے کے لیے اندرون اور بیرون ملک میڈیا مہم چلانے کا اعلان کیا ہے۔نیتن یاہو کی جانب سے یہ اعلان آئی سی سی کی پروسیکیوٹر جنرل فاٹو بنسوڈا کے اس بیان کے رد عمل میں آیا ہے جس میں انہوں نے فلسطین میں اسرائیل کے جنگی جرائم کی تحقیقات شروع کرنے کا فیصلے کا اعلان کیا ہے۔اسرائیلی اخبار' ہارٹز' کی رپورٹ کے مطابق نیتن یاہو نے کابینہ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں بین الاقوامی فوج داری عدالت کی طرف سے جنگی جرائم کی تحقیقات کے اعلان کے رد عمل میں فوری اور موثر اقدامات کرنا ہوں گے۔اس مقصد کے لیے عالمی ابلاغی مہم چلانے کی ضرورت ہے تاکہ آئی سی سی کے وجوہ کو آئینی طور پر متنازع بنا کر جنگی جرائم کی تحقیقات کو غیر موثر بنایا جاسکے۔رپورٹ کے مطابق یاہو نے وزرات خارجہ اور وزرات اطلاعات و نشریات کو ہدایت دی کہ وہ ملک اور بیرون ملک ابلاغی مہم شروع کریں ۔جس کے ذریعہ عالمی فوج داری عدالت اوراس کی خاتون پروسیکیوٹر جنرل بنسوڈا کو متنازع بنایا جاسکے۔اپنے شاطرانہ منصوبوں کے بارے میں بتاتے ہوئے یاہو نے کہا کہ ہم اس کا ہر سطح پر مقابلہ کریں گے اور دوسروں

کو بھی اس جنگ میں استعمال کریں گے ، لہٰذا وہ بھی اس کے لیے تیار رہیں۔ہم اسرائیلی فوجیوں کو عالمی عدالت کے سامنے جواب دہ نہیں ہونے دیں گے۔واضح رہے کہ اسرائیل اور امریکہ کے افسران بین الاقوامی عدالت کے فیصلے کی سخت مخالفت کر رہے ہیں، جس کے تحت اس بات کی تحقیق کی جائے گی کہ پچھلی جنگ میں اسرائیل یا فلسطین میں سے کس کی جانب سے جنگی جرائم کی خلاف ورزی کی گئی تھی۔اس خبر سے "چور کی داڑھی میں تنکا" والی مثال خوب اچھی طرح ثابت ہوتی ہے۔اور اگر ایسا نہیں تو کیوں بین الاقوامی عدالت کو قائم کرنے والے خود ہی بین الاقوامی عدالت کے فیصلہ کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کیا چاہتے ہیں؟

متذکرہ خبر کے تناظر میں یہ دیکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ وہ عالمی میڈیا خصوصاً مغربی میڈیا جس پر ہمارا انحصار ہے۔ جن کے حوالوں کے ساتھ ہماری خبریں و مضامین نہ صرف شائع ہوتے ہیں بلکہ اُن ہی خبروں کی بنیاد پر اپنی اور عوام کی رائے عامہ ہموار کرنے کا بھی کام انجام دیا جاتا ہے۔وہ خبریں کہاں سے آتی ہیں ؟اور ان وسائل پر کن لوگوں کی گرفت ہے؟گزشتہ دنوں 'عالمی میڈیا پر کنٹرول کس کا'کے عنوان سے ایک سروے منظر عام پر آیا تھا۔ جس میں دنیا بھر میں میڈیا پر براہ راست کنٹرول کرنے والی کمپنیوں اور ان کے مالکان کے بارے میں تفصیلات دی گئیں تھیں۔ سروے رپورٹ کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ فی الوقت عالمی میڈیا کے 90 فیصد حصے پر یہودی خبر رساں

ادارے، اخبارات، الیکٹرانک میڈیا، اور بین الاقوامی جرائد قابض ہیں۔اور یہ وہی خبر رساں ادارے ہیں جن کے ذریعہ ملکی و بین الاقوامی سطح کا مواد فراہم کیا جاتا ہے۔رپورٹ کے مطابق دنیاکے 90 فیصد میڈیا پر صرف 6 کمپنیوں کی اجارہ داری ہے ۔یہ سبھی کمپنیاں یہودیوں کی ہیں۔ سب سے بڑی کمپنی والٹ ڈزنی ہے،اس کمپنی کے امریکہ میں سب سے زیادہ پروڈکشن ہاؤس ہیں۔ کمپنی کے پاس 7،بڑے نیوز پیپرس، 3، میگزین اور بڑا کیبل نیٹ ورک ہے، جس کے 14، ملین صارف ہیں۔ دوسری کمپنی ٹائم وارنر جس کی ملکیت ایچ بی او ہے جو امریکہ کا سب سے بڑا پے ٹی وی کیبل نیٹ ورک ہے۔ کمپنی کی ملکیت میں امریکہ کی سب سے بڑی میگزین ٹائم میگزین بھی آتی ہے جو خالصتاً یہودیوں کی ہے۔ تیسری کمپنی وائی کام ہے۔ پیراماؤنٹ پکچرس اور ایم ٹی وی اس کی ملکیت ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف میڈیا کو کنٹرول کرتے ہیں بلکہ ذہن سازی کا کام بھی بڑے پیمانہ پر انجام دے رہے ہیں۔ بچے ،بڑے مرد و خواتین سب ہی کے نہ صرف ذہنوں کو بلکہ اُن کی معاشرتی، تمدنی و تہذیبی شناخت، کو بھی انٹرٹمنٹ پروگراموں کے ذریعہ تبدیل کرنے کی مہم جاری ہے۔ چوتھی کمپنی نیوز کارپوریشن ہے جس کی ملکیت فاکس ٹی وی چینل ہے۔ پانچویں: ڈریم ورکس ہے اور چھٹی فاکس ٹی وی ہے۔ان کمپنیوں کے ذریعہ روزانہ 6،کروڑ اخبارات فروت ہوتے ہیں، جس میں 75 فیصد ملکیت یہودیوں کی ہے۔دنیاکے مقبول ترین اخبار و رسائل نیویارک ٹائمز، وال اسٹریٹ جرنل اور واشنگٹن پوسٹ مخصوص گروہ کی ملکیت میں آتے ہیں۔میڈایا کی عالمی اجاری داری

وصورتحال کے تناظر میں نیتن یاہو کی بین الاقوامی فوج داری عدالت کی طرف سے جنگی جرائم کی تحقیقات کے خلاف اعلان شدہ میڈیا مہم کو باخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

اسی سلسلے میں مولانا نذر الحفیظ ندوی کی کتاب "مغربی میڈیا اور اس کے اثرات" کا یہ حصہ بڑا اہم ہے۔ جس میں وہ صیہونی پروٹوکول کے بارے میں بارہویں دستاویز سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ اقتباس مزید شواہد فراہم کرتا ہے کہ یہودیوں نے صحافت کو کتنی اہمیت دی ہے۔ اس سے نہ صرف دفاعی بلکہ اقدامی اور جارح طریقہ کار کا کام بھی لیا گیا ہے۔ اقتباس اس طرح ہے: "ادب اور صحافت عوام کا ذہن تیار کرنے کے لیے اہم ستون ہیں۔ اس لیے بیشتر اخبارات اور رسالے ہم اپنی حکومت کی ملکیت میں رکھیں گے۔ یہ ذرائع ابلاغ نجی ملکیت کے پریس کے منفی اثرات زائل کریں گے اور رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کے لیے ہمارے ہاتھوں میں زبردست طاقت ہوں گے۔ اگر عوام کو ہم دس رسالوں کے اجرا کی اجازت دیں گے تو یہ اجازت اپنے تیس رسالوں کو دیں گے۔ اور جتنے بھی رسالے شائع ہوں گے ان کا تناسب یہی ہوگا"۔ آگے لکھتے
ہیں: "ہمارے یہ سب اخبار اس بڑے دیو کی طرح ہوں گے جس کے بے شمار ہاتھ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک انگلی حسب ضرورت رائے عامہ کے ہر شعبہ پر رکھی ہوئی ہوگی۔ جس نبض کی رفتار تیز ہوگی یہ ہاتھ رائے عامہ کا رخ ہمارے نصب العین کی طرف موڑ دیں گے۔ ہمارے مخالفین کے پاس چونکہ

پریس کے ذرائع نہیں ہوں گے جن کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کا کماحقہ اور حتمی طور پر اظہار کرسکیں، ہم پریس کو ان کے خلاف استعمال کرکے فتح حاصل کرلیں گے" (ناشر ندوۃ العلماء لکھنؤ)۔

گفتگو کے پس منظر میں سوال پھر اٹھے گا کہ ہم کیا کریں؟ جواب بہت واضح ہے۔ کہا کہ : "اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو دانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو" (الحجرات:٦)۔اس بنیادی تعلیم کی روشنی میں وہ تمام اہل حق جو صحافت کو ایک مقدس مشن سمجھ کر داخل ہوئے ہیں،انہیں چاہیے کہ حمایت و مخالفت کا اسلامی اصول اختیار کرتے ہوئے جرائم کا پردہ فاش کرنے، شہادت کا حق ادا کرنے اور ظلم و ناانصافی کے خلاف پر امن اور قانونی حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے نہ صرف پیشاوارانہ ذمہ داری انجام دیں بلکہ اظہار رائے کی آزادی کے بے جا استعمال سے گریز کرتے ہوئے حکومت وقت سے بھی سوال اور باز پرس کرنے سے نہ گھبرائیں۔تاکہ وہ چوتھا ستون جو امارت کے قیام میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے، وہ نہ صرف اخلاق باختہ افراد کی نشاندہی کرے بلکہ اعلیٰ ترین نصب العین کے حصول میں بھی کامیاب ہو۔ساتھ ہی وہ ظلم وزیادتیاں جو چہار طرفہ برپا ہیں ،ان کا خاتمہ ہو اور امن و امان کے قیام میں موثر کردار ادا کرسکے!

! چھوٹی غلطی پر بڑی گرفت نہیں ہونی چاہیے

ملک کی راجدھانی دہلی فی الوقت سیاسی پارٹیوں اور ان کے امیدواروں کا اکھاڑہ بنی ہوئی ہے۔چہار جانب شور شرابہ ،جلسے ،جلوس، تقریریں اور اعلانات ہیں کہ جنھوں نے دہلی میں ایک عجیب و غریب ماحول پیدا کر دیا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ دہلی میں پہلی مرتبہ الیکشن ہونے جا رہے ہیں۔اس کے باوجود ملک کی دو بڑی سیاسی پارٹیاں، ملک میں اہل اقتدار بی جے پی اور سابقہ پندرہ سال دہلی میں بر سر اقتدار کانگریس، دونوں ہی کچھ پریشان پریشان دکھ رہی ہیں۔اور ان دوسب سے بڑی سیاسی جماعتوں کی پریشانی دہلی والے واقعی پہلی مرتبہ محسوس کر رہے ہیں۔اس پس منظر میں اگر سابقہ الیکشن سال 2013 کو یاد کیا جائے ،تو اُس وقت بھی دہلی میں سیاسی بساطبچھائی گئی تھی، اوریہی سیاسی جماعتیں اس وقت بھی ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھیں۔اس کے باوجود نہ اس وقت اس قدر پریشانی دکھائی دیتی تھی اور نہ ہی اتنا شور شرابہ۔پھر ایسا کیا ہوا کہ چند ماہ کے بعد اُسی شہر دہلی میں جہاں ایک طویل عرصہ سے کانگریس اور بی جے پی ادلا بدلی کا کھیل کھلیتی آئیں تھیں، وہ آج ایک دوسرا کا سہارا بنتی دکھ رہی ہیں۔نہ کانگریس بی جے پی کے کھلاف بہت کھل کر سامنے آ رہی ہے اور نہ ہی بی جے پی 'کانگریس مکت دہلی' کا نعرہ دیتی دکھائی دے رہی ہے۔دہلی وہی، دہلی والے وہی، اس کے باوجود ایک بڑی تبدیلی

ہے، جو قریب سے بھی اور دور سے بھی بہ خوبی سب کو نظر آرہی ہے۔ وجہ؟ جگ ظاہر ہے۔ 2013ء میں ایک نئی سیاسی جماعت عام آدمی پارٹی نے دہلی اسمبلی الیکشن میں حصہ لیا۔ اس وقت نہ لوگوں کو گمان تھا، نہ بی جے پی کو، نہ کانگریس کو اور نہ ہی خود اُس پارٹی اور اس کے نمائندوں و لیڈران کو، کہ وہ دہلی کی سیاست میں ایک بڑی تبدیلی کا ذریعہ بن جائیں گے۔ لہٰذا اُس وقت ماحول پر سکون تھا، کانگریس اپنے حصے سے زیادہ حکومت کر چکی تھی، اس لیے اسے کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ بی جے پی اپنی باری لینے کے لیے تیار اور پر عزم تھی۔ لیکن پریشانی اس وقت پیدا ہوئی، جب کانگریس کو امید سے بے انتہا کم اور بی جے پی کو اپنی باری کے آنے میں، عام آدمی پارٹی کے کامیاب امیدواروں کی شکل میں، مسائل کھل کر سامنے آ گئے۔ پھر کیا تھا راز فاش ہو گیا۔ اہل دہلی تبدیلی کے خواہاں ہیں، وہ نہ کانگریس پر ہی اندھا یقین رکھتے ہیں اور نہ بی جے پی سے کوئی خاص تعلق۔ اور اب چونکہ حریف کھل کر سامنے آ چکا ہے، تو کیوں نہ جمہوری نظام میں قوت، طاقت، دولت، وسائل اور کیڈر، جو کچھ بھی ہو وہ سب داؤ پر لگا دیا جائے! جمہوریت کی بہت سی خوبیاں ہیں اور انہیں خوبیوں میں یہ بھی ہے کہ عوامی نمائندہ جو عوام کے ذریعہ منتخب کیے جاتے ہیں، وہ چاہے کتنے ہی داغدار کیوں نہ ہوں، عوام ان کے حق میں اور ان کے خلاف فیصلہ کرنے کے حقدار ہیں۔ لیکن تصور کریں ایک ایسی جمہوریت کی جہاں ہر سطح پر یا بڑی تعداد میں جرائم پیشہ

اور داغدار امیدوار موجود ہوں۔ ایسے موقع پر عوام کس کو پسند اور کس کو ناپسند کریں گے؟ ممکن ہے کبھی عوام یہ دیکھیں کہ کم داغدار کون ہے تو کبھی علاقہ اور ذات پات کی بنیادوں پر پسند و ناپسند کیے جائیں۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ پسند کوئی ہو ہی نہیں، چند نوٹ اور چند شراب کی بوتلیں، امیدوار کی کامیابی کا ذریعہ بن جائیں۔ امیدوار کی کامیابی کی وجہ کوئی بھی ہو، لیکن یہ جمہوریت ہی کی خوبی ہے کہ وہ ریاست کو ایک مستحکم حکومت فراہم کرتی ہے۔ ٹھیک اسی پس منظر آیئے دیکھیں دہلی اسمبلی انتخابات کے نمائندوں کی' پروفائل کیا کہتی ہے؟ دہلی الیکشن واچ اور ایسوسی ایشن فار ڈیموکریٹک ریفارم نے اسمبلی انتخابات میں اترے 673، امیدواروں کے ذریعہ کاغذات نامزدگی داخل کرنے کے دوران دیئے گئے حلف ناموں کی بنیاد پر تیار رپورٹ جاری کی ہے۔ جس میں امیدواروں کی مالی، فوجداری اور دیگر تفصیلات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق انتخابات میں حصہ لینے والے کل 673، امیدواروں میں سے 117، ایسے ہیں جن [illegible] مجرمانہ معاملے درج ہیں۔ 74، امیدواروں کے خلاف [illegible] معاملے درج ہیں۔ 8، امیدواروں نے اپنے اوپر خواتین پر ظلم [illegible] سے متعلق کیس کی معلومات حلف نامہ میں دی ہے۔ ایک امیدوار نے اپنے اوپر قتل اور 5، امیدواروں نے اپنے اوپر قتل کی کوشش سے متعلق معاملے درج ہونے کا اعلان کیا ہے۔ وہیں دوسری جانب سیاسی جماعتوں کی بات کی جائے تو، بی جے پی کے کل 69، امیدواروں میں سے 27 کے خلاف مجرمانہ معاملے درج ہیں۔ جن میں

سے 17،امیدوار ایسے ہیں جن کے خلاف سنگین معاملے درج ہیں۔عام آدمی پارٹی کے کل 70،امیدواروں میں سے 23،کے خلاف مجرمانہ معاملے درج ہیں،جن میں سے 14،امیدوار ایسے ہیں جن کے خلاف سنگین دفعات کے تحت معاملے درج ہیں۔کانگریس کے کل 70،میں سے 21 ،کے خلاف مجرمانہ معاملے درج ہیں،جن میں 11،امید وار ایسے ہیں جن کے خلاف سنگین معاملات درج ہیں۔یہ وہ صورتحال ہے جس کے ہوتے ہوئے ہم اپنا نمائندہ 'اپنی پسند سے' طے کریں گے،اور یہی خوبی جمہوریت کی بقا کیغماز بھی ہے۔

دہلی اسمبلی کے حالیہ الیکشن ہی کے پس منظر میں چند خبریں،جو حالیہ چند دنوں میں واقع ہوئی ہیں،ان پر بھی نظر ڈالتے چلیئے،تاکہ اپنی پسند کی حکومت اور اپنی پسند کا نمائندہ طے کرتے ہوئے آسانی ہو۔پہلی خبر جو دراصل لالو پرساد یادو کی طرف سے کیا جانے والا طنز ہے۔لالو یادو اپنے ٹوئٹر اکاؤنٹ پر لکھتے ہیں: ملک کو 100،روپے کی گنجی۔لنگی والا لیڈر چاہیے یا 10،لاکھ روپے [illegible] کپڑوں سے نہیں بلکہ کام سے ہوتی ہے صاحب۔اس کے ساتھ ہی لالو نے وزیراعظم مودی اور اپنی تین تصویریں بھی اپ لوڈ کی ہیں۔وزیراعظم مودی کی تینوں تصویریں ان کے نام لکھے ہوئے سوٹ میں ہیں۔دوسری خبر مایاوتی سے متعلق ہے۔جس میں انہوں نے کہا ہے کہ نریندر مودی خواب دکھا رہے ہیں،انتخابات سے قبل بدعنوانی مٹانے ،بیروں ملک سے ملک کا

کالا دھن واپس لانے ،اور ہر غریب خاندان کے اکاؤنٹ میں 15-15 لاکھ روپے ڈالنے کی بات کہی تھی۔ لیکن آٹھ ماہ گزرنے کے بعد بھی نہ تو کالا دھن واپس آیا، اور نہ ہی غریبوں کو روپے ملے اور دیگر وعدے بھی پورے نہیں کیے۔ تیسری خبریوم جمہوریہ کے اشتہار میں لفظ 'سیکولر' اور 'سوشلسٹ' کا ہے۔ ساتھ ہی راجیہ سبھا کیلنڈر سے بھی ان الفاظ کے غائب ہونے کی خبر ہے۔ حکومت کی جانب سے وضاحتی بیان میں کہا گیا ہے کہ چونکہ یہ ہاتھ سے بنایا گیا دستاویز ہے۔ جس میں یہ دونوں لفظ شامل نہیں ہیں۔ اور اسی طرح 1950ء میں بھی ،آئین میں یہ دونوں الفاظ نہیں تھے ،اسے 42،ترتیم کے ذریعہ ایمرجنسی کے وقت شامل کیا گیا تھا۔ اور آخری خبر یہ کہ جن لوک پال بل کے لیے ملک گیر سطح پر تحریک چلانے والے بزرگ و سماجی کارکن انا ہزارے، کانگریس پارٹی اور عام آدمی پارٹی کے لیڈر اروند کیجریوال کا مذاق اڑانے والا اشتہار بی جے پی کے ذریعہ شائع کیا گیا۔ اشتہار میں نعرہ لکھا گیا ہے: اقتدار کے لیے بچوں کی جھوٹی قسم تک کھاؤنگا اور رات دن ایمانداری کا ڈنکا بجاؤں گا۔ اس پر عام آدمی پارٹی نے سخت اعتراض کیا۔ سابق وزیر اعلی اروند کیجریوال نے بی جے پی کے اشتہار پر سخت رد عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ناتھو رام گوڈسے نے گاندھی جی کو مارا تھا اور بی جے پی نے انا ہزارے کو مار دیا۔ دہلی کی موجودہ سیاست کے پس منظر میں یہ چند جھلکیاں ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسمبلی انتخابات کیا نتائج دیتے ہیں۔ نتائج جو بھی ہوں لیکن یہ بات طے ہے کہ دہلی کے انتخابات اور یہاں کی

کامیابی و ناکامی کے اثرات آئندہ دنوں ریاست بہار اور اترپردیش کے اسمبلی انتخابات پر بھی پڑیں گے۔یہی وجہ ہے کہ ایک طرف برسر اقتدار بی جے پی اپنی پوری طاقت لگائے ہوئے کہ کسی طرح دہلی میں وہ اکثریت حاصل کرلے تو وہیں عام آدمی پارٹی بھی اپنی سعی و جہد میں مصروف ہے۔کانگریس کو امید ہے کہ سابقہ کے مقابلے اس مرتبہ اس کی ایک دو سیٹیں بڑھ کر آئیں گی۔اس سب کے باوجود سیاسی جماعتوں کے کیڈر کے علاوہ عام شہری کنفیوژ ہیں کہ ووٹ کا استعمال کرتے ہوئے کس کو اکثرت اور کس کو اقلیت میں رکھا جائے۔اس موقع پر یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ حکومت چاہے کسی کی بھی بنے لیکن اپوزیشن بھی مضبوط ہونا چاہیے۔تاکہ مفاد عامہ کے خلاف لیے جانے والے فیصلوں پر گرفت کی جاسکے۔کہیں پارلیمانی انتخابات کی طرح اپوزیشن کا خاتمہ ہی نہ ہو جائے،کہ جس کے بعد ملک انتشار میں مبتلا ہو۔وہیں دوسری طرف اگر ایسا ہو جائے کہ ایک نئی طرز حکومت کا وعدہ کرنے والے ،ریاست دہلی کی باگ دوڑ پورے پانچ سال سنبھالیں،تو کھل کر انہیں بھی جانچنے اور پرکھنے کا موقع مل جائے گا۔کیونکہ وہ لوگ جو کل ہی سیاست میں آئے ہیں،ان کی غلطیوں پر بڑی گرفت نہیں ہونی چاہیے۔گرفت تو ان کی ہونی چاہیے جو ایک طویل عرصہ سے سیاسی میدان میں خدمات انجام دیتے ہوئے عوامی فلاح و بہبود کے کام انجام دیں یا نہ دیں،اس کے باوجود وہ کبھی بھی اپنی دنیا سنوارنے سے نہیں چوکے!

دلّی کی تبدیلی خدائی منشا ہے

دہلی میں بڑی شکست کے بعد بی جے پی کے ساتھ آر ایس ایس میں بھی احتساب کا دور جاری ہے۔اس کی تازہ مثال موہن بھاگوت کے ذریعہ تین مرکزی وزرا کو بلا کر ان سے جواب طلبی کا واقعہ ہے۔اس بات پر دہلی میں یونین دفتر کیشو کنج میں روی شنکر پرساد، اسمرتی ایرانی اور نرملا سیتارمن کو بلانا اور ان سے بی جے پی کی منفی مہم کو لے کر چبھتے ہوئے سوالات کا کیا جانا، واقعہ کی مزید توثیق کرتا ہے۔سیتارمن سے پوچھا گیا کہ انہوں نے کیجریوال کے خلاف "چور" لفظ کا استعمال کیوں کیا؟اسمرتی ایرانی کے خلاف یونین سے وابستہ لوگوں نے شکایت کی تھی کہ انہوں نے یونین سے وابستہ کچھ لوگوں کے مشوروں پر توجہ نہیں دی۔وہیں بی جے پی کے کچھ کارکنوں نے وزراء کے اہنکار بھرے رویے کو لے کر شکایت کی تھی اور کچھ نے کہا تھا کہ مہم کے دوران ان کی جگہ باہر سے آئے رہنماؤں اور ان کے کارکنوں کو ترجیح دی گئی ہے۔ذرائع بتاتے ہیں کہ ان سوالات کی وجہ دراصل الیکشن میں پیچھے رہ جانے اور منظر عام پر آنے والی غلطیوں سے سبق لیتے ہوئے مستقبل میں اس کے اعادہ سے اجتناب ہے۔موہن بھاگوت نے دہلی بی جے پی کے بڑے لیڈر جگدیش مکھی سے بھی ملاقات کی ہے، ساتھ ہی یونین کے سربراہ نے دہلی میں تعینات یونین کے پرچارکوں سے بھی شکست پر رپورٹ طلب کی گئی ہے۔ان رپورٹوں

پر آئندہ ماہ ناگپور میں ہونے والی آر ایس ایس کی کل ہندایوان نمائندگان میں بحث ہوگی۔ دہلی میں ہوئی جائزہ مٹنگ میں موہن بھاگوت کے علاوہ بھیاجی جوشی، دتاتریہ ہوسبولے، کرشن گوپال اور سریش سونی بھی شامل تھے۔ خبر نے پہلے سے موجود بیانوں میں مزید پختگی پیدا کی ہے کہ آر ایس ایس کے طے شدہ مقاصد، ایجنڈے، طریقہ کار، اور پالیسی کی روشنی ہی میں فی الوقت ملک عزیز ہند میں بی جے پی اپنی سرگرمیوں کو انجام دے رہی ہے۔ لہذا بی جے پی کے لیڈران کی شکل جو لوگ بھی ملک کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں وہ ایک خاص مقصد و نصب العین کے حصول میں سرگرداں ہیں۔ جو درحقیقت ہندوستان کے تکثیری سماج کے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ بات کی توثیق دہلی کے حالیہ اسمبلی الیکشن اور ان کے نتائج ہیں، جو خود اپنے آپ میں بہت کچھ بیان کرتے ہیں۔

دوسری جانب عام آدمی پارٹی، اس کے والینٹرس اور ذمہ داران کی انتھک جدوجہد نے آخرکار کامیابی ان کی جھولی میں ڈال دی ہے۔ لیکن کامیابی صرف جدوجہد کا ہی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ عام آدمی پارٹی کی پالیسی، عوام سے کیے گئے وعدے اور کانگریس پارٹی میں لیڈرشپ کا زوال بھی اس تاریخی کامیابی کے اہم اجزا ہیں۔ یہ بات کسی حد تک 2013 میں بھی دہلی کے عوام کے سامنے آچکی تھی کہ بی جے پی، جسے درحقیقت مخصوص گروہ کے علاوہ دیگر پسند نہیں کرتے، کا متبادل کانگریس کی شکل میں موجود ہے اس کے باوجود کانگریس میں وہ دم خم نہیں جو

مطلوب ہے۔ وہیں دوسری طرف 2013 میں اقلیتیں بھی عام آدمی پارٹی کے سلسلے میں تذبذب کا شکار تھیں۔ برخلاف اس کے 2013 میں جس پارٹی نے 8 سیٹیں حاصل کیں تھی وہ اس مرتبہ سیٹوں کے لحاظ سے بالکل ہی ختم ہو گئی ہے۔ ووٹ شیئر 2013 میں جو کانگریس کو 24.55% فیصد حاصل ہوا تھا 2015 میں کم ہو کر صرف 9.8% فیصد رہ گیا۔ وہیں اگر دہلی کی آبادی پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں 81% فیصد ہندو، 11.7% فیصد مسلمان، 5% فیصد سکھ، 1.1% فیصد جین اور 1.2% دیگر مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ اور یہ 15% فیصد کا شفٹ جو کانگریس سے عام آدمی پارٹی کی جانب آیا ہے، یہ وہی اقلیتوں کا فیصد ہے، جو گزشتہ مرتبہ عام آدمی پارٹی کو حاصل نہیں ہو پایا تھا۔ نتیجتاً جہاں کانگریس کے کل 8، امیدوار کامیاب ہوئے [illegible] 8 میں سے 6، اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہیں 2014 میں 18.5% فیصد اقلیتی ووٹ، پوری طرح عام آدمی پارٹی کے حق میں جانے سے، نتائج ایگزٹ پولس کے اندازوں سے بھی آگے نکل گئے۔ جس کی توقع گزشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی عام آدمی پارٹی کے لیڈران کو نہیں تھی۔ اس نمایاں تبدیلی میں بی جے پی اور اس سے وابستہ تنظیموں کی جانب سے چلائی جانے والی نفرت آمیز مہم، جس میں مختلف قولی و عملی رویوں کے ساتھ 2021 تک ملک کو ہندو راشٹر بنانے اور اقلیتی فرقے کے لوگوں کو ہندو مذہب میں ضم کرنے جیسے بیانات نے جلے پر نمک چھڑکنے کا کام کیا ہے۔ وہیں ان زہر آلودہ بیانات اور عملی رویوں نے ملک کی راجدھانی دہلی میں رہنے بسنے والے ہر طبقہ کے سنجیدہ اور پڑھے لکھے افراد کو احساس

دلایا کہ یہ بیانات اور عملی رویے نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک کے لیے نقصان دہ ہیں۔لہٰذا متبادل کی تلاش مزید تیز ہو گئی،اور متبادل جو انہیں ملااس کے حق میں اپنا قیمتی ووٹ دے ڈالا۔اب دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ آنے والے دنوں میں جن اقلیتوں کے یکطرفہ ووٹ نے عام آدمی پارٹی کو تاریخی کامیابی سے ہمکنار کیا ہے،اُن کے مسائل میں وہ کتنی دلچسپی لیتی ہے اور کیا کردار ادا کرتی ہے؟کیونکہ بی جے پی جو گزشتہ 2013 میں 34% فیصد ووٹ کے نتیجہ میں 31 سیٹوں پر کامیاب ہوئی تھی وہی بی جے پی اس مرتبہ 33% فیصد ووٹ حاصل کرنے کے باوجود صرف 3 سیٹوں پر محدود ہو گئی ہے۔اس سے یہ بات بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں امن پسند اور سنجیدہ طبقہ فرقہ پرست جماعتوں کے خلاف کھڑا ہوتا ہے وہیں نتائج کے اعتبار سے اقلیتی ووٹ سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔لیکن یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ وہ یکطرفہ ہوں،نہ کے تقسیم شدہ،جس کی نظیریں بے شمار موجود ہیں۔

نئی حکومت بننے اور پرانی حکومت کے جانے کی وجوہات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اہل دہلی گزشتہ ایک دہائی سے خصوصاً اور عموماً بڑے عرصے سے کرپشن،لوٹ مار،زنا بالجبر،مہنگائی اور بنیادی سہولیات کی فراہمی جیسے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔اس کے باوجود عام آدمی پارٹی نے عام آدمی کو امید دلائی ہے کہ وہ نہ صرف نظم ونسق کو درست کریں گے بلکہ عوامی مسائل کے حل

بھی تلاش کریں گے۔ مسائل میں جہاں ایک جانب خستہ حال تعلیمی ادارے اسپتال، پانی، بجلی اور سڑکیں ہیں وہیں خواتین اور بچوں کا ہر سطح پر استحصال بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔مزید یہ کہ روز مرہ کے معاملات میں کرپشن اہم ترین مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ساتھ ہی تقریباً2,000 غیر قانونی کالونیوں میں رہنے والے 60،لاکھ بد حال افراد مختلف قسم کی پریشانیوں سے دوچار ہیں۔ان کالیونیوں میں پینے کے صاف پانی کا کوئی نظم نہیں ہے، سڑکیں ٹوٹی ہوئی یا موجود ہی نہیں ہیں، گندگی اور کوڑا کرکٹ چہار جانب پھیلا ہوا ہے، گھریلو اور بارش کے پانی کی نکاسی کے لیے بہتر انداز میں سیوریج اور نالیوں کا بندوبست نہیں ہے، تعلیم، اور صحت عامہ کے بے شمار مسائل ہیں،ان تمام لاچاریوں کے ساتھ عوام غربت اور بے روزگاری کا شکار ہے۔صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت تشکیل دی جاچکی ہے لیکن جن امیدوں کے مینارے پر یہ حکومت قائم ہونے جارہی ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے لوہے کے چنے چبانے ۔اس سب کے باوجود وزیر اعلیٰ اروند کیجریوال ،ان کی کابینہ اور ٹیم سے جہاں عوام کو بہت ساری توقعات ہیں وہیں وہ پورے پانچ سال کا وقت بھی دینے کو تیار ہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ یہ عام آدمی کی کہی جانے والی عام آدمی پارٹی کس حدتک پانچ سال میں اپنے وعدوں پر پوری اترتی ہے۔حالات چیلنج بھرے ہیں،اور حکومت میں آنے والے افراد بھی اپنی ذمہ داریوں کو بہ خوبی جانتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ کیجریوال نے حلف برداری تقریب میں ذمہ داران دہلی کو اپنے دل کی بات پہنچادی ہے۔وہ کیا باتیں

ہیں؟آیئے ان پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔
حلف۔بردار تقریب میں اروند کیجروال نے اپنی پہلی تقریر میں بحثیت وزیر اعلیٰ عوام وخواص سبھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم تمام مذاہب کے لوگوں کو چاہے وہ امیر ہوں یا غریب ساتھ لے کر چلیں گے۔لوک پال بل پاس کرائیں گے ساتھ ہی اس پر عمل درآمد کریں گے۔دہلی کو آئندہ پانچ سال میں کرپشن فری ریاست کا درجہ دیں گے۔ایک ایسی دلّی بنائیں گے جہاں ہندو۔ مسلم۔ سکھ۔ عیسائی اور جین،ہر مذہب کے لوگ خود کو محفوظ سمجھیں۔دہلی کو مکمل ریاست کا درجہ دیں گے اور اس میں مرکزی حکومت جو مکمل اکثریت کے ساتھ پارلیمنٹ میں موجود ہے اس کا بھر پور تعاون حاصل کریں گے۔تاجروں کو تجارت کے مواقع فراہم کریں گے،شرط یہ ہے کہ وہ حکومت کو دیے جانے والے ٹیکس میں چوری نہ کریں۔اور آخری بات جو بہت اہم ہے وہ یہ کہ ہماری پارٹی کوچونکہ ہر مذہب کے لوگوں نے ووٹ دیا ہے،جس کے نتیجہ میں یہ تاریخی تبدیلی نظر آئی ہے،اس کے باوجود یہ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ ہماری آپ کی اور لوگوں کی کوششوں سے نہیں ہوا ہے بلکہ اوپر والے کی منشا سے ہوا ہے،ہم، تو صرف ذریعہ بنے ہیں۔لہٰذا ہم خدائی منشا کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے ،ریاست میں امن وامان اور بھائی چارے کی فضا عام کریں گے۔اور کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جو خدائی منشا یا اس کے بندوں کے خلاف ہو۔اور یہ خلاف ورزیوں کا

سلسلہ بھی اسی وقت شروع ہوتا ہے جبکہ انسان تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ہم ہر سطح پر تکبر کا خاتمہ کریں گے۔وزیر اعلیٰ کی باتیں ختم ہونے کے بعد مسلمان جو ہمارا قاری ہے جہاں اسے یہ غور و فکر کرنا ہے کہ اس خدائی تبدیلی میں اس کا کیا حصہ ہے؟وہیں اسے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ نئی حکومت کو صحیح رخ پر قائم رکھنے اور اس کے ساتھ مل کر امن و امان و عدل و انصاف کے قیام میں وہ کیا کردار ادا کر سکتا ہے!

اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ ہم۔۔۔۔

یہ حقیقت ہے کہ تمام ہی افکار و نظریات کے حاملین تشدد اور اشتعال انگیزی کو اچھا نہیں سمجھتے۔اس کے باوجود اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ گزشتہ چند سالوں میں ہر سطح پر جرائم و تشدد میں اضافہ ہوا ہے۔یہ واقعات کیوں رونما ہوتے ہیں؟اور ان کو انجام دینے والوں کو کیا فائدہ حاصل ہوتے ہیں؟ان جیسے بے شمار سوالات ہیں جن کے جواب ملک کا ہر شہری تلاش کرنا چاہتا ہے، اس کے باوجود کسی ٹھوس نتیجہ تک پہنچنا اور پختہ بنیادوں پر جواب تلاش کر لینا ممکن نہیں ہے۔وجہ یہ ہے کہ اُس کے پاس وہ وسائل موجود نہیں ہیں، جس کے ذریعہ واقعہ کی صحیح روداد،انجام دی گئی سرگرمی اور واقعہ کے نتیجہ میں انفرادی واجتماعی فائدے و نقصانات اخذ کیے جا سکیں۔اس کے باوجود واقعات کا سلسلہ وار جائزہ لینے سے کسی حدتک اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ متاثرین کون ہیں اور فائدے کہاں اور کسے حاصل ہو رہے ہیں۔لیکن ثبوتوں کی کمیت کی بنا پر، ممکن ہے کہ نتائج جو اخذ کیے جا رہے ہیں، وہ غلط ہوں۔ایسا ہی ایک واقعہ آج سے تقریباً تیرہ سال پہلے سن 2002 میں منظر عام پر آیا تھا،بے شمار لوگ حادثہ کا شکار ہوئے ،حکومت نے اس تعلق سے کمیشن بنایا اور رپورٹیں طلب کیں۔ملزمین کے خلاف مقدمے دائر ہوئے اور مجرمین کو سزائیں سنائی گئیں۔اس سب کے باوجود ہمت نگر فسادات میں مارے

گئے3،برطانوی شہری اور ایک ہندوستانی ڈرائیور کیس کے
تمام 6،ملزمین۔" خوش قسمت ہیں" جنھیں اسپیشل کورٹ نے بری کر

دیا۔وجہ؟ثبوتوں کا فقدان۔فیصلہ سناتے ہوئے کورٹ نے کہا کہ ایسی صورت میں جبکہ ملزمان کے خلاف کافی ثبوت نہیں ہیں،بری کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچتا۔کورٹ کا فیصلہ اور اس کے الفاظ خود کورٹ کی لاچاری کو واضح کرتے ہیں،کیونکہ ہر کورٹ میں فیصلہ شواہد اور ثبوتوں کی بنا پر ہی دیا جاتا ہے۔لہذا یہ فیصلہ بھی اسی پس منظر میں سامنے آیا ہے یعنی شواہد اور ثبوتوں کا فقدان۔فیصلہ سناتے ہوئے ہمت نگر ڈسٹرکٹ کے پرنسپل جج آئی سی شاہ نے کہا کہ چونکہ تمام ملزمان پر آئی پی سی کی دفعہ 302 قتل اور 307 قتل کی کوشش کے تحت مجرم ثابت کرنے میں ناکام رہا۔اور میرے پاس کوئی متبادل نہیں ہے،اس لیے میں تمام ملزمان کو بری کر رہا ہوں۔

دوسری جانب اُسی گجرات میں جہاں کا واقعہ اوپر درج ہے،گاندھی جی پیدا ہوئے اور انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے اُس وقت ستیہ گرہ کو اپنا ہتھیار بنایا،جبکہ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہوئے تھے۔ستیہ گرہ،دراصل ظلم کے خلاف عوامی سطح پر منظم سول نافرمانی ہے،جو عدم تشدد پر مبنی ہے۔1915ء میں ملک انگریز حکومت کا غلام تھا اور ملک کا کسان اور مزدور طبقہ حددرجہ ظلم و ستم برداشت کر رہا تھا۔اس وقت گاندھی جی نے مروجہ

تعصب کے خلاف آواز اٹھائی اور کسانوں اور شہری مزدوروں کے ساتھ بے تحاشہ زمین کی چنگی اور تعصب کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ ملک غلام تھا اور کسانوں پر ظلم وستم جاری تھا۔ لیکن آج ملک کو آزاد ہوئے 68، سال کا عرصہ مکمل ہونے کو ہے،اس کے باوجود ملک میں کسانوں کا استحصال جاری ہے چاہے وہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی جانب سے ہو۔بڑی فیکٹریوں کے لگانے سے کھیتی کی افزائش کا متاثر ہونا ہو،یا کیمکل سے آلودہ پانی اور فضا کھیتیوں کو برباد کر رہی ہو یا پھر حکومت وقت تحویل آراضی قانون کے تحت کسانوں کا استحصال کیا چاہتی ہو۔ ظلم وستم پہلے بھی جاری تھا اور آج بھی جاری ہے ، بس طریقے اور نام بدلے ہوئے ہیں۔ایک گاندھی اس وقت کسانوں کی بقا کے لیے جدوجہد کر رہا تھا تو ایک آج گاندھیائی تعلیمات پر عمل پیرا انا ہزارے، کسانوں پر جاری استحصال کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ عدم تشدد کے تصور پر مبنی ملک ہندوستان ، جس کی تاریخ میں اشوکا اور بدھ کی تعلیمات بھی قابل ذکر مانی جاتی ہیں،کیا امن وامان کے قیام اور ظلم وزیادتیوں کے خاتمہ میں یہ طریقہ کامیاب ہوگا؟ایسے موقع پر گاندھیائی تعلیمات پر عمل پیرا افراد کو گاندھی کی سوانح کا بھی مطالع کرنا چاہیے، جس میں گاندھی خود "حق کے ساتھ میرے تجربات کی کہانی" و فلسفہ میں لکھتے ہیں، کہ "جب میں مایوس ہوتا ہوں، تو میں یاد کرتا ہوں کہ پوری تاریخ مین سچ اور محبت کے راستہ کی ہمیشہ جیت ہوئی ہے۔ دنیا میں بڑے سے بڑے قاتل اور ظالم

ہوئے ہیں جو ایک وقت نا قابل شکست لگے، لیکن آخرکار وہ زیر ہو کر رہے"۔اور یہی میری بھی جدوجہد کی امید ہے۔

حالات کے تناظر میں تیسری جانب وہ اسلامی تعلیمات ہیں، جس کی روشنی میں ظلم و ستم کے زمانے میں انسان کا رویہ کیا ہو؟ اس کی واضح تعلیمات ملتی ہیں۔قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔(مظلوم ہونے کی صورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے) لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ، یا کم از کم برائی سے درگزر کرو، تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے" (النساء:۱۴۹)۔اس آیت میں مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔کہا کہ اس میں شک نہیں کہ تم پر ظلم کیا جا رہا ہے اور تم مظلوم ہو، لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا علانیہ ہر حال میں بھلائی کیے جاؤ اور برائیوں سے درگزر کرو، کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔جس خدا کا قرب چاہتے ہو اس کی شان یہ ہے کہ نہایت حلیم اور بردبار ہے، سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بڑے سے بڑے قصوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے۔لہٰذا اس سے قریب تر ہونے کے لیے تم بھی عالی حوصلہ اور وسیع الظرف بنو۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں پر جاری ظلم و ستم اور زیادتیوں واستحصال کا، فی زمانہ مقابلہ کیا جاتا رہا ہے۔اس کے باوجود مسائل کا حل متعلقہ زمانہ میں مختلف نظریاتی وعملی رویوں سے تلاش کیا گیا ہے۔ان ہی طریقوں میں سے ایک طریقہ رائج الوقت عدالت کا ہے جس میں شواہد و ثبوتوں کی بنا پر فیصلے لیے جاتے ہیں۔دوسرا عدم تشدد جیسی تحریکوں و نظریات کا ہے، جس میں انسان ظلم و تشدد کا مقابلہ اپنے مخصوص انداز میں کرتا ہے۔اور تیسرا وہ طریقہ ہے جو خود انسانوں کے پیدا کرنے والے نے بتایا ہے۔یہ طریقہ فی الوقت سورہ النساء کی آیت 149،کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ظلم و ستم جو جاری ہے، اور آئندہ جو متوقع ہے، کا حل کون سے طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے تلاش کیا جاسکتا ہے؟ساتھ ہی یہ بھی طے کریں کہ مسائل کے حل کے لیے ہم کس وقت قدم اٹھائیں گے؟اس وقت جبکہ وہ رونما ہو چکے ہوں؟ یا قبل از وقت بھی ان سے بچنے کی تدابیر تلاش کی جاسکتی ہیں؟ہندوستان میں عموماً ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف کمیونٹی، گروپ اور فرقے جب حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں، اس کے بعد ہی سوچنے اور غور و فکر کرنے والے متحرک ہوتے ہیں۔برخلاف اس کے واقعہ سے پہلے اور واقعہ کے ایک عرصہ بعد، خواب خرگوش میں کھوئے رہتے ہیں۔پھر جب کوئی واقعہ رونمانہ ہوجاتا ہے تو پہلی کوشش امن کمیٹیوں کا قیام ہے،تو وہیں دوسری کوشش مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے سست رفتاری

سے قانونی چارہ جوئی کا عمل۔سوال یہ ہے کہ ہم جس مقام پر بھی موجود ہیں،کیا وہاں قبل از وقت ایسی کمیٹیاں تشکیل نہیں دی جا سکتیں جو نہ صرف حادثہ کے وقت امن کے قیام میں مددگار ہوں بلکہ عام حالات میں بھی ایک دوسرے کی خبر گیری،مدد اور تعاون میں موثر کردار ادا کریں؟ساتھ ہی ایسے افراد جو ظلم و جبر کو پسند نہیں کرتے، جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ظلم کے لیے اٹھنے والے ہاتھوں پر گرفت ہونا چاہیے،ان کے خلاف نہ صرف قانونی چارہ جوئی ہونی چاہیے بلکہ سزا بھی دلوانی چاہیے۔کیا ایسے افراد کو مقاصد کے حصول کے لیے قبل از وقت منظم نہیں کیا جاسکتا؟واقعہ یہ ہے کہ حادثہ سے پہلے ہی سنجیدہ اور منظم کوششیں مستقبل قریب میں ہونے والے حادثات سے بچاتی ہیں۔لہذا ان دو پہلوؤں سے امن پسند طبقے کو ہمہ وقت سرگرم رہنے کی ضرورت ہے۔اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ ہم انسانی بنیادوں پر اپنے گرد و پیش کے افراد سے مضبوط رشتے استوار رکھتے ہوں!

! مسائل کا بڑھتا گراف اور عالمی دن منانے کا رواج

دنیا میں بے شمار کام ایسے ہیں جو یا تو کسی کو فائدہ پہنچانے کے لیے یا پھر نقصان کی غرض سے انجام دیے جاتے ہیں۔لیکن کون سا کام فائدہ کے لیے اور کون سا نقصان پہنچانے کے لیے انجام دیا جارہا ہے، بعض اوقات اس کی وضاحت کرنا ذرا مشکل ہو جاتی ہے۔اس کے باوجود مسلسل اور سلسلہ وار سرگرمیوں کے جائزے میں مثبت و منفی نتائج کو اخذ کیا جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔لیکن فکر و نظر کا اختلاف ایک ایسا اختلاف ہے جس میں مخصوص کام کی انجام دہی اور اس کے طے شدہ نتائج،ایک شخص و گروہ کے لیے منفی تو وہیں دوسروں کے لیے مثبت بھی ہو سکتے ہیں۔لیکن یہاں بھی اگر باریکی سے جائزہ لیا جائے تو باخوبی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ کون سا کام مہلک ہے تو کون سا سود مند۔کچھ ایسا ہی معاملہ اُن عالمی دنوں ،ہفتوں اور مہینوں کا بھی ہے جنہیں سماجی ومذہبی رسم و رواج ، مختلف افکار و نظریات اور کلچر کے فروغ کے پیش نظر اقوام متحدہ یا دیگر نظریات سے وابستہ تنظیموں وگروہوں کی جانب سے منایا جاتا ہے۔دراصل یہ عالمی دن منانے کا رواج اس بازار کی مانند ہے جہاں ایک عالمی سطح کے بازار میں بڑے پیمانہ پر اشیاء کی خرید و فروخت اور منافع کے اصولوں کارفرما ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ملین ٹریلین دولت،اِن عالمی دنوں ،ہفتوں اور مہینوں کو منانے میں خرچ ہوتی ہے۔اس کے باوجود

نہ مسائل میں کمی آتی ہے اور نہ ہی یہ مخصوص دن سماجی، معاشی، معاشرتی، تمدنی، اخلاقی و انسانی بنیادوں پر کارآمد ثابت ہو رہے ہیں۔ کسی بھی ملک کا ایک عام شہری مسائل کے انبار میں ہر دن مزید الجھتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود نہ دن منانے سے قبل اور نہ ہی بعد میں اس کو کوئی آسرا نظر آتا ہے۔

یہ بات ایک طویل عرصہ سے کہی اور سنی جا رہی ہے کہ خواتین کو مردوں کے برابر حقوق دیے جانے چاہیے، اُن کے اور مردوں کے درمیان کسی بھی سطح پر امتیاز برتنا نہ صرف غیر اخلاقی بلکہ غیر قانونی بھی ہے۔ اس پس منظر میں خواتین کی آزادی کی جدوجہد کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد صنفی امتیاز کے خاتمے کے تصور کو تقویت ملی۔ امریکا اور یورپ کے سوشلسٹوں نے سب سے پہلے خواتین کی آزادی کی جدوجہد کو منظم کیا۔ 1908ء میں جرمن خواتین کی انجمن کی طویل ہڑتال کی یاد میں سوشلسٹ انٹرنیشنل نے ڈنمارک میں ہونے والی تیسری کانفرنس میں یہ دن منانے کا فیصلہ کیا۔ سوشلسٹ پارٹی آف امریکا نے 28 فروری 1909ء کو خواتین کا عالمی دن منانے کا فیصلہ کیا۔ 19 مارچ 1911ء میں آسٹریلیا، ڈنمارک، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں لاکھوں افراد نے جلوس نکال کر خواتین کی جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا۔ 1913ء میں روس میں خواتین نے فروری کے آخری ہفتے کو خواتین کے عالمی دن کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ 1914ء میں جرمنی میں اس دن کو خواتین کے ووٹ کے حق سے

منسوب کیا گیا۔ روس کے شہر سینٹ پیٹرس برگ میں 8 مارچ 1917ء کو خواتین نے پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے لیے مظاہرہ کیا۔ یہ خواتین ہتھیاروں کے بجائے روٹی کامطالبہ کر رہی تھیں۔جب 1917ء میں روس میں سوشلسٹ انقلاب آیا اور سوویت یونین قائم ہوئی تو سوویت یونین کے بانی ولاڈیمر لینن نے 8 مارچ کو خواتین کا عالمی دن قرار دیا، سوویت یونین کے آئین میں تحریر کیا گیا کہ خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ سوویت آئین دنیا کا پہلا آئین تھا جس میں خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق کی ضمانت دی گئی جس کی یورپ اور امریکا نے بھی پیروی کی۔خواتین کے حقوق اور ان کی بازیابی کے تصور کے پیش نظر کل یعنی 8،مارچ 2015ء

ہندوستان سمیت دنیا کے دیگر ممالک میں خواتین کا عالمی دن بڑے دھوم دھام سے منایا ہے۔اور اُن فیصلوں پر عمل درآمد کی بات کہی ہے جس سے خواتین کو ان کے حقوق حاصل ہو سکیں۔اس کے باوجود گزشتہ طویل جدوجہد بتاتی ہے کہ زمانے کے متغیر حالات میں آج بھی ہر سطح پر خواتین حد درجہ ظلم کا شکار ہیں۔ساتھ ہی تشدد کے دیگر واقعات نے امن و بھائی چارے کا خاتمہ کیا ہے نیز زندگی مزید دشوار کر دی ہے۔

تشدد کا تازہ واقعہ گزشتہ دنوں ہندوستانی کی شمال مشرقی ریاست ناگالینڈ میں رونما ہوا ہے۔جہاں نہ صرف کھلے عام قانون کی دھجیاں اڑائی گئی بلکہ خود ہی منصف بن کر ملزم کے خلاف فیصلہ بھی صادر کر دیا۔واقعہ نے ملک بیرون ملک

رہنے والے ہندوستانیوں کو جہاں ایک جانب حد درجہ شرمندہ کیا ہے وہیں ریاست اور اس کی انتظامیہ پر بھی سوال کھڑے کیے ہیں۔ واقعہ اُس مشتعل ہجوم کا ہے جس نے دیماپور کی سینٹرل جیل میں گھس کر زنا بالجبر کے ایک ملزم کو نہ صرف باہر نکالا بلکہ تشدد کا وہ طریقہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں ملزم ہلاک ہوگیا۔ اور یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جبکہ شہر میں کرفیو نافذ تھا۔ اطلاعات کے مطابق پولیس کی فائرنگ میں زخمی ہونے والا ایک شخص بھی چل بسا ہے جبکہ چار افراد زیر علاج ہیں۔ واقعے کی ایک مختصر ویڈیو فلم ٹی وی چینلوں پر دکھائی جا رہی ہے۔ جس میں ہزاروں مظاہرین اُس شخص کو برہنہ حالت میں اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں، جسے ایک ناگا لڑکی کے ریپ کے الزام میں چند روز قبل گرفتار کیا تھا۔ اور گرفتاری کے بعد عدالت نے اسے جیل بھیج دیا تھا۔ مظاہرین کی رہنمائی ناگا طلبہ کی ایک تنظیم کر رہی تھی اور علاقے سے موصول ہونے والی خبروں کے مطابق ان کا ارادہ اس شخص کو سر عام پھانسی دینے کا تھا لیکن شدید پٹائی کی وجہ سے ملزم نے راستے میں ہی دم توڑ دیا۔ ابتدائی اطلاعات کے مطابق ہلاک کیا جانے والا شخص بنگلہ زبان بولنے والا تھا۔ واقعے کے بعد علاقے میں کشیدگی برقرار ہے۔ وہیں دوسری طرف وزیر داخلہ راج ناتھ سنگھ نے واقعہ پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ صورتحال پر قابو پانے کے لیے سکیورٹی کے مناسب انتظامات کیے جا رہے ہیں اور نیم فوجی دستوں کو تیار رہنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ ریاست کے ڈائریکٹر جنرل پولیس کے مطابق پولیس نے طاقت

کا زیادہ استعمال کرنے سے گریز کیا کیونکہ اس سے اور زیادہ جانی نقصان ہو سکتا تھا۔ ان کے مطابق تفتیش جاری ہے اور ویڈیو کی مدد سے جتنے بھی لوگوں کی شناخت ہوگی انہیں گرفتار کیا جائے گا۔

سوال پھر اٹھتا ہے کہ ہر سال خواتین کے عالمی دن منانے سے کیا حاصل ہو رہا ہے؟اُس صورت میں جبکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں زنا باالجبر کے واقعات میں اضافہ سامنے آرہا ہے۔حکومت سخت سے سخت قوانین بنارہی ہے وہیں دوسری جانب وہ چور دروازے بھی کھولے جارہے ہیں جن کا مقصد غالباًزنااور ان جیسے دیگر اخلاق سوز حرکات کو کم کرکے دکھاناہے۔ہندوستانی قانون کی دفعہ-375زنا بالجبر کی تفصیلات پیش کرتی ہے۔جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ کسی شخص کو "زنا بالجبر"کا مرتکب اس وقت کہا جائے گا جبکہ وہ کسی عورت سے درج شدہ چھ حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں مباشرت کرے۔ (iاس کی مرضی کے خلاف۔ (iiاس کی رضا مندی کے بغیر۔ (iiiاس کی رضامندی سے جبکہ ایسی رضامندی قتل یا ضرر کا خوف دلا کر حاصل کی گئی ہو۔ (ivاس کی رضا مندی سے جبکہ مرد جانتا ہو کہ وہ جائز طور پر اس سے شادی شدہ نہیں اور یہ کہ رضا مندی اس بناء پر دی گئی ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتی ہے کہ مرد وہ دوسرا شخص ہے جس کے ساتھ اس کی شادی جائز طور پر ہوئی ہے یا جائز طور پر شادی شدہ ہونا باور کرتی ہے۔ (vاس کی رضا مندی سے جبکہ ایسی رضا مندی دیتے وقت وہ فتور عقل

یا نشہ یا اس شخص کے ذریعہ ذاتی طور پر یا کسی اور شخص کے ذریعہ کوئی بے شعوری یا طبیعت کو بگاڑنے والی شئے کی وجہ سے، وہ اس امر کی نوعیت اور نتائج سمجھنے سے قاصر ہے جس کے لیے وہ رضا مندی دیتی ہے۔اور آخری یعنی چھٹی شکل vi) اس کی رضا مندی سے یا اس کے بغیر جبکہ وہ سولہ سال سے کم عمر کی ہو۔دستور ہند کی روشنی میں یہ وہ حالات ہیں جبکہ زنا کو زنا بالجبر کہا جائے گا اور ان ہی بنیادوں پر جرم ثابت ہوگا و سزا دی جائے گی۔برخلاف اس کے دیگروہ حالتیں جن میں دونوں کی رضامندی ہو اور ان پر قانون کی گرفت بھی نہ آتی ہو، ایسی حالت میں "زنا" قانون کی نظر میں برائی نہیں اور نہ ہی اس پر سزا دی جائے گی۔توجہ فرمائیں کیا قانون کی یہ شقیں ایک مذہب معاشرے کی تشکیل میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں؟ یا حالات کے پیش نظر مزید تبدیلیاں درکار ہیں؟لیکن سوال یہ ہے کہ فیصلہ کون کرے گا؟ خواتین کا عالمی دن منانے والے افراد، گروہ، این جی اوز اور برسر اقتدار طاقتیں؟ یا انسان کو بنانے والا معبودبرحق جس نے نہ صرف انسان کو بنایا بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے ایک بہتر زندگی وہ کیسے گزارے اس کی بھی واضح تعلیمات وہدایات مکمل طور پر فراہم کر دی ہیں؟!

غیر مذہبی جمہوریت " کیا یہ نظریہ درست ہے؟"

گزشتہ دنوں جہاں ایک جانب دیماپور کا شرمناک واقعہ خبروں میں چھایا رہا وہیں فلم "انڈیاز ڈاٹر" پر بھی ملک و بیرون ملک سے بے شمار تاثرات سامنے آئے ہیں۔ واقعات گرچہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں اس کے باوجود دونوں ہی واقعات میں یکساں بات "بے جا تشدد" کا اختیار کیا جانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ حالات کیسے پیدا ہوئے؟ جس کے نتیجہ میں یہ اور ان جیسے واقعات نہ صرف منظر عام پر آ رہے ہیں بلکہ ہر صبح ان ہی جیسے واقعات سے اخبارات کی سرخیاں سامنے آتی ہیں؟ سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے ملک کے اس ڈھانچے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جس کی بنیاد پر ملک کے ستون قائم ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک زمانے میں ملک تو آزاد ہوا، اس کے باوجود ملک کی فکری و عملی اساس کار غلامی کی زنجیروں سے نجات پانے میں ناکام رہی۔ غیر مذہبی جمہوریت کا قیام، ملک کا مقصد ٹھہرا۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ اسٹیٹ کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ دوسری طرف خود کو سیکولر اور غیر مذہبی جمہوریت کا علمبردار ثابت کرنے کے لیے ملک کے لیڈران، سربراہان اور برسر اقتدار طبقہ نے مذہب بیزاری کا کھل کر اظہار کیا۔ پھر یہاں بھی اگر کسی کو عروج حاصل ہوا تو وہ ملک کا " تعلیم یافتہ اور متمدن " مسلمان ہی تھا، جو ہر میدان میں پیچھے رہنے کے باوجود غیر مذہبی جمہوریت کے قیام میں خوب خوب

نمایاں ہوا۔ان متمدن اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں کہیں ماہرین تعلیم پیدا ہوئے کہیں ماہرینِ معیشت و معاشرت۔ نتیجہ میں ایک ایسا پڑھا لکھا طبقہ وجود میں آیا جس نے مذہب کو اپنی ذاتی زندگی سے بھی بے دخل کر دیا۔ پھر نہ ان کے افکار و نظریات میں نہ ان کے فکر و عمل میں اور نہ ہی ان کی خاندانی و معاشرتی زندگی میں مذہب یا مذہبی، تعلیمات کی کوئی جھلک سامنے آئی۔ ہاں چند لگے بندھے رسم و رواج ضرور فروغ پاتے رہے۔ لیکن ان لگے بندھے رسم و رواج میں بھی جب دیگر رسم و رواج شامل ہوئے ،تو نہ صرف ان کی فکر مزید مجروح ہوئی بلکہ ان کا تشخص بھی جاتا رہا۔

برخلاف اس کے ایک تیسری فکر بھی اسی دوران پروان چڑھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے تاریخی ورثہ سے بے انتہا رغبت کا اظہار کیا۔ نتیجہ میں نہ صرف حد درجہ قومیت کو فروغ ملا بلکہ بالفاظ دیگر نیشنل کلچرزم یا جارحانہ قوم پرستی میں بھی اضافہ ہوا۔ لیکنجارحانہ قوم پرستی کے فروغ میں ایک ولیین کی ضرورت تھی، جسے "نفرت پر مبنی سیاست "کے اصول پر حل کیا گیا۔ پھر نہ جانے کیوں اور کیسے یہ جارحانہ قوم پرستی مسلسل فروغ پاتی رہی؟ ابتدائی سطروں کے دو واقعات، غالباً ان ہی دو نظریات کی دین ہیں۔ جہاں ایک جانب مغربی افکار و نظریات کے حاملین عورت و مرد کے تعلقات کو کسی بھی درجہ میں برا نہیں سمجھتے، اختلاطِ مرد و زن پر اگر کوئی سوال اٹھائے تو وہ برا مان جاتے

ہیں،اس کے باوجود وہ چاہتے ہیں کہ معاشرے میں امن و امان برقرار رہے،لوگ ایک دوسرے کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں اور برائیاں کم و بھلائیاں فروغ پائیں۔دوسری طرف اس جارحانہ قومیت کے بے جا تصور نے انسانوں کو حیوانیت کے درجہ پر لا چھوڑا۔جہاں ملکی و بین الاقوامی حد بندیاں ہی سب کچھ ٹھہریں۔انسان اگر بھوکا ہے تو بھوکا رہے،لیکن رزق کی تلاش میں وہ حدود پار نہیں کر سکتا۔اور اگر وہ ایسا کرتا ہے (جس کا متذکرہ واقعہ میں شک ظاہر کیا جارہا ہے،اور جو ابھی تک ثابت بھی نہیں ہوا ہے)تو پھر اُس کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو ناگالینڈ کے دیما پور میں سامنے آیا ہے۔مجرمین کو اس بات سے اختلاف نہیں تھا کہ زنا بالجبر،جس کا ہلاک شدہ شخص پر الزام لگایا گیا ہے،اور جو ثبوتوں کی بنا پر غلط ثابت ہوا ہے،یہ عمل سب کے لیے اسی درجہ میں غلط ہے،جس درجہ میں ہلاک شدہ شخص کے لیے تھا۔نہیں ،بلکہ انہیں تو اس بات کا اختلاف تھا کہ ایک بنگلہ زبان بولنے والا اور وہ بھی بنگلہ دیش کا شہری (جو غالباًالزام ہے،ثابت نہیں ہوا ہے) ہمارے ملک کی عورت کے ساتھ وہ معاملہ کیونکر انجام دے جو مناسب نہیں ہے؟اور وہ یا اس جیسا کوئی اور یہ معاملہ انجام دیتا ہے تو ہم بھی تشدد کا وہ طریقہ اختیار کریں گے،جو درحقیقت جارحانہ قوم پرستی کی دین ہے۔

واضح رہے کہ ہندوستان میں شادی سے پہلے مرد و عورت کا ایک ساتھ رہنا نہ صرف

معیوب بلکہ غیر اخلاقی بھی سمجھا جاتا ہے۔اس کے باوجود یہ وبا بڑے شہروں میں تیزی سے عام ہو رہی ہے۔وبا کے عام ہونے کی وجہ ہندوستانی معاشرہ میں اصولوں کا بدلاؤ ہے۔جس کے نتیجہ میں شادی سے پہلے جنسی تعلقات قائم کرنا گرچہ تہذیبی نقطہ نظر سے معیوب ہے اس کے باوجود دو بالغوں کے درمیان شادی کے وعدے کے تحت قائم کیے جانے والے تمام جنسی تعلقات زنا بالجبر کے زمرے میں نہیں آتے۔گذشتہ سال اسی طرح کے ایک معاملہ میں دہلی کی عدالت نے غیر شادی شدہ (لیو ان ریلیشنز میں) رہنے والے جوڑے کو غیر اخلاقی قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ "مغربی تہذیب کا بدنام پروڈکٹ "ہے۔جج مسٹر بھٹ خواتین کے خلاف جنسی خلاف ورزیوں کے معاملات کی فاسٹ ٹریک عدالت کی صدارت کر رہے تھے۔انھوں نے یہ باتیں ایک ایسے معاملہ پر فیصلہ سناتے ہوئے کہیں جس میں ایک خاتون نے ایک کثیر ملکی کمپنی میں ملازم شخص پر زنا بالجبر کا الزام لگایا تھا۔جج کا کہنا تھا کہ اگر کوئی پڑھی لکھی، بالغ اور دفتر میں کام کرنے والی خاتون اپنے کسی ساتھی یا دوست کے ساتھ شادی کے وعدے کے تحت جنسی تعلق قائم کرتی ہے تو یہ اس کی اپنی ایما پر ہے۔اسے یہ بات جان لینی چاہیے کہ وہ اس کے لیے خود ذمہ دار ہے کیونکہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ لڑکا اپنا وعدہ پورا ہی کرے گا۔جج کا مزید کہنا تھا کہ وہ (مرد)اپنا وعدہ پورا کر سکتا ہے اور نہیں بھی۔ لیکن خاتون کو یہ باور ہونا چاہیے کہ وہ جس جنسی عمل میں شامل ہو رہی ہے وہ غیر اخلاقی ہے۔اور دنیا کے تمام مذاہب کے

اصولوں کے منافی ہے۔ کیونکہ دنیا کا کوئی مذہب شادی سے پہلے عورت و مرد کے اختلاط کی اجازت نہیں دیتا۔

ان سب عوامل کے نتیجے میں خاندانی نظام منتشر ہو رہا ہے۔

سماجی اعتبار سے اس دور کے بڑے فتنوں میں خاندانی انتشار کو لازماً شمار کیا جانا چاہیے۔ معاملہ یہ ہے کہ دنیا کے کئی ملکوں میں شرح نکاح کم ہو رہا ہے اور شرح طلاق بڑھ رہا ہے۔ ناجائز تعلقات، ہم جنس پرستی اور لیو اِن رلیشن شپ (Live-in-relationship) مقبول ہو رہی ہے۔ بچہ نہ پیدا کرنے کا رجحان سر اٹھا رہا ہے اور ان کی نگہداشت میں سرکار کا عمل دخل بڑھ رہا ہے۔ یہ بات اُس رپورٹ سے بھی ثابت ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں ہر سال طلاق کا اوسط بڑھ رہا ہے۔ صرف ء میں ممبئی میں 1,667ء طلاق کے واقعات [illegible] 2014 کلکتہ میں 8,347ء معاملات سامنے آئے ہیں. کلکتہ کی یہ تعداد ء کے مقابلے 350% فیصد زیادہ ہے، جبکہ کل 2,388ء واقعات ہی 2003 رونما ہوئے تھے۔ وہیں ملک کی سب سے بڑی ریاست اترپردیش کی راجدھانی لکھنؤ میں فیملی کورٹ کے تحت سال 2014ء میں 2,000ء طلاق کے واقعات سامنے آئے ہیں، جن میں 900ء معاملات ایسے ہیں جو شادی وطلاق کے دوران ایک سال کا عرصہ تک پورا نہ کرسکے۔ دوسری طرف بچوں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ہوس کے لیے ان کا استعمال ایک الگ سنگین مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی خاندانی محبت سے محروم

نوجوانوں میں جرائم و منشیات کا چلن بھی عام ہو رہا ہے۔اس پورے پس منظر میں یہ مزید حیرت انگیز ہے کہ ہمارے ملک میں لیوان رلیشن (Live-in-relations) کو درست قرار دے دیا جارہا ہے اوراس "رشتۂ ازدواج" سے پیدا ہونے والی "جائز" نسل کے حقوق کا تحفظ زیر غور ہے۔انتہا یہ ہے کہ لیوان ریلشن کے اشتہار ان ویب سائٹس پر موجود ہیں، جہاں نئے اور پرانے سامان کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔اور حد درجہ افسوس ناک خبر یہ ہے کہ یہ اشتہارات ملک کی راجدھانی دہلی کے ان علاقوں سے بھی درج کیے گئے ہیں جہاں ملت اسلامیہ ہند کا سواد اعظم موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی بھی قدر کا دائمی نہ ہونا بے قید جمہور کی حکمرانی

(Absolute monarchi or Absolute Government & the people)

کا سرچشمہ ہے؟اور اگر ایسا ہے جو واقعہ بھی ہے تو اس میں "غیر مذہبی جمہوریت کا قیام" کس حد تک درست سمجھا جانا چاہیے ؟اس مرحلے میں اگر بحث کا آغاز ہوتا ہے تو پھر سوال یہ بھی اٹھے گا کہ وہ کون سا مذہب ہے جو اپنی تعلیمات اوراصول و قوانین کے اعتبار سے انسانیت کی فوز و فلاح کا ضامن بن سکتا ہے!

ظلم سے نجات اور بھٹکتی انسانیت !

فی الوقت دو خبریں قابل توجہ ہیں۔ایک کا تعلق دلت نوجوان اروندن سے ہے تو دوسری مشہور سماجی خدمتگار اور مصنف ڈاکٹر بھارت پٹناکر سے متعلق ہے۔ریاست تمل ناڈو کے علاقہ کرشنہ نگر میں کچھ دبنگ لوگوں نے مبینہ طور پر ایک دلت نوجوان کے منہ میں پیشاب کر دیا۔شرمسار کر دینے والا یہ واقعہ ۲مارچ کو کرشنا نگر ضلع کے کروونورگاؤں میں مندر مہوتسو کے دوران پیش آیا ہے۔متاثر نوجوان بیس سالہ ایم اروندن، بنگلور میں ایک کمپنی میں ویلڈر کے طور پر کام کرتا ہے۔مندر میلے میں حصہ لینے کے لیے وہ ۲مارچ کو اپنے گاؤں میں آیا تھا۔اروندن کے مطابق، میں اپنے ایک دوست آر دنیش (۲۰) کے ساتھ مندر گیا تھا۔وہاں کچھ لوگوں نے ہمیں دیکھا تو ہمیں گالیاں دینے لگے۔جب دونوں نے اس کی مخالفت کی تو دبنگ لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا۔مارتے پیٹتے ایک قریبی ٹوائلٹ میں لے گئے۔جہاں وہ زخمی ہو کر زمین پر گر گیا۔بدحواس حالت میں اروندن نے پانی مانگا تو دبنگ لوگوں نے اس کے منہ میں پیشاب کر دیا۔اس درمیان دنیش بچ کر بھاگ گیا اور اروندن کے اہل خانہ کو واقعہ کی اطلاع دی۔وہیں دوسری جانب ریاست مہاراشٹر میں دانشوروں کے لیے بُرا دور تھمتا نظر نہیں آ رہا ہے۔توہم پرستی کے خلاف لڑنے والے نریندر دابھولکر اور کمیونسٹ رہنما گووند پنسارے کے قتل کے بعد اب مشہور

سماجی خدمتگار اور مصنف ڈاکٹر بھارت پٹنا کر کو خبر کے مطابق قتل کی دھمکی ملی ہے۔ڈاکٹر پٹنا کر نے میڈیا کو بتایا کہ انہیں کئی لوگ دھمکی آمیز خطوط بھیجتے ہیں۔اتنا ہی نہیں، انہیں جان سے مارنے کی دھمکی بھی دیتے ہیں۔ان خطوط میں الزام لگایا گیا ہے کہ ڈاکٹر پٹنا کر مسلمانوں کے تئیں نرم رخ اپنا رہے ہیں۔نیز پھٹکارتے ہوئے کہا گیا ہے کہ انہوں نے ودروہی سمیلن کی قیادت قبول کرکے غلط کیا ہے۔ودروہی سمیلن ریاست کی طرف سے چلائے جارہے ادبی کانفرنس کا ایک متبادل پلیٹ فارم ہے۔موجودہ قت میں ڈاکٹر پٹنا کر مزدور مکتی دل کے صدر ہیں۔یہ ادارہ مزدوروں کے لیے کام کرتا ہے۔ڈاکٹر پٹنا کر کو گزشتہ دنوں ایک خط موصول ہوا۔جو کولہاپور سے بھیجا گیا تھا۔خط کے ساتھ جارح، راشٹر وادی میگزین سناتن پربھات کی کاپی بھی بھیجی گئی تھی۔ڈاکٹر پٹنا کر نے بتایا کہ مجھے پہلے دھمکی ملی تھی۔خطوط میں کہا گیا تھا کہ میں دامودر اور پانسارے کے راستے پر نہ جاؤں۔اگر میں ایسا کرتا ہوں ، قتل کا اگلا نمبر میرا ہوگا۔ان دو واقعات کے علاوہ آج کل ملک عزیز ہند میں بے شمار دیگر واقعات بھی خبروں میں چھائے ہوئے ہیں، جو نہ صرف سماج کے امن عامہ کو متاثر کررہےہیں بلکہ مخصوص افراد و گروہ کو خوف میں مبتلا کرنے کے لیے بھی انجام دیے جارہے ہیں۔

ہندوستان کے آئین نے ملک کے شہریوں کو چند ایسے حقوق دیے ہیں جنہیں ہم

کے نام سے جانتے ہیں۔بنیادی حقوق کے (Fundamental Rights)بنیادی حقوق ذیل میں ہر شہری خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ مذہب ، ذات پات، جنس، رنگ یا جائے پیدائش کی بنا پر کسی کے خلاف کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شہری کو آزادئ خیال اور آزادئ مذہب حاصل ہے۔ ساتھی ہی ہر شہری کو سرکاری ملازمتیں نیز بڑے سے بڑا عہدہ بلا امتیاز و تفریق حاصل کرنے کا حق ہے۔ دوسری طرف دستور نے صدیوں سے چلے آرہے چھوت چھات کے رواج کو جرم قرار دیا ہے۔ نیز اقلیتوں کو مذہبی وتمدنی آزادی دی ہے۔ انہیں اس بات کا حق دیا ہے کہ وہ اپنے علیحدہ اسکول اور تعلیمی ادارے قائم کریں، اپنی تہذیب یا تمدن کو قائم و برقرار رکھیں اور ترقی دیں۔ ساتھ ہی مخصوص (script)زبان اور رسم الخط، مذہب کی تبلیغ اور مذہبی مراسم ادا کرسکیں۔ دستور کی دفعہ :۲۵کے تحت (ا) تمام اشخاص کو آزادی ضمیر اور آزادی سے مذہب قبول کرنے، اس کی پیروی اوراس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق ہے بشرطیکہ امن عامہ ، اخلاق عامہ، صحت عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیعات متاثر نہ ہوں۔ (۲) اس دفعہ کا کوئی امر کسی ایسے موجودہ قانون کے نفاذ کو متاثر نہ کرے گا اور نہ وہ ایسے قانون کے بنانے میں مملکت کا مانع ہوگا جو: (الف) کسی معاشی۔مالیاتی۔سیاسی یا دیگر غیر مذہبی سرگرمی کو جس کا تعلق مذہبی عمل سے ہوسکتا ہو منضبط کرے یا اس پر پابندی لگائے۔ (ب) سماجی بہبود اور سدھار کے لیے ہندوؤں کے عوامی نوعیت کے مذہبی اداروں کو

ہندووں کے تمام طبقوں اور فرقوں کے لیے کھول دینے کے بارے میں توضیع کرے۔ تشریح (a: کرپان باندھنا اور اس کو ساتھ رکھنا سکھ مذہب کے عقیدہ میں شامل ہونا متصور ہوگا۔ تشریح (b: فقرہ (۲) کے ذیلی فقرہ (ب) میں ہندووں کے حوالہ کی یہ تعبیر کی جائے گی کہ اس میں سکھ، جین یا بدھ مذہب کے پیرؤں کا حوالہ شامل ہے اور ہندو مذہبی اداروں کے حوالے کی حسبہ تعبیر کی جائے گی۔ وہیں دوسری جانب دستور نے مذہبی امور کے انتظام کی آزادی بھی دی ہے۔ دفعہ: ۲۶اس شرط کے ساتھ کہ امن عامہ، اخلاق عامہ اور صحت عامہ متاثر نہ ہوں ہر ایک مذہبی فرقے یا اس کے کسی طبقے کو حق ہوگا: (الف) مذہبی اور فلاحی اغراض کے لیے ادارے قائم کرنے اور چلانے کا۔ (ب) اپنے مذہبی امور کا انتظام خود کرنے کا۔ (ج) منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کے مالک ہونے اور اس کو حاصل کرنے کا؛ اور (د) ایسی جائداد کا قانون کے بموجب انتظام کرنے کا۔ واضح صراحت کے بعد غیر دستوری سرگرمیاں جرم کے زمرے میں داخل ہوں گی۔ لہٰذا ہر وہ عمل جو نہ صرف دستور کی خلاف ورزی ثابت کر دے ،جرم ہے ۔بلکہ امن عامہ ، اخلاق عامہ، صحت عامہ اور اس حصہ کی دیگر توضیعات کا متاثر ہونا بھی قابل گرفت مانا جائے گا۔

متذکرہ واقعات ہوں یا ان جیسے دیگر معاملات ،کے پس منظر میں دستور ہند کی ضمانتیں بہت حد تک مثبت امیدیں وابستہ کراتی ہیں۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے

کہ ہندوستان کی عدالتیں چھوٹے و بڑے معاملات کو بنٹانے کے لیے ناکافی ہیں۔ پھر عدالتوں کا ناکافی ہونا اور طویل مدتی کارروائیوں کی وجہ سے ملزمین کو کیفر کردار تک پہنچانے میں بے شمار دقتیں سامنے آتی ہیں۔ان دقتوں میں جہاں ایک طرف ثبوتوں کے اکھٹے کرنے کا وقت گزار مرحلہ ہے تو وہیں دوران مدت ثبوتوں کو مٹانے، گواہوں پر مختلف طریقوں سے ڈرانے دھکمانے کا غیر قانونی عمل بھی سامنے آتا ہے۔اس پیچیدہ صورتحال کے نتیجہ میں کئی مرتبہ ملزم باعزت بری ہوجاتا ہے۔اب اگر ملزم واقعی صرف ملزم ہے، مجرم نہیں ،تو فیصلے کا خیر مقدم ہونا چاہیے ۔برخلاف اس کے ملزم کا طویل مدتی عدالتی کارروائیوں اور اس دوران غیر اخلاقی و غیر قانونی سعی و جہد کے نتیجہ میں باعزت بری ہونا، عدالتوں کے موجودہ نظام پر کئی طرح کے سوالات کھڑے کرتا ہے۔ پھر اگر اس طرح کے ایک سے زائد معاملات سامنے آئیں تو یہ نہ صرف منفی نظیریں بن جاتی ہیں بلکہ جرم کے اضافہ اور ملزمین و مجرمین کو ان کے ظلم میں تقویت پہنچانے کا سبب بھی بنتے ہیں۔دوسری طرف سماج میں روز بروز بڑھتے جرائم سے متاثرہ فرد و خاندان کی مدد نہ کرنا، آنکھوں دیکھے جرم پر خاموشی اختیار کرنا،اور کمزور و بے سہارا افراد و گروہ کو تعاون نہ دینا، جیسے مسائل میں بھی ہر دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔اس کی ایک وجہ تو معاشرہ میں موجود افراد و خاندان کے درمیان غالباً ناواقفیت و لاتعلقی ہے۔ وہیں دوسری وجہ پولیس و عدالتی کارروائیوں میں ملوث ہونے سے بچنے کی فطری خواہش ۔ان دو حالات میں جہاں ایک

طرف معاشرہ میں موجود افراد کو ایک دوسرے کے خوشی و غم میں شریک ہونے کی سخت ضرورت ہے وہیں عرصہ دراز سے پولیس و عدالتی نظام کو مزید بہتر کرنے کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔ایک ایسے نظام کی ضرورت جہاں جرم کے خلاف شہادت پیش کرنے والے گواہان کو ہر طرح کے شر سے بچانے کے پختہ انتظامات ہوں۔ساتھ ہی عدالتوں میں موجود pending cases کو فاسٹ ٹریک عدالت کے ذریعہ حل کیا جائے۔ ممکن ہے اس صورت میں نہ صرف ملک کے کمزور طبقات ذلت و رسوائی سے نجات پائیں گے بلکہ امن و امان کے قیام اور ظلم کے خاتمہ میں بھی بہت حد تک یہ کوششیں اثر انداز ہوں گی!

! علماء کرام کا ایک کامن پلیٹ فارم

یہ حقیقت ہے کہ اللہ جس سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اُسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے۔یعنی اللہ تعالی جن لوگوں پر دنیا میں ہی اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں اللہ دین کا علم عطا عطا کرتا ہے۔ان میں سب سے اول انبیا و رسل ہیں اوراس کے بعد دین کا حقیقی علم حاصل کرنے والے دیگر افراد ۔چونکہ علماء دین کا حقیقی علم حاصل کرتے ہیں اور ایک بڑی ذمہ داری پر فائض ہوتے ہیں شاید اسی لیے علماء کو انبیا کا وارث بھی کہا گیا ہے۔پھر اسی علم پر مبنی اہم ترین ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اللہ تعالی دنیا و آخرت میں بلندی ،کامیابی اور سرخ روئی بھی عطا کرے گا۔وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اعمال صالحہ و حسنہ کی ادائیگی پہ خوشخبری دیتے ہیں اور برے اعمال کے نتائج سے ڈراتے ہیں۔چونکہ علماء کی حیثیت جہلا کے مقابلہ زیادہ ہے،اسی لیے انہیں معاشرہ میں وہ عزت و مقام بھی حاصل ہے جو دیگر افراد کو نہیں ہے۔برخلاف اس کہ جب اہل علم اپنے مقام ، رتبہ اور حیثیت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں نیز اپنی ذمہ داریاں انجام نہیں دیتے، تب وہی خدا گرفت بھی کرتا ہے، جس نے عزت و وقار عطا کیا ہے۔اہل کتاب کے علماء کی مثال دیتے ہوئے قرآن حکیم میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:۔"اہل کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ

وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں" (التوبہ : ۳۴)۔ یعنی ظالم صرف یہی ستم نہیں کرتے کہ فتوے بیچتے ہیں، رشوتیں کھاتے ہیں، نذرانے لوٹتے ہیں ، ایسے ایسے مذہبی ضابطے اور مراسم ایجاد کرتے ہیں جن سے لوگ اپنی نجات اِن سے خریدیں اور اُن کا مرنا جینا اور شادی و غم کچھ بھی اِن کو کھلائے بغیر نہ ہوسکے اور وہ اپنی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کا ٹھیکہ دار اِن کو سمجھ لیں۔ بلکہ مزید برآں اپنی اِنہی اغراض کی خاطر یہ حضرات خلقِ خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے ہیں اور جب کبھی کوئی دعوتِ حق اصلاح کے لیے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے یہی اپنی عالمانہ فریب کاریوں اور مکاریوں کے حربے لے لے کر اس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا ہے۔ اس ایک آیت سے یہ بات باخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اہل ایمان علماء کو اپنی حیثیت کے پیش نظر کس قدر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جس خدا نے انہیں دنیا میں صرف علم دین کی بنا پر عزت و سربلندی عطا کی ہے ،اگر وہ اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی انجام نہیں دیں گے تو وہ خدا گرفت کرنے سے بھی نہیں چوکے گا۔

ابتدائی گفتگو کے پس منظر میں یہ بات کافی ہے کہ عالم دین اسے کہا جائے گا جو دین کا حقیقی علم رکھتا ہو۔ اور یہاں دین سے مراد قرآن و حدیث کا علم ہے۔ لہٰذا ایک سچا اور مخلص عالم وہی کہلائے گا جو دین کا علم بھی رکھتا ہو

اور ساتھ ہی محمد رسول اللہؐ کے مشن کو انجام دینے کے لیے سرگرم بھی ہو۔ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے تقاضہ وقت ہے کہ علماء کرام ایک طرف دین کا مکمل علم حاصل کریں وہیں دیگر باطل عقیدہ ہائے علم سے بھی باخوبی واقف ہوں۔ناواقفیت کے نتیجہ میں باطل حق اور حق باطل بن جاتا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ دین میں ایک جانب تفقہ پیدا کیا جائے وہیں دور جدید کی صورتحال سے باخوبی واقفیت حاصل کی جائے۔تفقہ فی الدین کا معاملہ کسی طرزِ فکر، نقطہ نظر اور مسلک کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ یہ دین کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ تفقہ چند کلامی، فقہی مسائل اور تفسیری موشگافیوں سے بھی متعلق نہیں ہے۔اس سے مراد دین کی وہ گہرائی ہے جو ایک عالم کو عصرِ حاضر کے چیلنجز کے لیے تیار کرتی ہے۔ یونانی فلسفہ کا دور ہو یا مغربی سائنس کا زمانہ، نوآبادیاتی نظام کا وقت ہو یا مابعد نوآبادیاتی نظام، سرمایہ دارانہ نظام ہو یا جاگیردارانہ نظام، سوشلزم ہو یا کمیونزم، مغربی فلسفہ الحاد ہو یا لادینیت، جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت الغرض کوئی گمراہی و ضلالت کی شکل ہو وہ اپنے زمانے کے چیلنجز کا شعور بھی رکھتا ہے اور تفقہ فی الدین کی قوت سے ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ سورۃ النحل میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دعوت کے تین اصول بیان کیے ہیں: ۱۔ حکمت ۲۔ موعظت حسنہ ۳۔ مجادلہ حسنہ ۔حکمت کے بے شمار معنی مراد لیے جا سکتے ہیں لیکن دعوت دین کے معاملے میں حکمت سے مراد دلیل و برھان ہے جو عقل و فطرت کے تقاضے کے مطابق

ہو جسے سمجھنے میں عقل و فطرت کو اجنبیت نہ ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جب علمائے کرام عوام الناس کو دین کی طرف بلائیں تو حکمت کے تمام پہلوؤں کو ہمیشہ مد نظر رکھیں۔ پھر یہ کام جو دین کی بقا، قیام اور استحکام کے لیے انجام دیا جارہا ہو۔اس کے لیے پہلی اور لازمی شرط ہے کہ کوششیں منظم و منصوبہ بند انجام دی جائیں۔ بکھری ہوئی کوششیں کسی بھی سطح پر رنگ نہیں لاتیں تو علماء کرام کی جانب سے غیر منظم کوششیں کس طرح رنگ لائیں گی۔ جبکہ وہ نہ صرف بے شمار دائروں میں انجام دی جارہی ہوں بلکہ ان کے درمیاں اختلافات بھی موجود ہوں۔ مقاصد کے حصول کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم موجود ہو یا تیار کیا جائے جہاں علماء کرام کو اپنے تمام اختلافات سے اوپر اٹھ کر ذمہ داریاں ادا کرنے کا موقع میسر ہو۔جہاں مسالک و مدارس کی بنیاد پر شناخت نہ قائم کی جائے بلکہ صرف اور صرف ایک اللہ، ایک رسول اور ایک دین کی خاطر ایک پلیٹ فارم پر مل بیٹھنے اور ذمہ داریاں انجام دینے کا موقع حاصل ہو۔اور یہی بات ہمیں اسلامی احکامت کی روشنی میں بھی ملتی ہے۔ کہا کہ دین اسلام ہمیشہ جماعت کی طرف پکارتا ہے، بکھرنے سے نفرت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے، جو دائرہ جماعت سے نکلا وہ آگ میں جا کودا، بھیڑیا بھی ریوڑ سے الگ رہنے والی بھیڑ ہی کو کھاتا ہے۔جماعت میں صف سے نکل کر پیچھے اکیلے جا کھڑے ہونے سے نماز نہیں ہوتی اور نہ صفوں کو چیر کر جماعت سے آگے جانے سے ہی نماز ہوتی ہے۔ مومن تو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنتا ہے، نیکی اور تقوے کے

کاموں میں باہمی تعاون کا فریضہ ادا کرتا ہے۔واضح تعلیمات کی روشنی میں نہ عام مسلمانوں سے جو ذرا سا بھی دینی شعور رکھتے ہوں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بکھری ہوئی سعی و جہد کریں گے اور نہ ہی دین کا پختہ علم رکھنے علماء کرام سے یہ امید کی جانی چاہیے کہ وہ الگ الگ اور منتشر ہو کر اپنی ذمہ داریاں ادا کریں گے۔

اس پوری گفتگو کے پس منظر میں خوشی کی بات یہ ہے کہ گزشتہ دنوں دہلی میں ایک ایسی تقریب میں شرکت کا موقع ملا جہاں مختلف مسالک و مدارس کے علماء کرام ایک ساتھ ایک مقام پر جمع تھے،اور غور خوض اس بات پر ہو رہا تھا کہ علماء کرام کی ایک ایسی تنظیم عمل میں آئے جو بلالحاظ مسلک و مدرسہ ودیگر تقسیم کرنے والی بنیادوں سے پاک ہو۔تقریب میں علماء کی تنظیم کے مقاصد کچھ اس طرح بیان کیے جارہے تھے کہ ہم سب ملک کر:بندگان خدا کو خالص بندگی رب کی دعوت دیں گے۔امت میں داعی گروہ ہونے کا شعور بیدار کریں گے۔ دینی امور میں عوام کی رہنمائی کریں گے۔ وقت کے فتنوں کے سد باب کے لیے جدو جہد کریں گے۔ نظام زندگی کو خدا کے رو،رو جوابدہی کے احساس پر قائم کریں گے۔۔برائیوں کو مٹانے اور بھلائیوں کے فروغ کے لیے اجتماعی فضا ہموار کریں گے۔ امت کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کریں گے۔منظم، منصوبہ بند اور طے شدہ اہداف کے تحت مقاصد کے حصول کے لیے سرگرمیاں انجام دیں گے۔پھر سوال اٹھا کہ وابستگی کا

معیار کیا ہو؟ تو کہا کہ ہر وہ شخص جو انڈین یونین کا شہری ہو اور جو دینی مدرسہ سے سند یافتہ ہو یا بحیثیت امام و دینی معلم خدمات انجام دے رہا ہو، اس تنظیم کا رکن بن سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا کہ تنظیم اپنی تمام سرگرمیوں میں شرعی حدود کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے، پر امن، دستوری اور اخلاقی حدود کی پابند رہے گی۔ تنظیم مخصوص مسلک ومدرسہ کی شناخت کے بغیر، علماء کرام کو بحیثیت عالم دین، مقصد و نصب العین اور سرگرمیوں کے لیے آمادہ کرے گی۔ اپنے تمام اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے تنظیم علمی، ترغیبی، تبلیغی، اور اشاعتی جیسے پر امن، تعمیری اور قانونی طریق کار اختیار کرے گی ۔ نیز ایسے تمام افعال سے احتراز کرے گی جو سچائی اور دیانت داری کے خلاف ہوں یا جن کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ منافرت، ذات۔برادری کی کشمکش یا فساد فی الارض رونما ہو سکتا ہو۔ خواہش تو یہ ہو رہی تھی کہ کاش ! ہم بھی عالم دین ہوتے تو اس تنظیم میں ضرور شریک ہوتے لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ معزز علماء کرام جو کچھ کہ غور و خوض اور فیصلے لے رہے ہیں، اس میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ مختلف مدارس و مسالک کے علماء کرام کسی ایک کامن پلیٹ فارم سے وابستہ ہو جائیں؟ خصوصاً ان حالات میں جبکہ امت کا شیرازہ بکھیرنے کا منظم و منصوبہ بند عمل بھی جاری ہو!

آزمائشیں تو زندگی کا حصہ ہیں! لیکن۔۔۔

کسی شخص کا مخصوص پریشانی میں مبتلا ہونا خود اس کے غلط منصوبوں و اعمال کا نتیجہ ہے؟ دوسروں کی جانب سے منظم و منصوبہ بند سازش ہے؟ خدا کی جانب سے آزمائش میں ڈالا جانا ہے؟ یا پھر خدا کا نازل کردہ عذاب ہے؟ ان میں سے کون سی بات مخصوص شخص و گروہ پر نافذ ہوتی ہے اس کا فیصلہ کیا جانا ذرا مشکل ہے۔ اس کے باوجود اگر واقعات کا تسلسل کے ساتھ اور پختہ بنیادوں پر جائزہ لیا جائے تو نتیجہ تک پہنچنا کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ جائزہ لینے والا فرد و گروہ ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو کر، حقیقت پر مبنی نتائج اخذ کرنے کی سعی کرے۔ لیکن مشکل اس وقت آتی ہے جبکہ نتائج کے حصول میں ضروری شہادتوں و ثبوتوں کو مسخ کر دیا جائے یا پھر انہیں مٹا ہی دیا جائے۔ آزمائشوں، مسائل، پریشانیوں اور حادثات ہی کے پس منظر میں ہاشم پورہ قتل عام کو بھی دیکھنا چاہیے۔ جس کا تذکرہ انگلش ہفت روزہ 'آوٹ لک' نے کچھ اس طرح کیا ہے کہ راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ یعنی آر ایس ایس کے ایک کارکن کے قتل نے فوج اور پی اے سی کو ہاشم پورہ قتل عام کے لیے اکسایا تھا اور قتل عام کے بعد ثبوتوں کو یا تو تلف کر دیا گیا یا ثبوت، شہادتیں و گواہیاں سی آئی ڈی کے سامنے پیش ہی نہیں کی گئیں۔۔۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہاشم پورہ کا قتل عام کیا سنگھ پریوار کی انتقامی کارروائی تھی؟ ایسی

انتقامی کاروائی جس میں فوج کے جوانوں اور پی اے سی کے اہلکاروں نے سنگھ پریوار کا ساتھ دیا؟ یا حقیقت اس کے برخلاف ہے؟ واقعہ 22مئی 1987 کا ہے۔جب میرٹھ شہر سے دوکلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر واقع ہاشم پورہ نامی ایک محلے کے 42مسلم نوجوانوں کو وردی پوشوں نے بے رحمی سے قتل کیا تھا۔پولیس کے ذریعہ کی گئی قتل عام کی واردات کے بعد سی آئی ڈی کے ایس پی ایس کے رضوی نے 22جون1989ء کی اپنی مذکورہ رپورٹ میں تحریر کیا تھا: واردات کے فوراً بعد اخباروں میں اس طرح کی کچھ قیاس آرائیاں آئی تھیں کہ مقامی طور پر تعینات میجر ستیش چندر کوشک کا ایک بھائی ہاشم پورہ میں 21مئی1987ء کو گولیوں کے داغے جانے سے زخمی ہو کر مرگیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس ذاتی سانحہ کے سبب میجر ستیش چندر کوشک نے اپرگنگا اور ہنڈن کی نہروں کے پاس ہاشم پورہ کے باشندوں کا قتل عام کرایا تھا۔میجر کوشک کی کرنل کے عہدے تک ترقی ہوئی، وہ ریٹائرڈ ہوئے مگر ابتدائی رپورٹ میں ذکر کے بعد سی آئی ڈی نے ان کی مزید کوئی چھان بین نہیں کی اور نہ ہی وزیر اعظم کے دفتر سے سی آئی ڈی کی ابتدائی رپورٹ پر کوئی کاروائی ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں سی آئی ڈی کی رپورٹ ٹھنڈے بستہ میں ڈال دی گئی۔ متذکرہ رپورٹ اور اس پر عمل درآمد اور پھر حالیہ فیصلہ نہ صرف پورے نظام پر بے شمار سوالات کھڑے کرتا ہے بلکہ حق وانصاف کی لڑائی لڑنے والوں کے حوصلوں کا بھی خون کرتا ہے۔ باوجود اس کے حق کے علمبردار جو تمام مذاہب میں موجود ہیں، ظلم کے خلاف آواز اٹھانے سے نہیں

ڈرتے۔ کیونکہ ظلم کے خلاف خاموشی مجرمین کو مزید شہ دینے کا ذریعہ بنتی ہے وہیں سماج کو بھی اندر سے کھوکھلا کرتی ہے۔

ظلم کے خلاف متحد ہونے والے ابھی ہاشم پورہ قتل عام اور اس کے حالیہ فیصلے پر اپنی آواز بلند ہی کر رہے تھے کہ پولیس انکاؤنٹر کے دو واقعات اور سامنے آ گئے۔ایک واقعہ صندل اسمگلنگ میں ملوث 20،افراد کے قتل کا ہے،جو زیادہ [illegible] تھے تو وہیں دوسرا واقعہ تلنگانہ پولیس کے زیر حراست پانچ لوگوں کے انکاؤنٹر کا ہے۔ تلنگانہ انکاؤنٹر کے تعلق سے اپوروانند سیاسی تجزیہ کار مین اسٹریم میڈیا کی غیرت کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ مرنے والے اگر غریب اور مسلمان نہ ہوتے تو مین اسٹریم میڈیا اس خبر کو لازماً اہمیت دیتی۔برخلاف اس کے ایک ہی دن میں 25،افراد ہلاک ہو گئے اور میڈیا خاموش ہے! وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ موت کسی بم دھماکہ میں ہوئی ہوتی تو سارے ٹیلی ویژن چینلوں کو بخار آ گیا ہوتا، لیکن وہ تو ریاستی حکومت کی طرف سے مقرر پولیس کی گولیوں سے ہوئی ہے، لہذا مین اسٹریم میڈیا خاموش ہے۔ تلنگانہ اور آندھرا پردیش کا حالیہ انکاؤنٹر بھی حد درجہ افسوس ناک ہے۔اور خبر کی تفصیل میں اگر جایا جائے تو یہاں بھی پولیس کارروائی پر بے شمار سوالات اٹھتے ہیں۔اس کے باوجود ہم نہیں جانتے کہ ان سوالات پر قائم ہونے والے جانچ کمیشن کتنے عرصہ میں رپورٹ دیں گے؟اور وہ فیصلہ بھی ہاشم پورہ قتل عام ہی کی طرح کی ہوگی یا اس کے برخلاف؟

آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی بھی ایک طویل تاریخ موجود ہے۔1947 میں بنگال میں فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں تقریباً5سے10 ہزار کے قریب افراد ہلاک ہوئے۔1969میں احمد آباد فسادات میں صرف شہر میں 512افراد ہلاک ہوئے اور کل ریاست میں تقریباً3 سے 5ہزار کے قریب افراد ہلاک ہوئے۔1983 میں نیلی،آسام فسادات میں تقریباً2 سے 5ہزار افراد ہلاک ہوئے۔1984دہلی فسادات میں 2737افراد ہلاک ہوئے۔1964میں رر کیلا اور جمشید پور فسادات میں 2ہزار کے قریب افراد ہلاک ہوئے۔1980میں مرادآباد فسادات میں تقریباً 2ہزار افراد ہلاک ہوئے۔1989بھاگلپور، بہار فسادات میں تقریباً800سے 2ہزار کے درمیان افراد ہلاک ہوئے۔دسمبر1992اور جنوری1993میں ممبئی، مہاراشٹر فسادات میں 8سو سے 2ہزار کے درمیان افراد ہلاک ہوئے۔1985میں احمد آباد، گجرات فساد میں تقریباً300 افراد ہلاک ہوئے۔1992میں علی گڑھ، اترپردیش فساد میں 176افراد ہلاک ہوئے۔1992ہی میں سورت، گجرات فساد میں تقریباً175افراد ہلاک ہوئے۔1990میں حیدرآباد، آندھراپردیش فساد میں تقریباً 132افراد ہلاک ہوئے۔1967میں رانچی فساد میں تقریبا200افراد ہلاک ہوئے۔1979, جمشید پور، ویسٹ بنگال فساد میں تقریباً125افراد ہلاک ہوئے۔اسی طرح 86,1984اور87میں بھیونڈی، میرٹھ اور احمد آباد فسادات میں تقریباً286افراد ہلاک ہوئے۔فرقہ وارانہ فسادات کی یہ وہ مختصر تاریخ ہے جو نہ صرف ہلاک شدگان کی تعداد

بتاتی ہےبلکہ ہر فساد میں لاکھوں کی تعداد میں متاثرین کو بھی بہ خوبی سامنے لاتی ہے۔واقعات کی روشنی میں سوال صرف اتنا سا ہے کہ کیا یہ حادثات ہلاک شدگان و متاثرین کے اعمال کا نتیجہ ہیں،دوسروں کی جانب سے منظم و منصوبہ بند سازش ہے،خدا کا نازل کردہ عذاب ہے یا ڈالی گئی آزمائش؟یا پھر پولیس،انتظامیہ اور انٹلی جنس کی سرد مہری و ناکامی کا نتیجہ ہے؟

گفتگو کا دوسرا اور اہم ترین حصہ رد عمل پر مبنی ہے۔جہاں دیکھنا ہوگا کہ پریشانی جن میں متاثرین بتںلا ہوئے وہ ان کے غلط منصوبوں و اعمال کا نتیجہ تھی؟اگر ایسا ہے تو منصوبوں میں تبدیلی کے لیے فکر و نظر میں لچک اور وسعت پیدا کی جائے۔پریشانی اگر دوسروں کی منظم و منصوبہ بند سازش کا نتیجہ ہو تو پھر دوسروں کی سازشوں سے قبل،خود اپنے اندرون کی سازشوں سمجھا جائے۔ساتھ ہی مسائل کے حل میں پیش رفت کی جانی چاہیے۔اگر یہ محسوس ہو کہ پریشانی متذکرہ وجوہات کی بنا پر نہیں بلکہ خدا نے اپنے بندوں کو آزمانے کے لیے بھیجی ہے۔ساتھ ہی کھرے اور کھوٹے کا فیصلہ کیا جانا مقصود ہے۔تو ایسے موقع پر خدا کے حضور خود کو کھرا ثابت کیا جائے۔اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ ہم خدا کے وہ تمام حقوق ادا کریں جو ہم پر عائد ہوتے ہیں نیز صبر و تحمل اختیار کرتے ہوئے ثابت قدم رہیں۔لیکن معاملہ ان میں سے کوئی بھی نہ ہو،اور پریشانی خدا کا نازل کردہ عذاب ہو۔تو ہر اس شخص کو جو اُس عذاب سے بچا لیا

جائے، کوئی لمحہ ضائع کیے بنا، سابقہ اور موجودہ زندگی میں انجام دینے والے اعمال کا باریکی سے جائزہ لیتے ہوئے کمیوں پر گرفت حاصل کرے، نیز زندگی کے شب و روز میں آناً فاناً تبدیلی کے لیے متحرک و مستعد ہوجائے۔ قبل اس کے کہ خدا کے عذاب میں وہ بھی مبتلا ہو۔ آزمائشیں تو زندگی کا حصہ ہیں اور وہ آتی ہی رہیں گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وقتاً فوقتاً انفرادی و اجتماعی جائزہ لیا جاتا رہے۔ پھر ہر شخص پریشانی کا جو سبب بھی تلاش کرے اسی کی روشنی میں اٹھ کھڑا ہو اور امن و امان کی بحالی کے ساتھ تبدیلی کا آغاز کرے!

! جنتا پریوار' وجود کو برقرار رکھنے کی سعی و جہد'

سفر رکشہ سے کیا جائے یا بس،کار اور ریل سے ،دوران سفر بے شمار نظارے ہماری آنکھوں سےگزرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم ان نظاروں کو سرسری انداز سے دیکھ کر گزرجاتے ہیں، کبھی وہ ہمیں متاثر کرتے ہیں، کبھی ہماری فکر و عمل کو جھنجوڑتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم بالکل ہی اُنہیں نظرانداز کردیتے ہیں۔ بیشتر افراد کے ساتھ یہ نظرانداز کردینے کا رویہ ہی عموماً وقوع پذیر ہوتا ہے۔پھر جس طرح دوران سفر بے شمار نظارے ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں اور کوئی نہ کوئی ردّ عمل ہم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرز پر زندگی میں پیش آنے والے واقعات و مشاہدات بھی شعور و لاشعوار میں فکر و عمل پر اثرانداز ہوتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ دوران سفر دیکھے جانے والے نظاروں کو جس طرح ہم نظرانداز کرنے کے عادی بن چکے ہوتے ہیں،کچھ اسی طرح زندگی کے مختلف مراحل میں پیش آنے والے واقعات ومشاہدات اورتاریخی حوالہ جات کے مطالعہ کے باوجودہمارے عملی رویے انجماد کا شکار ہوتے ہیں۔لیکن زندگی کے آخری مراحل میں عموماًہم اندرون قلب ایک کسک میں ہم رہتے ہیں ،کہ کاش اس دور میں جبکہ ہمیں قوت و صلاحیت حاصل ہوئی تھی اور ارادوں میں بھی پختگی تھی،کچھ کر گزرتے ! لیکن یہ دور تو وہ دور ہوتا ہے جبکہ قوت و صلاحیت بہت حدتک ماندپڑ

جاتی ہیں اور تجربات و خواہشات کے علاوہ سرمایہ حیات کچھ بچتا نہیں ہے۔ لہذا ایک عقل مند شخص وہی کہلائے گا جو قبل از وقت اپنی خواہشات کو مثبت رخ دے، اپنی صلاحیتوں کو پہنچانے اور ارتقاء بخشے، اپنے فکر و نظر کی تطہیر کرے، زندگی کے نشیب و فراز میں مختلف واقعات و مشاہدات پر غور و فکر کا رویہ اختیار کرے اور طے شدہ وقت میں انفرادی و اجتماعی سعی و جہد کا پروگرام ترتیب دے۔

ابتدائی گفتگو کے بعد گزشتہ دنوں ملک عزیز ہندوستان میں رونما ہونے والے لوک سبھا الیکشن اور اس کے نتائج پر ہم نظر ڈالتے ہیں۔ اخبار کا قاری خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ چند ماہ پہلے لوک سبھا الیکشن اور اس کے نتائج سے ملک میں اگر کوئی سب سے زیادہ فکر مند تھا تو وہ ملک کی اقلیتیں ہی تھیں۔ اور یہ حقیقت بھی خوب عیاں ہو چکی ہے کہ ملک کی اقلیتوں کی فکر مندی لایعنی نہیں تھی۔ کیونکہ جس طرح ایک سال سے بھی کم کے عرصہ میں ملک عزیز ہند میں اقلیتوں کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے وہ کوئی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اُن کے خلاف کھلے عام منفی بیان بازیاں کی گئیں اور جاری ہیں۔ ساتھ ہی مختلف عنوانات کے تحت جن میں کبھی گھرواپسی کے نعرے سامنے آتے ہیں تو کبھی اقلیتوں کے خلاف ہندو اکثریت کو متحد کرنے کے بیانات، کبھی ملک کے تمام باشندگان کو ہندو قرار دینے کا معاملہ اٹھایا جاتا ہے تو کبھی قانون کے دائرہ میں تبدیلی مذہب کے خلاف

محاذ کھولنے کی بات کی جاتی ہے، کبھی نس بندی کروائے جانے کے دھمکی آمیز بیان سامنے آتے ہیں تو کبھی حق ووٹ سے محروم کرنے کی بات کہی جاتی ہے۔اور ان تمام بیانات کے ساتھ مخصوص اقلیتی طبقہ کے مذہبی مقامات کی بے حرمتی کے واقعات۔یہ وہ باتیں ہیں جن کا اندازہ کسی حدتک ملک میں تقریباً 60% فیصد ووٹنگ کا 31% حاصل کرنے والوں کے برسراقتدار میں آتے وقت ہی ہوگیا تھا،اس کے باوجود کچھ معصوم و ناداں ایسے بھی تھے جنہوں نے کل آبادی کے 15 سے 18 فیصد حاصل کرنے والوں سے بہت سی مثبت توقعات وابستہ کی ہوئیں تھیں۔اور شاید وہ توقعات اس بنا پر تھیں کہ جب کوئی ملک کا وزیر اعظم،وزیر اعلیٰ یا اور کوئی اور دستوری ذمہ دار منتخب ہوتا ہے،تو وہ نہ صرف اپنی پارٹی اور وابستگان کا بلکہ کل ملک کا ذمہ دار ہوتا ہے۔اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کل ملک کے شہریوں کے حق میں نہ صرف پالیسی و پروگرام مرتب کرے بلکہ پالیسی و پروگرام کے عمل درآمد میں رکاوٹ بننے والے افراد و گروہوں پر بھی شکنجہ کسے۔اخبارات و رسائل اور الیکٹرانک میڈیا کو دیکھنے و سننے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بظاہر اس سلسلے میں کچھ کوششیں بھی کی گئی ہیں۔برخلاف اس کے عمل و ردّعمل سے کوئی ایسی شہادت پیش نہیں کی گئی،جس سے دیکھی اور سننی والی باتوں پر یقین کیا جاسکے۔

گزشتہ دنوں جب ملک میں لوک سبھا انتخابات کے نتائج نے کمزور طبقوں نیز

اقلیتوں کو فکرمندی کے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔اس وقت ایک مضمون بعنوان "ہندوستان کا بدلتا سیاسی منظر نامہ "کے آخری پیراگراف میں راقم نے لکھا تھا کہ:اس موقع پر مسلمان ہند جو خصوصاً16،مئی کے بعد ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں انہیں ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ آپ کا یہ طرز عمل آپ کی حیثیت کے لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنی حیثیت سے آج خود ہی واقف نہ رہے ہوں۔لیکن جس طرح انتخابی نتائج کے بعد نہ صرف ناکام زدہ افراد اور پارٹیوں نے ناکامی کا ٹھیکرا مسلمانوں کے سر پھوڑنے کی کوشش کی اور راست و بلاواسطہ انہیں موردالزام ٹھہرایا جا رہا ہے،وہ مناسب نہیں ہے۔وہیں خود مسلمان بھی مسلم تنظیموں کے قائدین، علما کرام اور قائدین ملت کے فیصلوں کو برا بھلا کہنے سے نہیں چوک رہے ہیں۔سوال یہ ہے کہ ناکامی آپ کی ہوئی ہے یا اُن سیاسی پارٹیوں کے لیڈران کی جن کی روٹی روزی ہی آپ کے توسل سے پہنچتی ہے؟گزشتہ دنوں اترپردیش میں جب آپ نے بھرپور اکثریت کے ساتھ ایک پارٹی کو کامیاب کیا تھا تب آپ کو کیا فائدہ حاصل ہوا ؟واقعہ یہ ہے کہ ریاست میں کامیابی کے سال دو سال ہی گزرے تھے کہ تقریباًسو سے زائد چھوٹے۔بڑے فسادات کی لپیٹ میں آپ آگئے۔اور اب جب کہ وہ (لوک سبھا الیکشن میں) ہار چکے ہیں تو کیا ایسا بڑا نقصان ہونے والا ہے جس سے آج تک آپ دوچار نہیں ہوئے ؟درحقیقت تقسیم تو وہ ہوئے ہیں اور انہیں ، ان ہی کے اعمال بد نے رسوا بھی کیا ہے۔اس سے آگے۔بڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف وہ اپنی غلطیوں کا

اندازہ کر چکے ہیں بلکہ طرز عمل میں تبدیلی بھی لایا چاہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج بہار کا سیاسی منظر نامہ تبدیل ہو رہا ہے۔ توقع ہے اُن کو اپنی غلطیوں کے سدھارنے کے نتیجہ میں 2014 کے اختتام تک ہونے والے بہار اسمبلی الیکشن میں ،آپ کے اپنے موقف پر برقرار رہنے کے باوجود ،نتائج میں بڑی تبدیلی سامنے آئے گی۔یاد رکھیں ملک کا سیاسی منظر نامہ نہ صرف آج بلکہ گزشتہ 70 سالوں میں لگاتار تبدیلی ہوتا رہا ہے۔لیکن کامیابی سے ہمکنار وہی لوگ ہوئے ہیں جو ناکامیوں کے بعد بھی اپنے موقف پر جمے رہے، حوصلے بلند رکھے،لائحہ عمل میں تبدیلی کی اور کامیابیوں کے سراغ تلاش کرتے رہے۔

اس ایک اقتباس کی روشنی میں موجودہ حالات کا اگر جائزہ لیا جائے،تو یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح فی الوقت ملک کی چھ سیاسی پارٹیاں جنتا دل یو)، سماج وادی پارٹی، راشٹریہ جنتا دل، انڈین نیشنل لوک دل، جنتا دل (سیکولر)) اور سماج وادی جنتا پارٹی ،سب مل کر ایک نئی پارٹی کے قیام کا اعلان کرتی نظر آرہی ہیں،دراصل یہ اُسی ناکامی کا ادراک ہے ،جس کی وجہ ایک سال پہلے آپ نہیں بلکہ وہ خود ہی تھے۔ایک زمانے میں یہ تمام جماعتیں اور اس کے سربراہان "جنتا دل" کا حصہ رہے ہیں۔جو سنہ 1988 میں وجود میں آیا تھا۔اسی مناسبت سے اسے 'جنتا پریوار' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ 1988 میں جنتا دل کانگریس کے خلاف وجود میں آیا تھا اور تب اسے بی جے پی کا ساتھ ملا

تھا۔ لیکن آج اسی جنتا پریوار کے اتحاد کی تمام کوششیں بی جے پی کے خلاف ہیں اور کانگریس کا ساتھ ملتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جہاں ہندوستانی سیاست کا ایک دور مکمل ہو رہا ہے وہیں ایک نئے دور کا آغاز بھی ہوا چاہتا ہے۔ وجود کو برقرار رکھنے کی سعی و جہد میں "جنتا پریوار "بہت حد تک تشکیل پا چکا ہے۔ اس کے باوجود دیکھنا یہ ہے کہ اس نئے دور میں آپ اپنا تشخص اور وجود برقرار رکھنے کے کیا طریقے اختیار کرتے ہیں؟ تشخص و وجود کی عملی حصہ داری ہی آپ کی مذہبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور خاندانی حیثیتوں کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بنے گی۔ اور اس کی بنیادی کلید اسلام کو بطور ایک مکمل نظام حیات پیش کرنے میں ہے۔ یہ پیش کرنے کا عمل جہاں قولی ہو وہیں عملی بھی۔ ساتھ ہی طریقہ کار وہ اختیار کیا جائے جو اقدار پر مبنی ہو۔ جہاں رنگ، نسل، ذات اور معاشی پیمانوں سے اوپر اٹھ کر انسانی بنیادوں پر بنی آدم کی خیر خواہی عملی رویوں سے ثابت کردی جائے!

کیا ہم معبودانِ باطل کی پیروی میں مصروف ہیں؟

عزت و ذلت ، عروج و زوال اور شرف و منزلت سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے بلندیاں عطا فرماتا ہے، جس کو چاہتا ہے دنیا میں ہی کامیابیاں عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنا پسندیدہ اور محبوب بنا لیتا ہے۔ انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو وہ قدر و منزلت حاصل کرے اور چاہے تو ذلیل و خوار ہو۔ واقعہ معراج میں نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دودھ اور شراب کے برتن میں سے کسی ایک کو لینے کے لیے کہا گیا (مسلم : باب ایمان : واقعہ معراج) ۔نوویؒ کہتے ہیں "اس روایت میں اختصار ہے اور مراد یہ ہے کہ جبریلؑ نے آپ کو اختیار دیا تھا کہ ان دونوں برتنوں میں سے جس کو چاہیں اختیار کریں،آپ نے دودھ پسند کیا۔دودھ اور شراب تمثیل ہے پاکی اور ناپاکی ، معروف و منکر کی یعنی انسان جس چیز کو اختیار کرے گا وہی اس کے مقدر میں لکھ دی جائے گی اور پھر قدر و منزلت اور ذلت و پستی بھی اسی درجہ اس کو حاصل ہوگی۔واقعہ کی تفصیل قرآن حکیم میں بھی ملتی ہے۔کہا کہ "پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے، تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا" (بنی اسرائیل :۱) ۔مزید فرمایا: "اور ایک مرتبہ

پھر اس نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کو اترتے دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چوندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی، اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں" (النجم: ۱۳تا۱۸)۔ متذکرہ آیات میں واقعہ معراج کا تذکرہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ یہ ایک عظیم واقعہ تھا جو اس نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ظہور فرمایا۔ قرآن مجید محمدؐ کے مسجد حرام (یعنی بیت اللہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس)تک جانے کی تصریح کرتا ہے اور اس سفر کا مقصد یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھانا چاہتا تھا۔ اس سے زیادہ تفصیل قرآن میں نہیں ہے۔ حدیث میں جو تفصیلات آئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رات کے وقت جبریل علیہ السلام آپؐ کو اٹھا کر مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک براق پر لے گئے۔ وہاں آپؐ نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا کی۔ پھر وہ آپؐ کو عالم بالا کی طرف لے چلے ،وہاں طبقات سماوی میں مختلف جلیل القدر انبیاء سے آپؐ کی ملاقات ہوئی۔ آخرکار آپؐ انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے اور اس حضوری کے موقع پر دوسری اہم ہدایات کے علاوہ آپؐ کو پنج وقتہ نماز کی فرضیت کا حکم ہوا۔ اس کے بعد آپؐ بیت المقدس کی طرف پلٹے اور وہاں سے مسجد حرام واپس تشریف لائے۔ اس سلسلے میں بکثرت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو جنت اور دوزخ کا بھی مشاہدہ کرایا گیا۔ نیز معتبر روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ دوسرے روز جب آپؐ نے اس واقعہ کا

لوگوں سے ذکر کیا تو کفار مکہ نے اس کا بہت مذاق اڑایا اور مسلمانوں میں سے بھی بعض کے ایمان متزلزل ہو گئے۔

اس سفر کی کیفیت کیا تھی؟ یہ عالم خواب میں پیش آیا تھا یا بیداری میں ؟ اور آیا حضور بذات خود تشریف لے گئے تھے یا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محض روحانی طور پر ہی آپؐ کو یہ مشاہدہ کرا دیا گیا؟ ان سوالات کا جواب قرآن مجید کے الفاظ خود دے رہے ہیں۔ سبحٰنَ الذِی اَسریٰ سے بیان کی ابتدا کرنا خود بتا رہا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا خارقِ عادت واقعہ تھا جو اللہ تعالٰی کی غیر محدود قدرت سے رونما ہوا۔ ظاہر ہے کہ خواب میں کسی شخص کا اس طرح کی چیزیں دیکھ لینا، یا کشف کے طور پر دیکھنا وہ اہمیت نہیں رکھتا کہ اسے بیان کرنے کے لیے اس تمہید کی ضرورت ہو کہ تمام کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے وہ ذات ہے جس نے اپنے بندے کو یہ خواب دکھایا یا کشف میں یہ کچھ دکھایا۔ پھر یہ الفاظ بھی کہ "ایک رات اپنے بندے کو لے گیا" کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ ایک آسمانی سفر تھا۔ ساتھ ہی ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ بھی جو اللہ تعالٰی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کرایا۔ دوسری طرف مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ قرآن حکیم اللہ تعالٰی کی آخری کتاب ہے جو تمام عیوب سے پاک ہے۔ اس کی ہر بات سچی ہے اور اس میں کسی بھی طرح کی تحریف ممکن نہیں۔ پھر یہ بھی کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور آخری رسول ہیں۔ آپؐ انسانوں میں سب سے معتبر

شخصیت ہیں۔ لہٰذا قرآن کی ہر بات قابل یقین اور تمام احادیث قابل تقلید ہیں۔ اسلام میں تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو شخص کسی رسول پر ایمان نہ لائے گا وہ کافر ہوگا خواہ وہ باقی رسولوں کو مانتا ہو۔ لہٰذا اگر ہم جاننا چاہیں کہ آپؐ میں اور دوسرے پیغمبروں میں کیا فرق ہے؟ تو اس کو ہم تین باتوں سے سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں: ۱) آپؐ تا قیامت نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ۲) دیگر انبیاء کی تعلیمات اپنی خالص صورت میں محفوظ نہیں ہیں۔ ۳) دیگر انبیاء کی تعلیمات مکمل نہیں تھیں، احکام و قوانین میں ترمیم و اضافہ ہوتا رہا، لیکن آپؐ کو ایسی تعلیمات دی گئیں جو ہر حیثیت سے مکمل ہیں اور آپؐ کے بعد تمام انبیاء کی شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ اسی طرح قرآن حکیم کے تعلق سے بھی چند باتوں کا جان لینا ضروری ہے۔ ۱) صحفِ ابراہیم اب دنیا میں موجود نہیں، رہی تورات، زبور، انجیل تو وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس موجود ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان سب کتابوں میں لوگوں نے خدا کے کلام کو بدل ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اور دیگر کتابوں میں بہت نمایاں فرق ہو گیا ہے۔ ۲) دیگر کتابوں کے اصلی نسخے گم ہو گئے اور ترجمے رہ گئے، قرآن آج بھی اپنے اصل الفاظ میں موجود ہے، ساتھ ہی اس میں ایک حرف بلکہ ایک شوشہ میں بھی تغیر نہیں ہوا۔ ۳) قرآن میں خالص کلام الٰہی ملتا ہے، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت رسول، سیرت صحابہ اور تاریخ اسلام سب قرآن سے بالکل الگ ہیں۔ ۴) قرآن کے متعلق زبردست تاریخی شہادتیں موجود ہیں، آیتوں تک کے متعلق معلوم

ہے کہ کون سی آیت کب اور کہاں نازل ہوئی۔۵) پچھلی کتابیں جن زبانوں میں نازل ہوئی تھیں وہ ایک مدت سے مردہ ہو چکی ہیں، اب کہیں بھی ان کے بولنے والے باقی نہیں رہے۔٦) دنیا کی مختلف قوموں کی کتابوں میں کسی خاص قوم کو مخاطب کیا گیا ہے یہ کتابیں ایک خاص زمانے کے لیے تھیں، قرآن کے احکامات ہر زمانے میں ہر جگہ، کے لیے ہیں۔٧) قرآن میں جتنی خوبیاں پچھلی کتابوں میں الگ الگ تھیں وہ سب اس میں جمع کر دی گئی ہیں اور جو خوبیاں پچھلی کتابوں سے چھوٹ گئی تھیں وہ بھی اس کتاب میں آ گئی ہیں۔ لہٰذا قرآن پر ایمان اس حیثیت سے ہونا چاہیے کہ یہ خدا کا خالص کلام ہے، سراسر حق ہے، اس کا ہر لفظ محفوظ ہے، اس کی ہر بات سچی ہے، اس کے ہر حکم کی پیروی فرض ہے اور وہ تمام باتیں قابل رد ہیں جو قرآن کے خلاف ہوں۔ لہٰذا قرآن و حدیث میں تذکرہ معراج ثابت کرتا ہے کہ وہ ہمارے عقیدے کا حصہ ہے اور جو شخص بھی اس میں تذبذب کا شکار ہوا، اس کا ایمان جاتا رہے گا۔

وہیں یہ بات بھی ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ انبیاء کرام کے ذریعہ مختلف امتوں کو آزمائے۔ پس یہ واقعہ بھی اسی سنت کا ایک حصہ ہے۔ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ امتِ محمدی کو آزمانا چاہتا ہے۔ نہ صرف یہ آزمائش ہے بلکہ اللہ کی قدرت، جنت و دوزخ کے وجود، جبریلؑ امین کی حیثیت، نماز کی فرضیت اور ان جیسے دیگر معاملات سے بھی اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ اس کے نبیؐ کو واقف کیا

جائے۔ لیکن واقعہ کا پیش آنا اور نبیؐ کے ذریعہ بیان کیا جانا، ان لوگوں کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا جن کی آنکھیں اور جن کے دل نبیؐ کی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر ہونے اور اس کی قدرت کو بیان کرنے کے لیے بھی کافی ہے۔ ساتھ ہی اس واقعہ سے نہ صرف نبیؐ کو بلکہ انسانوں کو بھی اللہ تعالیٰ وہ علم بہم پہنچانا چاہتا ہے جس کے ذریعہ اللہ کی نعمتیں مکمل طور پر واضح ہو جائیں ساتھ ہی انسانوں کو اس عظیم خسارے سے بچالیا جائے جس کا مشاہدہ محمدؐ نے کیا ہے۔ یہ واقعہ آپ کی صداقت کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ آپؐ کے ذریعہ بتائی گئی ہر بات سچی ہے۔ لہٰذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے قول و عمل سے شہادت دیں کہ واقعی ہم نہ صرف محمدؐ کی ہر بات کو سچ مانتے ہیں بلکہ ہمارا اشمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کے تعلق سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں البقرہ: ۳)۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اعمال صالحہ کے نتیجہ میں شرف و" منزلت سے ہمکنار کرے۔ ساتھ ہی اس ذلت ورسوائی سے محفوظ رکھے جو معبودانِ باطل کی پیروی کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود سوال یہ ہے کہ کیا آج ہم معبودانِ باطل کی پیروی میں مصروف ہیں؟ اور یہ بھی کہ کس حد تک اور کیوں؟

نکبہ یعنی آفت کا دن یعنی ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء

محمد آصف اقبال، نئی دہلی

کہا جاتا ہے کہ کسی بھی مقصد کے لیے جب تک تن من دھن سے جدوجہد نہ کی جائے اس کا حصول ممکن نہیں ہے۔شاید یہی معاملہ فلسطینی ریاست کے قیام پر بھی چسپاں ہوتا ہے۔یاد کیجیے فلسطینی ریاست جسے ۱۵مئی ۱۹۴۸ء میں مکمل طور پر ختم کرنے کی منظم کوشش کی گئی ۔اور جہاں نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کے فیصلہ کے بعد اسرائیلی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔اُس موقع پر کہیں شادیانے بجائے گئے تو کہیں حد درجہ غم وفسردگی کے ماحول میں لاتعداد فلسطینیوں نے گھربدری کی تھی۔یہ وہی نقبہ یعنی بڑی گھس پیٹھ کا دن تھا جسے یوم نکبہ کے طور پر آج تک یاد رکھا جاتا ہے۔اس کے باوجود جس سعی و جہد کا آغاز،ذلت و رسوائی سے نجات کا عزم اور ایک طویل ،صبر آزما اور عظیم قربانیوں کی تاریخ رقم کی گئی۔اُس سچّے اور مخلصانہ عمل نے ثابت کر دیا کہ مقصد کی دھن میں مصروف افراد و گروہ آخر کار کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔اس کی تازہ مثال دنیا کے ایک ارب پچیس کروڑ سے زائد کیتھولک عیسائیوں کے روحانی پیشوا پوپ کی ویٹی کن میں واقع حکومت نے فلسطین کو باقاعدہ طور پر ریاست کا تسلیم کیا جانا ہے۔پوپ

نے فلسطینی ریاست کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا ہے اور اسرائیل سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ فلسطین کو اس کا حق دے۔ گرچہ اسرائیل ویٹی کن کے اس قدم سے ناراض ہے اور اس نے دھمکی بھی دی ہے کہ اس عمل سے قیام امن متاثر ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس کی ناراضگی کی پرواہ کیے بنا فلسطینی خطے میں کیتھولک چرچ سے متعلق "ہولی سی" معاہدے میں کہا گیا ہے کہ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن کی جگہ فلسطینی ریاست کو سفارتی سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور اب اس ہی سے تمام تعلقات رکھے جائیں گے۔ دوسری جانب اس فیصلہ پر دیگر ممالک کا ردعمل بھی سامنے آیا ہے۔ سویڈن نے ویٹی کن کے اس قدم کو تاریخی قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اسرائیل کو اب انصاف کی راہ پر چلنا ہی ہوگا۔ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ آئرلینڈ نے کہا کہ فلسطین کو بہت پہلے تسلیم کر لیا جانا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود اب بھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔ برطانیہ نے بھی اسے فلسطین کے دبے کچلے عوام کے حق میں بہت بڑا قدم قرار دیا ہے اور اسرائیل سے اپیل کی ہے کہ وہ امن کے فارمولے پر قائم رہے۔ ساتھ ہی اٹلی نے ویٹی کن کے قدم کے تعلق سے کہا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں امن قائم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ دونوں ہی ریاستوں کو تسلیم کیا جائے۔ وہیں فلسطینی وزرات خارجہ کا کہنا ہے کہ اب تک ۱۳۵ ممالک اور ۸ پارلیمان فلسطینی ریاست کو تسلیم کرچکے ہیں۔اور ان میں یورپی یونین کے کئی ممبر ممالک بھی شامل ہیں۔ یہ اس سعی و جہد کا نتیجہ ہے جس میں اب تک بے شمار جانیں بطور نذرانہ پیش کی جا چکی ہیں اور نہیں معلوم

اور کتنی جانیں قربان ہوں گی۔

دوسری طرف ظلم و تشدد پر یقین رکھنے والے زیادتیاں کرنے سے گریز نہیں کر رہے ہیں اور لگتا ہے کہ وہ بوکھلاہٹ میں مزید زیادتیوں میں مصروف عمل ہیں۔اسی سلسلے کی خبر کے مطابق سفاک اسرائیلی فوجیوں نے فلسطین کے مقبوضہ مغربی کنارے سے حراست میں لی گئی ایک عمر رسیدہ خاتون پر وحشیانہ تشدد کرکے اس کے بازو توڑ ڈالے۔ فلسطینی خاتون کو اردن سے واپسی پر گھر پہنچتے ہی صیہونی فوجی اغواء کرکے لے گئے تھے۔تشدد کا نشانہ بننے والی خاتون کے بیٹے محمد عبدالعزیز خرفان نے بتایا کہ اس کی والدہ چند روز قبل اردن میں اپنے پاسپورٹ کی تجدید کے لیے اردن گئی تھیں جہاں وہ حال ہی میں واپس مغربی کنارے میں قلقیلیہ میں عزون کے مقام پر اپنے گھر پہنچی ہی تھیں کہ انہیں حراست میں لے لیا گیا۔سوال کے جواب میں خرفان نے بتایا کہ اس کی والدہ (۶۰ سالہ) یسری محمد قاطش کو چوبیں گھنٹے حراستی مرکز میں رکھا گیا۔جہاں وحشیانہ تشدد کرکے اس کے بازو توڑ ڈالے گئے۔خرفان نے بتایا کہ اس کی والدہ کو پہلے مغربی کنارے کے ایک تفتیشی مرکز میں رکھا گیا جہاں اگلے بارہ گھنٹے اسے بیت المقدس میں معالیہ ادومیم کے ایک پولیس سینٹر میں لے جایا گیا۔حراستی مرکز سے رہائی کے بعد اس زخمی خاتون کو اسپتال لے جایا گیا،جہاں ڈاکٹروں نے اس کی مرہم پٹی کی۔میڈیکل رپورٹ کے مطابق یسریٰ قرطاش کا ایک

بازو توڑ دیا گیا ہے۔ قابض فوجیوں نے نہ صرف خاتون کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا بلکہ اس کا اُردنی پاسپورٹ بھی ضبط کر لیا۔ وہیں ایک دوسری خبر کے مطابق کم سن فلسطینیوں سے قابض صیہونی جیلروں اور سفاک تفتیش کاروں کے وحشیانہ سلوک کے مظاہر سامنے آئے ہیں۔ انسانی حقوق کی ایک تنظیم نے اپنی رپورٹ میں زیر حراست بچوں کے ساتھ نہایت شرمناک اور وحشیانہ سلوک کا انکشاف کیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دوران تفتیش زیر حراست فلسطینی بچوں کے سر ٹوائلٹ میں ڈالے جاتے ہیں اور گھنٹوں انہیں اسی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ اسیران و محررین کمیٹی کی مندوب ھبہ مصالحہ نے اسرائیلی جیلوں کے دورے کے بعد ایک رپورٹ مرتب کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ دوران حراست کم عمر بچوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ المصالحہ نے ہشارون جیلوں میں کم عمر بچوں سے ملاقات کی۔ بچوں نے بتایا کہ انہیں روز مرہ کی بنیاد پر وحشیانہ اور خوفناک نوعیت کے تفتیشی مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ انہیں زنجیروں میں باندھ کر گھسیٹا جاتا ہے، وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے، بجلی کے جھٹکے لگائے جاتے ہیں اور نفسیاتی تشدد کرتے ہوئے اہل خانہ کو بھی شامل تفتیش کرنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ انسانی حقوق کی مندوبہ کا کہنا ہے کہ اسرائیلی جیلوں میں فلسطینی اسیران بالخصوص کم عمر اسیران کی صورتحال نہایت ناگفتہ بہ ہے۔ قیدیوں کے حقوق کا خیال تو درکنار اسیران کے حوالے سے عالمی قوانین کا سر عام مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ھبہ المصالحہ نے بتایا کہ اس کی

ملاقات ایک۱۶سالہ احمد عدنان منا نامی بچے سے ہوئی۔اسے بیت المقدس سے ۲۴فروری کو صیہونی فوجیوں پر سنگ باری کے الزام میں حراست میں لیا گیا تھا۔اس نے بتایا کہ دوران حراست اس کے ساتھ بار بار وحشیانہ سلوک کیا جاتا ہے ساتھ ہی بری طرح مارا پیٹا جاتا ہے۔

وحشیانہ اور سفاکانہ قوم کے ایک فوجی اہلکار کا وہ انٹرویو بھی پڑھتے چلئے جو گزشتہ سال جولائی اور اگست کے دوران فلسطین کے علاقے غزہ کی پٹی پر مسلط کی گئی جنگ کا احوال بیان کرتا ہے۔انٹرویو اسرائیلی فوجی 'اریبہ' نے فرانسیسی اخبار 'لی مونڈ' کو دیا ہے جس میں غزہ جنگ کے حوالے سے اہم اعترافی انکشافات کیے گئے ہیں۔ فوجی اہلکار کہتا ہے کہ جنگ کے دوران ہم محض تفریح کی خاطر نہتے فلسطینیوں کا قتل عام کرتے اور شہری مقامات کو بمباری کا نشانہ بناتے رہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک روز صبح آٹھ بجے ہمیں غزہ کی پٹی میں البریج کی جانب روانہ ہونے کو کہا گیا۔یہ علاقہ گنجان آباد ہے۔اس کے بعد ہمارے سینیر کمانڈر نے حکم دیا کہ ہم اپنا ہدف خود مختص کریں اور اس کے بعد ہدف کو نشانہ بنا کر اندھا دھند گولہ باری شروع کردیں۔ پھر ہم سے ہر ایک نے ایسے ہی کیا۔اس وقت ہمیں حماس کا کوئی جنگجو دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی ہم پر کسی طرف سے کوئی جوابی فائر کیا گیا۔ لیکن ہمارے فوجی کمانڈر نے ہنستے ہوئے کہا کہ آج ہم اپنی فوج کے لیے البریج کا تحفہ لے کر جائیں گے۔ صیہونی فوجی

کہتا ہے ایک روز ہمارا ایک ساتھی اہلکار مارا گیا۔ ہمیں کمان کرنے والے کرنل نے حکم دیا کہ ہم اس کا انتقام لیں۔ اس کے بعد ہمیں کہا گیا کہ چار کلو میٹر تک جو کچھ بھی دکھائی دے رہا ہے بمباری سے تباہ کر دیا جائے۔ میں اور میرے ساتھیوں نے ایک ۱۱ منزلہ عمارت کو نشانہ بنایا اور وہ زمین بوس ہو گئی۔ اس میں درجنوں خاندان رہائش پذیر تھے جو سب کے سب ملبے تلے دب کر مارے گئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ سب بے گناہ تھے۔ اور ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ جنگ کا مقصد حماس کو نقصان پہنچانا نہیں تھا بلکہ غزہ کی پٹی کا انفرا اسٹرکچر تباہ کرنا تھا۔ ہم غزہ کی پٹی میں ۱۹ جولائی کو داخل ہوئے اور حماس کی کھودی گئی سرنگیں تلاش کرنے لگے۔ ہمیں کہا گیا کہ ہمارا ہدف حماس کا زیر زمین نیٹ ورک تباہ کرنا ہے۔ حماس کا نیٹ ورک تو اتنا تباہ نہیں ہوا مگر غزہ کی زراعت اور معیشت کا دیوالیہ ضرور نکال دیا گیا۔ تاہم یہ بھی حماس کے لیے ایک واضح پیغام تھا کہ آئندہ ہمارے ساتھ پنجہ آزمائی سے قبل ضرور سوچ بچار کرے۔ اس نے کہا کہ ہم نے رہائشی مکانات، کھیتوں، دفاتر، بجلی کے کھمبوں اور ایسی ایسی چیزوں کو بمباری سے نشانہ بنایا جن کا مزاحمتی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ عموماً شہریوں کی بنیادی ضروریات کا حصہ تھیں۔ یاد رہے یہ انٹرویو ایک ایسے وقت میں آیا ہے جبکہ انسانی حقوق کی ایک تنظیم نے انکشاف کیا ہے کہ غزہ جنگ میں اسرائیلی فوجیوں نے دانستہ طور پر عام شہریوں کا وحشیانہ قتل عام کیا تھا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ گزشتہ سال جولائی اور اگست

کے دوران غزہ کی پٹی پر اکاون دن تک جاری رہنے والے اسرائیل کے فضائی، زمینی اور بحری حملوں میں تقریباً ۲۳۰۰ سے زائد فلسطینی شہید اور ۱۱ ہزار سے زائد زخمی ہو گئے تھے۔ مقدس زمین فلسطین پر نقبہ یعنی آفت کا دن کل ہی نہیں آج بھی جاری ہے۔ لیکن اسرائیلی جارحیت کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ صرف یوم نکبہ منا کر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہونا تو یہ چاہیے کہ مسلمان ہی نہیں بلکہ قیام عدل و انصاف کے علمبردار ملک عزیز ہند اور پوری دنیا میں اسرائیل اور اسرائیل نواز معیشت کا مکمل طور پر بائیکاٹ کریں۔ ممکن ہے یہ چھوٹا عمل اُن روحوں کے لیے باعثِ تسکین بنے جو اذیتیوں کے دوران جینے پر مجبور ہیں!

!ترقی و خوشحالی اور اعتماد بحالی کے درمیان خط امتیاز

ہر زمانے میں ترقی کے مختلف معیار انسانی فکر و عمل کو نہ صرف متاثر کرتے رہے ہیں بلکہ اس کی فکر اور عمل پر بھی اثر انداز ہوئے ہیں۔ترقی کہیں فرد کی ذاتی زندگی میں دنیاوی وسائل میں اضافہ کا نام ہے تو کہیں معاشرہ میں موجود باطل اعمال میں سدھار کا نام ۔ کہیں چند مخصوص افراد کے معیار زندگی میں خوشنما تبدیلی کا نام ہے تو کہیں اہل ملک کے تعلیم و تمدن میں مثبت تبدیلی کا نام۔ کہیں اہل ثروت افراد، گروہ اور قوموں کے نقش قدم سے مطابقت کا نام تو کہیں اخلاق رذیلہ سے نجات اور عفت و عصمت کے اختیار کرنے کا نام۔ کہیں زماں و مکاں کے حدودِ متعین میں مخصوص گروہ ، فکر اور نظریہ کی سربلندی و عروج کا نام ہے تو کہیں زمانہ درزمانہ خوابِ غفلت سے بیداری کا نام۔ترقی کے مختلف معیار گروہِ انسانی کے اُس عقیدے سے وابستہ ہیں، جو اس نے دنیا اور دنیا میں موجود انسانوں کے تعلق سے قائم کیے ہیں۔لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ ہر شخص یا قوم اپنے لیے ترقی کا ایک ہی پیمانہ متعین کرے۔اس کے باوجود یہ لازم ہے کہ برسر اقتدار گروہ ترقی کے مخصوص نظریہ پر عمل کرتے ہوئے، متعلقہ شہریوں کو غذا، صحت ، تعلیم اور بنیادی حقوق کی ادائیگی میں سازگار مہیا کرائے۔تاکہ عام انسانوں کے مسائل حل ہوں اور دنیا میں بھی یہ پیغام جائے کہ مخصوص فکر و

عمل کے حاملین متعدل مزاج ہیں۔ برخلاف اس کے نہ ان کا نظریہ ترقی پا سکتا ہے، نہ عام انسانوں کے مسائل حل ہوں گے اور نہ ہی دنیا یہ ماننے کو تیار ہوگی کہ برسر اقتدار گروہ کے قول و عمل میں کسی بھی درجہ صداقت موجود ہے۔ اس کے باوجود اگر ایک متعین وقت ، حالات اور زمانہ میں کوئی گروہ بظاہر کامیاب نظر آئے تو یہ کامیابی دراصل آنکھوں کا دھوکہ ہے، جو بہت جلد دور ہو جائیگا۔ وجہ یہ ہے کہ شمار باطنی کمزوریوں پر مشتمل گروہ زیادہ مدت قائم نہیں رہ سکتا۔ بصورت دیگر یا تو وہ مکمل طور پر مٹ جائے گا یا پھر اُس کا نام رہے گا بھی تو بس برائے نام۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ جس طرح دنیوی زندگی اور اس کی معیاد کے تعلق سے مختلف عقیدے موجود ہیں ٹھیک اسی طرح مخصوص فکر، نظریہ اور گروہ کے آغاز، عروج اور زوال کی معیاد بھی مختلف قرار پائے۔

گزشتہ سال مئی 2014ء ہندوستان میں پارلیمنٹری انتخابات عمل میں آئے تھے۔ جس کے بعد دس سالہ برسر اقتدار کانگریس پارٹی نے اندرونی خامیوں اور احساس ذمہ داری سے فراموشی کے نتیجہ میں ناکامی کا سامنا کیا تھا۔ وہیں دوسری جانب پارلیمنٹ میں بی جے پی کو بڑی اکثریت کے ساتھ سیٹیں حاصل ہوئیں تھیں۔ نیز ہی بے شمار وعدوں اور خوابوں کے ساتھ انہوں نے حکومت تشکیل دی۔ ان وعدوں اور خوابوں میں خصوصیت کے ساتھ کالے دھن پر گرفت ، مہنگائی سے چھٹکارا، بھک مری سے نجات اور غربت کا خاتمہ تھا۔ غالباً یہی وہ بڑے وعدے اور خواب تھے جس کی

بنا پر اُس وقت عوام نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہیں یہ بات بھی واضح ہونا ضروری ہے کہ اُس وقت بی جے پی کو صرف اکتیس فیصد ووٹ حاصل ہوئے تھے جو کل آبادی کے پندرہ سے اٹھارہ فیصد لوگوں کے خوابوں کی تعبیر یا اعتماد تھا۔ اس کے باوجود یہ بی جے پی کی تاریخی کامیابی تھی جس کے لیے اُس نے تن من دھن سے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا ۔اور اب جبکہ ایک سال مکمل ہو گیا، کیے گئے وعدے اور خواب کسی صورت پورے ہوتے نظر نہیں آ رہے ہیں۔ لہذا جہاں ایک جانب حزب اختلاف ہر ممکن چوٹ کرنے سے گریز نہیں کر رہی ہے وہیں عوام بھی موجودہ حکومت سے مایوس ہی نظر آ رہے ہیں۔

ملک میں ایک طویل عرصہ سے بے غربت ، بے روزگاری اور بھوک ایک بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ مسائل کے حل میں حکومت ہی نہیں سماج کی متعدد تنظیمیں بھی مصروف عمل ہیں۔ اس کے باوجود حالیہ ایف اے او نے ایشیا بحر الکاہل غذائی تحفظ کی جانب سے جاری ہونے والی رپورٹ میں ملک کی صورتحال کو تشویشناک بتایا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کہ گرچہ ہندوستان میں تیز رفتار معاشی ترقی اور سماجی مقاصد کے حصول میں کامیابی خطہ کی پالیسیاں ہیں مگر پھر بھی دنیا میں سب سے زیادہ بھوکے لوگ یہیں بستے ہیں۔ ملک میں غذائی تحفظ کو یقینی بنانے کی کوششوں کے باوجود اب بھی 19،کروڑ ،لاکھ لوگوں کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا [illegible] 40 انہیں کھانا نہیں ملتا بلکہ جو کھانا بھی ملتا ہے وہ تغذیہ

سے بھرپور نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے 5 سال سے کم عمر کے بچوں کی نشوونما نہیں ہو پاتی۔ اس کے علاوہ ہر عمر کے لوگوں میں غذائی اجزا کی کمی کی بنا پر متعدد بیماریاں پائی جاتی ہیں۔ ملک یہ صورتحال ایک جانب تشویشناک تو دوسری جانب افسوس ناک بھی ہے۔ وہیں موجودہ حکومت کے ایک سال مکمل ہونے پر 'وال اسٹریٹ جرنل' میں ایک مضمون شائع ہوا۔ جس میں کہا گیا ہے کہ مودی حکومت کی 'میک ان انڈیا' مہم اب تک سرخیوں میں ہی رہی ہے اور بڑی توقعات کے درمیان روزگار میں اضافہ کی رفتار سست بنی ہوئی ہے۔ مینوفیکچرنگ کے میدان میں اس مہم کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آیا ہے۔ وہیں برآمدات جیسے اقتصادی معیار بتاتے ہیں کہ معیشت اب بھی لڑکھڑا رہی ہے۔ گزشتہ سال کے مقابلے سرمایہ کاری کے لیے افراط زر 2004ء کے بعد سب سے نچلے سطح پر آگئی ہے اور برآمدات اپریل میں مسلسل پانچویں مہینے گری ہے۔ کمپنیوں کی آمدنی معمولی رہی ہے اور غیر ملکی سرمایہ کاروں نے مئی میں ابھی تک ہندوستانی اسٹاک اور بانڈ مارکیٹ سے تقریباً 2 ارب ڈالر نکال لیا ہے۔ عوامی مسائل اور کیے گئے وعدوں کے علاوہ مودی حکومت پر اب انہیں کے افکار سے وابستہ دیگر تنظیمیں بھی متعدد معاملات میں حساب مانگتی نظر آرہی ہیں۔ اس موقع پر آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد نے بی جے پی کو اجودھیا میں رام مندر بنانے کی یاد دلائی ہے۔ سنگھ پریوار کی دونوں اکائیوں نے بی جے پی کو اس سلسلے میں لوک سبھا انتخابات کے دوران کیا گیا وعدہ پورا کرنے کو کہا ہے۔ آر ایس ایس کے کل ہند شریک رابطہ کے سربراہ ارون

کمار نے ناگپور میں صحافیوں سے بات چیت میں کہا کہ بی جے پی حکومت کو اپنے وعدے پورا کرنے میں لوگوں کی امیدوں پر کھرا اترنا چاہیے۔خاص طور پر رام مندراورآئین کے آرٹیکل 307،کو ختم کرنے کے معاملے میں ، جس کے ذریعہ جموں و کشمیر کو خصوصی درجہ ملا ہوا ہے۔اس درمیان وشو ہندو پریشد (وی ایچ پی) نے بھی حکومت سے اجودھیا میں بابری مسجد کے مقام پر رام مندر کی تعمیر میں رکاوٹوں کو دور کرنے کو کہا ہے۔ہریدوار میں وی ایچ پی کی مرکزی منڈل کی دو دنوں تک چلنے والی میٹنگ کے پہلے دن پاس کی گئی تجویز میں کہا گیا ہے کہ اس معاملے کو حکومت کے سامنے اٹھانے کے لیے سنتوں کا ایک وفد بنایا جائے گا،تاکہ رام مندر کی تعمیر سے وابستہ رکاوٹوں کو دور کیا جاسکے۔وہیں اجلاس میں متھرااور کاشی میں موجود ہندوؤں کے دو اور مذہبی مقامات پر دعویٰ کرکے ہندوتو کا ایجنڈا آگے بڑھانے کی بات بھی سامنے آئی ہے۔یہ اور اس طرح کے دیگر بے شمار مسائل ہیں جو موجودہ حکومت کے سامنے اٹھائے جارہے ہیں۔اس کے باوجود حکومت یا تو یہ کہتی نظر آتی ہے کہ ہم مسائل کے حل میں کوشاں ہیں یا پھر پارلیمنٹری نظام کے دوسرے ہاؤس یعنی راجیہ سبھا میں اقلیت میں ہونے کا رونا رو رہی ہے۔

مضمون کے آخر میں اگرہری کرشنا اکسپورٹ پرائیوٹ لمیٹیڈ جو ہیرے برآمد کرنے والی عالمی سطح کی مشہور و معروف کمپنی ہے،کے تذکرے کے ساتھ ممبئی کے

ذیشان علی خاں کا ذکر نہ کیا جائے ،تو ملک کی برسر اقتدار سیاسی جماعت،اس کی فکر،اوراس کی فکر میں رنگتے ہوئے دیگر افراد کے ذہن کو پڑھنا ذرا مشکل عمل ہوگا۔روزگار کی تلاش میں ایم بی اے سند یافتہ ذیشان علی خاں نے متذکرہ کمپنی میں درخواست داخل کی تھی۔جس کا آن لائن جواب نہ صرف چونکا دینے والا ہے بلکہ ایک سیکولر اور ترقی یافتہ ملک کے لیے نہایت شرمناک بھی ہے۔خبر کے مطابق ذیشان کو کمپنی کی جانب سے جو میل ملا،اس میں لکھا تھا"ہم افسوس کے ساتھ آپ کو مطلع کرتے ہیں کہ ہم صرف غیر مسلموں کو روزگار دیتے ہیں"یعنی اس ملک میں مسلمانوں کے لیے ہمارے پاس روزگار نہیں ہے۔اس کے باوجود قابل اطمینان بات یہ ہے ،جو شاید زیادہ عرصہ نہ رہے، کہ ذیشان کے ساتھیوں نے جن کا متذکرہ کمپنی میں انتخاب ہوگیا تھا،ملازمت کرنے سے انکار کردیا ہے اور کہا کہ ہم پرزور انداز میں کمپنی کے اس عمل کی مذمت کرتے ہیں اور ذیشان کی تائید۔یہ موقع ہے مسلمانان ہند کے لیے کہ وہ سوچیں اور غور و فکر کریں کہ برادران وطن اُن کے تعلق سے کیا کچھ احساسات رکھتے ہیں؟نیز اعتماد بحالی اور غلط فہمیوں کے ازالہ میں عملی اقدامات کا وقت ہے جبکہ ملک کی اکثریت نہ صرف فرد بلکہ اُس کے مذہب، معاشرت، تمدن اور نظام سے بھی پوری طرح لاعلمی کا اظہار کرے!

ظلم و بربریت کی تصاویر میں ایک تصویر !

موجودہ دور میں سوشل میڈیا نے ان بہت سے افراد کو زبان دی ہے جن کو نہ کوئی جانتا تھا اور نہ ہی ان کے پاس اپنی بات رکھنے کا مواقع موجود تھے۔یعنی سوشل میڈیا کے ذریعہ آج ہر شخص کو آزادانہ لیکن قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی بات کہنے کا پورا حق ہے۔ساتھ ہی اِس میڈیا نے نہ صرف اپنی بات کو تحریری شکل میں رکھنے کا موقع فراہم کیا بلکہ تصاویر ،آڈیو اور ویڈیوز بھی مہیا کرائے۔گزشتہ چند ماہ یا ہفتوں سے سوشل میڈیا کی فراہم کردہ اِنہیں تصویر وں میں کچھ ایسی تصاویر بھی دیکھنے کو ملی ہیں جنھوں نے بے شمار افراد کے قلب کو حد درجہ متاثر کیا ہے۔ہم خصوصاً اُن تصاویر کا تذکرہ کر رہے ہیں جو روہنگیا مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔جنہیں دیکھ کر نہ صرف کلیجہ منہ کو آتا ہے بلکہ آنکھوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔حد درجہ اذیت ناک تصاویر میں سے ایک تصویر نے خود ہمارے ذہن کو گزشتہ ایک ہفتہ سے کسی بھی لمحہ سکون و اطمینان فراہم نہ ہونے دیا ہے۔تصویر کو ذہن سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کسی صورت کامیابی نہ حاصل ہوئی۔اور ہوتی بھی کیسے جبکہ تصویر میں ظلم وزیادتی کی تمام حدیں پار کی جاچکی ہوں۔تصویر ایک ننے بچے کی ہے۔جو غالباً ایک سال یا کچھ زائد کا رہا ہوگا۔بچہ زمین پر مردہ حالت میں پڑا ہوا ہے اور ایک جنونی شخص اس پر کھڑا

ہے۔اس کا ایک پیر بچہ کے دونوں پیروں کو دبائے ہوئے ہے تو وہیں دوسرا پیر بچہ کی گردن پر موجود ہے۔بچہ کی زبان سے منہ سے باہر ہے اور چہرہ کالا پڑ چکا ہے۔اس کے باوجود جنونی شخص یا تو اپنی فوٹو بنوانے میں مصروف ہے یا ظلم و بربریت کے اِس عمل کے دوران کسی نے اُس کی تصویر لے لی ہے۔ گزشتہ ایک ہفتہ سے ہر وقت چلتے پھرتے،اٹھتے ،بیٹھتے ہر وقت تصویر ذہن پر سوار رہتی ہے۔یہاں تک کہ جب رات کو سونے کے لیے آنکھ بند کریں تو پھر اسی معصوم بچہ کی تصویر آنکھوں میں گھومنے لگے،اور انسان ہڑبڑا کر اٹھ جائے۔معاملہ ایسا بھی نہیں ہے کہ یہی ایک تصویر روہنگیا مسلمانوں پر جاریظلم وزیادتی کی موجود ہو۔بے شمار تصاویر ہیں جنہیں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ظلم و جبر کا دور دورہ ہے اور ایک ایسا المناک تشدد جس کا بظاہر اختتام ہوتا نظر نہیں آرہا ہے۔اس کے باوجود وہ بچہ کسی قیمت آنکھوں سے دور نہیں ہوتا!

آیئے ان روہنگیا مسلمانوں کے بارے میں مزید کچھ جاننے کی کوشش کریں جن کے تذکرے آج کل چہار جانب جاری ہیں۔برما میں مسلمان نویں صدی عیسوی میں اس وقت آئے تھے ،جب اسلام پوری آب وتاب کے ساتھ عرب،فارس،یورپ اور چین میں اپنی لازول کرنیں بکھیر رہا تھا۔اس وقت برما میں حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالی عنہ کے صاحبزادے محمد حنفیہؒ کے ذریعہ آفاقی مذہب کی آمد ہوئی اور یہاں کے عوام اخوت ومحبت اور انسانیت سے مزین دین اسلام سے متعارف ہوئے ۔فی

الوقت 'راکھن' جو "برما" کے زیر قبضہ ریاست "اراکان" ہے، یہ خطہ بیس ہزار مربع میل پر محیط ایک مسلم مملکت تھا، جس پر 1784ء میں برما نے قبضہ کیا۔ 1824ء میں اراکان پر برطانیہ کا تسلط ہوا۔ اور جب 1947-48ء میں انگریزوں نے انخلا کیا تو اہلِ اراکان کی شدید خواہش اور کوشش کے باوجود حیدرآباد اور جوناگڑھ وغیرہ ریاستوں کی طرح اراکان کو بھی خود مختاری نہیں دی گئی۔ محتاط اندازہ کے مطابق اراکان میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 60 فی صد سے کم نہیں ہے۔ اس تعداد میں وہ مسلمان شامل نہیں ہیں جو گزشتہ صدی عیسوی کی دوسری جنگ عظیم میں، جس کا ایک بڑا محاذ اراکان بھی تھا، بچ تو گئے تھے مگر جبری انخلا اور ترکِ وطن یا ہجرت سے محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ مسلمان جو اراکان کے قدیم نام "روہنگ" کی نسبت سے خود کو "روہنگیا" کہلواتے ہیں، ترکِ وطن اور ہجرت کی خاص متنوع اور پرانی تاریخ رکھتے ہیں۔ یہ بڑے مذہبی، جفاکش، پرامن اور صابر و شاکر لوگ ہیں۔ انہیں بزدل نہ بھی کہا جائے، پھر بھی ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ لڑنا بھڑنا اور اپنے جینے کے حق کے لیے مرنا مارنا انہیں پسند نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی یہاں واضح ہوتی چلے کہ برمی مسلمانوں کا مطلب، وہ تمام مسلمان ہیں جو برما میں وہاں کے قانون، دفعہ، ذات اور مذہب کے اعتبار سے اصل الاصول باشندے ہیں۔ روہنگیا مسلمانوں کی تعداد تقریباً 12ء لاکھ ہے جو آج حق

شہریت سے پوری طرح محروم ہیں۔ انہیں گندی پسماندہ بستیوں تک محدود کیا گیا ہے جن میں وہ جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یہ مسلمان صرف نسلی اِعدام'' ہی کے شکار نہیں ہیں، منظم اور طویل المیعاد منصوبہ بندی کے تحت گزشتہ چھ'' سات دہائیوں سے ہر مقتدر فوجی یا غیر فوجی ٹولہ ان کے دینی، علمی، ثقافتی اور تاریخی ارتداد کے لیے بھی کوشاں ہے۔ حکومت و ملازمت اور تعلیم کے دروازے ان پر بند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود پر گزرنے والی قیامت کے بارے میں یہ لوگ دنیا کو تحریراً یا تقریراً کچھ نہیں بتا سکتے۔ روہنگیا کا شمار ایسے باشندوں میں ہوتا ہے جن کا کوئی گھر نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں اقوام متحدہ کی طرف سے دنیا کی سب سے زیادہ استحصال شدہ اقلیت قرار دیا گیا ہے۔ پسماندہ اور کمزور ترین اقلیت ہونے کے باوجود بدھ بھکشو اور مگھوں کے ذریعہ مسلمانوں کے سروں سے کھیلنے کی داستان اور سانحات پچھلے 60 ساٹھ سالوں پر محیط ہیں۔ 1941ء میں ارکان (ریکھائن) کے ضلع (اکیاب) میں بدھسٹوں نے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی اور تنظیم کے تحت مگھوں نے 26 مارچ 1942ء کو ریکھائن میں بسنے والے روہنگیا مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا۔ یہ قتل عام تقریباً تین مہینوں تک جاری رہا۔ مارچ سے لے کہ جون 1942ء تک ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ جبکہ پانچ لاکھ مسلمانوں کو بے گھر اور بے آسرا کیا گیا۔ دوسری بار 1950ء کی دہائی میں قیامت ڈھائی گئی اور بڑے پیمانے پر مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ تیسری دفعہ 1978ء میں برما کی فوجی حکومت نے

مسلمانوں کے خلاف زبردست خونی آپریشن شروع کیا اور تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ نیز پانچ لاکھ سے زائد باشندوں کو اپنی ہی سرزمین سے بے دخل کردیا۔ 1991ء میں چوتھی دفعہ مسلمانوں کے خلاف خونی آپریشن شروع کیا نیز ریکھائن میں فسادات برپا کیے گئے۔ ان فسادات کے نتیجے میں ظالم مگھوں نے ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور گزشتہ 2012ء سے جو خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے اس کو نہ صرف ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں بلکہ سوشل میڈیا کے ذریعہ زمانہ بھی شاہد ہے۔

یہاں یہ بات بھی جانتے چلئے کہ یہ گوتم بدھ کون ہیں ؟ جن کی تعلیمات کے نام لیوا قتل و غارت گری اور ظلم و بربریت کے گھناؤنے کھیل میں آج کسی بھی "فرعون و نمرود سے پیچھے نہیں ہیں؟ ہم سب جانتے ہیں کہ بدھسٹ حضرات گوتم بدھ کو اپنا مذہبی رہنما" مانتے ہیں۔ گوتم بدھ 563 قبل مسیح میں پیدا ہوئے اور ان کا اصلی نام "گوتم سدھارتھ " رکھا گیا۔ بقول گوتم بدھ: "انسان برائی کا ارتکاب خود کرتا ہے اور اس کے خراب نتائج کو بھگتنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ وہ خود ہی برائی سے کنارہ کش ہو سکتا ہے اور پاکیزگی اور نجاست دونوں ذاتی صفات ہیں۔ کوئی بھی دوسرے کو پاکیزہ نہیں بناسکتا"۔ یہ علم انہیں دنیا کے فانی ہونے کے ادراک کے بعد ہوا۔ انہوں نے چند مناظر دیکھے: سب سے پہلے منظر میں ایک ضعیف و کمزور آدمی کو دیکھا جسے دیکھ کر انہیں بوڑھے کا ماضی یاد

آیا اور اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہوئے خیال آیا کہ ایک دن وہ بھی اس ضعیفی کی عمر میں پہنچیں گے۔ دوسرے منظر میں ایک بیمار آدمی سامنے آیا جس کے جسم پہ کمزوری کے آثار واضح تھے ،ان کے ذہن میں یہ بات سرایت کر گئی کہ وہ بھی اسی طرح بیمار ہو سکتے ہیں۔ تیسرے منظر میں ایک جنازہ گزرا تو ان کے ذہن میں دنیا کی بے ثباتی سامنے آئی اور احساس ہوا کہ ایک دن میرا جنازہ بھی لوگوں کے کندھوں پہ ہوگا۔ چوتھے منظر میں ایک فقیر اور درویش آدمی آیا، اس کے چہرے پہ طمانیت تھی، وہ بھیک مانگ رہا تھا اور دنیا کے جھمیلوں سے بے خبر ،ایک آزاد زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہی وہ آخری منظر تھا جس نے بدھ کو سوچنے پہ مجبور کر دیا کہ کیا وہ ایسی آزادانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں؟ مناظر کو دیکھ کر شاہانہ ٹھاٹ باٹ چھوڑ، حق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور فیصلہ کیا کہ جب تک وہ صحیح راہ تلاش نہ کر لیں گے گھر واپس نہیں آئیں گے۔ آخر وہ دن آیا کہ گوتم بدھ نے راحت و تسکین حاصل کی۔ اُن کے دل میں ایک قسم کی روشنی محسوس ہوئی اور دل کو اطمینان ہوا۔ معلوم ہوا کہ فاقے اور جسم کو ایذا دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا اور عقبیٰ میں خوشی اور راحت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نیک اور پاک زندگی بسر کی جائے۔ سب پر رحم کیا جائے اور کسی کو نہ ستایا جائے۔ گوتم بدھ کو یقین ہو گیا کہ نجات کا سچا راستہ یہی ہے۔ لہٰذا گوتم نے "بدھ "یعنی عارف کا لقب اختیار کیا۔ اُنہیں گوتم بدھ کی تعلیمات پر عمل پیرا بدھسٹوں کو کاش کوئی ہوتا جو ان کے عمل سے باخبر کرتا۔ شاید کہ انہیں

! اپنے عمل پر پشیمانی ہوتی

!ملک کی تشویناک صورتحال میں اہل اقتدار کا گرتا معیار

ہندوستانی عدلیہ گرچہ کافی فعال ہے اس کے باوجود بے شمار کیسس ایسے ہیں جنہیں ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اگلی تاریخ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ متاثرین اور اُن کے لواحقین و متعلقین کی جانب سے یہ بات بارہا سامنے آتی رہی ہے کہ ایسے کیسس کا فیصلہ جلد از جلد ہونا چاہیے۔اس کے لیے حکومت نے جہاں جج صاحبان کی تعداد بڑھائی ہے وہیں فاسٹ ٹریک عدالتیں بھی قائم کی ہیں۔اس کے باوجود مسائل اس رفتار سے حل ہوتے نظر نہیں آرہے ہیں جو مطلوب ہے۔دوسری جانب ملک میں پھیلتی بد عنوانی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اس تعلق سے بھی نئی حکومت نے یہ امید دلائی تھی کہ اقتدار میں آنے کے بعد بد عنوانی پر شکنجہ کسا جائے گا۔اور وہ لوگ جو بد عنوانی کے کیسس میں پکڑے جائیں گے ان کا فیصلہ فاسٹ ٹریک عدالتوں میں حل کیا جائے گا۔ ساتھ ہی بدعنوان رہنماؤں کے لیے بھی فاسٹ ٹریک عدالتیں قائم کی جائیں گی۔ لیکن یہ امید جو دلائی گئی تھی اس وقت تشویشناک بن کر سامنے آتیہے جبکہ آر ٹی آئی ایکٹوسٹ انیل گلگلی اس تعلق سے معلومات حاصل کرتے ہیں۔ لیکن وزیر اعظم کے دفتر کی طرف سے کسی بھی طرح کے حکم نہ دینے کی معلومات خبروں کے ذریعہ سامنے آتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی سامنے آتی کہ گزشتہ پندرہ سالوں میں

فیصد فاسٹ ٹریک عدالتیں بند ہوئی ہیں۔ دراصل انیل گلگلی نے وزیر اعظم کے دفتر 53
سے وزیر اعظم مودی کا بدعنوان رہنماؤں کے معاملے میں فاسٹ ٹریک کورٹ قائم
کرنے کے اعلان اور اسی کے تحت جاری کیے ہوئے حکم کی کاپی مانگی تھی۔ لیکن محکمہ
انصاف کے انڈر سکریٹری پی پی گپتا نے صحیح معلومات نہیں دی۔ جس کے بعد انیل گلگلی
نے وزرات قانون سے وضاحت طلب کی۔ تو اس کے بعد حکومت ہند کے محکمہ انصاف
کے ڈائریکٹر پرشانت کمار پونو گوتی نے واضح کیا ہے کہ ایسا کوئی بھی حکم وزیر اعظم کے
دفتر کی طرف سے جاری نہیں کیا گیا کیونکہ اس کی ذمہ داری متعلقہ ریاستوں کی
ہے۔ انیل گلگلی کو ملک کے 29، ریاستوں میں سال 2000ء میں منظور فاسٹ
ٹریک کورٹ کی تعداد اور اس وقت کتنے فاسٹ ٹریک کورٹ کام کر رہے ہیں، اس کی
معلومات دی گئی ہیں۔ معلومات کی روشنی میں ملک کی 29، ریاستوں میں کل
1734، فاسٹ ٹریک کورٹ کو سال 2000ء میں منظوری دے دی گئی
تھی، لیکن فی الحال صرف 815، فاسٹ ٹریک کورٹ کام کررہے ہیں۔
ریاست بہار میں سب سے زیادہ 179، فاسٹ ٹریک کورٹ ہیں، تو وہیں
مہاراشٹر میں 92، مدھیہ پردیش میں 84، مغربی بنگال میں 77، آندھرا پردیش میں
72 [illegible] ۔ جبکہ مسلسل 15، سال وزیر [illegible]
زیندر مودی کے گجرات میں صرفپانچ سال 166، فاسٹ [illegible]
تھے جس میں سے 105، آگے چل کر بند ہو نے سے اب 61، فاسٹ
ٹریک کورٹ ہی کام کر رہے ہیں۔ انیل گلگلی نے وزیر اعظم نریندر مودی کو خط بھیج کر
جن ریاستوں نے فاسٹ ٹریک کورٹ بند کیے ہیں ان پر کارروئی کرنے کا مطالبہ

کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کا کہنا ہے کہ مجرم اور سیاسی لیڈروں کی ملی بھگت توڑنے کے لیے ایسے فاسٹ ٹریک کورٹ ضروری ہیں۔ نیز تمام وزیر اعلیٰ اور چیف سکریٹریز کی میٹنگ بلاکر اس ضمن میں حکم دینے کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ گلگلی کی یہ کوشش قابل قدر ہے خصوصاً ان حالات میں جبکہ ایک جانب عام عدالتوں میں بے شمار کیسس موجود ہیں تو وہیں اِس پس منظر میں بھی کہ ملک میں ملزم اور مجرم کا فرق بہت جلد ہونا چاہیے۔ پھر اگر جرم ثابت ہو جائے تو ایسے مجرمین کو جلد از جلد سزا بھی دلوائی جانی ممکن ہو۔ خصوصاً ان حالات میں جبکہ ایسے مجرمین نہ صرف سماج کے تانے بانے کو بلکہ ملک کی معیشت کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچانے کا ذریعہ بنتےہوں۔

کرپشن اور ملک کی معیشت کے پس منظر میں آج کل للت مودی کے تعلق سے جو گھما گھی اور اندیشہ وامکانات ظاہر کیے جا رہے ہیں، وہ بھی کچھ اہم نہیں ہیں۔ خصوصاً ان حالات میں جبکہ ایجنسیوں کے ذریعہ یہ خبر گردش میں ہو کہ لندن کے بینٹلے ہوٹل کے مالک جوگیندر سانگیر ایک ٹی وی چینل کو انٹریو دیتے ہوئے اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ گزشتہ سال ان کے ہوٹل میں سشما اور للت کی ملاقات ہوئی تھی۔ ہوٹل کے بل چیک کے ذریعہ ہندوستانی ہائی کمیشن نے دیے تھے۔ اور متذکرہ ڈنر میں جوگیندر سانگیر کے خاندان سے 5، نیٹ پوری کے خاندان کے 4 رکن اور للت مودی شامل تھے۔

ساتھ ہی سشما سوراج کے ساتھ ان کا اسسٹنٹ

بھی موجود تھا۔ وہیں سشما سوراج اور للت مودی کے درمیان ملاقات کی بات سامنے آنے پر کانگریس نے سوال اٹھائے ہیں۔ پارٹی نے کہا ہے کہ وزیر خارجہ ہندوستان میں بدعنوانی کے ملزم سے سماجی تقریب میں کیوں ملیں؟ دراصل آئی پی ایل میں مالی بے ضابطگیوں کے الزامات کی یوپی اے حکومت کی طرف سے تحقیقات شروع کیے جانے کے بعد 2010ء سے آئی پی ایل کے سابق کمشنر للت مودی برطانیہ میں رہ رہے ہیں۔ حکومت نے ان کے پاسپورٹ کو رد کر دیا تھا، لیکن گزشتہ سال اگست میں دہلی ہائی کورٹ نے اسے دوبارہ بحال کر دیا تھا۔ وزرات خزانہ مودی کے پاسپورٹ کو بحال کیے جانے کو چیلنج دیے جانے کے حق میں تھا، جبکہ وزرات خارجہ کی طرف سے اپیل کی جانی باقی ہے۔ سابق وزیر خزانہ پی چدمبرم نے اس پر سوال اٹھاتے ہوئے کہا تھا کہ سشما سوراج کو یہ واضح کرنا چاہیے کہ انہوں نے للت مودی کو برطانیہ کے سفری دستاویزات میں مدد کرنے کے بجائے ہندوستانی ہائی کمیشن میں سفر دستاویزات داخل کرنے کے لیے کیوں نہیں کہا؟ وہیں بی جے پی اس پورے معاملے میں داغی آئی پی ایل چیئر مین مودی کی مدد کو لے کر مشکل میں پھنسیں سشما سوراج کے دفاع میں کھڑی نظر آ رہی ہے۔ پارٹی کا کہنا ہے کہ وزیر خارجہ نے انسانیت کی بنیاد پر للت مودی کی مدد کی تھی۔ دوسری طرف مختلف بیانوں کے درمیان کانگریسی لیڈر دگوجے سنگھ کا یہ ٹوئٹ وزیر اعظم نریندر مودی پر سخت حملہ ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ بڑے مودی نے چھوٹے مودی سے دو پرندوں کا شکار کر لیا۔ دو پرندوں سے ان کا اشارہ سشما اور وسندھرا راجے

کی طرف ہے۔ لیکن اس پورے معاملے پر وزیر اعظم کی جانب سے اب تک خموشی ہے اس کے باوجود پارٹی نے یہ واضح کر دیا ہے کہ سشما سوراج اور وسندھرا راجے کے استعفٰی کی اپوزیشن کی بات وہ نہیں مانے گی۔

سدھارتھ وردراجن جو بی بی سی کے سینئر جرنلسٹ ہیں،اس معاملے میں لکھتے ہیں کہ گرچہ ابھی ایک ہفتے پہلے ہی وزیر اعظم نے ٹربیوں کے ساتھ ایک انٹریو میں کہا تھا کہ عوام کے لیے اچھے دن تب ہی آئیں گے جب پرانے دنوں کی دوست بدعنوانی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تو پھر کابینہ کی سب سے سینئر ارکان میں سے ایک کے انفورسمنٹ دائرکٹوریٹ ای ڈی) کے ایک بھگوڑے کی مدد کرنے پر وہ کیسے چپ رہ سکے؟دراصل سشما سوراج) کو اپنے دم پر دفاع کرنے دینے کا مطلب ہوتا اپنے ہی مستقبل کو بگاڑنا اور مودی ایسا کبھی نہیں ہونے دینا چاہتے ہیں۔تاہم سشما سے ان کے بہت اچھے تعلقات نہیں ہیں۔ حالانکہ اس حکمت عملی کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ پارٹی کو بہت ہی پھلسن بھرے ٹریک پر ڈال دیتی ہے۔ یعنی اگر نریندر مودی کا دفاع کرنے کا مطلب سشما سوراج کا دفاع کرنا ہے تو اس کے بدلے بی جے پی کو للت مودی کا بھی دفاع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا اس میں اخلاقی زوال فطری ہے، لیکن اس میں سیاسی نقصان بھی ہے اور لگتا ہے کہ جس کا وزیر اعظم نے اندازہ بھی کر لیا ہے۔ سدھارتھ وردراجن کا یہ تجزیہ کتنا صحیح ہے یہ تو قارئین ہی بتائیں گے لیکن ایک بات طے ہے کہ فی الوقت بی جے

پی کے لیڈران حد درجہ اخلاقی پستی میں ملوث ہوتے نظر آرہے ہیں۔اگر ایسا نہیں ہے تو وہ لازماًاپنی غلطیوں کو تسلیم کرتے ،ساتھ ہی للت مودی جن پر450،کروڑ روپے کی منی لانڈرنگ کے الزامات ہیں اُن کو ملک میں بلاتے اور فاسٹ ٹریک عدالت کے ذریعہ الزامات کا فیصلہسناتے ۔خصوصاً اُن حالات میں جبکہ للت مودی اور نریندر مودی حکومت کے کئی افراد ایک دوسرے کے رابطہ میں ہیں۔

آخر میں سماجی تنظیم انہد کی جانب سے شائع مودی حکومت کے ایک سالہ دور اقتدار پر وہ رپورٹ بھی کچھ کم اہم نہیں جس میں ملک کے 13 الگ الگ ماہرین کی تنقیدی رائے کے ساتھ ان کے تجربات کو شائع کیا گیا ہے۔اس موقع پر شبنم ہاشمی نے کہا کہ مودی حکومت کے ایک سالہ دور اقتدار میں ہندوستان کی شان ، اس کے سیکولرزم اور جمہوریت کو جو نقصان پہنچا ہے وہ نا قابل تلافی ہے۔وہیں لال کرشن اڈوانی کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں جمہوریت کو کچلنے والی طاقتیں سرگرم ہو گئی ہیں۔جس کی وجہ سے ایمرجنسی کی واپسی کے خدشے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔تودوسری جانبجے ڈی یو کے نتیش کمار کہتے ہیں کہ اڈوانی ملک کے سینئر لیڈر ہیں، انہیں فکر ہے تو اس پر سب کو دھیان دینا چاہیے!

! عقائد ہی نہیں ہر پہلو سے اسلام کی دعوت مطلوب ہے

معاملہ چاہے فرد کا ہو یا سماج کا ہر دو سطح پر منصوبوں پر عمل درآمد ضروری ہے۔برخلاف اس کے عموماً دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ منصوبے اور پروگرام بناتے وقت حد درجہ محنت ،صلاحیتیں اور وسائل کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن جب مرحلہ عمل درآمد کا آتا ہے تو یہ منصوبے اورپروگرام دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور اہداف وہ حاصل نہیں ہوتے جو مطلوب ہیں۔دوسری جانب ترقی و خوشحالی اور عدل و قسط کا قیام ہر شخص کی خواہش ہے۔یہ خواہش بااقتدار افراد کی بھی ہے اور ان شہریوں کی بھی جو ملک عزیز سے تعلق رکھتے ہیں۔اس کے باوجود اگراُن چیزوں پر گرفت نہ کی جائے جو ترقی و خوشحالی اور عدل و قسط کے قیام میں رکاوٹ بننے والی ہیں تو پھر یہ خواہش صرف خواہش ہی بن کر اپنی موت آپ مرجاتی ہے۔خصوصاً ان حالات میں جبکہ برسراقتدار افراد خواہش کے باوجودرکاوٹوں پر گرفت کرتے نہ نظرآئیں۔اور یہ معاملہ تشویناک اس وقت بن جاتا ہے جبکہ ترقی و خوشحالی اور عدل و قسط کے قیام میں متعلقہ افراد و گروہ مزاحمت بننے لگیں۔باالفاظ دیگر خوشحالی وترقی میں اور عدل و قسط کے قیام میں مسائل کھل کر سامنے آنے لگیں۔پھر یہ مسائل اثر ورسوخ کی بنیادپر پیدا کیے جائیں یا ان قوانین کو نظر انداز کرتے ہوئے جنھیں نظر انداز کرنے کے نتیجہ میں مزید مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

فی الوقت خوشحالی و ترقی اور عدل و قسط کے قیام کے تعلق سے دو اہم خبروں کو ہم آپ کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔پہلا معاملہ ممبئی شہر کا ہے جہاں زہریلی شراب پینے سے بڑی تعداد میں لوگ ہلاک ہوئے ہیں ۔وہیں دوسرا معاملہ مالیگاؤں سے متعلق ہے جہاں ہندو شدت پسندوں کے خلاف مقدمہ کو کمزور کرنے کے لیے دباؤ ڈالے جانے کا واقعہ سامنے آیا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ اکتوبر2012ء میں سپریم کورٹ آف انڈیا نے مالیگاؤں بم دھماکے کے ملزمان سابق فوجی افسر کرنل پروہت اور سادھوی پرگیہ ٹھاکر کی ضمانت کی درخواست مسترد کردی تھی۔سابق ہندوستانی فوجی شری کانت پرساد پروہت، سادھوی پرگیہ ٹھاکراور بعض دیگر ہندو شدت پسند سن دو ہزار آٹھ کے مالیگاؤں بم دھماکے کے الزام میں گرفتار کیے گئے تھے۔اس وقت دو رکنی کورٹ بینچ نے ان کی ضمانت مسترد کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اس اسٹیج پر عارضی ضمانت نہیں دیں گے۔معاملہ ا 29 ستمبر 2008 کا ہے جب مہاراشٹر کے صنعتی شہر مالیگاؤں میں عید سے ایک روز قبل بھکو چوک میں بم دھماکہ ہوا تھا۔جس میں سات افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے تھے۔پولیس نے پہلی مرتبہ بم دھماکوں میں ہندو دہشت گرد تنظیموں کے ملوث ہونے کو بے نقاب کیا تھا اور گیارہ افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔اس میں سادھوی پرگیہ سنگھ ٹھاکر، لیفٹننٹ کرنل پروہت، شاردا پیٹھ کے سوامی دیانند پانڈے، رمیش اپادھیائے، راکیش دتاتریہ دھاواڑے، شیو نارائن کالسنگرا، سمیر کلکرنی، سدھاکر

چتراویدی، شیام ساہوا، اجے راہیر کر اور جگدیش مہاترے شامل تھے۔ واقع کو گزرے ہوئے ایک عرصہ گزرگیا ہے۔اس کے باوجود یہ معاملہ ایک بار پھر سرخیوں میں اس وقت سامنے آیا جبکہ مہاراشٹر میں خصوصی سرکاری وکیل روھنی سالیان نے الزام لگایا کہ جب سے مرکز میں بی جے پی کی حکومت آئی ہے، قومی تفتیشی بیورو این آئی اے کی جانب سے اُن پر ہندو شدت پسندوں کے خلاف قائم ایک مقدمہ کمزور کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ روھنی سالیان 2008ء میں ہونے والے مالیگاؤں بم دھماکے کے مقدمے میں خصوصی سرکاری وکیل ہیں۔ان کا الزام ہے کہ پہلے گزشتہ برس حکومت کی تبدیلی کے بعد اور پھر 12 جون کو این آئی اے کا ایک افسر اُن سے ملنے آیا اور اُس نے کہا کہ وہ زیادہ شدت سے کیس نہ لڑیں۔اُن سے مبینہ طور پر یہ بھی کہا گیا کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ یہ نہیں چاہتے کہ وہ یہ مقدمہ لڑیں۔ دوسری جانب این آئی اے نے الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ اس مقدمے کی ابھی باقاعدہ سماعت شروع ہی نہیں ہوئی ہے اور روھنی سالیان نے بظاہر یہ الزام اس لیے لگایا ہے کہ کیونکہ انہیں سرکاری وکیل کے عہدے سے ہٹانے کی کارروائی کی جا رہی تھی۔ وہیں شہری حقوق کے لیے کام کرنے والے سپریم کورٹ کے سینیئر وکیل پرشانت بھوشن کا کہنا ہے کہ یہ واضح ہے کہ حکومت ہندو تنظیموں سے وابستہ تمام ملزمان کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ حکومت مذہب کی بنیاد پر کارروائی کر رہی ہے۔۔۔ عدالت کو این آئی اے کے متعلقہ افسر کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی اس پورے معاملے پر سینیئر

وکیل اور سابق ایڈیشنل سالیسٹر جنرل اندراجے سنگھ نے کہا ہے کہ اگر سرکاری وکلا کو اس طرح کی ہدایات دی جائیں گی تو پورا نظام عدل تباہ ہو جائے گا۔ این آئی اے ممبئی پر 2008ء کے حملوں کے بعد صرف بڑے واقعات کی تفتیش کے لیے قائم کی گئی تھی اور مبینہ ہندو شدت پسندوں کو بے نقاب کرنے میں اس نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ روھنی سالیان کے الزامات منظر عام پر آنے کے بعد کانگریس کے ترجمان نے کہا ہے کہ این آئی اے کے سربراہ کو فوراً ہٹایا جانا چاہیے اور سپریم کورٹ یا بامبے ہائی کورٹ کو خود اس مقدمے کی نگرانی کرنی چاہیے۔ان تمام بیانات کے ساتھ ہی شدت پسندوں کے خلاف مقدمہ کمزور کرنے کے واقعہ نے اہل اقتدار پر سوالات کھڑے کیے ہیں۔سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا یہ واقعہ صحیح ہے؟یعنی روھنی سالیان کو متعلقہ مقدمہ کو کمزور کرنے کی بات کہی گئی تھی؟اور کیا یہ بات بھی صحیح ہے کہ بقول سینیئر وکیل پرشانت بھوشن حکومت ہندو تنظیموں سے وابستہ تمام ملزمان کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے؟اگر یہ، باتیں صحیح نہیں ہیں تو پھر یہ سوال بھی لازماً اٹھنا چاہیے کہ حکومت اُن افراد کے خلاف کیا کاروائی کر رہی ہے جنھوں نے یہ الزامات عائد کیے ہیں؟ بصورت دیگر محسوس ایسا ہی ہوتا ہے کہ حکومت الزامات عائد کرنے والے افراد کے خلاف فی الوقت کوئی کاروائی نہیں کرنا چاہتی ہے۔جس کے نتیجہ میں الزامات کے درست ہونے کی بات کی تصدیق خود بہ خود ہو جاتی ہے۔وہیں پرشانت بھوشن یا ان جیسے دیگر شہری حقوق کے علمبر داروں کی بات صحیح ٹھہرتی ہے

جبکہ حکومت سماج میں انتشار پھیلانے، نفرت و عداوت کا ماحول پروان چڑھانے اور، مذہب کا سہارا لے کر سماج کو تقسیم کرانے والوں کے خلاف کارروائی کرتی نظر نہیں آتی۔لہذا ان حالات میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ عدل و قسط کا قیام عمل میں آئے۔نیز عدل و قسط کا قیام نہ ہونے کے نتیجہ میں اُن منصوبوں اور پروگراموں کی کوئی حیثیت نہیں ہے جنہیں بڑے فخر سے پیش کیا جاتا ہے۔

دوسری خبر بھی ریاست مہاراشٹر سے ہے۔معاملہ زہریلی شراب پینے سے ہلاک شدگان کا ہے۔یہ تعداد اب تک 100 سے زائد ہوچکی ہے اور 50 سے زیادہ افراد مختلف ہسپتالوں میں زیر علاج ہیں۔بیشتر افراد کا تعلق ملاڈ کے علاقے مال ونی اور لکشمی نگر کی کچی آبادیوں سے ہے۔واقعہ جمعرات کی شام اس وقت پیش آیا جب یہ افراد بارش کے خوشگوار موسم میں لطف اندوز ہونے کے لیے ممبئی کے نواحی علاقے ملاڈ گئے تھے۔پولیس ترجمان ڈپٹی کمشنر دھننجے کلکرنی کے مطابق مال ونی کے علاقے میں نقلی شراب فروخت کے الزام میں ممتا یادو اور فرانسس ڈی میلو کو گرفتار کیا گیا ہے۔ڈی میلو کے گھر سے چھ گیلن دیسی شراب برآمد کی گئی ہے۔وہیں مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ دیویندر پھڈنویس کے حکم کے بعد کرائم برانچ اس معاملے کی تحقیقات کر رہی ہے۔پولیس کے مطابق اب تک تین افراد کو گرفتار کیا گیا ہے جبکہ آٹھ پولیس اہلکاروں کو معطل بھی کیا گیا ہے۔واقعہ کے بعد ممکن ہے ملاڈ میں چند دنوں کے لیے شراب کا کاروبار ذرا سست پڑ جائے

اس کے باوجود پورے ملک میں شراب کا کاروبار زور وشور سے جاری ہے۔معاملہ یہ ہے کہ ایک طرف حکومت شراب کی دکانوں کا لائسنس فراہم کرتی ہے،تو وہیں غریب اور مزدور طبقہ غیر لائسنس شدہ دکانوں سے شراب حاصلکرتے ہیں۔شراب نوشی کے نتیجہ میں معاشرہ حد درجہ متاثر ہے،گھروں شرابی شوہر خواتین کا مختلف طریقوں سے استحصال کرتے ہیں۔دوسری طرف شراب نوشی کے نتیجہ میں خاندان مالی تنگی کا شکار ہوتا ہے،اور خواتین مختلف قسم کے چھوٹے موٹے کام کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔جہاں وہ مزید استحصال کا شکار ہوتی ہیںؑاور ذلت و رسوائی کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔متاثرہ خواتین اس برائی کے لیے آواز بھی اٹھاتی ہیں تو پہلے شوہر لڑتے ہیں، بعد میں پولیس خاموش رہنے کو کہتی ہے۔اور یہ متاثرہ خواتین اور ان کی روداد غریب و کمزور طبقہ ہی میں نہیں بلکہ حد درجہ موڈرن اور روشن خیال طبقہ میں پائی جاتی ہے۔ان حالات میں جبکہ ایک جانب ملزمان کے خلاف پرزور آواز اٹھانے سے روکا جائے تو وہیں معاشرہ میں برائیوں کی ماں شراب کا کھلے عام کاروبار جاری ہو۔یہ کیسے ممکن ہے کہ اہل ملک خوشحال ہوں اور ملک عزیز میں عدل و قسط قائم ہو جائے؟صورتحال کے پس منظر میں یہ بات بھی خوب واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ نظام اپنے اندر بے شمار کمزوریاں رکھتا ہے،جس کے نتیجہ میں ہر روز مسائل بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔برخلاف اس کے اسلام نہ صرف ان دو معاملات میں بلکہ ہر معاملے میں ایک صالح فکر و نظام رکھتا ہے۔ ضرورت ہے کہ سماجی ،معاشی اور معاشرتی ہر پہلو سے اسلام کی دعوت

پیش کی جائے!

! مودی جی بہت ہوگیا، کچھ تو بولیں

سرگرمیاں جو انجام دی جا رہی ہیں اور منصوبے جو روبہ عمل لانے کی خواہش ہے، جب منصوبوں اور عمل میں تضاد سامنے آنے لگے اور نیت میں کھوٹ بھی جھلکے ساتھ ہی آپ کے اپنے چاہنے والے الزام تراشی سے کام لیں، جس میں کسی حد تک سچائی بھی موجود ہو تو پھر ایسے موقعہ پر تنقید برداشت کرنا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے تنقید آپ کے حریف کریں تو عام لوگوں کو یہ سمجھانا کسی حد تک آسان ہے کہ چونکہ یہ ہمارے حریف ہیں لہٰذا تنقید تو کریں گے ہی۔ لیکن اگر وہ آپ کے اپنے ہوں تو نہ صرف اپنوں کے درمیاں بلکہ دوسروں کے درمیان بھی سمجھانے کا عمل ناکام ہی ثابت ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ آج کل ملک عزیز ہندوستان میں جاری ہے۔ برسر اقتدار گروہ مختلف منصوبے بنا رہا ہے، ان کو روبہ عمل لانے کی حد تک کوششیں بھی جاری ہیں، اس کے باوجود نہ صرف دوسرے بلکہ اپنے بھی طریقہ کار پر سوالات کھڑے کر رہے ہیں۔

حالیہ دنوں آر ایس ایس کے چوٹی کے رہنما اور تھنک ٹینک کہلانے والے گووند آچاریہ نے تنازعات میں گھرے بی جے پی کے وزراء کو لے کر نریندر مودی حکومت پر زوردار حملہ بولا ہے۔ گووند آچاریہ نے کہا کہ ایسے وزراء کی حمایت کرکے

مرکزی حکومت سیاسی ایمانداری کو ختم کر رہی ہے۔ مودی حکومت اقتدار مرکوز ہو گئی ہے۔ اقتدار کے لیے مودی حکومت نے مسائل اور اقدار کو گڈ بائے کہہ دیا ہے۔ بی جے پی کے سابق جنرل سکریٹر نے مودی حکومت پر حملہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ حکومت اقتدار کے لیے ہے نہ کہ عوام کے لیے۔ دوسری طرف وزیر اعظم ڈیجیٹل انڈیا کو ملک کے مستقبل کی شاہراہ قرار رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ نجی سیکٹر ڈیجیٹل انڈیا کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرتے ہوئے ساڑھے چار لاکھ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری اور اٹھارہ لاکھ لوگوں کو روزگار دے گا۔ چونکہ اس موقعہ پر ملک کے کچھ اہم صنعت کاروں نے ڈیجیٹل انڈیا پروگرام کے لیے سرمایہ کاری اور روزگار کے مواقع کی بات کہی ہے اس لیے وزیر اعظم کے مطابق وقت تیزی سے بدل رہا ہے اور ٹکنالوجی کے معاملے میں ہمیں بھی وقت کی مانگ کے مطابق ہی چلنا ہوگا۔ ممکن ہے ڈیجیٹل انڈیا کا پروگرام، اس کا افتتاح، اور ملک کے بدلتے حالات کی سمجھ کے ساتھ اس سیکٹر میں قدم رکھنے کی خواہش کے نتیجہ میں کچھ تبدیلی آجائے۔ لیکن دوسری جانب ٹکنالوجی کے اس بدلتے دور میں کیا ہم اور ہمارا معاشرہ اخلاقی زوال میں تیزی کے ساتھ پستی کی جانب گامزن نہیں ہے؟ وہیں مخصوص فکر سے وابستہ چند مخصوص لوگ ملک کے شہریوں کو مختلف دائروں میں تقسیم کرنے کے لیے منظم سعی و جہد نہیں کر رہے ہیں؟ اسی کے ساتھ ملک میں ظلم وزیادتیوں کا بازار گرم ہے، غربت اور بنیادی وسائل کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ بنتا جا رہا ہے، امیر و غریب کے درمیان موجود خلیج بڑھ رہی ہے، اور اس

طرح کے بے شمار مسائل ہیں کہ جن سے اہل ملک نبرد آزماں ہیں۔ پھر کیا ان حالات میں مخصوص صنعت کاروں کا سرمایہ اور ان کی فراہم کردہ ٹکنالوجی مسائل کے حل میں کارگر ہو سکتی ہے؟اس پس منظر میں تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ گوند آچاریہ کی بات بہت حد تک صحیح ہے۔ کہ حکومت سیاسی ایمانداری کو ختم کر رہی ہے، اقتدار کے گرد مرکوز ہے، نیز حکومت نے مسائل اور اقدار کو گڈ بائے کہہ دیا ہے۔

بی جے پی کے ایک اور شبھ چنتک جناب ویدپرتاپ ویدک، جن کے تذکرے گزشتہ دنوں نہ صرف سوشل میڈیا پر ایک تصویر سامنے آنے کے بعد بہت زیادہ ہوئے تھیبلکمپیر نٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی ہوئے تھے ،اور جو ایک بڑے جرنلسٹ بھی ہیں۔ وہ حالیہ دنوں لکھے اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں کہ: "نریندر مودی کے خاموشی کی دہاڑ پورا ملک سن رہا ہے۔ آج پورا ملک حیرت زدہ ہے اور بس سن رہا ہے، لیکن وہ اپنا منہ کب تک بند رکھے گا؟ جب ملک بولنے لگے گا تو حکومت اور لیڈروں کی آواز کہاں ڈوب جائے گی، پتہ بھی نہیں چلے گا۔ پہلا معاملہ سشما سوراج کا ہی تھا۔ پھر آیا وسندھرا راجے کا اور اب آ گئے ہیں، اسمرتی ایرانی اور پنکجا منڈے کے معاملے بھی! کچھ ارو معاملے بھی ہیں، لیکن ابھی وہ سامنے نہیں آئے ہیں۔ بس ، جھروکھوں سے جھانک رہے ہیں۔ سارا ملک حیرت زدہ ہے کہ نریندر مودی جیسے منہ پھٹ آدمی کی بولتی کیسے بند ہو گئی، کیوں ہو گئی؟ یہ

ٹھیک ہے کہ گجرات کرکٹ ایسو سی ایشن کے سابق صدر ہونے کے ناطے نریندر مودی کی للت مودی سے اچھے تعلقات رہے ہوں گے، لیکن نریندر مودی جیسے روکھے آدمی پر یہ شک کرنا مشکل ہے کہ للت مودی سے ان کے اتنے قریبی تعلقات ہو گئے ہوں گے، جتنے سشما یا وسندھرا کے تھے یا شرد پوار یا کچھ کانگریسی رہنماؤں کے رہے ہوں گے۔ مودی اور امت شاہ جو بھی کام کرتے ہیں، کافی چاک- چوبند ہو کر کرتے ہیں، اس لیے ڈر یہ نہیں ہے کہ للت ان دونوں رہنماؤں کی کوئی پول کھول دیں گے۔ان کی خاموشی کی وجہ یہ ڈر نہیں ہے۔خاموشی کی وجہ کچھ اور ہو سکتی ہے۔وہ یہ کہ نریندر بھائی بولیں تو کیا بولیں؟جب دونوں خواتین- لیڈر صحافیوں کا سامنا کرنے سے کترا رہی ہیں تو مودی اپنی گردن کو کس طرح پھنسائیں؟اگر مودی یہ بولیں کہ یہ خواتین معصوم ہیں تو سارا الزام پھر ان ماتھے پر لگ جائے گا۔ابھی تو دو عورتیں تھیں، اب چار ہو گئیں۔ مودی آخر کس کس کا دفاع کریں گے؟"۔ مضمون تفصیلی ہے اور دلچسپ بھی، لیکن ہم جس مدے پر بات کر رہے ہیں وہ یہ کہ جب اندر کی باتیں باہر آنے لگیں اور جب مشکل ترین مرحلے میں آپ کے اپنے بھی کام نہ آئیں تو پھر معاملہ مزید سنگین ہو جاتا ہے۔اور اس سنگینی کا دوسرا رخ یہ ہے ایک طرف عوام بے شمار مسائل سے دوچار ہیں تو وہیں اہل اقتدار خوب خوب آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

منصوبے اور منصوبوں کی عمل آوری میں تضاد، جس سے ہم نے مضمون کا آغاز کیا

تھا،آیئے اس کی ایک مثال بھی دیتے چلیں۔جس سے باخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ آیا جو بات کہی جارہی ہے وہ تنقید برائے تنقید ہی نہیں بلکہ اُس میں سچائی بھی موجود ہے۔اقتدار میں آتے ہی حکومت نے ایک بڑاپروجیکٹ گنگا کی صفائی کے تعلق شروع کیا تھا۔گنگا جو ایک ندی ہے ساتھ ہی مخصوص فکر و عمل سے وابستہ افراد کی آستھا سے جڑاہوامتبرک پانی، کی صفائی ستھرائی کا پروجیکٹ۔لیکن جب 'نمامی گنگے'جو وزیر اعظم کے مرکزی ایجنڈے کے طور پر پہلے ہی سے مشتہر بھی تھا،پر کام شروع ہوا توزبانی حملے بھی ہوئے۔اور اُس پروجیکٹ پر حملے کا مطلب ہے نریندر مودی پر حملہ۔پھر یہ حملہ کسی اور نے نہیں بلکہ بی جے پی ہی کے ایک قدآور لیڈر مرلی منوہر جوشی جو سیاسی تجربہ سے مالامال اور دانشور بھی ہیں ،کی جانب سے ہوا ہے۔اُنھوں نے گنگا کی صفائی کے مسئلے پر زمینی حالت کو دیکھتے ہوئے کہا کہ گنگا اگلے 50 سال میں بھی صاف نہیں ہوسکے گی،تو اس بات نے نہ صرف ایک طرف بی جے پی کی اندرونی سیاست میں بھونچال مچادیا بلکہ دوسری جانب یہ بات بھی واضح کردی کہ منصوبے پر عمل درآمد کا طریقہ مناسب نہیں ہے۔جوشی نے مرکزی حکومت کے پروگرام 'نمامی گنگے'پر الگ رخ اختیار کرتےہوئے واضح طورپر کہا کہ گنگا ندی کی صفائی کے لیے جس طرح سے پروجیکٹ چلایا جارہا ہے،اس سے اگلے 50 سال میں بھی ندی صاف نہیں ہوسکے گی۔ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ جب تک ندی میں اسموتھ واٹر فلو نہیں ہوتا،گنگا کی صفائی دُور کا خواب ہوگا۔وہیں جوشی نے مرکزی وزیر نتن گڈکری کے 'ان لینڈ واٹر ویز

پروجیکٹ' پر بھی تیکھا طنز کیا۔ اور کہا، گنگا میں جہاز چلانا تو دور، بڑی ناؤ بھی نہیں چل پائے گی، جبکہ گڈکری کہہ رہے ہیں کہ بھاری مصنوعات کی ڈھلائی کے لیے گنگا ندی میں بڑے۔بڑے جہاز چلائیں گے۔ اُنہیں گنگا کی موجودہ حالت کا پتہ لگالینا چاہیے۔ جوشی کا مقصد ندیوں کی حالت اور اس کی جغرافیائی حالت کو لے کر جہاز رانی وزارت کی جنرل نالج سے تھا۔ اور جوشی کی بات میں اس وقت مزید وزن پیدا ہوگیا جب دوارکا اور جیوتش پیٹھ کے شنکراچاریہ سوامی سروپانند سرسوتی بھی مرلی منوہر جوشی کی حمایت میں آ گئے۔ دوسری جانب سابق مرکزی وزیر اور سینئر بی جے پی لیڈر ارون شوری نے بھی وزیر اعظم مودی کی پالیسیوں پر تیکھے سوال اٹھائے ہیں اور مودی حکومت کو کٹہرے میں کھڑا کیا ہے۔ مودی حکومت کے طریقہ کار کو لے کر ایک طویل لسٹ ہے یہاں تذکرا ہی ممکن ہے لہٰذا اترپردیش کے جالون سے بی جے پی کے رکن پارلیمنٹ بھانو پرتاپ ورما کی بغاوت کے خط نہیں بھلایا جاسکتا، جس نے بڑے پیمانہ پر وبال مچایا تھا۔ حالانکہ ورما نے کہا کہ اس خط پر ان کے دستخط نہیں ہیں، اس کے باوجود خط میں بی جے پی کو چار گجراتیوں کے ہاتھوں کا کھلونا بتایا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ پارٹی میں 'اپنا پن' کا جذبہ ختم کرکے کارپوریٹ تہذیب اپنائی جارہی ہے۔ ساتھ ہی مودی کی دہشت کا اشارہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ کانگریس میں صرف ایک منموہن ہیں، لیکن بی جے پی قیادت نے تو ہم سب کو 'مون موہن' بنا رکھا ہے۔ لیکن آج یہ 'مون موہن' کی بات تو وزیر اعظم پر صادق آتی ہے جبکہ ان سے

پورا ملک کہہ رہا ہو کہ مودی جی اب بہت ہوگیا، کچھ تو بولیں، یہ للت لیکس کیا ہے؟ اس میں ملوث پارٹی لیڈران کا معاملہ کیا ہے!

ماہِ قرآن، ماہِ شکر و عنایات !

ہر شخص کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہوتے ہیں کہ اگر ان پر ذرا ٹھہر کر غور کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائیبلکہ فکر و عمل میں بھی نمایاں تبدیلی آجائے۔اس کے باوجود عموماً انسان واقعات کو نظر انداز کرتے ہوئے روز مرہ کی زندگی جاری رکھتا ہے۔کچھ ایسا ہی واقعہ دو دن قبل ہمارے ساتھ بھی گزرا ہے۔دو دن قبل صبح جب بیدار ہوئے اور قدم زمین پر رکھنا چاہا تو معذور ہوگئے۔دائیں پیر میں شدید درد اور وہ بھی اچانک،اس حالت میں ایک قدم بھی بڑھا لیتے تو کیا کہنے۔بعد میں ڈاکٹر کو گھر پر بلایا گیا،معائنہ ہوا،کچھ نہ نکلا،دوا لکھی گئی،دو دن دوا کھائی،اس دوران دوا کھائی تو تکلیف بھی برداشت کرتے رہے۔دو دن تک گھر میں قید رہنے کے بعد تیسرے دن جب ذرا چلنے لگے تو گھر کے تمام لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا۔عالم یہ تھا کہ جیسے خدا نے پیر عنایت کردیے ہوں،جو آج سے پہلے نہیں تھے۔خوشی کا احساس دوسروں کو ہی نہیں ہمیں بھی تھا۔اسی عالم میں ،اپنی کمزوریوں کے مکمل احساس کے ساتھ خدا کے سامنے کچھ اس طرح سر بجود ہوئے ،کہ جس طرح آج سے قبل شاید کبھی نہ ہوئے ہوں۔آپ کہیں گے مضحکہ خیز واقعہ ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔وجہ یہ ہے کہ ہر فرد کی زندگی میں ایسے اور اس سے بہت بڑے واقعات رونما

ہوتے ہیں۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ متذکرہ واقعہ کم از کم ہماری زندگی میں ایک عظیم تاثر چھوڑ گیا ہے۔ معاملہ احساس کا ہے، کیونکہ جو احساس ہمیں ہوا ہے، ممکن ہے بڑے واقعات رونما ہونے کے بعد بھی شاید آپ کو نہ ہوا ہو۔

آیئے ایک اور معمول کے واقعہ کو پیش کرتے ہیں۔ معاملہ قرآن سے ہمارے رشتہ کا ہے۔ ہم ہر دن اور خصوصاً آج کل ماہ قرآن یعنی رمضان المبارک میں دن میں ایک سے زائد مرتبہ بھی قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ جس قرآن کی تلاوت کے ذریعہ ہم ثواب میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں، اس کے نزول کا مقصد کیا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن وہ فرقانِ عظیم ہے جس نے انسانوں پر دنیا اور آخرت کی حقیقتوں کو بہت ہی واضح انداز میں کھول کر رکھ دیا جم غفیر جن تاریکیوں میں مبتلا تھی اس کے سامنے وہ روشنی منور کی جس کے ذریعہ، صراط مستقیم عیاں ہو گئی۔ کامیابی اور ناکامی کی راہیں متعین کیں اور ذلت و رسوائی سے نکال کر عزت و شرف کا مقام بخشا۔ لیکن کیا یہ جانکاری ہماری ذات کو تبدیل کرنے میں کوئی موثر ذریعہ بن رہی ہے؟ جس زمانہ میں یہ تبدیلی رونما ہوئی، کیا یہ تبدیلی خود بہ خود آ گئی تھی؟ آپ کہیں گے نہیں، نہ صرف اس کے لیے عظیم قربانیاں دی گئیں بلکہ حد درجہ صبر و استقامت کی راہ بھی اختیار کی گئی۔ ساتھ ہی آئندہ آنے والی نسل انسانی کو جو دنیا و آخرت میں کامیابیوں کی خواہش مند ہو، بتایا: " یہ کتاب الٰہی (تمہارے،

ہاتھوں میں) اللہ تعالی کی رسی ہے ، جس نے اس کی اتباع کی وہ راہ ہدایت پر گامزن رہا اور جس نے اسے چھوڑ دیا اس نے راہ ضلالت اختیار کی" (صحیح مسلم)۔دوسری جانب ہمیں علم ہے اور مکمل علم ہے کہ یہ قرآن حکیم اللہ تعالی کا کلام ہے جو اس نے اپنے بندوں پر نازل کیا۔اب جو شخص اس کو مضبوطی سے تھامے گا، دنیا و آخرت میں کامیاب ہوگااور جو اس کو پس پشت ڈالے گا وہ ہلاک ہونے والا ہے۔اس کے باوجود سوال آپ سے بھی ہے اور اپنے آپ سے بھی ، کہ کیا نزول قرآن کے مقصد کو جاننے کے باوجود ہمارے شب و روز کے اعمال قرآن کے طے شدہ اصولوں پر قائم ہیں ؟اور اگر نہیں ۔تو کیا ہم وہ قربانیاں دے رہے ہیں جو قرآن سے تعلق استوار کرنے کے بعد دینی چاہیں ؟یا ہم یہاں بھی یہی کہیں گے کہ جناب ہم قرآن پڑھتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں ، لیکن ہماری زندگیوں میں جو تضاد بظاہر دکھائی دے رہا ہے وہ حقیقی نہیں ہے، کیونکہ نیتوں کا علم تو صرف اللہ کو ہے، لہٰذا نیت پر کسی صورت سوال نہیں اٹھانا چاہیے۔ ممکن ہے آپ کی بات صحیح ہو لیکن ظاہری اعمال باطنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔لہٰذا یہاں بھی معاملہ احساس ہی کا ٹھہرا،اور یہ احساس اسی وقت نفا بخش ہو سکتا ہے جبکہ قرآن کے ایک ایک لفظ کو مفہوم کی روشنی میں زندگی کے رویوں سے کروس چیک کیا جائے ۔پھر جس درجہ بھی تضاد محسوس ہو، فوراً تبدیلی لائی جائے۔اسے یہ کہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ مشکل ترین مرحلہ ہونے کے سبب، فی الوقت ممکننہیں ہے،جب وقت ہوگا تو کوشش کی جائے گی!

آیئے ایک اور جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ہم بات کر رہے ہیں شب قدر کی جو رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرنے کے لیے کہی گئی ہے۔ سورۃ القدر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا،اور تم کیا جانو شب قدر کیا ہے؟شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے،۔۔۔"۔اس تعلق سے بھی ہمیں علم ہے کہ یہی وہ عظیم رات ہے جس میں تمام حکیمانہ امور کا فیصلہ ہوا۔ اس رات میں قدریں، بنیادیں اور پیمانے وضع ہوئے، اس رات میں افراد کی قسمتوں سے بڑھ کر قوموں، نسلوں اور حکومتوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا، بلکہ اس سے بھی زیادہ عظیم امر، حقائق، طور طریق اور قلوب کی قدریں طے ہوئیں۔اس رات کی قدر بے انتہا ہے اور اگر اس کو کوئی بنا عزر حاصل کرنے کی سعی نہ کرے تو وہ اللہ کی نصرت وتائید سے محروم ہے۔ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: "تمہارے اوپر یہ مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے، اور اس میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو اس سے محروم رہ گیا، وہ تمام ہی خیر سے محروم رہ گیا، اور اس سے وہی شخص دور رہتا ہے جو خیر سے محروم ہے" (سنن ابن ماجہ)۔ہمیں اور آپ کو یہ بھی باخوبی علم ہے کہ آج کل ہم اسی آخری عشرہ سے گزر رہے ہیں جس میں یہ رات آتی ہے۔آخری عشرے کی چند راتیں گزر چکی ہیں اور چند باقی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے گزری راتوں سے استفادہ کیا؟اور کیا آئندہ آنے والی راتوں سے استفادہ کا منصوبہ رکھتے

ہیں؟ہر رات کے آخری پہر میں عبادت گزار تہجد کا اہتمام کرتے ہیں، دعائیں بھی کرتے ہیں، لیکن اس رات کی خاص دعا بتائی گئی ہے۔ حضرت عائشہ عرض کرتی ہیں کہ اے اللہ کے رسولؐ! اگر مجھے شب قدر نصیب ہو جائے تو کیا دعا کروں؟ فرمایا " اللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفوٌ تُحِبُّ العَفوَ فَاعفُ عَنِّیْ۔ کہو، "اے اللہ! تو بہت معاف کرنے والا ہے، معافی کو پسند کرتا ہے، تو میری خطائیں معاف فرما" (ابن ماجہ)۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھنے سے قبل یہ سوال بھی اہم بن جاتا ہے کہ کیا حقیقی معنوں میں ہمیں اپنی خطاؤں کا احساس ہے؟اور کیا ہمیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ یہ موقع ممکن ہے ہماری زندگی میں دوبارہ نہ آئے، توجو موقع میسر آیا ہے اس سے بھرپور استفادہ کیا جانا چاہیے؟

ایک اور دن جو الحمداللہ ہماری زندگی میں کئی مرتبہ آچکا ہے اور آئندہ بھی آئے گا،انشااللہ ۔ یہ عید الفطر کا دن ہے، جو مومنین کو پورے ایک ماہ رمضان المبارک کی عبادات کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ نتیجہ میں اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوتا ہے اور خوشیوں سے نوازتا ہے۔ معدؓ بن اوس انصاری اپنے والد حضرت اویسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جب عید الفطر کا دن آتا ہے تو خدا کے فرشتے تمام راستوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں اے مسلمانو! رب کے پاس چلو جو بڑا کریم ہے، نیکی اور بھلائی کی راہ بتاتا اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دیتا ہے اور اس پر بہت انعام سے نوازتا ہے،

تمہیں اس کی طرف سے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا تو تم نے روزے رکھے اور اپنے رب کی اطاعت گزاری کی ۔ تمہیں اس کی طرف سے تراویح پڑھنے کا حکم دیا گیا تو تم نے تراویح پڑھی سواب چلو اپنا انعام لو۔ اور جب لوگ عید کی نماز پڑھ لیتے ہیں تو ایک فرشتہ اعلان کرتا ہے۔اے لوگو! تمہارے رب نے تمہاری بخشش فرمادی پس تم اپنے گھروں کو کامیاب وکامران لوٹو یہ عید کا دن انعام کا دن ہے"۔ خوشی و مسرت کے اس موقع پر بھی ہمیں اللہ کی عطا کردہ نعمتیں نہیں بھولنا چاہیں،اور اگر ایسا ہوا تو لازماً ہماری زبان اللہ کی کبرائی بیان کرے گی "اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد"۔ متذکرہ بڑی نعمتوں کے ساتھ ہی ہر اس چھوٹی نعمت کو بھی یاد رکھا جائے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے۔ نعمتوں کی یہی یاد دہانی دنیا و آخرت میں انشاءاللہ مزید نصرت و کامرانی سے ہمکنار کرے گی!

!اسلام اور فکر معاصر کے باطل افکار و نظریات

ہندوستان میں اونچ نیچ اور ذات پات کا تصور نہ صرف ہندوؤں میں بلکہ اسلام کے ماننے والے افراد اور گروہوں میں بھی پایا جاتا ہے۔جس طرح برہمنیت اور منو وادیت نے ذات پات کے تصور کو معاشی اتار چڑھاؤ پر استوار کیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح یا اس سے ملتا جلتا نظام اسلام سے تعلق رکھنے والے مسلمان بھی اختیار کیے ہوئے ہیں۔برخلاف اس کے اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے مساوات انسانی کا نہ صرف ایک مکمل نظام فراہم کیا بلکہ اپنے رسولؐ کے ذریعہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا ہے۔مساوات انسانی ہی کے تعلق سے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کی شناخت کر سکو،اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو" (حجرات: ۱۳)۔اسی تعلق سے اللہ کے رسول فرماتے ہیں: "دو چیزیں ایسی ہیں کہ اگر لوگوں میں پائی جائیں تو وہ انہیں کفر کے درجے تک پہنچا دیتی ہیں،ایک نسب میں طعن کرنا (یعنی دوسروں کو کم ذات اور ذلیل ذات سمجھنا) اور دوسری میت پر نوحہ کرنا" (مسلم،کتاب الجنائز) ۔قرآن و حدیث میں اس تعلق سے بے شمار احکامات و ہدایات موجود ہیں،اس کے باوجود مسلمان باطل افکار و اعمال سے متاثر ہو کر

اورغیر اخلاقی حد تک ذات پات اوراونچ نیچ کے اعلیٰ وادنیٰ معیارات قائم کیے ہوئے ہیں۔آپ یہ بات بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم بکریاں چرانے کا پیشہ کرتے تھے (صحیح بخاری)۔آپؐ کی سگی پھوپی زاد بہن حضرت زینب بنت جحشؓ جو آپ کی زوجہ (بیوی) تھیں، چمڑے کی دباغت کرتی تھیں (صحیح مسلم) ۔بلکہ حافظ بن حجر نے ان کا پیشہ ہی چمڑے کی دباغت اور جوتا گانٹھنا بتایا ہے۔آپؐ کی دوسری بیوی ام سلمہؓ بھی چمڑے کی دباغت کرتی تھیں (مسند احمد)۔آپ نے اپنی سگی پھوپی زاد بہن زینب کا اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ سے نکاح کرکے جہاں ایک جانب باطل عقائد و رسم ورواج کو ختم کیا تھا وہیں ذات پات کے کافرانہ اور منوّوادی ذہنیت کا قلع قمع کیا تھا۔

ایک وقت میں ملک عزیز ہند میں اسلام کی آمد اور اس کے اخلاقی تعلیمات ومساویانہ نظام سے متعارف ہو کر بڑی تعداد نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ اس کے آغوش میں پناہ بھی لی۔گرچہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے،اس کے باوجود آج نہ صرف اسلام کا بیجا خوف پیدا کرنے کی منظم کوششیں جاری ہیں بلکہ جھوٹ ،فریب اور بڑے پیانہ پر وسائل کے ذریعہ اسلام کے دیے گئے مساویانہ حقوق سے دور رکھنے کے لیے سماج کے کمزور اور مظلوم طبقات کو کہیں ڈرا دھمکا کر تو کہیں لالچ کے ذریعہ دور کیا جارہا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ آج ہند وہندوپاک اور بنگلہ دیش واطراف میں پائے جانے والے مسلمان کل تک باطل عقائد و نظریات سے تعلق رکھنے

والی قوم ہی کا حصہ تھے۔پھر یہ لوگ صرف مزعومہ پنچ قوم کے ہندو ہی نہیں بلکہ بعض اونچی ذات کے ہندو بھی تھے جو مشرف بہ اسلام ہوئے۔انگریز مصنف ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب "The Preaching of Islam" میں لکھا ہے: ان مفلس لوگوں کے لیے جن میں ماہی گیر، شکاری، سمندری ڈاکو اور پنچ ذات کے کاشتکار شامل تھے، اسلام ایک نعمت عظمی تھی جو ان پر عرش بریں سے اتری۔جس وقت اسلام حکمراں قوم کا مذہب تھا اس کے پرجوش مبلغ خدا کی توحید اور انسانی مساوات کا مژدہ لے کر ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جس کو سب لوگ حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے اور جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔۔۔۔اسلام نے ان کو خدا کی ذات کا ایک اعلیٰ تصور دیا۔انسانی اخوت اور مساوات کے ایک اشرف تخیل سے آشنا کیا۔۔۔۔اسلام ذات پات کی تمیز اور طبقاتی منافرت کو روا نہیں رکھتا۔لہٰذا ہندوستان میں اسلام کو اسی بات سے حقیقی قوت حاصل ہوئی اور اس کی بدولت اس نے ہندوؤں کو کثرت سے اپنا حلقہ بگوش بنایا (صفحہ 279,80,91)۔لیکن سوال موجودہ دور کے مسلمانوں کے لیے ہے کہ کیا آج وہ ان تمام خوبیوں کو اختیار کیے ہوئے ہیں، جن کی وجہ سے کل وہ خود اسلام میں داخل ہوئے تھے؟

مساوات انسانی اور اس میں فکر و عمل کا تضاد جس طرح آج مسلمانوں میں گھر کر گیا ہے اسی طرح اسلام نے عورت کو جو تقدس و شرف عطا کیا تھا،اس کو بھی ہم مسلمانوں نے کہیں بے جا پابندیوں کے ذریعہ تو کہیں بے جا آزادی کے نام پر

نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ممکن ہے یہاں بھی معاشرے کا اتار چڑھاؤ ہی ہم پر غالب رہا ہو،اس کے باوجود یہ بات قابل مذمت ہونی چاہیے کہ ہم ایک جانب اپنا تعلق اسلام سے قائم کریں وہیں دوسری جانب غیر اسلامی رسم و رواج اور اس کی جکڑ بندیوں میں بھی گھرے رہیں۔ ہندوستانی سماج جسے عموماً ہندو سماج سے تعبیر کیا جاتا ہے، میں عورت پر طرح طرح سے ظلم وستم ڈھائے جاتے ہیں۔ ظلم وستم کی کھلی داستان وہ بوڑھی مائیں بھی ہیں جو ہمارے علاقوں میں دربدر بھٹکتی نظر آتی ہیں۔ کہیں انہیں بیوہ کے نام پر تو کہیں ڈائن اور کالا جادو کرنے کے شبہ میں گھروں سے نکال دیا جاتا ہے۔اور اگر یہ ڈر ہو کہ گھر سے نکالنے پر سماج میں بے عزتی ہوگی تو پھر بہانوں کا سہارا لے کر موت کے منہ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔کچھ ایسا ہی واقعہ چند روز پہلے اڑیسہ میں پیش آیا ہے ۔جہاں ضلع کیوجھر کے دیہاتیوں نے جادوٹونا کے شبہ میں ایک ہی خاندان کے چھ ارکان کو ہلاک کر دیا۔جائے وقوع پر پہنچے پولیس افسر اجے پرتاپ سوائی نے بتایا کہ تمام ہلاک شدگان کی لاشیں ان کے مکان کے اندر موجود تھیں اور ان کی گردنیں کسی تیز دھار ہتھیار سے کاٹی گئی ہیں۔اڑیسہ میں حال میں ہوئے ایک سروے کے مطابق پچھلے پانچ سالوں میں ریاست میں اس طرح کے 274افراد قتل ہو چکے ہیں۔اور یہ سب تب ہوا ہے جبکہ ریاستی حکومت دو سال قبل 'اڑیسہ پریوینشن آف وچ ہنٹنگ' قانون منظور کر چکی ہے۔ ہندوستان میں پچھڑے اور کمزور علاقوں میں خواتین کو ڈائن یا جادوگرنی قرار دیے جانے کا چلن عام ہے۔ماہرین کا خیال

ہے کہ اس طرح کے حملوں کے پیچھے توہم پرستی اور جہالت کارفرما ہے لیکن بعض اوقات بیواؤں کی جائیداد ہتھیانے کے لیے بھی یہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ظلم و ستم اور جبر واستبداد کا یہ صرف ایک پہلو ہے۔ان حالات میں حقیقی اسلام سے تعلق رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ مظلومین کے حق میں آواز بھی بلند کریں بلکہ دستور ہند میں موجود حقوق انسانی کے خلاف ہر اٹھنے والے ہاتھ کو قانونی دائروں میں رہتے ہوئے گرفت میں لائیں، قیام عدل کے لیے منظم سعی و جہد کریں ،اسلامی کے حقیقی اورآفاقی نظام سے متعارف کرائیں۔ ساتھ ہی اسلام پر مکمل عمل کرتے ہوئے اسلامی معاشرہ کی مثال قائم کریں۔ ممکن ہے اس طرح ایک جانب نہ صرف اسلام متعارف ہوگا بلکہ انسانوں کے بنائے قوانین اور خدا کے بنائے قوانین کے فرق کو بھی خوب کھول کر واضح کیا جاسکے گا۔

معاملہ یہ ہے کہ اسلام اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ مرد اور عورت برابر نہیں ہیں۔ وہیں اسلام سے بغض رکھنے والے یا نفسانی خواہشات کے علمبردار پروپگنڈہ کرتے ہیں کہ مرد و خواتین کے حقوق ہر معاملے میں یکساں ہونے چاہئیں۔ مفروضہ کی حد تک جہاں یہ بات ممکن نہیں، وہیں عملی زندگی میں یہ ایک کھلا تضاد ہے۔ مرد و خواتین کے مساویانہ حقوق کے پرفریب نعرے کے نتیجہ میں خاندان بکھر رہے ہیں،ماں باپ بچوں کی تربیت سے محروم ہیں۔ یہاں تک کہ اسکول ،کالج ،دفاتر اور معاشی اداروں میں اخلاقی قدریں حد درجہ پامال ہو رہی ہیں۔ وجہ؟ مرد و عورت جو

کہیں ماں، کہیں بہن، کہیں بیٹی یا کسی اور رشتے سے منسلک ہے،اس کے فکر و عمل میں تضاد پیدا کیا جا چکا ہے۔کچھ اسی طرح کا ایک دلچسپ واقعہ،جو مرد و عورت کے مساویانہ حقوق اور وہ بھی ہر معاملے میں، سے تعلق رکھتا ہے پیش آیا ہے،آیئے اس کا بھی تذکرہ کرتے چلیں۔ملک کا اکثرتی معاشرہ اور اس کے مذہبی گرو جنہیں سادھو اور سادھویوں کے نام سے جانا جاتا ہے، میں سادھویوں نے خواتین کے مساویانہ حقوق کی بازیابی کا نعرہ لے کر کنبھ جیسے میلے میں برابر کے حقوق کی بحث چھیڑ دی ہے۔ایک سادھوی نے سوال اٹھایا ہے کہ جبکہ اس مذہبی موقعہ پر خواتین پورے جذبہ سے سرشار ہو کر مذہبی رسوم میں حصہ لیتی ہیں تو کیوں انہیں بھی سادھوؤں جیسی سہولیات فراہم نہیں کی جاتیں؟سوال کے پس منظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فکر معاصر اور اس کے باطل افکار و نظریات،زندگی کے کسی بھی شعبہ سے اب دور نہیں ہیں۔اور یہ معاملہ ان لوگوں میں بڑی حد تک رچ بس چکا ہے جو خود کو مخصوص سنسکرتی اور کلچر سے وابستہ سمجھتے ہیں!

پارلیمنٹ میں ہنگامہ آرائی اور بہار اسمبلی الیکشن !

ہندوستان میں قانون ساز باڈی پارلیمنٹ ہے جس میں عموماً ہر پانچ سال میں عوام کے ذریعہ منتخبہ نمائندے آتے ہیں جنہیں ممبر آف پارلیمنٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پارلیمنٹ میں کسی بھی پارٹی کے اکثریت میں آنے والے نمائندے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالتے ہیں۔دوسری جانب ہر سطح کے منتخبہ نمائندے مزید ممبر آف پارلیمنٹ کا انتخاب کرتے ہیں،اور یہ افراد راجیہ سبھاکے وقار کا حصہ بنتے ہیں۔کیونکہ یہ دونوں ہی ہاؤسز اہمیت کے حامل ہیں لہذا پارلیمنٹ ،اس کے باوقار افراد اور ان پر ہونے والے اخراجات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔پارلیمنٹ کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس پر ہونے والے اخراجات بھی کچھ معمولی نہیں ہیں۔ہر ایک منٹ پر تقریباً ڈھائی لاکھ روپے (2.5 لاکھ) خرچ ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے پارلیمنٹ پر ہونے والا خرچ بے شمار ہے،جو کئی سو کروڑ تک پہنچتا ہے۔وہیں دوسری جانب اس کا ایک تہائی حصہ مختلف احتجاجات اور نعرے بازی کی نظر ہو جاتا ہے۔جبکہ ہر سیشن کے آغاز سے قبل جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی میٹنگ ہوتی جس میں وزیر اعظم پارلیمنٹ کو ٹھیک انداز سے چلنے،اس میں انجام دینے والی سرگرمیوں پر گفتگو کرتا ہے۔اور سیاسی پارٹیوں کے مختلف افراد اعتماد دلاتے ہیں کہ وہ پارلیمنٹ اور اس کے ایک ایک منٹ کی قدر کریں

گے۔پارلیمنٹ اوراس کے ایک منٹ پر تقریباً ڈھائی لاکھ روپیہ کا صرفہ یہ وہی رقم ہے جو ہم سے اورآپ سے ٹیکس کی وصولی کی شکل میں لی جاتی ہے۔یعنی عوام راست یا بلاواسطہ جو ٹیکس ادا کرتے ہیں اسی رقم سے یہ اخراجات بھی انجام پارتے ہیں۔اس صورت میں یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ نہ صرف ممبرآف پارلیمنٹ کے انتخابی عمل میں عوام راست یا بلاواسطہ شامل ہیں بلکہ اس پر ہونے والے اخراجات میں بھی عوام ہی کے پیسہ کو استعمال کیا جاتاہے، لہٰذا عوامی نمائندے ہر وقت عوام کے سامنے جوابدہ ہیں اور ان کا کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہونا چاہیے جو عوام کو یا ملک کو نقصان پہنچانے والا ہو۔ان دو صورتوں میں جہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ عوام خوداپنی حیثیت سمجھیں ،وہیں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ کس طرح کے لوگوں کوان قانون ساز اداروں میں بھیجا جانا چاہیے ؟آپ کو معلوم ہے کہ فی الوقت جاری مان سون سیشن کے گزشتہ چار دن لگاتار پارلیمنٹ میں شور شرابے،ہنگامہ اوراحتجاج کی نظر ہوچکے ہیں اور طے شدہ سرگرمی انجام نہیں دی جا سکی ہے۔یہ ایک تشویشناک صورتحال ہے ،جو قیمتی ووٹ اور ٹیکس ادائیگی کا کھلا مذاق ہے۔وہیں دوسری طرف ملک کی شبیہ خراب کرنے اور عوامی نمائندوں پر موجوداعتماد پر بھی سوالات کھڑے کرتا ہے۔یعنی یہ کہ عوام نے کن لوگوں کو اور کس طرح کے لوگوں کو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کی ذمہ داری سونپی ہے؟اور کیا وہ اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

گفتگو کے پس منظر میں یہ سوال بھی لازماً اٹھے گا کہ پارلیمنٹ میں آج کل جو کچھ دیکھنے کو مل رہا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟اس کا سیدھا جواب تو یہ ہے ملک کی.بر سر اقتدار بی جے پی اور اس کی دیگر ریاستوں میں موجود حکومتیں گھوٹالوں، بدعنوانیوں اور غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔جس نہ صرف عوام اور حزب مخالف بلکہ.بر سر اقتدار حکومت کے افراد بھی نا خوش ہیں۔اب یہ الگ بات ہے کہ.بر سر اقتدار حکومت میں ایک.بڑی تعداد نہ خوش ہونے کے باوجود غلطیوں، کوتاہیوں اور گھوٹالوں پر خاموش رہے۔یہ مجبوری ان لوگوں کی تو ہو سکتی ہے جنہیں اپنا طویل کیریئر پارٹی اور اس کے غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث افراد کے ساتھ طے کرنا ہے۔لیکن یہ مجبوری غالباً ان لوگوں کی نہیں ہے جو پارٹی میں کیریئر کی حد تک اپنا ہدف حاصل کر چکے ہیں اور جو سینئر بھی سمجھے جاتے ہیں یا جن کا نفس واقعی.برائیوں کے خلاف احتجاج کرنے پر انہیں ابھارتا ہے۔بی جے پی جو آر ایس ایس کی سیاسی جماعت ہے اور آر ایس ایس جو خود کو ایک نظریاتی جماعت کہتی ہے، دونوں ہی آج کل کچھ زیادہ شدت پسند بنے ہوئے ہیں۔بقول شخصے معتدل نظریہ اور معتدل افراد جو کل تک فیصلہ ساز مقامات پر موجود تھے،ان کی اہمیت ختم ہو چکی ہے یا کر دی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ معتدل کہے جانے والے افراد اندرون خانہ ایک عجیب قسم کی بے چینی اور کشمکش میں مبتلا ہیں۔جس کی تازہ مثال شانتا کمار ہیں۔شانتا کمار بھارتیہ جن سنگھ

اور بی جے پی کے بانیوں میں شامل رہے ہیں۔ مرارجی ڈیسائی اور واجپئی حکومت میں وزیر رہے ہیں۔ واجپئی اور اڈوانی کے معتمد خاص اور بی جے پی کے 80، سالہ بطیر بجم رہنما شانتا کمار کی بے چینی اس وقت سامنے آئی ہے جب انہوں نے پارٹی صدر امت شاہ کو خط لکھ کر ویاپم گھوٹالہ جیسی بدعنوانی کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اس عمل سے ان کا سر شرم سے جھک گیا ہے۔ نیز انہوں نے پارٹی کی داخلی صورتحال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی داخلی صحت کو بہتر رکھنے کے لیے 'لوک پال' مقرر کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ شانتا کمار کے خط میں کچھ ریاستوں میں لگ رہے الزامات کا ذکر، للت مودی معاملے میں راجستھان کی وزیر اعلیٰ وسندھرا راجے کا نام آنے اور مہاراشٹر میں بی جے پی کی ایک وزیر پنکجا منڈے کے خلاف بدعنوانی کے الزامات سے متعلق تنازعہ کا اشارہ کیا

ہے۔ دوسری جانب پارٹی ہائی کمان شانتا کمار کے خط سے سخت ناراض ہے اور میڈیا سے بات کرنے پر اُنہیں منع بھی کیا گیا ہے۔ گرچہ پارٹی ہائی کمان شانتا کمار اور ان کے خط میں اٹھائے گئے ایشوز سے ناراض ہیں، اس کے باوجود سینئر لیڈر شانتا کمار کا کہنا ہے کہ ان کے اٹھائے کچھ مسائل پر انہیں کافی وزراء کی حمایت حاصل ہے۔ اور نہ تو میں پارٹی میں الگ تھلگ ہوں اور نہ ہی عوام کے درمیان۔ وہیں ہماچل پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ نے بھی پارٹی کے اندر بات چیت کی کمی پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی پارٹی ہونا کافی نہیں ہے بلکہ سب سے اچھی پارٹی ہونا بھی ضروری ہے۔ اس بیان سے وہ دنیا میں سب سے بڑی

سیاسی پارٹی بننے کے بی جے پی کے دعوے پر بالواسطہ نشانہ لگا رہے تھے۔ مختصر یہ کہ اندرون خانہ وبیرون خانہ پارٹی اور حکومت مسائل میں مبتلا ہے۔

ملک کی موجودہ صورتحال کافی ناگفتہ بہ ہے۔ مرکزی حکومت کے ذمہ داران پر سوالات اٹھ رہے ہیں کہ انہوں نے للت مودی جو بڑی بدعنوانی میں مبتلا اور ملک بھگوڑے ہیں کی مدد کیوں کی؟ ویاپم گھوٹالہ اور اس کے خلاف آواز اٹھانے والے آر ایس ایس طبّی شعبہ کے آروگیہ بھارتی کے اندرو کے ضلع نائب صدر آنند کمار کی سعی و جہد بھی ہمارے سامنے ہے۔ دیگر وزراء اور ریاستی حکومتوں کے بدعنوانی کے معاملات بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ وزرات داخلہ کے ذرائع کے حوالے سے انڈیا ٹائمز میں شائع خبر میں درمیانہ فرقہ وارانہ تشدد کے 287 واقعات کا تذکرہ بھی ہم سن چکے ہیں جس میں مودی حکومت میں فرقہ وارانہ تشدد میں 25% فیصد کا اضافہ سامنے آیا ہے وہیں دیگر ان بے شمار واقعات سے بھی دنیا آگاہ ہے جو سماج اور ملک کی شبیہ خراب کرنے نیز عوام کو باٹنے اور تقسیم کرنے کے لیے جاری ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں کے پس منظر میں حکومت ناکامی کا شکار ہے۔ برخلاف اس کے اقتدار میں آنے سے قبل بدعنوانی سے پاک شفافیت اور جوابدہ حکومت کی بات کہی گئی تھی، جو محسوس ہوتا ہے کہ جھوٹے خواب، تھے، جن کی زد میں عوام آگئی ۔ اور اب نہ صرف پارلیمنٹ کا وقار مجروح ہو رہا ہے بلکہ عوام کے ذریعہ ادا کی گئی رقم کا بیجا استعمال بھی ہو رہا ہے۔ اس کے

باوجود عوام کو ہر ممکن طریقہ سے بے وقوف بنانے کا عمل جاری ہے، ساتھ ہی یہ امید اور کوشش بھی ہے کہ ریاست بہار میں حالیہ ہونے والے اسمبلی انتخابات میں ایک بار پھر جیت کا سہرا عوام انہیں بی جے پی یا این ڈی اے کے سر رکھے جن کے سبب بے شمار مسائل سے عوام دوچار ہیں۔فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہے،جو طے کرے گی کہ کیا بی جے پی کی یہ خواہش جائز ہے جبکہ کیے گئے کسی بھی وعدے کو چار سو دنوں میں اب تک پورا نہ کیا جاسکا ہو!

خشکی وتری میں فساد برپا ہو گیا ہے!

اسلام وہ دین حنیف ہے جو انسان کو صراط مستقیم عطا کرتا ہے۔ساتھ ہی ان بے شمار سوالات کے جواب فراہم کرتا ہے جو اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔اسی طرح کا ایک سوال یہ بھی ہے کہ زندگی دائی ،ابدی اور لافانی ہے یا یہ زندگی وقتی ، مختصر اور فانی ہے؟یہ وہ اہم سوال جو نہ صرف ذاتی زندگی میں انجام دیے جانے والے اعمال سے تعلق رکھتا ہے بلکہ فرد واجتماعیت کے ریاست اور دنیا سے متعلق نظریہ کو بھی واضح کرتا ہے۔زندگی کو مختصر سمجھنے والے عموماً ہر عمل ورد عمل اور اس کے نتیجہ کو بہت جلد دیکھنے کے عادی ، جلد باز اور صبر و تحمل سے عاری ہوتے ہیں۔برخلاف اس کے دائی زندگی پر یقین رکھنے والے متحمل مزاج اور صابر و شاکر سمجھے جاتے ہیں۔حقیقت میں یہ زندگی دائی ہے۔یہ زندگی جو ہمیں میسر آئی ہے وہ لافانی ہے۔اور موت جو ایک سچائی ہے وہ حد درجہ مختصر مدت پر منحصر ہے۔زندگی اور موت کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص دن بھر اپنے کاموں کو انجام دینے کے بعد رات میں آرام کی غرض سے سو جائے اور پھر صبح بیدار ہو۔زندگی اور موت کے درمیان کا فاصلہ بھی بس اتنا ہی ہے۔یہ فاصلہ طے ہوتے ہی لافانی زندگی پھر سے شروع ہو جاتی ہے۔لہٰذا جو لوگ اس عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں ان سے یہ سوال کیا جاتا ہے

اور کیا بھی جانا چاہے کہ لافانی زندگی کے عقیدہ پر آپ کا یقین کس قدر پختہ ہے ؟پھر یہ پختہ یقین عمل سے ثابت کیا جائے نہ کہ قول سے۔کیونکہ قول و عمل کا تضاد ہی رسوائی کا سبب بنتا ہے۔

اسلام یہ پیغام بھی دیتا ہے کہ آج اگر کوئی واحد مذہب دنیا میں باقی ہے جو فرد، خاندان، معاشرہ اور ملکی و بین الاقوامی سطح پر تعمیر و ترقی کا ذریعہ بن سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کا عمل اس بات کی شہادت نہیں دیتا بلکہ اسلامی نظام اور اس کی خوبیوں کو واضح کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔جب سے گلوبلائیزیشن نے مختلف ثقافتوں، تمدنوں اور معاشروں کو ایک کیا ہے۔معاشی اعتبار سے کمزور ترین و ترقی پذیر ملکوں نے مغربی افکار و نظریات اور دیگر باطل طریقہ ہائے زندگی کو اختیار کرنے میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی دکھائی ہے۔ نتیجتاً فرد و معاشرہ گرچہ بیرونی اعتبار سے کچھ خوشحال نظر آئے اس کے باوجود بیرون میں بے شمار مسائل سے دوچار ہے۔آج پوری دنیا میں ایک نظریاتی خلا پایا جاتا ہے۔اوراسلام متبادل نظام پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس کے باوجود محسوس یوں ہوتا ہے کہ کوئی بھی شخص نظریۂ حیات کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔صرف مادی ترقی اور خوشحالی اس کے پیش نظر ہے اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا یہ بات واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر انسان کے لیے اپنا نظریۂ حیات طے کرنا ضروری ہے۔اُس سے پوری

زندگی کا رخ متعین ہوتا ہے۔اسلام صحیح نظریۂ حیات پیش کرتا ہے۔وہ انسان کی مادی ضروریات کی تکمیل کی راہ بھی دکھاتا ہے اور اس کو اطمینان قلب بھی فراہم کرتا ہے۔اس نے عبادت کا جو نظام دیا ہے وہ اس نظریۂ حیات کو تقویت پہنچاتا ہے۔خاندان سماج کا بنیادی شعبہ ہے اور آج اس کا ڈھانچہ بکھرتا چلا جا رہا ہے۔اس کے باوجود اسلام خادان کی تعمیر کے لیے ٹھوس اور مضبوط بنیادیں فراہم کرتا ہے۔اُس نے جو اخلاقی تعلیمات دی ہیں وہ انسان کو پاکیزہ سیرت و کردار عطا کرتی اور انسانی تعلقات کو بہتر بناتی ہیں۔اس کا معاشی نظام انتہائی اعتدال پر مبنی ہے۔وہ امیر اور غریب کی کشمکش سے سوسائٹی کو نجات دلاتا ہے۔ہر ایک بنیادی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور جائز ذرائع سے معاشی جدوجہد کی اجازت دیتا ہے۔اس نے سیاست کا جو نظام دیا ہے وہ انسان پر انسان کے اقتدار کو ختم کرتا ہے اور فرد کو اللہ کا بندہ اور اس کے احکام کا پابند بناتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم جس نظام کا حصہ ہیں وہ سیکولر اور نیشن اسٹیٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ نیشن اسٹیٹ کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شہریت کی بنیاد صرف اس خطہ زمین کا باشندہ ہونا ہے۔چنانچہ کسی شخص کا مذہب اس کی شہریت کے سلسلے میں بحث نہیں ہوتا اور ہر شہری کو بلالحاظ مذہب انتظام ملکی میں شرکت کا حق حاصل ہوتا ہے۔اسی سے اس کے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ جس طرح ہر شہری کو

ملکی انتظام میں شرکت کا حق حاصل ہے، خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو، اسی طرح خواہ کچھ بھی ہو، اسے ملکی انتظام میں شرکت کا حق حاصل (ideology) اس کا نظریہ ہوگا۔ نیشن اسٹیٹ کا خود کا کوئی نظریہ نہیں ہوگا، کیونکہ اگر اس کا اپنا کوئی نظریہ ہوا تو وہ مخالف نظریات رکھنے والے شہریوں کو انتظام ملکی میں شرکت کے مساوی حقوق نہیں دے سکتی۔ اصولاً تو نیشن اسٹیٹ کا کوئی اپنا نظریہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ سادہ جمہوری نیشن اسٹیٹ ہوتی ہے۔ لیکن عملاً تاریخی اسباب کی بنا پر ہوتا یہ ہے کہ ہر ریاست اپنا ایک نظریاتی رنگ رکھتی ہے، خواہ وہ تسلیم کرے یا نہ کرے۔ اور یہ نظریاتی رنگ اس ریاست کے دستور، نظام تعلیم، سرکاری میڈیا، پالیسیوں، تقریبات اور نعروں، غرض ہر چیز میں جھلکتا ہے۔ مخصوص نظریاتی رنگ میں رنگنے کے لیے ریاست کی پوری مشنری کوشش کرتی ہے۔ اور جو باشندے اس نظریاتی رنگ سے اتفاق نہیں رکھتے وہ اصولاً تو سارے شہری حقوق رکھتے ہیں، لیکن عملاً زمین ان کے لیے تنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسا صرف کسی تعصب کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ نظریاتی رنگ کی موجودگی کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ ریاست ان نظریات کو مٹانے کی کوشش کرے جو اس کے اپنے پسندیدہ نظریے سے مختلف ہوں۔

واقعہ یہ بھی ہے کہ اس وقت ملک متعدد سنگین مسائل سے دوچار ہے۔ ان حالات میں ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ملک کی تعمیر و

ترقی میں حصہ لیں۔ مسائل جن سے ملک دوچار ہے ان کو دور کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو صرف کریں۔ ساتھ ہی اسلام جس نظام عدل وانصاف کی بات کرتا ہے اس کے قیام میں سعی و جہد کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ فی الوقت فقر و فاقہ، لوٹ کھسوٹ، ملاوٹ اور چور بازاری، ذخیرہ اندوزی و گراں فروشی، بدعنوانی و رشوت ستانی، نظم و نسق کی ابتری، تشدد و لاقانونیت کی بڑھتی ہوئی لہر، غنڈہ گردی و غنڈہ پروری، غیر ضروری بند و ہڑتال کی وبا، قومی دولت اور املاک کی وسیع پیمانہ پر بربادی، باہمی نفرت و بے اعتمادی، نفسانیت و اباحیت، فحاشی و بے حیائی، اخلاقی انارکی، کام چوری اور غیر ذمہ دارانہ روش، کلیت پسندانہ و آمرانہ رجحانات، بنیادی حقوق کی پامالی، ظلم و ناانصافی، عصبیت و عدم رواداری، اور ان سب سے زیادہ یہ کہ جارحانہ قوم پرستی وغیر جمہوری سرگرمیوں نے مسائل میں مزید شدت و سنگینی بڑھا دی ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں بگاڑ اور فساد رونما ہو چکا ہے۔ وہیں دوسری طرف حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ سب ہمارے اپنے ہی کرتوتوں کا کڑوا کسیلا پھل اور اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ کچھ اس طرح بیان کیا ہے: "خشکی وتری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا۔ شاید کہ وہ باز آجائیں"۔

! جشن آزادی اور ملک میں پھیلتی انارکی

آزادی کے حصول میں ہندوستانیوں نے پہلی مسلح جنگ جو لڑی انگریزوں نے اس کا نام 'غدر' دیا۔اس جنگ کے عموماً دو سبب بیان کیے جاتے ہیں۔اولاً یہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے تمام صوبے اور کئی ریاستیں یکے بعد دیگرے اپنی حکومت میں شامل کرلیے تھے۔دوم یہ کہ ان دنوں جو کارتوس فوجیوں کو دیے جاتے تھے وہ عام خیال کے مطابق سور اور گائے کی چربی سے آلودہ تھے اور انہیں بندوقوں میں ڈالنے سے بیشتر دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ہندو اور مسلمان فوجی سپاہیوں نے اسے اپنے مذہب کے منافی سمجھا اور ان میں کھلبلی مچ گئی۔جن سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا ان کی فوجی وردیاں اتار کر انہیں بیڑیاں پہنادی گئیں۔اور اس بات کی ذرا پرواہ نہیں کی گئی کہ ان قیدیوں میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے انگریزوں کی خاطر بڑی قربانیاں دی تھیں۔مئی 1857 میں غیر منظم انداز میں اس جنگ کا آغاز ہوا اور مارچ 1858 میں لکھنؤ، دہلی ،کانپور و دیگر مقامات ایک بار پھر انگریزوں کے تصرف میں آگئے۔جنگ کے دوران بڑی تعداد میں جانی و مالی نقصانات برداشت کیے گئے۔باوجود اس کے اندرونی سازشوں اور چپقلش نے ناکامی سے دوچار کیا۔آزادی کا جذبہ جو ایک طویل عرصہ سے محسوس کیا جارہا تھا غدر کی ناکامی

کے نتیجہ میں گرچہ کچھ مدھم پڑا لیکن 90 سالہ مزید جدوجہد اور عظیم قربانیوں کے بعد اگست 1947 میں ملک کو آزادی میسر آئی ۔اس موقع پر جشن منائے گئے اور خوشیاں بانٹی گئیں اس امید کے ساتھ کہ آزاد ملک کی تعمیر وترقی میں سب کو نمایاں کردار ادا کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے،بنیادی حقوق سب کے یکساں ہوں گے،امن وامان قائم ہوگا،مذہب کی بنیاد پر بانٹا اور تقسیم نہیں کیا جائے گا،ریاستی سطح پر مذہب کی بنیاد پر تشدد پھیلانے والوں پر گرفت کی جائے گی، ظلم وزیادتیاں ختم ہوں گی اور عدل ونصاف قائم ہوگا۔لیکن اس موقع پر جبکہ ابھی دو دن قبل ہی یوم آزادی منایا گیا ہے، سوال اٹھتا ہے کہ کیا وہ امیدیں بر آئیں جن کے حصول کے لیے بلا تفریق مذہب و ملت اہل ملک نے قربانیاں پیش کی تھیں؟اور اگر آزادی حاصل کرنے کے باوجود وہ امیدیں بر نہیں آئیں جو مطلوب تھیں تو اس کی بنیادی وجوہات کیا ہیں؟کیا "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" کی آڑ میں جس طرح انگریزوں نے ملک کو تقسیم کیا اور غلام بنایا تھا وہ نعرے اور اس پر عمل درآمد کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے؟انسانوں پر انسانوں ہی کی جانب سے دورغلامی میں جس طرح حددرجہ ظلم وزیادتیاں جاری تھیں کیا آج بھی یہ حالات ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں؟آزاد ہندوستان میں کیا آج بھی انسان غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے؟یہ اور ان جیسے بے شمار سوالات ہیں جو اُن کمزور محروم اورپست طبقات کی جانب سے اٹھائے جاتے ہیں،جنہوں نے درحقیقت آج تک، اپنی زندگیوں میں لفظ 'آزادی' کے معنی ہی نہ سمجھیں ہوں اور جن

کی زندگیاں 'آزادی' سے کبھی لطف اندوز ہوئی نہ ہوں۔آیئے ایک ایسے ہی واقعہ کا تذکرہ کرتے ہیں، جس کو پڑھ کر آزاد ہندوستان کے ہر شہری کا سر شرم سے جھک جائے گا۔

واقعہ ریاست بہار کے ضلع لکھی سرائے کے گاؤں کھڑا کا ہے۔جب منوتانتی نام کے ایک دلت مزدور اپنے پچھلے چار دنوں کی مزدوری مانگنے گیا تو اسے گاؤں کے دبنگ لوگوں نے گیہوں نکالنے والے کریشر میں زندہ پیس ڈالا۔ حیران کردینے والی بات یہ ہے کہ اس رونگٹے کھڑے کردینے والے واقعہ کو ملک کے کسی میڈیا نے قابل توجہ نہ سمجھا۔دوسری جانب دلت میڈیا واچ ٹیم سے جڑے ارون کھوٹے کا کہنا ہے کہ "اتنی بے رحمی اور متشدد طریقہ سے کیے گئے قتل عام پر میڈیا کی خاموشی خود ایک شرمناک واقع ہے۔جس میڈیا نے گزشتہ دنوں ہیمامالنی کی گاڑی سے ہوئے حادثہ کو ہائپ دی، وہی میڈیا اس واقعہ پر خاموش نظر آئی۔اگر سوشل میڈیا پر دو چار لوگوں نے اس واقعہ کو شیئر نہ کیا ہوتا تو کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی۔انہوں نے سوال کرتے ہوئے کہا کہ ہم کیسے غیر انسانی، غیر اخلاقی اور بربریت پر منحصر معاشرہ میں جی رہے ہیں؟دلت ہونے کی وجہ سے ہم کس قدر غیر مہذب ریوں کو برداشت کر رہے ہیں، یہ ہم ہی جانتے ہیں۔جہاں اپنی مزدوری کے پیسہ مانگنے پر زندہ کریشر میں ٹھونس دیا جاتا ہو یا گولی ماردی جاتی ہو، اُس معاشرہ کی غیر اخلاقی حرکتوں کو برداشت کرنا انسان کی

بات نہیں ہے۔ذلت و رسوائی کی زندگی کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا۔یہ صرف دلت ہی ہیں جو برداشت کیے جا رہے ہیں۔اور وجہ صرف ایک ہے وہ یہ کہ نہ صرف ہم خود کو انسانوں سے کمتر سمجھتے ہیں بلکہ دیگر بھی ہمیں ایسی زندگی جینے پر مجبور کیے ہوئے ہیں،اس کے باوجود کہ وہ ہم سے زیادہ محنت نہیں کر سکتے۔اگر دلت طے کر لے کہ میں سامنے والے کو ایک ہی وار میں ڈھیر کر دوں گا تو کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا،مگر افسوس ہم بات کرنے کی بجائے گڑگڑاتے ہیں،اسی وجہ سے ظالم کا ظلم بڑھتا جاتا ہے اور وہ ہمیں روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔انھوں سوال کرتے ہوئے کہا کہ اس غیر اخلاقی، غیر قانونی حرکت پر حکومت تو قانونی خانہ پوری کر لے گی لیکن معاشرہ اس بدنامی سے کیسے نجات پائے گا؟کیا دلت کو معاشرہ میں مزدوری نہیں مانگنی چاہیے ؟کیا اس کا اور اس کے بچوں کا پیٹ نہیں ہے ؟کیا اُس وقت معاشرہ میں اُس دلت کو بچانے والے انسان نہیں تھے ؟کیا سبھی تماشبین تھے ؟صرف اس کے قاتل ہی نہیں بلکہ ایسے تمام لوگ انسانیت کے قاتل ہیں جو حد درجہ ظلم دیکھیں مگر خاموش رہیں"۔ارون کھوٹے صاحب کا درد، دلتوں پر ہو رہے مظالم اور دیگر مظلومین پر جاری تشدد کو محسوس کرتے ہوئے ذرا ایک لمحہ ٹھہریئے اور پھر آزاد ہندوستان کی آزادی سے لطف اندوز ہونے کی جرات کیجئے اور بتایئے آپ کیسا محسوس کرتے ہیں !

یوم آزادی کے موقع پر آیئے ایک اور واقعہ سے آپ کو رو،رو کرتے چلیں۔کیا آپ

کو معلوم ہے 15اگست 1947کے دن مہاتما گاندھی دہلی سے ہزاروں کلومیٹر دور بنگال کے نوا کھلی میں موجود تھے۔جہاں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تشدد کو روکنے کے لیے انشن پر بیٹھے تھے۔اورجب یہ بات طے ہو گئی کہ 15 اگست ہی کے دن ہندوستان آزاد ہوگا تو جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل نے مہاتما گاندھی کو خط لکھا۔اس میں لکھا" قانونی اعتبار سے 15 اگست ہمارا پہلا آزادی کا دن ہوگا،آپ راشٹر پتا ہیں،اِس میں شامل ہوں اور اپنا آشرواددیں"۔گاندھی نے خط کے جواب میں لکھا" جب کلکتہ میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی جان لے رہے ہوں،ایسے میں جشن منانے کے لیے میں کیسے آسکتا ہوں؟میں تشدد روکنے کے لیے اپنی جان دے دوں گا"۔اگلے دن دہلی میں جشن منایا گیا،لال قلعے سے جھنڈا کشائی ہوئی،لیکن گاندھی اس جشن میں موجود نہیں تھے۔واقعہ کے پس منظر میں سوال اٹھنا ہی چاہیے کیا آج ملک مختلف قسم کے تشدد میں بری طرح گھرا ہوا نہیں ہے؟زندہ مثال چند آوارہ نما نوجوان ہیں جو ٹھیک آزادی کے 69ویں سالگرہ کے موقع پر اترپردیش ، میرٹھ میں پہلے ایک خاتون کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے ہیں اور جب ایک فوجی خاتون کو بچانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بعد میں حد درجہ تشدد اختیار کرتے ہوئے کھلے عام اس کا قتل کردیتے ہیں۔وزیر اعظم جو ملک کے انتظام و انصرام کا ذمہ دار ہے ،سے ہم کہنا چاہیں گے کہ ملک میں بڑھتی غیر اخلاقی حرکتیں، حد درجہ ظلم وزیادتیاں اور عدل و انصاف کا دن دہاڑے قتل عام کے نتیجہ میں ممکن ہے حکومتی پنشن اور کچھ

معاوضے تو اہل ملک کو حاصل ہو جائیں لیکن ملک کی تعمیر و ترقی میں میک ان انڈیا کا
خواب تب ہی ممکن ہے جبکہ مجرمین کو مختلف خانوں میں بانٹ کر نہ دیکھا جائے۔ساتھ
ہی نہ صرف حقیقت سے واقف ہوا جائے بلکہ عملی نمونے بھی پیش کیے جائیں۔اسی وقت
آپ پر عائد وہ ذمہ داری بھی ادا ہوگی جس کے بیبانگ دہل بڑے دعوے کیے گئیں ہیں
اور جن کی آس میں اہل ملک بے صبری سے نظر لگائے بیٹھے ہیں !

ملک عزیز میں کیا آمریت فروغ پا رہی ہے!

دنیا میں عموماً دو طرح کی طرز حکومت پائی جاتی ہیں۔ایک جمہوریت تو دوسری آمریت۔جمہوریت اکثریت میں قابل قبول سمجھی جاتی ہے.برخلاف اس کے آمریت کو عوام ردّ کرتے ہیں۔یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جمہوری کلچر، انتخابات سے کہیں آگے ایک منزل کا نام ہے۔ جمہوری کلچر میں.بروقت انتخابات ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ایک نمائندہ حکومت وجود میں آتی ہے۔اس حکومت کے تحت سب کچھ پارلیمنٹ سے پوچھ کر ہوتا ہے۔ قانون سازی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ عدلیہ اور صحافت مکمل طور پر آزاد ہوتے ہے۔ کسی کو اپنی بات کہنے سے نہیں روکا جاتا۔ مملکت کا ہر ادارہ مثلاً پولیس سیاسی اثر سے آزاد ہوتا ہے۔ احتساب کا ایسا غیر جانبدارانہ نظام قائم ہوتا ہے، جس کے تحت ہر وقت اور ہر لمحے اقتدار پر فائز لوگوں کے ہر کام کی نگرانی کی جاتی ہے۔ اربابِ اقتدار سب سے.بڑھ کر خود قانون کی پابندی کرتے ہیں، اور اپنے فرائضِ منصبی کی بجاآوری کے علاوہ ان کو کوئی اضافی مراعات حاصل نہیں ہوتیں۔اگر وہ محسوس کریں کہ رائے عامہ ان کے خلاف ہوچکی ہے، تو نئے انتخابات کا اعلان کرتے ہیں اور کسی بھی مخالفانہ نتیجے کو قبول کرنے میں پس وپیش سے کام نہیں لیتے۔

موجودہ دور میں دنیا کے وہ ممالک جو جمہوریت کو درہم برہم کرکے آمریت کا رخ اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے آمریت کی راہ پر چل پڑنا جتنا آسان ہے، جمہوریت کی طرف پھر پلٹ آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آمریت خواہ پرامن طریقے ہی سے قائم ہو، بہرحال پرامن طریقے سے دفع نہیں ہو سکتی، اور اس امر کی بھی کوئی ضمانت کسی کے پاس نہیں ہے کہ جو لوگ ابتداً آمریت کے سربراہ کار ہوں وہی ہمیشہ اس کے سربراہ کار رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل بساط الٹ جائے اور آمر خود مامور ہو کر رہ جائیں، بلکہ آمریت کے شکار جائیں۔ لہٰذا تمام لوگوں کو، جمہور کی نمائندگی کرنے والوں کو بھی اور آمریت کی طرف رجحان رکھنے والوں کو بھی اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ آیا وہ آمریت کے ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو بہرحال اس کے فطری نتائج ہیں؟ وہیں دوسری جانب آمریت خواہ کتنی ہی خیراندیش ہو اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ قائم کی جائے، اس کا مزاج اس کے اندر لازماً چند خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو اس سے کبھی دور نہیں ہو سکتیں، اور ان خصوصیات کے چند لازمی اثرات ہوتے ہیں جو مترتب ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتی۔ وہ خوشامد پسند ہوتی ہے۔ وہ اپنے محاسن کا اشتہار دیتی اور عیوب پر پردہ ڈالتی ہے۔ اس میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ خرابیاں بروقت نمایاں ہو جائیں اور ان کا تدارک کیا جا سکے۔ وہ عام رائے اور افکار و نظریات سے غیر متاثر ہوتی ہے۔ اس میں ردّ و بدل کسی کھلے طریقے سے نہیں بلکہ درباری سازشوں اور

جوڑتوڑ سے ہوتا ہے جنھیں عوام الناس صرف تماشائی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس میں صرف ایک محدود طبقہ ملک کے سارے دَر وبست پر متصرف ہوتا ہے اور باقی سب بے بس ومحکوم بن کر رہتے ہیں۔ اس کے تحت یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ پوری قومی طاقت دِلی رضا اور ارادے کے ساتھ کسی مقصد کے لیے حرکت میں آسکے۔ اس کا آغاز چاہے کتنی ہی نفع رسانی کے ساتھ ہو، انجامِ کار وہ ایک جابر طاقت بنے بغیر نہیں رہتی اور عام لوگ بیزار ہو کر اس سے خلاصی کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں۔ مگر خلاصی کے جتنے پرامن راستے ہوتے ہیں وہ انھیں چن چن کر بند کردیتی ہے اور مجبوراً ملک ایسے انقلابات کی راہ پر چل پڑتا ہے جو مشکل ہی سے اس کو کسی منزلِ خیر پر پہنچنے دیتے ہیں۔ لہٰذا موجودہ حالات میں وہ تمام مقامات قابل توجہ ہیں جہاں جمہوریت بنام آمریت گھر کر چکی ہے۔ ایسے حالات میں آمریت کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنا خود آمریت کو فروغ دینے کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا چاہیے کہ قانون کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے، پر امن طریقہ سے عوام الناس کے سامنے جمہوری اقدار کو متعارف کیا جائے ساتھ ہی آمریت جہاں اور جس درجہ میں بھی پنپتی محسوس ہو اس کے خلاف نہ صرف قول سے بلکہ عمل سے بھی سعی و جہد کی جائے۔ تب ہی ممکن ہے کہ ملک میں امن و امان قائم ہو اور وہ ادارے جو عدل و انصاف کے فروغ میں غیر جانب دارنہ کردار ادا کرنے کے پابند ہیں، بخوبی اپنی ذمہ داری ادا کرسکیں۔

گفتگو کے پس منظر میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ آمریت کہاں گھر کر چکی ہے اور جمہوریت کہاں باقی ہے۔فی الوقت اس کے دو پیمانے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ایک جہاں جمہور کے ذریعہ حکومت تو تشکیل دی جاتی ہے مگر نظم و نسق کی صورتحال ابتر اور عدل و انصاف کے ادارے جانب دارانہ کردار ادا کرتے ہوں،یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں جمہوریت خطرہ میں ہے۔دوسری طرف مختلف حیثیتوں میں موجود اقلیتی طبقے کا کھلے عام استحصال، ظلم و زیادتیاں اور عدل و انصاف کا قتل عام، کی صورتحال میں کہا جانا چاہیے کہ گرچہ ظاہر میں جمہوریت ہے لیکن اس ہی کے پس پردہ آمریت گھر کر چکی ہے۔لیکن ان دونوں ہی صورتوں میں عوام کی اہم ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حق رائے دہی کو بخوبی پہچانیں۔اور جب ان کو یہ احساس ہو جائے کہ ایک بڑا حق انہیں حاصل ہے تو پھر کسی لالچ، خوف یا محض سیاسی گروہ بندی کی بنیاد پر اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے نہ دیں۔

جمہوریت و آمریت کے فرق اور حکومت کو صحیح رخ پر قائم رکھنے میں عوام کو حاصل حق رائے دہی کے اختیارات کے بعد ملک عزیز ہند کی ایک ریاست کی بات کرتے ہیں۔جہاں گزشتہ چند سالوں سے یکے بعد دیگرے دو پارٹیاں حکومت کرتی آئی ہیں۔ایک بہوجن سماج پارٹی ہے،جس کی پارٹی سپریمو مایاوتی دلتوں کی مسیحا سمجھی جاتی ہیں۔تو دوسری خود کو سوشلسٹ کہنے والے ملائم سنگھ اور ان کی

پارٹی ہے۔فی الوقت ریاست میں سماج وادی پارٹی کی حکومت ہے۔جس کے موجودہ دور حکومت میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت فسادات سے متاثر رہی ہے،اور یہ کھیل آج بھی جاری ہے۔وہیں دلتوں کا الزام ہے کہ جب سے سماج وادی پارٹی حکومت میں آئی ہے ،نہ صرف ریاست میں نظم ونسق ابتر ہوا ہے بلکہ دلتوں پر ظلم وزیادتیوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔زندہ مثال ریاست اترپردیش کے ضلع ہردوئی کے سلسلے وار دو واقعات ہیں،جس سے دلتوں کا الزام کسی حدتک درست ثابت ہوتا ہے۔پہلا واقعہ ایک تیرہ سالہ دلت بچی کے ساتھ اجتماعی زیادتی کا ہے۔جس میں درندگی کی تمام حدیں پار کی گئیں۔بچی کے ساتھ پہلے اجتماعی زیادتی ہوئی اور بعد میں نہ صرف اس کی آنکھیں نکال لی گئیں بلکہ قتل بھی کیا گیا۔دوسرا واقعہ ایک چار ماہ کی معصوم دلت بچی کا ہی ہے۔اس معصوم کے ساتھ بھی زیادتی کی گئ اور قتل کیا گیا۔تیرہ سالہ بچی کا معاملہ اس وقت پیش آیا جب قتیاپوری علاقہ کے مرزا لکتانہ گاؤں میں بچی اپنے والد کے لیے دوا لینے گئ تھی۔ غلطی سے دوا وہ دکان پر ہی چھوڑ کر چلی آئی اورجب دوبارہ دوا لینے بازار گئ تو واپس نہیں لوٹی۔کافی انتظار کے بعد گھر والوں نے تلاش شروع کی تو بچی کی لاش ایک کھیت میں ملی۔اس کے جسم پر کپڑے نہیں تھے،منہ میں دوپٹا ٹھونسا گیا تھا،چہرہ چاقوؤں سے بری طرح زخمی تھااور آنکھیں نکلی ہوئی تھیں۔وہیں دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جبکہ بچی کے والد رشتہ داری میں گئے تھے اور ماں سو رہی تھی۔ماں جب نیند سے بیدار ہوئی تو بچی غائب تھی،تلاشی کے بعد

معصوم بچی کی لاش ایک کھیت سے دریافت ہوئی جو حد درجہ افسوسناک حالت میں تھی۔ملک عزیز کے یہ دو واقعات کل نہیں ہیں۔معاملہ یہ ہے کہ نظم و نسق کی ابتری اور ظلم وزیادتیوں کے واقعات ہر دن سامنے آتے ہیں، اس کے باوجود عوام اس بے غیرتی سے ان کو نظرانداز کردیتی ہے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔اس کی وجہ کیا ہے؟ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی بنیادی وجہ وہ ماحول ہے جس نے انسانوں کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے۔یہ بانٹنے اور تقسیم کرنے کا عمل کہیں شخص و گروہ کو مخصوص پیشہ سے وابستہ کرتا ہے تو کہیں دولت کی غیر جانب دارانہ تقسیم کی بناپر۔کہیں مخصوص علاقہ سے رشتہ استوار کرکے پہچان بنائی جاتی ہے تو کہیں غیر انسانی وغیر اخلاقی مروجہ ذات پات کے نظام کی بناپر۔کہیں حسب و نسب کی بناپر تو کہیں زبان و رنگ کی بنیادوں پر۔اس سے بھی آگے بڑھیں توافسوس ناک صورتحال یہ ہے کہ ظلم وزیادتیاں اور دکھ درد مخصوص مذہب سے وابستگی کی بناپر بھی تقسیم کیے جاتے ہیں۔اس پس منظر میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ حالات انتہائی بدترین ہیں، اور انہیں بدترین حالات میں آمریت فروغ پاتی ہے۔لہذا وہ افراد و گروہ جو آمریت پسند نہیں کرتے ،جہاں مظلوم کی مدد کریں وہیں ظالم کی بھی۔ظالم کی مدد ایسے کہ اسے ظلم کرنے سے روک دیا جائے!

! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو۔۔۔

گزشتہ پچیس اگست ۲۰۱۵ دہلی کے تقریباً تمام اخبارات میں یہ افسوسناک خبر شائع ہوئی کہ نویں کلاس کے ایک پندرہ سالہ طالب علم ، شبھم جندل جو کرشنا ماڈل اسکول میں زیر تعلیم تھے، کی اس ہی کے کلاس کے دو ساتھیوں نے لکڑی کے ایک مضبوط ڈنڈے سے سر پر لگاتار وار کرتے ہوئے پہلے بری طرح زخمی کر دیا اور بعد میں جب اس کی ناک اور سر سے بری طرح خون بہنے لگا تو اسے چھوڑ کر رفع دفع ہو گئے، یہاں تک کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ شبھم اور اس کے ساتھیوں کے درمیان اِس سے قبل بھی کئی مرتبہ جھگڑا ہو چکا تھا اور بارہا وہ اُسے زدکوب کرتے رہے ہیں۔ شبھم چونکہ پڑھنے میں تیز تھا لہذا اس کے ساتھی اس سے حسد رکھتے تھے اور مختلف بہانوں سے اس کے ساتھ چھیڑ خانی ولڑائی جھگڑا کیا کرتے تھے۔ خبر حد درجہ افسوس ناک ہے اس کے باوجود اس طرح کی خبریں جن میں کم عمر بچوں کے ذریعہ جرائم انجام دیئے جائیں، آئے دن سامنے آتی ہی رہتی ہیں۔ وہیں دوسری طرف کم عمر بچے خود بھی ظلم وزیادتیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ خصوصاً سماج کے اس بااثر طبقہ کی جانب سے جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ معصوم بچپن کی نہ صرف حفاظت کریں بلکہ بہتر تعلیم وتربیت کا بھی انتظام کریں۔ ایک ایسا تعلیم وتربیت کا نظام جس میں بچے کی پوشیدہ صلاحیتیں

پروان چڑھیں ساتھ ہی اخلاقی تربیت کا بھی بھرپور اہتمام کیا جائے۔
گزشتہ پانچ سالوں میں ہندوستان میں بچیوں کے ساتھ زیادتی کے معاملات 151 فیصد بڑھے ہیں۔ نیشنل کرائم ریکارڈس بیورو کے اعداد و شمار کی روشنی میں 2010 میں درج شدہ 5,484 معاملے بڑھ کر 2014 میں 13,766 ہو چکے ہیں۔ وہیں بچوں کے استحصال کے معاملات ملک بھر میں 8,904 درج کیے گئے ہیں۔ این سی آر بی کی روشنی میں ہندوستانی پینل کوڈ کی دفعہ 354 کے تحت بچیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور عصمت دری کے ارادے سے کیے گئے حملے کے واقعات 11,335 درج کیے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم عمر بچوں کے ساتھ مختلف قسم کے استحصال کے معاملات میں اضافہ ہورہا ہے۔ گزشتہ چار سالوں میں بچیوں کے ساتھ زیادتیوں کے اضافہ کی عموماً دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ i) پہلے معاملے خوف، ڈر اور بدنامی کی وجہ سے درج نہیں کروائے جاتے تھے اور ii) نئے قانون کا نفاذ۔ صورتحال کے پس منظر میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ جرائم جو بچوں کے ساتھ یا بچوں کے ذریعہ انجام دیے جا رہے ہیں اس کی وجوہات کیا ہیں؟ سوال گرچہ بچوں سے تعلق رکھتا ہے اس کے باوجود سوال کے دو الگ الگ پہلو ہیں، جن کا اگر بغور مطالع نہ کیا جائے تو نتائج تک پہنچنا مشکل مرحلہ ثابت ہوگا۔ فی الوقت ہم بچوں کے ذریعہ انجام دیے جانے والے جرائم کا تذکرہ کریں گے ساتھ ہی ان وجوہات کو بھی جاننے کی کوشش کریں گے جن کے سبب یہ جرائم انجام دیے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں لازمی تعلیم کا ایکٹ نافذ ہونے کے باوجود تقریبا ایک کروڑ بچے مزدور ہیں جن کی زندگی استحصال پر مبنی ہے۔ساتھ ہی ملک کے تمام شہروں میں بڑی تعداد میں سڑکوں پر بے یارومددگار زندگی گزارنے والے بچے بچیاں موجود ہیں جنھیں بھیک مانگنے کے پیشہ باضابطہ وابستہ کیا جاتا ہے۔وہیں ملک میں لاپتہ بچوں کی بھی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔یہ لاپتہ بچے وبچیاں سرگرم گروہوں کے ذریعہ اغوا کیے جاتے ہیں جن کی تعداد تقریباً ہر سال ایک لاکھ سے زائد ہوتی ہے۔اس کے باوجود کہ اغوا شدہ بچوں کے تعلق سے سپریم کورٹ آف انڈیا نے پولیس کو متوجہ کیا ہے کہ وہ مسئلہ کے حل میں منصوبہ بند و منظم انداز میں سرگرم ہوں، لیکن معاملہ حل ہوتا نظر نہیں آرہا ہے۔آپ اور ہم باخوبی جانتے ہیں کہ ان اغوا شدہ، لاپتہ بچوں سے کہیں جبراًمزدوری کروائی جاتی ہے، تو کہیں بھیک منگوائی جاتی ہے نیز حد درجہ غیر اخلاقی حرکتوں میں بھی ان بچوں کو ملوث کیا جاتا ہے،اور چونکہ وہ ایک طرح سے قید میں ہیں لہذا وہ یہ سب کرنے پر مجبور ہیں۔دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ انتظامیہ اس درجہ چاق وچوبند نہیں جو مطلوب ہے۔نتیجتاً ہر دن جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔

چھوٹے وبڑے شہروں میں بچوں پر استحصال وان کے ذریعہ انجام دیے جانے والے جرائم کی وجہ سماج کا ٹوٹتا بکھرتا وہ خاندانی نظام بھی ہے جہاں ماں باپ

اور بچوں کے درمیان الفت و محبت کا ماحول ختم ہوا چاہتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہمدردی و تربیت کا وہ ادارہ پروان نہیں چڑھ پاتا جس کی ذمہ داری ماں باپ پر عائد ہوتی ہے۔ نیز ان دورویوں کا سبب وہ شہری ماحول بھی ہے جہاں عموماً ماں اور باپ دونوں ہی نوکری پیشہ ہوتے ہیں۔ پھر اس نوکری پیشہ ہونے کی بنیادی وجہ بھی ان کے نزدیک یہی ہوتی ہے کہ دولت کی فراوانی یا آسودگی، بچوں کی تعلیم و تربیت میں بڑا ذریعہ ثابت ہوگی۔ برخلاف اس کے دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ معاشی طور پر مستحکم بچے و نوجوان عموماً جرائم میں زیادہ ملوث ہوتے ہیں ساتھ ہی وہ زندگی کے اُن حقیقی مسائل سے بیگانہ ہوتے ہیں جو شخصیت کے ارتقاء کا لازمی جز ہے۔ یہی سبب ہے کہ لاشعوری زندگی گزارتے ہوئے پہلے وہ اخلاقی آوارگیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور بعد میں غیر محسوس انداز سے جرائم کی دنیا میں قدم رکھ دیتے ہیں۔ نتیجتاً بچوں کے ذریعہ انجام دیے جانے والے جرائم کہیں انفرادی تو کہیں اجتماعی، اور کہیں منظم تو کہیں غیر منظم سامنے آتے ہیں۔ گزشتہ دنوں دہلی کا نربھیا معاملہ ہو یا شبھم اور اس کے ساتھیوں کے ذریعہ انجام دیے جانے والا جرم، یہ دونوں ہی معاملے اجتماعی بھی ہیں اور منظم بھی۔ اب جبکہ بچوں کے ذریعہ اجتماعی اور منظم انداز میں جرائم انجام دیے جارہے ہوں، تو یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ خاندان و معاشرہ اندورن میں حد درجہ کمزور پڑ چکا ہے، ساتھ ہی یہ ایک تشویشناک صورتحال ہے۔ ایک ایسی تشویشناک صورتحال جہاں نہ خاندان مثالی پایا جاتا ہے، نہ معاشرہ اور نہ ہی

بچوں کے لیے ماں باپ کا وہ کردار موجود ہے جس کی روشنی میں وہ آپ اپنی تربیت آپ کرپائیں۔ کیونکہ تربیت صرف قول ہی سے نہیں ہوتی بلکہ اس چھوٹے وبڑے عمل کو دیکھ کر بھی ہوتی ہے، جو ان کے سامنے انجام دیا جارہا ہے۔اور یہ ایک مستقل عمل ہے جو غیر محسوس انداز میں ہمہ دم جاری رہتا ہے۔ لہذا ایسے ماں باپ جو اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کرتے، کردار کے لحاظ سے نہایت کمزور ہوتے ہیں،مزید وہ بداخلاقیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ایسے ماں باپ خود بھی چاہتے ہیں کہ وہ بچوں سے دور رہیں تو وہیں بچے بھی ماں باپ سے دوری اختیار کرلیتے ہیں۔دوسری جانب دوہرے کردار والے ماں باپ کی بداخلاقیاں جب بچوں پر ظاہر ہونا شروع ہوتی ہیں تو وہ بچے یا تو خود ہی ماں باپ سے مکمل علیحدگی اختیار کرلیتے ہیں بصورت دیگرایسے ظالم ماں باپ بھی سامنے آتے ہیں جو اپنی بداخلاقیوں کے نشے میں اپنے ہی بچوں کا قتل کرنے سے گریز نہیں کرتے۔اور یہ خبریں بھی ہم وقتاً فوقتاً سنتے رہتے ہیں، کہ فلاں ڈاکٹر یا فلاں میڈیا پرسن نے اپنی بیٹی کا قتل کردیا۔ کہیں قتل کی وجہ بیٹی کی اخلاق سوز حرکت ہوتی ہے تو کہیں ماں اپنی اخلاق سوز حرکت کو چھپانے کی وجہ سے ایسا کرتی ہے۔مزید یہ کہ ہندوستانی معاشرہ جس تیز رفتاری کے ساتھ "ترقی یافتہ قوموں "کے نقشہ قدم پر آگے بڑھ رہا ہے،اس میں لاوارث (حرام) بچے وبچیاں اوران کے معاشرتی مسائل بھی جرائم کے فروغ کا ایک سبب ہیں۔

ملک وملت اور معاشرہ کی اس پیچیدہ صورتحال میں اسلام ایک واضح و متعین راستہ فراہم کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے" (التحریم: ٦) ۔پس یہی وہ مختصر ترین خدائی تعلیم ہے جس پر چل کر نہ صرف مسائل کے حل تلاش کیے جا سکتے ہیں بلکہ ایک بہتر خاندان و معاشرہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔لیکن اس کے لیے جہاں یہ لازم ہے کہ عمل کیا جائے وہیں یہ بھی لازم ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایسی زندہ مثالیں فراہم کریں جس سے معصیت سے پاک وہ معاشرہ فروغ پائے جس کا ہر شخص خواہشمند نظر آتا ہے۔زندہ مثالیں جہاں تشویشناک صورتحال سے نکلنے میں آسانی پیدا کریں گی وہیں ملک کی تعمیر وترقی میں بھی مددگار ثابت ہوں گی۔لہٰذا ایسے تمام حضرات جو چاہتے ہیں کہ مسائل حل ہوں، مثبت تبدیلی واقع ہو ساتھ ہی خاندان کا ادارہ مثبت بنیادوں پر مستحکم ہو، تو چاہیے کہ بلا لحاظ مذہب وملت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وہ راستہ اختیار کیا جائے، جس میں سب ہی کا فائدہ ہے۔لیکن اگر کوئی شخص و گروہ چاہے کہ مسائل تو حل ہوں اور حالات بھی بہتر ہوں اس کے باوجود اسلام و اسلامی تعلیمات کے حوالہ جات سامنے نہ آنے پائیں، تو یہ عمل اصولی طور پر غلط اور عملی زندگی میں ناقص ٹھہرے گا۔اس پس منظر میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک غیر اصولی و ناقص طرز عمل سے کسی خیر کی توقع کی جائے!

اقدار پر مبنی سیاسی پارٹی وجود میں ضروری ہے!

نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی ہندوستانی شہریوں کے لیے فی الوقت دلچسپی کا موضوع اگر کچھ ہے تو وہ بہار میں ہونے والے اسمبلی انتخابات ہیں۔الیکشن گرچہ بہار میں ہیں اس کے باوجود ہر اس مقام پر جہاں بہار کے لوگ رہتے بستے ہیں راست یا بلاواسطہ الیکشن میں مصروف ہیں۔دوسری جانب رائج الوقت طریقوں کے علاوہ خبروں کے ذریعہ یہ بات بھی سامنے آرہی ہے کہ ایک نئ اور تخلیقی کوشش ریاست بہار سے چلائی جانے والی وہ ٹرین ہے جو اہل بہار کو بی جے پی کی حکمرانی والی ریاستوں میں لے جارہی ہے تاکہ وہ لوٹ کر بتائیں کہ وہاں کس طرح کی ترقی ہوئی ہے۔اس کے لیے باقاعدہ ایک اسپیشل ٹرین چلائی گئی ہے جو بہار کے مختلف اضلاع سے نوجوانوں کو لے کر جارہی ہے۔ٹرین میں کھانے کے پیکٹ،پینے کا پانی اور ضروری چیزیں فراہم جارہی ہیں۔14ڈبوں کی ٹرین میں بہار کے مختلف علاقون سے نوجوانوں کو سفر کروایا جارہاہے۔ساتھ ہی مسافرین کو میڈیا سے بات کرنے سے روکا بھی جارہا ہے۔اور کہا یہ جارہاہے کہ ٹرین بی جے پی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک این جی او کی جانب سے چلائی گئی ہے۔برخلاف اس کے یہی ٹرین جب مغل سرائے اسٹیشن پر رکتی ہے تو فوراً ہی مقامی بی جے پی کے کارکنان مسافرین کے لیے کھانے کے پیکٹ،پانی اور دوسری اشیاء پہنچانے کا نظم کرتے ہیں۔اس پوری سعی و

جہد کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس مرتبہ ایک ایک ووٹر پر بے شمار دولت صرف کی جائے گی۔اور یہ دولت کا صرفہ، طریقے اور ہتھکنڈے متذکرہ پارٹی ہی نہیں بلکہ تمام سیاسی جماعتیں استطاعت کے لحاظ سے اختیار کریں گی۔یعنی وہ دولت جو ایک اسمبلی امیدوار کے لیے الیکشن کمیشن طے کرتا ہے،اس سے کہیں زیادہ صرف ہوگی،لیکن طریقے وہ اختیار کیے جائیں گے جس سے اسمبلی امیدوار پر آنچ نہ آئے۔شاید یہی وجہ ہے کہ تمام سیاسی پارٹیاں آر ٹی آئی کے دائرہ سے باہر رہنے پر متفق نظر آتی ہیں۔

اسمبلی انتخابات کا تذکرہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ریاست بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار گزشتہ 2010 میں جنتا دل یونائٹڈ سے 115 سیٹوں پر کامیاب ہوئے تھے،ساتھ ہی بھارتی جنتا پارٹی کو 91 سیٹوں حاصل ہوئی تھیں۔نتیجہ میں کل 206 سیٹوں پر کامیابی کا سہرا پہننے والے این ڈی اے اتحاد کی حکومت تشکیل پائی تھی۔جبکہ 2010 میں لالو پرساد یادو کی راشٹریہ جنتا دل صرف 22 سیٹوں پر ہی سمٹ گئی تھی۔دوسری جانب بی جے پی،بی ایس پی،سی پی آئی،آئی این سی،جے ڈی یو اور ایل جے پی سے لے کر ایس ایس ڈی،ایس ڈبلو جے پی اور وی آئی پی تک کل 90 سیاسی پارٹیوں کے امیدواروں نے اسمبلی انتخابات میں اپنی قسمت آزمائی تھی۔برخلاف اس کے 2005 اسمبلی الیکشن میں جنتا دل یونائٹڈ کو 88 اور بی جے پی

کو 55 سیٹیں حاصل ہوئی تھیں اور اس وقت پہلی مرتبہ بی جے پی اور جے ڈی یو اتحاد والی حکومت ریاست میں تشکیل پائی تھی۔ وہیں لایادو کی راشٹریہ جنتادل کو اس وقت 54 سیٹیں حاصل ہوئی تھیں جو 2010 کے مقابلہ 32 زیادہ تھیں۔ وہیں سیاسی جماعتوں کی بات کی جائے تو 2005 میں کل 58 جماعتیں انتخابات میں حصہ دار تھیں، جو 2010 کے مقابلہ 32 کم تھیں۔ اس سے قبل سن 2000 میں لالویادو کی راشٹریہ جنتا دل کو 124 سیٹیں حاصل ہوئی تھیں اور دیگر کے اتحاد سے حکومت تشکیل پائی تھی۔ کانگریس پارٹی جو ایک زمانے میں 1951 سے لیکر 1972 تک ریاست کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی رہی، اس کا گراف اس وقت پست ہوگیا جب 1977 میں جنتا پارٹی نے 214 سیٹیں حاصل کر ایک نئی تاریخ رقم کی۔ اس کے باوجود 1980 اور 85 میں ایک بار پھر کانگریس کو موقع ملا اور اس نے بالترتیب 169 اور 196 سیٹیں حاصل کیں اور حکومت بنائی۔ وہیں 1990 اور 95 میں جنتا دل کو بالترتیب 122 اور 167 سیٹوں پر کامیابی ملی اور حکومت تشکیل دی۔ ریاست کا یہ وہ مختصر سیاسی پس منظر ہے جس میں مختلف پارٹیاں اور ان کی حکومتیں تشکیل پاتی رہی ہیں۔

فی الوقت بہار میں 82.7% فیصد ہندو، 16.9% فیصد مسلمان، 0.1% فیصد عیسائی اور 0.3% دیگر مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ ریاست میں 85% فیصد آبادی گاؤں میں رہتی ہے تو وہیں 58% فیصد ایسے افراد ہیں جن کی عمر 25 سال سے کم ہے۔ اس لحاظ موجودہ حالات میں نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد ہے جو بہار کا مستقبل طے کرنے

والی ہے۔نوجوانوں کی کثیر تعداد ہونے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ نوجوان جو 1977 میں جنتا پارٹی کی شکل میں تبدیلی کا حصہ بنے تھے ، نہیں ہیں۔اس کے باوجود "تعمیر و ترقی "کے نام پر ایک نئی تاریخ لکھی جانے والی ہے۔دوسری طرف حالیہ دنوں ملک میں آئی تبدیلی،کانگریس پارٹی کی ایک بار پھر سے پورے ملک میں شرمناک ہار، ریاستی سطح پر این ڈے اے کی اتحادی پارٹی کا رشتہ جو کافی عرصہ سے برقرار تھا کا ٹوٹ جانا،جیتن رام مانجھی کو اقتدار سونپنا اور پھر مانجھی کا اندورن خانہ ہی سیند لگانے کی منظم کوششیں، نتیش کمار کا شکتی پردرشن ،اور126اسمبلی ممبران کے ذریعہ ایک بار پھر نتیش کمار کو وزیر اعلیٰ بنایا جانا۔11،جنوری2015ء ریاست میں تشکیل پانے والا ایک نیا اتحاد، جو گزشتہ 20 سال پرانی رنجشوں کے بعد وجود میں آیا یعنی لالو اور نتیش کا ایک پلیٹ فارم پر آنا۔ جنتا پریوار کا شوشہ، سماج وادی پارٹی کے ملائم سنگھ بطور جنتا پریوار کے سربراہ طے پانا۔پریوار کے نام پر کانگریس ،جے ڈی یو، آرجے ڈی ، ایس پی ودیگر کا اتحاد۔الیکشن سے پہلے سیٹوں کی تقسیم،اور تقسیم پر پہلے این سی پی اور پھر جنتا پریوار کے سربراہ کی پارٹی ایس پی کا اظہار ناراضگی واتحاد سے الگ ہونا۔مزید ایس پی کے اپنے امیدوار اتارنے کا اعلان۔اور آگے یہ بھی کہ ملائم سنگھ یادو کو جمہوریت کا سب سے بڑا حامی قرار دیتے ہوئے وزیر اعظم نریندر مودی کی قصیدہ خوانی۔یہ منظر و پس منظر واضح کرتا ہے کہ ریاست بہار میں ہونے والے الیکشن آئندہ دنوں نہ

صرف ملک کی سیاست کا رخ تبدیل کرنے کا ذریعہ بنیں گے بلکہ ریاست اترپردیش کے انتخابات پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ ووٹر سنجیدگی اور سمجھداری سے کام لیں۔ اس پورے پس منظر میں اگر مسلمانوں کی بات کی جائے تو درحقیقت مسلمان ہر پارٹی کے لیے نرم چارہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نہ اُن کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی وہ خود اپنی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں۔ہاں یہ الگ بات ہے کہ 16.9%یعنی 17%فیصد مسلمان نتیجوں کے اعتبار سے نہ صرف حد درجہ اہمیت کے حامل ہیں بلکہ فیصلوں کا رخ تبدیل کرنے میں بھی اہم کردار ادا کریں گے۔اور سابق میں یہ کردار دہلی اسمبلی انتخابات کے دوران وہ ادا بھی کر چکے ہیں۔جہاں صرف 12%فیصد مسلمانوں نے ایک نئی تاریخ رقم کروائی ہے۔اس کے باوجود نہ ان کی بات کی جاتی ہے،نہ ان کی ترقی و خوشحالی پر توجہ دی جاتی ہے اور نہ ہی ان کے مسائل سے کسی کو یارانہ ہے۔ہاں اس بات سے سب واقف ہیں کہ مسلمان اگر کسی کو ووٹ دیں گے تو وہ جمہوری اقدار والی سیاسی جماعتوں ہی کے حق میں ووٹ دیں گے،فرقہ پرست و متشدد افراد اور جماعتوں سے گریز کریں گے۔اس کے باوجود مسلمانوں کی یہ خوبی،آج ان کی ایک بڑی خامی بن کر سامنے آرہی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ کانگریس پارٹی کے م افضل اسدالدین اویسی کے نام کھلا خط لکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے علیحدہ سیاسی پارٹی

بنانے کا فارمولہ مسترد کیا ہے۔ لہذا بحیثیت کانگریسی نہیں، بلکہ ایک مسلمان یہ گزارش ہے
کہ آپ قلیل انتخابی سیاست کو ترک کرکے بہت ہی مثبت انداز میں طویل مدتی سیاست
اور سماجی سرگرمیوں پر دھیان دیں، یہی وقت اور موجودہ حالات کا تقاضہ ہے۔ یہاں م
افضل صاحب کی بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اشتعال انگیزی، دوراندیشی اور مشترکہ
لائحہ عمل سے الگ ہو کر کوئی قدم اٹھانا طویل مدتی نقصان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے
۔اس کے باوجود م افضل صاحب خود بتائیں کہ 1985 تا 90 آپ کی پارٹی اور جنتا دل
بہار میں برسر اقتدار رہے۔ اسی دوران بھاگلپور کے فسادات سامنے آئے، آپ اور آپ
کی پارٹی نے گزشتہ 10 سال جبکہ مرکز میں رہے اور اس سے پہلے بھی جب جب حکومت
واتحاد میں رہے، بھاگلپور فساد انکوائری کے لیے کیا کچھ کیا؟ آپ چاہیں تو جواب بحیثیت
کانگریسی دیں یا بحیثیت مسلمان، لیکن سوال صرف آپ ہی سے نہیں بلکہ ہر ہندوستانی
مسلمان کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ آخر کب تک وہ اقدار پر مبنی سیاسی پارٹی کو وجود میں
نہیں لائیں گے؟ یہاں یہ شبہ ہر گز نہیں رہنا چاہیے کہ اس موقع پر ہم کسی مسلمان سے
اسدالدین اویسی کی پارٹی ایم آئی ایم کو ووٹ دینے کی بات کر رہے ہیں!

! تہذیب و تمدن کی بنیادیں

کسی بھی معاشرہ میں رہنے بسنے والے افراد کا عمل ورد عمل کے پس پشت اس کے عقائد و نظریات اور تصورات کارفرما ہوتے ہیں۔عقائد میں سب سے اہم عقیدہ انسان کا خود اپنا وجود، مقصد حیات، دنیا میں آنے و جانے کا نظریہ،اور موجود وسائل سے ذات کا تعلق ہے۔انہیں عقائد و تصورات کی بناپر تہذیبیں وجود میں آتی ہیں نیزارتقائی مراحل سے گزرتی ہیں۔پھر یہی وہ تصورات بھی ہیں جن پر چل کر ثقافتیں رائج ہوتی ہیں۔دوسری جانب دنیا کا ہر شخص ماورائی تصورات کے ساتھ خدا کے وجود،اس کی کبرائی،اختیارات، شکل و ہیئت اور صفات کا نہ صرف تذکرہ کرتا ہے بلکہ مختلف طریقوں سے وابستگی کا اظہار بھی کرتا ہے۔عام الفاظ میں،خدا سے وابستگی کو عبادت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لہذا اسلام اور اس کی تعلیمات کی روشنی میں اگر عقائد کا تذکرہ کیا جائے تو اول الذکر وحدانیت کا تصور ہے،لا شریک اور ایک خدا کا تصور،جس کے بے شمار ناموں میں اہم ترین نام 'اللہ' ہے۔وہیں مقصد وجود یا مقصد حیات کے تذکرے میں اسلام صرف اور صرف اللہ کی عبادات پر عمل آوری کے جذبے کو ابھارتا ہے۔نیز ہر اس عمل کو اختیار کرنے کے لیے کہتا ہے جس کو اللہ نے اختیار کرنے کے لیے کہا اور ہر اس عمل سے رکنے کے لیے کہتا ہے،جس سے رکنے کی تعلیم اللہ نے دی ہے۔دنیا میں موجود وسائل و ذات کے تعلق

ہے ،اسلام صاف طور پر آگاہ کرتا ہے کہ تمام وسائل، جو انسان کی قدرت اختیار میں ہیں اور جو اب تک نہیں بھی ہیں، سب کے سب اللہ کے فراہم کردہ ہیں۔ لہٰذا وسائل و ذات کا تعلق بس وہی ہے جسے 'حرام و حلال' میں تقسیم کیا جا چکا ہے۔

اللہ تعالٰی نے دنیا میں بے شمار بلکہ لا تعداد چیزیں وسائل کے زمرے میں فراہم کی ہیں۔ان زمرہ جات کو جاندار اور بے جان چیزوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام ہی چیزیں اللہ تعالٰی کی عطا کردہ ہیں۔اور ان کی تخلیق کا مقصد اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ وہ انسان کی ضروریات کی تکمیل میں معاون ثابت ہوں۔یعنی دنیا میں موجود ہر شے ء اللہ کی تخلیق شدہ اور انسان کے استعمال کے لیے بنائی گئی ہے۔ لہٰذا 'خدا' کا تصور اور دنیا میں موجود چیزیں، ایک ہی عقیدہ کے دو جز ہیں۔اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دنیا میں موجود کوئی بھی شے ء خدا یا اس کی صفات سے متصف نہیں ہو سکتی، لہٰذا نہ اس کی پرستش کی جائے گی، نہ ان سے حاجات بیان کی جائیں گی اور نہ ہی انسان سے زیادہ انہیں فوقیت دی جائے گی۔ان کی حیثیت اگر کچھ ہے ،تو اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں، کہ وہ انسان کی ضرویات و مسائل کے حل میں مددگار ثابت ہوں۔ لہٰذا عبادات کا صرف وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا جس میں موجود وسائل دنیا کا عمل دخل نہ ہو۔ باالفاظ دیگر ظاہر و باطن میں عبادات کا صرف وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا، جس میں جاندار و بے جان چیزیں، چھانٹ کر الگ کر دی جائیں، یعنی زمین و آسمان کے

درمیان پائی جانے والی ہر شے، خدائی تصور میں داخل نہیں ہونی چاہیے۔
اسلامی تعلیمات جن کا تذکرہ مختصر طور پر ہم نے کیا ہے، خوب اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اس میں وجود پذیر تہذیب و تمدن کیسا ہوگا۔انسانوں کی انسانوں پر حکمرانی کی حیثیت کیا ہوگی؟ساتھ ہی دنیا میں موجود جاندار و بے جان چیزوں سے ربط و تعلق اور تصورات ،کیا ہوں گے؟اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قائم ہونے والی حکمرانی، میں ہر شخص چاہے وہ حکمراں ہو یا رعایا، عدل و انصاف میں.برابر کے اختیارات حاصل ہوں گے۔برخلاف اس کے رائج الوقت حکمرانی و تہذیبوں کو اسلامی نہیں کہا جاسکتا۔ہماری بات کس حد تک صحیح و غلط ہے؟اس کا فیصلہ اہم واقعہ کے پس منظر میں رونما ہونے والی اس حدیث کی روشنی میں جانچی جا سکتی ہے۔رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اے لوگو! تم سے پہلے کے لوگ اس وجہ سے گمراہ ہو گئے کہ جب ان میں کوئی شریف چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر سزائیں قائم کرتے تھے۔خدا کی قسم! اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے گی تو یقینا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا ہاتھ کاٹ لے گا" (بخاری و مسلم)۔اسی طرح
زنا'جو آج عام ہے، جس سے نہ آج کراہیت محسوس کی جاتی ہے اور نہ ہی اس کو خاندانی' و معاشرتی بگاڑ کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے،کے سلسلے میں اسلام ،دنیا میں بگاڑ، خاندانی انتشار، معاشرتی زوال، فرد و سماج کی حد درجہ

اخلاقی پستی، خدا کے قائم کردہ خونی رشتوں میں دراڑ اور دنیا کے نظام کو درہم برہم کرنے کا سبب سمجھتا ہے۔مزید یہ کہ زنا کو خدائی حدود کی کھلے عام پامالی بتاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں نہ صرف فرد کی تباہی طے شدہ ہے بلکہ خاندان، معاشرہ اور ملک و عالم بھی لازماً انتشار میں مبتلا ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ اس کی سزا بھی ایسی سخت مقرر کی گئی جس کے مشاہدے سے ہر انسان پناہ مانگے، یا بصورت دیگر اللہ کی نظر میں پاکی و طہارت اختیار کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

اسلامی تعلیمات پر قائم معاشرہ کیسا ہوتا ہے؟اس کی دو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔آیئے تہذیب وتمدن کے تصور، نظریہ اور معنی و مفہوم کو بھی سمجھتے چلیں۔تہذیب کے لغوی معنی چھانٹنے، اصلاح کرنے سنوارنے ، درست کرنے، خالص کرنے اور پاکیزہ کرنے کے ہیں۔ اس کا مادہ ہذب ہے۔ عرب بولتے ہیں ہذب (اس کی تہذیب کی یعنی اس کی اصلاح کی۔ اسے درست کیا۔اور سنوارا) ۔اصطلاح میں تہذیب کا لفظ ہر چیز کی درستگی اصلاح پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی ارادہ ونیت کی درستگی اور اصلاح، خیالات وجذبات اور عادات واطوار ، رسم ورواج اور نظام معاشرت، سیاست و تمدن، سیاست ومنزلت، علوم فنون، تجارت وزراعت اور فکر وعمل کی درستگی و اصلاح۔ غرض تہذیب کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔وہیں محمد مار میڈیوک پکھتال کے الفاظ میں: تہذیب سے مراد انسانی دماغ اور دل کی

آراستگی ہے (محمد مارمیڈیوک پکھتال ، خطبات مدراس کا اردو ترجمہ ، تہذیب اسلامی مترجم شیخ عطاء اللہ ایم۔اے)۔تہذیب کی تشریح کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں کہ جب، ایک گروہ انسانی کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور حاجتیں، ان کی غذائیں اور پوشاکیں، ان کی معلومات اور خیالات ،ان کی مسرت کی باتیں اور نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں۔اس لیے.برائی اور اچھائی کے خیالات بھی یکساں ہوجاتے ہیں۔برائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ہوتی ہے۔اور یہی مجموعی خواہش و تبادلہ اُس قوم یا گروہ کی تہذیب ہے(مقالات سرسید از مولانا محمد اسماعیل پانی پتی)۔تہذیب کی ان تعریفوں کے باوجود مختصراً یہاں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ تہذیبیں،ابتدائی مرحلے میں عقائد و نظریات پر استوار ہوتی ہیں،اور بعد میں معاشرتی میل ملاپ سے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی یا تو پستی میں مبتلا ہوتی ہیں یا انہیں عروج حاصل ہوتا ہے۔نیز یہی معاملہ افراد، گروہ و قوموں کے عروج وزوال کا بھی ہے اور اسی پر تمدن کا انحصار ہے ۔تمدن کا مادہ چونکہ مدن ہے، جس کے لغوی معنی جگہ ، بستی اور شہر کے ہیں۔اس لحاظ سے اصطلاحی معنوں میں شخصی اور جماعتی آزادی، اور شخصی و اجتماعی حققوق کے قوانین مراد لیے جاتے ہیں۔جہاں آپس میں مل جل کر رہنے کے وہ قواعد جو اخلاقی و روحانی اصولوں پر مستنبط ہوں اور جن میں اخلاق و فطری خوبیاں اور حقیقی شائستگیاں پائی جاتی ہوں، تمدن کہلاتا ہے۔ساتھ ہی اصلاح میں تمدن سے مراد وہ باتیں ہیں جو

میں شمار ہوتی ہے۔ مثلاً شائستہ ہونا اور بود و باش، یہ سب شہری زندگی Civilization اختیار کرنے اور انہیں اپنانے وغیرہ میں آتا ہے۔ دراصل تمدن ضروریات زندگی کی پیداوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی ضروریات رفتہ رفتہ تمدن کو جنم دیتی ہیں۔

موجودہ حالات میں رائج الوقت تہذیب و تمدن نہ صرف دنیا میں بلکہ وطن عزیز میں بھی ،فرد و اجتماعیت ،ہر دو سطح پر سود مند نہیں ہے۔ نتیجہ میں معاشرہ انتشار میں مبتلا ہے، خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں اور ملک حد درجہ اخلاقی پستیوں میں مبتلا ہو چکا ہے۔ برخلاف اس کے جو کوششیں جاری ہیں اور جن کی بنیاد ہی ماورائی تصورات ہیں پر قائم ہونے والی تہذیب و تمدن اور ثقافت فرد، معاشرہ اور ملک ہر سطح پر حد درجہ، نقصان کا باعث ہے۔ واقعہ کے پس منظر میں لازم ہے کہ آفاقی تعلیمات کی روشنی میں ، جس کا اسلام نہ صرف دعویٰ بلکہ علی الاعلان چیلنج بھی کرتا ہے، پر سنجیدگی سے غور و خوض کیا جانا چاہیے۔ اور یہ غور و خوض کا معاملہ مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو تو امن پسند طریقہ اختیار کرتے ہوئے ،اُن مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا جن کے سبب اسلام کو بدنام تو اسلامی تعلیمات کو مجروح کیا جا رہا ہے۔ اس پس منظر میں مداوا اگر کچھ ہے تو صرف اور صرف افکار و نظریات کو قول و عمل سے صحیح تصورات کے ساتھ پیش کرنے کا ہے، ساتھ ہی معاملات میں اخلاق کے اعلیٰ ترین

مقام پر فائز ہونا ہے۔یہی وقت کی ضرورت اور اسلام ، مسلمان اور خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کو فروغ دینے کا ذریعہ بنے گا۔برخلاف اس کے ہر عمل و ردِّ عمل عام انسانوں کو اسلام و مسلمانوں سے دوریاں قائم کرنے میں معاون ہوگا !

! تشدد، تعصب اور نفرت کی فضا

تشدد کسی بھی سماج کی بقا و استحکام کے لیے حد درجہ نقصان دہ چیز ہے۔اس کے باوجود سماج میں جس تیزی سے گزشتہ چند دہائیوں میں یہ عام ہوا ہے یافروغ دیا جارہا ہے، مستقبل قریب میں ملک و معاشرہ ہر دوو سطح پر انتشار وافتراق میں اضافہ کرے گا۔اس کے باوجود وہ مواقع برقرار ہیں جن کی روشنی میں مسائل کے حل تلاش کیے جاسکیں اور تشدد کے واقعات میں بھی کمی لائی جاسکتی ہے۔لیکن اگر سماج کے سوچنے سمجھنے والے افراد اس جانب توجہ نہیں دیتے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ملک کے دو بڑے طبقات مکمل طور پر دوریاں اختیار کرلیں۔دوری کی ابتدا مذاہب اور ان کے ماننے والوں کی الگ الگ بستیوں کا بسایا جانا ہے تو وہیں انتہا انسانی بنیادوں پر خوشی و غم کے مواقع میں ایک دوسرے سے قطع تعلق ہے۔اوراگرخدانہ خواستہ یہ صورتحال رونما ہوتی ہے تو نہ صرف ملک کی شبیہ خراب ہوگی بلکہ کثرت میں وحدت کے نظریہ کو بھی ٹھیس پہنچے گی۔دوسری طرف اطمینان کی بات یہ ہے کہ تشدد گرچہ بڑھ رہا ہے اس کے باوجود بہت حد تک حالات قابو میں ہیں اور وہ صورتحال ابھی پیدا نہیں ہوئی کہ ایک ہی بستی یا محلے کے افراد مل جل کر نہ رہ سکیں۔وہیں تسلسل کے ساتھ ایسے واقعات بھی رونما ہو رہے ہیں، جن کی بنیاد پر سماج کو تقسیم

کیا جارہا ہے، افواہیں پھیلائی جارہی ہیں، غلط فہمیاں قائم کی جارہی ہیں اور پھوٹ ڈال کر ملک کی بقاو سالمیت کو خطرہ لاحق ہے۔

تشدد کا حالیہ واقعہ ریاست اترپردیش میں گریٹر نوئیڈا سے متصل علاقہ دادری کا ہے۔ جہاں گائے کا گوشت کھانے کے شبہے میں ایک شخص کو مار مار کر ہلاک کیا گیا ساتھ ہی اس کے بیٹے کو بھی شدید زخمی کیا۔ نوئیڈا پولیس کے ترجمان کے مطابق بسراڑا گاؤں میں ایسی افواہ پھیل گئی تھی کہ کچھ لوگ گوشت کھا رہے ہیں۔ جس کے بعد لوگوں کی مشتعل بھیڑ نے 50 سالہ شخص اخلاق احمد کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ حملے میں اخلاق احمد موقع پر ہی ہلاک ہو گئے، جبکہ ان کے 22 سالہ بیٹے کو زخمی حالت میں ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ پولیس نے اس معاملے میں دس افراد کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کیا ہے جن میں سے چھ کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں گائے کے ذبیحے پر پابندی عائد ہے اور یہ ایک حساس مسئلہ ہے۔ ریاست اترپردیش بھی اُن ریاستوں میں سے ایک ہے جہاں گائے کا گوشت کا استعمال ممنوع ہے۔ اطلاعات کے مطابق اخلاق کے اہل خانہ کا کہنا ہے کہ ان کے گھر کے فریج میں بکرے کا گوشت تھا گائے کا نہیں۔ وہیں پولیس نے گوشت کو اپنے قبضے میں لے کر جانچ کے لیے بھیج دیا ہے۔ سینیئر پولیس اہلکار این پی سنگھ نے انگلش اخبار انڈین ایکسپریس کو بتایا ہے کہ علاقے کے بعض لوگوں نے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ اخلاق گائے

ذبح کرنے میں شامل ہوئے اور ان کے گھر میں گوشت رکھا ہوا ہے۔ افواہ کی بنیاد پر حملہ کیا اور اخلاقکو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ وہیں اس کا جوان بیٹا حد درجہ زخمی حالت میں ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ معاملہ اس مقام پر ہوا ہے جو ملک کی راجدھانی دہلی سے محض پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اخلاق کی اٹھارہ سالہ بیٹی ساجدہ نے اخباری نمائندے کو بتایا کہ گاؤں کے تقریباً سو افراد پر مشتمل ایک گروپ پیر کی رات کو ان کے مکان پر پہنچا۔ انھوں نے ہم پر گائے کا گوشت رکھنے کا الزام عائد کیا۔

دروازہ توڑ دیا اور ہمارے والد اور بھائی کو مارنا شروع کر دیا۔ میرے والد کو گھسیٹ کر گھر سے باہر نکال لے گئے اور وہاں اینٹوں سے مارا۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ایک مندر سے ہمارے بیف کھانے کے متعلق اعلان کیا گیا تھا۔ فریج میں مٹن تھا جسے پولیس جانچ کے لیے اٹھا کر لے گئی ہے۔ اطلاعات کے مطابق گاؤں والوں نے گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کیا اور پولیس سے جھڑپیں ہوئیں جس میں کئی گاڑیاں تباہ ہوئی ہیں۔

معاملہ گرچہ حساس ہے، عقیدت اور آستھا کا ہے اس کے باوجود ایک شخص کی موت، اس کے جوان بیٹے کا حد درجہ زخمی ہونا، گھر کے پورے نظام کا درہم برہم ہو جانا۔ متوجہ کرتا ہے کہ ہم سوچیں اور غور کریں کہ ریاست میں قانونی صورتحال کس حد تک کمزور ہو چکی ہے؟ پھر یہ سوال بھی لازماً اٹھنا ہی چاہیے کہ

واقعہ کے پس منظر میں کیونکر عوام یا ان کے ایک گروہ کو یہ حوصلہ ملا کہ شک کی بنیاد پر ایک شہری جو گرچہ ان کے مطابق ملزم تھا،کے بالمقابل قانون اپنے ہاتھ میں لے کر نہ صرف اس پر حملہ کریں ،ماریں پیٹیں،زخمی کریں ، یہاں تک کہ مار ہی ڈالیں؟معاملہ افواہ کا ہ،لیکن اگر مان لیا جائے کہ یہ افواہ نہیں بلکہ سچائی تھی تب بھی کیا عوام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ قانونی چارہ جوئی کی بجائے ملزم یا مجرم کو ہلاک کیا جائے؟ریاستی حکومت نے معاملہ پر کارروائی کرتے ہوئے چند افراد کو گرفتار کیا ہے،معاملہ کی جانچ ہو رہی ہے اور ہلاک کرنے والوں میں دیگر کی تلاش بھی جاری ہے۔اس کے باوجود توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ عوام اس قدر کیونکر مشتعل ہوئے؟اُنہیں کیوں نہ سوجھا کہ قانون اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے؟کیا یہ محض اتفاق تھا کہ عوام اچانک ہی مشتعل ہو گئے یا یہفضا پروان چڑھائی گئی؟اگر یہ فضا منصوبہ بند اور منظم تھی تو اس کی پشت پر کون لوگ ہیں؟کیوں ایسے افراد و گروہ پر ریاستی نظام قابو پانے میں ناکام ہے جو عوام کو منتشر کرتے ہیں،ان کے درمیان دوریاں پیدا کرتے ہیں،محلّہ ، علاقہ ، شہر اور ملک کے حالات کو تشویشناک بناتے ہیں،اور خوف وہراس کا ماحول پروان چڑھا کر امن و امان میں خلل ڈالتے ہیں۔غور کیجیے کیا آج ایسا ماحول نہیں بنتا جا رہا ہے جہاں ایک شخص کو دوسرے پر بھروسہ نہیں،ہر شخص خود کو غیر محفوظ سمجھ رہا ہے،حالات نظم و نسق اور انتظامیہ کے قابو سے باہر ہیں ۔اور یہ معاملہ خصوصاً سماج کے ان کمزور طبقات

یا اقلیتوں کے تعلق سے ہے جن کی بقا و استحکام پر حکومت کو مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مرحوم اخلاق کے واقعہ کا پس منظر یہ بھی ہے کہ آج کل وطن عزیز میں بی جے پی کی اقتدار والی ریاستوں اور میونسپلٹیوں میں گوشت کی فروخت پر پابندی لگانے کی ریس چل رہی ہے۔سب سے پہلے یہ پابندی مہاراشٹر میں لگائی گئی۔ اس کے بعد راجستھان، چھتیس گڑھ، گجرات اور پنجاب کے بعض شہروں میں گوشت پر آٹھ دن کے لیے پابندی لگائی گئی ہے۔اطلاعات یہ بھی ہیں کہ بی جے پی کی اقتدار والی دہلی کی تین میونسپلٹیوں میں مطالبہ کیا جارہا ہے کہ یہاں بھی 17 اکتوبر تک گوشت پر پابندی لگائی جائے۔

دوسری جانب ہندوستان میں گذشتہ چند سالوں سے گوشت خوری کے خلاف ہندو پرست تنظیموں کی مہم میں شدت آئی ہے۔ گوشت کے خلاف مہم میں ایک دبے ہوئے مذہبی اختلاف کا پہلو بھی شامل ہے۔ عموماً سبزی خوری کی حمایت کرنیوالے عناصر اور سیاسی پارٹیاں عام طور پر اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ گوشت خور صرف مسلمان ہیں۔برخلاف اس کے واقع یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کی غالب اکثریت گوشت خور ہےجن میں پچاس کروڑ ہندوٗ بھی شامل ہیں۔وہیں دانشوروں کا کہنا ہے کہ گوشت پر پابندی کا سوال نہ گوشت کا ہے اور نہ ہی مذہب کا۔ یہ سوال دراصل انتخاب کی آزادی اور بنیادی حقوق کا ہے۔ کسی جمہوری ملک میں ریاست کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ شہریوں کے لیے یہ طے کرے کہ کون کیا

کھائے گا۔ کسی کثیرالمذہبی جمہوری ملک میں کسی ایک مذہب کے تصورات کو کسی دوسرے مذہب کے پیروکاروں یا شہریوں پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ جمہوری ملک میں ہر شہری کھانے پینے، مذہب پر عمل کرنے یا نہ کرنے اور اپنے طور طریقے سے رہنے کے لیے آزاد ہے۔ وہیں ڈی این جھا، تاریخ داں اپنے مضمون میں کہتے ہیں کہ ہندو بھی گائے کھاتے تھے۔ لوگوں میں یہ غلط تاثر ہے کہ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی ہیں جو گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ یہ بالکل ہی بے بنیاد خیال ہے کیونکہ اس کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے۔ قدیم ہندوستان کے ویدک ادب میں ایسے کئی شواہد ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں بھی گائے کے گوشت کا استعمال کیا جاتا تھا۔ جب یگیہ (ایک مذہبی تقریب) ہوتی تھی تب بھی گائے کو قربان کیا جاتا تھا۔ اس وقت یہ بھی رواج تھا کہ اگر مہمان آ جائے یا کوئی خاص شخص آ جائے تو اس کے استقبال میں گائے کو ذبحہ کیا جاتا تھا۔ شادی بیاہ کے رسم میں یا پھر گھرباس (نئے گھر میں آباد ہونے کی رسم) کے وقت بھی گائے کا گوشت کھلانے کا رواج عام ہوا کرتا تھا۔ یہ عہد گپت (تقریبا 550- 320 عیسوی) سے پہلے کی بات ہے۔ گائے ذبح کرنے پر کبھی پابندی نہیں رہی ہے لیکن پانچویں صدی سے چھٹی صدی عیسوی کے آس پاس چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے وجود میں آنے اور زمین عطیہ کرنے کا رواج عام ہوا۔ اسی وجہ سے کاشت کاری کے لیے جانوروں کی اہمیت بڑھتی گئی۔ بطور خاص گائے کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد کی مذہبی کتابوں یہ باتیں سامنے آئیں کہ گائے کو ذبحہ کیوں نہیں کرنا

چاہیے۔ رفتہ رفتہ گائے کو نہ مارنا ایک نظریہ بن گیا، برہمنوں کا نظریہ۔ پانچویں اور چھٹی صدی تک دلتوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس وقت برہمن مذہبی اصولوں میں یہ بھی ذکر کرنے لگے کہ جو گائے کا گوشت کھائے گا وہ دلت ہے۔ اسی دوران اسے قابل تعزیر بنایا گیا یعنی جس نے گائے کو ذبح کیا اسے کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ پھر بھی ایسی سزا نہیں تھی کہ گو کشی کرنے والے کی جان لی جائے۔ جیسا کچھ آج لوگ کہہ رہے ہیں اور کر رہے ہیں!

! بہار اسمبلی الیکشن اور ملک کا بکھرتا تانا بانا

فی الوقت وطن عزیز جن حالات سے دوچار ہے اس سے نہ صرف ملک کی اقلیتیں بلکہ حساس دل رکھنے والا ملک کا ہر شہری ایک عجیب طرح کے دکھ درد واضطراب میں مبتلاہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ تمام لوگ جو ایک خاص فکر و نظریہ سے تعلق نہیں رکھتے ساتھ ہی تشدد و نفرت کے فروغ سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے زندگی گزارنے کی خواہش رکھتے ہیں، موجودہ حالات کے پس منظر میں اپنی تکالیف کا اظہار مختلف انداز سے کرنے پر مجبور ہیں۔واقعہ جس کا ہم یہاں تذکرہ رہے ہیں وہ اٹھاسّی سالہ مصنفہ نین تارا سہگل کا ہے جنہیں سنہ 1986 میں باوقار ادبی ایوارڈ ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے نوازا گیا تھا۔موجودہ حالات کے پیش نظر یہ ایوارڈ آج انہوں نے واپس کر دیا ہے۔دوسری جانب ہندی کے معروف شاعر اشوک واجپئی نے بھی اپنا ایوارڈ یہ کہتے ہوئے واپس کردیا ہے کہ حکومت عوام اور قلم کاروں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہو گئی ہے۔دونوں ہی حضرات کا کہنا ہے کہ بی جے پی حکومت ہندو شدت پسندوں کے ذریعہ اقلیتوں اور مصنفوں کونشانہ بنانے سے روکنے میں ناکام ہے۔نین تارا سہگل لکھتی ہیں وزیر اعظم نے دہشت کے اس راج پر خاموشی اختیار کر رکھی ہے، اس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں ان شر پسندوں کو الگ کرنے کی ہمت نہیں ہے جو ان کے نظریات کی حمایت کرتے ہیں۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ

ہندوستان کی تنوع اور بحث و مباحثے کی تہذیب و ثقافت اب مذموم حملے کی زد میں ہے۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی بھانجی نین تارا کہتی ہیں ،جو بھی توہمات پر سوال کرتا ہے، جو بھی ہندو مذہب کی بدصورت اور خطرناک تبدیلیوں کی کسی بھی جہت پر سوال کرتا ہے انھیں الگ تھلگ کر دیا جاتا ہے، ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے یا پھر قتل کر دیا جاتا ہے۔حالات کس رخ پر ہیں؟اور سوچنے سمجھے والے افراد کیا کچھ محسوس کر رہے ہیں ؟نین تارا سہگل اور اشوک واجپئی کے واپس کیے گئے ایوارڈ کے پس منظر میں خوب اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔لہٰذا یہاں کسی بھی طرح کی تفصیلات میں جائے بغیر ان لوگوں کو بھی اس جانب لازماً متوجہ ہونا چاہیے جن کے ذریعہ ایک مصنوعی خوف کا ماحول بنانے کی کوششیں جا رہی ہیں۔ایسے افراد و گروہ اگر ملک یا اہل ملک سے ذرا بھی دلچسپی رکھتے ہیں تو چاہیے کہ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی ملک کی خراب ہوتی شبیہ کو بچانے کی فکر کریں۔اس میں پہلا اقدام نفرت اور خوف کی فضا کے خاتمہ میں مثبت کردار ادا کرنا ہے۔رہی بات اُن کی مخصوص فکر اور نظریہ کی تو وہ بھرپور اُس کی کوشش کریں لیکن ملک کے قانون کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے،امن و امان کو برقرار رکھتے ہوئے ،ساتھ ہی ان جمہوری طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے جن کے ذریعہ سماج تقسیم نہیں ہوتا اور نہ ہی ملک کی فضا مکدر ہوتی ہے۔

معاشرتی انتشار، مخصوص تہذیبی یلغار اور تمدنی خلفشار جیسے حالات میں وطن عزیز کی ریاست بہار میں ہونے والے اسمبلی الیکشن پر نہ صرف سیاسی پارٹیاں سرگرم عمل ہیں بلکہ ملک کے شہری بھی تبدریج پیدا ہوتے حالات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔اس موقع پر جہاں کانگریس پارٹی ایک بار پھر اپنے وجود کو بچانے میں جٹی ہوئی ہے وہیں مہاگٹھ بندھن سے وابستہ پارٹیاں، خصوصیت کے ساتھ سماج وادی پارٹی اپنا راگ الاپتے ہوئے پارٹی کو خصوصاً یادؤں اور مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی میں مثبت کردار ادا کرنے والی پارٹی بتا رہی ہے۔دوسری طرف لالو یادو کی راشٹریہ جنتا دل اور نتیش کمار کی جنتا دل یونائیٹڈ اپنے ہی پرانے ساتھی جیتن رام مانجھی کو مات دینا چاہتے ہیں تو کہیں رام ولاس پاسوان کو،اور یہ دونوں ہی خود کو دلتوں و مہادلتوں کا لیڈر بتا کر،ووٹ تقسیم پالیٹکس پر عمل کرتے ہوئے،بی جے پی کو ہر ممکن فائدہ پہنچانے میں مصروف عمل ہیں۔لیکن آر جے ڈی اور جے ڈی یو کی اصل سر دردی بی جے پی کی جانب سے چہرے کے طور پر پیش کیا جانے والا ملک کے وزیر اعظم نریندر مودی کا چہرا ہے اور ان کی مخصوص انداز میں کی جانے والی تقاریر۔ان تقاریر میں نہ صرف ریاست کو ترقی و خوشحالی کی بلندیوں تک پہنچانے کے وعدے ہیں بلکہ ریاست کی تصویر ہی تبدیل کرنے کی بات کی جا رہی ہے۔ایک بار پھر بہار کے اچھے دن لانے کا ارادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ بڑے سے بڑے واقعات پر وزیر اعظم آج کل من کی بات نہیں کر رہے ہیں۔اس کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ مودی کے وعدوں سے عوام بے خبر ہیں، یہ

وعدے بڑے زور و شور سے بڑے دعوں کے ساتھ پارلیمنٹری الیکشن کے دوران بھی کیے گئے تھے، جن میں سب سے بڑا وعدہ کالے دھن کو واپس لانے کا تھا، مہنگائی کے خاتمہ کا تھا، غربت کے ازالہ اور ملک کو ترقی و خوشحالی کی بلندیوں تک پہنچانے کا تھا۔لیکن جیسے ہی بی جے پی یا این ڈی اے کی حکومت تشکیل پائی، وہ تمام وعدے بھلا دیے گئے جو کبھی کیے گئے تھے۔اور کہا یہ گیا کہ یہ تو "جملہ" تھا۔کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے جملے عوام کو یاد نہیں؟خوب اچھی طرح یاد ہیں۔اور اسی حافظہ کے نتیجہ میں جب عوام ان وعدوں کو یاد دلاتی ہے تو عموماً تو جواب ہی نہیں دیا جاتا اور اگر کبھی کچھ جواب دیا بھی جاتا ہے تو بس یہ کہ ذرا اور انتظار کریں، وقت آنے پر تمام وعدے پورے کیے جائیں گے!

وہیں ایک ملک و معاشرہ کی ایک تصویر یہ بھی کہ بیرون ملک رہنے والے افراد ہوں یا وطن عزیز میں رہنے والے، ان دو سطحوں پر ایک بڑی تعداد ایسی پائی جاتی ہے جو ملک کے معاشرتی تانے بانے سے یا تو پوری طرح واقف نہیں یا پھر واقفیت رکھنے کے باوجود اظہار سے گریز کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں، مخصوص افراد اور ناواقف حضرات کبھی شعوری تو کبھی لاشعوری طور پر یہ باور کرانے میں جٹے ہوئے ہیں کہ ملک میں آنے والی ہر تبدیلی کا منفی اثر صرف مسلمانوں پر پڑتا ہے یا پڑے گا۔منفی فضا جو تیار کی جارہی ہے، کے نتیجہ میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو درحقیقت حالات سے واقف نہیں، ڈر اور

خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ایسی صورت میں یا تو یہ افراد و گروہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں یا پھر اپنی شناخت کو اہل اقتدار کی منشا کے مطابق ڈھالنے میں مجبور ہوتے ہیں۔پھر یہ کوششیں کبھی انفرادی تو کبھی اجتماعی سامنے بھی آ رہی ہیں۔اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھایا جا رہا ہے وہیں سماج کے کمزور ترین طبقہ پر بھی کچھ کم ستم نہیں ڈھایا جا رہا ہے۔ سچر کمیٹی رپورٹ کی روشنی میں تو دلت مسلمانوں سے بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ دلتوں پر آج تک، حد درجہ ظلم و ستم اور زیادتیاں جاری ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بہوجن سماج وادی پارٹی کی سپریمو مایاوتی کہتی ہیں کہ جس طریقے سے ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانے کی سازش کی جا رہی ہے اس سے دلتوں، قبائیلوں اور دیگر پسماندہ طبقات کے لوگوں کے مفاد محفوظ نہیں رہ پائیں گے۔وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ ہندو مذہب میں چار حروف ہوتے ہیں جس میں شودر صرف غلامی کرتا تھا، دلت اور پچھڑے شودر کہلاتے تھے۔ملک اگر ہندو راشٹر بنا تو یہ دلت پھر سے غلام بنا دیے جائیں گے۔لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ہندو راشٹر بننے سے قبل ہی دلتوں پر ظلم و زیادتیاں جاری نہیں ہیں؟کیا ابھی چند پہلے انسانیت کو بے انتہا شرم سار کرنے والا دنکور، نوئیڈا کا واقعہ نہیں بتاتا کہ غلاموں جیسے معاملات آج بھی جاری ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ ہندو سماج اندرونی طور پر خود بری طرح خلفشار کا شکار ہے۔اس کے باوجود ہندتو کے علمبردار سمجھتے ہیں کہ لفظ "ہندو" کا اطلاق تمام ہندوستانیوں پر

کرنے سے اپنا الو سیدھا کرلیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے، جتنا کہ وہ سمجھ رہے ہیں یا جتنا کہ گزشتہ چند ماہ سے مخصوص فکر کے حاملین کے منفی پروپیگنڈے میں حوصلے بلند ہوتے نظر آرہے ہیں۔

صورتحال کے پیش نظر جہاں مسلمانوں کو ہر قسم کے خوف وہراس سے پوری طرح باہر نکل آنا چاہیے وہیں اُنہیں یہ بھی چاہیے کہ وہ اندرونی انتشار واختلاف سے حتی المکان گریز کریں۔انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ اختلاف ہو، اس کے باوجود اختلاف میں اتحاد کی راہیں تلاش کی جائیں،ایک دوسرے کے اچھے کاموں کی تعریف وتوصیف ہو،افراد جماعتوں اورانجمنوں کے مثبت اقدامات کی حوصلہ افزائی ہو۔ساتھ ہی کامن ایجنڈے کے تحت برادران وطن کے ساتھ مل کر امن وامان کا ماحول پروان چڑھائیں، کدورت کی فضا کے خاتمہ کے لیے منظم اور منصوبہ بند سعی و جہد کی جائے،اپنے آس پڑوس اور شناسائیوں کے ساتھ خاندانی روابط قائم کیے جائیں، خوشی و غم کے مواقع مل بانٹ کر گزارے جائیں،اور سب سے بڑا کام جو مسلمانوں کی اہم ترین ذمہ داریوں میں سے ہے وہ یہ کہ ہر شخص کو دنیا وآخرت کی ابدی کامیابی سے واقفیت بہم پہنچائی جائے۔وحدانیت کا حقیقی درس عملی زندگیوں سے دیا جائے، ساتھ ہی رسول وآخرت کے تصور کو پوری طرح واضح کیا جائے، یہاں تک کہ متعلقہ فرد کی ہر غلط فہمی واشکال دور ہو ساتھ ہی اسلامی عقائد اُس پر پوری طرح واضح ہو جائیں۔مزید یہ کہ سماجی ، معاشی ، معاشرتی اور

سیاسی و تہذیبی منفی یلغار، جو جاری ہے، سے نجات کے لیے ہر مقام پر کامن پلیٹ فارم تشکیل دیے جائیں۔ نیز ووٹ کی اہمیت کو بہ خوبی سمجھتے ہوئے ریاست بہار میں ہونے والے اسمبلی انتخابات میں مثبت تبدیلیوں کے پیش نظر، ہر سطح پر منظم سعی و جہد کی جائے۔ اور آخر میں بات بھی یاد رکھی جائے کہ مومن فرد واحد ہو یا کوئی گروہ یا بحیثیت قوم، اگر درحقیقت وہ مومن ہے تو ہر موقع پر اللہ اس کے ساتھ ہے۔ اور جس کے ساتھ اللہ ہو، اُسے کس بات کا غم!

! ام الخبائث اور اس کے اثرات

کسی بھی ملک کے حالات کو سمجھنا چاہیں تو دیکھنا چاہیے کہ وہاں نظم و نسق کی صورتحال کیا ہے، خواتین جو معاشرہ کا کمزوروں ترین حصہ ہیں وہ کن حالات سے دوچار ہیں، افراد و گروہ کن بنیادوں پر تقسیم ہیں، اخلاقی اعتبار سے معاشرہ کس معیار پر ہے، وغیرہ۔ صورتحال کا جائزہ اہل علم کے لیے اگر باعث سکون ہو تو اس بہتر کوئی اور بات نہیں ہو سکتی لیکن اگر حالات تشویشناک ہوں تو پھر منظم و منصوبہ بند مثبت تبدیلیوں کے لیے سرگرم عمل ہونا چاہیے۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ فکری و نظریاتی اور تہذیبی و تمدنی اختلافات کی بنیادیں ایک ہی صورتحال کو کبھی مثبت تو کبھی منفی بنا کر سامنے لاتی ہیں۔ اس کے باوجود خالق حقیقی نے انسان کی فطرت میں اچھائی اور برائی وضاحت خوب اچھی طرح کر دی ہے۔

فی الوقت جس خبر سے ہم بات کا آغاز کیا چاہتے ہیں وہ سپریم کورٹ آف انڈیا کا وہ فیصلہ ہے جس میں ریاست مہاراشٹرا کے دارالحکومت ممبئی میں شراب والی رقص گاہوں پر عائد پابندی کو ہٹایا جانا ہے۔ سنہ دو ہزار پانچ میں ریاستی حکومت نے ان رقص گاہوں پر یہ کہہ کر پابندی عائد کی تھی کہ یہ رقص گاہیں جرائم اور جسم فروشی کے اڈے ہیں ساتھ ہی نوجوانوں میں بے راہ روی کا سبب۔ لیکن

چونکہ یہ رقص گاہیں باضابطہ مال و دولت کے حصول کا ذریعہ بنی ہوئیں ہیں لہٰذا متاثرہ مالکان و رقاصاؤں نے پابندی کی شدید مذمت کی۔آپ جانتے ہیں کہ ان ڈانس بارز میں رقاصائیں گانوں پر رقص کرتی ہیں تو وہیں شائقین بے تحاشہ دولت لٹاتے ہیں۔پابندی لگنے سے پہلے لگ بھگ چودہ سو رقص گاہوں سے ایک لاکھ عورتوں کا روزگار " وابستہ تھا۔ریاستی حکومت کی جانب سے اس پابندی کو اپریل دو ہزار چھ میں " ممبئی میں ہائی کورٹ نے کالعدم قرار دے دیا تھا تاہم ریاستی حکومت کی جانب سے عدالتِ عظمٰی میں اپیل کی گئی۔ سپریم کورٹ نے حکم دیا تھا کہ فیصلہ آنے تک یہ رقص گاہیں بند رہیں گی۔لیکن پندرہ اکتوبر سنہ دوہزار پندرہ سپریم کورٹ آف انڈیا نے ریاست مہاراشٹر میں ڈانس بارز یعنی رقص گاہوں پر لگی پابندی کو ختم کر دیا اور اس طرح ممبئی میں بند پڑے بہت سے ڈانس بارز دوبارہ کھل گئے۔آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ مہاراشٹر کی سابقہ کانگریس اور این سی پی کی حکومت نے رقص گاہوں پر پابندی عائد کرکے انہیں بند کروایا تھا۔دوسری جانب رقص گاہوں کے مالکان نے عدالت کے اس فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ ممبئی ڈانس بار ایسوسی ایشن کے ترجمان منجیت سنگھ نے بی بی سی سے بات چیت میں کہا 'ہم اسے ایک بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ ممبئی سے نائٹ لائف ایک طریقے سے ختم ہو گئی تھی اور جو خواتین رقاصائیں تھیں وہ گھر چلانے کے لیے جسم فروشی کرنے پر مجبور ہو گئیں تھیں۔ ہماری " تجارت " بھی اب اچھی طرح سے چل سکے گی لہٰذا ہم اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

وہیں حقیقت یہ ہے کہ شراب و منشیات کے اس کھلے بازار میں عصمتیں نیلام ہوتی ہیں،اخلاقی زوال کی بدترین مثالیں قائم کی جاتی ہیں، نتیجہ میں نہ صرف ملک کا مستقبل نوجوان طبقہ ہلاکت میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ خاندان اور معاشرہ بھی تباہیوں کے دہانے پر، پہنچ جاتا ہے۔دوسری جانب منشیات اور اس کو استعمال کرنے والے افراد کے ذریعہ نہ صرف معاشی مسائل پیدا ہوتے ہیں بلکہ صحت عامہ کے بھی بے شمار مسائل یہیں سے پنپتے ہیں۔ساتھ ہی جرائم کے فروغ اور اضافہ میں بھی متاثرہ افراد پیش پیش رہتے ہیں۔ہندوستان میں اس وقت ریاست پنجاب کے شہریوں کی بڑی تعداد اس لعنت میں مبتلا ہے۔75% فیصد نوجوان منشیات کے شکار ہیں وہیں عام شہری بھی بلا تخصیص مرد و خواتین ملوث ہیں۔ ممبئی، حیدرآباد اور دیگر بڑے شہر اس کی لپیٹ میں ہیں۔ہندوستان کے مسلمانوں کی 18%آبادی اگر الگ کر دی جائے تو 75% فیصد گھروں میں شراب عام طور پر استعمال کی جاتی ہے ساتھ ہی اسے کوئی برائی بھی نہیں سمجھا جاتا۔ریاستی و مرکزی حکومتیں منشیات میں مبتلا افراد کو چھٹکارا دلانے کے لیے بے شمار rehab چلانے میں مصروف ہے۔ملک کی راجدھانی دہلی میں ہی اس طرح کے سینٹر centres س کی تعداد تقریباً500 ہے وہیں دیگر این جی اوز و ادارے بھی اس کام میں مصروف عمل ہیں۔اس کے باوجود سچائی یہ بھی ہے کہ حکومت شراب کے ٹھیکوں کو لائسنس دیتی ہے، سستے داموں میں منشیات کھلے عام ہر مقام پر دستیاب ہے اور معاملہ مضحکہ

خیز اس وقت بن جاتا ہے جبکہ ملک کا سپریم کورٹ شراب و رقص گاہوں کو چلانے کی اجازت دیتا ہے۔ان حالات میں ملک کے ہر شہری، بااختیار افراد اور حکومت و عدلیہ کو سوچنا چاہیے کہ شراب و منشیات اور اس کے نتیجہ میں ملک و معاشرہ جس درجہ خسران میں مبتلا ہے، حالات کے تناظر میں بڑی ہی نہیں متعلقہ ہر چھوٹی برائی کو بھی ختم نہیں کیا جانا چاہیے۔جہاں معاملہ یہ ہو کہ ملک کا مستقبل، نوجوان طبقہ شراب و منشیات میں حد درجہ مبتلا ہو، اخلاقی زوال کے بے شمار واقعات ہر صبح سننے کو ملتے ہوں، معاشرتی بگاڑ اور خاندانی نظام تباہ و برباد ہو رہا ہو، ملک کی دولت کا ایک بڑا حصہ مسائل کے حل میں صرف کیا جا رہا ہو۔اس کے باوجود اگر حالات قابو سے باہر ہوں اور اضافہ ہی ہوا جا رہا ہو، تو پھر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ان حالات میں ہمارا طرز عمل، فکر و نظریہ اور قوانین لازماً تبدیل ہونے چاہیں؟اور نہ صرف قوانین میں بتدیلی لائی جائے بلکہ عمل در آمد کے ٹھوس اقدامات بھی کیے جائیں۔اس کے برخلاف واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف مغربی تہذیب بلکہ ہندوستانی تہذیب جسے باالفاظ دیگر ہندو تہذیب بھی کہا جا سکتا ہے، میں اس تعلق سے سنجیدگی نہیں پائی جاتی۔اور چونکہ ان کے بڑے اور ان کے چھوٹے سب ہی اس برائی میں ملوث ہیں لہذا عوام جو عموماً تقلید پسند ہوتی ہے اُس میں بھی اِس تعلق سے کراہیت نہیں پائی جاتی۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کی ایک بڑی آبادی مسلمانوں پر منحصر ہے۔یہ

وہ لوگ ہیں جو تعلیماتِ خداوندی کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو سنوانے کی سعی و جہد کرتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی وہ افراد و خاندان جو اسلامی تعلمیات سے ناآشنا ہیں یا ہندو تہذیب کا جن پر غلبہ ہے شراب و منشیات سے گریز نہیں کرتے۔ نتیجہ میں وہ برائیاں یہاں گرچہ اس درجہ میں نہیں اس کے باوجود قابل قدر تعداد اس جانب متاثر ہوتی نظر آرہی ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کا نوجوان طبقہ اور ان میں بھی وہ افراد جن کے گھروں میں اسلامی تعلمیات کے چرچے نہیں ہوتے۔ اس پس منظر میں مسلمانوں کو کسی خام خیالی میں نہیں رہنا چاہیے کہ وہ یا ان کی نوجوان نسل اِس برائی سے طویل مدت میں اپنی شناخت برقرار رکھ سکے گی۔ کیونکہ وبائی بیماریاں جب پھیلتی ہیں تو پھر چہار جانب اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں الہ یہ کہ اس سے بچنے کی مخصوص اور منظم کوششیں پورے شعور کے ساتھ کی جائیں۔ شعور کی ابتداوہ قرآنی ہدایات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: پوچھتے ہیں : شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے ؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ گرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں ، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے (البقرہ: ۲۱۹)۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان

چیزوں سے باز رہوگے ؟اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات مانو اور باز آ جاؤ، لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسولؐ پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی (المائدہ:۹۱-۹۰)۔وہیں اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ لاتی ہو،اس چیز کی کم مقدار بھی حرام ہے (مسند احمد) ۔احکامات خداوندی کی روشنی میں فکر و عمل کی تصحیح ہمارے اختیار میں ہے۔ عمل کے نتیجہ میں ہم اور آپ نہ صرف اللہ کی رضا و خوشنودی اور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوں گے بلکہ عمل ہی کے نتیجہ میں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و تشہیر بھی خود بہ خود ہو جائے گی۔ نیز ملک وملت اور معاشرہ کی صورتحال میں بھی مثبت تبدیلی سامنے آ سکتی ہے۔لہذا لازم ہے کہ اسلامی تعلیمات کو بھرپور انداز میں نہ صرف عام شہریوں تک پہنچایا جائے بلکہ پالیسی ساز اداروں میں اس تعلق سے گفتگو ہونی چاہیے۔ کوششوں کے نتیجہ میں ممکن ہے اہل علم اور باشعور انسان .برائیوں سے نجات پائیں اور ملک کے بے شمار وسائل وصلاحیتیں اور مال و دولت کا صحیح استعمال کیا جا سکے۔ ساتھ ہی ایسے تمام افراد کا ہر ممکن تعاون کیا جانا چاہیے جو ملک وملت کو اس لعنت سے نجات دلانے کے لیے سرگرم عمل ہیں اور جن کے مقاصد و جذبات اخلاص پر مبنی ہیں!

مسائل میں اضافہ ! لاعلمی، بے حوصلگی وپست ہمتی

ہر آزاد جمہوریہ ملک میں شہریوں کو کچھ ایسے حقوق حاصل ہوتے ہیں جن سے ان کو محروم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حقوق شہریوں کے لیے اتنے ضروری ہوتے ہیں کہ ان کے بغیر وہ اپنی شخصیت کی تعمیر نہیں کر سکتے۔ ہمارے ملک کے دستور میں شہریوں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی رو سے ہر شہری خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی قانون کی نگاہ میں برابر ہے۔ مذہب، ذات پات، جنس، رنگ یا جائے پیدائش کی بنا پر کسی کے خلاف کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شہری کو آزادیٔ خیال اور آزادیٔ مذہب حاصل ہے۔ ساتھی ہی ہر شہری کو سرکاری ملازمتیں نیز بڑے سے بڑا عہدہ بلاامتیاز وتفریق حاصل کرنے کا حق ہے۔ دستور نے صدیوں سے چلے آرہے چھوت چھات کے رواج کو جرم قرار دیا ہے۔ اور اقلیتوں کو مذہبی وتمدنی آزادی دی ہے۔ انہیں اس بات کا بھی حق دیا ہے کہ وہ اپنے علیحدہ اسکول اور تعلیمی ادارے قائم کریں۔ اپنی تہذیب یا تمدن، زبان اور رسم الخط (script) کو قائم وبرقرار رکھیں اورانہیں ترقی دیں۔ ساتھ ہی مخصوص مذہب کی تبلیغ اور مذہبی مراسم ادا کرسکیں۔ دستورہندنے ہندوستانی عوام کو سرچشمہ اقتدار مانا ہے۔اس کو صاف اور کھلے

ہوئے لفظوں میں دستور کی تمہید میں بیان کیا گیا ہے۔ دستور نے ہندوستان کو ایک
مانا (Sovereign Democratic Republic) بااقتدار، خود مختار عوامی جمہوریہ
ہے۔ نیز بلا تفریق و امتیاز، مذہب و ملت، جنس و رنگ اور ذات پات ہر بالغ ہندوستانی
کو حکومت کی تشکیل میں ووٹ کا حق دیا ہے۔اِنہیں ووٹوں سے مرکز اور ریاستوں میں
حکومتیں قائم ہوتی ہیں۔ دستور کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ملک میں غیر
مذہبی جمہوریت قائم کی ہے۔یعنی اسٹیٹ کا کوئی مذہب نہیں ہے اور ہر مذہب کو یکساں
حیثیت حاصل ہے۔ دوسرے ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ کسی بھی مذہب کے
ماننے والے ہوں ایک مشترک شہریت میں منسلک کر دیئے گئے ہیں۔ ہر ہندوستانی شہری
کو اسٹیٹ سے متمتع اور اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق ہے۔ مذہب یا ذات پات یا کسی
خاص علاقہ یا ریاست میں پیدا ہونے کی بنا پر کسی ہندوستانی کو شہریت کے کسی حق سے
محروم نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کے ساتھ کسی قسم کی تفریق کی جا سکتی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، یعنی حق مساوات تمام شہریوں کو
برابر سے ملا ہے۔ دفعہ ۱۴ کہتی ہے: مملکت کسی شخص کو ہندوستان کے علاقہ میں
قانون کی نظر میں مساوات یا قوانین کے مساویانہ تحفظ سے محروم نہیں کرے گی۔ ساتھ
ہی اس بات کا بھی خوب اچھی طرح تذکرہ کیا گیا ہے کہ مذہب، نسل، ذات یا جنس یا
مقام پیدائش کی بنا پر امتیاز نہیں کیا جائے گا، یعنی اس

کی مکمل ممانعت ہے۔وہیں دفعہ:۱۵میں بتایا گیا ہے (۱) مملکت محض مذہب، نسل، ذات، جنس یا مقام پیدائش یا ان میں سے کسی کی بنا پر کسی شہری کے خلاف امتیاز نہیں برتے گی۔ (۲) کوئی شہری محض مذہب۔ نسل۔ ذات۔ جنس۔ مقام پیدائش یا ان میں سے کسی کی بنا پر۔۔۔ (الف) دکانوں۔ عام ریستوران۔ ہوٹلوں یا عام تفریح گاہوں میں داخلہ کے لیے ،یا (ب) کلی یا جزوی طور سے مملکتی فنڈ سے قائم یا خلایق عامہ کے استعمال کے لیے کنووں،تالابوں،اشنان گھاٹوں، سڑکوں اور عام آمدورفت کے مقامات کے استعمال کے نا قابل نہ ہوگا یا اس پر کوئی ذمہ داری یا پابندی یا شرط نہ ہوگی۔ساتھ ہی (۳) اس آئین میں کوئی امر اس میں مانع نہ ہوگا کہ مملکت عورتوں اور بچوں کے لیے کوئی خاص توضیع کرے۔

ہندوستان کے آئین میں شہریوں کے لیے حق آزادی کا بھی بہت تفصیل سے تذکرہ ہے۔دفعہ:۱۹۔ (۱) کی روشنی میں ، تمام شہریوں کو حق حاصل ہے: (الف) آزادیٔ تقریر وآزادیٔ اظہارکا؛ (ب) امن پسندانہ طریقہ سے اور بغیر ہتھیاروں کے جمع ہونے کا؛ (ج) انجمنیں یا یونین قائم کرنے کا؛ (د) ہندوستان کے سارے علاقہ میں آزادانہ نقل وحرکت کرنے کا؛ (ہ) ہندوستان کے علاقہ کے کسی حصہ میں بود و باش کرنے اور بس جانے کا، اور (ز) کسی بھی پیشہ کے اختیار کرنے یا کسی کام کاج ، تجارت یا کاروبار کے چلانے کا۔آئین میں حق آزادی کے الف تاز حقوق کی تشریحات بھی کی گئی ہیں، جن کی روشنی میں کوئی بھی شہری اِن حقوق کو حاصلکر

سکتا ہے۔ دفعہ ۱۹ اکے ذیلی فقرہ (الف) کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کوئی امر کسی موجودہ قانون کے نفاذ کو متاثر نہ کرے گا۔ نہ مملکت کے کسی قانون کے بنانے میں مانع ہوگا جس حد تک ایسا قانون مذکورہ ذیلی فقرہ کے عطا کیے ہوئے حق کے استعمال پر ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ اور سالمیت۔ مملکت کی سلامتی۔ غیر مملکتوں سے دوستانہ تعلقات۔ امن عامہ، شائستگی یا اخلاق عامہ کی اغراض کے لیے یا توہین عدالت، ازالہ حیثیت عرفی یا کسی جرم کے لیے اکسانے کے تعلق سے معقول پابندیاں عائد کرے۔ وہیں مذکورہ فقرہ کے ذیلی فقرہ (ب) میں کوئی امر کسی موجودہ قانون کے نفاذ کو متاثر نہ کرے گا نہ وہ مملکت کے کسی قانون بنانے میں مانع ہوگا۔ جس حد تک وہ ذیلی فقرہ مذکور کے عطا کیے ہوئے حق کے استعمال پر ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ اور سالمیت یا امن عامہ کی اغراض کے لیے معقول پابندیاں عائد کرے۔۔۔۔۔ وغیرہ۔

مذکورہ بالا گفتگو سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ہندوستان میں قانونی اعتبار سے شہریوں کو بے شمار تحفظات حاصل ہیں۔ اس کے باوجود ملک میں اقلیتوں اور کمزور طبقات کے ساتھ جس طرح جارحانہ معاملات ایک کے بعد ایک سامنے آرہے ہیں وہ حد درجہ تشویشناک ہیں۔ گزشتہ دنوں ملک میں شہری کیا کھائیں اور کیا نہیں، اس کو لے کر جھوٹ پر مبنی ایک افسوس ناک واقعہ سامنے آیا۔ جس کے بعد ملک کے ایک بڑے طبقے نے متشدد افراد کے خلاف کاروائی کی مانگ کی۔ لیکن افسوس

کہ یہ واقعہ و کاروائی جاری ہی تھی کہ ہریانہ کے فرید آباد علاقہ میں دلت کنبہ کو زندہ جلانے ڈالنے کا معاملہ سامنے آگیا۔ یہاں بھی عوام نے افسوس ظاہر کیا، مظاہرے کیے اور مجرمین کو سزا دلوانے کی مانگ کی۔ لیکن انسانیت بری طرح تب شرمسار ہوئی جبکہ واقعہ سے متعلق الیکٹرانک میڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے مرکزی وزیر وی ۔کے۔ سنگھ نے کہا کہ، کوئی کتے پر پتھر پھینک دے تو سرکار کیا کرے؟ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے سابق مرکزی وزیر اور کانگریس کے سینئر لیڈر منیش تیواری نے سنگھ کی طرف سے کتے کا لفظ استعمال کرنے کو بیہودہ اور نفرت آمیز بتایا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ زندہ جلادیئے گئے دو بچوں کی موت کا موازنہ ایک کتے کو پتھر مارے جانے سے کرنا،اس سے زیادہ بیہودہ اور نفرت آمیز اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ حکومت کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے ۔ نیز مودی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دو سال قبل ہندوستان کے موجودہ وزیر اعظم نے بھی رائٹرس کو دیئے گئے انٹرویو میں ایسے ہی الفاظ استعمال کیے تھے۔ تب انھوں نے کہا تھا کہ اگر کوئی کتے کا پلا بھی گاڑی کے پہیہ کے نیچے آجاتا ہے تو اس کے لیے بھی حساس ہونے کی ضرورت ہے۔ ان کا یہ تبصرہ گجرات کے 2002 مسلم کش فسادات کے تناظر میں تھا۔ منیش تیواری کی گفتگو کے پس منظر میں یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کا ایک بڑا طبقہ اقلیتوں اور سماج کے کمزور طبقات کے تعلق سے کیا نظریہ رکھتی ہے۔ ایک جانب حد درجہ نفرت کا فروغ ہے تو دوسری جانب منووادی نظام کا اثر ہے، جو دماغوں

میں رچ بس چکا ہے۔لہٰذا مرکزی وزیر داخلہ، راج ناتھ سنگھ کو بھی سوچنا چاہیے کہ جو نفرت پیدا کی جا چکی ہے،اور جو نظام ایک بار پھر قائم کیے جانے کی سعی و جہد ہے،اس میں موجود خرابیوں کو صرف ڈانٹنے ڈپٹنے اور اظہار ناراضگی سے حل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ہاں یہ ممکن ہے کہ بیانات دیتے وقت ذرا احتیاط برت لی جائے۔وہیں یہ بھی حقیقت ہے فکرو نظریہ انسان کے عمل میں لازماً جھلکتا ہے،اس کے باوجود کہ وہ کتنی ہی احتیاط برتے،اور اسے کتنی ہی نصیحتیں کیوں نہ کی جائیں!

حالات کے پس منظر میں جہاں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعصب سے پاک نظام فراہم کرے وہیں ہمارے، آپ کے اور عام شہریوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ دستور میں موجود دفعات کو سمجھیں اور آئینی طریقہ سے مسائل کے حل کی منظم سعی و جہد کریں۔اس پہلو سے دو کام بہت اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ایک)فرد واحد کی واقفیت ۔دو) متاثرہ یا غیر متاثرہ باشندگان ملک کے مقامی سطح پر قانونی رہنمائی کے پلیٹ فارم کا قیام۔حقیقت یہ ہے کہ قانونی اعتبار سے آئین میں بہت حد تک مسائل سے نمٹنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اس کے باوجود لاعلمی، بے حوصلگی اور پست ہمتی مسائل میں اضافہ کا سبب بنتے جارہے ہیں!

! بہار اسمبلی الیکشن : دعوے، خواہشات ونتائج

9،ستمبر 2015 الیکشن کمیشن آف انڈیا نے بہار میں ہونے والے اسمبلی الیکشن کا اعلان کیا ہی تھا کہ ملک و بیرون ملک رہنے والے شہریوں کی نظریں بہار پر مرکوز ہو گئیں۔پانچ مرحلوں میں ہونے والے اسمبلی الیکشن کی تاریخیں جو سامنے آئیں یعنی ۲۸،۱۶،۱۲اکتوبر،اوریکم و۵ نومبر تو سب سے پہلے آر جے ڈی اور جے ڈی یو جو مہاگٹھ بندھن کے بڑے چہرے تھے، پانچ مرحلوں میں الیکشن پر نکتہ چینی کی اور کہا کہ اس طرح ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں جاتے ہوئے،ووٹرس فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں لہٰذا یہ کم ہونے چاہیں۔وہیں دوسری جانب وہ بی جے پی اور اس کے حلیف نے خاموشی اختیار کی ۔مہاگٹھ بندھن میں 100-100-43 سیٹیں تقسیم ہوئیں تو اور پر جوش اور بلند حوصلوں کے ساتھ سرگرمیاں بھی جاری ہو گئیں۔دوران مہم بی جے پی اور اس کی مددگار آرایس ایس نے بھرپور جدوجہد کی۔دھواں دھار مقرر اور ملک کے وزیر اعظم نریندر مودی کی 51 ریلیاں طے ہوئیں تو وہیں دوسری جانب صرف چھ دنوں میں مودی نے 17 ریلیوں سے خطاب کیا۔بی جے پی کے صدر امت شاہ نے مستعدی سے بہار کو ہی اپنا گھر بنا لیا اور دوران مہم وہ پوری طرح بہار الیکشن پر توجہ دیتے ہوئے سرگرم رہے۔یہاں یہ بات کہنے کی نہیں کہ بی جے پی یا ان کے ہمدردان نے بے شمار دولت صرف کی،ریاست کے تمام

ہی اخبارات میں پہلے صفحہ پر اشتہارات دیئے گئے، خصوصاً اردو کے اخبارات بی جے پی کے اشتہاروں سے بھرے رہے۔اور وہ سب کچھ ہوا جو ممکن تھا۔

پانچ نومبر کو آخری مرحلے کا الیکشن مکمل ہوتے ہی ایگزٹ پول کا مرحلہ شروع ہو گیا۔زیادہ تر پول کمپنیوں نے مہاگٹھ بندھن کو نتائج کے اعتبار سے آگے دکھایا۔دوسری جانب چانکیہ ایگزٹ پول نے بی جے پی اور ان کے حلیف کے حوصلہ بلند کیے اور155 سیٹوں پر بی جے پی اور ان کے ساتھیوں کے آگے دکھا کر سیکولر پارٹیوں کے جوش کو کچھ کم کر دیا۔وہیں جب 8 نومبر کی صبح ہوئی اور الیکٹرانک میڈیا نے رجحانات کو بتانا شروع کیا تو پہلے ہی مرحلے میں مہاگٹھ بندھن کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔صبح گیارہ بجے تک تقریباً 10835 سیٹوں میں سے 71 پر بی جے پی اور ان کی حلیف آگے تھیں تو وہیں صرف سیٹوں پر مہاگٹھ بندھن۔نتیجہ میں بی جے پی کے آفس کے باہر شنکھ کی آوازیں آنے لگیں،پٹاخے پھوڑے جانے لگے،لوگ جشن کے موڈ میں آ گئے۔ٹی وی اینکرس اور عوام نے بتانا شروع کیا کہ بی جے پی اور مہاگٹھ بندھن کے درمیان جو بہت واضح فرق سامنے آ گیا ہے اب اس کو تبدیل کیا جانا ممکن نہیں ہے۔لیکن مرحلہ آگے بڑھا تو تقریباً 10:30 بجے تک یہ صورتحال تبدیل ہوتی نظر آئی۔236 سیٹوں کے رجحانات میں مہاگٹھ بندھن اب 124 پر تھا تو بی جے پی اور ان کے حلیف 103 پر جبکہ 9 آزاد امیدوار۔اور مکمل 143 سیٹوں کے رجحانات نے چانکہ پول کو مکمل طور پر خارج کرتے ہوئے 151 پر مہاگٹھ بندھن

کو آگے دکھایا تو بی جے پی اور ان کے حلیف کو 82 پر پہنچادیا جبکہ آزاد امیدواراب 10 سیٹوں پر سامنے نظر آئے۔اور حتمی نتائج جن کا عوام بے صبری سے انتظار کر رہے تھے وہ بھی کچھ اس طرح سامنے آئے ہیں: مہاگٹھ بندھن 178، بی جے پی 58 اور دیگر 7۔ جس نے ان تمام جھوٹے دعوں کو کھوکلا ثابت کردیا ہے جن کے چرچے چہار جانب سنائی دے رہے تھے۔

بہار الیکشن کے دوران اور اس سے قبل ملک میں بد امنی کی فضا عام رہی ہے۔دادری کے اخلاق احمد کو صرف افواہ کی بنیاد پر پتھروں سے پیٹ پیٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔چند دن ہی گزرے تھے کہ دلتوں کو زندہ جلایا گیا۔ساتھ ہی چھوٹے موٹے وہ واقعات بھی جنھیں میڈیا میں زیادہ جگہ نہیں ملی اس کے باوجود ملک کے امن وامان کو بگاڑنے کا ذریعہ بنتے رہے۔ نتیجہ میں اہل ملک نہایت رنج وافسوس میں مبتلا ہو گئے,پریشان ہوئے اور ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ناراضگی کے اظہار کا ایک ذریعہ ایوارڈ واپسی تھا،جہاں نہ صرف ادب و لٹریچر کے معروف ترین حضرات شریک ہوئے بلکہ ملک کے سائنسداں، فلم انڈسٹری کے کلاکار، سماجی ایکٹوسٹ اور دیگر بھی پیش پیش رہے۔دوسری جانب بی جے پی اور ان کے حلیف نہ صرف خاموشی اختیار کیے رہے بلکہ بہار الیکشن میں مزید اشتعال انگیزی اختیار کی۔کوئی بی جے پی کی ہار پر پاکستان میں پٹاخے چھوڑنے کی بات کرتا نظر آیا تو کہیں گائے کو سہارا بنانے کی کوشش کی گئی۔الیکشن کمپین میں

مقدس گائے' کو اشتہارات میں جگہ دی جانے لگی۔ نتیجہ میں پہلی مرتبہ بڑے پیانہ پر' الیکشن کمیشن نے نوٹس لیتے ہوئے اشتہارات پر روک لگائی۔

اس پورے پس منظر میں اور اس کے بعد چند باتیں قابل توجہ ہیں۔ایک: کیا ملک میں بڑھتی فرقہ واریت بہار کے نتائج سے کچھ کم ہوسکے گی۔دو: مسلمان اور دیگر اقلیتیں جو مختلف انداز سے متاثر ہیں، کے مسائل اور ان کے حل میں بہار کے نتائج مثبت ثابت ہوں گے۔ تین: دہلی کے بعد بہار میں بی جے پی کی بڑی شکست کیا آئندہ ہونے والے اترپردیش اسمبلی الیکشن کے لیے دیگر سماجی یا بہوجن سماجی افراد و گروہ کے لیے نئی حکمت عملی وضع کرنے میں معاون ہوگی۔چار: ترقی و خوشحالی جس کا تذکرہ بہار الیکشن میں بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی سننے کو ملتا رہا، بہار کے نتائج سامنے آنے کے بعد کیا واقعی ملک ترقی و خوشحالی کی جانب گامزن ہوسکے گا۔اور آخری بات یہ کہ فرقہ وارانہ فکر کے حاملین کو بہار کے نتائج مزید منظم، منصوبہ بند اور سرگرم ہونے پر مجبور کریں گے یا وہ خاموشی کو غنیمت جانیں گے۔ان تمام صورتوں میں بحیثیت مسلمان ہماری ذاتی، خاندانی، معاشرتی ،مذہبی اور ملی و ملکی زندگی پر کیا کچھ اثرات رونما ہوئے اور آئندہ ہونے والے ہیں۔کیا ہم منظم ہوئے ہیں؟ بامقصد زندگی کی جانب پیش قدمی کر رتے نظر آرہے ہیں؟یا منقسم اور تقسیم ہوتے جارہے ہیں؟ساتھ ہی ہم پر عائد ذمہ داریاں، جن میں بحیثیت داعی سب سے اہم ذمہ داری برادران وطن

تک اسلام کی دعوت پہنچانے کی ہے، میں ہم آگے بڑھتے نظر آرہے ہیں یا اس میں غفلت کا شکار ہیں۔مزید بھی کہ ملک کی تعمیر وترقی، امن وامان کی بحالی، اور مسائل کے حل میں ہم کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟؟ سوالات کے جواب اگر مثبت میں ہوں تو مبروک، بصورت دیگر ملک میں پنچایت، اسمبلی، اور پارلیمنٹری الیکشن تو آتے ہی جاتے رہیں گے۔اس کے باوجود مسائل جو ہر صبح بڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، شاید کہ مستقبل قریب میں ان میں مزید اضافہ ہو۔لہذا ان حالات میں ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی حیثیت کو پہچانیں، صلاحیتوں میں ارتقاء بخشیں، بامقصد زندگی سے وابستہ ہوں، اور ملک واہل ملک کے لیے دنیا وآخرت میں کامیابی کے حصول کا ذریعہ بنیں۔ ممکن ہے بہار الیکشن، اور اس کی سیاسی بساط پر کھیلی جانے والی پارٹی، اور ریلیاں، احتجاج و دھرنوں کے درمیان یہ باتیں عجیب وغریب محسوس ہوں۔اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ جب تک ہم یہ نہیں سمجھ سکیں گے کہ الیکشن کے منفی یا مثبت اثرات جو مرتب ہوتے ہیں، نتائج جو سامنے آتے ہیں، ان میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ساتھ ہی وہ اقوام بھی جو اندرون وبیرون خانہ بری طرح متاثر ہیں اس کے باوجود وہ کیوں غیر منظم وغیر فعال ہیں؟ تب تک ہم یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ یہ مہاگٹھ بندھن کیوں بنے یا بنتے ہیں اور کیوں ملک کا ایک بڑا طبقہ اخلاق احمد کی موت یا ان جیسے دیگر مسائل میں اظہار رنج و غم میں شریک ہوتا نظر آتا ہے۔ساتھ ہی یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ کیوں ملک کے دانشواران ودیگر سوچنے سمجھنے والے وہ حضرات جو خود ووٹ پالٹکس کے عملی

میدان میں شریک نہیں ہوتے،ایوارڈ واپس کرتے نظر آرہے ہیں۔
بہر حال ہم ان تمام لوگوں کی خوشی کو متاثر نہیں کرنا چاہتے جو فرقہ پرست قوتوں کے بری طرح ناکام ہونے پر جشن میں مصروف ہیں۔وہیں واقعہ یہ بھی ہے کہ نریندر مودی جن کا انحصار صرف اشتہارات وزبانی جمع خرچ تھا،آج وہ اپنی مقبولیت کھوتے نظر آرہے ہیں۔یا کم از کم دہلی اور بہار کے الیکشن نے ثابت کردیا ہے کہ وہ اپنی مقبولیت کھو چکے ہیں۔اس کے باوجود ریاست بہار میں بننے والی نئی حکومت،وزراء اور وزیراعلی کو دہلی جیسی صورت پیدا نہیں ہونے دینا چاہیے۔جہاں مرکز وریاستی حکومت میں رسہ کشی سامنے آئے۔مناسب یہی ہوگا کہ ہارنے اور جیتنے والے،دونوں ہی ایک جگہ چائے پرچرچا کرتے نظر آئیں اور من کی وہ باتیں جو سیاہ ہیں،پراگندہ ہیں،نفرت آمیز ہیں،انہیں عوام کے درمیان سامنے نہ لائیں۔کیونکہ عوام نے ہی انہیں یہ موقع فراہم کیا ہے کہ ایک دوسرے سے اختلافات رکھنے کے باجود وہ عوامی فلاح و بہبود کے مسائل اور ان کے حل میں مدد و معاونت کا رویہ اختیار کریں گے۔ساتھ ہی 1.25 لاکھ کروڑ کا وہ بڑا پیکیج جس کا اعلان مرکزی حکومت نے بہار الیکشن سے قبل کیا تھا،وہ وعدہ جملہ بن کر نہ رہ جائے کیونکہ عوام وہی،ریاست وہی،ملک وہی اور اہل ملک بھی وہی ہیں،جن کی ترقی و خوشحالی کی باتیں اور وعدہ کیے جا چکے ہیں!

! نظام عدل و انصاف کی بنیادیں

یہ صحیح ہے کہ ملک، معیشت و معاشرہ ہر سطح پر سیاست کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اس کے باوجود سیاسی میدان میں ظہور پذیر سرگرمیاں کُل نہیں ہیں۔جہاں ایک جانب اہل اقتدار اور ان کا نظریہ معیشت اور معاشرہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔وہیں ذہین و فطین اور بالغ نظر افراد،ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں اور سرگرمیاں بھی معیشت و معاشرہ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔لیکن اگر یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں اور اہل اقتدار، قوت تشکیل کے دو الگ دائرے نہ ہو کر ایک ہوں تو پھر یہ نظریہ کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔اور اگر کسی نظریہ کو اقتدار حاصل ہو جائے تو پھر نہ صرف معیشت بلکہ معاشرت و تمدن بھی ایک خاص رخ اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔الّہ یہ کہ کوئی دوسرا نظریہ موجود ہو۔وہیں جب دوسرا نظریہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے تو لازماً نظریوں کے درمیان محاذ آرائی ایک فطری عمل ہوگا۔اس موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ نظریہ کی بنیاد اور اس کی برتری اقلیت اور اکثریت پر نہیں بلکہ دلائل و براہین کی بنیاد پر ہوا کرتی ہے۔

گزشتہ دنوں وطن عزیز ہند کی ریاست بہار میں اسمبلی الیکشن اختتام پذیر

ہوئے۔اس موقع پر دو نظریوں کے درمیان جو کھل کر اختلافات سامنے آئے،ان کی بنیاد پر ایک نظریہ غالب تو دوسرا مغلوب ہوا۔گرچہ بظاہر مغلوب ہونے والوں کے پاس بے شمار وسائل تھے،تعداد کے اعتبار سے وہ اکثریت میں تھے،اہل اقتدار ہونے کے نتیجہ میں بھی انہیں کئی طرح کی آسانیاں فراہم تھیں،اس سب کے باوجود وہ مغلوب ہو گئے۔کیونکہ جس نظریہ و فکر کی بنیاد پر انہوں نے اپنے افراد کی فکری، نظریاتی اور عملی تربیت کی تھی،وہ ناقص اور حد درجہ کمزور تھی۔ساتھ ہی وہ خود اندرونی طور پر ایک عجیب و غریب کشمکش میں مبتلا تھے اور آج بی ہیں۔وجہ؟اللہ تعالی نے انسان کو جس فطرت سلیم پر پیدا کیا ہے،وہ فطرت سلیم اور نظریۂ مخصوص ،ہر دو سطح پر تضاد موجود ہے۔اس کے باوجود باطل نظریہ پر تربیت یافتہ افراد جب اپنے ضمیر اور اس کی آواز کو خود ہی زک پہنچاتے اور کچل ڈالتے ہیں، تو پھر انہیں باطل نظریہ کو فروغ دینے میں ہی سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔اس کے باوجود اگر انہیں وقتاً فوقتاً ٹٹولا جائے،ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگایا جائے،اور ان کو اظہار محبت و ہمدردی کا نہ صرف درس دیا جائے بلکہ فرد واحد یا گروہ عملی رویوں سے ثابت کردے کہ وہ متعلقہ فرد یا گروہ سے واقعی ہمدردانہ تعلق برقرار رکھنا چاہتا ہے،تو عین ممکن ہے کہ کبھی نہ کبھی باطل نظریہ کی بنیاد پر زندگی کے شب و روز گزارنے والے افراد،اِس دوسرے محاذ پر بھی مغلوب ہو جائیں،جہاں بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ وہ غلبہ حاصل کیے ہوئے ہیں۔اور اگر ایسا نہیں بھی ہوا تو ہمدردی و اخلاص اور

اس کا اظہار آنے والی نسلوں کو خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے پر مجبور کردیں گی۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔اقلیت یعنی وہ، تعداد کے لحاظ سے کم ہیں بالمقابل ہندوؤں کے۔اور ہندو وہ جو ایک خدا کی پرستش نہیں کرتے، شرک والحاد اور باطل افکار و نظریہ جن کی اساس کار ہے،اور معاشرتی زندگی و اس میں انجام دیئے جانے والے رسم و رواج میں ان کی ایک خاص پہچان ہے۔کئی مرتبہ ہمیں یہ بھی سننے کو ملتا ہے کہ ہندو درحقیقت وطن عزیز میں اکثریت میں نہیں ہیں۔کیونکہ خود ان کے درمیان اس قدر طبقات اور عبادات کے مظاہر موجود ہیں، جن کی بنا پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ایک ہیں۔"یہ تو بس بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جو 'منووادی نظریہ' کو فروغ دینا چاہتے ہیں"۔برخلاف اس کے دیگر ہندو ان سے الگ ہیں،ان کے نظریہ سے اتفاق نہیں رکھتے، وہ مختلف بھگوانوں (مورتیوں) کی پوجا کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی مذہبی کتابیں بھی الگ ہیں۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اہل علم کی باتیں درست ہیں تو پھر وہ مختلف طبقات و گروہ اپنے شادی بیاہ اور زندگی و موت کے مراسم کون سے طریقہ سے ادا کرتے ہیں؟یہی نہیں بلکہ جس مورتی پوجا کے وہ قائل ہیں اس کی بنیاد کیا ہے؟شاید یہ اُن کے نظریہ، فکر اور رسم و رواج کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔پھر یہی دو باتیں شاہد ہیں کہ ہندو گرچہ مختلف طبقات و گروہ میں

منقسم ہیں اس کے باوجود وہ ایک ہیں۔ان کا نظریہ ایک ہے،ان کا عمل ایک ہے،ان کا نصب العین ہے،اور وہ جس نظام کو قائم کیا چاہتے ہیں، گرچہ اس میں بے شمار خرابیاں ہیں، کسی گروہ پر حددرجہ ظلم وزیادتیاں تو کسی کے لیے بے شمار آسانیاں،اس کے باوجود ہندوؤں کا ہر طبقہ چار و ناچار،اُس نظام کے قیام کا حصہ ہے۔اور دیگر افکار و نظریات جو بظاہر ان سے برسرپیکار ہیں،ان کی موجودگی ،بقااور ترقی ،انہیں پسند نہیں ہے۔ایسا کیوں ہے؟اس کا سیدھا جواب تو یہی ہونا چاہیے کہ قائم شدہ فکر کی بنیادایک جانب لاعلمی ہے تو دوسری جانب تعصب اور غلط فہمیوں کی موجودگی و اضافہ ہے،وہیں تیسری اہم وجہ دیگر افکار و نظریات کے حاملین کی زندگیاں ،ان کے معاملات ،رویے اور تعلقات ہیں،جہاں ہر ایک سطح پر اِن میں بے شمار کمزوریاں نمایاں ہیں۔لہذااگر مسلمانوں کی بات کی جائے تو مسلمانوں کو ہر سطح پر خود میں سدھار کی ضرورت ہے،ساتھ ہی اُس جذبہ ہمدردی کو فروغ دینے کی ضرورت ہے،جس کے نتیجہ میں وہ خود کواور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو،دو الگ خانوں میں تقسیم نہ کریں۔لازم ہے کہ جس ایک خدا نے انہیں پیدا کیا وہی خدا تمام انسانوں کو پیدا کرنے والا ہے،لہذا ملک میں پائے جانے والے تمام ہی مذاہب کے افرادایک خداکے بندے ہیں۔آدمؑ کی اولاد ہیں ۔لہذا وہ اور ہم ایک ماں باپ کی اولاد اور بھائی بھائی ہیں۔

گفتگو کے پس منظر میں ملک واہل ملک کی بہتری ،اس کے افراد کی کامیابی کے لیے لازم ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔ نیز ذمہ داریوں کی ادائیگی تب ہی ممکن ہے جبکہ ہم خواپنی ذمہ داریوں سے واقف و متوجہ بھی ہوں نیز غفلت سے پرہیز کریں۔ حالات کے پس منظر میں ذمہ داریوں کے تعلق سے مسلمانوں کی بنیادی ذمہ داریوں میں دین سے واقفیت اور اس پر عمل آوری ہے تو وہیں دوسری اہم ذمہ داری وطن عزیز میں موجود برادران وطن کو اسلام کی آفاقی تعلیمات سے آگاہ کرنا ہے۔اس پہلو سے ہمارا ہر عمل چاہے وہ حد درجہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر دو پہلو سے اہم ہو جاتا ہے۔ جس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہر عمل خود اس بات کی شہادت ہے کہ ہم دین کی تعلیمات سے کس درجہ واقف و عمل پیرا ہیں ،تو وہیں ہمارے باطن میں خدا اور سولؐ کی محبت کا درجہ کیا ہے،اس کو بھی واضح کرتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمارا ہر عمل دیگر افکار و نظریات کے لوگوں کو یا تو اسلام سے قریب کرنے کا ذریعہ بنتا ہے یا اسلام سے بدظن کرنے کی وجہ ۔اس موقع پر لازم ہے کہ اسلام کی دعوت لوگوں میں پہنچانے کی شعوری کوششوں کے ساتھ مسلمانوں کی اصلاح وان میں دین کا شعور پیدا کرنے کی بھی منظم کوششیں کی جائیں۔ یہاں یہ بات کہنے کی نہیں ہے کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ 'شعور دین' کے معنی چند عبادات اور مخصوص طرز معاشرت نہیں بلکہ دین بحیثیت نظام عدل وانصاف ہے۔ لہذا نظام عدل وانصاف کا شعور نہ صرف تحریر و تقریر تک محدود ہونا چاہیے بلکہ فکری نظریاتی اور عملی تربیت کا بھی اہتمام کیا

جانا چاہیے ۔یہاں تربیت سے مراد علم و عمل کے عملی مظاہر ہیں۔جہاں ہر سطح پر علم بھی بہم پہنچایا جائے گا،صلاحیتوں کا ارتقاء بھی ہوگا،اور مختلف محاذ پر سعی و جہد کا آغاز بھی کیا جائے گا۔ساتھ ہی سعید روحوں کو منظم و منضبط بھی ایک بڑا عمل ہے۔یہ کام اگر کوئی فرد انجام دینے کی جرات رکھتا ہے تو وہ ضرور کرے بصورت دیگر موجودہ پرامن و صالح تحریکات کا حصہ بننا چاہیے۔اجتماعی سعی و جہد کے نتیجہ میں ممکن ہے کہ نہ صرف غلط فہمیاں دور ہوں ،لاعلمی کا خاتمہ ہو بلکہ تعصب کی فضا جو چہار جانب پروان چڑھائی گئی ہے،وہ ختم ہو یا کم از کم اس کی شدت میں ہی کمی آجائے۔لیکن اس موقع پر لازماً یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ دعوت وتربیت اور عملی جدوجہد کا اولین میدان کار داعی کی شخصیت اور ذاتی کردار ہے۔وہ مخاطب تو تمام انسانوں کو کرتا ہے۔اس لیے کہ بندگی رب کا پیغام تمام انسانوں کے لیے نفع بخش ہے، لیکن سب سے پہلے اس کو اپنی فکر ہونی چاہیے۔وجہ یہ ہے کہ اپنی اصلاح سب سے مشکل کام ہے!

! مدعی سست گواہ چست

یہ صحیح ہے کہ کوئی بھی نظریہ اپنے فروغ کے لیے ہی وجود میں آتا ہے۔ماضی میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ایک نظریہ کی ابتدا ہوئی اور وہ اپنے فروغ کے لیے کوشاں نہ رہا ہو۔پھر اگر یہ نظریاتی بحث دور حاضر میں ہو تو کیوں لوگ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ نظریہ تو ہو لیکن اس کے فروغ کی سعی و جہد نہ کی جائے؟کیا یہ ممکن ہے کہ نظریہ بھی ہو، نظریہ کو فروغ دینے کے لیے سرگرم گروہ بھی ہو،اس کے باوجود وہ صرف اس لیے مخصوص نظریہ کے فروغ میں کوشاں نہ ہوں کہ فلاں شخص یا گروہ نہیں چاہتا کہ وہ فروغ پائے۔کیا اس طرح کی بے جا خواہش نظریہ کے فروغ کو ماند کر سکتی ہے؟ہمارے خیال میں جو لوگ شعوری یا لاشعوری طور پر اس طرز عمل کو اختیار کرتے ہیں وہ ایک لا حاصل سعی وجہد میں مصروف عمل ہیں۔ہاں اگر نظریہ کے باالمقابل دوسرا نظریہ و فکر سامنے آئے،اور اس کے فروغ کی بھی اُسی لحاظ سے جدوجہد کی جائے تو پھر ممکن ہے کہ دو یا دو سے زیادہ نظریوں کے درمیان اختلافات سامنے آئیں،اُن کے منفی اور مثبت پہلوؤں پر بحث ہو،تعداد کے لحاظ سے اقلیت کہنے والوں کے نظریہ کو اس کی خوبیوں کی روشنی میں پسند کیا جانے لگے،یہاں تک کہ شعوری طور پر نظریاتی جنگ چھڑ جائے،اور اس نظریاتی جنگ میں،اپنے اپنے نظریہ

پر قائم رہتے ہوئے، نیز اصولوں کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے، ایک نظریہ اور اس کے حاملین شکست کھائیں تو وہیں دوسرا سربلند ہو۔

اس پس منظر میں جب ہم وطن عزیز اور اس میں موجود نظریات کا مطالع کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ایک جانب مختلف نظریات اور اس کے حاملین ہیں تو وہیں دوسری جانب سماج کا ایک بہت بڑا طبقہ یا حصہ ایسا بھی ہے، جو لاشعوری زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ باالفاظ دیگر یہ وہ لوگ ہیں جو ہوا کا رخ دیکھ کر اپنے طرز
عمل، فکر، خیالات، احساسات، خواہشات، یہاں تک کہ مسائل جن سے وہ دوچار ہیں، اُن سے بھی نظریں چراتے ہیں۔ وجہ غالباً یہی ہے کہ ملک تو آزاد ہوا لیکن یہ بڑا طبقہ آج بھی اس ذہنی غلامی سے نجات نہیں پا سکا جس کا وہ کبھی شکار رہے ہیں۔ دوسری جانب جس مذہب سے ان کا تعلق ہے وہ اکثریت کا مذہب ہے، لہٰذا یہ وہ دوسرا اہم پہلو ہے جو انہیں اطمینان دلاتا ہے کہ حالات چاہے کچھ بھی ہوں کم از کم وہ اپنے مذہب پر تو عمل پیرا ہیں۔ لیکن اگر مذہب اور مذہبی بنیادوں پر رائج معاشرتی رسم و رواج پر عمل آوری ان کے لیے دشوار گزار ہو جائے تو پھر یہی بڑا طبقہ جو ان حالات میں خاموش نظر آتا ہے وہ بھی ایک عجیب تذبذب میں مبتلا ہو جائے۔ پھر یہ خاموشی یا عدم دلچسپی جو جگ ظاہر ہے، وہی خاموشی چینخ و پکار میں تبدیل ہو جائے گی۔ گفتگو کے پس منظر میں یہ بات بھی اہم ہے کہ جب کوئی نظریہ وقوع پذیر ہوتا ہے تو اُس کی پوری کوشش ہوتی

ہے کہ وہ دنیا میں اپنا نظام قائم کرے۔ باالفاظ دیگر وہ عوام میں رائے ہمواری پروان چڑھانے تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ہر ممکن طریقہ سے وہ اقتدار کے حصول کی سعی و جہد بھی کرتا ہے۔ پھر جس جس مرحلے میں اس کو دشواری لاحق ہوتی ہے، حاملین نظریہ اسے دور کرنے کی نہ صرف منظم و منصوبہ بند عملی جدوجہد کرتے ہیں بلکہ ان دشواریوں کو بھی دور کرتے جاتے ہیں، جن مقاصد کے حصول کے لیے وہ کمربستہ ہوئے ہیں۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ وطن عزیز میں نظریاتی اور فکری اعتبار سے کتنے قسم کے گروہ وحاملین گروہ سرگرم عمل ہیں؟اس صورت میں سب سے بڑا نظریہ طاقت کے اعتبار سے ہندوتو وادی یا منو وادی نظریہ ہے۔ دوسری جانب سماج وادیا سوشلزم، کمیونزم اور اسلام ہے۔ وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستانی آئین، ملک کے شہریوں کو یہ آزادی فراہم کرتا ہے کہ ہر نظریہ واس کے حاملین دستور ہند میں دیئے گئے اختیارات کی روشنی میں مخصوص نظریہ پر نہ صرف عمل درآمد کر سکتے ہیں بلکہ اس کے فروغ کی بھی بھرپور آزادی ہے۔ وہیں اگر ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ملک میں مذاہب کے اعتبار سے کتنے طرح کے افراد پائے جاتے ہیں تو دنیا کے بڑے مذاہب کے تمام ہی افراد ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ یہاں یہودیت کے ماننے والے یہودی بھی ہیں تو گوتم بدھ کے ماننے والے بدھسٹ بھی ہیں، مسیحیت کے ماننے والے عیسائی ہیں تو اسلام کے ماننے والے مسلمان بھی

ہیں۔ گرونانک کے ماننے والے سکھ ہیں تو مہاویر کے ماننے والے جین بھی ہیں۔ان سب کے علاوہ لوک مذہب، بہائی مت کے ساتھ ساتھ کافی تعداد ایسے افراد کی بھی ہے جو خود کو لامذہبیت کا علمبردار کہتے ہیں۔یہاں بھی مذہب و عقیدہ کے اعتبار سے آئین ہند یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ تمام مذاہب و لامذاہب کے ماننے والے اپنے مخصوص مذہب، عقیدہ اور فکر پر نہ صرف آزادانہ عمل درآمد کر سکتے ہیں بلکہ اس کے فروغ کے لیے تبلیغ و تشہیر بھی کر سکتے ہیں۔ان دو بنیادی نکات کی روشنی میں یعنی نظریہ و فکر پر عمل درآمد اور اس کی تبلیغ کی آزادی۔ نیز مذہب کے اختیار کرنے کی آزادی اور اس کی تبلیغ کی اجازت، واضح کرتا ہے کہ ہندوستان کا آئین آج بھی حد درجہ لچک دار ہے۔وہیں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ فکر و نظریہ اور مذہب کے اعتبار سے یہاں اکثریت و اقلیت کا سرے سے کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔اس صورت میں اگر لامذہبیت کے علمبردار یہ خواہش رکھیں کہ وہ، چونکہ دیگر مذاہب کے افراد کی تعداد و اقتدار کے لحاظ سے کمزور ہیں، لہٰذا دیگر بھی اپنے مذہب کے فروغ واس کی تبلیغ کی سعی و جہد نہ کریں،تو یہ بات کسی کو بھی تسلیم نہیں ہوگی کیونکہ یہ ایک غیر منطقی و غیر دستوری بات ہے۔پھر جس طرح کم تعداد، مخصوص مذہب پر عمل درآمد اور اس کے فروغ میں مانع نہیں ہے، ٹھیک اسی طرح اکثریتی گروہ کو بھی اختیار ہے کہ وہ اپنی اکثریت میں مزید اضافہ کیے جائے۔

اس پورے پس منظر میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب ملک کا آئین اس قدر لچک دار ہے،آزادیاں اور اختیارات بھی حاصل ہیں، تو پھر کیوں ملک میں گزشتہ چند ماہ سے رواداری اور عدم روادی کی بحث جاری ہے؟ کیوں ملک کے حالات خراب ہوتے نظر آرہے ہیں، کیوں ملک کا سوچنے سمجھنے والا طبقہ حالات سے حیران وپریشان ہے؟ کیوں سماج کے منتشر ہونے اور بکھرنے کی باتیں کہی جارہی ہیں؟ کیوں ان حالات سے نااتفاقی اور تشویش کے اظہار کے مختلف طریقہ سامنے آرہے ہیں؟ کیوں یہ محسوس کیا جا رہاہے کہ ایک فکر اور ایک نظریہ کے حاملین کے سوا دیگر افکار و نظریات کمزور پڑتے جا رہے ہیں؟ وہیں دنیا کو بھی آج اس بات کا کیوں احساس ہو رہاہے کہ ہندوستان میں فی الوقت جو حکومت ہے، وہ اپنے علاوہ دیگر مذاہب وافکار، خصوصاً وہ جو ہندو مذہب میں ضم نہیں ہوئے ، کو متعینہ رسم و رواج اور پرسنل لاء میں دشواریاں لاحق ہیں اور مزید کے اندیشے ہیں؟ یہ اور اس طرح کے بے شمار سوالات ہیں جن کے جواب تلاش کیے جانے چاہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں ان سوالات کے جوابات کی کھوج کے ساتھ ہی ساتھ دیگر نظریہ اور فکر کے حاملین اپنے مخصوص نظریہ اور فکر کو فروغ دینے کی بھی کوشش کریں۔ کیونکہ صرف تشویش سے بات نہیں بنتی ، خصوصاً اس صورت میں جبکہ مذہب، عقیدہ اور نظریہ کے فروغ کے مکمل اختیارات بھی حاصل ہوں۔ وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی نظریہ تب تک عوامی نظریہ نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کے فروغ کی منظم و منصوبہ بند کوشش نہ کی جائے۔ اس کے لیے جہاں اخلاص پر مبنی سعی و جہد درکار ہے وہیں

فرد کے معاملات میں نظریہ کی عکاسی لازمی شرط ہے۔واقعہ یہ ہے کہ جب ہم وطن عزیز میں موجود نظریہ ہائے افکار و خیالات، مراسم، رسم و رواج،مذاہب،اورمذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والے معاشرہ کوتلاش کرتے ہیں تو عموماً مسلمانوں کے علاوہ کسی اور گروہ کواپنی مخصوص شناخت میں موجود نہیں پاتے۔چاہے وہ سکھ ہوں،جو گرچہ مخصوص لباس میں مزین نظرآتے ہیں، یا جین ہوں،یا بدھسٹ یا پھربہائی ۔یہاں تک کہ عیسائیت پر عامل ہندونواز عیسائی طبقہ ہی کیوں نہ ہو۔تمام ہی معمولی شناخت کے علاوہ مخصوص شناخت سے محروم ہیں۔مزید یہ کہ عقائد گرچہ مختلف ہیں اس کے باوجود نظریہ حیات سب کا ایک ہی ہے۔نہ کہیں معاشرتی بنیادوں پر تشخص برقرار ہے نہ رسم و رواج میں فرق اور نہ ہی عائلی نظام نمایاں و مخصوص ہے۔ہاں اگر کوئی آج بھی اپنی مخصوص شناخت ، مخصوص نظریہ حیات ، مخصوص عقائد،افکار و نظریات اور عبادات کی بات کرتا ہے تو وہ اسلام ہے۔لہٰذا سیاسی اتار چڑھاؤ اور فوائد و نقصانات کو پس پشت ڈالتے ہوئے، مسلمانوں کو یہ خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ان کے قول و عمل میں تضاد اسی طرح برقرار رہا، تو پھر ہر سطح پر خمیازہ بھی صرف اور صرف مسلمانوں کو ہی بھگتنا پڑے گا۔ممکن ہے کچھ لوگ بظاہر آپ کے حق کی لڑائی لڑیں، لیکن جب تک مدعی خود ہی سست رہیں گواہ کیونکر چست ہوں؟اور اگر گواہ چست بھی ہو جائیں تو مدعی کو کیا حاصل!

! شہید بابری مسجد

1528 عیسوی میں اجودھیا ضلع فیض آباد اودھ کے مقام پر مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے گورنر میر باقی کی نگرانی میں بابری مسجد تعمیر کی۔ اُس وقت وہاں ہندو بھی رہتے تھے اور مسلمان بھی، کسی جانب سے اس کو تنازع نہیں بنایا گیا۔ 15 جنوری 1885 میں سب جج فیض آباد کی عدالت میں مسجد سے سو قدم کے فاصلے پر رگھبیر داس نام کے ایک شخص نے مندر تعمیر کرانے کی اجازت چاہی۔ جس پر عدالت نے اجازت نہیں دی۔ بعد میں فرقہ وارانہ نظریہ کے حاملین نے فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ مسجد کو قدرے نقصان پہنچایا اور ایک طویل عرصہ نہ صرف انتظار کیا بلکہ کوششوں کو جاری رکھا۔ یہاں تک کہ 22 اور 23 دسمبر 1949 کی درمیانی رات میں مسجد میں رام للا کی مورتیاں رکھ دیں گئیں۔ ایک دن بعد فیض آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنڈت گووندولبھ پنت، چیف سکریٹری اور ہوم سکریٹری کے نام بابری مسجد سانحہ سے متعلق تار ارسال کیا۔ جس میں حکومت کو آگاہ کرنے کی کوشش کی اور تار میں صاف لکھا کہ 23 دسمبر کی سرد اور تاریک رات میں ہندو وا ہنی کے لوگوں نے بابری مسجد میں رام للا کی مورتی رکھ کر حالات کشیدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے خلاف اقدامات نہایت ضروری ہے۔ موجودہ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ نے فوراً جائے واردات پہنچ کر صورتحال کو کنٹرول میں کیا۔ انصاف کو

پروان

چڑھاتے ہوئے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے وزیر اعلیٰ اتر پردیش کو سخت ہدایت دی کہ مسجد کے ساتھ ناانصافی ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن ضلع ڈسٹرکٹ نے وزیر اعلیٰ کے احکامات پر عمل درآمد کی بجائے اپنے عہدے سے ہی استعفیٰ دے دیا۔ 1950 میں مسجد پر ناجائز قبضہ کے لیے دو مرتبہ برت رکھا گیا۔ اس سے قبل 29 دسمبر 1949 میں ایک نئے ضلع مجسٹریٹ نے اس مسئلہ کو مزید فروغ نہ دے کر حالات کو جوں کا توں برقرار رکھا، بابری مسجد کو سرکاری تحویل میں لینے کا حکم دیا اور مسلمانوں پر مسجد میں داخلہ پر پابندی عائد کردی۔ ساتھ ہی مسجد میں پوجا کرنے کے لیے چار پجاریوں کو بھی مقرر کر دیا۔ 1950 میں مسجد میں تالا لگایا گیا وہیں محدود پیمانے پر پوجا کا عمل بھی جاری رہا۔ 16 جنوری 1950 میں وکیل گوپال سنگھ کی درخواست پر سول جج نے فیصلہ سناتے ہوئے مسجد میں حسب سابق مورتیاں رکھی رہنے اور پوجا کرنے کے عمل کو جاری رکھنے کا حکم دیا۔ 17 اکتوبر 1984 میں رام جنم بھومی ایکشن کمیٹی تشکیل دی گئی۔ 1985 کے آغاز میں بابری مسجد کا تالا کھولنے کی تحریک وشوہندو پریشد نے اپنے ہاتھ میں لی۔ 25 جنوری 1986 میں وشوہندو پریشد کی جانب سے عدالت میں تالا کھولنے کی عرضی دائر کی گئی لیکن عدالت کسی طرح کا فیصلہ سنانے کی بجائے خاموش رہی۔ 31 جنوری 1986 میں ڈسٹرکٹ جج ایم کے پانڈے کی عدالت میں درخواست داخل کی گئی جس پر عدالت نے سرسری سماعت کے بعد یکم فروری 1986 کو تالا کھلوا کر عام پوجا کرنے کی اجازت دے دی۔ یہاں ایک بڑا مرحلہ طے کیا گیا نیز دوسرے میں

داخلہ کا آغاز ہوا۔دوسرے مرحلے میں بابری مسجد کو ہٹا کر رام للّا کے جائے مقام پر ایک بڑا مندر بنانے کی تحریک کا آغاز تھا۔ تحریک سے وابستہ افراد کو سمجھایا گیا کہ چونکہ عدالتوں میں انصاف کرنے کی صلاحیت ختم ہوچکی ہے لہٰذا عوامی تحریک آغاز کیا جانا چاہیے۔

مسجد میں عام پوجا پاٹ کی اجازت حاصل ہوجانے سے ہندو احیاء پرستوں کے حوصلے بلند ہوچکے تھے ۔اب ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے مسجد کو منہدم کرنے اور اس کی جگہ نیا مندر بنانے کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ وشو ہندو پریشد کے سربراہ اشوک سنگھل ، جن کا چند روز قبل انتقال ہو چکا ہے، نے اعلان کیا کہ 9 نومبر 1989 مندر کا شلانیاس (سنگِ بنیاد) ہوگا، ملک کی کسی سیاسی پارٹی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ ہمارے اس پروگرام میں رکاوٹ پیدا کرسکے۔ طریقہ کار یہ طے ہوا کہ عام ہندوؤں کو ہم نوا بنانے کے لیے 30 دسمبر 1989 سے ملک گیر شلا پوجن مہم شروع کی جائے گی ۔جس کے تحت ملک بھر کے پانچ لاکھ پچھتّر ہزار گاؤں میں ایک ایک شلا (اینٹ) بھیج کر اس کا پوجن کرایا جائے گا اور دیواستھان اکادشی (9 نومبر) کے دن یہ ساری اینٹیں اجودھیا پہنچا دی جائیں گی ۔ نیز اسی دن رام مندر کا شلانیاس کیا جائے گا۔دوران مہم ریاستی حکومتوں نیز مرکزی حکومت کا راست یا بلاواسطہ جو تعاون رہا وہ سب پر عیاں ہے۔پریشد شلا پوجن کے نام پر گاؤں گاؤں گھوم کر نفرت و تشدد کا زہر پھیلاتی رہی لیکن حکومتیں خاموش تماشہ ہیں

بنی رہیں۔ متعینہ تاریخ یعنی 9 نومبر کو وشوہندوپریشد کے ہاتھوں متنازعہ اراضی پر شلانیاس کی اجازت دے کر مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا کہ بابری مسجد کے انہدام اور مندر کی تعمیر کا وقت قریب آگیا ہے۔دوسری جانب موجودہ وزیر داخلہ نے ایک طرف تو یہ اعلان کیا کہ متنازعہ جگہ پر شلانیاس کی اجازت نہیں دی جائے گی وہیں دوسری جانب اندرون خانہ وشوہندوپریشد سے ساز باز بھی جاری رہی۔ حکومت کی اس منافقانہ پالیسی نے فرقہ پرست تنظیموں کو اس قدر حوصلہ فراہم کیا کہ 23 جون 1990 ہری دوار میں ہندو مذہبی لیڈروں نے طے کیا کہ اگست سے اکتوبر تک پورے ملک میں جگہ جگہ جلوس نکالے جائیں، گاؤں گاؤں مندر کی تعمیر کے لئے والنٹیر جمع کئے جائیں، اور 30 اکتوبر کو مسجد کی جگہ پر رام مندر کی تعمیر کا کام شروع کیا جائے۔ فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آر۔ ایس ایس، بی جے پی، وشوہندوپریشد، بجرنگ دل اور ان کی ہمنوا تمام فرقہ پرست پارٹیاں میدان عمل میں نکل آئیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر لال کرشن اڈوانی نے سومناتھ سے اجودھیا تک کی رتھ یاترا شروع کی، جس میں انتہائی اشتعال انگیز اور دل خراش تقریریں کی گئیں۔ نتیجہ میں بڑودہ، بنگلور، کرناٹک، مدھیہ پردیش اور یوپی کے بعض اضلاع میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ حکومت جس کی اولین واہم ترین ذمہ داری اپنے شہریوں کی جان ومال اور آبرو کی حفاظت ہے خود اپنی حفاظت کے بندوبست اور اپنی جان بچانے کی فکر میں مصروف رہی اور جارحیت کا عفریت ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم کر آگ وخون کا طوفان

برپا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بڑی تعداد میں کارسیوک 30 اکتوبر 1990 اجودھیا پہنچ گئے۔ اس موقع پر مسجد کو مسمار کرنے کی کوششیں کی گئیں، مسجد کے گنبد اور دیواروں کو مجروح کیا گیا۔ لیکن وزیر اعلیٰ اترپردیش کے سخت رویہ نے انہیں مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

جنتا دل کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ 5 دسمبر 1989 میں وزیر اعلیٰ بنے تو وہیں 24 جون میں برخاست ہو گئے۔ کل 566 دن کے دور حکومت کے بعد نئی حکومت میں 1991 عمل آئی۔ 24 جون 1991 میں بی جے پی کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ وزارت سازی کے بعد وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ اپنے وزیروں کو ساتھ لے کر اجودھیا آئے اور بابری مسجد میں نصب مورتی کے پاس کھڑے ہو کر یہ عہد کیا کہ "رام للاہم آئیں گے مندر یہیں بنائیں گے"۔ اس عہد و پیمان کے بعد حائل رکاوٹیں دور کرنے کی مہم کا آغاز ہوا۔ مسجد سے ملحق موقوفہ متنازعہ اراضی کو اپنی تحویل میں لیا گیا، پھر اسے وشوہندوپرشید کے حوالہ کیا گیا، جس پر مستحکم بنیادوں کے ساتھ پختہ چبوترہ تیار ہوا۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے احکامات تھے کہ جائے مقام پر کسی قسم کی تعمیر نہ کی جائے، اس کے باوجود توہین عدالت کا ارتکاب کرتے ہوئے تعمیر ہوتی رہی۔ دوران مدت ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاکرات بھی جاری رہے۔ یہاں تک کہ تیسرے دور کا آغاز ہونے ہی والا تھا کہ اچانک حیرتناک انداز میں وشوہندوپریشد نے یکطرفہ اعلان کیا

کہ 6 دسمبر 1992 کو کارسیوا ہوگی۔کارسیوا کے اعلان ہوتے ہی فرقہ پرست تنظیمیں حرکت میں آگئیں۔ بھاجپا کے سابق صدر ایڈوانی اور جوشی یاترا پر نکل پڑے، تخریب کار عناصر کارسیوک کے نام پر اجودھیا میں جمع ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک کا ماحول کشیدہ و سراسیمہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ مہم جوئی کا وہ آخری مرحلہ مکمل ہوا جس کے لیے 6 دسمبر 1992 کا دن طے کیا گیا تھا۔اور بابری مسجد شہید ہو گئی!

! مسائل سیاسی ہی نہیں معاشی اور معاشرتی بھی ہیں

حقیقت یہ ہے کہ ملک و معاشرہ جس قدر بڑا ہوگا اسی تناسب سے حالات و واقعات بھی رونما ہوں گے۔یہ الگ بات ہے کہ واقعات جو رونما ہو رہے ہیں وہ کسی کے لیے خوشگوار تو کسی کے لیے ناگوار ہو سکتے ہیں۔اس کے باوجود تمام ہی باشعور شہریوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ حالات کو خراب ہونے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔لیکن معاملہ اس وقت خراب ہوتا ہے جبکہ مسائل جن کے حل کے لیے عوام نہ صرف متوجہ بلکہ سرگرم عمل بھی رہنا چاہتے ہیں،ان تمام یا ان میں سے بیشتر مسائل کے حل کے اختیارات ریاستی یا مرکزی حکومتوں کے پاس ہوتے ہیں یا وہ اس پوزیشن میں ہوتی ہیں کہ مسائل کے حل کے لیے قانون سازی کے عمل سے گزریں اور فیصلوں کا نفاذ کر سکیں۔دوسری جانب عوام جو گرچہ فیصلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے، احتجاج کرتے ہیں اور حکومت کو پابند عہد بناتے ہیں۔ان عہد کا پابند جن کا وعدہ انتخاب سے قبل کیا گیا تھا۔کہ اگر وہ حکومت میں آئیں گے تو مسائل حل کریں گے، عدل و انصاف اور امن وامان قائم کریں گے اور ترقی و فلاح و بہبود کے کاموں کو انجام دیں گے۔اسی سلسلے کا ایک واقعہ آج سے ٹھیک تین سال قبل ملک کے دارالحکومت دہلی میں چلتی بس میں ایک نوجوان میڈیکل طالبہ کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کا رونما ہوا تھا۔اُس موقعہ پر پورا ملک جن حالات سے گزرا اور جس

طرح عوام نے اس بدترین واقعہ کے خلاف بھرپور انداز میں احتجاج کیا، وہ نہ صرف مثالی بنا بلکہ ملک و بیرون ملک ہر سطح پر قصورواروں کو سخت سے سخت سزا دلوانے کی بات کہی گئی۔حکومت بھی متوجہ نظر آئی اور جوینائل عمر گھٹانے اور بدترین مجرمین کو سخت سزا دلانے کی باتیں کہی گئیں۔آپ یہ بھی باخوبی جانتے ہیں کہ چونکہ سنہ 2000 میں ایک ترمیم کے ذریعہ نابالغ مجرم معالمے میں عمر کی حد بڑھا کر 16 سے 18 سال کردی گئی تھی۔اس عمر کو کم کرنے کی جب بڑے پیانہ پر مانگ ہوئی تو سنہ 2013 میں سپریم کورٹ آف انڈیا نے پھر سے عمر 16 سال کرنے کی بات کہی۔اس کے باوجود آنے والی 20 دسمبر 2015 میں وہی نابالغ جو نربھیا معاملہ میں ملوث تھا،زانی مجرم کی رہائی ہونے والی ہے اور ہائی کورٹ نے رہائی روکنے سے انکار کر دیا ہے۔عدالت کا کہنا ہے کہ قصوروار ٹھہرائے جانے کے وقت مجرم نابالغ تھا،لہذا تین سال کی سزا بچہ اصلاح گھر میں اس کی پوری ہوچکی ہے۔ایسے میں اب کوئی ایسا قانون نہیں ہے جس سے سزا کاٹنے کے بعد اسے مزید اصلاح گھر میں رکھا جاسکے۔وہیں متاثرہ کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رورہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ ہماری لاکھ کوششوں کے باوجود اتنے بڑے مجرم کو عدالت نے چھوڑدیا۔ہمیں یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ انصاف ملے گا لیکن وہ نہیں ملا۔زنا بالجبر جو ایک تشویشناک واقعہ ہے،ملک میں ہر دن 93 خواتین کی عصمت دری ہوتی ہے۔اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ 2014 میں پورے ملک میں 36735 عصمت دری کے واقعات ہوئے جن میں صرف دہلی میں عصمت دری کے 3000 واقعات ہوئے ہیں۔

اس ایک مسئلہ کے بعد دوسرے مسئلہ کا رخ کریں تو معلوم ہوگا کہ کرپشن میں اس وقت ملک کا ہر چھوٹا اور بڑا شخص راست یا بالواسطہ طور پر کہیں نہ کہیں ملوث ہے۔ لیکن اگر بالواسطہ کرپشن کو نظرانداز کر بھی دیا جائے تو راست اس جرم میں ملوث افراد کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہے کہ صرف انہی کے جرائم کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ یوں تو کرپشن ہر دور میں رہا ہوگا لیکن گزشتہ چند دہائیوں میں جس تیزی سے یہ پھلا پھولا ہے شاید ہی کسی زمانے میں اتنی بدترین شکل میں یہ سامنے آیا ہو۔ پھر اہل اقتدار اس کرپشن کی اصل جڑ ہیں۔ ویسے بھی عوام کسی زمانے میں اتنے بڑے پیمانہ پر کرپشن میں ملوث نہیں ہو سکتے۔ اس معاملے میں بھی برسراقتدار لیڈران نے حکومت سنبھالتے وقت اور اس سے قبل وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے ہر ممکن طریقہ سے ختم کریں گے۔ لیکن افسوس کہ نہ وہ ایسا کرسکے اور نہ ہی وہ اپنی سطح پر کوئی مثبت مثال قائم کرنے کی پوزیشن میں نظر آتے ہیں۔ وہیں راجدھانی دہلی میں گزشتہ سالوں آنے والی ایک نئی سیاسی پارٹی نے بھی بڑی بیباکی کے ساتھ کرپشن کے مسئلہ کو اٹھایا تھا۔ ساتھ ہی اس کے حل اور خاتمہ کے عہد و پیمان کیے تھے۔ اس کے باوجود آج کل اور گزشتہ مہینوں میں خود ان کی پارٹی کے لیڈران مختلف قسم کے کرپشن میں ملوث پائے گئے ہیں۔ پھر جس طرح عام آدمی پارٹی نے دہلی سکریٹریٹ میں چھاپہ ماری کے بعد بی جے پی کے ارون جیٹلی پر پے درپے وار کیے، واضح کرتا ہے کہ حمام

میں سب ہی ننگے ہیں۔ کیجریوال کا کہنا ہے کہ جیٹلی کئی سالوں تک ڈی ڈی سی اے کے صدر رہے ،اس دوران ڈی ڈی سی اے میں بدعنوانی کے متعدد الزامات عائد کئے گئے جیٹلی بھی اس میں ملوث ہیں۔ وہیں کرپشن اور اس میں ملوث اہم ترین شخصیات اب، کرپشن جو انھوں نے کیا یا جس کا الزام ان پر لگایا جا رہا ہے،اس کی پرواہ کیے بغیر سیاسی بساط پر شہ مات کا کھیل کھیلنے میں مصروف ہیں۔بی جے پی کے سبرامنیم سوامی نے سنہ 2012 میں مودی حکومت کے برسر اقتدار میں آنے سے قبل نیشنل ہیرالڈ کے مالکانہ حق کو لے کر سونیا اور راہل گاندھی پر جائیداد پر قبضہ کیے جانے کی مجرمانہ سازش کا الزام لگایا ہے۔ سوامی کے مطابق سونیا اور راہل نے نیشنل ہیرالڈ کی 5000 کروڑ روپے سے زیادہ کی جائیداد غبن کی ۔اس کے لیے پہلے کانگریس نے غیر قانونی طریقے سے پارٹی فنڈ سے 90 کروڑ کا لون دیا۔ پھر ایک ینگ انڈیا کے نام سے کمپنی بنائی۔ ہیرالڈ چلانے والی کمپنی ایسوسی ایٹ جنرل سے 99 فیصد اسٹاک غلط طریقہ سے ینگ انڈیا کے نام ٹرانسفر کرائے۔ اور اس نئی کمپنی میں 76 فیصد حصہ داری سونیا اور راہل گاندھی کی ہے، بقیہ کانگریس خزانچی موتی لال وہرا اور آسکر فرنانڈیز اور سیم پترودا کے پاس ہے۔ اور آج جب اس پورے معاملے پر کورٹ میں پیشی ہوئی تو مسئلہ کرپشن کا نہیں بلکہ انا کا بن گیا جسے بعد میں سیاسی رخ دیا جا رہا ہے۔ اور وہ بھی اس امید کے ساتھ کہ بازی ہمارے ہی ہاتھ لگے گی، یعنی ہم ہر سطح پر کامیاب ہوں گے اور ایک بار پھر برسر اقتدار آئیں گے ۔دلچسپ بات یہ کہ

کرپشن جس کی بنیاد پر کانگریس پارٹی کا صفایا ہوگیا تھا،اسی کانگریس پارٹی اور اس کی اعلیٰ قیادت کو ایک بار پھر کرپشن کی آڑ میں امید بندھی ہے۔لہٰذا میدان ہموار کیا جا رہا ہے اور لگتا ہے کہ بس کامیابی سامنے کھڑی ہے۔

یہاں اس مختصر اخباری مضمون میں موقع نہیں ہے کہ ایک ہی وقت میں دیگر مسائل پر بھی روشنی ڈالی جا سکے۔لہٰذا گفتگو کا اختتام ہندوستان کے جنوبی شہر چنئی کے خوفناک سیلاب سے کرتے ہیں جہاں نہ صرف بڑی تعداد میں جان و مال کا نقصان ہوا بلکہ ملک کے سلیم الحس افراد نے اس موقع پر بلا تخصیص مذہب و عقیدہ ایک دوسرے کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔چنئی کی مسجد غیر مسلموں کے لیے جائے پناہ بنی تو وہیں شہر کے نوجوان تباہ شدہ گھروں اور عبادت خانوں کی صاف صفائی کرتے نظر آئے۔دوسری جانب کچھ ایسے افراد بھی سامنے آئے جو موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں بھی چوری چکاری میں مصروف تھے۔لیکن درد ناک واقعہ نالینی کے بیٹے گوکل کا ہے۔جبکہ نالینی کی لاش بڑی مشقتوں کے بعد حاصل ہوئی۔اس وقت نالینی کی میت حد سے زیادہ پھولی ہوئی تھی اور ان کے جسم پر کیڑے چل رہے تھے۔راوی کا کہنا ہے کہ ہم نے مشکل سے ان کے مردہ جسم کو صاف کیا اور ان کی میت کو لے کر سینمبچری میں واقع سرکاری شمشان گھاٹ لے گئے۔سرکاری شمشان گھاٹ، جہاں ساری خدمات مفت ہوتی ہیں، اس کا انتظام اب مقامی ٹھکیداروں کے ہاتھ میں تھا اور انھوں نے آخری رسومات کی ادائیگی کے

لیے 15,000 روپے کا مطالبہ کیا۔ کرونیا دیوی کا کہنا ہے کہ اندھیر پھیل رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ علاقے میں بجلی بھی غائب تھی۔ ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں تھا اور آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے رشوت دینی تھی۔ گوکل نے کہا کہ وہ 15,000 روپے مانگ رہے تھے لیکن ہم نے انھیں چار ہزار روپوں پر راضی کر لیا۔ تصور کیجئے اس موقع پر کہ کرپشن کس طرح اس ملک کے ہر فرد کی نس نس میں رچ بس چکا ہے۔ دوران خون یہ نہ صرف پورے جسم میں گردش کرتا ہے بلکہ قلب و ذہن کو اس نے حد درجہ جکڑ لیا ہے۔ اس موقع پر یاد رکھیے بے شمار مسائل ہونے کے باوجود حل یہ نہیں ہے کہ اسے میں یا آپ صرف بیان کرتے رہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ سیاسی پارٹیوں اور ان کے لیڈران سے ناطہ توڑا جائے اور ایک ایسی صالح اجتماعیت سے وابستگی اختیار کی جائے جو نہ صرف دنیا کے مسائل کے حل اپنے پاس رکھتی ہے بلکہ جس سے وابستگی کے نتیجہ میں ابدی زندگی میں بھی کامیابی یقینی ہو جائے گی۔ خصوصاً ان لوگوں کی جو جنت و جہنم پر یقین رکھتے ہیں!

! میڈیا میں افراد سازی کا عمل

تازہ خبر کے مطابق مہاراشٹر کے انسداد دہشت گردی دستے، اینٹی ٹیرارزم اسکواڈ نے سمجھا جاتا ہے کہ حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے تین نوجوانوں کو حراست میں اس شبہ پر لیا ہے کہ یہ نوجوان داعش میں شمولیت کے لیے ہندوستان چھوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مہاراشٹر اے ٹی ایس نے تلنگانہ اے ٹی ایس کو خبر دی کہ یہ تینوں ناگپور ایرپورٹ پر جمعہ کی صبح پہونچیں گے اور ملک چھوڑنے کے لیے طیارہ میں سوار ہونے کی کوشش کریں گے۔ جس پر تینوں کو حراست میں لے کر تلنگانہ اے ٹی ایس کے حوالہ کر دیا گیا۔ وہیں گزشتہ ۱۶ دسمبر دہلی پولیس کے اسپیشل سیل کو اس وقت ایک بڑی 'کامیابی' ہاتھ لگی تھی جبکہ القاعدہ کے برصغیر کے مبینہ 'بانی' اور انڈیا چیف کو سنبھل کے دیپا سرائے محلے کے رہنے والے ایک شخص کو دہلی میں گرفتار کیا گیا۔ گرفتار شدہ شخص کے بھائی صادق کا کہنا ہے کہ خبریں بتا رہی ہیں کہ ہم گھر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ جبکہ ہم کہاں بھاگے ہیں؟ ہم تو یہیں ہیں۔ پھر وہ اپنے درد اور حالات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں 'ڈاکٹر کہتے ہیں ایڈز چھونے یا ساتھ بیٹھنے سے نہیں پھیلتا ہے، لیکن جیسے ہی پتہ چلتا ہے کہ فلاں شخص ایڈز کا مریض ہے، لوگ ملنے سے گھبراتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہمارا معاملہ تو ایڈز سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ہم جس کے پاس جاتے ہیں، وہ عجیب سی نظروں سے

دیکھتا ہے۔اب آپ ہی بتایئے کہ ہم کیا کریں۔ہمارے پاس تو کیس لڑنے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں۔ہم تو روز کنواں کھودتے ہیں اور پانی پیتے ہیں،ہمارے پاس تو دہلی جانے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں'۔اس سے قبل میڈیا کی رپورٹنگ سے ناراض ہوتے ہوئے صادق نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ آخر آپ لوگ (میڈیا والے) اتنی نفرت کہاں سے لاتے ہیں؟کیا صرف الزام لگنے سے کوئی مجرم ہو جاتا ہے؟مجرم تو کوئی اس وقت ہوتا ہے جبکہ ہماری عدالت ثابت کر دیتی ہے۔لیکن آپ اس سے پہلے ہی اسے دہشت گرد اور نہ جانے کن کن الفاظ سے نوازنا شروع کر دیتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں جب سے القاعدہ سے وابستگی کے شک کی بنا پر وطن عزیز میں لوگوں کی پکڑ دھکڑ ہونا شروع ہوئی ہے، تقریباًاس ہی وقت سے انڈین مجاہدین کے نام پر پکڑ دھکڑ کا سلسلہ رک گیا ہے۔ممکن ہے جو لوگ پہلے انڈین مجاہدین کے ذریعہ دہشت گردی پھیلانے کی کوشش کرتے رہے،وہ اب القاعدہ کے نام سے دہشت گردی میں ملوث ہونا چاہتے ہوں۔اس کے باوجود حکومت یہ بتانے میں ناکام رہی ہے کہ سابقہ دنوں جن نوجوانوں کا تعلق انڈین مجاہدین سے تھا،اس انڈین مجاہدین نامی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟اسے کون لوگ چلا رہے ہیں؟اس کا بانی کون ہے؟وغیرہ۔لیکن چونکہ اب داعش اور القاعدہ کے نام پر پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری ہے لہٰذا انڈین مجاہدین نامی تنظیم اور اس سے وابستہ افراداوران

کی دہشت گردانہ سرگرمیوں پر شاید روک لگ گئی ہے۔یا وہ مقاصد جو مقصود تھے وہی اب القاعدہ اور داعش کے نام سے حصول کیے جارہے ہیں۔وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ قیاس اور شک کی بنا پر کی جانی والی گرفتاریاں جب عدالت میں جرح کے ذریعہ سامنے آئیں تو ایک بڑی تعداد باعزت بری ہوئی اور جو الزامات عائد کیے گئے تھے وہ کمزور ثابت ہوئے۔دوسری جانب باعزت بری ہونے کے باوجود طویل مدت جیل میں زندگی گزارنے کے سبب یہ افراد اور ان سے وابستہ اہل خانہ ورشتہ داران مالی اور نفسیاتی پریشانیوں میں حد درجہ ملوث رہے۔یہاں تک کہ سماج میں ایک باعزت زندگی گزارنے ان کے لیے محال ہو گیا۔اس موقعہ پر جہاں ایک جانب حکومت کی ذمہ داری ہے کہ صرف شک کی بنا پر لوگوں کو گرفتار نہ کرے بلکہ گرفتاری کا سبب ہی پختہ ثبوتوں کی بنا چاہیے وہیں میڈیا سرکاری ہو یا نیم سرکاری یا پھر پرائیوٹ،ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ گرفتار شدہ لوگوں کے لیے تب تک لفظ" دہشت گرد"نہ استعمال کریں جب تک کہ ان پر عائد جرم ثابت نہ ہو جائیں۔اور ہماری آج کی گفتگو کا موضوع بھی یہی ہے کہ میڈیا کو نہ متعصب ہونا چاہیے،نہ یک طرفہ اور نہ ہی جانب دار۔

میڈیا کی موجودہ صورتحال پر اگر ہم نظر ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آج کا میڈیا پوری طرح کارپوریٹ کے ہاتھ میں ہے۔کارپوریٹ یعنی یہاں کسی بھی کام میں دولت صرف اسی بنیاد پر لگائی جاتی ہے کہ اس سے منافع کمایا جا

سکے۔دوسرے الفاظ میں جس طرح دیگر روزمرہ کا سامان بازار میں منافع و نقصان کی بنیادوں پر فروخت ہوتا ہے ٹھیک وہی صورتحال میڈیا کی بھی ہے۔یہاں کا کارپوریٹ ورلڈ چاہتا ہے کہ میڈیا پر صرف کی جانے والی دولت کا بھرپور منافع اسے حاصل ہو۔اس ہوڑ اور اس دوڑ میں میڈیا کو اپنی ٹی آر پی.بڑھانا ایک طرح کی مجبوری ہے۔یہ ٹی آر پی ہی کسی چینل کے منافع میں کامیابی و ناکامی سے ہمکنار کرتی ہے۔ان دو صورتوں میں باخوبی سمجھا جاسکتا کہ آج کے میڈیا میں آنے والی خبریں، کس نوعیت کی ہیں ہوسکتی ہیں۔اور انہیں اس بات کی کیا کبھی فکر ہوسکتی ہے کہ جو چیزیں 'خبروں' کے نام پر پیش کی جارہی ہیں، وہ غلط ہیں یا صحیح؟صورتحال کے پس منظر میں جب ہم بات کرتے ہیں تو درحقیقت میڈیا میں آنے والی بیشتر خبریں غیر معتبر و بے مقصد نظر آتی ہیں۔وہیں ان خبروں کا غیر معتبر ہونا، نیوز چینلز، پرنٹ و سوشل میڈیا اور ان سے وابستہ جرنلسٹ حضرات پر بھی سوالیہ نشان لگاتی ہیں۔اس کے باوجود آج بھی میڈیا میں ایسے حضرات موجود ہیں جو سچائی کو ہر ممکن طریقہ سے جاننے کوشش کرتے ہیں، خبر کو خبر کی حدتک محدود رکھتے ہیں، میڈیا میں دولت کی فراوانی اور اس کے بے جا استعمال سے خود کو بچاتے ہیں، کسی مخصوص نظریہ اور فکر کے حاملین کی حمایت و مخالفت اس حدتک نہیں کرتے کہ انہیں جانب دار کہا جائے۔بس یہی وہ حضرات ہیں جن کے دم پر مخصوص چینلس اور اخبارات و پورٹلس اپنی نمایاں پہچان بناتے ہیں۔لیکن کیونکہ اس فیلڈ میں ہر فکر و نظریہ کے حاملیں اپنے

اثرات مرتب کرنے کے لیے بے شمار دولت کو خرچ کرنے کا منصوبہ رکھتے ہیں، لہٰذا یہ مخصوص شناخت کے غیر جانب دار جرنلسٹ حضرات کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی نظر آ رہی ہے۔اور یہ وہ بڑا چیلنج ہے جسے قبول کرنے کے لیے باعزم اور باصلاحیت حضرات کو میدان عمل میں آنے کی اشد ضرورت ہے۔

اس موقع پر اہم ترین کرنے کا کام افراد سازی کا ہے۔میڈیا میں ایسے سچے، دیانت دار اور انسانیت سے ہمدردی رکھنے والے حضرات کو لانے کی ضرورت ہے جو عوام کے مسائل کو جرات و شجاعت کے ساتھ حکومت کے سامنے رکھنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔لیکن پہلی شرط یہ ہے کہ یہ افراد غیر جانب دار ہونے چاہیے۔کسی بھی فکر سے اس حد تک متاثر نہ ہوں کہ اس کی خرابیوں کو بھی بطور خوبی پیش کریں۔کیونکہ ایسی خود ساختہ خوبیاں دیر پا نہیں ہوتیں۔دوسری طرف مختلف حضرات، انجمنیں اور تنظیمیں اپنے اخبارات و رسائل اور چینلس جاری کیے ہوئے ہیں، جو ایک بڑا انفرا اسٹرکچر کا تقاضہ کرتے ہیں، اس کے باوجود، ان چینلس اور اخبارات و رسائل میں شائع شدہ چیزوں کے لیے وہ دوسروں پر منحصر ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کم سے کم اخبارات ورسائل جاری کیے جائیں، لیکن ایسے افراد ضرور تیار ہوں جو پہلے سے جاری اخبارات و رسائل اور نیوز چینلس میں مختلف خدمات انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔افراد سازی کے عمل سے گزرتے ہوئے جو اثرات مرتب ہوں گے وہ دیر پا، دور رس اور زیادہ فائدہ مند ہوں گے، برخلاف اُن

کوششوں کے جن کا مقصد اپنا کوئی اخبار یا پورٹل یا پھر چھوٹا یا بڑا نیوز چینلس قائم کرنا ہوتا ہے، کیونکہ کوششیں قائم کیے جانے تک ہی محدود نہیں ہوتیں بلکہ اس کو برقرار رکھنا اور ترقی دینا ایک مشکل ترین مرحلہ ہے۔اس کے ہر گز یہ معنی نہیں ہیں کہ باصلاحیت افراد یا ادارے ان کوششوں کو ترک کردیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر دو سطح پر سعی و جہد کی ضرورت ہے۔ لیکن سعی و جہد کا زیادہ حصہ افراد سازی کے لیے ہونا چاہیے،تاکہ یہ افراد اندرون خانہ اور بیروں خانہ ہر دو سطح پر کارآمد ثابت ہوں۔اور آخر میں یہ بات بھی اہم ہے کہ جس طرح آج کے حالات میں میڈیا میں لوگ صرف اور صرف دولت کمانے کی دھن میں مصروف ہیں، متذکرہ افراد سازی اور عملی میدان میں سعی و جہد ، دنیا کو یہ پیغام دے کہ ہم موجودہ ٹرینڈس سے اتفاق نہیں رکھتے۔ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس میدان میں آنے کا مقصد صرف دولت کا حصول ہو بلکہ اس میدان میں ہمارے دخول کا مقصد اگر کچھ ہے تو صرف اور صرف قرآن حکیم کی وہ تعلیمات جس میں فرمایا گیا کہ : "اے ایمان لانے والو اگر تمہارے درمیان کوئی فاسق (جھوٹا شخص) کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو،ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو لاعلمی میں (ناحق) تکلیف پہنچا بیٹھو، پھر تم اپنے کیے پر پشیمان ہو" (الحجرات:٦)۔اور یہ بھی کہ:۔" جنہوں نے ایمان اور نیک عملی کا رویہ اختیار کیا ہے انہیں ان کے اجر پورے پورے دے دیے جائیں گے۔اور (خوب جان لو کہ)ظالموں سے اللہ ہرگز محبت نہیں کرتا" (آل عمران: ۵۷)۔

! نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

انگلش اخبار ہندوستان ٹائمز کی رپورٹ کی روشنی میں سال 2015 میں جن تین ممالک میں سب سے زیادہ صحافی حضرات قتل ہوئے ان میں ہندوستان سر فہرست ہے۔رپورٹرس وِدآوٹ بارڈرس کی شائع رپورٹ کے مطابق پاکستان اورافغانستان کے بالمقابل ہندوستان میں گزشتہ سال سب سے زیادہ صحافی حضرات ہلاکت کا شکار ہوئے ہیں۔رپورٹ بتاتی ہے کہ ہلاک شدہ صحافیوں کے پس پشت ہندوستانی سیاست اور جرائم سے وابستہ افراد کا ہاتھ ہے۔یہ خبر نہ صرف حد درجہ افسوس ناک ہے بلکہ سیاست اور جرائم کے رشتہ کو بھی خوب اچھی طرح واضح کرتی ہے۔وہیں دوسری جانب یہ ہلاکتیں ملک کے نظم و نسق پر بھی راست سوالات کھڑے کرتی ہیں۔واقعہ بہت بڑا اور اہم ہے اس لحاظ سے صحافی حضرات کا منظم قتل سال کے اختتام پر ایک بڑی خبر بنا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ممکن ہے موجودہ دور میں جس طرح انسانی جانیں کہیں منظم و غیر منظم جنگوں کی نظر ہوئی ہیں،اس کے نتیجہ میں صحافی حضرات کی ہلاکتیں تعداد کے لحاظ سے شاید کوئی خاص معنٰی نہ رکھتی ہوں۔اس کے باوجود بلا سبب انسانی جان کا قتل پوری دنیا میں چاہے ایک ہی ہو قابل توجہ ہے۔لیکن معاملہ یہ ہے کہ آج نہ انسانوں کی کوئی اہمیت ہے،نہ ان کے مسائل کی اور نہ ہی ان کی زندگی کی۔کیونکہ موجودہ دور میں دنیا پر چند طاقتور افراد و گروہوں کا غلبہ

ہے، لہٰذا اُن کی موت اور اُن کے مسائل ہی دراصل مسائل ہیں۔ باقی مسائل روزمرہ کے مسائل ہیں، جنہیں دنیا کے بااقتدار افراد و گروہ اہمیت کا حامل نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ چند مخصوص طاقتیں دنیا پر مسلط ہیں اور وہ نہیں چاہتیں کہ کوئی دوسرا گروہ یا طاقت دنیا میں ابھرے اور اپنی پہچان بنائے۔ اس پس منظر میں گزشتہ ایک سال میں ہندوستان نے دنیا کے دیگر ممالک کے ساتھ بین الاقوامی تعلقات نہ صرف مزید استوار کیے ہیں بلکہ یہ بھی کوشش کی ہے کہ وہ دنیا کے بڑے ممالک کے سامنے ایک نئی شناخت کے ساتھ ظاہر ہو۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ ہندوستان مستقبل قریب میں دنیا میں طاقت کا ایک اہم سرچشمہ تسلیم کیا جائے۔ وجہ؟ ہندوستان کے پاس نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ہے، جنہیں اگر باصلاحیت بھی بنا لیا جائے تو پھر مقاصد کے حصول میں دشواریاں کم سے کمتر ہوتی جائیں گی۔

دوسری جانب گزشتہ سال 2015 میں ہندوستان میں جس طرح عدم رواداری کے معاملات سامنے آئے ہیں، وہ ایک تشویشناک پہلو ہے۔ اور یہی وہ پہلو بھی ہے جو دنیا میں ہندوستان کی رسوائی کا سبب بنتا رہا ہے۔ ان حالات میں جن عزائم کے ساتھ ملک کو آگے بڑھنا چاہیے تھا وہ نہیں ہو سکا۔ وہیں غربت و افلاس کو دور کرنے کے منصوبہ پر اُس درجہ عمل نہیں کیا جا سکا جو مطلوب تھا۔ اور یہ ہوتا بھی کیسے؟ جبکہ ایک طبقہ مسائل پیدا کرنے میں ہی صرف مصروف تھا۔ اس موقع پر جو

اہل اقتدار ہیں انہیں بھی تو ان لوگوں کو بھی جو ملک کی ترقی و فلاح و بہبود کے نام پر ہر الیکشن میں ووٹ مانگتے ہیں، سوچنا چاہیے کہ مل جل کر ملک کی ترقی و فلاح بہبود میں کام کیسے کیا جائے؟کیا یکساں ترقی کا راز یہی ہے کہ ملک کا ایک مخصوص طبقہ تو اس کام میں ہاتھ بٹائے لیکن ایک دوسرے بڑے طبقہ کو مسلسل نظرانداز کیا جائے؟

در حقیقت ہندوستان اپنے جغرافیہ کے لحاظ سے بہت بڑا ملک ہے۔یہاں بے شمار تہذیبیں پائی جاتی ہیں۔جن کے اپنے رسم و رواج اور طور طریق ہیں۔پھر ہندوستان میں ریاستوں کی ایک بڑی تعداد ہے،جہاں آئے دن مختلف سطح کے سیاسی انتخابات عمل میں آتے ہیں۔لہٰذا یہاں ہر دن عوام اور سیاسی لیڈران کو مقاصد کے پیش نظر مخصوص موضوعات درکار رہتے ہیں۔اس کے باوجود سیاسی لیڈران کے پیدا کردہ ایشوز ہی عموماً گردش میں رہتے ہیں۔برخلاف اس کے عوام کے حقیقی مسائل پس پشت نظر آتے ہیں۔اس کی ایک بڑی وجہ عوام میں سیاسی بیداری کا فقدان ہے۔تو وہیں دوسری جانب جذباتی مسائل میں عوام کا کوئی اپنا پختہ موقف نہ ہونا ہے بھی ایک مسئلہ ہے۔مثلاً گزشتہ دنوں دہلی سے قریب دادری میں ایک شخص کے گھر میں چند لوگ چڑھ دوڑے صرف اس بنا پر کہ اُس گھر میں گوشت کا استعمال کیا جا رہا تھا۔کہا گیا کہ وہ گائے کا گوشت ہے ،لہٰذا اس کی جان لینی چاہیے، کیونکہ وہ "مقدس گائے" سے اپنی بھوک مٹا رہا ہے۔لیکن جب رپورٹ سامنے

آئی تو معلوم ہوا کہ وہ گوشت "مقدس گائے" کا نہیں بلکہ بکرے کا تھا۔اب عوام و خواص سب خاموش تماشائی بنے ہیں؟شاید وہ کنفیوژن کا شکار ہیں یا پھر تذبذب میں مبتلا ہیں یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوں! ایسے بے شمار وقتی مسائل ہیں، جن پر ٹھہر کر سوچنا چاہیے کہ ہم جو کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں یا جن لوگوں کے کہنے پر مخصوص ردّعمل کا اظہار ہوتا ہے،اس کے دوررس نتائج کیا نکلیں گے؟ لہٰذا عوام کو صرف اسکول اور کالج میں ہی تعلیم یافتہ بنادینے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اُن تعلیمات سے بھی آشنا کیا جائے جس کے ذریعہ نفرتیں کم ہوں تو وہیں آپسی رشتے مضبوط بنیادوں پر استوار کیے جاسکیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندوستان میں متشدد تنظیمون نے گزشتہ دنوں گھرواپسی کے نام پر تبدیلی مذہب پر سوالات اٹھائے تھے۔ مسئلہ کا حقیقی رخ یہ ہے کہ اِن متشدد تنظیموں وسربراہان کو مخصوص مذہب سے نفرت و کراہیت ہے۔لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح نفرت کی آگ میں وہ جل رہے ہیں ٹھیک اسی مانند دیگر اہل ملک بھی نفرت کی آگ میں جھلس جائیں ۔اس کے باوجود تبدیلی مذہب آج بھی اُن کی ناک کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس مذہب کو وہ تبدیل کرنے سے روکتے ہیں،اس میں عدل و انصاف کی بنیادوں پر اتنی جان ہے ہی نہیں کہ اس پر مستقل مزاجی کے ساتھ عمل پیرا رہا جانا ممکن ہو۔سال کے آخری دن جس طرح

افسر امراؤ سلودیا نے دلتوں کے ساتھ (وہ خود بھی ہیں) بھید بھاؤ کا IAS جانے مانے رویہ اپنانے کی بات کہی اور ناراضگی کے اظہار میں مذہب تبدیل کیا، وہ خود ان لوگوں کے لیے سوچنے کا اہم موقع فراہم کرتا ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو تبدیلی مذہب پر روک لگانا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر کوئی کیوں بلا روک ٹوک ایک ہی مذہب کو اختیار کیے رہے جبکہ اُس مخصوص مذہب میں متعلقہ شخص کو اطمینان بھی نہ حاصل ہو؟ اس واقعہ میں ایک دوسرا پہلو بھی سامنے آتا ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جن کا اختیار شدہ مذہب امراؤ سلودیا نے قبول کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس مذہب میں درحقیقت اِس قدر جاذبیت ہے کہ ہر طرح کے مسائل پیدا کیے جانے کے باوجود لوگ بلا خوف و ہراس بڑے پیانہ پر لوگ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ بشرطیکہ مذہب کے ٹھیکدار اپنے مذہب پر عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ تمام اوصاف حمیدہ اپنے اندر پیدا کرلیں، جن سے اُن کا مذہب تقاضہ کرتا ہے۔

آخر میں کہنا چاہیں گے کہ گرچہ سال 2015 میں وطن عزیز میں اچھے واقعات کم اور برے زیادہ سامنے آئے۔ اس کے باوجود دن بھی گزر گئے، واقعات بھی اور وہ لمحات بھی جن سے ہم اور آپ افسردہ ہوئے ہیں۔ اور یہ دن، مہینہ اور سال ایسے ہی گزرتے رہیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے اپنے دن جبکہ ہمیں ہر طرح کی پریشانی، آزمائش اور مسائل سے بچالیا گیا، کیسے گزارے؟ کیا ہم نے اپنے وقت، صلاحیتوں

اور وسائل کا صحیح استعمال کیا؟ اگر کیا تو بہت خوب لیکن اگر نہیں کیا تو ایک بار پھر دن بھی موجود ہ، مہینہ بھی اور سال بھی ،جب تک کہ موت کے فرشتے ہماری روح قبض کرنے نہ چلیں آئیں ۔ لہذا جو کچھ بھی میسر ہے اور جس قدر بھی ای لحاظ سے اس کا استعمال بھی کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ مسائل نہ کبھی ختم ہوتے ہیں اور نہ ہوں گے۔ یہ گزشتہ سالوں میں رونما ہوئے ہیں، اس سال بھی ہوں گے اور آئندہ سالوں میں بھی۔ اور یہ جب جب رونما ہوں گے ان سے نمٹنے کے لیے ای وقت لائحہ عمل بھی تیار کیا جائے گا۔ برخلاف اس کے ہماری اور آپ کی زندگی میں کچھ کام ایسے لازماً ہونے چاہیں جو مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے مثبت بنیادوں پر مستقل جاری رہنے چاہیں۔ کیونکہ نہیں معلوم کہ موت کا فرشتہ کب آ دھمکے۔ اس کے باوجود موت کا ایک دن معین ہے، نیند کیوں رات بھر نہیں آتی!

! فلاح و بہبود کے کاموں میں حکومت کا تعاون کیا جانا چاہیے

کل صبح دہلی کے پرگتی میدان میں جاری عالمی کتاب میلہ میں شرکت کا موقع ملا تو کیا دیکھتے ہیں کہ دہلی کی وہ سڑکیں جہاں سکون و اطمینان کے ساتھ کم ٹریفک میں گزشتہ کئی دنوں سے سفر کیا جانا ممکن تھا ایک بار پھر بھیڑ بھاڑ اور ٹریفک جام کی کیفیت میں تبدیل ہو گئی ہیں۔آپ جانتے ہیں کہ دہلی حکومت نے یکم تا پندرہ جنوری 2016 آزمائشی طور پر ایک مہم چلائی تھی جس کا سبب دہلی میں بڑھتی ہوئی فضائی آلودگی ہے۔دوران مہم شہر میں تقریبا ایک چوتھائی گاڑیوں کو سڑک پر آنے سے روکا گیا جس سے ٹریفک کی روانی سہل انداز میں ہوئی۔ ایک اندازے کے مطابق شہر میں 30 لاکھ گاڑیاں ہیں۔ان میں سے پرائیوٹ گاڑیوں پر جب چند دنوں کے لیے روک لگائی گئی تو اس کے فوائد بھی سامنے آئے ۔دوسری جانب سال رواں کے موسم سرما میں دہلی میں فضائی آلودگی کی سطح خطرناک حد تک پہنچ گئی ہے۔شہر میں آلودگی کی سطح بین الاقوامی ادارہ صحت کی طے شدہ حد سے دس گنا زیادہ ہونے کے بعد عدالت کی جانب سے آلودگی سے نمٹنے کے لیے دیے جانے والے حکم کے بعد ہی ریاستی حکومت کی جانب سے حالیہ اقدامات اٹھائے گئے ہیں۔ عوام نے جس مثبت انداز سے مہم کا خیر مقدم اور بھر پور تعاون کیا اس کی امید مہم سے قبل نہ انتظامیہ کو تھی ،نہ حکومت کو اور نہ ہی حزب اختلاف کو۔یہی وجہ ہے کہ مہم

سے قبل کئی جانب سے مخالفت میں اٹھنے والی آوازیں اُس وقت اچانک بند ہو گئیں جبکہ شہریوں نے نہ صرف دلچسپی دکھائی بلکہ تعاون بھی کیا۔اور چونکہ دہلی میں فضائی آلودگی ایک بڑا مسئلہ ہے جس میں ہر شخص مبتلا ہے لہٰذا یہ مسئلہ ،مسئلہ کا حل اور طریقہ کار، جو گرچہ حکومت نے طے کیا تھا، ہر شخص کا مسئلہ بن گیا۔اور واقعہ یہ ہے کہ تمام ہی لوگوں نے موجودہ حکومت کے جفت اور طاق اعداد کے فارمولہ پر عمل کرنا پسند کیا۔لیکن چونکہ یہ بہت محدود مدت کے لیے تھا،اس کے خیر خواہ نتائج فوراً نظر آنا ممکن نہیں ہیں۔ضرورت ہے کہ آئندہ دنوں میں ہم اور آپ مل کر نہ صرف حکومت کی بلکہ خود اپنی اور اہل خانہ کی بھی مدد کریں۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دارالحکومت نئی دہلی نے دنیا کے سب سے آلودہ شہر بیجنگ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔نئی دہلی میں فضائی آلودگی کی سطح بیجنگ سے ڈھائی گنا زیادہ ہے۔فضائی آلودگی کا مطلب ہوا میں نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ، سلفر ڈائی آکسائیڈ اور کاربن مونوآکسائیڈ کی مقدار عالمی ادارہ صحت کی جانب سے طے کیے گئے معیار سے زیادہ ہونا ہے۔آلودگی کا معیار سے زیادہ ہونا اور سانس کے ذریعے کاربن مونو آکسائیڈ، سیسہ اور کیڈمیئم پھیپھڑوں میں جانے کے باعث نہ صرف سانس کی بیماریوں میں حد درجہ اضافہ ہوا ہے بلکہ آنکھوں اور دل کے امراض بھی عام ہوتے جا رہے ہیں۔نئی دہلی میں قائم سینٹر فار

سائنس اینڈ انوائرنمنٹ کی ایگزیکیٹو ڈائریکٹر انومیتا رائے چوہدری کہتی ہیں کہ اس شہر نے 2004ء اور 2005ء میں جو کامیابیاں حاصل کی تھیں، اب وہ ان سے محروم ہو چکا ہے۔ایک دور میں جب نئی دہلی کی آبادی 9.4 ملین تھی، شہر کو کنٹرول کرنا نسبتاً آسان تھا۔ لیکن اس وقت آبادی 16 ملین تک جا پہنچی ہے، جسے کنٹرول کرنا ایک مشکل ترین عمل ہے۔دارالحکومت کی فضا کو بہتر بنانے کے لیے 1998 سے 2003ء تک ایک کامیاب پروگرام چلایا گیا تھا، جس کے تحت بجلی گھروں کو شہر کے مرکز سے دور منتقل کیا گیا، بسیں اور رکشے چلانے کے لیے سی این جی استعمال کی گئی، جو ایندھن کی دیگر اقسام کے مقابلے میں سب سے کم آلودگی پیدا کرتی ہے، لیکن یہ عمل برقرار نہ رہ سکا۔

وہیں دوسری جانب عالمی ادارہء صحت (WHO) کے مطابق ہوا میں دس مائیکرو میٹر سے کم سائز کے PM10s کہلانے والے ذرات انسانی صحت کے لیے بے انتہا خطرناک ہیں۔ چونکہ یہ انتہائی باریک ذرات انسانی پھیپھڑے تک بہ آسانی پہنچ جاتے ہیں اور مستقل اپنی موجودگی ظاہر کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں ذرات کی وجہ سے ہر سال دنیا بھر میں 1.34 ملین انسان موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ دارالحکومت دہلی میں بھی ایسی اموات ہزاروں میں درج کی جا رہی ہیں۔ صورتحال کے پیش نظر جہاں ایک طرف WHO نے ہوا میں اِن ذرات کی زیادہ سے زیادہ مقدار 20 ذرات فی کیوبک میٹر تجویز کی ہے۔ وہیں دوسری طرف نئی دہلی انتظامیہ نے 100 ذرات فی

کیوبک میٹر کی قانونی حد مقرر کی ہے۔برخلاف اس کے آج کل اکثر دہلی میں 300 ذرات فی کیوبک میٹر ناپے جارہے ہیں۔ تجزیہ کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دارالحکومت دہلی کی فضا حد درجہ زہر آلود ہے۔جس کے نتیجہ میں نہ صرف انسان بلکہ چرند وپرند،حیوان اور نباتات تک حد درجہ متاثر ہیں۔اب جبکہ مسئلہ کے حل کے طور پر صرف پندرہ دن کے تجرباتی دور میں 30% فضائی آلودگی میں کمی آئی ہے۔اگر یہ عمل مستقل انجام دیا جائے ساتھ ہی این سی آر میں چلنے والی ڈیزل گاڑیوں پر بھی کنٹرول کیا جائے تو ممکن ہے فضا صاف ہو،مسئلہ کا حل متعین ہواور صحت عامہ کی بڑی پریشانیوں سے بھی ہم نجات پا جائیں۔لہٰذا اس مسئلہ کو حکومتی وعوامی ہر دو سطح پر نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

ایک اور خوش آئند خبر گزشتہ دنوں ریاست بہار سے آئی ہے۔خبر کے مطابق بہار میں اپریل 2016 سے شراب نوشی اور اس کی فروخت پر پابندی کا اعلان کیا گیا ہے۔موجودہ حکومت نے گزشتہ دنوں ریاستی انتخابات کے دوران شراب پر مکمل پابندی کا وعدہ کیا تھا۔شراب نوشی اور منشیات کی خرید فروخت گرچہ مرکزی وریاستی حکومت کی آمدنی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔اس کے باوجود یہ معاونت بے شمار سماجی،معاشی،معاشرتی خاندانی اور صحت کے مسائل میں اضافہ کا سبب ہے۔وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے ایک تقریب کے دوران کہا کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خواتین شراب نوشی سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں،اس وجہ سے میں نے

اپنے افسران کو ہدایت جاری کی ہے کہ وہ آئندہ مالی سال سے اس پابندی پر عمل درآمد کی تیاریاں کریں۔تاہم انہوں نے اس حوالے سے مزید وضاحت نہیں کی کہ وہ اس پابندی پر کس طرح عمل درآمد کروائیں گے ۔اور اس سے ہونے والی مالی خسارہ کو کیسے پورا کیا جائے گا؟بحر حال یہ حکومت کا معاملہ ہے اور حل کے لیے لازماً اس نے کوئی نہ کوئی طریقہ بھی طے ہوگا۔لیکن ایک مرحلہ میں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حکومت کو خسارہ ہوتا ہے۔تب بھی شراب پر پابندی سے حکومت معاشرتی،خاندانی اور صحت کے بے شمار مسائل سے نجات پائے گی۔جس کے نتیجہ میں ایک صحت مند معاشرہ تشکیل پائے گا۔اور اس صحت مند معاشرے سے لازماًیہ امید وابستہ کی جاسکتی ہے کہ وہ معاشی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرے گا۔

آپ یہ بات بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ منشیات کے استعمال سے خرابیٔ صحت کے مسائل بڑے پیمانہ پر رونما ہوتے ہیں۔ہاضمہ متاثر ہوتا ہے،جگر کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں،ہائی بلڈ پریشر اور لو بلڈ پریشر جیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں،دل متاثر اور دل کی بیماریاں بڑھتی ہیں،ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں،کینسر پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں،انیمیا ہوتا ہے،یادداشت کمزور ہوتی ہے،خود پر کنڑول رکھنے یہاں تک کہ چلنے پھرنے میں بھی دشواری ہوتی ہے،نیند متاثر ہوتی ہے ،ساتھ ہی متاثرہ افراد بڑے پیمانہ پر ڈیپریشن کا

شکار ہوتے ہیں، وغیرہ۔ وہیں دوسری جانب سماجی مسائل میں خاندان متاثر ہوتے ہیں، رشتوں میں ناچاقیاں بڑھتی ہیں، صنف نازک پر ظلم وزیادتیوں میں اضافہ ہوتا ہے، بچوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سڑک حادثات انسداد قانون کے واقعات میں اضافہ ہوتا ہے، نشہ خوری کی لت میں چوری و ڈکیٹی، کے واقعات میں مزید بڑھ جاتے ہیں ساتھ ہی صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کی تمیز ختم ہوجاتی ہے۔ اس صورت میں ہم اس فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ ریاستی سطح پر اس میں تعاون کیا جائے گا۔ اور ایک اچھے فیصلہ میں تعاون کیوں نہ کیا جائے جبکہ راست فائدہ ہمارا ہی ہے!

کہیں آپ بھی فکر و نظر سے محروم تو نہیں!

بی جے پی کے رہنما سبرامنیم سوامی نے حیدرآباد یونیورسٹی میں دلت ریسرچ اسکالر روہت ویمولا کی خودکشی کے معاملے میں تحریک چلانے والے طالب علموں کے بارے میں قابل اعتراض رائے زنی کی ہے۔ سوامی نے مخالفت کرنے والے والوں پر ہی متنازعہ بیان دے ڈالا ہے۔ مخالفت کرنے والوں کا موازنہ انہوں نے نظام کا پیچھا کرنے والے کتوں سے کیا ہے۔ ٹویٹ میں سوامی نے لکھا ہے حیدرآباد میں چل رہی مخالفت ڈرامہ بن گئی ہے۔ اقتدار مخالف لیفٹ اور دیگر ڈرامہ کر رہے ہیں۔ یہ اقتدار کی مخالفت کے پیچھے ریسرچ والے کتوں کی طرح ہے۔ دوسری جانب ویمولا کی خودکشی کے خلاف اٹھ رہی آوازوں کے درمیان آر ایس ایس نے کہا ہے کہ یونیورسٹی کے طلبا کسی غدار وطن کی حمایت میں تحریک کس طرح کر سکتے ہیں؟ پرچارک ڈاکٹر منموہن وید نے ناگپور کے ریشمی باغ واقع سنگھ آفس میں یہ سوال اٹھایا۔ انہوں نے کہا کہ سپریم کورٹ کی جانب سے دی گئی سزا کی مخالفت کرنے والے عناصر یونیورسٹی میں کس طرح ہو سکتے ہیں؟ معاملہ یہ ہے کہ روہت ویمولا حیدرآباد مرکزی یونیورسٹی کے تحقیق کے طالب علم تھے۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے انہیں اور ان کے چار ساتھیوں کو معطل کر دیا تھا۔ اس کی مخالفت میں وہ تحریک چلا رہے تھے۔ 17، جنوری کو روہت نے پھانسی لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ روہت کی خودکشی کے سوال پر وید نے اس واقعہ

کو ذات کے نام پر معاشرے میں امتیاز کھڑے کرنے کی بدقسمت کوشش سے تعبیر کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ روہت ویمولا کی خودکشی نے ،اخلاق کی موت اورایوارڈ واپسی کے بعد ایک بار پھر بڑے سوالات پیدا کر دیے ہیں۔سوالات میں سب سے بڑا سوال منووادی نظام ہے۔جس نے انسانوں کو انسانوں ہی کے درمیان چھوٹا بڑا اور عزت وذلت گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔وہیں موجودہ واقعہ کے پس منظر میں ہندوسماج کے غیر منصفانہ ذات پات کے نظام کو ایک بار پھر تنقید کا سامنا ہے۔کہا جا رہا ہے کہ ایک انسان اور اسی کے طرح کے دوسرے انسان کے درمیان اعلیٰ و ادنی کا فرق صرف اس بنا پر کیسے ممکن ہے کہ وہ دو الگ الگ خاندانوں میں پیدا ہوئے ؟کیا ایک دلت کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ اور برہمن یا کسی اور بڑی ذات کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ،صرف گھروں یا خاندانوں کی تبدیلی سے عزت وذلت کے مقام پر فائز ہو سکتے ہیں؟یا اسلام کے دیئے گئے اصول کے مطابق ہی کوئی انسان دوسرے سے اعلیٰ و ادنی ہوگا جبکہ وہ اخلاق و کردار کے پیانہ پر بھی اعلیٰ ہو ؟

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں آریوں کی آمد ہی نے ہندوسماج کو طبقاتی کشمکش میں مبتلا کیا ہے۔اس کے باوجود آزادی کے بعد اور اس سے قبل ہی دلت سماج کو

یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ منو وادی سماج کا حصہ نہیں بن سکتا۔ لہذا اپنی مخصوص شناخت کو برقرار رکھنے یا ذلت سے اٹھ کر عزت کی زندگی جینے کے لیے ایک جانب جہاں انہوں نے علم و حرفت میں مقام بنانے کی سعی و جہد کی۔ وہیں ساتھ ہی ساتھ حصول اقتدار میں بھی منظم و منصوبہ بند جدوجہد کا آغاز کیا ہے۔ اس لحاظ سے انہیں جو سب سے بڑا دشمن نظر آیا وہ 'ہندوتو' کے حاملین تھے اور ہیں۔ اس پورے پس منظر میں آزادی کے بعد کے ہندوستان کو چار بڑے افکار و نظریات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک ہندوتو کے حاملین، دوسرے کانگریسی فکر کے حاملین، تیسرے اشتراکیت کے حاملین یا لیفٹ پارٹیاں اور چوتھے بہوجن سماج یا دلت طبقات۔ اور دیکھا جائے تو ان چاروں ہی طبقات کو آزادی کے بعد دو بنیادی چلینجز کا سامنا ہوا ہے۔ ایک، نئے حالات میں ذات پات کے نظام کو برقرار رکھنا اور دوسرا، ہندو سماج کے جذباتی اتحاد کے لیے مذہب کی بجائے کوئی متبادل بنیاد فراہم کرنا۔ پروفیسر محمد رفعت اپنی کتاب فرد، معاشرہ اور ریاست میں لکھتے ہیں ملک کی تحریک آزادی کی قائد کانگریسی فکر نے پہلے چیلنج کا جواب اس طرح دیا کہ ذات پات کے نظام میں بعض سطحی اور ضمنی اصلاحات کیں۔ اور دوسرے چیلنج میں انہوں نے نیشنلزم کو اتحاد کی نئی بنیاد کے طور پر اختیار کیا۔ ہندوتو کے حاملین نے بھی ان دونوں چیلنجوں کا جواب دیا۔ پہلے چیلنج کے سلسلے میں ان کا رویہ کانگریسی فکر کے حاملین کے رویہ سے ہم آہنگ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کانگریسی چھوت چھات کے خاتمہ اور ہریجن کی

نئی اصلاح کے رواج کے کاموں کو زور و شور سے کرتے تھے،جب کہ ہندتو کے علم
.برداروں نے عام طور پر ذات پات کے مسئلہ پر خاموشی اختیار کی۔در حقیقت ذات
پات کے نظام کے مکمل خاتمہ کے قائل کانگریسی تھے نہ ہی ہندوتو کے علم.بردار،البتہ ضمنی
اصلاحات کے روادار دونوں تھے۔وہیں دوسرے چیلنج کے جواب میں ہندوتو کے علم
.برداروں کا یہ خیال تھا اور ہے کہ کانگریس کا مبہم 'نیشنلزم' ایک بے جان تصور ہے اور
ہندو سماج کے اندر نیا حوصلہ،امنگ اور ولولہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔مزید
.برآں یہ خرابی بھی ہے کہ تہذیبی اقلیتوں کی انفرادیت باقی رہتی ہے اور وہ کسی وقت
بھی مضبوط ہو کر ہندو سماج کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔چناں چہ ہندتو کے حاملین محض
نیشنلزم کو کافی نہیں سمجھتے،بلکہ 'کلچرل نیشنلزم' کا تصور پیش کرتے ہیں۔کلچرل نیشنلزم کا
تقاضہ ہے کہ ملک کے ایک ایک فرد کے اندر اس ملک کی روایتی تہذیب و تاریخ
.بزرگوں و رسوم و رواج سے گہری جذباتی وابستگی پیدا کی جائے۔یہ باشندے محض،
ایک سیاسی وحدت نہ بنیں بلکہ ان کے جذبات بھی اس ملک کے روایتی ڈھانچے میں
ڈھل جائیں۔کلچرل نیشنلزم کے اس پروگرام کو.بروئے کار لانے کے لیے وہ یہ بھی
ضروری سمجھتے ہیں کہ تہذیبی انفرادیت ختم ہو جائے۔اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس
کلچرل نیشنلزم کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو وہ بہت ہی حقارت آمیز سمجھتے
ہیں۔حقارت آمیزی کے پس منظر ہی میں دیا جانے والا وہ بیان ہے جسے فی الوقت
سبرامنیم سوامی نے اقتدار کی مخالفت کے پیچھے ریسرچ والے کتوں سے تشبیہ دی

ہے۔اور یہ حقیر جاننا اور اس پر بیان بازیاں پہلی مرتبہ نہیں ہیں بلکہ گزشتہ سالوں میں یہ ذہنیت بہت کھل کر سامنے آئی ہے۔نتیجہ میں کبھی دلتوں کو کتے سے تعبیر کیا گیا تو کبھی ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو کتے کے پلّوں سے موازنہ کیا گیا۔

گفتگو کے پس منظر میں سوال اٹھتا ہے کہ امبیڈکر وادی مظلوم طبقہ کے پاس مظلومیت سے نکلنے کا واحد حل کیا صرف حصول اقتدار ہے؟اور اگر وہ کسی بھی سطح پر اقتدار حاصل بھی کر لیں تو کون سا نظریہ اور ideology نافذ کریں گے؟دوسری جانب معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے ابھی تک اس پہلو سے چیلنج کو قبول کیا ہی نہیں ہے۔اور چونکہ سارا زور مظلومیت سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا مظلومیت کے شکار فکری اعتبار سے انتقامی جذبہ رکھتے ہیں اور وہ کوئی متبادل نظام یا نظریہ تجویز نہیں کرتے۔البتہ وہ چاہتے ہیں کہ اب تک جو طبقات محروم رہے ہیں،انہیں اقتدار حاصل ہونا چاہیے۔اور جب انہیں اقتدار حاصل ہو جائے گا تو ظالم سے ظلم کا بدلہ لینا آسان ہوگا۔ظلم و ستم سے چور ان طبقات میں اقتدار کا نشہ ہی ہے کہ وہ انہیں مقصد سے وقتاً فوقتاً بھٹکاتا بھی رہتا ہے۔جس کے نتیجہ میں بے شمار دلت رہنما اُسی ہندوتو وادی فکر کے حاملین کا لقمہ اجل بن جاتے ہیں جن سے نجات کے لیے وہ کبھی کھڑے ہوئے تھے۔ہندوستانی سیاست میں یہ نظارہ بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ اقتدار پر مبنی جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی جسے

عرف عام میں بی جے پی کہا جاتا ہے، وقتی حصول اقتدار کے نشہ میں، وہ اپنی منزل مقصود کو بھول کر قلیل مدت کامیابی و عزت و منزلت کے لیے وہ اسی کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں، جس کے خلاف وہ کبھی کھڑے ہوئے تھے۔

سوال مسلمانوں سے بھی ہونا چاہیے، وہی سوال جو امبیڈ کر وادیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ کہ آیا آپ کی سعی و جہد جو کچھ بھی آپ انجام دے رہے ہیں اس کا حاصل اور منزل مقصود کیا ہے؟ اگر آپ اور وہ دونوں ہی کنفیوژن کا شکار ہوں تو پھر ان میں اور آپ میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟ ظلم کا شکار آپ بھی ہیں، بے مقصدیت سے آپ بھی نبرد آزما ہیں، حصول اقتدار کے لیے آپ بھی کوشاں ہیں۔ اس کے باوجود کہیں آپ بھی فکر و نظر سے محروم تو نہیں!

!سیاسی بساط پر لال، ہرا یا نیلا جھنڈا کب تک تھامے رہیں گے

ہمارا ملک ہندوستان نہ صرف آبادی کے لحاظ سے ایک بڑا ملک ہے بلکہ افکار و نظریات، مذاہب، ثقافت، تمدن، جغرافیہ، وسائل اور مسائل کے لحاظ سے بھی ایک بڑا ملک ہے۔اس صورت میں ہر آنے والے دن کا آغاز گزشتہ دن کے مقابلہ نئے چیلنجز کے ساتھ ہوتا ہے۔برخلاف اس کے آبادی کے لحاظ سے چین دنیا میں سب سے اوپر ہے لیکن چین اور ہندوستان میں فرق یہی ہے کہ چین میں مذہبی و ثقافتی بنیادوں پر بظاہر ہم آہنگی پائی جاتی ہے لیکن حقیقت میں وہاں ہر قسم کی آزادی سلب کی جاچکی ہے۔وہیں ہندوستان کی نمایاں خوبی ہے کہ یہاں ہزار پابندیوں کے باوجود شخصی، مذہبی، ثقافتی اور افکار و نظریات کی آزادی موجود ہے۔برخلاف اس کے چین اوران جیسے دیگر ممالک میں جمہوری نظام کے ظاہری پہلو پس پشت حد درجہ عوامی اور اجتماعی اختیارات طویل مدت سے ختمکیے جاچکے ہیں۔ان ممالک میں انسان مادی ترقی کے مراحل توطے کرتا نظرآرہاہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان کے ذہن و قلب اور اس کے افکار نظریات واحساسات تک کواسٹیٹ کا پابند بنادیا گیا ہے۔ان حالات سے گزرنے والے اکثر ممالک وہ ہیں جہاں آج بھی کمیونزم جڑیں مضبوطہیں۔مشہور کمیونسٹ ممالک میں چین، نارتھ کوریا، ویت نام، لوس، اور کیوبا ہیں۔ گرچہ یہ ممالک خود کو سوشلسٹ اسٹیٹ یا ورکرس اسٹیٹ کہلانا پسند کرتے ہیں اس کے باوجود نظریاتی

اعتبار سیہ کمیونسٹ اسٹیٹ ہیں۔ساتھ ہی یہ وہ ممالک بھی ہیں جہاں مخصوص نظریہ کے علاوہ دیگر نظریات کی تبلیغ ممنوعہ ہے اور فکری آزادی کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔نیز یہ ممالک نظریہ کے اعتبار سے سنگل پارٹی سسٹم پر قائم ہیں۔

ہندوستان میں بھی کمیونزم کا نظریہ آزادی سے قبل موجود ہے اور دو مخصوص ریاستیں مغربی بنگال اور کیرلہ میں نظریہ کے حامیوں کی حکومتیں بھی طویل عرصہ رہی ہیں ۔عام طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ کمیونسٹ کے معنی دہریہ کے ہیں۔یعنی وہ کسی مذہب کا پیروکار نہیں یا کائنات کے خلق ہونے اور اس کے خالق پر یقین نہیں رکھتے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ کمیونسٹ دہریہ ہو سکتا ہے لیکن سارے کمیونسٹ دہریے نہیں ہوتے اور ہر دہریہ کمیونسٹ بھی نہیں ہوتا۔دراصل کمیونزم ایک سیاسی نظریہ ہے، مذہب نہیں۔یہی وجہ ہے کہ برصغیر ہندوپاک میں کمیونزم سے متاثر و منہمک مسلمانوں کی "بڑی شخصیات سرگرم عمل رہی ہیں۔ان میں مولانا حسرت موہانی اور بھاشانی دہریت کا نہیں بلکہ" کمیونزم کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔اور آج بھی ہندوپاک میں بے شمار پڑھے لکھے اور سمجھدار کہے جانے والے مسلمان کمیونزم اور کمیونسٹ پارٹیوں کے افکار و نظریات سے ن صرف وابستہ ہیں بلکہ اس کمیونزم کی بنیاد پر کھڑے ہونے والے نظام میں بھی معاون و مددو ہیں ۔معاملہ یہ ہے کہ ہر شخص کو پیٹ سے سابقہ

ہے۔پیٹ یعنی معاش یا معاشی نظام۔اور کمیونزم کے بانی مارکس نے معاشی نابرابری کو بنیاد بنا کر ہی اپنے نظریہ کی تبلیغ کی تھی۔فریڈرک اینگلز جو مارکس کا دوست تھا اور اقتصادیات کا ماہر،مارکس نے اینگلز کی اقتصادی معلومات کو مد نظر رکھتے ہوئے سرپلس ویلیو تھیوری" پیش کی۔مارکس کا یہ نظریہ بالآخر اس تصور پر مبنی ہے کہ" جدلیاتی مادیت سماجی زندگی کی بنیاد ہے اور یہی آدمی کے شعور کا تعین کرتی ہے۔اس کا کہنا تھا کہ مادہ ذہن سے افضل ہے۔ذہن از خود مادے کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور زمان و مکان مادے کی صورتیں ہیں۔"ہمارا رہن سہن اور کام کرنا ہمارے احساسات اور انداز فکر پر اثرانداز ہوتے ہیں"۔دوسری جانب اس نے معاشی اعتبار سے کمزوروں و بے سہارا کو معاشی استحکام بخشنے کی بات کی تھی،جس میں جاذبیت بھی تھی اور کشش بھی۔لہذا نہ صرف نظریہ کو فروغ ملا بلکہ بیسویں صدی کے دوسرے حصے میں دنیا کی آدھی آبادی اُن حکومتوں کے زیر اثر تھی، جن کی اساس مارکس کے بنیادی نظریات پر رکھی گئی تھی۔

گزشتہ سو برسوں میں مسلسل مارکس کے نظریات کو عروج و زوال کا سامنا رہا ہے۔ مارکس کے نظریات ہی کی بنیاد پر سرد جنگ کا تنازعہ کھڑا ہوا تھا۔مارکس کے جامع نظریات ہی بحیثیت مجموعی جدلیاتی مادیت اور سائنسی سوشلزم کی تشکیل کرتے ہیں اور دنیا بھر کے ممالک میں محنت کشوں کی تحریکوں کے نظریات اور

پروگراموں میں شامل ہیں۔ یہی نظریات سوشلسٹ انقلابات اور کمیونسٹ معاشروں کی بنیادوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں نظریات کی بنیاد پر سابق سوویت یونین میں لینن اور ان کے جانشین سٹالن نے تاریخی مادہ پرستی کی شکل میں سوویت عوام کو کمیونسٹ طرز زندگی دیا تھا۔ دوسری جانب مارکس کے انہیں نظریات کو ماؤ نے چین میں، ہوچی منہہ نے ویتنام میں، کم ال سنگ نے شمالی کوریا میں اور فیڈل کاسترو نے کیوبا میں اپنایا تھا۔ ان سب کو یقین تھا کہ مارکس نے ایک عالمگیر حقیقت کو تلاش کر لیا ہے۔ بعد ازاں انہیں رہنماؤں نے مارکس کے نظریات کو اپنے ضروریات کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ادب کے نوبل انعام یافتہ فرانسیسی ادیب Albert Camus نے سنہ 1956ء میں کہا تھا، "وہ ظلم جو ہم نے مارکس کے ساتھ مل کر کیا ہے، اس کا مداوا ہم کبھی بھی نہیں کر سکتے"۔ یہ ایک زندہ حقیقت جو فرانسیسی ادیب نے جرات اظہار کے ساتھ بیان کی ہے۔

ہندوستان میں نظریہ کے حاملین کے زیر اقتدار ریاست مغربی بنگال طویل عرصہ رہی ہے۔اس کے باوجود اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ہندوستان کی غربت و افلاس میں مبتلا ریاستوں میں ایک اہم ریاست یہی مغربی بنگال ہے جہاں مزدوروں اور غریبوں کی جنگ لڑنے والے نہ صرف طویل مدت اقتدار میں رہے بلکہ یہی وہ لوگ بھی ہیں جو ہر ناانصافی کے خلاف لال جھنڈا اٹھائے احتجاج میں نمایاں نظر

آتے ہیں۔لیکن دوسری جانب ہم اِس تلخ حقیقت سے بھی خوب اچھی طرح واقف ہیں کہ طویل عرصہ غریبوں،مزدوروں اوراستحصال شدہ حضرات کی جنگ لڑنے والوں نے نہ اس وقت جبکہ وہ اقتدار میں تھے اور نہ ہی آج،انسانون کو جانوروں کی مانند بوجھ اٹھائے پھرنے کی ذلت آمیز زندگی سے چھٹکارا دلانے کی سعی و جہد کی ۔ملک میں ایک واحد یہی ریاست مغربی بنگال ہے جس کے دارالحکومت کلکتہ میں ایک انسان دوسرے اپنے ہی جیسے انسان کا بوجھ رکشہ پر اٹھائے شب وروز ڈورے پھرتا ۔ریاست میں آج بھی پچیس فیصد لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔عالمی جائزے کی رپورٹ کے مطابق دیہی علاقوں میں اب بھی تقریباً گیارہ فیصد لوگ رات کو بھوکے سوتے ہیں۔دیبابرت بندھواپادھیائے کے کہتے ہیں کہ کمیونسٹ جو بتیس سال ریاست میں برسراقتدار رہے اگر وہ غریبوں کی حامی ہیں تو پھر انبتیس سالوں میں انہوں نے ریاست اور اہل ریاست کی معاشی زندگی کو بہتر بنانے کی فکر کیوں نہیں کی؟اپادھیائے کا کہنا ہے کہ آزادی کے بعد صنعت میں ریاست تیسرے نمبر پر تھی لیکن اب یہاں صنعت پوری طرح ختم ہو چکی ہے۔ٹریڈ یونینس کے غیر ضروری مطالبات کی وجہ سے ہزاروں صنعتیں بند ہو گئیں اور تقریباً چودہ لاکھ لوگ بیروزگار ہوگئے۔یہ صحیح ہے کہ فی الوقت کمیونسٹ پارٹی حکومت میں نہیں ہے۔لیکن جس طرح ہندوستان کے موجودہ صدر پرنب مکھرجی نے اپنی کتاب میں بابری مسجد انہدام کا ذکر کرتے ہوئے کہاکہ کس طرح وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے بابری مسجد کو توڑنے سے روکنے میں اپنی ناکامی

دکھائی تھی اور بحیثیت وزیر اعظم بابری مسجد انہدام کو نہ روک پانا نرسمہا راؤ کی سب سے بڑی ناکامی تھی۔اس احساس وتذکرے کے بعد کانگریس پارٹی اور اس کے لیڈران ملک اور اہل ملک درمیان پیدا ہونے والے حالات کے ذمہ دار ہیں اور وہ بری الزمہ، نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ واقعہ صرف وزیر اعظم نرسمہاراؤ کی ناکامی کا نہیں تھا بلکہ برسر اقتدار پارٹی کے تمام ہی بڑے لیڈران اس غلطی سے کہیں نہ کہیں راست یا بلاواسطہ وابستہ تھے ۔ ٹھیک اسی طرح ریاست مغربی بنگال کی افلاس زدہ موجودہ صورتحال سے وہ لوگ بری الزمہ نہیں ہو سکتے جنھوں نے مکمل بتیس سال ریاست میں اقتدار سنبھالا ہے۔پھر یہی وہ ریاست بھی ہے جہاں سرکاری اعدار وشمار کے مطابق 27.01% فیصد مسلمان آباد ہیں۔اور غربت وافلاس میں شاید ستائیس فیصد سے کہیں زیادہ ہر طرح کی پریشانیوں سے نبرد آزما ہیں۔ایک بار پھر انتخابات قریب ہیں اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے مالدہ واقعہ کے پس پشت اپنی انتخابی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ مسلمان پھر آزمائے جانے ہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ فکری و نظریاتی اختلاف کے باوجود کب تک سیاسی بساط پر وہ لال،ہرا یا نیلا جھنڈا تھامے آزمائش سے گزرتے رہیں گے !

نفرتوں کے گہرے ہوتے سائے !

کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ اکثریت اقلیت سے ڈر کر رہے یا لوگوں میں اقلیت کی شبیہ کچھ اس طرح کی بنائی جائے کہ اکثریت میں ڈر اور خوف خود بہ خود پیدا ہو جائے۔لیکن خبر سننے والے کو پہلے مرحلہ میں سوال یہی کرنا چاہیے کہ آپ جبکہ اکثریت میں ہیں ،اقلیت سے خود کو کیوں غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔باالفاظ دیگر اقلیت کا کیا ڈر اور کون سا خوف جبکہ آپ وسائل اور گنتی ہر لحاظ سے بے پناہ طاقت رکھتے ہیں؟غالباً اس کا آسان جواب یہی ہونا چاہیے کہ اکثریتی طبقہ کا وہ گروہ جو اقتدار میں ہے،وہ اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔لہٰذا ایک ایسا مصنوعی ماحول پروان چڑھایا جاتا ہے جس کی بنیاد پر یا معدود چند واقعات کی بناپر اکثریتی طبقہ اقلیتوں کی موجودگی میں خود کو غیر محفوظ محسوس کرے۔یعنی اکثریتی طبقہ کا وہ گروہ جسے لفظ عام میں عوام کہا جاتا ہے،برسر اقتدار طبقہ کا استحصال برداشت کرنے اور مختلف طرح کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے باوجود اُنہیں کو اپنا سب سے بڑا ہمدرد اور محافظ سمجھنے لگتا ہے اور انہیں ہر ممکن تعاون بھی دیتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ایسے حالات میں ہر دور میں بڑے پیمانہ پر انسانیت کے دشمن اور متشدد عناصر پروان چڑھتے ہیں۔اور یہ وہ عناصر ہیں جنہیں نظم و نسق کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوتا کیونکہ اہل اقتدار بلاواسطہ اُن کی

پشت پناہی میں مصروف ہوتے ہیں یا انہیں چھوٹ فراہم کرتے ہیں، جو دراصل امن و امان کے حقیقی دشمن ہیں۔

وطن عزیز میں ایک طویل عرصہ سے شک اور قیاس کی بنیاد پر مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ جاری ہے۔اس کے مختلف مراحل رہے ہیں۔پہلے پڑوسی ملک کی متشدد تنظیموں کے نام سے یہ کام ہوتا رہا۔پھر ملک ہی کی ایک خاص تنظیم پر سوال کھڑے کیے گئے۔اور اب معاملہ یہ ہے کہ متشدد عالمی تنظیم کے ملک میں موجود نیٹ ورک کے نام پر پکڑ دھکڑ جا ری ہے۔یہ صحیح ہے کہ وطن کی سلامتی اور اس کی بقا و تحفظ کے لیے ایسے لوگوں پر نظر رکھی جائے جو انتشار و افتراق پیدا کرنا چاہیے ہیں یا غلط کاموں میں مصروف ہیں ۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نظم و نسق عوام خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔یا ایسا ماحول پروان چڑھائیں جس سے ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے باضابطہ نفرت پیدا ہو جائے۔پھر وہ بلا سوچے سمجھے اور حقیقت کو جانے بغیر ایک گروہ خود ہی دوسرے سے نمٹنے کی تیاری میں مصروف ہو جائے۔ایسے حالات میں ہونا تو یہ چاہیے کہ نظم و نسق کو چلانے والے ایمانداری، سچائی اور حقیقت پر مبنی معلومات پر کارروائی کریں،اس بات کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ ان کی یہ کارروائی نفرت کے فروغ کا حصہ نہ ہو کر امن و محبت کو پروان چڑھانے کا ذریعہ بنے گی ۔اس لیے جب تک ملزم کا جرم ثابت نہ ہو جائے،اس کی شبیہ خراب ہونے سے بچائی جائے۔فائدہ یہ ہوگا کہ شہریوں کے

دو گروہ آپس میں ایک دوسرے سے نہیں لڑیں گے ،ماحول خوشگوار ہوگا، مسائل کم سے کم تر ہوں گے۔اور ایک مثالی معاشرہ اور مثالی ملک دنیا کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا جا نا ممکن ہوگا۔ خصوصاً آج کے حالات میں جبکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں کہیں سرد تو کہیں حقیقی جنگیں جاری ہیں۔شاید یہی بات صدر جمہوریہ ہند پرنب مکھرجی نے راجستھان سرکار کے اشتراک سے انڈیا فاؤنڈیشن کی جانب سے منعقدہ انسداد دہشت گردی کانفرنس 2016 کے افتتاحی خطاب میں کہی ہے۔انہوں نے کہا کہ امن نہ صرف ہماری قومی بیداری اور آفاقی اخلاق کے نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اسے تہذیب کی بنیاد اور معاشی کامیابی کی حیثیت حاصل ہے۔مزید کہا کہ دہشت گردی ، مہمل مقاصد اور شدید نفرت کے ماحول میں پروان چڑھتی ہے۔ایسی صورت میں محض سیاسی اور جنگی حکمت عملی اس مسئلہ کے حل کے لیے کافی نہیں ہے۔ہمیں اس کے سماجی ، معاشی ،مذہبی اور نفسیاتی پہلوؤں پر غور و خوض کرنا ہوگا۔اور یہ بھی کہا کہ ہندوستان جیسے اجتماعی اور مجموعی سماج نے ہمہ ثقافتی طریقہ زندگی کے متعدد نمونے پیش کیے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ عالمی دہشت گرد گروہ ہندوستان میں اپنی جڑیں نہیں جما پائے ہیں۔ہم نے ایک قوم کی حیثیت سے اجتماعیت کو اس طرح مستحکم کیا ہے کہ وہ بنیاد پرست نظریات کے خلاف جم کر کام کر سکیں۔

صدر جمہوریہ کی گفتگو موجودہ حالات میں بہت معنی خیز ہے ۔اور اس میں کھلا

پیغام شاید یہی دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ وطن کی سالمیت کے لیے اندرون ملک رہنے والے ایک دوسرے کے درمیان نفرت کا ماحول پروان نہ چڑھائیں۔اس کے باوجود نفرت کا ماحول منظم اور منصوبہ بندانداز میں جاری ہے۔پھر یہ معاملہ صرف مسلمانوں کے تعلق ہی سے نہیں ہے بلکہ شرمناک حدتک دیگر مذاہب اور اقوام کے ساتھ بھی روا رکھا جا رہا ہے۔معاملہ یہ ہے کہ نفرت کا زہر جب پلا ہی دیا گیا تو پھر اُس کے اثرات بھی کسی نہ کسی شکل میں سامنے آنے ہی ہیں۔فی الوقت ہم جس واقعہ کا تذکرہ کررہے ہیں وہ تنزانیہ کی طالبہ کے ساتھ شہر بنگلور میں حد درجہ شرمناک واقعہ ہے۔جہاں ہجوم نے افریقی طالبہ کو پہلے مارا پیٹا، رسوا کیا اور بعد میں برہنہ کیا۔طالبہ جس پر حملہ کیا گیا وہ اکیس سال کی کالج اسٹوڈنٹ ہے۔جس ویگن آر کار سے وہ سفر کر رہی تھی ،اس کو قریب دوسو لوگوں نے اس وقت روک لیا تھا جبکہ روکے گئے مقام پر ٹھیک آدھے گھنٹے پہلے وہاں سے گزری گاڑی نے سڑک پر چل رہی ایک خاتون کو کچل دیا تھا۔مشتعل ہجوم کو جب کچلنے والی گاڑی پر غصہ نکالنے کا موقع نہیں ملا تو انہوں نے اُس ویگن آر گاڑی کو نشانہ بنایا جس میں یہ افریقی طالبہ سفر کر رہی تھی۔پہلے گاڑی رکوائی گئی، ہجوم نے طالبہ کو مارا پیٹا اور برہنہ کیا، پھر طالبہ کو جان بچانے کے دوران مزید تکلیفیں بھی اٹھانی پڑیں، یہاں تک کہ گاڑی کو آگ لگا دی گئی۔اس موقع پر ایک لمحہ ٹھہریئے ! اور غور کیجئے کیا یہ معاملہ صرف ایک طالبہ اور مشتعل ہجوم کے درمیان کا تھا؟سوال یہ ہے کہ یہ

اشتعال انگیزی اور وہ بھی حد درجہ اشتعال انگیزی، ہمارے فکر و نظر اور اعمال میں کس نے پیوست کی ہے؟ وہ لوگ کون ہیں جو نفرتوں کی آگ لگا کر، اذیتیں اور تکلیفیں دے کر، عزت نفس سے کھلواڑ کرتے ہوئے، انسانوں کو جھلستا دیکھ کر نہ انہیں اپنے کیے پر شرمندگی ہوتی، نہ وہ اس میں سدھار کے خواہش مند ہیں بلکہ محظوظ بھی ہوتے ہیں۔کیا ان انسان نما حیوانوں سے کسی خیر کی توقع کی جا سکتی ہے؟

نفرتوں کا بازار ایک اور مسئلہ کو بنیاد بنا کر تیزی سے سجایا جا رہا ہے۔وہی بازار جس کا تذکرہ ہم نے مضمون کے آغاز میں کیا تھا یعنی مسلم نوجوانوں کی قیاس اور شک کی بنیاد پر کی جانے والی گرفتاریاں۔فی الوقت جو گرفتاریاں جاری ہیں وہ داعش اور اسلامک اسٹیٹ سے رابطہ کے شک میں یا اس کو تعاون فراہم کیے جانے کے قیاس پر مبنی ہیں۔اوراس شک و قیاس کی بنیاد پر کی جانے والی گرفتاریوں کے دو پہلو سامنے آرہے ہیں۔ایک عمومی طور پر اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرنا تو دوسرا مسلمان جن لوگوں کے درمیان اپنے سماجی رابطہ بنائے ہوئے ہیں، ان سماجی رابطوں میں پہلے دراڑ ڈالنا، پھر دوریاں پیدا کرنا، نفرت کا بازار سجانا اور آخر میں نظم و نسق کو نظر انداز کرتے ہوئے عوام کے ذریعہ بڑے پیمانہ پر کشت وخون بہانا۔شگاف ڈالنے، دوریاں قائم کرنے اور نفرت کا بازار سجانے کا مرحلہ کسی حد تک طے کیا جا چکا ہے،اور آخری مرحلے کی

منظم تیاریاں جاری ہیں۔انہیں کوششوں کا ایک سرسری جائزہ تہلکہ ہندی نے اپنے ایک خاص مضمون " ہندتو کے نئے ٹھیکدار " کے نام سے شائع کیا ہے۔جسے یکسوئی اور تندہی کے ساتھ نرسنہا نند جو سوامی کے نام سے مشہور ہیں سینا کی شکل میں چلا رہے ہیں۔مقصد جو بتایا گیا وہ یہ کہ ملک کے تحفظ اور بقا کے لیےغیر ملکی متشدد تنظیموں اور افراد سے لوہا لینا ہے۔برخلاف اس کے مضمون کے آغاز ہی میں گاؤں کے ایک بچہ کو بری طرح پیٹتے ہوئے بتایا گیا ہے جو اُسی گاؤں کا بچہ ہے جہاں سوامی اور ان کی سینا موجود ہے۔اور پیٹنے والا بچے کو صرف اس لیے پیٹ رہا ہے کہ اسے ،بچے اور اس کی کمیونٹی سے حد درجہ نفرت ہو چکی ہے۔ مضمون تو آپ پڑھ ہی لیں گے ۔اس کے باوجود دیکھنا یہ چاہیے کہ نفرت کے خاتمہ اور آپسی محبت و ہمدردی کے ماحول کو پروان چڑھانے میں ہم نے عملی میدان میں کیا خدمات انجام دی ہیں یا کیا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ؟سوال، اس لیے بھی اہم ہے کہ نفرتوں کے سائے جو گہرے ہوتے جارہے ہیں ان کا خاتمہ ہو۔ اس نفرت کے خاتمہ میں اسلامی تعلیمات اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔اور بحیثیت مسلمان آپ پر ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے!!

!منفعت ایک ہے اس قوم کی۔۔۔

انسانوں کے درمیان کسی بھی موضوع پر اختلاف کا یا پایا جانا ایک فطری عمل ہے۔یہ عمل ناپسندیدہ نہیں ہے اور نہ ہی اس عمل کے نتیجہ میں کسی ایک کو دوسرے کی تذلیل کرنی چاہیے۔قابل غور بات یہ ہے کہ یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے؟اس کا آسان جواب تو یہی ہونا چاہیے کہ چونکہ ہر شخص کی اٹھان یکساں حالات میں نہیں ہوتی لہذا اس کے غور وفکر اور عمل میں بھی یکسانیت ممکن نہیں ہے۔اور یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کی بنا پر دو اشخاص و گروہوں کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ان اختلافات کی ایک اور بھی وجہ ہے اور وہ یہ کہ انسان فی نفسہ اور بحیثیت گروہ عمل کے نتیجہ میں مثبت و منفی توقعات رکھتا ہے۔یعنی ایک کام جو انجام دیا گیا یا جس کا وہ ارادہ رکھتا ہے،اُس کے بدلے اس کو کچھ نہ کچھ نتیجہ درکار ہے۔یہ نتیجہ فائدہ پر منحصر ہے اور فائدہ بھی وہ جو اعلیٰ درجہ کا ہو۔یعنی یہ وہ دو بنیادی باتیں ہیں جن کی بنا پر اختلافات رونما ہوتے ہیں۔لیکن اس موقع پر دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ فرد یا گروہ کی اٹھان کن بنیادوں پر ہوئی ہے تو وہیں یہ بھی کہ عمل کے نتیجہ میں حاصل کیا جانے والا اعلیٰ درجہ کا فائدہ کیا ہے؟جس کے حصول میں وہ سرگرداں ہے۔نتیجہ کے اعتبار سے یہ دونوں ہی باتیں مخفی رہیں ایسا نہیں ہے۔یہ جگہ ظاہر ہوتی ہیں اور معمولی سمجھ رکھنے والا

ایک معتدل مزاج، غیر جانب دار شخص آسانی سے مشاہدہ کی روشنی میں فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن دشواری وہاں ہوتی ہے جبکہ فرد کا مزاج ہی متشدد ہو یا وہ جانب دار ہو۔ایسی صورت میں کسی بھی فکر و نظر اور عمل کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

آج کل وطن عزیز میں یہ خبر خوب گردش میں ہے کہ راجستھان کی اُدے پور پولیس نے دو مولانا اور ان کے ساتھ پچاس دیگر لوگوں کو حراست میں اس بنا پر لیا کہ ان کے خلاف قبر سے لاش نکل وانے کا الزام ہے۔جس شخص کی لاش نکالی گئی ہے وہ مسلکی اعتبار سے وہابی تھا اسے بریلویوں کے قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا۔بعد میں اس کی لاش کو مدھیہ پردیش میں اس کے آبائی وطن، مند سور میں لے جاکر دفنایا گیا۔بتایا گیا ہے کہ ۸۸ سالہ محمد یوسف طویل عرصہ سے اُدے پور میں رہ رہے تھے،انتقال ہونے پر ان کی لاش کو نزدیکی قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا۔یہ قبرستان بریلیوں کا قبرستان کے نام سے مشہور ہے۔تدفین کے ایک گھنٹے بعد ہی میت کو صرف اس بنا پر قبر سے نکالا گیا کہ کچھ بریلوی حضرات کو اس پر اعتراض تھا۔پس یہ اعتراض ہی اس بدترین فیصلہ کی وجہ بن گئی۔خبر کی روشنی میں جو کچھ بھی ہوا، واقعہ کو درج بالا دو نکات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجئے۔مسلکی بنیادوں پر کی جانے والی شکایت اور پھر مخصوص عمل،کے پس پشت کون سی فکر کارفرما تھی یعنی اِن لوگوں کی اٹھان کن بنیادوں پر ہوئی ہے؟ساتھ ہی عمل کے نتیجہ میں دنیاوی یا اخروی حیثیت سے انہیں کیا

فائدہ حاصل ہوا؟ سوائے اس کے کہ نہ صرف مخصوص افراد بلکہ پوری امت رسوا ہوئی۔ ساتھ ہی عام انسانوں تک یہ پیغام بھی پہنچا کہ مسلمان خود اندرونی انتشار و افتراق میں حد درجہ مبتلا ہیں۔ لیکن ایک لحہ کے لیے ٹھہریئے ! اور غور فرمایئے کہ جس دو گز زمین سے ایک مردہ جسم کو قبر کھود کر نکالا گیا اور "اپنی زمین "کا دعویٰ کیا گیا، کیا یہ زمین اُن کی ہے جنھوں نے دعویٰ کیا تھا؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ زمین و آسمان اور اس کے درمیان ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مشرک و متکبر اور تمام منافقین اُس رب کریم کی فیاضیوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں، جس نے اُنھیں ایک وقت خاص تک مہلت عطا کی ہے۔ نہیں تو عین ممکن تھا کہ جس طرح چند شکایات و عرض داشت کی بنا پر ایک مردہ جسم کو دو گز زمین سے نکال باہر پھینکا گیا، اسی طرح تمام منکرین، مشرکین، متکبرین اور منافقین ایک لحہ بھی مہلت نہ پاتے اور انہیں بھی اسی زمین پر نست و نابود کر دیا جاتا۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو مہلت دی ہے لہٰذا اس مہلت کے ساتھ آگاہ بھی کیا ہے، کہ : "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ کا ہے۔ تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو خواہ چھپاؤ اللہ بہر حال ان کا حساب تم سے لے لے گا۔ " (البقرہ: ۲۸۴)۔ اس صورت میں گرچہ دیگر اہل باطل یا منکر متوجہ نہ ہوں لیکن اُن افراد کو لازماً متوجہ ہونا چاہیے، جو یہ اظہار کرتے ہیں کہ ہم صرف اور صرف ایک خدا اور اس کے رسول محمد صلی اللہ وعلیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔ اور اگر وہ متوجہ نہیں ہوتے ، تو پھر انہیں سنبھل کر رہنا چاہیے

کیونکہ نہیں معلوم کب اللہ کے عذاب میں وہ مبتلا ہو جائیں اس کے باوجود کہ وہ اپنی زبان سے یہی ورد کرتے رہیں کہ وہ ایک اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و تعلیمات سے حد درجہ محبت رکھتے ہیں۔

آج امت مسلمہ جن حالات سے دوچار ہے اس میں سب سے بڑا چیلنج اگر کوئی ہے تو وہ اندرونی اختلافات ہی ہیں۔ یہ اختلافات اگر اللہ کی عبادات کو ادا کیے جانے کی حد تک ہوں تو کچھ حرج نہیں۔ لیکن اگر یہ اختلافات مسلک سے اوپر اٹھ کر فرقوں کی شکل اختیار کرلیں اور یہ فرقے امت کو اندرونی طور پر کمزور سے کمزور تر کیئے جائیں تو پھر یہ حد درجہ تشویشناک صورتحال ہو گی۔ اسلامی تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے آج تک یہ امت مختلف گرہوں میں تقسیم رہی ہے۔ جس کا راست فائدہ اہل باطل اٹھاتے آئیں ہیں۔ لہذا یہ توقع جو عموماً کی جاتی ہے کہ امت مسلکی اختلافات کا خاتمہ کر متحد ہو جائے، ناممکن ہے اور شاید اس کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں۔ اسی پس منظر میں وطن عزیز کی موجودہ صورتحال ہو ، برصغیر ہند و پاک ہو، عالم عرب کا موجودہ منظر نامہ ہو یا یورپی ،افریقی اور امریکی ممالک ہوں۔ جس سطح پر بھی نظر ڈالی جائے امت انتشار میں مبتلا ہی نظر آتی ہے۔ نیز ہر مقام پر اہل باطل یا امت سے بغض رکھنے والے موجودہ انتشار سے فائدہ حاصل کرنے کی نہ صرف خواہش رکھتے ہیں بلکہ منظم و منصوبہ بند سعی و جہد میں بھی مصروف ہیں۔ نتیجہ میں

اندرونی انتشار و منظم بیرونی کوششوں کا حاصل یہ ہے کہ اہل باطل یا بغض رکھنے والے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جارہے ہیں۔اس صورت میں دیکھنا یہ چاہیے کہ امت کے ایک اہم ترین فرد کی حیثیت سے ہماری کیا ذمہ داری ہے؟ساتھ ہی یہ بھی کہ ہم اس اہم ترین ذمہ داری کو ادا کرنے کی کیا کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں؟لیکن اگر ان دو سوالات کے جواب دینے سے ہم قاصر ہوں تو پھر چاہے ہم کتنے ہی امت کی موجودہ صورتحال سے افسردہ و متفکر نظر آئیں،اس تفکر اور افسردگی کا کچھ حاصل نہیں۔

ملک کی موجودہ صورتحال کے پس منظر میں بھگتی تحریک کی بڑی اہمیت ہے۔آپ جانتے ہیں کہ بھگتی تحریک کی ابتدا بارہویں صدی میں جنوبی ہند میں ہوئی تھی۔اس کے بانی سوامی رامانج، مادھو، آنند تیرتھ، وشنو سوامی اور باسو تھے۔بھگتی تحریک کے بانیوں نے خدا اور انسان سے محبت کی مبہم تبلیغ کی۔کبیر، رائے داس، وھنا، سائیں، دادو اور دوسرے بھگت سماجی اصلاح کے خواہاں تھے۔ان کا خیال تھا کہ ذات پات کا فرق، چھوت چھات، پوجا پاٹ اور طبقاتی اونچ نیچ پنڈتوں اور مولویوں کے ڈھونگ ہیں۔لوگ اگر محبت کے پرستار ہوجائیں اور دکھاوے کی رسموں کو ترک کردیں تو خدا اور انسان کے درمیان سے حجابات اٹھ جائیں گے اور نفرت کی دیوار گرجائے گی۔ہندو مسلمان،برہمن اچھوت، راجا پرجا، چھوٹے بڑے سب بھائی بھائی بن جائیں گے اور سماج کے سارے درد

دور ہو جائیں گے۔ اسی مبہم اور غیر عقلی تحریک نے اس وقت کے رائج الوقت صوفیانہ نظام کو بھی حد درجہ متاثر کیا تھا۔ یہاں تک کہ بھکتی تحریک و نظریہ نے صوفیانہ نظام کو خود میں ضم کر لیا یا دونوں ایک ہی سکہ کے دو رخ بن گئے۔ اس کے باوجود کہ اسلام اپنی صحیح شناخت کے ساتھ اس وقت بھی موجود رہا۔ لیکن ایک بڑا طبقہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کو صحیح شکل میں نہ پیش کر سکا اور نہ ہی عمل پیرا رہا۔ نتیجہ میں اسلام بحیثیت مذہب اور نظام حیات مجروح ہوا۔ آج ایک بار پھر نہ صرف وطن عزیز میں بلکہ عالمی سطح پر بھی وہی کوششیں دہرائی جا رہی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس مرتبہ اسلام مجروح ہوگا یا اہل اسلام یا پھر وہ حضرات جو ان کوششوں میں سرگرداں ہیں!

! میڈیا کی اجارہ داری

آپ سب کو پتہ ہے کہ ہمارا ٹی وی بیمار ہو گیا ہے۔پوری دنیا میں ٹی وی میں ٹی بی ہو" گیا ہے۔ہم سب بیمار ہیں۔میں کسی دوسرے کو بیمار بتا کر خود کوڈاکٹر نہیں کہہ رہا ہوں۔بیمار میں بھی ہوں۔پہلے ہم بیمار ہوئے اب آپ بیمار ہو رہے ہیں۔آپ میں سے کوئی نہ کوئی روز ہمیں مارنے پیٹنے اور زندہ جلادینے کا خط لکھتا رہتا ہے۔اس کے اندر کا زہر کہیں ہمارے اندر سے تو نہیں پہنچ رہا ہے۔میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔میں تو خود ہی بیمار ہوں۔میرا ٹی وی بھی بیمار ہے۔ڈبیٹ کے نام پر ہر دن کا یہ شور شرابہ آپ کی آنکھوں میں روشنی لاتا ہے یا اندھیرا کر دیتا ہے۔آپ شاید سوچتے تو ہوں گے۔ڈبیٹ سے جوابدہی طے ہوتی ہے۔لیکن جوابدہی کے نام پر اب نشاندہی ہو رہی ہے۔ٹارگیٹ کیا جا رہا ہے۔اس ڈبیٹ کا آغاز ہوا تھا مدّوں پر سمجھ صاف کرنے کے لیے۔لیکن جلد ہی ڈبیٹ عوامی رائے کی موت کا کھیل بن گیا۔عوامی رائے ایک طرفہ رائے کا نام نہیں ہے۔عوامی رائے میں کئی رائے ہوتی ہیں۔مگر یہ ٹی وی ڈبیٹ عوامی رائے کے تنوع کو ختم کر رہا ہے۔ایک فکر کی حکومت کو قائم کرنے میں جٹ گیا ہے۔جن اینکروں اور ترجمان کے اظہار کی کوئی حد نہیں ہے،وہ اس آزادی کی حد طے کرنا چاہتے ہیں۔کئی بار یہ سوال خود سے اور آپ سے کرنا چاہیے کہ ہم کیا دکھا رہے ہیں اور آپ کیوں دیکھتے ہیں۔آپ کہیں گے آپ جو

دکھاتے ہیں ہم دیکھتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ آپ جو دیکھتے ہیں ہم دکھاتے ہیں۔اسی میں کوئی نمبر ون ہے تو کوئی میرے جیسا نمبر ٹین۔کوئی ٹاپ ہے تو کوئی میرے جیسا فیل۔اگر ٹی آر پی ہماری منزل ہے تو اس کے ہمسفر آپ کیوں ہیں۔کیا ٹی آر پی آپ کی بھی منزل ہے۔اسی لیے ہم آپ کو ٹی وی کی اس اندھیری دنیا میں لے جانا چاہتے ہیں۔جہاں تنہا آپ اس شور کو سن سکیں، سمجھ سکیں،اُس کی امیدوں اور خوف میں جی سکیں، جو ہم اینکروں کی جماعت روز پیدا کرتی ہے۔آپ اس چیخ کو پہچانئے،اس چلاہٹ کو سمجھئے ،اسی لیے میں آپ کو اندھیرے میں لے آیا ہوں"۔یہ گفتگو اُس پروگرام کا کچھ حصہ ہے جو این ڈی ٹی پر دکھائے جانے والے پروگرام 'پرائم ٹائم ' سے لیا گیا ہے، جسے ایک سینئر جرنلسٹ رویش کمار پیش کرتے ہیں۔

معاشیات کا یہ اصول بارہا سنا جا چکا ہے کہ بازار میں جس چیز کی مانگ ہوتی ہے وہی فراہم کی جاتی ہے۔لیکن کیا آپ اور ہم بازار کے اس اصول کو نہیں جانتے جسے اجارہ داری کہتے ہیں۔جہاں ڈمانڈ کچھ بھی ہو،اس سے صرف نظر، بازار میں موجود چیزیں ہی لوگ خریدنے پر مجبور ہوتے ہیں۔رویش کمار کی یہ بات کہ کئی بار یہ سوال خود سے کرنا چاہیے کہ ہم جو دکھا رہے ہیں وہ آپ کیوں دیکھتے ہیں؟دراصل اسی اجارہ داری کا حصہ ہے جہاں لوگ دیکھنے پر مجبور ہیں،اور ان کی مرضی نہیں چلتی۔اور کئی مرتبہ دکھانے والے بھی مجبور ہوتے

ہیں۔وہ جو دکھانا چاہتے ہیں،ارادہ اور مواد فراہمی کے باوجود، مختلف پالیسیوں کے پابند ہوتے ہیں۔انہیں وہی کچھ کہنا اور دکھانا پڑتا ہے جو راست یا بلاوسطہ ان کے مالک چاہتے ہیں۔یہ مالک بھی دو طرح ہیں۔ایک، فنڈ فراہم کرنے والے افراد و گروہ تو دوسرے سیاسی لیڈران،ذمہ داران اور بچولیے جواِن دکھانے والوں کی وقتاً فوقتاً مختلف شکلوں میں مدد کرتے ہیں۔لہٰذا عوام مجبور ہیں کہ جو آپ دکھائیں گے وہی دیکھیں گے۔البتہ لاتعداد نیوز چینلس کی موجودگی یہ موقع ضرور فراہم کرتی ہے کہ ہم اپنی پسند کا چینل چن سکیں۔لیکن چونکہ فی الوقت ملک ایک خاص رخ پر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔لہٰذا سستی اور کاہلی میں پڑے اہل ملک بھی اُسی بہاؤ میں بہنے کو تیار ہیں۔یہ وہ تیسری اور سب سے تشویشناک صورتحال ہے جس کا تذکرہ بھی رویش کمار نے کیا ہے۔یعنی یہ کہ آپ کہیں گے آپ جو دکھاتے ہیں ہم دیکھتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ آپ جو دیکھتے ہیں ہم وہی دکھاتے ہیں۔

نیوز چینلس اور اس میں شائع ہونے والی خبریں اور ان خبروں میں وہ تمام ناپسند چیزیں دیکھنے اور سننے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم زندگی کے ہر مرحلہ میں حد درجہ سہل پسندی کے عادی ہو چکے ہیں۔خبروں کے نام پر شائع ہونے والی چیزیں گرچہ ہمارا وقت خراب اور ہمارے ذہنوں کو بوجھل کرتی ہیں۔اس کے باوجود ہم انہیں دیکھتے اور سنتے ہیں۔بے مقصد ٹی وی ڈبیٹس سننا ہمارا مشغلہ

بن گیا ہے۔اشتعال انگیزی جو کہیں نہ کہیں ہمارے رویوں میں خاموشی کے ساتھ چھپی بیٹھی ہے،ٹی وی ڈیبٹس ہمارے اندروں کو تسکین پہنچاتے ہیں۔اور اگر ایسا نہیں ہے، کہ اشتعال انگیزی ہمارے رویوں میں چھپی نہیں بیٹھی تو کیوں ہم اسی وقت کو یا اس سے بھی کچھ کم وقت میں اچھے مضامین نہیں پڑھتے ؟کیوں ہم ٹی وی نیوز کی جگہ اخبارات کا مطالع نہیں کرتے ؟اس کی دو بڑی وجوہات ممکن ہیں۔ایک سہل پسندی جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں، وہ اس میں بڑی رکاوٹ ہے۔تو وہیں یہ بھی کہ ایک اخبار ہماری تسکین کے لیے شاید کافی نہیں ہے۔دوسری جانب ایک ٹی وی اسکرین پر موجود بے شمار چینلس دلچسپی کے لحاظ سے ہماری تسکین کا ذریعہ بنتے ہیں۔پس یہی وجہ ہے کہ اہل اقتدار یا حزب مخالف ان ٹی وی چینلس پر راست یا بلاواسطہ بے تحاشہ دولت صرف کرنے میں مصروف ہیں۔

موجودہ صورتحال کے پس منظر میں جس درجہ میں جو لوگ بھی ان ٹی وی چینلس سے متاثر ہیں،انہیں اسی قدر زیادہ قوت اور تندہی کے ساتھ میڈیا میں اپنے موقف کو رکھنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔جرنلزم کی بنیاد تو ہر زمانہ میں پرنٹ میڈیا ہی رہے گا۔لہذا پرنٹ میڈیا میں مراسلات ، مضامین، سروے رپورٹ، جائزے ،انٹرویو وغیرہ لکھنے اور انہیں تیار کرنے کی بھرپور و منظم کوششیں ہونی چاہیں۔کوشش کے نتیجہ میں ملک کو ایک ایسی بڑی تعداد جرنلسٹ حضرات کی حاصل ہوگی جو میڈیا میں اپنی حصہ داری و شراکت داری میں اہم کردار

ادا کرے گی۔ نیز اس عمل سے ملک واہل ملک سب ہی کو فائدہ ہوگا۔ دوسری جانب ٹی وی چینلس کے لیے ایسے افراد تیار ہونے چاہیں جو مختلف ایشوز کے ماہرین کی حیثیت سے ٹی وی ڈبیٹس کا حصہ بنیں۔ نیز اپنی صلاحیتوں اور علم کی روشنی میں ٹی وی ڈبیٹس کی موجودہ بد سے بدتر ہوتی صورتحال کو صحیح رخ پر لانے کی کوشش کریں۔ کیونکہ عام طور سے ہوتا یہی ہے کہ جب متبادل نہ ہو تو پھر اجارہ داری ہوتی ہے۔برخلاف اس کے بازار میں جب ضرورت سے زیادہ چیزیں موجود ہوں تو وہ وہاں معیار قائم نہیں رہ پاتا۔ نتیجہ میں وقت صلاحیت دولت سب کچھ برباد ہوتی ہیں۔اور ایسی صورت میں سوائے ساہوکار کے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تقریباً یہی صورتحال آج ہم دیکھنے پر مجبور ہیں۔دوسری جانب یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ مال و دولت کی چمک ،افکار و نظریات اور معاملات وریوں کو متزلزل کرنے کاذریعہ بنتی ہے۔یہ مال و دولت کی چمک ہی ہے جو کہیں ٹی آرپی بڑھاتی ہے تو کہیں اینکر حضرات کا اسٹیٹس اور بینک بیلنس۔ نتیجہ میں نہ افکار نہ نظریات اور نہ ہی مثبت ریوں کی کوئی حیثیت رہتی ہے۔ان حالات میں سہل انگیزی ہر دوصورتوں میں خصوصاً ان افراد و گروہوں کو حد درجہ نقصان پہنچائے گی جو متاثر ہیں۔ خبریں پڑھنے اور سننے مین بھی نقصان اورانہیں نظر انداز کرنے میں بھی نقصان۔ لہذا اگر آج آپ اس حالت میں نہیں ہیں کہ خود میڈیا کی بگڑتی صورتحال کے سدھا میں حصہ داری نبھائیں تو کم از کم قوم وملت اور ملک کے مستقبل کو اس میدان کار میں متحرک کیجئے۔ پھر اگر آپ نے ایسا

کیا تو لازما عمل کے نتیجہ میں ملک اور اہل ملک سب ہی کو فائدہ ہوگا۔ لہٰذا ہوش کے ناخن لیں اور صرف اپنے ہی بارے میں نہ سوچیں بلکہ ملک اور اہل ملک سب ہی آپ کی توجہ کے مستحق ہونے چاہیں۔ کیونکہ اجتماعی سعی وجہد بہتری کی علامت ہے۔ اور جب سب مل جل کر بہتری کی جانب میدان عمل میں قدم بڑھائیں گے تو لازماً اس کے فوائد بھی بہت جلد سامنے آئیں گے!

پہلی شرط! اپنے وجود سے واقفیت

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کا نظام انسان کے وجود سے ہے۔اور اگر مان لیا جائے کہ دنیا میں انسان ہی نہ ہوتا تو اِس کا نظام بھی اس شکل میں نہ چلتا جس طرح آج ہم دیکھ رہے ہیں۔اس کے باوجود یہ بات نا قابل یقین اور حیرت و افسوس کی ہے کہ انسانوں کا ایک بڑا طبقہ خود اپنے وجود اور اس کے مراحل سے لاعلم ہے۔ناواقفیت اپنے وجود سے، ناواقفیت اس بات سے کہ وہ دنیا میں کیوں اور کس حیثیت سے آیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام کے برخلاف جن مذاہب و رسم و رواج یا کلچر سے انسانوں کے گروہ تعلق رکھتے ہیں، وہ اعلیٰ سطح پر ترقیوں کے منازل طے کرنے کے باوجود، یہ فیصلہ آج تک کرنے سے قاصر ہیں کہ درحقیقت ان کی خود کی حیثیت کیا ہے؟یعنی انسان درحقیقت کیا ہے اور دنیا میں اس کی موجودگی کے کیا تقاضے ہیں۔پھر چونکہ ایک بڑے طبقے نے ہر زمانے میں مذہب سے بیزاری کا رویہ اختیار کیا لہٰذا مذہب بیزاری ہی کا نتیجہ تھا اور ہے کہ مذہبی تعلیمات کو اس نے کوئی اہمیت نہ دی۔اور سوال کا جواب وہاں تلاش کیا جہاں درحقیقت اس کے پاس کوئی سند نہ تھی، سند تھی تو قیاسات پر مبنی افکار و نظریات کی، جو زماں و مکاں کی تبدیلی کے ساتھ خود بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں۔دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا وہ کہاں تک کامیاب رہا اور کن حیثیتوں، تصورات و نظریات میں وہ ناکام ثابت ہوا ہے۔انہیں کوششوں کی

کچھ جھلکیاں یہاں ہم پیش کر رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ قاری خود کو اُن تصورات اور افکار و نظریات کے سانچے میں ڈھال کر دیکھے، کہ آیا وہ وہی ہے جو دوسرے اُس کے تعلق سے بحث کرتے نظر آرہے ہیں ؟ یا اُس سے کچھ مختلف ؟ ممکن ہے یہ باتیں ان لوگوں کو سوچنے پر مجبور کریں جو "عقیدہ" سے پرے دیگر افکار و نظریات سے بحث کرتے ہیں یا کم از کم اس کو سمجھنے میں کوشاں ہیں۔

عموماً سائنس اور فلسفہ سے متعلق تقریباً تمام مطالعوں کی ابتدا ہمیں یونانی فلسفہ کی تصانیف میں ملتی ہیں۔ان کے زمانے سے پہلے محض مبہم قیاس آرائیاں ہی دستیاب ہو سکی تھیں۔ جن میں سے کچھ خاصی دلچسپ ہیں لیکن ان کی سائنسی اہمیت بہت مشتبہ ہے۔قدیم یونانی مفکروں کے بارے میں بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ جن نظریات سے انہوں نے بحث کی ہے وہ کس حدتک درست ہیں۔ یہ بات صاف ہے کہ انہوں نے اپنی گرد وپیش کی دنیاکے عام پہلوؤں کو علاحدہ علاحدہ کرکے ابتدائی امتیازات پیش کیے ہیں۔ جیسے آگ ، ہوا، پانی اور ٹھوس مادہ جسے انہوں نے زمین کا نام دیا تھا۔یا کشش اور دور دھکیلنے کے رجحانات میں ، دوام اور تغیر میں ، وحدت اور کثرت میں، مادے اور ہیت میں اور اعلیٰ ہذاالقیاس زندگی کی عام حقیقت، اور خصوصاً انسانی زندگی نے سب سے پہلے ان کو اپنی جانب متوجہ کیا۔انہوں نے اس کا اپنے گرد و پیش کے دوسرے حقائق سے سلسلہ جوڑنے کی کوشش کی۔مثال کے طور پر ہیراکلیٹس (Heraclitus) نے بلندی اور پستی کی سمت حرکت

کے عام رجحان سے اس کا رشتہ جوڑا۔ جو اس کے نزدیک قدرت میں ہر طرف کار فرما نظر آرتا ہے۔ جیسے ابخرات کے اٹھنے میں اور بارش ہونے میں رات اور دن میں، گرمی اور سردی میں، خواب اور بیدار میں، حیات اور ممات میں ، نشو نما اور انحطاط میں، نیکی اور بدی میں، ترقی اور تنزلی میں۔ اس طرح کے طریقہ ہائے بحث نے بعض قدیم یونانی فلسفیوں کو جدید نظریہ ارتقاء اور اس کے انسانی زندگی پر عملی انطباق کے بہت سے مسائل تک پہنچایا دیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں انسانی زندگی کی ناہمواریوں نے خصوصاً اس کے سماجی پہلوؤں کی غیر ہمواری نے ان کو کافی متاثر کیا۔ اس کے باجود انھوں نے مشاہدہ کیا کہ آگ کے جلنے کا ایک مقررہ طریقہ ہے، اس کا جو طریقہ یونان میں ہے وہی ایران میں بھی ہے۔ یہی بات مجموعی طور پر پودوں کی نشونما، حیوانات کی جبلتوں، سیاروں کی حرکت اور دوسرے قدرتی طرز ہائے عمل کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ جن میں بڑی حد تک یکسانیت ملتی ہے۔ چنانچہ ان مشاہدوں کے ذریعہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یکسانیت ہر فطری چیز کی خصوصیت ہے اور اس میں تغیر نہیں ہے۔

اسی طرح پانچویں صدی قبل مسیح کے درمیانی زمانے میں یونان میں معلّمین انسانی کی ایک جماعت ابھری جسے عموماً سوفسطائیوں (Sophists) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے فطری انشاء کے درمیانی تضاد کو نمایاں کرے کے پیش

کیا۔ وہ ایک طرح سے چلتے پھرتے استاد تھے جو ہمیشہ سرگرم سفر رہتے تھے۔ مختلف مقامات کی سیاحت کے دوران جس چیز نے خاص طور پر انہیں متاثر کیا وہ وہاں کے رواجوں، قوانین اور آئین حکومت وغیرہ کی وسیع نیرنگی تھی۔ان کو دیکھ کر وہ یہ کہنے پر مائل ہوئے کہ کیوں کہ ان کے اندر فطری معروضات کی سی باقاعدگی نہیں ہے اس لیے ان کو محض روایتی سمجھنا چاہیے۔ان کا انحصار انسانی معاہدوں، سمجھوتوں یا محض حکمرانوں کے بے اصول انتخاب پر تھا۔ان کی حقیقی بنیاد اشیاء کی فطری خصوصیات میں موجود نہیں تھی۔اس طرح ان چیزوں کے درمیان جو فطری وجود رکھتی ہیں اور ان میں جن کا وجود انسانی قوانین یا روایتوں پر منحصر ہے واضح امتیاز پیش کیا گیا اور اس کی اہمیت پر سختی سے زور دیا گیا۔

دوسری جانب جب ہم لفظ انسان کو سمجھنا کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی مختلف اوقات میں مختلف فکر و نظر نے یا تو فلسفہ سے کام لیا یا قیاس آرائیوں سے ۔کہیں انسان کی تعریف بے پروں کا دوپایہ جیسی مضحکہ خیز تعریف کی تو کہیں حیوانِ ناطق جیسی تعریفیں ملتی ہیں۔بیک ہاٹ (Bagehot) نے کہا تھا کہ میں ایک روح ہوں جو حیوان کی شکل میں ہے۔اسی طرح فرنیکلن (Franklin) اور کارلائل (Carlyle) نے انسان کو آلات سے کام لینے والا جانور قرار دیا ہے۔مارگن (Prof Llyod Morgan) نے اپنی کتاب Animal Life and Intelligence میں کہا، کہ اگر انسان کو آلات سے کام لینے والا جانور تسلیم کر

لیا جائے تو وہاں آلات کا بھی وسیع مفہوم لینا ہوگا۔جس میں مشینوں،کتابوں،اداروں اور جانوروں سے کام لینا بھی شامل ہے۔وہیں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ استدلال کی صلاحیت کے باوجود بھی اگر انسان کو ایک مخصوص جسمانی ساخت ودیعت نہ ہوئی ہوتی تو انسانی زندگی وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔ایک مکمل عضلاتی اور استخوانی بناوٹ کے بغیر وہ اپنے جسم کو اس طرح سیدھا اور کھڑا نہ رکھ سکتا تھا کہ دوسروں پر حکمرانی اور برتری کا سکہ جما سکے۔انیکسگوراز (Enexgoras) تمام اس بات کا حامی ہے کہ انسان کی افضیلت تراس کے ہاتھوں کی بدولت ہے۔وہ کہتا ہے کہ اپنے اعلیٰ حواس اور آنکھوں کے بغیر وہ معروضات کا اتنی صحت کے ساتھ مشاہدہ نہیں کر سکتا تھا کہ انہیں اپنے مقاصد کے مطابق ڈھال سکے۔ہاتھوں کی آزادانہ حرکت کے بغیر اس کے لیے وہ اوزار اور مشینیں بنانا مشکل ہوتا جن سے آج ہم واقف ہیں اور جن کی قدیم شکلوں کو انسان کے جسمانی اعضاء کی توسیع دی ہوئی شکل سے کچھ ہی زیادہ سمجھا جا سکتا تھا۔یہ مفکرین جو انسان اور انسانی ساخت اور اس کی خصوصیات پر بحث کرتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسانی جسم کی انوکھی خصوصیات پر توجہ دیئے بغیر ہم انسانی زندگی کو مکمل طور پر سمجھنے کی امید نہیں کر سکتے۔

گفتگو کے پس منظر میں غور کیجئے جو انسان خود کو انسانِ کامل ہی نہ سمجھتا ہو وہ کس طرح ، دنیا کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکتا ہے؟اور اگر ایک شخص

گروہ یا قوم اپنے وجود اور آغاز و انتہا کو دنیا کے وجود اور آغاز و انتہا سے صحیح معنوں میں رشتہ قائم کرنے میں ناکام ٹھہرتا ہے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے لیے یا دیگر افراد و گروہوں کے لیے سود مند ثابت ہو جائے۔ لہذا دنیا میں کسی بھی نظام کے قیام و استحکام کے لیے لازم ہے کہ سب سے پہلے انسان اپنے وجود سے خوب اچھی طرح خود واقف ہو جائے ! ۔۔۔۔۔ جاری

دیش بھکت و دیش دروہی!

فی الوقت ہندوستان میں بڑے زور و شور سے نیشنلزم کی بحث جاری ہے۔جو خاصی دلچسپ بنتی جارہی ہے۔کہا جارہا ہے کہ جس کو دیش سے محبت ہے وہ "بھارت ماتا کی جئے"کا نعرہ لگائے گا اور جس کو دیش سے محبت نہیں وہ یہ نعرہ نہیں لگائے گا۔باالفاظ دیگر جو دیش بھکت ہے اور نعرہ بھی لگاتا ہے تو مخصوص نعرے کی آڑ میں اس کا ہر عمل حلال تسلیم کیا جائے گا۔دوسری جانب جو یہ نعرہ نہیں لگاتا وہ دیش دروہی ہے۔اس کے باوجود کہ اس کے تمام اعمال ملک کے لیے مثبت ہیں لیکن اس کے کسی عمل پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔لیکن جن لوگوں نے نعرہ کو بطور ایشو اٹھایا تھا معلوم نہیں کیوں اور کیسے اچانک خود اپنے ہی بیان سے پلٹ گئے۔یا یہ کہیے کہ اپنے بیان کی تشریح نئے انداز میں پیش کردی۔کہا کہ جمہوریت میں سب آزاد ہیں۔کسی کو کسی بھی مخصوص نعرہ لگانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔اس موقع پر ضروری تھا کہ مسلمانوں کے اکابر علماء کرام مسلمانوں کو اس نعرہ،اور اس کی ادائیگی میں قباحت سے،مدلل انداز میں سمجھاتے۔تاکہ اگر یہ سوال دوبارہ اٹھایا جائے یا نہ بھی اٹھایا جائے تب بھی مسلمانوں کو لازماً یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ یا اس طرح کے دیگر نعروں کی ادائیگی میں قباحت کیا ہے؟اور وہ کیوں اس کی مخالفت کرتے ہیں؟غالباً انہیں حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے

ہندوستان کے اکابر علماء کرام کا اتفاق ہے کہ ہمیں بحیثیت مسلمان یہ نعرہ نہیں لگانا چاہیے۔اعتراض کی وجہ بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ کہ بھارت ماتا کی جے پر اصرار اُسی وقت ممکن ہے جبکہ آئین میں اس کا ذکر ہو۔اور دوسری بات یہ کہ چونکہ بھارت ماں کی ایک تصویر اور مورتی بنائی جاتی ہے،جس کے آگے ہاتھ جوڑ کر یا اعتقاداً پوجا پاٹ بھی ہوتی ہے،اور آئندہ اس کے مزید امکانات ہیں،لہذا اس صورت میں یہ عمل ہمارے لیے نہ صرف ایک مشرکانہ عمل ہے بلکہ وحدانیت کے تصور میں شرک کی آمیزش بھی ہے۔ان دونوں ہی صورتوں میں ہم اس نعرہ سے اتفاق نہیں کر سکتے۔برخلاف اس کے قومی ترانہ جن گن من سے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔پھر اگر ان دومسئلوں کو پس پشت ڈال دیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آیا مسلمانوں نے ملک کے لیے ماضی میں کیا کچھ قربانیاں دی ہیں؟تو تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک،اس کی آزادی اور اس کی سلامتی،بقا اور تحفظ کے لیے مسلمانوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔لہذا نعرہ لگانے یا نہ لگانے سے کسی فرد،گروہ یا قوم کی محبت اور نفرت کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری جانب ریاست مہاراشٹر کے پونے میں شنی شنگناپور مندر میں خواتین کے داخلہ پر طویل مدت سے شور برپا ہے۔ترپتی دیسائی نامی خاتون اور ان کی دیگر خواتین ساتھیوں نے ایک طویل عرصہ سے جدوجہد جاری کی ہوئی ہے۔اور ان خواتین کی طویل جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے کہ آخرکار بامبے ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا

کہ مندر میں تمام خواتین کو جانے کی اجازت ہے۔اور کورٹ کے فیصلہ کو روبہ عمل لانے کے لیے بی جے پی کے وزیر اعلیٰ فڈنویس نے بھی کہا ہے کہ نہ صرف شنی شنگنا پور مندر میں بلکہ ریاست کے تمام مندروں میں خواتین کو جانے اور وہاں پوجاپاٹ کرنے کی اجازت ملے گی۔اس سب کے باوجود جب خواتین مندر میں پوجا پاٹ کرنے کے لیے مندر میں داخل ہو رہی تھیں تو مقامی لوگوں نے جن میں خواتین بھی شامل تھیں، ہنگامہ کیا اور اس عمل کی مخالفت کی۔لہٰذا پولیس نے ترپتی دیسائی اور ان کی 26 خواتین ساتھیوں کو حراست میں لے لیا۔توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ ایشور، بھگوان، یا خدا کی عبادت جو ایک انسان کی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے،اس میں یہ تفریق کہ مرد پوجا کر سکتے ہیں اور عورتیں نہیں۔یہ کس حد تک صحیح ہے؟اسی درمیان گزشتہ دنوں شہر ممبئی کے ساحلی علاقہ میں حاجی علی نامی درگاہ پر بھی خواتین کو جانے اور وہاں پوجاپاٹ کرنے کی آواز، مسلم خواتین کی جانب سے اٹھی تھی۔اور اس وقت ان دونوں "عبادت گاہوں" میں خواتین پر پابندی کیوں ہے؟سوال سامنے آئے تھے۔لیکن یہاں اور وہاں میں دلچسپ اور واضح فرق غالباًیہی ہے کہ درگاہوں اور قبروں پر جانا، دعائیں کرنا، منتیں مانگنا، یہ تمام اعمال اسلام میں عبادت کے زمرے میں نہیں آتے ۔برخلاف اس کے مورتی پوجا، اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر خاص انداز میں اشلوک پڑھنا، ہندو مذہب یا کلچر میں عبادت سمجھا جاتا ہے۔اور یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ بندے اور بھگوان کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔بصورت دیگر اسلام میں درگاہوں پر جانے سے

بندے اور اس کے خدا کا رشتہ استوار نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے عبادت کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

تیسری جانب آج کل ملک کی پانچ ریاستوں میں اسمبلی انتخابات شروع ہونے جارہے ہیں۔جہاں برسر اقتدار ریاستی حکومتیں اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں تو وہیں حزب اختلاف کی پارٹیاں موجودہ حکومتوں کی بدنظمیاں اور وعدہ خلافیوں کو عوام کے سامنے لانے میں کوشاں ہیں۔ساتھ ہی اگر وہ کامیاب ہوتے ہیں تو ریاست کو مزید کیسے بہتر بنائیں گے اور متعلقہ حلقہ میں بے روزگاری، غربت، تعلیم ، صحت و دیگر مسائل کو کیسے حل کریں گے، یہ سب بتانے اور سمجھانے میں مصروف ہیں۔پانچ ریاستیں آسام، مغربی بنگال، کیرلہ، تمل ناڈو اور پانڈیچری، جہاں اسمبلی الیکشن ہونے والے ہیں، ان میں مغربی بنگال اور آسام کی ریاستوں میں 4،اپریل کو پہلے مرحلہ کا الیکشن ہونا ہے۔اور ان دونوں ہی ریاستوں کی خصوصیت یہ ہے کہ مسلم آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاستیں جانی جاتی ہیں۔آسام میں 34.2% فیصد مسلمان آباد ہیں تو وہیں مغربی بنگال میں 27.1% فیصد۔مغربی بنگال میں تین ڈسٹرکٹ، مرشدآباد، مالدہ، اتردیناجپور ایسے ہیں جہاں بالترتیب 70.2%، 51.27% اور 50.92% فیصد مسلمان آباد ہیں ۔وہیں ساؤتھ 24 پرگنا، نارتھ 24 پرگنا، نادیہ، بیر بھوم، ہاوڑا، کوچ بہار، وہ ڈسٹرکٹس میں مسلمانوں کی آبادی 25 سے فیصد کے درمیان موجود ہے۔دوسری جانب ریاست آسام کی 35

بات کی جائے تو ڈھوبری میں 79.67%، بیرپیٹا میں 70.74% فیصد، دھر رنگٹ میں 64.34% فیصد مسلمان آباد ہیں۔ وہیں بون گے گاؤں، گول پاڑہ، ہیلا کنڈی، کریم گنج، موری گاؤں، ناگاؤں، وہ ڈسٹرکٹس میں مسلمانوں کی آبادی 50 سے 60 فیصد کے درمیان موجود ہے۔ اس کے باوجود افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہی وہ دوریاستیں ہیں جہاں مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی صورتحال پر نظر ڈالی جائے تو وہ حد درجہ مسائل سے دوچار ہیں۔

اوپینئن پول یا ایگزٹ پول کی روشنی میں یہ بات صاف ہوتی نظر آرہی ہے کہ مغربی بنگال میں بھارتیہ جنتا پارٹی حکومت تشکیل دے، کسی صورت بھی یہ ممکن نہیں ہے۔ CVoter Opinion Poll 2016 نے ترنمول کانگریس کو 160 سیٹوں پر سب سے آگے دکھایا ہے، وہیں کانگریس کو 21، لیفٹ کو 106، بی جے پی کو 4 اور دیگر کی 3 سیٹوں پر کامیابی دکھائی ہے۔ برخلاف اس کے آسام کے opinion poll میں بی جے پی کو کہیں آگے تو کہیں پیچھے دکھایا جارہا ہے۔ نیوز نیشن نے کانگریس کو 54-58، بی جے پی کو 50-54، اے آئی یو ڈی ایف کو 13-17 اور دیگر کو 2-4 سیٹوں پر کامیاب دکھایا ہے۔ وہیں ٹائمس ناؤ سی ووٹر نے کانگریس کو 53، بی جے پی اور ان کے حلیف کو 55 اے آئی یو ڈی ایف کو 12 اور دیگر کو 0 سے 2 سیٹوں پر کامیاب دکھایا ہے۔ دیگر opinion poll نے بھی اسی کے آس پاس اپنے نمبرس دیئے ہیں۔ ریاست آسام کے حالیہ اسمبلی انتخابات میں بدرالدین اجمل کی اے آئی یو

ڈی ایف اہم کردار ادا کرسکتی ہے، گرچہ وہ بی جے پی کو روکنا چاہے اور کانگریس کے ساتھ حکومت بنائے۔لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جموں کشمیر کی طرح آسام میں بھی کانگریس کے بعد دوسرے نمبر پر کامیابی حاصل کرنے والی پارٹی بی جے پی کی حمایت سے حکومت تشکیل دے۔اور اس کا قیاس اس لیے زیادہ ہے کہ مرکز میں.برسراقتدار پارٹی کے تعاون سے جب کبھی بھی ریاست میں حکومت تشکیل دی جاتی ہے تو وہ تمام سہولیات باآسانی حاصل ہو جاتی ہیں،جو کسی بھی دیگر سیاسی پارٹی کے ساتھ حکومت بنانے میں حاصل نہیں ہوتیں۔ مغربی بنگال وآسام دونوں ہی ریاستوں میں 4،اپریل کو پہلے مرحلہ کا الیکشن ہونا ہے۔جہاں آسام میں کل 126 سیٹوں میں سے 65،سیٹوں پر تو وہیں مغربی بنگال میں کل 240 سیٹوں میں سے 18،سیٹوں پرووٹنگ ہوگی ۔دیکھنا یہ ہے کہ 19،مئی 2016 کو آنے والے نتائج ملک اور ریاست کی کیا تصویر پیش کرتے ہیں۔اور غالباً یہی وہ نتائج ہوں گے جن کی بنا پر ایک بار پھر ممکن ہے دیش بھکت اور دیش دِروہی کے نعروں کا دوسرا مرحلہ شروع کیا جائے!

عوامی مسائل میں حصہ داری

یہ عجب اتفاق ہے کہ ایک جانب ملک کی نو ریاستوں میں سوکھا پڑا ہے اور کسان حد درجہ متاثر ہے تو وہیں پانچ ریاستوں کے اسمبلی الیکشن جاری ہیں۔ عجب اتفاق ہم نے اس لیے کہا کہ انتخابی موسم ہی تو دراصل وعدوں اور جملوں کا موسم بہار ہوتا ہے۔ لیکن توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ وہ کون سی بات ہے کہ جس کے نتیجہ میں گزشتہ کئے گئے وعدے پورے نہ کرتے ہوئے بھی مزید وعدوں اور جملوں کے بیان کرنے میں دقت نہیں ہوتی بلکہ حوصلہ بھی ملتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ یہ دور جمہوریت اور جمہوری نظام کا دور کہلاتا ہے۔جہاں عوام اپنی پسند کے نمائندے منتخب کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔اوریہی وہ نکتہ ہے کہ چونکہ عوام اپنی پسند کا نمائندہ خود منتخب کررہی ہے، لہٰذا اس کی پسند کے سابقہ و موجودہ نمائندے بتاتے ہیں کہ اگر وہ ان کو منتخب کر لیں گے تو وہ کیا کچھ ان کے لیے کریں گے، جنھوں نے انہیں منتخب کیا۔پھر یہی وجہ انتخاب انہیں یہ حوصلہ اور جرات بھی بخشتی ہے کہ وہ مزید وعدے اور جملے عوام کے درمیان عوامی جلسوں میں ادا کریں۔ جمہوری نظام میں ہم سب اس بات سے بھی باخوبی واقف ہیں کہ جہاں سیاسی لیڈران وعدے کرنے اور جملے بازی سے نہیں ہچکچاتے وہیں عوام بھی اس ماحول کی عادی ہو چکی ہے۔غالباًیہی وجہ ہے کہ وہ بھی سیاسی جلسوں کو سیاسی جملے بازی سے زیادہ اہمیت نہیں

دیتے۔اور وہ یہ یقین بھی کر چکے ہیں کہ ان جلسوں میں کیے گئے وعدے حقیقتاً پورے نہیں ہونے ہیں۔اس سب کے باوجود چونکہ سیاست سے ہمارا راست یا بلاواسطہ تعلق استوار ہوتا ہے لہذا خوشی کے ساتھ یا اظہار ناپسندیدگی کے ،ہمیں بھی اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔دوسری جانب ووٹ حاصل کرنا اور ووٹوں کی گنتی جس میں کوئی کسی سے آگے تو کسی سے پیچھے ہوتا ہے ،کی بنیادیں بھی وہ نہیں ہیں جو بظاہر نظر آتی ہیں۔یہ پوری تصویر جو پیش کی گئی ہے جہاں ایک جانب دلچسپ ہے تو وہیں حد درجہ تشویشناک بھی ہے ۔اور ہماری تشویش بھی بس یہی ہے کہ عوام کے پیش نظر ووٹ دینے اور نہ دینے ،حکومت کے انتخاب اور ردّ کے جو پیمانہ قائم ہوتے جارہے ہیں ، مستقبل قریب میں وہ مزید سنگین شکل اختیار کر سکتے ہیں۔لہذا وہ افراد اور گروہ جو خود کو موجودہ سیاست سے الگ رکھنا چاہتے ہیں اور جن کے پیش نظر ایک صاف ستھری زندگی کے معنی ،اس میدان غلاظت سے دوری اختیار کرنے کے سوااور کچھ نہیں،ان کی یہ فکر و نظریہ کم از کم موجودہ دور میں صحیح قرار نہیں دی جا سکتی۔حالات کے پیش نظر صاف ستھری زندگی گزارنے والوں کو چاہیے کہ وہ ایک بار پھر اپنی فکر و نظریہ پر نظر ثانی فرمائیں۔ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص سیاسی جماعت سے وابستہ ہو یہ لازم نہیں ہے۔اس کے باوجود ہر شخص سیاسی میدان میں جاری کھیل سے کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی مرحلہ میں متاثر وملوث ہے۔اور جبکہ وہ متاثر بھی ہیں اور ملوث بھی تو کیونکر مسائل کے انبار سے وہ خود کو الگ کرپائیں گے۔اور یہ

کیسے مانا جاسکتا ہے کہ مسائل جن میں ہر صبح اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، مسائل کے اضافہ میں ،آپ ،آپ کا کردار، اعمال اور افکار و نظریات شامل نہیں ہیں ؟ساتھ ہی یہ بات بھی خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ شراکت داری متحرک رہ کر ہی نہیں جمود کی حالت میں زیادہ ہوا کرتی ہے۔

دوسری جانب گزشتہ دنوں ہندوستان میں امام کعبہ کی آمد جو گرچہ ویزا نہ ملنے کی وجہ سے منتظمین کے لیے باعث تشویش تھی،آخر کار حکومت نے ویزا فراہم کیا اور حرم شریف کے امام ہندوستان تشریف لائے۔ان کی آمد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے باعث خوشی ہے۔اور جس تپاک سے ہندوستانی مسلمانوں نے ساتھ ہی مختلف مسالک کے علماء کرام نے ان کا استقبال کیا ہے وہ خود قابل دید ہے۔امام حرم سے محبت ،ان کی عزت اوران کا تقدس امت مسلمہ میں اگر پایا جاتا ہے تو غالباًاس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ بذات شخص مقدس ہیں بلکہ یہ تمام دلچسپیاں اور محبتیں جو چھلکتی ہیں تو صرف اس بنا پر کہ وہ اُس مقدس مقام سے وابستہ ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی دیگر عبادت گاہوں میں اعلیٰ ترین مرتبہ عطا کیا ہے۔پھر اس لیے بھی کہ اللہ تعالی نے مقام حرم کو پرامن حرم بنایا ہے،ایک ایسا پرامن جائے قیام جہاں ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں۔یہی بات قرآن حکیم میں اللہ تعالی خود فرماتا ہے: کہ "کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پرامن حرم کو ان کے لیے

جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں، ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اِترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے، آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے (القصص:۵۷-۵۸)۔لہٰذا اہل حرم، خادم حرمین و شریفین اور ائمہ حرمین، جو بارہا حکومتی کی جانب سے طے شدہ مقاصد کے تحت مختلف ممالک کا دورہ کرتے ہیں، ان تمام کو اس آیت کی روشنی میں نہ صرف اپنی حقیقی حیثیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے بلکہ چاہیے کہ وہ، ان تمام قوت باطلہ کا آلہ کار بننے سے بھی گریز کریں، جن کے شر سے آج پوری دنیا میں فساد برپا ہے۔اور اگر ایسا نہیں ہوا، تو پھر یاد رکھنا چاہیے کہ حدود حرم اور مسجد حرام میں نماز کی ادائیگی کی جو اہمیت ہے وہ حدودِ حرم اور مسجد سے باہر نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح جو محبت اور عزت امت مسلمہ سے آج انہیں حاصل ہے۔اگر انہوں اپنی حیثیت کے برخلاف عمل کیا۔یا انہوں نے قوت باطلہ کا آلہ کار بننا ہی پسند کیا تو مجموعی طور پر امت مسلمہ بھی مجبور ہو گی کہ انہیں ان کی اصل حیثیت سے وہ واقف، کرادیا جائے۔اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "شد رحال (بغرض ثواب رخت سفر باندھنا) صرف تین مسجدوں ہی کی طرف کیا جائے۔مسجد حرام، میری یہ مسجد (یعنی مسجد نبوی) اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس)" (صحیح بخاری)۔اور یہ سب جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مسجد شعب یا

مسجد جمیزہ کی طرف شد رحال کرکے جائے گا تو ہم کہیں گے کہ یہ جائز نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شد رحال صرف تین مسجدوں ہی کی طرف کیا جائے۔ اگر حرم کی ہر مسجد کی طرف شد رحال جائز ہوتا تو پھر دسیوں بلکہ سینکڑوں مسجدوں کی طرف شد رحال جائز ہوتا۔ پس یہ حدیث کافی ہے امت مسلمہ کے لیے اور آئمہ ولیڈران امت کے لیے بھی کہ وہ اپنی حیثیت اور حدودِ شرعی کا پاس و لحاظ رکھیں۔

آخری بات جو قابل تذکرہ اور قابل تعریف ہے، وہ بہار حکومت کا شراب نوشی پر مکمل پابندی کا اعلان اور پہلے مرحلہ میں مکمل عمل درآمد ہے۔ اس کے باوجود ام الخبائث سے پاک ریاست کا تصور تب ہی ممکن ہے جبکہ ریاست کے شہری بھی حکومت کے فیصلہ کو تعاون فراہم کریں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی ان تمام نشہ آور اشیاء کو بھی جو انسان کو خیر و فلاح سے نکال کر شر و فساد میں مبتلا کرنے والی ہیں۔ اس کے باوجود حد درجہ افسوناک صورتحال یہ ہے کہ تمام ہی مقامات پر مسلمانوں کی نسل نوخیز اس نشہ کی بدترین لت میں مبتلا ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر عام شہریوں کی بات کی جائے تو ان کی اکثریت نہ اس کو برائی مانتی ہے، نہ اس کے سامنے حرام و حلال کا مسئلہ ہے اور نہ ہی معاشرتی سطح پر اس کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ان کے یہاں شراب عام مشروب کی طرح استعمال کی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ

صحت کے نقطہ نظر اور خاندنی مسائل میں وہ اس کو مضر سمجھتے ہیں۔اس کے باوجود یہ قوتِ اقتدار ہی ہے جو ہر قسم کے فیصلے لینے میں رکاوٹ نہیں بنتی۔اور اگر فیصلہ جو لیا گیا ہے وہ عوام کے لیے بھی سود مند ہو تو پھر عوام بھی بھرپور انداز میں تعاون دیتی ہے۔اس صورت میں ملک کی راجدھانی دہلی پر نظر ڈالی جائے تو یہاں بھی شراب پر پابندی نہیں ہے۔گرچہ دہلی ملک کی راجدھانی ہے۔اس لحاظ سے اسے مثالی ہونا چاہیے تھا،لیکن آج تک کسی بھی حکومت نے اس جانب توجہ نہیں دی۔اس موقع پر میں اپیل کروں گا ان حضرات سے جو شراب کو حرام قرار دیتے ہیں،انہیں اس جانب پیش قدمی کرنی چاہیے۔ساتھ ہی عام باشندگان دہلی کے تعاون سے حکومت کو متوجہ و مجبور کرنا چاہیے کہ وہ یہاں بھی شراب پر مکمل پابندی عائد کریں۔ممکن ہے عوامی رجحان اور منظم و منصوبہ بند طویل مدتی سعی و جہد کے نتیجہ میں یہاں بھی حکومت فیصلہ لینے پر مجبور ہو جائے۔اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ عمل ہر لحاظ سے نہ صرف قابل تعریف بلکہ منکر کے ازالہ اور معروف کے قیام میں داخل ہو جائے گا۔پھر یہ اور ان جیسے دیگر اعمال شہادت دیں گے کہ واقعی ہمیں نہ صرف عوام الناس بلکہ ان کے مسائل سے بھی حقیقی دلچسپی ہے!

!نوجوانوں میں نشہ آور اشیاء کا بڑھتا رجحان

انسان کو لگنے والی کسی بھی طرح کی لت اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ عموماً یہ لفظ استعمال بھی منفی معنوں میں ہی ہوتا ہے۔اس کے باوجود مختلف افراد اپنے ذوق کے لحاظ سے مختلف طرح کی لتوں میں ملوث ہوتے ہیں۔اور توجہ دلانے کے باوجود ان کے لیے اپنی مخصوص لتوں سے چھٹکارا ایک اہم مسئلہ بن سامنے آتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض اوقات مذہبی امور میں بھی انسان نہ جانے کون کون سی لتوں میں ملوث ہوجاتا ہے۔ نتیجہ میں مذہب کے اُس آفاقی تصور سے وہ نالاں رہتا ہے،جو مطلوب ہے۔لتوں سے چھٹکارے کی خواہش اور سعی و جہد کے باوجود اگر فرد یا گروہ کی صحیح رہنمائی نہ کی جائے تو عین ممکن ہے کہ ایک لت سے نکل کر دوسری اور دوسری سے نکل کر تیسری لت میں وہ مبتلا۔ یہاں تک کہ وقت ضائع ہوتا رہے لیکن منزل مقصود ہاتھ نہ آئے۔دیکھا جائے تو منزل مقصود تک نہ پہنچنے کے عموماً دو اسباب بیان کیے جا سکتے ہیں ۔ایک: صحیح رہنمائی عدم موجودگی،اور دو: جذبۂ عزیمت کا فقدان۔ پھر ان اسباب کے پس پشت بھی دو بڑے اسباب کارفرما ہیں۔ایک: خلوص نیت کی کم یابی اور دو:مثالی رہنما کا نہ پایا جانا۔یعنی کسی بھی طرح کی لت میں مبتلا ہے ہر وہ وہ شخص جو اُس سے چھٹکارا چاہتا ہے نیز وہ تمام نجات دہندہ،ہر دو سطح پر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔اور چونکہ مریض اور شفاداں،ایک دوسرے کی مخالف

سمت میں گامزن ہیں لہٰذا تمام طرح کی خواہشات اور مختلف سطح پر کی جانے والی ظاہری کوششوں کے باوجود، نتائج کے اعتبار سے ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے۔کچھ یہی حال ہمارے معاشرتی ومذہبی مسائل وامور اور ان میں حائل افراد و گروہوں کا بھی ہے۔کہ اگر ایک فرد یا گروہ سنجیدگی کے ساتھ سعی وجہد کرتا نظر بھی آتا ہے تو اس کے مخالفین کی بھی ایک بڑی تعداد فوراً ہی سامنے آجاتی ہے۔جس کے نتیجہ میں مسائل کا حل دیر پا نہیں رہ پاتا۔اس سب کے باوجود اگر عزائم بلند ہوں اور خلوص نیت بھی کسی حد تک پائی جاتی ہو، تو کامیابی طے شدہ ہے۔بس چاہیے تو ایک شوق، تمنا، ارمان اور طلب۔ ہندوستان میں نشہ کی لت وبا عام ہے۔نشہ کی ایک شکل گانجہ، چرس، بھانگ، ہیروئن اورافیون ہے جس کے عادی بڑی تعداد میں چہار جانب موجود ہے۔ وہیں دوسری شکلوں میں بیڑی، سگریٹ اور شراب نوشی میں مبتلا افراد کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔نشہ کی ایک اور شکل گٹکھ ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں ہر عام و خاص کے درمیان گٹکھ کی وبا عام ہوئی ہے۔یہاں تک کہ یہ ایک مکمل انڈسٹری بن چکی ہے۔ہندوستانی معاشرہ میں نشہ آور اشیاء کا ستعمال قابل گرفت نہیں ہے۔ہندو معاشرہ میں خوشی کے مختلف مواقعہ پر نشہ آور اشیاء کا کھلے عام استعمال ہوتا ہے۔یہاں تک کہ بعض تہواروں کی ادائیگی مراسم میں نشہ شامل ہے۔اور اگر ایسے مواقعہ پر نشہ نہ کیا جائے تو وہ تہوار ہی نامکمل کہلائے گا۔مثلاً

ہولی کے موقعہ پر دیسی شراب کا استعمال عام بات ہے۔پھر اگر فرد صاحب حیثیت ہے تو انگریزی شراب اس کے اسٹیٹس کو بڑھانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ایسے مواقعہ پر بچے،بڑے،مرد،خواتین،خاندان کے سرپرست حضرات،تمام ہی نشہ کا استعمال کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔پھر اگر شراب اور نشہ آور اشیاء کا زبان کو مزہ مل جائے تو کیونکر وہ دوبارہ استعمال نہیں کریں گے؟اس کے باوجود کہ نہ معاشرتی سطح پر اور نہ ہی مذہبی بنیادوں پر شراب یا نشہ آور اشیاء کا استعمال معیوب سمجھا جاتا ہے۔ہندو معاشرہ کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں کہ سادھو اور بھکت نشہ کرتے ہیں اور غالباً وہ اس کو عبادت کی انجام دہی میں معاون سمجھتے ہیں۔ویدوں میں چند نشہ آور پودوں کے نام بھی آتے ہیں جن کا استعمال ان کے مخصوص دیوتا کرتے تھے۔لہذا مخصوص مواقعہ پر نشہ کو بھی عبادت کا حصہ مان لیا گیا ہے۔اس پس منظر میں یہ کیسے ممکن ہے کہ نشہ کو ہندو یا ہندوستانی معاشرہ سے مکمل طور پر الگ کیا جاسکے۔اور یہ بات طبّی ریسرچ ثابت کر چکی ہے کہ نشہ دراصل کہتے ہیں اس عادت کو ہیں،جس میں کوئی بھی کھانے پینے کی کوئی بھی شے فرد کو اس قدر عادی بنا دے،جس سے چھٹکارا حاصل کرنا،حددرجہ مشکل ہو۔پھر یہ نشہ آور اشیاء نہ صرف انسان کے دماغ کو متاثر کرتی ہیں بلکہ اس کے دل،گردے اور پھیپڑوں کو بھی بری طرح نقصان پہنچاتی ہیں۔نشہ کے عادی افراد کو کینسر ہونا عام بات ہے،وہیں نشہ کے عادی افراد کی 2.4 ملین تعداد ایسی ہے جو HIV Positive سے متاثر ہیں۔افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندوستان فی الوقت دنیا میں

تیسرے نمبر پر ہے جہاں ایچ آئی وی پازیٹیو انفیکشن ان افراد کے ذریعہ پھیل رہا ہے جو نشہ کی لت میں مبتلا ہیں۔ قانونی اعتبار سے ہیروئن کا استعمال کرنے والوں میں ہندوستان بھی، ایران، پاکستان اور چین کے ساتھ سرفہرست ہے۔ وہیں جغرافیائی اعتبار سے دنیا میں ہیروئن فراہم کرنے والے سب سے بڑے ملک برما اور افغانستان ہیں، جو ہندوستان سے بالکل قریب ترین ہیں۔ اس اعتبار سے ہیروئن کا ہندوستان میں غیر قانونی طریقہ سے داخل ہونا اور کاروباری شکل اختیار کرنا بہ نسبت دوسرے ملکوں کے زیادہ آسان ہے۔ نشہ آور اشیاء میں ہیروئن ہندوستان میں سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ مختلف طبقات جن میں دس سے لیکر تیرہ سال کے بچے، جن میں کمزور طبقات کے بچے بھی شامل ہیں تو وہیں اشرافیہ کے بچے بھی، طلبہ وطالبات بھی شامل ہیں تو وہیں مرد و خواتین بھی، جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے بھی شامل ہیں تو اعلیٰ ترین مکانات میں رہنے والے بھی، کاروباری بھی شامل ہیں تو وہیں عامیانہ زندگی گزارنے والے افراد بھی۔ پھر یہی معاملہ شراب نوشی کا بھی ہے۔ اور دیگر نشہ آور اشیاء کا بھی۔

ہندوستان میں نشہ کی لت میں مبتلا افراد میں سب سے زیادہ تعداد نوجوانوں کی ہے۔ موجودہ حکومت کا جہاں ایک جانب یہ خواب ہے کہ 2020ء تک ہندوستان نوجوانوں کی موجودگی کے بل پر، دنیا کا طاقتور ملک بنے گا۔ وہیں اس خواب کی

حقیقت یہ ہے کہ یہاں ہندوستان میں سب سے زیادہ بے روزگاری اگر کہیں ہے تو وہ اسی طبقہ نوجوانوں میں ہے۔ نتیجہ میں ذہنی تناؤ میں مبتلا افراد کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ یہ ایسے نوجوان ہیں جو بے روزگار بھی ہیں اور ذہنی تناؤاور دباؤ کا شکار بھی۔آج نشہ صرف مزہ حاصل کرنا اور تناؤ دور کرنے ہی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ نوجوانوں کی ایک ضرورت بن چکی ہے۔ نشہ کے بغیر وہ اپنی روز مردہ کی زندگی کے کام ٹھیک اور پڑھائی ٹھیک طرح سے نہیں کرپاتے۔ایک رپورٹ کے مطابق دہلی ، این سی آر کے ساتھ پنجاب، نارتھ ایسٹ، ممبئ اور بنگلور نشہ کے ہب بن چکے ہیں۔خطرناک بات یہ ہے کہ نشہ آور اشیاء ہوٹلوں، عام دکانوں اور تعلیمی اداروں کے قرب و جوار میں بہت آسانی سے دستیاب ہیں۔حیرت اور افسوس کی بات یہ بھی ہے کہ آن لائن خریداری کی ویب سائٹس پر نشہ آور اشیاء مختلف کوڈورڈس میں دستیاب ہیں۔ جنہیں بہت آسانی کے ساتھ بغیر کسی رسک کے ہوم ڈلیوری کے ذریعہ گھر بیٹھے منگایا جا سکتا ہے، اور یہ جاری ہے۔جانے مانے ماہر نفسیات ڈاکٹر نوین گرور کہتے ہیں کہ ،نوجوانوں کے درمیان نشہ کے بڑھتے چلن کے پیچھے ،بدلتی طرز زندگی، غیر اخلاقی دوستوں کا ساتھ ،خاندانی دباؤ،ماں باپ کے جھگڑے،انٹرنیٹ پر گھنٹوں وقت صرف کرنا،اور خاندانی تضادات ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دہلی ، نوئیڈا،گڑگاؤں،فریدآباداور غازی آباد،یہ وہ تمام علاقے ہیں جو دہلی سے ملے ہوئے ہیں،اور جہاں بڑی تعداد میں نوجوان معاشی ضرورتوں کے پیش نظر موجود

ہیں۔ان تمام علاقوں کے کارپوریٹ ہاؤس میں کام کرنے والے 27% فیصد نوجوان کسی نہ کسی نشہ کی لت میں مبتلا ہیں۔

گفتگو کے پس منظر میں یہ بات پوری طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ آج ملک کا نوجوان نشہ آور اشیاء کا استعمال بڑے پیانہ پر کررہا ہے۔ نتیجہ میں جہاں ایک جانب وہ مختلف طرح کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہے وہیں معاشرتی ،خاندانی اور مذہبی امور میں اس کو سرے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ان حالات میں اہل اقتدار کو چاہیے کہ خواب دکھانے کی بجائے یکساں لائحہ عمل کے ساتھ ،پورے ملک میں عملی اقدامات کریں۔ نہیں تو بہت جلد وہ خواب چکنا چور ہو جائے گا جو نوجوانوں کی بڑی تعداد کے پس پشت دیکھا اور دکھایا جارہا ہے!

! اَوَر اِنڈین مسلمانز

ہندوستان میں مسلمانوں کے انحطاط کو اگر ہم سمجھنا چاہیں تو دراصل یہ وہی زمانہ ہے جبکہ 1712ء میں مسلم حکومت کا چراغ گل ہوااور مسلمانوں کا تنزل شروع ہوا۔مزید 1857ء میں انتہا کو پہنچا۔اس درمیان میں 1757ء میں پلاسی کی لڑائی ہوئی اور گرچہ میر جعفر بنگال کا صوبیدار مقرر ہوا۔لیکن وہ "مردہ بدست زندہ" تھا۔حقیقت میں حکمرانی ایسٹ انڈیا کمپنی کی قائم ہو چکی تھی۔ادھر پنجاب میں 1799ء میں شاہ زماں والی کابل رنجیت سنگھ کو اپنا صوبیدار مقرر کر گیا تھا۔لیکن وہ خود مختار ہو گیا۔1818ء میں اس نے ملتان فتح کیا۔جہاں نواب مظفر خاں بہادری سے مقابلہ کرتا ہوا کام آیا۔اس سے اگلے شال کشمیر مسلمانوں کے قبضے سے نکل گیااور رنجیت سنگھ نے آہستہ آہستہ پشاور پر اقتدار بڑھانا شروع کیا۔سندھ 1843ء میں اور اودھ 1856 میں کمپنی میں ملحق کر لیے گئے۔اس کے بعد بھی گرچہ مسلمانوں کا کوئی سیاسی اقتدار باقی تھا تو اسے جنگ آزادی کے ہنگامے نے مٹا دیا۔اس سیاسی انقلاب کے علاوہ جو انحطاط مسلمانوں کی اقتصادی اور تمدنی زندگی میں رونما ہوا، وہ اس سے بھی زیادہ اہم تھا۔اس کی صحیح اور مفصل تصویر ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "اَوَر انڈین مسلمانز" ہمارے ہندوستانی مسلمان، میں کھینچی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلمان ہندوستان میں آج تک ابھر نہیں سکے ہیں۔ وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد سے آج تک جس قدر مسائل سے ہندوستانی مسلمان دوچار رہے ہیں، کوئی اور قوم ان حالات سے گزرتی تو ممکن تھا کہ وہ اپنا وجود ہی خطرہ میں ڈال چکی ہوتی۔ اُس کی شناخت ختم ہوجاتی اور اس کے عقائد بگڑ جاتے۔ لیکن غالباً یہ مسلمانوں کی خود کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خدا برحق کی مصلحت ہے کہ مسلمان ہندوستان میں نہ صرف باقی رہیں بلکہ اپنی مکمل شناخت اور عقائد وافکار میں بھی وہ نمایاں حیثیت برقرار رکھیں۔ تاکہ نظریہ ظلم پر قائم ہونے والی فکر کو وہ موقع میسر نہ آئے، جس کے بظاہر وہ خواہش مند نظر آتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہم بات کرنا چاہتے ہیں 1857ء کے بعد کے ہندوستانی مسلمانوں کی۔ لہٰذا اس وقت کی کسی حد تک تصویر کشی لارڈ میو کے ایما پر 1871ء میں لکھی گئی کتاب، ہمارے ہندوستانی مسلمان، میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ لارڈ میو جسے مسلمانوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی تھی، نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ مسلمان حکومتِ وقت سے کیوں بد دل ہیں اور ان کی تسکین کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ کی توضیح کے لیے ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر نے یہ کتاب لکھی تھی۔ کتاب کے چوتھے باب میں انھوں نے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور ان کی مشکلات پر بحث کی ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکومت سے بہت سی شکایات ہیں۔ ایک شکایت یہ ہے کہ حکومت نے ان کے لیے تمام اہم عہدوں کا

دروازہ بند کردیا ہے۔ دوسرے ایک ایسا طریقہ تعلیم جاری کیا ہے جس میں ان کی قوم کے لیے کوئی انتظام نہیں۔ تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے، بیکار اور محتاج کردیا ہے۔ چوتھے یہ کہ ان کے اوقاف کی آمدنی جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہیے تھی، غلط مصرفوں پر خرچ ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر ہنٹر نے ان شکایات پر بالتفصیل بحث کی ہے۔ اور مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے۔ بالخصوص مشرقی بنگال کے خاندانی مسلمانوں کی پستی اور افلاس کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں: اگر کوئی سیاست دان دارالعوام میں سنسنی پیدا کرنا چاہے تو اس کے لیے کافی ہے کہ بنگال کے مسلمانون خاندانوں کے سچے سچے حالات بیان کردے۔ یہی لوگ کسی زمانے میں محلوں میں رہتے تھے۔ گھوڑے گاڑیاں، نوکر چاکر موجود تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ ان کے گھروں میں جوان بیٹے اور بیٹیاں، پوتے اور پوتیاں، بھتیجے اور بھتیجیاں بھرے پڑے ہیں اور ان بھوکوں کے لیے ان میں سے کسی ایک کو زندگی میں کچھ کرنے کا موقع نہیں۔ وہ منہدم اور مرمت شدہ مکانوں اور خستہ برآمدوں میں قابل رحم زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں اور روز بروز قرض کی دلدل میں زیادہ دھنستے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی ہمسایہ ہندو قرض خواہ ان پر نالش کرتا ہے اور مکان اور زمینیں جو باقی تھیں، ان کے قبضے سے نکل جاتی ہیں اور یہ قدیمی مسلمان خاندان ہمیشہ کے

لیے ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری جانب ڈاکٹر ہنٹر نے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کا مقابلہ دوسری قوموں کے ساتھ کیا ہے۔ساتھ ہی مال اور منصفی کے محکموں میں مسلمانوں کی حالت زار کے تعلق سے لکھا: لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی کا صحیح نقشہ اِن محکموں میں دیکھا جاسکتا ہے جن میں ملازمتوں کی تقسیم پر لوگوں کی اتنی نظر نہیں ہوتی۔1869ء میں ان محکموں کا یہ حال تھا کہ اسسٹنٹ انجینئروں کے تین درجوں میں چودہ ہندو اور مسلمان صفر۔امیدواروں میں چار ہندو، دو انگریز اور مسلمان صفر۔سب انجینئروں اور سپروائزروں میں چوبیس ہندو اور ایک مسلمان۔اوورسیروں میں ترسٹھ ہندو اور دو مسلمان۔اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں پچاس ہندو اور مسلمان معدوم، وغیرہ۔سرکاری ملازمتوں کے علاوہ ہائی کورٹ کے وکیلوں کی فہرست بڑی عبرت آموز ہے۔ایک زمانہ تھا کہ یہ پیشہ بالکل مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔اس کے بعد 1851ء تک مسلمانوں کی حالت اچھی رہی اور مسلمان وکلاء کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد سے کم نہ تھی۔لیکن 1851ء سے تبدیلی شروع ہوئی۔اب نئی طرز کے آدمی آنے شروع ہوئے اور امتحانات کا طریقہ بھی بدل دیا گیا۔1852ء سے 1868ء تک جن ہندوستانیوں کو وکالت کے لائسنس ملے۔ان میں 239 ہندو تھے اور ایک مسلمان۔وہیں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگلے دن ایک بڑے سرکاری محکمے میں دیکھا گیا کہ سارے ڈیپارٹمنٹ میں ایک

بھی اہلکار ایسا نہ تھا، جو مسلمانی زبان سے واقف ہو (بنگال کے مسلمانوج جو زبان بولتے تھے، وہ عام بنگالی سے اس قدر مختلف تھی کہ اسے ایک علیحدہ نام مسلمانی سے یاد کیا گیا) ۔اور حقیقتاً اب کلکتہ میں شاید ہی کوئی سرکاری دفتر ایسا ہو گا، جس میں کسی مسلمان کو دربانی، چپڑاسی یا دواتیں بھرنے، قلم درست کرنے کی نوکری سے زیادہ کچھ ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔چنانچہ انہوں نے کلکتہ کے ایک اخبار کی شکایت نقل کی ہے۔" تمام ملازمتیں اعلیٰ ہوں، ادنی، آہستہ آہستہ مسلمانوں سے چھینی جارہی ہیں۔اور دوسری قوموں بالخصوص ہندوؤں کو بخشی جاتی ہیں۔حکومت کا فرض ہے کہ رعیت کے تمام طبقوں کو ایک نظر سے دیکھے، لیکن اب یہ حالت ہ کہ حکومت سرکاری گزٹ میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ رکھنے کا کھلم کھلا اعلان کرتی ہے۔چند دن ہوئے کمشنر صاحب نے تصریح کردی کہ یہ ملازمتیں ہندوؤں کے سوا کسی کو نہ ملیں گی"۔

ڈاکٹر ہنٹر یہ بھی لکھتے ہیں :جب ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان سب قوموں سے بہتر تھے۔نہ صرف وہ دوسروں سے زیادہ بہادر اور جسمانی حیثیت سے زیادہ توانااور مضبوط تھے بلکہ سیاسی اور انتظامی قابلیت کا ملکہ بھی ان میں زیادہ تھا، لیکن یہی مسلمان آج سرکاری ملازمتوں اور غیر سرکاری اسامیوں سے یکسر محروم ہیں۔ڈاکٹر ہنٹر نے جو حالات لکھے ہیں وہ زیادہ تر بنگال کے متعلق ہیں۔لیکن شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی کیفیت اس سے بہتر نہیں

تھی۔ بالخصوص جنگ آزادی کے بعد تو ان کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اس زمانے میں سر سید نے بھی ہندوستان چھوڑ کر مصر میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ گفتگو کے پس منظر میں تین باتوں پر غور کیا جانا چاہیے۔ایک یہ کہ جو یہ کہا جاتا ہے کہ آج کی دیش بھکت پارٹی یا ان کے ہمنوا اس زمانے میں جنگ آزادی میں کیوں شریک نہیں ہوئے، تو وہ کیونکر نہیں ہوں گے ؟دوسرے یہ کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کے حد درجہ شرکت کے پس پشت کیا توقعات وابستہ رہی ہوں گی؟ تیسرے یہ کہ سلسلۂ حالات و واقعات اور موجودہ حالات کے تغیرات کے نتیجہ میں، مسلمانوں کی عدل و انصاف پر مبنی تعلیمات، فکر و نظریہ اور ایک زندہ و پائندہ قوم کے ناطے، موجودہ حالات میں کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟

! دہلی وقف بورڈ کے عزائم

ایک وہ زمانہ تھا جب ساٹھ کی دہائی میں نام نہاد قوم پرست مسلمانوں کی ایک جماعت ہندوستانی مسلمانوں کو تقسیم وطن کے لیے کوستی اور اعلان کرتی کہ وہ اپنی تعلیمی اور معاشی پسماندگی کے لیے خود ذمہ دار ہیں۔ غور فرمایئے ایک ہراساں ملت کو مزید پریشان کرنے کا اس بہتر سے بہتر نسخہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن بات چونکہ اوقاف کی ہو رہی ہے تو جناب یہاں بھی تقریباً وہی صورتحال ہے۔ یعنی یہاں بھی عموماً یہی کہا جاتا ہے کہ سارے متولی چور ہیں، وقف بورڈ بے ایمانی کا گڑھ ہے،اس کا سارے کا سارا عملہ نکما ہے،اور کیونکہ مسلمان اوقافی جائدادوں کی فکر نہیں کرتے،اس کی بازیابی اور بازآبادکاری میں شامل نہیں ہیں، لہذا مسلمان خود ہی اوقاف کی تباہی کے ذمہ دار بھی ہیں۔ اس گہما گہمی اور شورشرابہ میں اسٹیٹ اپی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے،اور عموماً عوام بھی توجہ نہیں دیتی۔ جبکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ حکومت جس نے نہ صرف وقف بورڈ قائم کیا، وقف ایکٹ بنایا اور اس میں وقتاً فوقتاً ترمیمات کیں،اس پورے نظام میں جو کمیاں اور خرابیاں ہیں،اس کی ذمہ داری لیتی،جوابدہ ہوتی،اور بہتری کی جانب سنجیدگی سے عمل پیرا ہوتی۔ لیکن جب مسجد کا متولی ہی چور ٹھہرا اور قبرستان کے نگراں لینڈ مافیا، تو پھر کیوں

حکومت وقت جوابدہ ہو؟لیکن بات اتنی غلط بھی نہیں ہے کہ اوقاف کی جائدادوں کے ذمہ داران ونگراں یا اس کے بچولیے یا اوقافی جائدادوں کے فیصلہ ساز، سب صاف ستھرے ہیں۔اس صورت میں جہاں ایک جانب حکومت کی ذمہ داری ہے وہیں مسلمانوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ الرٹ رہیں، متوجہ رہیں،کمیوں پر نظریں اور خاطیوں کی نشاندہی کریں، قانونی چارہ جوئی کریں اور اس کے لیے تحریک برپا کریں،تاکہ حکومت وقت متوجہ ہو اور وہ ذمہ داران بھی جو حکومت کی جانب سے طے کیے جاتے ہیں۔لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم حکومت یا حکومت کے کارندوں کی مدد نہ کریں،بلکہ معاملہ یہ ہے کہ ہمیں جہاں ایک جانب تعاون کی فضا ہموار کرنی ہوگی وہیں اپنے مسائل کے لیے اپنے وقت اور صلاحیتوں کی بھی قربانی دینی ہوگی۔برخلاف اس کے اپنے مسائل سے اگر ہم خود ہی نظریں چرائیں گے اور بے توجہی کا اظہار کریں گے،تو یہ کسی بھی ضرورت ممکن نہیں ہے کہ مسائل خود بہ خود ختم ہو جائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عام ہندوستانی مسلمان مسائل سے حد درجہ دوچار ہیں۔ان کے بنیادی مسائل ہی انہیں ہمہ وقت مصروف رکھتے ہیں،ان حالات میں اوقاف اور اوقافی جائدادوں کے غیر قانونی قبضوں کو واگزار کرانے میں،وہ کیا کردار ادا کریں گے۔اور شاید آزاد ہندوستان کے پالیسی ساز اداروں نے بھی مسلمانوں کے تعلق سے یہی منصوبہ بندی کی ہے کہ انہیں جان ومال، عزت وآبرو کے مسائل میں

اس قدر الجھا کر رکھا جائے کہ مزید مسائل سے نہ ان کی دلچسپی ہو اور نہ انہیں یہ موقع ہی حاصل ہو کہ وہ اس طرف توجہ دے سکیں۔ نیز معاشی و تعلیمی میدان میں بھی وہ اس قدر پست رہیں کہ انہیں ابھرنے کا موقع نہ حاصل ہو۔ پھر وقتاً فوقتاً راست یا بلاواسطہ منظم و منصوبہ بند ایسی کوششیں انجام دی جائیں، جس کے نتیجہ میں ان کی کمر ہی ٹوٹ جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وطن عزیز میں اسلام و مسلمانوں سے نفرت کی فضا عام کرنے کے لیے مختلف تنظیمیں، تحریکیں، جماعتیں اور گروہوں کو یہ موقع فراہم کیا گیا، کہ وہ انہیں الجھائے رکھیں، اور کوئی ایک دور بھی ایسا نہ گزرنے پائے جبکہ مسلمان سکون کی حالت میں رہتے ہوئے ملک وملت کی تعمیر وترقی سرگرم عمل ہوں۔ اس سب کے باوجود حالات سازگار ہیں، مسلمان تعلیمی، فکری و نظریاتی، ہر سطح پر ترقی کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ وہ مسلکی و گروہی بنیادوں سے اوپر اٹھ کر بحیثیت ملت اسلامیہ ہند، ملک وملت کی تعمیر وترقی میں کردار ادا کریں۔ اور یہ آج ممکن ہے، ہر اس فرد کے لیے ،جو دنیا و آخرت میں کامیابی و سرخ روئی چاہتا ہے، ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہے کہ اللہ کی خوشنودی اسے حاصل ہو اور نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر وہ عمل پیرا رہتے ہوئے اس دار فانی سے جانے کے بعد ایسی جگہ پہنچے جہاں فرشتہ اس کے استقبال کے لیے موجود ہوں، اور ہمیشہ ہمیشہ کامیابی کا مژدہ اسے سنا دیا جائے۔ اوقاف کی جائدادیں شرعی حیثیت رکھتی ہیں، لہذا ان کی بازیابی کے لیے کی جانے والی

کوششیں بھی ،جنت سے قریب تو جہنم سے دور کرنے والی ہیں۔
واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اوقاف کا نظم مسلمانوں کا خود کا قائم کردہ ہے۔ مسلم بادشاہوں نے ، مسلم ریاستوں کے سرکردہ حضرات نے ،اور مختلف مسلم زمینداروں نے ملت کی ضروریات کے پیش نظراپنی کی زمینیں وقف کیں،اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ان وقف شدہ زمینوں کے ذریعہ مساجد،قبرستان، تعلیمی ادارے، مقبرے و دیگر مسلمانوں کی ضروریات پوری ہوتی رہی ہیں۔ لیکن آزادی سے قبل ہی انگریز حکومت نے 1913ء میں مسلمان وقف ایکٹ تیار کیا۔جس میں وقت شدہ زمینوں کے لیے علاحدہ سے قانون سازی کی ابتدائی کوششیں ہوئیں منظر عام پر آئیں۔اسی نظام میں بہتری لاتے ہوئے 1931 میں پہلی بار اوقاف کی آمدنی و خرچ کے آڈٹ کا التزام کیا گیا۔لیکن یہ آڈٹ،آمد و خرچ کے حسابات اور سروے وانکوائیری کا نظام مستحکم کرنے کے لیے جس عملہ کی ناواقفیت کی رپورٹ 1972 میں سامنے آئی تھی تقریباً وہی صورتحال اور مسائل آج بھی برقرار ہیں۔معاملہ یہ ہے کہ ریاستی حکومتوں نے عام طور سے یہ ذمہ داری لوکل فنڈ کو سونپ رکھی ہے جو ہر سال آڈٹ کرنے کی بجائے کئی کئی سال کے وقفہ سے یہ کام انجام دیتے ہیں ۔وقف ایکٹ 1954 اور اس کے بعد بننے والے تمام قوانین نے ریاستی حکومت کو یہ ذمہ داری دی ہے کہ وہ اپنی ریاست کے وقف بورڈ کی سالانہ آڈٹ پورٹ کا مطالعہ کرے اور اس پر ضروری احکامات جاری کرے،تاکہ خامیوں کو

دور کیا جاسکے۔ لیکن یہ کام بروقت نہیں ہوتا، لہٰذا کمیاں اور خرابیاں برقرار رہتی ہیں۔
یہاں یہ بات بھی ہمارے علم میں رہنی چاہیے کہ وقف ایکٹ 1995 کی دفعہ 4 کے تحت ہر ریاست میں اوقافی جائدادوں کا از سرنو سروے کرایا جانا طے تھا۔ تاکہ جائدادوں کی موجودہ حیثیت سامنے آئے نیز بہت سی کھوئی ہوئی یا ناجائز قبضہ شدہ جائدادوں کا سراغ ملے۔ وقف (ترمیمی) ایکٹ 2013 میں اسے مزید موثر بنایا گیا ہے۔ اس کے باوجود ریاستی حکومتیں متوجہ نہیں ہیں۔ گزشتہ 20 سالوں میں بیشتر ریاستوں میں یا تو سروے کا کام مکمل نہیں ہوا ہے یا دفعہ 5 کے تحت اسے شائع نہیں کیا گیا۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ میں صفحہ 2019 پر کہا گیا کہ ملک میں دولاکھ نوے ہزار اوقاف رجسٹرڈ ہیں، مگر اگلے ہی صفحہ پر فٹ نوٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک وقف میں متعدد جائدادیں ہوتی ہیں۔ اور 220 ابھی چند دن پہلے کی بات ہے کہ نائب وزیر اقلیتی امور نے کہا کہ ملک میں ایک لاکھ پینتس ہزار اوقاف ہیں۔ اعداد وشمار کا یہ تضاد صرف اس وجہ سے ہے کہ آج تک سروے کا کام مکمل نہیں ہوا ہے۔ یہ مسئلہ سب سے زیادہ وقف بورڈ کے کمپیوٹرائزیشن میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اس صورت میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایسے اعداد و شمار کی بنیاد پر اوقاف کی بازیابی اور ترقی کے منصوبے مکمل نہیں ہو سکتے، وہ ہمیشہ نامکمل اور غیر مستحکم رہیں گے۔ وقف کے مسائل میں چند مسائل اور بھی ہیں

وقف ایکٹ 1995 کی دفعہ 109 کے تحت وقف رول (i جنہیں مختصراً بیان کیا جا رہا ہے۔ وقف (ii اور دفعہ 110 کے تحت، وقف ریگولیشن شائع کیا جانا تھا، یہ کام نا مکمل ہے۔ ٹریبونل جو وقف جائدادوں کی قانونی چارہ جوئی کا ادارہ ہے، وقف (ترمیمی) ایکٹ کی دفعہ کئی (iii کی روشنی میں نئے سرے سے تشکیل ہونے تھے، لیکن وہ بھی نا مکمل ہیں۔ 83 ریاستیں ایسی ہیں جہاں کل وقتی چیف آکزیکیٹیو آفیسر کی تقرری ہونی ہے، اور اس کا تقرر نہیں ہوا ہے۔ یہ اور ان جیسے دیگر کئی مسائل ہیں جن پر توجہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر ہم بات کریں دہلی وقف بورڈ کی تو ان کے عزائم سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئے چیئرمین اور ان کی عام آدمی پارٹی اپنی ذمہ داریاں بحسن خوبی انجام دیں گے اور جلد ہی مثبت نتائج بھی سامنے آئیں گے۔ اس کے باوجود عوام جو حکومتی فیصلوں میں معاون ساز ہوتے ہیں وہیں ان کی یہ بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ حکومت لیے گئے فیصلوں سے روگردانی کرے، تو انہیں توجہ دلائیں، اور اگر پھر بھی متوجہ نہ ہوں، تو مسئلہ کے حل کے لیے عوامی سطح پر مہمات چلائیں نیز قانونی چارہ کی جائے!

مسلم نوجوانوں کی سلسلہ وار گرفتاریاں

ہندوستان میں مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کا مسئلہ نیا نہیں ہے۔ طویل عرصہ سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ جس کے نتیجہ میں نہ صرف قیاس اور غیر مصدقہ معلومات کی بنا پر گرفتار شدہ اشخاص حد درجہ متاثر ہوتے ہیں بلکہ ان کے اہل خانہ جن نفسیاتی ، معاشی اور معاشرتی دشواریوں اور پریشانیوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں ، وہ اس فرد کی گرفتاری سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک ہے جو فرد واحد پر گزرتی ہے۔ یہ بات بھی ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ زیادہ تر مسلم نوجوان جن وجوہات کی بنا پر گرفتار ہوئے ہیں، اس میں دہشت گردی کا مسئلہ ہی دراصل وجہ گرفتاری ہے، پھر جب ایک طویل مدت کے بعد وہ بے قصور ثابت ہوتے اور باعزت بری ہوتے ہیں، اس وقت انہیں وہ معاوزہ نہیں ملتا، جو انہیں ملنا چاہیے۔ اس پورے عمل میں جہاں ایک جانب حکومت وقت ذمہ دار ہے تو وہیں پولیس کا وہ نظام بھی جوابدہ ہونا چاہیے، جس کے عمل کے نتیجہ میں یہ تمام مسائل سامنے آتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پولیس کی ذمہ داریوں میں اہم ترین ذمہ داری غیر اخلاقی سرگرمیوں پر نظر رکھنا ہے وہیں مختلف سطح پر نظم و نسق کو بگاڑنے والی کوششوں کو ناکام کرنا ہے تاکہ عوام ، معاشرہ اور ملک مختلف قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنے سے بچ جائیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پولیس کچھ بھی کرے اور جبکہ وہ ثبوت بھی فراہم نہ

کرپائے، تو اپنے عمل کی جوابدہی سے بھی وہ بچائی جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی ملک میں پولیس آزاد نہیں ہوتی اور ہمارے ملک میں بھی یہی معاملہ ہے۔ یہ پولیس جو نظم و نسق کو برقرار رکھنے والی ہے اس پر مختلف اوقات میں سرپرست ذمہ داران یا اداروں کا پریشر ہوتا ہے، کہ وہ نظم و نسق کو درست رکھے اور جو حادثات ہوئے ہیں، متعلقہ خاطیوں کو وہ گرفت میں لائے، لیکن کچھ مخصوص طبقات پر وہ وہ نظر رکھے اور کچھ کو وہ نظرانداز کردے، یہ عمل نہ عوام کو پریشانیوں سے بچا سکتا ہے نہ ہی ملک و معاشرے کی تعمیر وترقی معاون ہوگا بلکہ مسائل کے اضافہ کا سبب ہی بنے گا اور بنتا جا رہا ہے۔ان عملی دشواریوں سے نجات کے لیے وقتاً فوقتاً پولیس اصطلاحات میں بہتری لانے کی کوششیں بھی کی گئی ہیں، اس کے باوجود حقیقت یہ بھی ہے جس سے ہم نظریں نہیں چرا سکتے کہ پولیس جن ذمہ داران یا اداروں کی نگرانی میں سرگرم عمل ہے، وہ بھی کہیں بلاواسطہ تو کہیں باالواسطہ اپنی خواہشات اور پالیسیوں کی تکمیل میں پولیس پر غیر ضروری پریشر ڈالتے ہیں اور ان کے کاموں میں یا طریقہ کار میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ نتیجتاً مسائل میں اضافہ ہوتا ہے اور عوام بدحالی و انتشار میں مبتلا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

دوسری جانب واقعہ یہ بھی ہے کہ فی الوقت ہندوستان کی جیلوں میں مسلم قیدیوں کی تعداد میں ہر صبح اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ نیشنل کرائم ریکارڈس کے ڈاٹا

کے مطابق 2014 کے آخر تک ملک بھر میں 82,190 مسلم قیدی ہیں، جس میں 59,550 قیدی عدالت کے زیر سماعت ہیں۔ راجیہ سبھا میں وزیر مملکت برائے امور داخلہ ہری بھائی پراتھی بھائی چودھری نے ملک بھر میں مسلم قیدیوں کی جانکاری دیتے ہوئے قومی جرائم بورڈ کا حوالہ دیا ہے۔ جس میں انہوں نے کہا کہ 2014 کے آخر تک مسلم قیدیوں میں سے 21,550 سزا یافتہ، 59,550 زیر سماعت، 82,190658 زیر حراست اور 432 دیگر قیدی موجود ہیں۔ این سی آر بی کے ڈاٹا کے مطابق مجموعی طور پر سزا یافتہ قیدیوں کے مقابلے مسلم قیدیوں کا اوسط 16.38% فیصد ہے، جبکہ زیر سماعت قیدیوں کے مقابلے مسلم ملزمان کا تناسب 21.05% فیصد ہے۔ تعداد کی یہ جانکاری انہوں نے پارلمنٹ میں اٹھے ایک سوال کے تحریری جواب میں دی ہے۔ گزشتہ سال این سی آر بی نے انکشاف کیا تھا کہ ملک کی آبادی میں مسلمانوں کا حصہ 14% فیصد ہے، مگر زیر سماعت قیدیوں کے تناسب میں وہ 21% فیصد ہیں۔ دراصل این سی آر بی ڈاٹا کے تجزیہ کی روشنی میں کچھ مقامات پر آبادی اور زیر سماعت قیدیوں کی اوسط 2:1 ہے، جو ایک لمحہ فکریہ ہے۔ ملک کی پارلمنٹ میں یہ سوال مالیگاؤں دھماکہ کیس میں 9 مسلمانوں کی رہائی کے دو دن بعد پوچھا گیا تھا، اس معاملہ میں خصوصی عدالت نے ثبوت کی عدم فراہمی کی وجہ سے تمام ملزمین کو باعزت رہا کر دیا۔ لیکن یہ باعزت بری کا معاملہ گرفتاری کے بعد 5 سال تک جیل کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد آیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان 5 سالوں میں جن دشواریوں میں وہ اور ان کے اہل خانہ

مبتلا رہے، ان کی جوابدہی کس کی ہے اور خمیازہ کون ادا کرے گا؟ متعلقہ 5 لوگوں کو سیمی سے تعلقات ہونے کے شبہ میں گرفتار کیا تھا لیکن جب این آئی اے نے تفتیش کی تو ان کے خلاف کوئی بھی ثبوت نہیں مل سکا، اور پانچ سالہ قانونی جدوجہد کے بعد نیز ہر طرح کی اذیتیں برداشت کرنے کے بعد اب وہ "باعزت" رہا کر دیئے گئے ہیں۔

شک و شبہات اور قیاس کی بنیادوں پر گرفتار شدہ افراد جہاں ایک جانب مختلف قسم کی پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہیں وہیں معاشرہ میں مسلمانوں کے تعلق سے نفرت پر مبنی ایک عمومی فضا بھی ہموار ہوتی ہے۔ جس کے مظاہر گزشتہ دنوں بھی دیکھے گئے ہیں تو ایک واقعہ آج بھی سامنے آیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا معاشرہ میں اتنی زیادہ نفرت گھولی جا چکی ہے کہ ایک دوسرے کو ہم برداشت نہیں کر پا رہے ہیں ؟ یا ہر مسلمان واقعی دہشت گرد ہے یا دہشت گردوں کے زمرے میں آتا ہے؟ یا پھر مسلمانوں کو بدنا کرنے کی منظم کوششیں انہیں مقصد کے تحت کی جا رہی ہیں جن کے کچھ مظاہر سامنے آچکے ہیں تو مزید کبھی بھی آسکتے ہیں۔ وقعہ جس کا تذکرہ ہم کیا چاہتے ہیں تو وہ سونی چینل کے ڈائریکٹر کا وہ چہرہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ، جی ہاں، کوئی بھی ملسم دہشت گردہ ہو سکتا ہے۔ دراصل نوئیڈا کی رہنے والی سید سلمان حیدر نے فیس بک پیج پر ان باکس میسج کے ذریعہ ماڈلنگ کا کام مانگا تھا، جس شخص سے وہ بات کر رہی تھیں وہ

خود سونی انٹر ٹنمنٹ اسسٹینٹ ٹیلنٹ ڈائریکٹر رادھکا سینی تھیں، جنھوں نے جواب میں کہا کہ ہم مسلموں کو کاسٹ نہیں کرتے ہیں۔ حیدر نے جب ان سے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ وہ دہشت گرد ہو سکتے ہیں۔ بعد میں سینی نے اپنے دفاع میں کہا کہ اس کی فیس بک آئی ڈی کو مسلم ہائی جیکرس نے ہیک کر لیا تھا۔ حیدر کی رشتہ دار شروتی حسن علی نے فیس بک پہ اس معاملہ کو شیئر کیا ہے۔اُدھر حیدر نے کہا کہ وہ قانونی ماہرین سے رابطہ کرنے کے بعد سینی کے خلاف قانونی ایکشن لیں گی۔

گفتگو کے پس منظر میں یہ حقیقت سامنے رہنی چاہیے کہ قیاس پر مبنی مسلم نوجوانوں کی لگاتار اور سلسلہ وار گرفتاریوں نے معاشرہ میں بے شمار مسائل پیدا کر دیے ہیں۔اس کے باوجود ہماری سمجھ کے مطابق حل کے دو پہلو ہیں جن پر عمل درآمد سے مسئلہ کی شدت میں کمی لائی جا سکتی ہے۔ایک: اسلام کی تعلیمات کو بڑے پیانہ پر عوام الناس کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ غلط فہمیاں دور ہوں، دو: مسلمان اپنی فکری، نظریاتی اور عملی زندگی میں اسلام کو مکمل طور پر اختیار کریں۔مجھے یقین کامہ ہے کہ اس طرح سے ہمارے مسائل حل ہوں گے، نہیں تو بصورت دیگر جن دشواریوں میں ہم مبتلا ہیں، استقامت کا رویہ اختیار کرتے ہوئے دنیا و آخرت میں سرخ رو ہوں ، انشااللہ !

ریاست آسام، مسلمان اور بی جے پی؟

19 مئی 2016 کے دن ان تمام پانچ ریاستوں کے الیکشن کا مرحلہ مکمل ہوا جس کا اعلان الیکشن کمیشن آف انڈیا نے 18مارچ 2016 کو کیا تھا۔الیکشن کے نتائج کیسے رہے اور کون کامیاب ہوا تو کون ناکام ،اس کا فیصلہ ہر شخص و گروہ اپنی وابستگی کے حساب سے کرے گا۔جو لوگ سیاسی پارٹیوں سے راست وابستہ تھے وہ الیکشن کے نتائج کو اپنی پارٹی کی ہار یا جیت کے اعتبار سے دیکھیں گے تو وہیں وہ لوگ سیاست دانوں سے وابستہ تھے ان کے جائزہ کا معیار الگ ہوگا۔اس کے برخلاف چیف الیکشن کمشنر نسیم زیدی کی کوششیں اور ان کے ساتھ مصروف عملہ کے جائزہ کا معیار مختلف ہوگا۔لیکن ان تمام پارٹیوں اور اداروں سے وابستہ افراد کے علاوہ الیکشن کے نتائج سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے وہ متعلقہ شہری ہیں، جنہوں نے اس پورے عمل میں شامل ہو کر "اپنی پسند" کی حکومت تشکیل دی ہے۔یعنی اس اہم ترین موقع پر مختلف سیاسی پارٹیوں کے خلاف یا ان کے حق میں اپنے قیمتی ووٹ کا استعمال کیا ہے۔فی الوقت جن پانچ ریاستوں میں الیکشن ہوئے ان تمام کا جائزہ لینے کی بجائے ہم نے کوشش کی ہے کہ ریاست آسام کا تجزیہ پیش کریں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ آسام کی معاشی معاشرتی اور تمدنی صورتحال پر نظر ڈالی جائے۔

ڈسٹرکٹس پر مشتمل ریاست آسام ایک پہاڑی سلسلہ ہے،جہاں ندیاں نالے جھرنے اور پہاڑ چہار جانب پھیلے ہیں۔31,205,576آبادی ہے،جس میں 73.18%فیصد خواندہ لوگ رہتے ہیں۔آسامی، بنگالی، بوڈواور انگلش زبانیں وہاں عام طور پر بولی جاتی ہیں۔تقریباً ہر سال برہم پتراندی اور دیگر ندیوں کے ذریعہ سیلاب آتا ہے،جس سے وہاں کے لوگ معاشی اعتبار سے عموماً پریشان رہتے ہیں۔ریاست میں 2011کے اعداد و شمار کی روشنی میں 61.46% ہندو،34.22% مسلمان،3.73% عیسائی،0.17% بدھ ،0.08% جین،0.06% سکھ اور 0.03 ایسے لوگ ہیں جن کے مذہب کی کوئی شناخت نہیں یا ملحد ہیں۔وہیں ریاست آسام کی یہ بھی خوبی ہے کہ یہاں 115 نسلی گروہ پائے جاتے ہیں۔دوسری جانب ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں مسلمان تناسب کے اعتبار سے سب سے زیادہ موجود ہیں۔

آسام میں مسلمانوں کے مسائل کی بات کی جائے تو دیکھنے کو ملتا ہے کہ یہاں کے مسلمان مختلف مسائل سے دوچار ہیں۔سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ جو مسلسل اٹھتا رہا ہے وہ بنگالی مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔واقعہ یہ ہے کہ یہ مسلمان عموماً مغربی بنگال سے تعلق رکھتے ہیں تو وہیں ریاست آسام سے بھی۔لیکن چونکہ آسام کی سرحد بنگلہ دیش سے بھی لگتی ہے لہذا یہ بات بھی عام ہے کہ بنگلہ دیش کے مسلمان یہاں غیر قانونی طریقہ سے رہتے بستے ہیں، جن کی تعداد کافی ہے۔یہ بات کس قدر صحیح ہے اور کتنی غلط اس کا اندازہ تو ووٹر

لسٹ سے لگایا جاسکتا ہے، لیکن عام طور پر ووٹر لسٹیں خود ہی غلط ہوتی ہیں، بہت سارے شہریوں کے نام ووٹر لسٹ میں آنے سے رہ جاتے ہیں تو بہت سے وہ نام داخل ہو جاتے ہیں جو درحقیقت اُس ریاست سے تعلق ہی نہیں رکھتے۔اس لیے عموماً مسلمانوں کا یہی ماننا رہا ہے کہ جس طرح مسئلہ کو بیان کیا جاتا رہا ہے، حقیقت اس کے برخلاف ہے اور چونکہ سیاست میں مسئلے ہی انتخابی ایشو بنتے ہیں ، جن کی بنیادی پر کامیابی یا ناکامی ہاتھ آتی ہے، لہٰذا ہندؤں، مسلمانوں اور بڑی تعداد میں پائے جانے والے نسلی گروہ کے درمیان دوریاں پیدا کرنے،ڈرار ڈالنے اور نفرتوں کے فروغ میں یہ ایشوکافی کارگراور معاون ہے،اسی لیے اس ایشو پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی رہی ہے۔آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ سال 2012 میں کوکراجھار ڈسٹرکٹس میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا تھا،اس کی بڑی وجہ بھی یہی بتائی گئی تھی ۔جس کے نتیجہ میں آدی واسیوں یا نسلی گرہوں نے مسلمانوں پر حملے بولے اور کافی نقصان پہنچایا تھا۔80 بنگالی مسلمانوں نے جان سے ہاتھ دھویا تو وہیں کچھ بوڈو بھی ہلاک ہوئے تھے۔اور یہ وہی موقع تھا جبکہ ریاست کے 4 لاکھ مسلمانوں نے فسادات اور قتل عام سے جان بچانے کے لیے حکومت کی جانب سے قائم کردہ کیمپوں میں پناہ لی تھی نیز500 مسلم گاؤں ان حملوں سے متاثر ہوئے تھے۔وہیں دوسری جانب آغاز ہی سے ریاست میں ایک بڑی تعداد ہونے کے باوجود مسلمان کی معاشی صورتحال اچھی نہیں ہے۔مسلمانوں کی اکثرتی کھیتوں میں بحیثیت مزدور کام کرتی ہے۔ایک تیسرا رخ یہ ہے کہ طویل

عرصہ سے ریاست میں بوڈولینڈ کے نام سے ایک الگ بوڈو ریاست قائم کرنے کی مانگ سرگرم عمل ہے، جو سابقہ کانگریس حکومت (BPF) کرنے والے بوڈولینڈ پیوپلس فرنٹ کے ساتھ تھے، لیکن اس مرتبہ 2016 میں انہوں نے بی جے پی کا ساتھ دیا ہے۔ بوڈولینڈ کی یہ مانگ ریاست آسام کے 4 ڈسٹرکٹس پر منحصر ہے، جس میں کوکراجھار، چرانگ، بکسا، اور اُدل گری آتے ہیں۔ 2011 کے اعداد و شمار کی روشنی میں ان 4 ڈسٹرکٹس کی کل آبادی 3,51,047 ہے۔ جس میں ہندو، 19.12% مسلمان اور 9.14% عیسائی ہیں۔ لیکن چونکہ بوڈولینڈ 71.24% کی مانگ کرنے والے نوجوانوں میں یہ فضا عام ہو گئی ہے کہ ہمیں صرف اپنے مسئلہ کے حل کے لیے جدوجہد کرنی ہے، چاہے اس کے لیے دوسروں کے ساتھ کچھ بھی سلوک کیوں نہ کرنا پڑے، لہٰذا قانونی و غیر قانونی جدوجہد میں ایک بڑی تعداد ایسی بھی سامنے آئی ہے جو غیر قانونی طریقہ سے ہتھیار بند ہے۔ نتیجہ میں جہاں دیگر مسائل سے ریاست نبرد آزما ہے وہیں یہ ہتھیار بند افراد وقتاً فوقتاً مسائل پیدا کرتے رہے ہیں۔ اس کا سب سے نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ بوڈولینڈ کی مانگ کرنے والے افراد کا نشانہ عموماً ریاست کے مسلمان ہی ہوا کرتے ہیں۔

آزادی سے لے کر آج تک ریاستی حکومت پر اگر نظر ڈالی جائے تو دیکھنے میں آتا ہے کہ 1947 سے 2011 تک ریاست میں کل 16 مرتبہ حکومت تشکیل پائی ہے، جس میں 13 مرتبہ کانگریس برسراقتدار رہی ہے۔یہ وہی کانگریس ہے جس کے تعلق سے ایک

زمانے تک مسلمان فخر سے کہتے رہے کہ ہم "کانگریسی مسلمان" ہیں۔ جہاں اس کا خمیازہ
انہوں نے بے شمار مقامات پر اٹھایا ہے وہیں اس کی زندہ مثال آسام بھی ہے۔ شروع
ہی سے ریاست میں مسلمانوں کے تعاون سے حکومتیں بنتی اور گرتی رہیں، اس کے
باوجود مسلمانوں کو نہ معاشی میدان میں، نہ تعلیمی میدان میں اور نہ ہی سیاسی محاذ پر
کسی قسم کا فائدہ حاصل ہوا ہے۔ غالباً صورتحال ہی کے پیش نظر گزشتہ 2011 میں ایک
مسلم سیکولر سیاسی پارٹی AIUDF نے پہلی مرتبہ قسمت آزمائی کی اور 12.6% ووٹ
شیئر کے ساتھ 18 اسمبلی سیٹوں پر کامیابی حاصل کی۔ اور اس مرتبہ بھی 2016 میں
AIUDF توقع کی جارہی تھی کہ کے ووٹ شیئر اور سیٹوں دونوں میں اضافہ
ہوگا، اور ممکن ہے یہی پارٹی کنگ میکر کا کردار ادا کرے گی۔ لیکن نتائج نے ثابت کردیا
کہ AIUDF اور کانگریس نے جو حکمت عملی اختیار کی، وہ مناسب نہیں تھی، اس کے
باوجود AIUDF کا ووٹ شیئر میں اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ 2011 میں AIUDF کا ووٹ
شیئر 12.6% تھا لیکن 2016 میں بڑھ کر 18% فیصد ضرور ہوا لیکن سیٹوں کے اعتبار
سے 18 سے کم ہو کر 13 پر پہنچ گئی۔
آسام کے الیکشن نے کم از کم کانگریس کو یہ بات بھی واضح کردی ہوگی کہ اگر مسلمانوں
اور دلتوں کے مسائل کو وہ اسی طرح نظر انداز کرتی، اور علاقائی مسلم سیکولر یا دلت
سیکولر پارٹیوں سے اتحاد نہیں کیا، تو بہت جلد آر ایس ایس یا بی جے پی کے "کانگریس
مکت بھارت" کا خواب شرمندہ تعبیر ہوجائے گا۔ کیونکہ

کا ووٹ شیئر 31+18 رہا ہے جو کل AIUDF آسام کے حالیہ الیکشن میں کانگریس اور فیصد بنتا ہے.برخلاف اس کے بی جے پی کا کل 29.5%ووٹ شیئر رہا ہے۔ لیکن 49% کے ووٹ شیئر کو ملایا جائے تو یہ بی جے پی سے 19.5%AIUDF اگر کانگریس اور زیادہ ہے،اس کے باوجود کانگریس نے بہت.بڑی ہار کا سامنا کیا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ کانگریس اور بی جے پی دونوں ہی آج تک مسلمانوں کے تعلق سے بہتر سیاسی پارٹیاں ثابت نہیں ہو سکی ہیں اور نہ ہی آئندہ ہونے کی کوئی توقع ہے، کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کے مسائل کا کوئی سنجیدہ حل نہ پیش کیا ہے اور نہ پیش کریں گے۔اس کے باوجود کانگریس مکت بھارت کے نتیجہ میں جہاں راست فائدہ آر ایس ایس کو ہونے والا ہے وہیں راست نقصان بھی کانگریس ہی کو ہوگا!

رمضان المبارک کا پیغام : داعی حق بن جایئے !

کسی کے آنے کی آمد عام طور پر خوشگوار ہوتی ہے اور اس کے استقبال کی تیاریاں بھی بڑے زور و شور کی جاتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ آنے والا کون ہے اور اس کا استقبال کیسے کی جائے۔ فی الوقت ہمارے پیش نظر رمضان المبارک ہے ، جس کی رحمتیں وبرکتیں امت مسلمہ نیز ان تمام لوگوں پر سایہ فگن ہونے والی ہیں خیر و اصلاح کا مہینہ سمجھتے ہیں۔ رمضان المبارک نزولِ قرآن کا مہینہ ہے، تقویٰ، پرہیزگاری، ہمدردی، غمگساری، محبت وخیر خواہی، جذبہ خدمتِ خلق، راہ خدا میں استقامت، جذبہ حمیت اور جذبہ اتحاد،اللہ اور رسول سے بے انتہا لو' لگانے کا مہینہ ہے۔ لہٰذا اس کے شایان شان اس کا استقبال بھی ہونا چاہیے۔ساتھ ہی ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ وہ تمام صفات سے ہم مزین ہو جائیں جو اس مہینہ کی پہچان ہے۔ہم جانتے ہیں کہ رمضان المبارک میں قرآن نازل ہوا، روزے فرض ہوئے، جنگ بدر پیش آئی، شبِ قدر رکھی گئی، فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا، اس کے عشروں کو مخصوص اہمیت دی گئی۔ساتھ ہی اس ماہ میں زکوۃ، انفاق اور فطرے کا اہتمام کیا گیا۔ نتیجتاً ماہِ رمضان کی عبادات کو خصوصی درجہ حاصل ہوا۔

رمضان المبارک کے یہ تین واقعات: رمضان المبارک کے یہ وہ تین واقعات ہیں

جنھوں نے دنیا کی صورت یکسر تبدیل کر دی ہے۔اس کے باوجود یہ صحیح ہے کہ امت کی کامیابی مختلف ادوار میں پیش آنے والے واقعات کے پس منظر میں بنائے جانے والی حکمت عملی، پالیسی، لائحہ عمل اور تدابیر وضع کرنے کے نتیجہ میں ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ابتدائی تین واقعات وہ مینارہ نور ہیں جن کی روشنی میں یہ کام اس طرح ہو سکتا ہے کہ امت بحیثیت امتِ مسلمہ اور مسلمان بحیثیت فرد واحد کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ وقتی و ابدی کامیابی کے حصول کے لیے یہ واقعات ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔پہلا واقعہ نزولِ قرآن ہے: واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے حیاتِ انسانی کو جلا بخشی اور دنیا کو تاریکی گمراہی اور شرک کی جڑوں سے نجات دلائی۔لہٰذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم قرآن کو، حتی الامکان سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کو اپنی عملی زندگی کے شب وروز میں پیش آنے والے معاملات میں نافذ کریں۔اس کے مطابق اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگیوں کو ڈھالیں۔اس کے پیغام سے پیاسی روحوں کو تازہ دم کریں۔اس کے قیام کی سعی و جہد کریں اور اس کو وہ اہمیت دیں جس کے نتیجہ میں اس کا حق ادا کیا جاسکے۔دوسرا واقعہ جنگ بدر ہے: یہ واقعہ اس حق و باطل کے فرق کو کھول کر رکھ دینے کا ہے جہاں حق کے علمبرداراس سعی و جہد میں اپنی تمام نعمتوں کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں، جو اس نے عطا کی ہیں۔اللہ نے عقل دی ہے اور یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔جس کے ذریعہ انسان اور حیوان میں فرق نمایاں ہوتا ہے۔اللہ نے صلاحیتیں دی ہیں جن کے ذریعہ خیر و فلاح کے کام انجام دیے جانے چاہیں۔اللہ نے

علم عطا کیا ہے جس کے ذریعہ جہالت، گمراہی اور باطل نظریہ ہائے افکار سے چھٹکارا پانااور دلایا جانا چاہیے۔اللہ نے مال دیا ہے جو خدمتِ خلق اور انفاق فی سبیل اللہ کے کاموں میں استعمال کیا جانا چاہیے۔اللہ نے جان دی ہے جس کے ذریعہ نظامِ باطل کو زیر کیا جاسکتا ہے اور یہ آخری انتہا ہے۔ لیکن اس آخری انتہا سے قبل لازم ہے کہ وہ کام انجام دیئے جائیں جن کا آغاز ہر شخص اپنی ذات سے کر سکتا ہے۔ تیسرا واقعہ فتحِ مبین ہے: یہ واقعہ اس بات کی شہادت پیش کرتا ہے کہ حق کے علمبردار دنیا میں بھی سرخ رو ہوں گے اور آخرت کی ابدی کامیابی بھی انہیں حاصل ہوگی۔ یہ واقعہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ اللہ کا گھراور وہ مقام جو اللہ کی عبادت کے لیے مختص کر لیا گیا ہو وہ شرک اور بت پرستی سے پاک رہنا چاہیے۔ یہ زمین اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص ہے لہٰذا اس میں باطل سے سودے بازی نہیں کی جاسکتی۔ یہ وہ زمین ہے جہاں اللہ کے نام لینے والے اللہ کے آگے سر بجود ہوتے ہیں، اس کی بڑائی اور کبریائی بیان کرتے ہیں، اس سے اپنی توقعات وابستہ کرتے ہیں، اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں اور اجتماعی شکل میں اسلامی فکر پروان چڑھاتے ہیں۔ یہ واقعہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ مسلمان اگر دنیا میں کسی بھی مرحلے میں کامیابی حاصل کریں تو وہ مزید اللہ کی کبرائی بیان کرنے والے بن جائیں، ان کی کمر غرور و تکبر کے محرکات سے اکڑے نہیں بلکہ مزیدوہ اللہ کے آگے جھک جانے والے بن جائیں۔ فائدہ یہ ہوگا کہ ان میں انسانوں سے مزید خیر خواہی کے جذبات ابھریں

گے جس کی شدت آج چہار جانب محسوس کی جا رہی ہے۔یہ تین واقعات اس جانب بھی متوجہ کرتے ہیں کہ ماہ قرآن کے استقبال ،اس سے استفادہ اور اس کے بعد کے ایام میں ہمیں اپنے ظاہر و باطن میں وہ محرکات پیدا کر لینے چاہیں جن کے اختیار کے نتیجہ میں، اللہ اور اس کے بندوں کے ہم محبوب بن جائیں۔

ماہ رمضان المبارک یہ پیغام و شعور بھی ہمیں بخشتا ہے کہ امت کی بقا و تحفظ ان غیر اسلامی و غیر اخلاقی اقدامات سے ممکن نہیں ہے جو آج رواج پا چکے ہیں۔ علمی میدان میں ترقی، معاشی میدان میں ترقی، عورتوں کی بے جا آزادی و بالا دستی، صنعت و حرفت میں پیش قدمی، سائنس و ٹیکنالاجی میں دریافتیں، چاند اور مریخ پر کمندیں، یہ اور ان جیسے تمام نعروں میں اس وقت تک کوئی طاقت نہیں محسوس کی جا سکتی جب تک کہ وہ اسلام کے سانچے میں نہ ڈھل جائیں۔دوسری جانب مسالک کی بنیاد پر ہم دینی مدارس کھولتے ہیں، کلمہ اور نماز کی تبلیغ کرتے ہیں، فسق و فجور کے خلاف وعظ و تلقین کرتے ہیں اور گمراہ فرقوں کے خلاف مورچے لگاتے ہیں، حاصل؟حاصل یہ کہ بس جس رفتار سے دین مٹ رہا ہے اور مسلمانوں کی عملی زندگی سے دور ہوتا جا رہا ہے اس کے مٹنے میں ذرا سستی آجائے اور زندگی کو سانس لینے کے لیے کچھ دن اور میسر آجائیں۔لیکن اس لائحہ عمل کے ساتھ یہ امید کبھی نہیں کی جا سکتی کہ اللہ کا دین غالب آئے گا یا اللہ کا کلمہ عوام الناس کے دلوں کی دھڑکن بن جائے گا۔تیسری جانب یہ خیال کہ

موجودہ نظام تو ان ہی غیر اسلامی بنیادوں پر قائم رہے، مگر اخلاق ،

معاشرت، معیشت، نظم و نسق یا سیاست کی خرابیاں خود بہ خود ٹھیک ہو جائیں گی یا ان کی اصلاح ہو جائے گی ! تو یہ خیال بھی غیر عملی کہلائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ نظامِ زندگی کی بنیادی خرابیوں کی آفریدہ اور پروردہ ہے اور ہر خرابی کو دوسری بہت سی خرابیوں کا سہارا مل رہا ہے۔ ان حالات میں جامع فساد کو رفع کرنے کے لیے ایک جامع پروگرام ناگزیر ہے، جو جڑ سے لے کر شاخوں تک پورے توازن کے ساتھ اصلاح کا عمل جاری رکھے۔ وہ کامل پروگرام کیا ہے؟اس سے قبل یہ سوال اہم بن جاتا ہے کہ آپ فی الواقع چاہتے کیا ہیں؟اس موقع پر ہم یہ بتاتے چلیں کہ اسلام اور جاہلیت کا ملا جلا مرکب، جو اب تک ہمارا نظام حیات بنا ہوا ہے،زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ یہ اگر چلتا رہا تو دنیا میں بھی ہماری کامل تباہی کا موجب ہوگا اور آخرت میں بھی ہمارا شمار نامراد وناکام لوگوں میں ہوگا !

انسان جب کسی کا غلام بن جائے تو لازم ہے کہ اس کو غلامی سے نکالا جائے۔ کیونکہ انسان جسمانی و عقلی بنیادوں پر آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی وہ اللہ کا بندہ بھی ہے۔ لہٰذا اس کے جسم اور اس کی فکر کو ہر سطح پر غلامی سے نجات دلانا اولین فریضہ ہے۔ ڈی کنڈیشنگ جسے عرفِ عام میں تطہیرِ فکر و قلب کہہ سکتے ہیں، یہ عمل انسان کو ہر طرح کی نفسیاتی غلامی کے خاتمے کا عمل

ہے۔لیکن یہ عمل انہی افراد کو نفسیاتی غلامی سے آزاد کر سکتا ہے جن میں یہ خواہش موجود ہو۔جس شخص میں یہ جذبہ ہی نہ ہو وہ آزادی کیسے اور کیونکر حاصل کر سکتا ہے؟ڈی کنڈیشنگ کا عمل، نفسیاتی آزادی کا عمل یا تطہیرِ فکر و قلب کا عمل ان لوگوں کے لیے آسان ہے جو داعی الالخیر کی ذمہ داری انجام دیتے ہیں۔اور یہی وقت کا تقاضہ بھی ہے کہ ہم داعی حق بن جائیں۔لیکن داعی حق کے لیے لازم ہے کہ وہ غیر ضروری بحث و مناظرے سے بچے، نہیں یہ عمل اسلام اور مسلمانوں دونوں کی شبیہ خراب کرتا ہے۔داعی حق کے لیے اخلاصِ نیت پہلی شرط ہے تو وہیں دوسری یہ کہ کارِ دعوت کا مقصد کسی شخص کو گھیر گھار کر اپنے نقطہ نظر پر قائل یا لاجواب کرنا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔داعی کا کام صرف اتنا ہے کہ جس بات کو وہ حق سمجھتا ہے،اسے احسن طریقہ سے دوسرے بھائی تک پہنچادے۔ داعی کو کبھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اور نہ ہی اپنے مخاطب کو راست یا بلاواسطہ ایسی تنقید کا نشانہ بنانا چاہیے جس کے نتیجہ میں ضد پیدا ہونے کا امکان ہو۔کیونکہ ضد، انانیت اور ہٹ دھرمی، کبھی سیدھے راستے کی راہنمائی نہیں کرتے۔لہٰذا رمضان المبارک کا استقبال ہمیں اس طرح کرنا چاہیے کہ ہم پر یہ واضح ہو جائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا مقصد کیا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا اصل اور بنیادی مقصد یہی تھا کہ دین پر نہ صرف مکمل عمل کرکے لوگوں کو بتادیا جائے بلکہ یہ بھی کہ دین کو بے کم وکاست لوگوں تک پہنچادیا جائے۔ہمیں بھی اس رمضاالمبارک سے

یہی پیغام لینا چاہیے۔اللہ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

کیرانہ کے سفید جھوٹ سے بی جے پی کے مشن اترپردیش کا آغاز!

ایک جانب کانگریس نے اترپردیش میں ہونے والے اسمبلی انتخابات کی باگ دوڑ کی ذمہ داری غلام نبی آزاد کو سونپی تو اُدھر بی جے پی کی قومی مجلس عاملہ کی میٹنگ الہ آباد میں مکمل ہوئی۔دونوں ہی کا نشانہ آئندہ 2017 میں ہونے والے اسمبلی انتخابات ہیں۔لیکن اس سے پہلے کہ کانگریس کسی ایشو کو اٹھاتی اور اسے انتخابی رخ دیتی، بی جے پی نے پہل کرتے ہوئے کیرانہ کا مسئلہ زور و شور سے اٹھا دیا ہے۔اس کے باوجود افسوس کی بات یہ ہے کہ جس حکم سنگھ نے اس مسئلہ کو بڑی تیاری کے ساتھ اٹھایا تھا وہ خود اپنے موقف سے پلٹ گئے ہیں۔یہ بات بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ملک میں ہوئے 2014 کے پارلیمانی انتخابات کے بعد سے اترپردیش میں بی جے پی اور اس کی ہمنوا پارٹیوں کے لیڈران کی زبانی جنگ تیز سے تیر تر ہو چکی ہے۔اس بدزبانی اور نفرت آمیزگی کا ہی نتیجہ تھا کہ چند ماہ پہلے نریندر مودی نے آر ایس ایس کے سربراہ سے ملاقات کی اور اس پر لگام لگانے کی بات کہی تھی یہاں تک کہ اپنے عہدے سے سبکدوشی کی بات بھی کہی تھی۔اس کے باوجود اترپردیش کے چند سادھو نما سیاست داں نفرت کا ماحول پروان چڑھانے میں مستقل مصروف عمل رہے ہیں۔ممکن ہے اسی پس منظر میں بی جے پی کے قومی صدر امت شاہ کو لکھنؤ میں کہنا پڑا کہ سادھوی پراچی کا بی جے پی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔وہ بی جے

پی کی رکن بھی نہیں ہیں۔ لیکن امت شاہ کا یہ بیان سادھوی پراچی کو بڑا شاق گزرا۔ اور انہوں نے بھی اس بیان کے بعد یہ بیان دے ڈالا کہ کام میں کرتی ہوں اور فائدہ بی جے پی اٹھاتی ہے، پھر جس طرح سے مظفر نگر سانحہ میں، میں نے اپنا کردار ادا کیا اور مجھ پر قومی سلامتی ایکٹ لگا، اس کا فائدہ بھی تو بی جے پی ہی کو ملا۔ میں نے قومی سلامتی ایکٹ برداشت کیا، کورٹ کچہری کے چکر لگائے اور اب کا فائدہ امت شاہ اٹھا رہے ہیں۔

وہیں کیرانہ کے مسئلہ کو اٹھاتے ہوئے بہوجن سماج پارٹی کی سربراہ مایاوتی نے کہا کہ معاملہ یہ ہے کہ بی جے پی نے ریاست میں آئندہ ہونے والے اسمبلی انتخابات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیرانہ کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ جس کا بنیادی مقصد انتخابات سے قبل کشیدگی پھیلانے اور فرقہ وارانہ فساد کروانے کی سازش ہے۔ انہوں نے ریاست کی برسراقتدار سماج وادی پارٹی، بی جے پی کے الزامات کا جواب دینے میں ناکام رہی ہے لیکن ان کے فرضی الزامات کی اصلیت بتاکر میڈیا نے اس سازش کو بے نقاب کیا ہے۔ ریاست میں امن و قانون کی صورتحال بدتر ہے جس سے لوگ پریشان ہیں۔ اس بدحالی کے لیے تنہا سماج وادی حکومت ہی نہیں بلکہ بی جے پی اور کانگریس بھی ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے کہا راجیہ سبھا اور قانون ساز کونسل کے الیکشن میں اپنے دو امیدواروں کی شکست کے بعد بی جے پی بری طرح سے زمین پر آ گئی ہے، اس سے توجہ ہٹانے کے لیے کیرانہ کا مسئلہ اٹھایا گیا

ہے۔لیکن یہ اچھی بات ہے کہ میڈیا ہی نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔
کیرانہ شاملی ڈسٹرکٹ کا ایک چھوٹا شہر ہے۔یہ علاقہ مظفر نگر فسادات کے دوران بھی متاثر ہوا تھا۔شہر میں 80 فیصد مسلمان ہیں تو وہیں 18 فیصد ہندو۔ واقعہ یہ بھی کہ جس طرح حکم سنگھ کی لسٹ میں ہندوؤں کی نقل مکانی کی بات اٹھائی گئی ہے وہیں دوسری جانب 'دا وائر' کی رپورٹ کی روشنی میں 150 مسلم خاندان بھی اِس علاقہ سے نقل مکانی کر چکے ہیں۔وجہ؟خوف کی سیاست، کرائم کا اضافہ، معاشی تنگی اور امن وامان کی تلاش۔رپورٹ یہ بھی بتاتی ہے کہ غنڈہ گردی میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔علاقہ کے دو مشہور سرگرم گینگ سربرہ کے ناموں میں سے ایک کا نام مکم کالا ہے تو دوسرے کا نام فرقان ہے، اور فی الوقت دونوں ہی جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔انڈین ایکسپریس کی رپورٹ کی روشنی میں جو لسٹ حکم سنگھ نے فراہم کی اس میں سے 5 افراد مرچکے ہیں، 4 افراد بہتر معاش کی تلاش میں علاقہ چھوڑ کر گئے ہیں، 10 افراد ایسے ہیں جو تقریباً 10 سال پہلے یہاں سے جا چکے ہیں۔وہیں 118 نام جو شاملی ڈسٹرکٹ پولیس کو فراہم ہوئے ہیں ان میں سے 5 لوگ مرچکے ہیں، 12 ابھی بھی وہیں مقیم ہیں، 46 افراد ایسے ہیں جو 2011 میں ہی یہاں سے جاچکے ہیں، اور 55 افراد ایسے ہیں جو 11 سال پہلے یہاں سے نقل مکانی کر چکے ہیں۔ان تمام اعداد و شمار کے ساتھ ہی سینئر جرنلسٹ پنکج چترویدی کہتے ہیں کہ لسٹ میں 10 لوگ مرے پائے گئے ہیں،

کئی سرکاری نوکر ہیں جو ریٹائرمنٹ کے بعد علاقہ سے جا چکے ہیں، کئی خاندان وہیں موجود ہیں،اور اگر اس لسٹ کو تسلی کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر افراد مزدور ہیں جو روزگار کی تلاش میں نقل مکانی کرنے پر مجبور ہیں، پھر اگر وہ ایسا نہ کریں تو کیا کریں؟ان حالات میں ریاستی اور مرکزی حکومتوں سے سوال تو یہ کرنا چاہیے تھا کہ علاقہ میں کرائم کا خاتمہ اور امن و امان بحال کرنے کی کس کی ذمہ داری ہے اور وہ کب ادا کی جائے گی؟ وہیں شہریوں کی معاشی تنگ دستی کے لیے کیا پالیسی اور پروگرام مرتب کیا گیا ہے؟ لیکن فی الوقت یہ سوالات پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔برخلاف اس کے لگتا ایسا ہے کہ کیرانہ کا مسئلہ بی جے پی ختم کرنے والی نہیں ہے۔وہ چاہتی ہے کہ جس ایشو کی باقاعدہ زمین ہموار کی گئی، جس کے لیے میڈیا میں اس کی تشہیر ہوئی،اور علاقہ سے وابستہ لیڈر حکم سنگھ کی ساکھ داؤ پر لگی،اسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔اس لیے جہاں اُس نے پہلے مقیم مسلمانوں کی دبنگی کا مسئلہ بنا کر پیش کیا وہیں اب کیرانہ سے ہندو خاندانوں کی مبینہ نقل مکانی کے الزامات کی تحقیقات کے لیے اپنی 9 رکنی ٹیم کو مقامی شہریوں کی سخت مخالفت کے باوجود بھیجا،اور کہا کہ جس طرح ہم یہاں تحقیقات کرنے آئے ہیں اسی طرح ریاستی حکومت کو بھی یہاں آکر زمینی حقائق کی تلاش کرنی چاہیے۔دوسری جانب ایک مقامی شہری نے بتایا کہ یہاں ہم ہندو مسلمان ایک طویل عرصہ سے امن و امان کے ساتھ رہ رہے ہیں۔مسئلہ صرف سیاسی وجوہات کی بنا پر

اٹھایا جارہا ہے۔پوری ریاست میں قانون وانتظامیہ کامسئلہ ہےاوراسے روکنے کے لیے کارروائی ہونی چاہیے،اور جو نقل مکانی کی وجہ بتائی جارہی ہے،وہ نہیں ہے۔جن ستا اخبار کی روشنی میں خبر کاایک تیسرارخ یہ ہے کہ سہارنپور رینج کے ڈی آئی جی،اے کے راگھوَ نے ڈی جی پی ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ بھیجی،جس میں کئی خلاصے سامنے آئے ہیں۔رپورٹ میں کہاگیا ہے کہ نقل مکانی کرنے والے ہندوؤں کی لسٹ بنانے والے بی جے پی کے ممبر آف پارلیمنٹ حکم سنگھ اپنی بیٹی کو چناؤلڑوانا چاہتے ہیں۔سنگھ اپنی بیٹی کو کرانا کامیابی دلانے کے لیے فرقہ ورانہ صف بندی (Communal polarization) چاہتے ہیں۔غور طلب ہے کہ سنگھ نے ہندو خاندانوں کی ایک لسٹ جاری کی تھی اور کہا تھا کہ بڑی تعداد میں کیرانہ کے مخصوص مذہب کے افراد کی دہشت سے ہندو خاندان نقل مکانی کرنے پر مجبور ہیں۔رپورٹ میں کہاگیا ہے کہ یہ مسئلہ فساد کی شکل اختیار کر سکتا ہے لہٰذا یہاں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔رپورٹ میں یہ بھی بتایاگیا ہے کہ ایک خاتون کے اغوااور قتل کےمعاملہ میں ہندو سماج کے دو لوگوں کا نام آرہا تھا لیکن سنگھ نے ان دونوں لوگوں کا نام رپورٹ سے ہٹانے کا دباؤ بنایا۔اوراس معاملہ میں مسلمانوں کو گرفتار کرکے جیل بھیج دیاگیا۔

کیرانہ کا معاملہ لگتا ایسا ہے کہ جلد ختم ہونے والا نہیں ہے۔شاید اسی وجہ سے بی جے پی کے ممبر اسمبلی سنگیت سوم نے تقریباً دوہزار حامیوں کے ساتھ

اپنی 'نربھیہ یاترا' شروع کی۔ سوم نے نقل مکانی کرنے والوں کی واپسی کے لیے پندرہ دن کا الٹی میٹم دیا ہے ورنہ سڑکوں پر اترنے کی بات کہی ہے۔ گرچہ پولیس نے سوم ان کے حامیوں کی یاترا کو روک دیا ہے،اس کے باوجودہ توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس یاترا میں کھلے عام ہتھیاروں کی نمائش کی گئیاوراشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ کیرانہ کا معاملہ پوری طرح صاف ہے کہ عمل کے پس پشت مقاصد کیا ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آغاز ہے 2017 میں ہونے والے اترپردیش اسمبلی الیکشن کا۔ غوروفکر اور لائحہ عمل ان تمام لوگوں کو طے کرنا چاہیے جو اس لیکشن میں راست حصہ داری نبھائیں گے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی کافی وقت موجود ہے۔اس کے باوجود بہتر یہی ہوگا کہ وقت کا زیاں کیے بناکسی بہتر اور ٹھوس لائحہ عمل کی جانب پیش قدمی کی جائے!

! چین کی این ایس جی مخالفت اور چینی چٹائیوں پر یوگ کا اہتمام

گزشتہ ایک ہفتہ پہلے کی بڑی خبر کیرانہ کی نقل مکانی تھی۔ جس کا آغاز و اختتام اُسی ہفتہ ہوگیا تھا۔اس کے باوجود اترپردیش حکومت کی جانب سے تشکیل شدہ سنتوں کی پانچ رکنی ٹیم نے اپنی رپورٹ جب بائیس جون کو سونپی تو ایک بار پھر وقتی طور پر مسئلہ کو منفی رخ دینے کی کوشش کی گئی لیکن ،کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ سنتوں کی ٹیم نے رپورٹ میں کہا ہے کہ کچھ لوگ وہاں کی فضا خراب کرنا چاہتے تھے۔ کیرانہ جانے والے سنتوں کے وفد میں بھارتی سنت کمیٹی کے قومی صدر پرمود کرشنن سمیت ہندو مہاسبھاکے صدر چکرپانی مہاراج، دیوآنند گری شامل تھے۔پرمود کرشنن نے وزیر اعلیٰ کو رپورٹ سونپتے ہوئے بتایا کہ کیرانہ تحقیقات کے دوران انہوں نے وہاں پر تمام طبقے کے لوگوں سے بات چیت کی اور پتہ چلا کہ اترپردیش کی فضا خراب کرنے کی خطرناک سازش رچی گئی تھی۔ اس پر وزیر اعلی اکھلیش یادو نے سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے سخت کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا۔اسے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ کوشش جو کی گئی تھی وہ جھوٹ پر مبنی تھی،اور واقعہ جو بیان کیاگیا تھا وہ حقیقت، سے بہت دور تھا،برخلاف اس کے حالات یکسر مختلف تھے،لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ تھا، جسے حل کرنا مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی ذمہ داری ہے، اور جس طرح انہیں اپنی ذمہ داری ادا کرنی تھی وہ ابھی تک ادا نہیں کر

رہے ہیں۔ساتھ ہی غربت وافلاس اور معاشی بدحالی کا معاملہ ہے،اس تعلق سے بھی کو ئی واضح منصوبہ ،رپورٹ اور واقعات سامنے آنے کے باوجود، عمل درآمد کے مرحلے میں سامنے نظر نہیں آتا۔

ہفتہ کی دوسری اہم اور بڑی خبر عالمی یوگا دن کا منایا جانا ہے۔اس دن کو منانے کے لیے جہاں حکومت نے اپنی تمام تر طاقت کا راست اور بلاواسطہ استعمال کیا۔وہیں عالمی یوگا دن کے موقع پر تاریخ رقم کرنے کی خواہش لئے ہندوستانی حکومت نے سوا سو کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم صرف اشتہار بازی پر خرچ کی ہے۔حکومت کی مختلف وزارتوں نے اس دن کو کامیاب بنانے کا جو بجٹ تیار کیا ہے وہ تشہیر کے لیے دیگر منصوبوں کے مقابلے کہیں زیادہ ہے۔سرکاری ذرائع کے مطابق اکیلے آیوش محکمہ نے 30 کروڑ روپے خرچ کرنے کا ذمہ اٹھایا ہے۔جبکہ وزارت خارجہ نے ہندوستان کے علاوہ دنیا بھر میں واقع ہندوستانی سفارت خانوں کے ذریعہ یوگا دن کو کامیاب بنانے کے لئے تشہیر کی ہے۔جس کا بجٹ تقریباً سو کروڑ روپے کے آس پاس بتایا جا رہا ہے۔دولت، وسائل، ذرائع، صلاحیتں، وقت کا بھرپور استعمال ہوا تو وہیں سرکاری وزراتیں، دفاتر،اثر و رسوخ کا استعمال بھی سامنے آیا۔ساتھ ہی میڈیا جو کسی بھی چیز کو اہم اور غیر اہم بناتی ہے،اس موقع پر اس کا مکمل اور بھرپور استعمال کیا گیا۔اور اس سب کی وجہ جو ملک کے وزیر اعظم نے جو بتائی وہ یہ

تھی کہ یوگا کوئی مذہبی سرگرمی نہیں ہے، لہٰذا اس کو گلالگایا جائے یعنی اس کو زندگی میں اختیار کیا جائے۔اس موقع پر ایک لمحہ کے لیے اُن لوگوں کے بیانات بھی یاد کر لینے چاہیے جنھوں نے موجودہ حکومت کی تشکیل کے وقت ،اور موجودہ وزیر اعظم نریندر مودی کے حلف بر داری کے وقت کہا تھا کہ ہندوستان کو ایک طویل عرصہ کے بعد ایک ہندو حکمراں حاصل ہوا ہے۔اس پس منظر میں جب ہم نریندر مودی کی سرگرمیوں اور ان کی جانب سے کی جانے والی سعی و جہد کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرگرمیوں کا رشتہ کہیں نہ کہیں اس پس منظر سے بھی وابستہ ہے، جس کا تذکرہ کبھی کھل کر تو کبھی ڈھکے چھپے کیا جاتا ہے۔ساتھ ہی ملک کے ہر باشعور شہری کو اس بات پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ جیساکے کہنے والوں نے ملک کے وزیر اعظم کو "ایک ہندو حکمراں کہا،اور اپنی امیدیں وابستہ کیں، اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے کہ ملک کو درحقیقت" ہندو راشٹر بنانے میں مصروف عمل اور پابند عہد "ہندو حکمراں" کس سرگرمی کو کن مقاصد کے لیے انجام دے رہا ہے؟ ممکن ہے کہنے والے کہیں کہ ملک کے وزیر اعظم کے لیے جو کسی بھی مذہب ، تہذیب اور ثقافت کو فروغ دینے کا ذمہ دار یا پابند عہد نہیں ہوتا ،کے لیے اس طرز پر سوچنا اور اس کی سرگرمیوں کا اس طرح جائزہ لینا مناسب نہیں ہے۔لیکن یہ جائزہ لینے کا عمل ہمارا خود کا نہیں بلکہ یہ جائزہ لینے کا عمل تو اُن لوگوں کا ہونا چاہیے ، جنھوں نے بڑی مشقتیں اٹھانے کے بعد اور اندرونی کشمکش سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ،نریندر

مودی کو پارٹی کی جانب سے وزیر اعظم نام زد کیا تھا۔ بہر حال، واقعہ تو یہی ہے کہ یوگا ایک مذہبی عمل ہے، اور جو یوگی، تپسیا اور سادھنا کرتے ہیں یا جن مذہبی پیشواؤں کا ہندو مذہب میں تذکرہ اور عبادت کی جاتی ہے، وہ سب یوگا کے کسی نہ کسی عمل کو جاری رکھتے ہوئے اپنی عبادت انجام دیتے رہے ہیں، اور وہی طریقہ آج بھی جاری ہے یہی وجہ ہے کہ یوگا کرتے وقت نہ صرف شلوک (مذہبی آیات) پڑھے جاتے ہیں بلکہ سوریہ نمسکار جیسی سرگرمی بھی انجام دی جاتی ہے۔ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہندومذہب نے جس طرح دیگر نظریات و خیالات کو خود میں ضم کرلینے کا ہنر سیکھا ہے، اسی طرح یوگا میں بھی دیگر صحت عامہ سے متعلق چیزوں کو شامل کرلیا گیا ہے۔یا یہ کہیے کہ اسے جدید تر بناتے وقت دیگر ورزشوں کو بھی شامل کرلیا ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ یوگا کا تعلق مذہب سے نہیں ہے۔

تیسری خبر گرچہ زیادہ مشتہر نہیں ہوئی لیکن یہ خبر اس لیے اہم ہے کہ ملک میں برسر اقتدار سیاسی جماعت اور اس کے لیڈران اقلیتوں اور دیگر کمزور طبقات کے سلسلے میں کیا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں ؟اس کا اندازہ اُن کے بیانات، احساسات، نظریہ، طرز عمل اور پالیسی و پروگرام سے وقتاً فوقتاً خوب اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً دلت طبقہ جو صدیوں سے خود کو ہندوستانی تہذیب اور اس کی مضبوط جڑوں سے متاثر کن محسوس کرتا رہا ہے۔اور جس کے نتیجہ

میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبید کر سے لیے کر آج تک سیاسی و معاشرتی محاذوں پر حصول وقار حصول عزت، حصول ذات ،کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے لوگ نظر آتے ہیں ۔اس، سب کے باوجود نظریہ ظلم وزیادتی پر مبنی سماج ، اس کی فکر نے اُنہیں اپنے مقام سے اوپر نہیں اٹھنے دیا۔یہی وجہ ہے کہ آج کے "جدید ہندوستان "میں بھی دلتوں کو وقتاً فوقتاً ذلت آمیزی سے دوچار ہوناپڑتا ہے۔فی الوقت جس بیان یا صحیح معنی میں فکر کا ہم تذکرہ کررہے ہیں وہ ریاست مہاراشٹر کے بی جے پی ممبر اسمبلی روندر چوہان کی جانب سے سامنے آیا ہے،جو بیان انہوں نے ایک تقریب کے دوران دیا ہے ۔وہ کہتے ہیں کہ جس طرح ابراہم لنکن نے ایک سور کو نالے سے نکال کر اسے صاف کیا تھا،اسی طرح وزیر اعظم نریندر مودی اور ریاست کے وزیر اعلیٰ دیندر فڈنویس دلتوں کی ترقی کے لیے سخت جدوجہد کر رہے ہیں۔دوسری جانب حزب اختلاف نے اس بیان کی بھرپور تنقید کی، دلت تنظیموں نے بیان کو واپس لینے اور معافی مانگنے کی بات کہی، این سی پی پارٹی نے مخالفت کرتے ہوئے ایک سورنی کا نام رویندر چوہان رکھ دیا،اس سب کے باوجود نظریہ اور فکر میں تبدیلی کی نہ کوئی کوشش ہوئی اور نہ ہی اس کے امکانات نظر آتے ہیں۔گرچہ حقیقت حال کاتذکرہ ایک مختصر واقعہ سے کیا گیا لیکن درحقیقت یہی وہ بدترین صورتحال ہے جو ملک کو اندرون خانہ کمزور کیے ہوئے ہے۔اور اسی ایک معمولی واقعہ کے پس منظر میں ملک کے برسر اقتدار طبقیاوران مذہبی و معاشرتی راہنماؤں کے ذہنوں کو خوب اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ایک جانب یہ سیاسی و

غیر سیاسی لیڈران اکیسویں صدی میں ہندوستان کو دنیا کی ترقی پذیر ممالک کی فہرست سے نکال کر ترقی یافتہ فہرست میں شامل کرنے کی خواہاں ہیں تو وہیں اُن کی فکر اور طرز عمل منووادی دور میں آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ایک ایسا دور جو صدیوں پرانا اور دقیانوسی دور ہے۔ان حالات میں برسراقتدار طبقہ اور اس کے مذہبی و معاشرتی نظریہ پر دنیا کا کون شخص تعریف کر سکتا ہے؟

آخری خبر 2002 میں ریاست گجرات میں ہوئے مسلمانوں کا قتل عام اور گلبرگ سوسائٹی پر آنے والا فیصلے کی ہے۔جس کا فیصلہ سناتے ہوئے جج صاحب کہہ رہے تھے کہ ہلاک شدہ کانگریس کے سیاسی لیڈر ،احسان جعفری نے اپنی لائسنس والی بندوق سے گولی چلا کر بھیڑ کو بھڑکا دیا تھا جس کے نتیجہ میں 69 افراد ہلاک ہوگئے،یہ افراد قبل از وقت مجرم نہیں تھے، لہٰذا شواہد و ثبوتوں کی روشنی میں بڑی تعداد میں لوگوں کو بری کر دیا گیا۔ہستکشیپ ڈاٹ کام کی خبر کی روشنی میں گودھرا میں بی جے پی نے ٹرین میں آگ لگائی،اس کے بعد ٹرین میں مارے گئے لوگوں کی لاشوں کے ساتھ پوری ریاست میں جلوس نکالے گئے،بی جے پی، آر ایس ایس اور وی ایچ پی کے رہنماؤں کی نگرانی میں بھیڑ اکٹھی ہوئی اور مسلم بستیوں اور دکانوں پر حملے کئے گئے،اور ان فسادات میں جبکہ لفظ فساد خود اس واقعہ کے لیے مناسب نہیں) تقریباً دو ہزار لوگوں کا قتل ہوا، اس) سب کے باوجود قاتل اس بات پر فخر کرتے نظر آئے کہ وہ ریاست گجرات کی ہندو برادری.

سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہیں یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ بھلے ہی چین نے ہندوستان کو این ایس جی کی رکنیت نہیں ملنے دی اور اس کی مخالفت کی اس کے باوجود ہندو چینی بھائی بھائی کا نعرہ دیتے ہوئے یہ منظر کیا کافی نہیں ہے کہ عالمی یوگا دن پر جو یوگ کیا گیا وہ چین کی بنی چٹائیوں پر ہی تھا!

! رمضان المبارک کا آخری جمعہ اور یوم القدس

عام طور پر ناکارہ اور کام چور لوگوں کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں تو ادا نہیں کرتے لیکن چند دیگر خوشنودی کے کام انجام دے کر متعلقہ ذمہ دار کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کے لیے کبھی وہ جائز اور کبھی ناجائز طریقہ اختیار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔وہیں حقیقت یہ بھی ہے کہ عام طور پر ذمہ دار یا افسر اپنے متعلقہ افراد سے باخبر ہوتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ فلاں شخص جو اپنی ذمہ داری ادا نہ کرتے ہوئے دیگر حربے استعمال کر رہا ہے وہ دراصل اُس کی نظر میں قابل اعتماد بننے اور عرف عام میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔اس کے باوجود لوگ سمجھتے ہیں کہ افسر لاعلم ہے، ہماری کوششیں رنگ لائیں گی اور دوسروں پر ہم کو فوقیت حاصل ہو جائے گی۔کچھ یہی معاملہ مذاہب میں عبادات میں غلو کے تعلق سے بھی ہے۔چند لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ عبادات میں غلو کے دخول سے اپنے ان معبودانِ غیر حقیقی کے مخصوص بندوں میں شمار ہو جائیں گے جن میں عام لوگ نہیں ہیں۔یہ معاملہ تو معبودانِ غیر حقیقی کا ہے لیکن وہ لوگ جو معبودِ حقیقی اور رب العالمین کی عبادات کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں ،ان کو عبادات کا طریقہ، ان کی تعداد اور مقدار بھی متعین کرکے بتا دی گئی ہے۔اس کے باوجود وحدانیت کے قائل افراد کی بعض اوقات شدید خواہش

ہوتی ہے کہ عبادت کے طریقہ اور تعداد میں کچھ اضافہ کر لیا جائے یا اگر اضافہ نہیں کر سکتے تو کچھ نئے رسم و رواج اور عقائد وافکار میں تبدیلی ہی لے آئیں تاکہ خواہشِ نفس کی تکمیل ہو جائے ساتھ ہی ہماری ساکھ بھی بحیثیت مسلمان برقرار رہے۔ ممکن ہے کچھ ناسمجھ یا بھولے بھالے لوگ اس کے قائل ہوں لیکن معاملہ یہ ہے کہ یہ بھولے بھالے اور ناسمجھ لوگوں کا عمل نہیں بلکہ ان شاطر اور چالاک لوگوں کے حربے ہیں جو دین میں کجی پیدا کرنے کے درپے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ امت کا شیرازہ بکھر جائے اور دینِ حنیف جن اوصاف و صفات سے مزین انسانوں کی تکمیل چاہتا ہے وہ نہ ہونے پائے۔ ایسے تمام مواقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ دین میں کجی یا بے راہ روی کے نتیجہ میں نہ صرف امت منتشر المزاجی کا شکار ہوگی بلکہ رب غفور و رحیم کی نظر کرم سے بھی محروم ہو جائے گی۔ معلوم ہوا کہ دین کے وہ کام جن کو عبادات کا درجہ دیا جاتا ہے ان میں کوئی نئی چیز پیدا کرنا، ان میں کمی یا زیادتی کرنا یا اس کی فکر اور عقیدے میں تبدیلی لانا، کارِ خیر نہیں بلکہ کارِ حرام ہے۔ اسی لیے اللہ کے رسول فرماتے ہیں: "جس نے ہمارے دین میں کسی ایسی چیز کی ایجاد کی جو دین میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے" اور کہا کہ: "جب کوئی قوم (دین میں) نئی بات نکالتی ہے (یعنی ایسی بدعت جو سنت کے مزاجم ہو) تو اس کے مثل ایک سنت اٹھالی جاتی ہے۔ لہٰذا سنت کو مضبوط پکڑنا نئی بات نکالنے (بدعت) سے بہتر ہے" (مسند احمد بن حنبل)۔ اسی طرح ایک اور موقع پر اللہ کے رسول فرماتے ہیں: " بہترین بات اللہ کی

کتاب ہے اور بہترین سیرت محمد کی سیرت ہے اور سارے کاموں میں بدترین کام نئے نئے طریق ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے " (صحیح مسلم)۔

:اور یہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ

آج امت مسلمہ دین وعبادت کے نام پر جن من گھڑت باتوں اور کاموں میں ملوث ہے ان میں ایک اہم مسئلہ رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو "جمعۃ الوداع" کہنا، سمجھنا اور برتنا بھی ہے۔ رمضان کے آخری جمعہ کو آج عرف عام میں جمعۃ الوداع کا نام دیا جاتا ہے، اس کے باوجود کہ یہ نام کتاب وسنت میں کہیں نہیں ملتا۔ گرچہ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح ہجرت کے دسویں سال آپ کے آخری حج کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے اسی طرح نبی کریم کے آخری رمضان المبارک کے آخری جمعہ کو "جمعۃ الوداع" قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول نے حج صرف ایک مرتبہ ادا کیا اور وہی حج ، حجۃ الوداع بھی کہلایا لیکن رمضان کے روزے اور اس کے جمعہ ایک نہیں بلکہ بہت مرتبہ آپ کی عبادات کا حصہ رہے۔ اس پس منظر میں یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ رمضان کے آخری جمعہ کو جمعۃ الوداع کہا جائے۔ دیکھا جائے تو خصوصاً ہندوستان میں اور اس کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی رمضان کے آخری جمعہ میں خطبہ کے دوران خطباء ایسے اشعار پڑھتے اور تقاریر کرتے ہیں جن میں رمضان کے گزر جانے پر افسوس کیا جاتا ہے۔ پھر ہر ایک جملہ یا دو جملوں کے بعد

کہتے ہیں "الوداع الوداع" یا کہتے ہیں "الفراق الفراق" یا کہتے ہیں "الوداع الوداع اے
شہر رمضان" اور ان ہی جیسے دیگر الفاظ ومفاہیم بھی سامنے آتے ہیں۔ جبکہ اس طرح
اظہار افسوس اور ان الفاظ اور احساسات کا اظہار نہ متقدمین اور نہ ہی متاخرین محدثین نہ
فقہا کی کتابوں اور نہ ہی خلفائے راشدین کے دورِ خلافت یا اس کے بعد کے دور میں ملتا
یہ الوداعی کلمات پر مشتمل خطبات (i: ہے۔ لہذا اس طرح کے خطبے روکنے چاہیں کیونکہ
نبی کریم صل اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ رضی اللہ اجمعین، تابعین اور تبع تابعین
سے منقول نہیں ہے اور جو فعل ان تینوں زمانوں میں نہ پایا جائے وہ من گھڑت
رمضان کے گزرنے پر افسوس کا اظہار غیر (iiبدعت ہوتی ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔
مشروع ہے کیونکہ روزے کا افطار تو فرحت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اور اس
کی دلیل حضرت ابوہریرہ؟ کی روایت کردہ وہ حدیث ہے جس میں اللہ کے نبی نے
فرمایا: "روزہ دار کو دو خوشیاں ملتی ہیں، ایک خوشی اس کو افطار کے وقت ہوتی ہے
اور دوسری خوشی جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا، اس وقت اس کو ملے گی" (بخاری و مسلم)
۔اور عید الفطر کے دن نمازِ عید تو مشروع ہی رمضان کے روزے ختم ہونے اور ملک
العلام کے حکم کو بجالانے کی خوشی کی وجہ سے ہے تو پھر پریشان ہونے اور رمضان کا
اسلام کے پانچوں (iiiمہینہ گزرنے پر افسوس کا اظہار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔
ارکان۔برابر درجہ کے ہیں اور رمضان کے گزرنے کی وجہ سے خصوصی طور پر غم کرنے
کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں شریعت

وارد ہوئی ہے۔ اور اگر یہ قیاس سے لیا ہے تو لازم آتا ہے کہ اس جیسی پریشانی اور تکلیف نماز، روزہ، حج اور زکوۃ، ہر رکن کے بعد ہونی چاہیے اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ جس طرح رمضان کے گزرنے اور دیگر عبادات نماز، حج اور زکوۃ کے اوقات گزر جانے کے درمیان فرق کسی عالم پر مخفی نہیں ہے۔ اسی طرح دیگر عبادات کے اوقات کے گزر جانے پر ہمیں اظہارِ افسوس نہیں کرنا چاہیے۔

iv) اور آخری بات گرچہ وہ پہلے بھی کہی جا چکی ہے وہ یہ کہ نبی کریم اور صحابہ؟ کے طریق کی اتباع کرنے میں ہی مکمل خیر ہے اور ان تمام طریقوں، رسموں اور عرفِ عام میں جاری و ساری باتوں سے پرہیز کیا جائے جو غیر شرعی کو شرعی اور غیر سنت کو سنت سمجھ لینے کے نتیجہ میں انجام دی جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر مباح جس کو التزام سے ادا کیا جائے وہ غیر مشروع ہو جاتا ہے۔ اور جاہلوں کا عقیدہ خراب ہونے کی صورت اس مباح کا ترک کامل لوگوں پر واجب ہے تو علماء کرام کو چاہیے کہ اس جیسا خطبہ پڑھنے کا التزام نہ کریں تاکہ یہ اس کے سنت ہونے کے اعتقاد تک نہ پہنچا دے۔ جہاں تک کسی دن کی چھٹی کا تعلق ہے تو عام طور پر سرکاری اور نجی اداروں میں تہواروں اور مخصوص سرکاری دنوں کے مواقع پر ہی چھٹیاں دی یا لی جاتی ہیں۔ لیکن آج ہمارے وہ ادارے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ رمضان المبارک کے آخری جمع کی چھٹی کا بھی مخصوص اہتمام کرتے ہیں۔ سوچنا چاہیے اور زیر بحث لانا چاہیے کہ یہ مخصوص چھٹی ہم کیوں مناتے ہیں؟ جبکہ ہمارے ادارے سال کے بقیہ مہینوں میں بھی اور رمضان کے

دیگر جمعوں میں بھی چھٹی نہیں کرتے۔ تو کیا وجہ ہے کہ رمضان کے آخری جمعہ میں اس چھٹی کا مخصوص اہتمام کیا جاتا ہے؟ کیا ہم اس جمعہ کو تہوار کی شکل دینا چاہتے ہیں؟ یا اپنے قول و عمل سے اس کی مخصوص فضیلت بیان کرنا ہمارا مقصد ہے؟ یہی وہ اعمال و افکار کے تضادات ہیں جن کی بنا پر عام مسلمان جمعۃ الوداع کے خطبہ کی خاص فضیلت سمجھتے ہوئے حاضر ہونے کا بہت اہتمام کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی اس کو چھوڑ دے تو اس کو برے عقیدے والا گردانتے ہیں۔

: یوم القدس

شرق وسطی کی آنکھ " فلسطین "انبیاء کرام کی سرزمین جہاں 1917ء تک مسلمان بڑی آبرومندانہ زندگی بسر کر رہے تھے، مگر دوسری جانب سویت یونین، یورپ و دنیا کے دیگر حصوں میں یہودیوں کا اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس اثر کو زائل کرنے کے لیے یہاں کے حکمرانوں نے یہودیوں کو اپنے ممالک سے نکال کر باہر پھینکنا شروع کیا۔

یہودیوں نے اپنے سرمائے کے بل بوتے پر برطانیہ اور امریکہ سے اپنے لیے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا۔ یہودیوں کے اس مطالبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے۔ برطانیہ نے اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر عسکری لحاظ سے کمزور اسلامی مملکت فلسطین پر حملہ کیا اور اس کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔ برطانوی افواج نے فلسطین کے اس حصہ میں یہودیوں کی آبادکاری کا عمل شروع کیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو بیدردی سے تہ تیغ کیا۔ یہاں آباد

ہونے والے یہودیوں کو امریکہ اور برطانیہ نے نہ صرف مہلک ہتھیاروں سے لیس کیا، بلکہ ان کی بھرپور فوجی تربیت اور مدد کی۔ فلسطین میں مسلمانوں کی قتل و غارت کا سلسلہ 1947ء تک برطانیہ کی نگرانی میں جاری رہا۔ 1947ء میں فلسطین کی اس اسلامی سرزمین پر غیر قانونی طور پر وجود میں لائی جانے والی ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اسرائیل کے قیام کے بعد برطانیہ نے اپنی افواج فلسطین سے نکال لیں، مگر اس ناجائز یہودی ریاست کے تحفظ کی ذمہ داری امریکہ نے قبول کی۔ اس وقت سے تاحال اسرائیل امریکی سرپرستی میں نہ صرف مظلوم فلسطینی عوام پر جبر و ستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے بلکہ دنیا بھر کے اسلامی ملکوں کے خلاف ایک گھناونے اور مذموم ایجنڈے پر کاربند ہے۔ امریکہ اپنے ناجائز لے پالک طفل شر کے ذریعے مشرق وسطٰی سمیت تمام اسلامی دنیا کو غیر مستحکم اور پسماندہ رکھنا چاہتا ہے۔

فلسطین کا مرکز قدیم تاریخی شہر "قدس" کا محل وقوع ہے جسے "بیت المقدس" یا قدس شریف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ مقدس شہر ان شہروں میں سے ایک" ہے جو تمام انسانوں کے نزدیک مقدس ہیں کیونکہ اکثر انبیاء اسی شہر میں مبعوث ہوئے۔ یہ شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کیلئے یکساں متبرک ہے۔ مسلمانوں کا قبلہ اول، مسجد الحرام اور مسجدِ نبوی کے بعد تیسرا حرم ہے۔ اللہ کے رسول ہجرت کے بعد بھی سترہ مہینوں تک اس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے

رہے۔ معراج کے سفر میں بھی یہی شہر آپ کی پہلی منزل تھا۔ اِسی جگہ حضرت داود علیہ السلام کا مدفن اور حضرت عیسیٰؑ کی جائے ولادت ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مسجد صخرہ، مسجد الاقصیٰ، دیوار براق اور کوہ طور ہے۔

ایران میں دینی انقلاب کے بعد امام خمینیؒ نے اپنے خطاب میں رمضان کے آخری جمعہ کو "یوم القدس" قرار دیا اور کہا کہ مسلمان اس جمعہ کو اجتماعی وحدت کی علامت قرار دیں ساتھ ہی اس دن کو القدس کی آزادی کے طور پر منائیں۔ امام خمینیؒ کی اس اپیل کو دنیا بھر کے مفکرین اسلام نے آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی جانب ایک اہم سنگ میل قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ اس دن مخصوص پروگراموں کے ذریعہ اس موضوع کو دنیا کے سامنے سامنے لاتی ہے۔ اس کے باوجود یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دن بطور دن منا کر امت جو خوابِ غفلت میں محو ہے، اس کو بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرف علامہ اقبالؒ نے امت مسلمہ کو متوجہ کرتے ہوئے خود شناسی کی تعلیم دی اور ملت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل

تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدہ دشوار
ترکان جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

رمضان المبارک کے اس آخری جمعہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ دین حنیف پر عمل کرنے کا مضبوط عزم کریں۔اللہ کے گھر میں اس کے حضور پیش ہو کر اس بات کا عہد کریں کہ وہ جئیں گے تو مسلمان بن کر اور مریں گے تو مسلمان !ان کو یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ وہ ایک امت ہیں۔ نہ صرف یاد رکھنی ہے بلکہ اپنے قول و عمل سے اس بات کی شہادت بھی دینی ہوگی کہ وہ ایک اللہ اور ایک رسول کے ماننے والے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان میں آپس میں ہمدردی و غم خواری اور اخوت و محبت کے جذبات اعلیٰ درجے پائے جاتے ہیں۔اور اسی ایک امت ہونے کا نتیجہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی اُس حدیث کا سچا مظہر بن جاتے ہیں جس میں فرمایا کہ: "تم مومنوں کو آپس میں ایک دوسرے سے رحم کا معاملہ کرنے، ایک دوسرے سے محبت و تعلق رکھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی ومعاونت کا سلوک کرنے میں ایسا پائیں گے جیسا کہ بدن کا حال ہے کہ جب بدن کا کوئی عضو دکھتا ہے تو بدن کے باقی اعضاء اس ایک عضو کی وجہ سے ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اور بیداری وبخار کے تعب ودرد میں سارا جسم شریک رہتا ہے" (بخاری و مسلم)۔یاد رکھیے ! حدیث پر عمل اور وحدت امت ہونے کا شعور یہ امت اسی وقت حاصل کرسکے گی جبکہ اپنی

عبادات اور معاملات میں ان تمام خرافات سے نجات پالے جو در حقیقت دینِ حنیف کا حصہ نہیں لیکن پھر بھی وہ قربِ الٰہی اور اجر و ثواب کے نام پر انجام دیے جاتے ہیں۔

!کیا جمہوریت اپنی حیثیت کھو چکی ہے

آج دنیا تشدد سے پریشان ہے۔ تشدد کے علمبردار ہر زمانے میں تشدد کا فروغ امن و امان کے قیام کے نام کرتے آئے ہیں اور یہی کچھ آج بھی جاری ہے۔ فی الوقت امن و امان "کے نام پر تشدد کے فروغ کی مثال امریکہ سے ہے۔ وہی امریکہ جو چاہتا" ہے کہ دنیا میں جس کو وہ امن کہے اسے سب امن کہیں اور جس کو وہ تشدد کہے اسے سب تشدد کہیں۔اس سے قطع نظر کہ دنیا امریکہ اور اس کی کاروائیوں سے کس قدر پریشان ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو ملک عرصہ دراز تک انسانوں کو رنگ و نسل کی بنیادوں پر تقسیم کرتا رہا اور انہیں بنیادوں پر ظلم و زیادتیاں اور استحصال میں اضافہ کرتا آیا ہے، وہ خود اپنے گریبان میں جھانکنے اور اس میں بہتری لانے کی کوشش کیوں نہیں کرتا ہے؟افسوس در افسوس ایسے شطر مرغ اور اس کے ہمنواؤں پر جو خود کو چھوڑ کر دوسروں کے مسائل اپنے ہاتھ میں لینے ، ان کو حل کرنے اور ان میں کمیاں نکالنے کے درپے ہیں۔۔برخلاف اس کے واقعہ یہ ہے کہ آج کے "مہذب ترین "دور میں جبکہ حقوق انسانی کی باتیں ہر فرد و گروہ بڑے زور و شور سے اٹھاتا ہے،اپنے ہی ملک، میں ہو رہی حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔کچھ اسی طرح کا معاملہ ایک بار پھر نسلی تعصب کے نتیجہ میں امریکہ میں سامنے آیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ایک طرف مہذب افراد اور ان کا ملک سیاہ فاموں کا قتل

کر رہا ہے تو وہیں تشدد کا جواب تشدد سے دیا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حقوق انسانی کا علمبردار اور امن و امان کے قیام کے خواہش مند امریکہ کی ریاست ڈیلاس میں صرف گھنٹوں کی بدامنی میں 7 افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ فی الوقت ان حملوں سے امریکی 32 غمزدہ ہیں اور مشکل کی اس گھڑی میں وہ کہتے ہیں کہ ہمیں امریکی عوام کی حمایت درکار ہے۔ یہ پورا واقعہ اس وقت پیش آیا جبکہ دو سیاہ فام افراد کو پولیس کے ہاتھوں قتل کیا گیا، بعد میں امریکی ریاست مینسوٹا میں سیاہ فام شخص فیلینڈو کاسٹل کو گاڑی سے ڈرائیونگ لائسنس نکالتے وقت پولیس نے گولی ماردی نیز اگلے ہی دن ایلٹن اسٹرلنگ نامی ایک اور سیاہ فام شخص کو ریاست لوسیانا میں ہلاک کر دیا گیا۔ وہیں سیاہ فام امریکی صدر بارک اوباما نے سیاہ فام امریکی شہریوں کےخلاف پولیس کے تشدد کو تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ پولیس کے ہاتھوں تشدد ایک 'سنگین مسئلہ' ہے۔ سیاہ فام اوباما کے مطابق اداروں اور عوام کے درمیان اعتماد کی کمی ہے۔ جس کے نتیجہ میں اس طرح کے سانحات رکنے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنے متعصب افراد کو برطرف کردیں۔ متذکرہ واقعہ تکلیف دہ اور افسوسناک ہے اور ہمیں بھی انسانوں کے درمیان رنگ و نسل کی بناپر برتری اور حقیر جاننے پر افسوس ہے۔ ساتھ ہی ہلاک شدگان اور زخمیوں سے ہمدردی بھی ہے۔ اس سب کے باوجود یہ ایک واقعہ ان تمام افراد و گروہ کو غور و فکر کا موقع فراہم کرتا ہے، جو امریکہ اور وہاں موجود آزادیٔ اظہار و حقوق انسانی کے گن گاتے

نہیں تھکتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جس طرح ہمارے وطن میں تشدد پایا جاتا ہے اور جس طرح یہاں بدکلامی جاری ہے، لوگوں کی عزت نفس کے کھلواڑ کی جارہی ہے، اور جس طرح حقوق انسانی کا گھلاگھوٹا جا رہا ہے، بالمقابل اس کے وہاں ظاہراً وہ کچھ نہیں ہوتا اس کے باوجود نہ وہاں کے حالات بہتر ہیں اور نہ یہاں کے۔ کیونکہ ایک فکر و نظریہ، انسانوں کا انسانوں ہی کے خلاف ظلم وزیادتیوں کا یہاں بھی ہے اور وہاں بھی۔ یہاں، اس کا واستہ منووادی فکر ہے، جس میں ایک برہمن ہے تو دوسرا شودر تو وہاں رنگ و نسل کی برتری کی بناپر عزت وذلت کے پیمانہ قائم کیے گئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں ہی مقامات پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کچھ انسانی حقوق کے پیمانہ بھی قائم کیے گئے ہیں۔ اس سب کے باوجود عملی مظاہر یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی فطرت میں ظلم وزیادتیاں رچی بسی ہیں، نتیجہ میں ہر دو مقام پر انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر ظلم وزیادتیوں میں مصروف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ وطن عزیز میں اسلام کے سورج طلوع ہونے سے قبل ہر قسم کی زیادتیاں جاری تھیں۔ فرعون وقت اپنی رعیت پر ہر قسم کی زیادتیوں میں مصروف تھے۔ مشہور یہی تھا کہ ملک کا بادشاہ، خدا کا پرتو ہے، لہٰذا حکم خداوندی یا حکم اقتدار ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں سب سے بڑی اور سب سے پہلی، سلطنت موریہ تھی۔ جس کا بانی چندرگپت موریہ تھا۔ موریہ برہمنوں کی

بالادستی کو نہیں مانتے تھے۔ وہ ہندو مذہب کے روایتی، سماجی مذہبی اور سیاسی نظریات کی مخالفت کرتے تھے اور ذات پات کے مخالف تھے۔اس کے باوجود موریا حکومت اس دور کی دوسری ہندو حکومتوں کی طرح شخصی، موروثی اور مطلق العنان تھی۔ راجہ دیوتا کا نائب اور اس کی طاقتوں کا مظہر تھا۔ تمام عدالتی، انتظامی اور فوجہ اختیارات صرف اسے حاصل تھے۔ وہیں ہندوستان میں اسلام سے قبل بدھ مذہب کے پیروکار تھے، نیز اس دور میں بہت ہی قلت کے ساتھ برہمنی مذہب کا یہاں پتہ چلتا ہے، لیکن اتنی بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اس وقت آرین مذہب کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی، بلکہ بدھسٹ اپنی خیرات تقسیم کرتے وقت جہاں دیگر مستحقین کو لائن میں لگاتے تھے وہیں برہمنوں کی قطار بھی ہوتی تھی (مختصر تاریخ ہند ۱۱۷، ۱۱۸-۱، از مسٹر ہنٹر) اس کے باوجود برہمن "بدھ "مذہب کو ختم کرکے آرین مذہب قائم کرنا چاہتے تھے۔ مورخ اسلام اکبر شاہ خاں کے حوالے سے چین کے مشہور عالم "ہیونگ شیانگ" نے ہندوستان کی سیاحت میں پندرہ سال (۶۴۵-۶۳۰ء) گزارے اور اس مدت میں ہندوستان کی سیر کی، وہ ہر مقام پر اپنے ماننے والوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ چناں چہ دوران سفر کئی جگہ ڈاکوؤں کے پنجے میں گرفتاری کا ذکر بھی کرتا ہے، اور ہمیشہ ان (لٹیروں) کو کافر اور بے دین بتاتا ہے حالانکہ وہ برہمنی مذہب کے پیروکار اور بدھ کے مخالف تھے (آئینہ حقیقت نما، ص: ۸۴)۔ گوتم بدھ اور اشوک کے بعد کے زمانے میں معاشرہ بت پرستی و بدعقیدگی اور شدت پسندی کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ جادو کا عام طور پر

رواج تھا، غیب کی باتیں اور شگون کی تاثیرات بتانے والوں کی بڑی گرم بازاری تھی، محرمات ابدی کے ساتھ شادیاں کرلینے میں تامل نہ تھا، چناں چہ راجا داہر نے اپنی حقیقی بہن کے ساتھ پنڈتوں کی ایماء سے شادی کی تھی، راہزنی اکثر لوگوں کا پیشہ تھا، ذات باری تعالیٰ کا تصور معدوم ہو کر اعلیٰ وادنی پتھر کی مورتوں اور بتوں کو حاجت روا سمجھتے تھے (آئینہ حقیقت نما، ص: ۱۷۵-۱۷۴)۔اسی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے علی میاں ندویؒ "منو شاستر "کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اس وقت عام طور پر ہندو مذہب نت نئے دیوتاؤں یہاں تک کہ آلہ تناسل تک کا پوجا جانا بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا (اور آج بھی یہ طریقہ ہندوؤں میں رائج ہے)۔ طبقہ واریت بے انتہا تھی یہاں تک کہ ایک قوم "شودر" نامی ، جس کے متعلق منوشاستر، ص: ۶ پر ہے: "اگر کوئی شودر کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے، اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اس کو (کسی برہمن) کو وہ تعلیم دے سکتا ہے تو کھولتا ہوا تیل اس کو پلایا جائے، کتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوے، الو اور "شودر" کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔ یعنی اگر برہمن کا کوئی شخص دوسری ذات والے کو قتل کردے تو فقط اس کی اتنی سی سزا کہ اس کا سر منڈوا دیا جائے اور اس کے برعکس دوسری قوم کے لوگ برہمن کے سامنے لب کشائی بھی کریں تو ان کی جان کے لالے پڑجائیں۔یہ اس وقت کے حالات تھے جو شاید وطن عزیز کا ماضی تھا لیکن دور جدید میں کمزور طبقات اور دلتوں کے ساتھ نیز ملک کی اقلیتوں کے تعلق سے جو خیالات پائے جاتے ہیں، وہ بھی

کچھ اچھے نہیں ہیں۔ساتھ ہی جو معاملات سامنے آتے رہے ہیں وہ مزید تشویشناک ہیں۔ دوسری جانب واقعہ یہ ہے کہ جدید امریکہ ہو یا جدید ہندوستان، دونوں ہی ممالک دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلاتی ہیں۔اس پس منظر میں ان ممالک میں جو واقعات رونما رورہے ہیں اور جن سے یہاں کے لوگ نبرد آزما ہیں، وہ کیسے اس بات کو ثابت کریں گے کہ جمہوریت واقعتاً مخصوص فکر و گرہوں کے گھر کی لونڈی نہیں بن چکی ہے؟واقعات کی روشنی میں کیا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جمہوریت اپنی اصل کے ساتھ عدل و انصاف کے پیمانہ برقرار رکھتے ہوئے لوگوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو رہی ہے؟اور اگر یہ مانا جائے کہ آج جمہوریت جس کا ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے وہ استعماریت اور آمریت میں تبدیل ہو چکی ہے تو پھر عوام کے پاس متبادل کیا ہے؟خصوصاً ان حالات میں جبکہ اسلام،اسلامی تعلیمات اور داعیان اسلام پر پابندی کی بات کی جا رہی ہو!

! اترپردیش - بساط تو بچھ چکی ہے

یہ درست ہے کہ اترپردیش ملک کی سب سے بڑی ریاست ہے اور بڑا ہونے کے ناطے سیاسی میدان میں اہم کردار ادا کرتا آیا ہے۔ وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ ریاست میں ایسے بے شمار مسائل ہیں جن کا حل فوری طور پر ہونا چاہیے اس کے باوجود ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا ہے۔ اور چونکہ آج کل ریاست میں آئندہ سال ہونے والے اسمبلی انتخابات سب سے اہم مسئلہ بنے ہوئے ہیں لہذا، اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے چھوٹی و بڑی تمام سیاسی پارٹیاں فعال نظر آ رہی ہیں۔ سال 2017 میں اترپردیش میں ہونے والے اسمبلی انتخابات کے لئے بساط بچھائی جا چکی ہے۔ اس بڑی جنگ کو جیتنے کے لئے تمام ہی سیاسی پارٹیوں نے ذات پات کی بنیاد پر تقسیم سماج کے پیش نظر اپنی اپنی گوٹیاں بھی بٹھانا شروع کر دی ہیں۔ ترقی کی بات کرنے والی بی جے پی بھی آگے نکلنے کے لئے پوری طاقت کے ساتھ دوڑ میں شامل ہے۔ دوسری جانب حقیقت یہ ہے کہ بہار کی شکست کے بعد بی جے پی اترپردیش کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی۔ اس پس منظر میں اِن کے رہنما اسٹیج پر تو ترقی کی بات کرتے نظر آتے ہیں اس کے باوجود لائحہ عمل معاشرتی بنیادوں پر تقسیم شدہ سماج کو مزید تقسیم کرکے الو سیدھا کرنا ہے۔ اترپردیش میں پسماندہ اور انتہائی پسماندہ دلتوں کی تعداد تقریباً 50% فیصد ہے۔ ان میں سے % فیصد یادو اگر نکال دیئے جائیں تب بھی 19

یہ فیصد کافی ہے، جسے بی جے پی اپنی طرف متوجہ کرنے میں مصروف ہے۔ اس سب کے باوجود بڑا سوال یہ ہے کہ بہار انتخابات میں یہی بی جے پی ذات پات کی کشتی میں سوار ہو کر ڈوب چکی ہے، تو کیا ایک بار پھر اتر پردیش کے انتخابات میں اِس کشتی میں سوار ہونے کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار پاتی ہے؟ ایسے میں دیکھنے والی بات یہ ہوگی کہ اتر پردیش کی سیاسی منجھدار میں یہ کشتی کس کو کنارے تک پہنچاتی ہے۔

اگر ہم بات کریں نریندر مودی کے مرکزی وزراء میں ہوئی حالیہ ردوبدل کی تو وہاں بھی اتر پردیش پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ریاست کے جن تین ممبران پارلیمنٹ کو وزیر بنایا گیا ہے ان دو مشرقی اور ایک وسط، یا علاقہ اودھ سے آتے ہیں۔ یہ تینوں ہی پہلی مرتبہ لوک سبھا کے لئے 2014 میں منتخب ہوئے ہیں۔ وہیں انتظامی صلاحیت اور پارٹی میں سرگرمی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو تینوں ہی بھارتیہ جنتا پارٹی میں مقامی و محدود اثرات کے رہنما ہیں۔ لیکن اپنے علاقے میں اپنی ذات کے لوگوں پر اثر ڈالنے کے قابل مانے جاتے ہیں۔ مرزاپور کی ممبر پارلیمنٹ انوپریا پٹیل، پارٹی اپنا دل میں شروع سے تنازعات میں رہی ہیں تو وہیں انوپریا، کرمی برادری کی اہم لیڈر ہیں۔ دوسری جانب گزشتہ چند دنوں سے بہار کے وزیر اعلی نتیش کمار جو خود ایک کرمی لیڈر ہیں اتر پردیش میں وارانسی اور آس پاس کے علاقوں میں شراب بندی مہم کو ایشو

بناتے ہوئے اپنا اثر بڑھانے کے فراق میں ہیں۔ اسی طرح شاہجہاں پور سے ممبر پارلیمنٹ کرشناراج بھی اپنے علاقے میں دو بار رکن اسمبلی رہ چکی ہیں اور دلت طبقہ میں اپنی ذات کی بنا پر معروف رہنما مانی جاتی ہیں۔ دلت برادری کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں مصروف بی جے پی کا یہ فیصلہ بھی ذات پات کے نظام کو مزید مضبوط کرنے کی روشنی میں دیکھا جا رہا ہے۔ تقریباً یہی جوڑ توڑ چندولی کے ایم پی مہندر پانڈے پر بھی لاگو ہوتا ہے جو اپنے علاقے میں برہمن کمیونٹی کے بااثر لیڈر رہیں۔ دوسری جانب اس تبدیلی کے پس پشت ایک اور تشویش جو بی جے پی کی سامنے آ رہی ہے وہ یہ بھی ہے کہ ان تین وزراء سے کم از کم اپنے علاقے میں کچھ کام کرائے جانے کی توقع کی جا رہی ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ ریاست میں بی جے پی کے 73 لوک سبھا رکن ہونے کے

باوجود اکثریت پر یہ الزام لگتا آیا ہے کہ وہ اپنے ہی علاقے میں غیر فعال ہیں۔ حال ہی میں ایسی رپورٹیں بھی سامنے آئی ہیں کہ بہت سے ممبران پارلیمنٹ نے گود لئے دیہات میں ابھی تک کوئی خاص کام نہیں کیا اور بعض نے تو اپنے فنڈ کا بھی مناسب استعمال نہیں کیا ہے۔

بی جے پی کے بعد اگر بی ایس پی کی بات کی جائے جس کی سربراہ مایاوتی یہ امید لگائے بیٹھی ہیں کہ اِس بار ریاست میں اُن کی حکومت بننے کی زیادہ امید ہے، تو حقیقت جو سامنے آ رہی ہے وہی یہی ہے کہ بی ایس پی خود اندرون

خانہ کمزور ہوتی نظر آ رہی ہے۔ پارٹی کے لیڈر ایک ، ایک کر کے الگ ہو رہے ہیں اور مایاوتی پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ پیسے کی دلدادہ ہیں۔ ساتھ مقامی سے لے کر ریاست تک کے زیادہ تر لیڈر پارٹی میں پیسے کا کھیل کھل کر کھیلتے آئے ہیں اور یہی سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جس کا ذکر نہ صرف بی جے پی صدر امت شاہ نے یہ کہتے ہوئے کیا کی بی ایس پی سربراہ مایاوتی نوٹ چھاپنے کی مشین ہیں بلکہ یہ بھی کہا کہ ایس پی اور بی ایس پی راہو ، کیتو کی طرح ہیں، ان کے رہتے اترپردیش کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف بی ایس پی کو نوٹ چھاپنے والی مشین بنا دیئے جانے کے بی جے پی کے الزام کی مخالفت کرتے ہوئے بہوجن سماج پارٹی، کی سربراہ مایاوتی نے امت شاہ کے الزام کو مکمل طور پر نسل پرستی کو فروغ دینے والی ذہنیت کے مترادف بتایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بی ایس پی نے بہوجن سماج کو لینے والے سے نکال کر دینے والا بنایا ہے۔ پارٹی انہی کے تھوڑے بہت مالی تعاون سے اپنی انسانیت پر مبنی مہم کو مسلسل آگے بڑھا رہی ہے۔ جبکہ بی جے پی اور کانگریس اور ان کی حکومتیں بڑے بڑے سرمایہ داروں سے رقم لینے کی وجہ سے ہمیشہ ان کی غلامی کرتی آئی ہیں۔ بی ایس پی صدر مایاوتی نے یہ بھی دعوی کیا کہ وزیر اعظم نریندر مودی کی حکومت غریبوں، مزدوروں، دلتوں ، کسانوں، پسماندہ طبقات اور مذہبی اقلیتوں میں سے خاص طور پر مسلمان اور عیسائی معاشرے کے مفادات کے خلاف ہے اور سرمایہ داروں کے لئے کام کرنے کی وجہ ہر طبقہ میں اپنا اعتماد کھوتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ مختلف ریاستوں کے اسمبلی انتخابات میں ان کی مسلسل ہار ہو رہی ہے۔ دوسری جانب گزشتہ دو سالوں میں بیرون ملک گھوم کر اس نے اپنی امیج میک اور کرنے کے لیے جتنی اہمیت دی ہے، اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ انہیں ملک کے اہم مسائل جیسے بڑھتی ہوئی مہنگائی، غریبی، بیروزگاری، سڑک، بجلی، پانی، خشک سالی اور سیلاب وغیرہ کو ترجیحی بنیادوں پر دور کرنے کی کتنی فکر ہے! ان حالات میں اگر مایاوتی کی بات مان بھی لی جائے جو انھوں نے امت شاہ، مودی اور ان کی حکومت کے بارے میں کہی اور جو کافی حد تک صحیح بھی ہے، اس کے باوجود بی ایس پی سے باغی ہوئے سوامی پرساد موریہ اور پرم دیو یادو کی باتوں کو کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا ؟ جس میں ان پر پیسہ لے کر عہدہ دینے کی بات سامنے آئی ہے۔

اترپردیش میں ہونے والے اسمبلی انتخابات میں بہتر کارکردگی اور کامیابی کی خواہش لیے کانگریس پارٹی بھی گزشتہ کئی سالوں کے بعد اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی فکر مند نظر آ رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو پارٹی کی لوک سبھا میں کمزور ترین صورتحال ہے وہیں راجیہ سبھا میں اِس کی موجودہ صورتحال برقرار رہے، یہ خواہش بھی نظر آتیہے۔ یہی وجہ ہے اور صلاح کار پرشانت strategist کہ اس بار خاص فیصلے لئے جارہے ہیں۔ سیاسی کمار کی مدد لی جارہی ہے، پرینکا گاندھی کو میدان میں اتارنے اور بڑے پیانے پر ریلیوں سے خطاب کرنے کی باتیں سامنے

آ ئیمیں، نیز ذات پات پر مبنی سیاست میں وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی۔یہی وجہ ہے کہ جہاں ایک جانب کانگریس نے حالیہ اسمبلی انتخابات کے پیش نظر راج ببر کو ریاست کا صدر بنایا، جن کی شناخت کسی خاص گروہ سے گرچہ منسلک نہیں ،اس کے باوجود راجا رام پال، بھگوتی پرساد، راجیش مشرا اور عمران مسعود کو نائب صدر بنا کر کانگریس نے ذات اور مذہب ہر دو پہلو سے کامیاب ہونے کی کوشش کی ہے۔اور بڑی خبر یہ بھی ہے کہ تین مرتبہ دہلی کی وزیر اعلیٰ رہیں شیلا دکشت کو اترپردیش میں بطور وزیر اعلیٰ نام زد کیا گیا ہے۔شیلا دکشت ذات کے لحاظ سے برہمن ہیں اور یوپی کے علاقہ قنوج کی بہو ہیں باالفاظ دیگر اترپردیش کی بہو اترپردیش میں بطور وزیر اعلیٰ داخل ہوا چاہتی ہے۔

گفتگو کے پس منظر میں قبل از وقت اترپردیش اسمبلی انتخابات کے بارے میں بہت کچھ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنی بات طے ہے کہ بی جے پی کے علاوہ جن پارٹیوں کو بھی کامیاب ہونا ہے ان کے لئے مسلمانوں اور دلتوں کا ووٹ شیئر بہت اہمیت رکھتا ہے۔

اس پس منظر میں مسلمان ہوں یا دلت، دونوں ہی کو ووٹ دینے سے قبل ریاست میں اپنی حیثیت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیۓ۔ ساتھ ہی جو وعدے پچھلی حکومتوں نے ان سے کیے تھے لیکن پورے نہیں کیے ،انہیں بھی یاد رکھنا چاہیۓ۔ ساتھ ہی گزشتہ پانچ سالوں میں جو نقصانات ہوئے ہیں اس کی

تلافی کی بھی حکمت عملی تیار کرنی ہوگی۔ کیونکہ سننے میں یہی آ رہا ہے کہ بی جے پی اور سماج وادی پارٹی نے پردے کے پیچھے ہاتھ ملانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب اگر آپ ان دو سیاسی جماعتوں کے اِس فیصلے سے اتفاق رکھتے ہیں تو آنکھ بند کرکے کسی ایک کے حق میں بھی ووٹ دے سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ ووٹ دینے کا حق انفرادی ہے نہ کہ اجتماعی، اور اس لئے بھی کہ ہم ایک "جمہوری ملک" میں رہتے ہیں جہاں حکومتیں "عوام کی پسند" سے بنائی جاتی ہیں۔ لہٰذا آپ کی پسند صرف آپ کی ہونی چاہیے یا ان لوگوں کی جن پر آپ کو اعتماد ہے!

! مقدس گائے" کے بہانے مظالم میں اضافہ "

ہم سب جانتے ہیں کہ بی جے پی یا سنگھ کے تین اہم ایشوز ہیں، رام مندر، آئین کی دفعہ 370 اور ملک میں کامن سول کوڈ کا نفاذ۔ لیکن چونکہ ان تینوں ہی ایشوز سے عوام کو آج کل دلچسپی نہیں ہے اس لئے ان کو چھوڑ کر کچھ دوسرے سماجی وسیاسی مسائل اٹھائے جارہے ہیں۔ جیسے "مقدس گائے" کا مسئلہ آج کل اہم ترین ایشو بنا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں آئے دن گائے کے تحفظ کے بہانے ظلم وزیادتیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس ایشو نے سنگین صورتحال اختیار کر لی ہے۔گائے جو کسی کے لیے مقدس ہے تو اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہو سکتے کہ جن کے پاس وہ صرف ایک جانور ہے، ان کے ساتھ ظلم اور زیادتیاں کی جائیں۔ باالفاظ دیگر قانون کو ہاتھ میں لینا کسی بھی طرح سے مناسب نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ وہیں واقعہ یہ بھی ہے کہ جب سے موجودہ حکومت اقتدار میں آئی ہے تب سے ان تمام مجرموں پر قانونی گرفت کمزور ہوئی ہے، جو گائے کی آڑ میں اپنے خطرناک عزائم غیر قانونی طریقے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر جس طرح ابھی حال میں گجرات میں مری ہوئی گائے کی کھال اتارنے والے چار دلت نوجوانوں کے پیٹنے کے ویڈیو سوشل میڈیا میں سامنے آئی ہے، وہ نہ صرف لاء اینڈ آڈر کی خراب صورت حال کو بیان کرتی ہے بلکہ یہ واقعہ اپنے آپ میں بہت سے سوالات بھی کھڑے کرتا ہے۔

پولیس کے مطابق ویراول میں متشدد لوگوں نے گزشتہ ہفتے کچھ دلتوں کو اس وقت پیٹا جبکہ وہ جانور کی کھال اتار رہے تھے۔ تاہم بعد میں گجرات میں مخصوص تنظیم نے اپنے کارکنوں کے اس معاملے سے جڑے ہونے سے انکار کیا ہے۔ لیکن یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ جن چار دلتوں کو بدمعاشوں نے پورے شہر میں گھومایا اور پیٹا تھا، اس کے بعد چھ بدمعاشوں کو گرفتار کیا گیا، تو وہیں تین افسران بھی معطل کئے گئے ہیں۔ اس المناک واقعہ کے بعد سات مشتعل دلتوں نے پولیس کے مطابق خودکشی کی کوشش کی۔ وہیں حالات کے پیش نظر ریاست میں وزیر اعلیٰ آنندی بین نے جانچ کا حکم دیا ہے اور چار پولیس ملازمین کو معطل بھی کیا ہے۔ وہیں دلتوں کی پٹائی کے بعد احتجاج ایک نئے انداز میں سریندر نگر میں دیکھنے کو ملا ہے۔ جہاں دلت سماج کے لوگ مری ہوئی گائے ٹرکوں میں بھر کر کلکٹر دفاتر پہنچ گئے، اور وہاں پھینککر یہ کہتے نظر آئے کہ سنبھالو اپنی ماؤں کو۔ دلت نوجوانوں کے پیٹنے کی مخالفت کو لے کر احتجاج کا یہ طریقہ پورے گجرات میں شروع ہو چکا ہے۔ لوگ مری ہوئی گائے کو سرکاری حکام کے دفاتر پہنچا رہے ہیں۔ ساتھ ہی سوشل میڈیا پر یہ طریقہ مزید وائرل ہو رہا ہے۔ لوگ اسے دلت سماج کے احتجاج کا گجرات ماڈل کا نام دے رہے ہیں۔

دوسری جانب حقیقت یہ بھی ہے کہ گورکشا کے نام پر ہر طرف گلی محلوں میں

مظالم کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن مار پیٹ کے واقعات سامنے آ رہے ہیں۔ لیکن یہ واقعات قومی اور بین الاقوامی میڈیا میں اس وقت سامنے آنا شروع ہوئے جب دادری، بساہڑا میں 28 ستمبر 2015 کو ایک 50 سالہ شخص اخلاق کی گائے کا گوشت کھانے کے الزام میں ایک گروپ نے پیٹ پیٹ کر اسے ہلاک کر دیا تھا۔ یہ واقعہ فرقہ وارانہ نفرت کا پہلا واقعہ نہیں تھا بلکہ اس سے قبل اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ چند واقعات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ سال 2014 میں 2، اگست کو دہلی کے نجف گڑھ علاقے کے چھاؤلا گاؤں میں پولیس چیک پوسٹ پر ایک منی ٹرک کو روکا گیا۔ ایک طرف جب ٹرک کا ڈرائیور پولیس کو جانے دینے کے لئے منا رہا تھا، تبھی کچھ دیہاتی ٹرک کے ارد گرد جمع ہو گئے اور بے رحمی سے ڈرائیور کو پیٹ پیٹ کر مار ڈالا۔ وہیں ہماچل پردیش میں 16 ،اکتوبر 2015 کو ایک 28 سالہ ٹرک ڈرائیور نومن کو بھیڑ نے گائے کی اسمگلنگ کے الزام میں پولیس کی موجودگی میں قتل کر دیا۔ 9، اکتوبر [illegible] 18 سالہ زاہد رسول کو زندہ جلا دیا، جس کی بعد میں علاج کے دوران موت ہو گئی۔ 11، دسمبر 2015 کو گائے کی حفاظت کے لیے تشکیل شدہ ٹیم نے ہریانہ کے کرنال میں سالہ مزدور کا قتل کر دیا۔ اسی طرح 29 ،نومبر 2015 گائے اسمگلنگ کے ملزم 25 عابد کو پولیس نے ہریانہ کے تھانیسر قصبے میں مار ڈالا۔ یہاں تک کہ کشمیر کے آزاد ممبر اسمبلی عبد الراشد کو اسمبلی میں بیف پارٹی کے الزام میں پیٹا گیا۔ 2، نومبر کو بی جے

پی لیڈروں نے کرناٹک کے وزیر اعلی سدھارامیا کو گائے کے گوشت کھانے پر سر قلم کرنے کی دھمکی دے ڈالی۔ 18، مارچ 2016 کو جھارکھنڈ میں لاتیہسر کے بالومتھ جنگلوں میں دو لوگوں کی لاش درخت سے لٹکی ہوئی پائی گئی۔ ایک 35 سالہ تو دوسرا 12 سالہ بالوگون اور نوادہ دیہات کا رہائشی تھا۔ یہ اپنی 8 بھینسوں کے ساتھ پڑوس کے جانور میلے میں جا رہے تھے جنہیں راستے میں بھیڑ کی طرف سے روکا گیا اور پیٹنے کے بعد درخت پر پھانسی دے کر لٹکا دیا۔

یہ وہ تمام غنڈہ گردی کے واقعات ہیں جو عام لوگوں کے لاء اینڈ آڈر ہاتھ میں لینے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس ہریانہ میں گائے کی حفاظت کے لیے 24 گھنٹے کی ہیلپ لائن شروع کی گئی ہے۔ اس ہیلپ لائن سے جہاں ایک جانب گائے کے تحفظ میں مدد مل سکتی ہے، وہیں اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ غنڈہ گردی کے مقابل، قانونی طریقے سے فیصلہ ممکن ہے، نیز غیر قانی تشدد کے واقعات میں بھی کمی آئے گی۔ دوسری طرف مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے مسئلہ کا حل، قانونی دائرہ میں ہر جگہ موجود ہے۔ اس کے باوجود گائے کے تحفظ کے نام پر نہ صرف قانون سے کھلواڑ جاری ہے بلکہ قانون کو لاگو کرنے والوں کی پکڑ بھی کمزور ہوتی محسوس ہو رہی ہے۔ سوشل میڈیا پر گجرات کے واقعہ کو لے کر لوگ اپنے خیالات درج کر رہے ہیں جو کسی کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں تو کسی کے لئے حقیقت سے واقفیت کا ذریعہ۔ وہیں اس موقع پر یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے

کہ سنگھ کا ہندوتو، عام ہندوؤں یا ہندوستانیوں کو قبول نہیں ہے۔ اس کے باوجود میڈیا مارکیٹنگ کی ذریعہ جس طرح وہ آگے بڑھتے دکھائے جارہے ہیں، سماجی سطح پر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ بی جے پی ہر محاذ پر کمزور ہوتی نظر آرہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جن وعدوں اور دعوؤں کے ساتھ وہ حکومت میں آئے تھے وہ سب کے سب جھوٹے ثابت ہو رہے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ مشہور دعویٰ، سب کا ساتھ سب کا وکاس" تھا۔ ملک کی موجودہ صورتحال بیان کر رہی ہے کہ نہ کسی" کا ساتھ ہے اور نہ ہی کسی کا وکاس۔ امیر، امیر سے امیر تر ہوتا جارہا ہے تو وہیں غریب اپنی غربت اور مہنگائی کی وجہ سے حد درجہ پریشان ہے۔

اس پورے پس منظر میں اور مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے، لازم ہے کہ نہ صرف حکومتوں کو بلکہ عوام کو بھی حل کے لیے موثر کردار ادا کرنا چاہیے۔تاکہ دلتوں، پسماندہ طبقات اور معاشرے کے کمزور طبقوں کے مسائل کم ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے انسانوں کوانسان سمجھا جائے ۔ان کو برابری کا درجہ دیا جائے۔ اور کیوں کے خدا واحد نے دنیا میں انسان کو سب مخلوقات میں افضل حیثیت دی ہے، لہٰذا اسے کسی سے کمتر یا حقیر نہ جانا جائے۔ اسے عزت و وقار بخشا جائے اور انہیں رنگ و نسل، ذات پات اور مختلف معاشی کاموں کی بنا پر تقسیم کرکے اعلی وادنی کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو

پھر مسائل میں اضافہ ہوگا۔ جو ملک اور اہل ملک، دونوں کے لئے نقصان کا باعث ہے۔ ضروری ہے کہ ان حالات سے نجات پائی جائے۔ خصوصاً اُن مسائل سے جن کی بنا پر انسانوں کو انسانوں کے درمیاں ہی تقسیم کیا جاتا ہے، انسانوں کے بالمقابل دیگر مخلوقات کو فوقیت دی جاتی ہے۔ نتیجہ میں نفرت کی فضاپروان چڑھتی ہے اور انسان بلاجوازاپنی ہی طرح کے دوسرے محترم انسان کی جان کا پیاسا بن جاتا ہے۔ یہ حد درجہ تشویشناک صورتحال ہے، جس کا تدارک لازماً ہونا چاہیے ۔مسئلہ کے حل کے لیے دیگر بہت سے عملی اقدامات میں ایک مثبت قدم مقامی سطح پر بلا تفریق مذہب وملت معزز و معروف حضرات کی امن کمیٹیوں کا تشکیل دیا جانا ہے۔ قبل اس سے کہ ہم، بذات خود مسئلہ کا شکار ہوں اس سلسلے میں پیش رفت کی جانی چاہیے،!

! مذاہب کی آڑ میں سیاسی داؤ پیچ

یہ عجب مذاق ہے کہ سیاسی لیڈران نہ صرف مختلف مذہب کے ماننے والوں کے مذہبی راہنما بنے ہوئے ہیں بلکہ عرف عام میں سماج بھی انہیں اسی حیثیت سے دیکھتا ہے۔اس کے باوجود کہ ان کی عملی زندگیاں مذہب بیزاری کے شواہد فراہم کرتی ہیں۔کچھ یہی معاملہ ملک کی اکثرتی طبقہ ہندوؤں کے تعلق سے ہے۔ تو وہیں اقلیتوں کی صورتحال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ موجودہ.برسر اقتدار بھارتیہ جنتا پارٹی ہندوؤں کے ایک.بڑے طبقہ کی ہر سطح پر رہنمائی کرتی نظر آتی ہے۔اور ہندو بھی انہیں اپنا مسیحا سمجھتے ہیں۔ ہندو مذہب و ثقافت کا تحفظ وبقا اور اس کا قیام اِس مخصوص پارٹی سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔دوسری جانب سماج کا کمزور طبقہ جسے عرف عام میں دلت کہا جاتا ہے ،وہ بھی اپنے افکار و نظریات کی ترویج ،بقا و تحفظ کے لیے بہوجن سماج پارٹی کی جانب نظریں اٹھاتاہے۔ تیسری جانب مسلمان ہیں جو گرچہ اپنی بقا و تحفظ کے لیے کسی مخصوص پارٹی کی جانب متوجہ نہیں ہیں ،اس کے باوجود مختلف سیاسی پارٹیوں سے وابستہ مسلمان سیاست داں یہی ثابت کرنے میں کوشاں رہتے ہیں کہ ہم نے جو اس سیاسی پارٹی سے اپنا تعلق استوار کیاہے ، اس کا مقصد صرف اور صرف یہی ہے کہ مسلمانوں کے مسائل حل ہوں، ان کو تحفظ ملے۔ اور یہاں بھی عموماً اسی پس منظر میں ان مسلمان لیڈران کو دیکھنے کا رواج ہوگیا ہے۔یہی

وجہ ہے کہ مسلمان انہیں کامیاب کرتے ہیں اور اپنا سیاسی و مذہبی مسیحا سمجھتے ہیں۔مذہبی و سیاسی راہنما اس لحاظ سے کہ مذہب پر عمل پیرا وہ رہنے میں اسٹیٹ اور قانون جو مواقع فراہم کرتا ہے، اس میں وہ مددگار ہوں گے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو تاثر ان سیاسی لیڈران اور ان کی سیاسی پارٹیوں کے تعلق سے قائم کیا گیا ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔بلکہ شواہد یہی ثابت کرتے ہیں کہ ان کے قول و عمل میں تضاد ہے اور مذہب اور مذہبی عقائد و نظریات سے وہ حد درجہ دور ہیں۔

فی الوقت چونکہ ملک کی سب سے بڑی ریاست اترپردیش میں آئندہ سال انتخابات ہونے والے ہیں اس لیے اترپردیش کی سماجی و مذہبی صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے ملک میں وقوع پذیر مختلف حادثات اور واقعات پر سیاسی لیڈران اپنا ردعمل سامنے لا رہے ہیں۔آپ کہ سکتے ہیں چونکہ وہ مختلف طبقات ومذاہب کے نمائندے ہیں، اس لیے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا ردعمل سامنے لائیں۔لیکن ہمارے خیال میں یہ بات اس لیے درست نہیں ہے کہ جس منصوبہ بندی کے ساتھ آج کل سیاسی محاذ پر سرگرمیاں جاری ہیں، وہ اس سے قبل گزشتہ سال ہونے والے واقعات کے بعد، اپنا ردعمل ظاہر نہیں کر رہے تھے۔آج دلت سماج نے منظم طور پر گجرات واقعہ کے بعد اپنے جذبات کا جس طرح اظہار کیا ہے، وہ گزشتہ سال رونما ہونے والے واقعات کے بعد نہیں تھا۔لیکن چونکہ ہمیں اس سے سروکار نہیں

کہ کون کس وقت کس مسئلہ پر اپنا رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ سروکار ہے اس بات سے ہے کہ اس طبقہ کے بیشتر رہنما جو زندگی کے بہترین دور، دورِ جوانی میں، طبقہ کے مسائل کے لیے سعی و جہد کرتے نظر آتے ہیں، اپنے نظریہ اور فکر اور سماجی تانے بانے کے خلاف موجود طاقتوں کو زبانی اور کہیں کہیں عملی بھی زیر کرتے نظر آتے ہیں، وہ آخر کار کیوں زندگی کے آخری دور میں داخل ہوتے وقت، اپنی فکر و نظریہ اور سماجی تانے بانے کے خلاف منظم و منصوبہ بند سعی و جہد کرنے والوں کا آلہ کار بن جاتے ہیں؟ جس طرح ضعیفی کی حالت میں انسان کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح سیاسی و سماجی سطح پر وہ اپنے موقف میں اس وقت کیوں کمزور نظر آتے ہیں جبکہ وہ سیاسی و سماجی سطح پر ایک مقام حاصل کر لیتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ سیاسی و سماجی ہر دو سطحوں پر بھارتیہ جنتا پارٹی اور بہوجن سماج پارٹی ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ اس کے باوجود بہوجن سماج پارٹی سے وابستہ یا اس طبقہ سے وابستہ افراد زندگی کے آخری دور میں، اُسی حریف کے ساتھ کیوں کھڑے نظر آتے ہیں جس کے خلاف وہ زندگی بھر آواز اٹھاتے آتے ہیں؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی اقتدار ہی سب کچھ ہے؟ یا ان کا ماننا ہے کہ سماج میں ذلت کی زندگی سے نکل کر عزت کی زندگی صرف سیاسی سطح پر بظاہر کامیابی ہی کی شکل میں حاصل کیا جا سکتا؟ کیا عزت کی زندگی سیاسی بساط پر کچھ عروج پا لینا ہے؟ یا عزت یہ ہے کہ انسان جس عقیدہ اور نظریہ سے وابستہ ہے اس پر کاربند رہتے ہوئے مسائل کا صبر و تحمل کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے

اس دارفانی سے رخصت ہو جائے؟ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھے کہ اردو میں لکھی تحریر کا اس طبقہ سے کیا تعلق جس کا تذکرہ اور مسائل یہاں چھیڑے جا رہے ہیں؟ کیونکہ بات کو کہنے کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے مخاطب ہوں، ان سے، ان ہی کی زبان میں ان کے سامنے بات کی جائے۔ پھر یہاں اس تحریر کو پڑھنے والے عموماً مسلمان ہیں تو مسلمانوں کے سامنے یہ سوالات کیوں اٹھائے جا رہے ہیں؟ اگر آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میری کوشش کارآمد ثابت ہو رہی ہے اور رائیگاں نہیں جائے گی۔ کیونکہ مخاطب آپ اور ہم ہی ہیں، یعنی وہ عام مسلمان، جو سیاسی محاذ پر اپنے مسائل کے حل، مختلف سیاسی پارٹیوں کے ان لیڈران سے وابستہ کرتے ہیں، جن کی سیاسی پارٹی نے، کبھی بھی آپ کے مسائل کو حل کرنے کی جانب توجہ نہیں دی۔ اب آپ سوچئے اور غور کیجیے کہ ہم بحیثیت مسلمان اُن سیاسی پارٹیوں سے اپنے مسائل کے حل کے لیے کیوں توقعات وابستہ کیے رہتے ہیں؟ کیا ان سیاسی پارٹیوں کے لیڈران اور منصوبہ ساز، آپ اور آپ کے مسائل کی جانب کبھی متوجہ ہوئے ہیں؟ کیا انہوں نے آپ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ اور ٹھوس لائحہ عمل تیار کیا ہے؟ کیا ان مسلم لیڈران کی جو مختلف سیاسی پارٹیوں سے وابستہ ہیں، اپنی ہی پارٹی میں مسلمانوں کے تعلق سے آواز اٹھانے پر، متعلقہ لیڈران اور منصوبہ ساز، حوصلہ افزائی کرتے ہیں؟ عمل درآمد، رد عمل، اور مسئلہ کے حل کی جانب پیش قدمی کی جاتی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر مسلمان ہندوستان کی آزادی کے بعد سے اب تک

اس ستر سالہ دور اور اس میں درپیش مسائل کے مشاہدے کے بعد، کوئی اور لائحہ عمل، تیار کیوں نہیں کرتے؟اور کیا یہ لائحہ عمل صرف سیاسی لیڈران ہی تیار کر سکتے ہیں؟یا اس لائحہ عمل میں علاقائی سطح پر موجودسیاسی شعور رکھنے والے افراد بھی کوئی موثر کردار ادا کرنے کے قابل ہیں؟

بات کا اختتام اس بیان پر کرتے ہیں جس میں بہوجن سماج پارٹی کی سربراہ مایاوتی نے کہاگیا ہے کہ معاشرہ بیدار ہوجائے تو پھر وہ کروڑوں لوگوں کے ساتھ بدھ مت اپنائیں گی۔مایاوتی نے کہا کہ باباصاحب امبید کرنے بھی بدھ مت اپنانے میں جلد بازی نہیں کی تھی اور زندگی کے آخری وقت میں بدھ مت مذہب اپنایا تھا۔مایاوتی کا یہ بیان مہاراشٹر کے دلت لیڈر اٹھاولے کے بیان کے بعد سامنے آیا ہے۔جس میں اٹھاولے نے امبیڈکر کے نام پر مایاوتی پر سیاست کرنے کا الزام لگایا تھا اور کہا تھا کہ امبیڈکر کے نام پر سیاست تو کرتی ہیں لیکن ان کے نظریات کو نہیں مانتیں۔جواب میں مایاوتی نے جوابی حملہ کرتے ہوئے کہا کہ رام داس اٹھاولے بی جے پی کی غلامی میں باباصاحب امبیڈکر کی تحریک کو صدمہ پہنچارہے ہیں۔نیز یہ بھی کہ اٹھاولے دلتوں کو غلام بنانے کی ذہنیت رکھنے والے بی جے پی کے ایجنڈے پر کام کرنا بند کریں اور دلت اتحاد کو نہ توڑیں۔وہ یہ بھی کہتی سنی گئیں کہ وہ سچی امبیڈکر وادی ہیں اوراترپردیش اسمبلی انتخابات میں اپنی شکست کے خوف سے بی جے پی مذہب کی آڑ

میں سیاست کر رہی ہے ۔اسی مقصد سے اس نے حال میں 'بدھ دھرم یاترا' شروع کی ہے۔ساتھ ہی الزام لگایا کہ آر ایس ایس اور نریندر مودی نے اپنے سیاسی مفاد کے پیش نظر ہی بدھ مذہب کی تعریف شروع کی ہے۔برخلاف اس کے وہ بدھ مذہب کی تعلیمات کو نہیں مانتے اور ان کے ماننے والوں پر ظلم کرنے والوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔مایاوتی اور اٹھاولے کے بیان دربیان کے بعد اب آپ بتایئے کہ آپ اپنے مسائل کے حل کے لیے کون سا مذہب اختیار کرنے والےہیں!

! ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعلیمی نظریہ

تعلیم کا مقصد لوگوں کو حقیقت سے روشناس کرانا ہے۔ لیکن یہ سوال بھی لازماً اٹھنا چاہیے کہ "حقیقت "کیا ہے؟ حقیقت وہ ہے جس کی بنیادیں حد درجہ پختہ ہیں۔ جس کی اساس کار میں تبدیلی نہیں لائی جاتی البتہ زماں و مکاں کے قیود سے بالاتر اضافہ ہونا ایک فطری عمل ہے۔ برخلاف اس کے ناقص تعلیم وہ ہے جس کی بنیادیں حد درجہ کمزور ہوں اور عموماً مفروضوں پر منحصر ہو۔ پھر یہ ایسے مفروضے ہوں جن کی نہ کوئی سند ہو اور نہ ہی کوئی بنیاد ہے۔ اردو میں تعلیم کا لفظ دو خاص معنوں میں مستعمل ہے ایک اصطلاحی دوسرے غیر اصطلاحی ، غیر اصطلاحی مفہوم میں تعلیم کا لفظ واحد اور جمع دونوں صورتوں میں استعمال ہو سکتا ہے ، درسِ حیات، ارشادات، ہدایات اور نصائح کے معنی میں۔ جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یا تعلیمات ، حضرت عیسیٰ کی تعلیم یا تعلیمات وغیرہ۔ لیکن اصطلاحی معنوں میں تعلیم یا ایجوکیشن سے وہ شعبہ مراد لیا جاتا ہے جس میں خاص عمر کے بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما، تخیلی و تخلیقی قوتوں کی تربیت و تہذیب ، سماجی عوامل و محرکات ، نظم و نسق ،مدرسہ و اساتذہ ، طریقہ تدریس و نصاب ، معیار تعلیم ، تاریخ تعلیم ، تعلیمی نفسیات، اساتذہ کی تربیت اور اس طرح کے دوسرے موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ تعلیمی افکار و نظریات پر روشنی ڈالی جائے

تو دنیا اور خود ہمارے ملک میں بے شمار مفکرین، مدبرین اور درس وتدریس سے وابستہ افراد کے تعلیمی افکار موجود ہیں۔ فی الوقت اس مضمون میں ہم ڈاکٹر ذاکر حسینؒ کے تعلیمی افکار و نظریات کا تذکرہ کرتے ہوئے تعلیم کے ان اعلیٰ مقاصد سے روشنا ہونے کی کوشش کریں گے، جو درحقیقت انسان کو نہ صرف خودشناس بناتے ہیں بلکہ خدا شناسی اور نصب العین کا شعور بھی فراہم کرتے ہیں۔

:ڈاکٹر ذاکر حسینؒ کے تعلیمی افکار

ڈاکٹر ذاکر حسینؒ کی شخصیت کے کئی پہلو نمایاں ہیں مثلاً ماہر معاشیات، ماہر سیاست اور ماہر تعلیم۔ ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا معلومات اکٹھا کرنا دوسرا تجزیہ اور تحقیق کے ذریعے ان معلومات کا جوہر اخذ کرنا اور تیسرا اس جوہر سے ایک اخلاقی شخصیت کی تعمیر کرنا۔ اگر یہ تینوں عملی طور پر کسی انسان میں ظاہر ہوں تو وہ انسان تعلیم یافتہ کہا جاسکتا ہے۔ تحصیل علم کا مقصد تلاش حق ہے اور تلاش حق کا مدعا خدمت خلق ہے۔ تلاش حق میں بھی تین منزلیں ہیں۔ خودبینی، جہاں بینی اور خدا بینی۔ ذاکر صاحب کے نزدیک یہ سب خوبیاں جس انسان میں یکجا ہوں اس میں حق وانصاف، رحم و کرم، حمیت وہمدردی، صدق و صفا اور محبت ومروت کی صفات خود بخود پیدا ہوجاتی ہیں اگر ایک تعلیم یافتہ انسان میں یہ قدریں نہ ہوں تو اس کی ڈگریاں بے کار ہیں۔ ذاکر حسین کے تعلیمی فلسفے کا ایک اہم جزیہ ہے کہ وہ فرد کی

تعلیم کو تعلیم نہیں سمجھتے ان کے نزدیک اصلی اور ابتدائی چیز معاشرہ ہے۔ انسان کے افکار و نظریاتک کا ارتقاء جو تعلیم کا اصل مقصد ہے سماج کے بنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ایک فرد واحد جاندار تو ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ ایک بامہذب سماج کا حصہ نہ ہو تو وہ مکمل انسان نہیں کہلائے گا۔ کیونکہ انسان کی امتیازی خصوصیت اس کا پختہ ذہن ہے لہذا یہ ارتقائی مراحل سماج کے تصور کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ انسان کے افکار، نظریات، تصورات اور عقائد معاشرہ کے کسی نہ کسی دوسرے انسان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ذہنی زندگی میں "تو" نہ ہو "میں" کا وجود بھی نہ ہو۔ اس لئے ذہن کی بالیدگی کے لیے سماج کا وجود لازم ہے۔ لہذا ایک بہتر سماج کے قیام کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تعلیم کا نظام درست کرے۔ سماج جس طرح کا بیج بچوں کے ذہن میں بوئے گا اس قسم کا پھل پائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ببول بوئے اور گلاب کے پھول اگنے لگیں۔ ذاکر صاحب کے نزدیک استاد کا بہت بڑا مقام ہے جو سماج کا ایک لازمی حصہ ہے۔ استاد کا کام صرف یہ ہے کہ شاگردوں کو کسی طرح انسان کی ذہنی زندگی سے روشناس کرادے۔ افلاطون نے اس ضمن میں ایک بڑے کام کی بات بتائی ہے: تعلیم وتربیت کے کاموں کو یوں سمجھنا چاہئے کہ معلم و طلبہ سب کے سب ایک گہرے اندھیرے غار میں پڑے ہوئے ہیں کسی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسی صورت میں استاد کا کام صرف یہ ہے کہ شاگردوں کا رخ اس طرف کردے جہاں غار میں روشنی کی ایک جھلک نظر آرہی ہے، استاد اپنے شاگردوں کو بصیرت نہیں بخش رہا ہے

شاگرد خود آنکھ رکھتے ہیں ، استاد کا کام صرف یہ ہدایت ہے کہ صرف اس طرف دیکھو جس طرف سے روشنی آرہی ہے ۔استاد کا کام صرف ایک reciever کا ہوتا ہے ۔غرض ذاکر صاحب ذہن کی بیداری کو تعلیم سے تعبیر کرتے ہیں (."تعلیمی خطبات "،از ڈاکٹر ذاکر حسین،مکتبہ جامعہ، نئی دہلی)۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے افلاطون سے لے کر انگلستان کے فرانسس بیکن ، امریکہ کے ڈیوی ، جرمنی کے کرنر ہٹز شیلر مارشر اور دیگر اکابرین تعلیم سے بہت کچھ سیکھا اور گاندھی جی کے تجربات وخیالات کو لے کر اسلامی فلسفے کی کسوٹی پر پرکھا اور اپنے فکر و تحقیق کے سانچے میں ڈھالا ، پھر اس سانچے کو ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کی مختلف ضروریات، احساسات ، تہذیبی رجحانات اور ذہنی امتیازات کے مد نظر ان میں ضروری ترمیمات کرکے خود اپنا فلسفہ تعلیم تیار کیا۔ اسی لگن اور محنت کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے اپنے بنیادی تعلیم کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے 1937ء میں جو کمیٹی بنائی اس کا سربراہ ذاکر صاحب کو مقرر کیا۔ ذاکر صاحب کی دیرینہ خواہش تھی کہ ان کا بنایا ہوا تعلیمی دستور العمل یعنی بنیادی تعلیم کا نظریہ ملک میں رائج کردیا جائے۔ اس اسکیم کے پیچھے مسلسل دس سال (1937-47)تک جان توڑ کوشش کی گئی کمیٹیاں بنیں ، کئی قراردادیں اور اور تجویزیں منظور ہوئیں لیکن ملک نے اس کو قبولیت کا شرف نہیں بخشا ، کبھی سیاست رکاوٹ بنی ، کبھی حکومت سے نااتفاقی رہی '

کبھی عہدیداروں کی ہٹ دھرمی اور کبھی ماہرین تعلیم کی آپسی کشمکش کی وجہ سے یہ اسکیم شرمندہ تعبیر نہ ہو سکی۔ (جاری)۔۔۔۔

! امن اور انسانیت کے قیام کا مشترکہ پلیٹ فارم

دنیا میں دو طبقات ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں۔ایک وہ جو اقتدار پر قابض ہے تو دوسرا وہ جو کسی اقتدار کے زیر سایہ ہے۔وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ برسر اقتدار طبقہ عموماً اپنے اختیارات کا صحیح استعمال نہیں کرتا ہے۔ نتیجہ میں ملک و سماج میں کمزور اور مظلومین کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ مظلومین کی تعداد میں اضافے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اُن کے ساتھ جاری ظلم وزیادتیوں کا فیصلہ عدل و انصاف کے پیمانہ سے گرا ہوا ہے تو وہیں یہ بھی ہیں کہ راست یا بلاواسطہ اُن انتہا پسند، شرپسند اور گنڈہ عناصر کو برسراقتدار طبقہ کی خاموش حمایت حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب سے ممالک کی حد بندیاں کی گئیں اور بین الاقوامی سطح پر ایک ملک کو دوسرے ملک کے اُن داخلی امور سے روکا گیا، جہاں عوام ظلم وزیادتیوں کے شکار تھے، اسی وقت سے سرد جنگ اور پروکسی وار کے الفاظ بھی تخلیق پائے ہیں۔ ویسے تو اصطلاحی معنی میں 'سرد جنگ' ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین اور ان کے متعلقہ اتحادیوں کے درمیان 1940ء سے 1990ء کی دہائی تک جاری رہنے والے تنازع، تناؤ اور مقابلے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جس عرصہ میں یہ دو عظیم قوتیں مختلف شعبہ ہائے حیات میں ایک دوسرے کی حریف رہیں جن میں عسکری اتحاد، نظریات، نفسیات، جاسوسی، عسکری قوت، صنعت، تکنیکی ترقی، خلائی دوڑ، دفاع پر

کثیر اخراجات، روایتی و جوہری ہتھیاروں کی دوڑ اور کئی دیگر شعبہ جات شامل ہیں۔ یہ امریکہ اور روس کے درمیان براہ راست عسکری مداخلت کی جنگ نہ تھی لیکن یہ عسکری تیاری اور دنیا بھر میں اپنی حمایت کے حصول کے لیے سیاسی جنگ کی نصف صدی تھی۔ اس کے باوجود کہ امریکہ اور سوویت یونین دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے خلاف متحد تھے لیکن بعد از جنگ تعمیر نو کے حوالے سے ان کے نظریات بالکل جدا تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بعد کی چند دہائیوں میں سرد جنگ یورپ اور دنیا کے ہر خطے میں پھیل گئی۔ امریکہ نے اشتراکی نظریات کی روک تھام کے لیے خصوصاً مغربی یورپ، مشرق وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا میں کئی ممالک سے اتحاد قائم کیے۔ اس دوران کئی مرتبہ ایسے تنازعات پیدا ہوئے جو دنیا کو عالمی جنگ کے دہانے پر لے آئے جن میں برلن ناکہ بندی (1948 - 1949ء)، جنگ کوریا (1950 - 1953ء)، جنگ ویتنام (1959 - 1975ء)، کیوبا میزائل بحران (1962ء) اور سوویت افغان جنگ (1979 - 1989ء) قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے ادوار بھی آئے جس میں دونوں ممالک کے درمیان تناؤ میں کمی واقع ہوئی۔ 1980ء کی دہائی کے اواخر میں سرد جنگ اس وقت اختتام پذیر ہونے لگی جب سوویت رہنما میخائل گورباچوف نے امریکی صدر رونالڈ ریگن سے متعدد ملاقاتیں کیں اور ساتھ ساتھ اپنے ملک میں اصلاحاتی منصوبہ جات کا اعلان کیا۔ اس دوران روس مشرقی یورپ میں اپنی قوت کھوتا رہا اور بالآخر 1991ء میں تاش کے پتوں کی طرح بکھر گیا۔

سرد جنگ کی اس مختصر تاریخ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو جائے کہ دو ممالک یا ایک ہی ملک کے اندر دو مختلف نظریہ ہائے حیات کے درمیان جو دوریاں اور نفرتیں محسوس ہوتی ہیں، ان کے پس پشت برسراقتدار طبقہ کا اہم کردار ہوتا ہے۔اس کی شہادت نہ صرف ان کی پالیسیاں دیتی ہیں بلکہ اقدامات شواہد بنتے ہیں۔چونکہ یہ نفرتیں اور دوریاں ہی سماج کو اکثریت اور اقلیت میں تقسیم کرتی ہیں لہٰذا ملک میں ایک طبقہ ہمیشہ خوف کے ماحول میں رہتا ہے تو دوسرا پر اطمینان زندگی گزارتے ہوئے مادی ترقی اور وسائل پر قبضہ کرتا ہے۔نتیجہ میں ایسے مواقع پر برسراقتدار طبقہ کے افکار و نظریات بھی تیزی سے فروغ پاتے ہیں ۔وطن عزیز ہندوستان میں بھی یہ کھیل آزادی سے قبل ہی جاری رہا ہے۔لیکن چونکہ ملک انگریزوں کا غلام تھااس لیے اس مدت میں ملک کے مختلف طبقات غلامی کا طوق اپنی گردن سے نکالنے کے لیے کسی حد تک متحد تھے۔اس کے باوجود کہ اُس مدت میں بھی ایک قلیل تعداد انگریزوں کی غلامی کو اپنے لیے عافیت سمجھتی تھی۔اور یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس قلیل تعداد میں ہندو مسلمان، دونوں ہی شامل تھے۔لیکن جب سے ملک تقسیم کے نام پر، آزاد ہوا، تب ہی سے ان دو ممالک کے درمیان نہ صرف جنگیں ہوئیں بلکہ سرد جنگ اور پروکسی وار، حد درجہ بڑھی ہوئی ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔سرد جنگ کی مختصر تاریخ میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اس کی ابتدا ریاست

ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان ہوئی تھی۔ لیکن سوویت یونین کے شیرازہ بکھرتے ہی سرد جنگ نے اپنا دائرہ مزید وسیع کیا۔ اور اب یہ دائرہ دنیا کی دو طاقتوں کے درمیان نہیں بلکہ دنیا کی واحد ترین طاقت اور اس کے ہمنواؤں نے، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دنیا وسیع سے وسیع تر کیا ہے۔ نتیجہ میں آج دنیا دو واضح حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ اسی تقسیم کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں امن و امان غارت ہوا ہے، چہار جانب فساد برپا ہے، اور انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ ہر گروہ دوسرے کو زیر کرنے میں مصروف ہے۔ اور پورے عمل میں سب سے زیادہ نقصان معصوم بچوں کی شکل میں آئندہ آنے والی نسلوں کا ہو رہا ہے۔ جن کی زندگیاں آج خون و آگ کے شعلوں پر، پروان چڑھ رہی ہے۔

دنیا کی موجودہ صورتحال کا پس منظر جو یہاں بیان ہوا ہے۔ اس کے پس پشت ایک اور عمل جاری ہے، جسے 'عظیم چالبازیاں' (The Great Game) اصطلاح کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح 19 ویں اور 20 ویں صدی میں وسط ایشیا پر بالادستی کے حصول کے لیے سلطنت برطانیہ اور سلطنت روس کے درمیان ہونے والی مسابقت اور تنازع کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اولین 'عظیم کھیل' کا دور عام طور پر 1813ء کے روس فارس معاہدے سے 1907ء کے انگریز روس معاہدے تک تسلیم کیا جاتا ہے۔ 1917ء میں بالشیوک انقلاب کے بعد ایک دوسرے، لیکن کم شدت کے دور کا آغاز ہوا۔ اس

دور میں عظیم کھیل کی اصطلاح کو عموماً آرتھر کونولی (1807 – 1842ء) سے منسوب کیا جاتا ہے۔جو برطانوی شرق الہند کمپنی کے چھٹے بنگال گھڑسوار دستے میں جاسوس افسر تھا۔ اس اصطلاح کو عوامی سطح تک برطانوی ناول نگار روڈیارڈ کپلنگ کے (Kim) ناول، کم 1901ء) نے پہنچایا۔فی الوقت دنیا میں جاری عالمی قوتوں کی) ریشہ دوانیوں اور مفادات کے باعث اب بھی سمجھا جاتا ہے کہ عظیم کھیل جاری ہے جس کا مقصد اُن ممالک کے قدرتی وسائل پر قبضہ جمانا ہے، جو وافر مقدار میں وہاں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس جدید 'عظیم کھیل' میں امریکہ کی زیر قیادت نیٹو اور روس۔ چین اتحاد برسرپیکار ہیں۔

واقعہ یہ بھی ہے کہ بین الاقوامی اصطلاحات اور اس کے اثرات سے اندرونی و بیرونی سطح پر آج دنیا کا ہر ملک نہ صرف متاثر ہے بلکہ نئے اصطلاحات کے ساتھ اس کو فروغ بھی دے رہاہے۔اُسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف ممالک کے اندرون خانہ موجود مختلف گروہوں کے درمیان نہ صرف سرد جنگ جیسے حالات پیدا ہو گئے ہیں بلکہ عظیم چالبازیاں نئے پیرایوں میں بڑے پیانہ پر جاری ہیں۔کچھ ایسے ہی حالات آزادی کے بعد سے وطن عزیز ہندوستان میں بھی کبھی منظم تو کبھی غیر منظم انداز میں جاری ہیں۔لیکن اس پورے کھیل میں یہ واضح کرنا حد درجہ مشکل ہے کہ مختلف اوقات میں موجود برسراقتدار طبقہ نے کیا اور کیسے اپنا خاموش کردار ادا کیا ہے۔ تشویشناک صورتحال یہ ہے کہ جس طرح آج واضح انداز میں ملک

میں فرقہ پرست طاقتیں اپنے آپ کو مضبوط سمجھ رہی ہیں، تنازعات اور اختلافات نے تشدد کی شکل اختیار کر لی ہے، کہا جا سکتا ہے کہ یہ ٹکراؤ آج سے پہلے اس قدر بڑھا ہوا نہیں تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے پر امن افراد و گروہ بھر پور انداز میں ان حالات کا مقابلہ کریں۔ مقابلہ انہیں کے طرز عمل کو اختیار کرکے نہیں بلکہ مقابلہ اس صورت میں کہ زبان و علاقہ اور مذہب و نسل سے اوپر اٹھ کر ملک میں امن اور انسانیت کے قیام اور ظلم وزیادتیوں کے خاتمہ کے لیے مشترکہ پلیٹ فارم تشکیل دیا جائے ساتھ ہی اسے استحکام بھی حاصل ہو۔ کیونکہ ظلم وزیادتیوں پر خاموشی اختیار کیے رہنا، خود ظلم وزیادتیوں کے فروغ میں شامل ہونے جیسا ہی ہے۔ اور یہ طرز عمل ہمیں، ہمارے خاندان، بستی و قریہ، علاقہ اور شہر اور پورے ملک کو، کب اپنی چپیٹ، میں لے لے؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ قبل از وقت ہم ہوش میں آئیں، کیونکہ جس وقت آگ اور خون کی ہولی سے ہم خود متاثر ہوں گے، اور دنیا خاموش تماشائی بنے افسوس بھرے کلمات دہرائے گی، اس وقت جس قدر درجہ کرب و اذیت میں ہم مبتلا ہوں گے، اسے بروقت سمجھنا مشکل ہے۔ اس کے باوجود ہوش مند وہی کہلائے گا جو قبل از وقت امن اور انسانیت کے قیام میں مصروف عمل ہو جائے!

تکریم انسانیت اور ملک کی تشویشناک صورتحال !

یہ حقیقت ہے کہ ہمارا ملک ایک وسیع و عریض ملک ہے۔جس کا رقبہ بتیس لاکھ ستاسی ہزار دو سو ترسٹھ کلو میٹر ہے۔سرکاری اعداد شمار کے مطابق ملک میں 1.2ارب افراد رہتے ہیں۔ان میں 79.8%فیصد ہندو،14.2%فیصد مسلمان،2.3%فیصد عیسائی، فیصد سکھ،0.7%فیصد بدھ ازم کو ماننے والے، 0.4% جین، اور 0.9%% 1.7% دیگر افراد ہیں۔ملک میں تمام ہی مذاہب کے ماننے والے موجود ہیں۔ان میں عیسائیت کے ماننے والے بھی ہیں اور اسلام کے ماننے والے بھی، ہندو بھی ہیں تو سکھ مت، بدھ مت، جین مت ،زرتشی اور بہائیت کے ماننے والے بھی ۔ نیز ایسے افراد کی بھی کافی تعداد موجود ہے جو کسی بھی مذہب کو نہیں مانتے۔ملک کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس میں ایک ساتھ سترہ سو زبانوں کے بولنے موجود ہیں ۔ وہیں یہ بھی دلچسپ لیکن تلخ حقیقت ہے کہ انسانوں کو تقسیم کرنے میں بھی ہمارا ملک دنیا میں واحد ترین ملک ہے یعنی ملک میں تقریباًسترہ سو ذاتیں پائی جاتی ہیں۔ملک کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں انگریزوں کے آنے سے قبل اور جانے کے بعد تمام ہی افراد مل جل کر رہتے آئے ہیں۔انگریزوں کی آمد نے سماج کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کیا، 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی اختیار کی اور اہل ملک اس کا شکار ہو گئے۔ نتیجہ میں ملک تقسیم ہوگیا۔نہیں تو ہندوستان جو ہر

اعتبار سے ایک عظیم ملک تھا ہندوستان ، پاکستان اور بعد میں بنگلہ دیش میں تقسیم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود آج بھی ملک اپنے تنوع ، سماجی تانے بانے رشتہ ، تعلقات اور معاملات کے اعتبار سے دنیا کے لیے حیرت انگیز خصوصیات کا مالک، ہے۔

وطن عزیز کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں حد درجہ تنوع ہے اس کے باوجود ایک ہی گاؤں میں مختلف مذاہب کے لوگ اور نسلی گروہ مل جل کر رہتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں، خوشیوں اور غموں میں شریک ہوتے ہیں، مل جل کر ہی ملک کی معیشیت اور سماجی تانے بانے کو تقویت پہنچاتے ہیں اور مشترکہ مسائل سامنا بھی ایک ساتھ کرتے ہیں۔ تنازعات ہوتے رہے ہیں لیکن فرقہ وارانہ صورتحال اور تشدد و ٹکراؤ کم ہی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وقتاً فوقتاً فسادات بھی ہوتے رہے ہیں لیکن ان فسادات نے مستقل تصادم کی صورت کبھی اختیار نہیں کی۔ دستور کی روشنی میں دیکھا جائے تو دستور بھی تمام فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں کو پوری آزادی دیتا ہے۔ نیز آپس میں بھائی چارہ اور امن وامان کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ دستور کا دیباچہ تمام شہریوں کے درمیان اخوت، بھائی چارہ، مساوات ،آزادی اظہار اور معاشی و سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ تکریم انسانیت ، جیسی اعلیٰ قدروں پر زور دیتا ہے۔ ملک کا ،جو مختصر ترین اور خوبصورت نقشہ یہاں کھینچا گیا ہے،اس کا انکار کیے بنا

یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے اور جو اختیارات دستور کی شکل میں موجود ہیں، درحقیقت کیا ان پر عمل درآمد کیا اور کروایا جاتا ہے؟ عمل کیے جانے سے مراد اہل ملک کا سماجی اور طبقاتی نظام ہے اور عمل کروایا جانے سے مراد ملک کا نظم و نسق اور عدل و انصاف کے پیمانہ ہیں۔جب ہم تصویر کے اس رخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ملک کی ایک بھیانک تصویر بھی ہماری نظروں سے گزرتی ہے۔جہاں انتہا پسندانہ رجحانات میں تیزی سے اضافہ ہے تو وہیں سماجی تانے بانے کو پارہ پارہ کرنے کی منظم و منصوبہ بند سعی و جہد۔نیز آزادی اظہار پر لگام کسنے کی تیاری ہے تو وہیں معاشی و سماجی سطح پر عدل و انصاف کا ہوتا ہوا خون۔مزید دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تکریم انسانیت کی بجائے ذلت و خواری انسان کا مقدر بن چکی ہے۔ملک کی یہ دو تصویریں ہیں جن میں سے ایک کو آنکھ بند کرکے دیکھا جا سکتا ہے تو دوسری جگ ظاہر ہے۔آپ کون سی تصویر دیکھتے ہیں؟اور کون سی دیکھنا پسند کرتے ہیں؟یہ مجھے نہیں بلکہ آپ کو خود فیصلہ کرنا ہے۔ہم نے تو اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں اور آنکھیں بند کیے رہنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ لیکن جسم پر اس وقت تیز جھرجھری طاری ہو جاتی ہے جبکہ آنکھ بند کیے رہنے میں بھی سکون نہیں ملتا۔کیونکہ خواب و خیال میں بھی انسان کو وہی کچھ دکھتا ہے جو اس کے شعور اور تحت الشعور میں موجود ہے۔اور یہ شعور و تحت الشعور اسی وقت ارتقاء پاتا ہے جبکہ آپ کچھ دیکھتے، سنتے اور محسوس کرتے ہیں۔

آیئے تکریم انسانیت کے خوبصورت نعروں کے درمیان تذلیل انسانیت کے چند تازہ واقعات آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں۔پہلا واقعہ اڑیسہ کے کالا ہانڈی ضلع کا ہے جہاں ایک قبائلی آدمی اپنی بیوی کی مردہ لاش کندھے پر لاد کر چھوٹی بچی کے ساتھ پیدل چل نکلتا ہے۔وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ وہ نعش کو کسی گاڑی سے اپنے گھر تک لے جاسکے۔اس دردناک واقعہ پر ریاست کے وزیر صحت سبّیہ ساچی نے کہتے ہیں کہ حکومت اس تکلیف دہ حادثہ کو لے کر فکر مند ہے، ہم حل تلاش کر رہے ہیں اور مستقبل میں ایسا واقعہ دوبارہ پیش نہ آئے اس کی کوشش کر رہے ہیں۔لیکن غور فرمایئے تو یہ واقعہ ،صرف ایک واقعہ نہیں ہے۔یہ حقیقت ہے اس پورے نظام کی جہاں انسانیت مرچکی ہے ساتھ ہی یہ جنازہ صرف اس مردہ عورت کا نہیں بلکہ یہ اس نظام کی سڑی ہوئی لاش ہے جس کے درمیان ،پرسکون انداز میں ،ہم اور آپ شب و روز
گزارتیمیں۔دوسرا واقعہ ،پنا گر تحصیل ،جبل پور ،مدھیہ پردیش کا ہے۔یہاں معاشرہ کے ان غنڈہ عناصر نے ایک طبقہ کوادنیٰ قرار دیتے ہوئے ،اسی طقبہ کی ایک نعش کو اُس راستے سے نہیں جانے دیا جو ان کے قبضہ میں تھی۔برسات کی وجہ سے چونکہ گاؤں کی کچی سڑک ڈوب گئی تھی لہٰذا میت کے متعلقین میت کو تالاب کے راستے لے جانے پر مجبور ہوئے۔جبکہ جس راستے سے میت کو لے جانے سے روکا گیا تھا،بتایا گیا ہے کہ وہ زمین سرکاری ہے اور غنڈہ عناصر کے قبضہ میں ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ اعلیٰ طبقہ ہی کیا غنڈہ

عناصر ہے؟اور اُس واقعہ کو بھی سنتے چلئے جس کے سنتے ہی آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے،اورآپ اپنے سر کر پکڑ کر بیٹھ جائیں گے۔یہ واقعہ بھی اڑیسہ کے بالاسور ضلع کا ہے۔جہاں ریلوے اسٹیشن سے قریب ایک 80،سالہ بیوہ خاتون،مال گاڑی کے نیچے آگئی اور موت ہو گئی۔لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال لے جانا تھا،لیکن ایمبولنس کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے لاش کی ہڈیاں توڑی گئیں،اس کو ایک بورے میں بھراگیا،اور دولوگ ایک پوٹلی باندھ ،ڈنڈے پر لاد ،پیدل چل نکلے۔غور فرمایئے گا یہ تین واقعات ہمیں کس جانب سوچنے پر مجبور کرتے ہیں؟کیا یہ واقعات تکریم انسانیت ہیں یا تذلیل انسانیت کے؟واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کی تکریم ان ہی جیسے انسانوں کے درمیاں تذلیل میں تبدیل ہوچکی ہے۔اُسی کا نتیجہ ہے کہ جہاں ایک جانب یہ رویے ہمارے سامنے آتے ہیں وہیں وہ واقعات اور رویے بھی موجود ہیں جن میں نہایت درجہ ظالمانہ اور دہشت ناک واقعات کی مثالیں سامنے موجود ہیں۔آپ کو خوب اچھی طرح یاد ہوگا جھارکھنڈ کے اس کم عمر نوجوان کی نعش جسے پیڑ پر لٹکایا گیا تھا، دادری میں محمد اخلاق کا بہیمانہ قتل،دہلی ،ہریانہ ، گجرات،مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ،آگرہ اور ممبئی میں چرچوں پر حملے،یونی ورسٹیوں میں دلتوں پر حملے،اور وہ واقعات بھی جو مقدس گائے اور نہ جانے کون کون سے افسانہ گڑھ کر،پورے ملک میں جاری ہیں۔سوال یہ ہے کہ ان حالات میں ہم کیا کریں؟ضرورت ہے کہ اُس فکر کو تبدیل کیا جائے جو فکر انسانوں کو کیڑے مکوڑوں سے بھی کمتر سمجھتی ہے،جو انسانوں

کے درمیان نفرت کو فروغ دیتی ہے، جو عقیدت کے نام پر تشدد کا ذریعہ بنتی ہے اور اس فکر کو بھی تبدیل کیا جائے جو خدائے واحد کو تسلیم نہیں کرتی۔ آپ پوچھیں گے یہ کیسے ہوگا؟ہم بس یہیں کہیں گے کہ اپنے مخصوص دائروں سے نکلا جائے اور عوام الناس کے درمیان روابط بڑھائیں، ان کے دکھ درد اور خوشیوں میں شریک ہوا جائے اور تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد سمجھتے ہوئے دوریاں ختم اور قربتیں قائم کی جائیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھی اور رکھوائی جائے کہ مظلوم کی بد دعا اور اللہ کے درمیان کسی بھی قسم کا پردہ حائل نہیں ہوتا ہے!

! راجدھانی دہلی- ڈینگو اور چکن گنیا کی چپیٹ میں

یہ بات صحیح ہے کہ گرمیوں کے آواخر اور برسات کے آغاز میں ایک طویل عرصہ سے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں ڈینگو اور چکنگنیا جیسی خطرناک بیماریاں گزشتہ کئی سالوں سے شہریوں کو اپنی چپیٹ میں لیتی رہی ہیں۔اس کے باوجود اعداد و شمار کی روشنی میں یہ بات بھی موجود ہے کہ جس طرح امسال ان بیماریوں نے ملک کی مختلف ریاستوں میں لوگوں کو بیماریوں سے دوچار کیا ہے ،اس قدر بڑے پیمانہ پر آج تک یہ بیماریاں وبائی امراض کی طرح عام نہیں ہوئیں۔وہیں دہلی جو ملک کی راجدھانی ہے یہاں بے شمار مسائل آغاز ہی سے موجود ہیں، جن کے خاتمہ کے لیے کبھی منظم کوشش نہیں کی گئی۔راجدھانی کے بڑے مسائل میں برسات کے پانی کی نکاسی آغاز ہی سے ایک بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے،وہیں راجدھانی دہلی کی جغرافیائی وسعت ،آبادی کا اضافہ ، ترقی کے نام پر بلڈنگوں کی تعمیرات ،خراب مٹیریئل سے بننے والی ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، نئی کالونیوں کا نقشہ کے بنا ہی وجود میں آنا، کوڑا اور غلاظت کے جمع کرنے اور اٹھانے کا ناقص نظام، صحت عامہ کے لیے ایمس جیسے بڑے اسپتالوں کی قلت، گندے پانی کے بہتے نالوں کے آس پاس جھگی جھونپڑیوں کا وجود میں آنا،اور حکومت کی قائم کردہ جے جے کالونیوں (جگھی جھونپڑی کالونیوں) کی وسائل کے لحاظ سے بدترین صورتحال، وغیرہ جیسے بڑے مسائل نے دہلی کو آج تک وہ

درجہ نہیں دلایا، جس کی وہ بحیثیت ملک کی راجدھانی حق دار ہونی چاہیے تھی۔آزادی کے بعد ہی سے ملک اور رراجدھانی میں مختلف حکومتیں آئیں اور جاتی رہیں، اس کے باوجود یہ مسائل جن کا تذکرہ کیا گیا، آج بھی برقرار ہیں۔ہاں یہ صحیح ہے کہ جس شہر کے ہم واسی ہیں اس شہر میں اور عموماً بڑے شہروں میں تین طرح کے علاقہ پائے جاتے ہیں۔ایک پاش کالونیاں، دوسرے درمیانی درجہ کے لوگوں کی کالونیاں اور تیسرے جے جے کالونیاں یا اس سے بدتر حالت میں رہنے بسنے والے لوگ، جنھیں بدبودار بہتے پانی کے آس پاس دیکھا جاسکتا ہے تو وہیں کوڑے اور غلاظت کے ڈھیروں کے نزدیک۔

راجدھانی دہلی کی جو تصویر یہاں کھینچی گئی ہے ایسا نہیں ہے یہ تصویر آپ کی نظروں سے نہیں گزری۔ملک کے کسی بھی بڑے شہر سے آپ کا تعلق ہو، یہی تصویر آپ کو وہاں بھی دیکھنے کو ملے گی۔لیکن اگر ہر بڑے شہر کی تصویر ایک جیسی ہی ہے تو پھر یہ سوال لازماً اٹھنا چاہیے کہ بڑے شہروں کے یہ پڑھے لکھے، سمجھ دار، دانا، عقل مند، ہوش مند، دولت مند، برسراقتدار لوگ کیا یہ ساری سمجھداری، عقل مندی اور دولت کا استعمال انہیں جیسے مسائل کو برقرار رکھنے کے لیے کرتے ہیں؟یا پھر حقیقت یہ ہے کہ یہ پڑھے لکھے "اور" روشن خیال "لوگ ہی دراصل انسانوں کو انسانوں کے درمیان" بانٹنے اور تقسیم کرنے کا کام کرتے ہیں؟واقعہ بھی شاید یہی ہے کہ جیسے جیسے انسان معاشی اعتبار سے مضبوط ہوتا ہے اس کا

رہنے سہنے کا انداز بھی بدلتا جاتا ہے۔اِس پڑھے لکھے اور دولت مند انسان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ اس نے کمایا اور حاصل کیا ہے اس کو صرف اور صرف وہ اپنے اوپر استعمال کرے، یہاں تک کہ بعض اوقات یا زیادہ تر خونی رشتہ داروں کو بھی اُن وسائل سے فیض یاب نہیں ہونے دیا جاتا جس کے وہ حقدار ہیں۔اور اگر آپ مزید سوال کریں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے تو اس کا آسان سا جواب یہی ہے کہ جس تیز رفتاری کے ساتھ دنیا وسائل کے اعتبار سے ترقی حاصل کرتی جارہی ہے، اخلاقی ذمہ داریوں اور احساس ذمہ داری سے اسی قدر تیزی سے پستی میں مبتلا ہوتی جارہی ہے،وجہ یہ ہے کہ مادیت اُن پر غالب آچکی ہے۔آج کسی بھی فرد کو دوسرے کی تکلیف اور پریشانی سے واسطہ نہیں ہے،الا ماشااللہ۔سماج کی یہ وہ تکلیف دہ صورتحال ہے جس کے نتیجہ میں مسائل میں ہر صبح اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔غنڈے اور لوفر افراد و گروہ مختلف بہانوں سے اپنے ہی جیسے انسانوں پر ظلم وزیادتیوں میں مصروف ہیں۔اس کے باوجود مادیت اور خود میں کھوجانے کی کیفیت نے دوسرے کے دکھ درد اور مسائل سے ہر ایک کو دوسرے سے دور کیا ہوا ہے۔حکومتوں اور سرکاری اداروں کی صورتحال بھی اسی سے ملتی جلتی ہے۔کیونکہ ان حکومتوں اور سرکاری فلاح و بہبود کے ادارووں میں بھی اسی ناقص سماج کے تربیت یافتہ افراد موجود ہیں۔لہذا حکومتیں اور فلاح و بہبود کے ادارے بھی اپنی ان ذمہ داریوں کو بھول جاتے ہیں،ادا نہیں کرتے جو ان پر لازم آتی ہیں۔وہیں،برسراقتدار طبقہ یا لیڈران خودنمائی میں تو مصروف رہتے ہیں لیکن

مسائل کے حل کا کوئی ٹھوس اور قبل از وقت لائحہ عمل طے نہیں کرتے۔ نتیجہ میں صحت عامہ سے متعلق جن بیماریوں کا تذکرہ کیا گیا تھا، ڈینگو اور چکنگنیا جیسے امراض ہر دن بڑھ رہے ہیں، بیماروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، بچے بوڑھے جوان، گھر کی خواتین، بیٹے اور بیٹاں ، اور ماں باپ و دیگر رشتہ داروں کی اموات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ایک عجیب و غریب خوفناک صورتحال ہے کہ جس سے ہر شخص گھبرایا ہوا اور ڈرا سہا ہے۔اس سب کے باوجود کلیم اور بلیم کا کھیل جاری ہے۔ایک طرف ایم سی ڈی ہے، دوسری طرف ریاستی حکومت ہے، تیسری طرف مرکزی حکومت ہے، سب بیماریوں کو ختم کرنے میں جٹے ہوئے ہیں،ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہیں، لیکن وبا کی طرح پھیلی ڈینگو اور چکنگنیا کی بیماریاں ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی
ہیں۔پڑھنے والا سوچے گا کہ جب تمام ہی ادارے اور ذمہ داران مصروف عمل ہیں تو مسئلہ حل کیوں نہیں ہو رہا ہے؟جواب یہی ہے کہ قبل از وقت بیماریوں کو نظر انداز کیا گیا، ہلکے میں لیا گیا، کوششیں جو ہونی چاہیں تھیں وہ نہیں کی گئیں،اور اب جبکہ حالات بے قابو ہو چکے ہیں، تو کی جانے والا عمل ،ناکام ثابت ہو رہا ہے۔
31 اگست 2016 تک 12,255 چکنگنیا کے کیسس رجسٹرڈ کیے جا چکے تھے، جبکہ گزشتہ سال 2015 میں یہ تعداد آدھی ہی تھی۔ جبکہ 27,879 کیسس ڈینگو کے سامنے آچکے تھے جن میں سے 60 لوگوں کی اموات بھی ہوئی تھیں۔ وہیں گزشتہ 2015 میں ڈینگو کے مریضوں

کی تعداد99,913 تھی جس میں 220 لوگوں نے اپنی جان سے ہاتھ دھویا تھا۔اگر یہ تعداد گزشتہ سال بڑھی ہوئی پہلے ہی سامنے آچکی تھی تو کیا وجہ تھی کہ اس سال ان تمام ریاستوں میں جہاں سے یہ تعداد لی گئی ، قبل از وقت ہی الرٹ جاری نہیں کیا؟ کیوں ان ریاستوں کی حکومتوں اور متعلقہ اداروں نے کوششیں نہیں کیں ؟وجہ صاف ہے کہ سماج کے جس پیرامڈ کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے،اس میں ان بیماریوں سے بھی سب سے زیادہ متاثر وہی لوگ ہوتے ہیں جو سماج کے نچلے یا درمیانی طبقہ میں آتے ہیں۔پڑھے لکھے ، سمجھ دار، دانا، عقل مند، ہوش مند، دولت مند اور برسر اقتدار لوگ عموماً ان بیماریوں سے بچے رہتے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہی طبقہ سماج کے اِن کمزور ترین افراد کی زندگی کے مختلف اتار چڑھاؤ سے اپنے بینک بیلنس میں اضافہ بھی کرتا ہے۔انڈین ایکسپریس میں شائع رپورٹ کے مطابق ہر سال حساس آبادی کا 23% فیصد حصہ ڈینگو سے متاثر ہوتا ہے جسے اعداد و شمار کی روشنی میں 228,000افراد سے سمجھا جاسکتا ہے۔یہ تعداد معمولی نہیں ہے۔اس کے باوجود اگر متعلقہ حکومتیں ایسے ہی بے حس بنی رہیں تو پھر یہ وبائی امراض کی شکل اختیار کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔اور آج کل دہلی اور کرناٹک میں ان بیماریوں نے حقیقتاً وبائی شکل ہی اختیار کی ہوئی ہے۔ڈینگو اور چکنگنیا دونوں ہی امراض میں ہر سال اضافہ سامنے آرہاہے۔2010 سے لے کر 2015تک چکنگنیا سے متاثرہ افراد کی تعداد بالترتیب

48,176،20,402،15,977،8,840

16,049،27,553 تھی تو وہیں ڈینگو سے متاثرین کی تعداد بالترتیب،
40,751،75,808،50,222،18,860،اور99,913رہی28,292
ہے۔صرف ساؤتھ دہلی کے جامعہ نگر علاقہ میں اب تک34اموات ہو چکی ہیں،دہلی
اور ملک میں اموات و متاثرین کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ترین مرحلہ ہے۔اس پس
منظر میں محسوس ہوتا ہے کہ سال رواں2016یہ تعداد پچھلے تمام اعداد و شمار سے
زیادہ ہو سکتی ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ان بچے ہوئے دنوں میں ہمارے
لیڈران،برسراقتدار حکومتیں اور فلاح و بہبود کے ادارے،گزشتہ اعداد و شمار کے ریکارڈ
توڑنے کا کام کرتے ہیں ذرا سی بھی انسانیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے،عام شہریوں کی
تکالیف اور دکھ درد میں شامل ہوتے ہوئے مسائل کے حل کے لیے کوئی ٹھوس اقدام
کریں گے!

! ناکامیوں اور عدم اعتماد کی کیفیت سے باہر نکلیے

فی الوقت ملک اندرون و بیرون خانہ بڑے چیلنجز سے نبرد آزما ہے۔اور بڑے ممالک عموماً ان حالات سے وقتاً فوقتاً دوچار ہوتے بھی رہتے ہیں۔اس لحاظ سے جن مسائل سے ملک دوچار ہے وہ نئے نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے حالات ہیں جس کا مشاہدہ آج سے پہلے نہ کیا گیا ہو۔وجہ یہ ہے کہ دنیا نے جس وقت سے خود کو حد بندیوں میں محدود کیا ہے، تبھی سے نوآبادیاتی نظام کا آغاز ہوا ہے،نوسامراجیت، قوم پرستی، سرمایہ دارانہ نظام، ثقافتی سامراجیت، گلوبلائزیشن، انسانی کج دشمنی، دوسرے ممالک پر اثر انداز ہونے یا یا دباؤ ڈالنے کی پالیسی اور حقوق انسانی اور سالمیت کے نام پر انتہا پسندی کے فروغ میں اضافہ سامنے آیا ہے۔یہ وہ مسائل ہے ہیں جنہیں بیرونی مسائل کے ذیل میں درج کیا جا سکتا ہے۔دوسری جانب وہ اندرونی مسائل ہیں جن کی موجودگی میں ملک اندر سے کمزور ہوتا رہتا ہے،اس کے باوجود غور و فکر کرنے والے اُن مسائل پر توجہ نہیں دیتے۔بلکہ بعض اوقات مسائل کے اضافہ میں خاموشی اختیار کرتے ہوئے انہیں خاموش حمایت کا اشارہ بھی دیا جاتا ہے۔ان مسائل میں وطن عزیز میں آزادی سے لے کر اب تک جو سب سے بڑا مسئلہ سامنے آیا ہے وہ اشتعال پر مبنی قوم پرستی کا مسئلہ ہے۔جس کے چلتے ملک کے مختلف مذاہب ، طبقات اور گروہ کو تقسیم کرنے کا کام منظم انداز میں سامنے

آیا ہے۔اس کے علاوہ غربت و افلاس،جہالت، بے روزگاری، صحت عامہ کے مسائل وغیرہ ہیں، جنہیں آزادی سے لے کر اب تک ستر سال گزرنے کے باوجود اں پر قابو پانے میں ہم کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ بنیادی مسائل جیسے ٹوائلٹ اور صفائی ستھرائی تک کا منظم و پختہ نظام نہ ہم قائم نہیں کر سکے ہیں اور نہ ہی اس کے لیے کوئی سنجیدگی نظر آتی ہے۔ہاں یہ صحیح ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں گزشتہ دو سالوں سے اس پر کچھ توجہ دے رہی ہیں۔جس کے مظاہر یہ ہیں کہ پروجیکٹ تیار کیے جا رہے ہیں، نفاذ کی کوششیں ہو رہی ہیں، لیکن اگر آپ اس پورے عملکا اعتدال پر مبنی جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ نہ یہ کوششیں مستحکم بنیادوں پر جاری ہیں اور نہ ہی اس جانب خصوصی توجہ ہے۔ہاں یہ صحیح ہے کہ بے تحاشہ دولت خرچ ہو رہی ہے اور وسائل کا استعمال بھی کیا جارہا ہے ،اس کے باوجود، معاملہ وہیں کا وہیں ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے۔ ملک اور سماج کے حالات اور مزاج کو سمجھنے کا ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ وطن عزیز میں جو مرکزی و ریاستی حکومتیں تشکیل دی جاتی ہیں ان کی بنیادیں کیا ہیں؟اس پہلو سے ملک کے طول و عرض میں مختلف ماڈل سامنے آتے ہیں۔اس کے باوجود ان میں کچھ باتیں یکساں ہیں۔جیسے مذاہب کی تقسیم،طبقات و گروہ اٹھک پٹخ،ذات پات کا نظام ،اقتدار پر قابض رہنے کی خواہش اور خوابوں کی خرید و فروخت۔وہیں جن چیزوں کی کمی محسوس ہوتی ہے ان میں جذبہ ہمدردی

جذبہ انسانیت کی عدم موجودگی، عدل و انصاف پر مبنی نظام کی خواہش کا نہ پایا جانا، معاشی پالیسی میں تضاد، افکار و نظریات پر مبنی نظام کا نہ ہونا اور ہمہ جہت ترقی جو ملک اور اہل ملک کی مختلف جہات کو اوپر اٹھانے میں معاون و مددگار ہے اس کی قلت۔ یہ وہ بنیادی اور بڑی خامیاں ہیں جو وطن عزیز کی سیاست و اقتدار میں شامل افراد کی کمیوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہیں یہ بات جو عموماً کہی جاتی ہے، صحیح نہیں ہے کہ اہل سیاست بھی سماج ہی کا حصہ ہیں یعنی جس فکر و نظر اور جذبہ سے عاری سماج کے افراد ہیں ان ہی کی نمائندگی اہل سیاست بھی کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جن بنیادوں پر اور جس طریقہ کار کے ذریعہ اہل سیاست منتخب ہوتے ہیں وہ خود ناقص ہے خامیوں سے بھرپور ہے۔ لہٰذا کمیاں و خامیاں طریقہ انتخاب میں ہے نہ کہ شہریوں میں۔ اس کی تین مثالیں یہاں پیش کی جارہی ہیں۔ جن ریاستوں کی مثالیں پیش کی جارہی ہیں وہ ملک کی راجدھانی سے قریب تر ہیں۔ پہلی مثال خود راجدھانی دہلی کی ریاستی حکومت اور اس کی پالیسیاں ہیں، جہاں انتخاب کے وقت بے شمار وعدے اور دعوے کیے گئے تھے، لیکن خود اُس پارٹی کی اندرونی و بیرونی کشمکش نے وعدوں اور دعوں کو ابھی تک پورا نہیں ہونے دیا ہے۔ اس کے باوجود جس بڑی اکثریت کے ساتھ انہیں کامیابی حاصل ہوئی تھی یعنی 70 میں سے 63 ایم ایل اے، وہ کامیابی انہیں مطمئن کیے ہوئے ہے کہ ریاستی حکومت کے پانچ سال تو انہیں بنا کسی بڑے دباؤ کے پورے ہونے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔ لہٰذا مسائل جو جاری ہیں انہیں مزید بڑے کینوس

پر مسائل کی شکل میں پیش کیا جائے تاکہ اپنی ناکامیاں چھپائی جا سکیں۔دوسری ریاست اترپردیش ہے ، یہاں بھی دہلی جیسے ہی حالات تھے جس کے نتیجہ میں موجودہ ریاستی حکومت کو 404 ایم ایل اے والی اسمبلی میں 229 سیٹوں پر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔اس کے باوجود ریاست اترپردیش میں بے شمار مسائل ہیں جہاں تقریباً پانچ سال مکمل ہونے کے باوجود قابو نہیں پایا جا سکا ہے۔ان میں لاء اینڈ آڈر کی ناکامی اور ریاست میں ہونے والے چھوٹے بڑے فسادات ، کمزور و مظلوم طبقات پر ظلم و زیادتیاں،اقلیتوں کو نظر انداز کیا جانا، غربت و افلاس، بے روزگاری جیسے بے شمار مسائل جیسے پانچ سال پہلے تھے تقریباً وہی حالات آج بھی ہیں۔تیسری مثال ریاست بہار ہے جہاں حالیہ دنوں ہوئے آر جے ڈی اور جے ڈی یو اور کانگریس اتحاد کو 243 سیٹوں میں سے 178 سیٹوں پر کامیابی حاصل ہوئی اور حکومت جاری ہے۔اس کے باوجود یہ اتحاد ایک بار پھر اندرون خانہ کمزور ہوتا نظر آرہا ہے۔وجہ وہی پرانی ہے کہ یہاں بھی ہوس اور اخلاقی جوابدہی سے عاری حکومت تشکیل دی گئی ہے۔اور اب اِس کے اشارات بھی ملنے شروع ہو گئے ہیں کہ جن لوگوں نے نظریاتی بنیادوں پر اور ذاتی رنجش کی وجہ سے ایک سیاسی پارٹی سے دوریاں اختیار کی تھیں آج ایک بار پھر وہ قربت محسوس کر رہے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ وہ نتیش کمار جنہوں نے چند روز قبل آر ایس ایس مکت بھارت کا نعرہ دیا تھا اور اس کے لیے مہم چلانے کی بات بھی کہی تھی، اب وہی نتیش کمار آر ایس ایس کے سربراہ مفکرین میں شمار کیے جانے والے پنڈت دین

دیال اپادھیائے کی صدی پر ہونے والی تقریبات کے لیے بنائے جانے والی کمیٹی میں بحیثیت رکن شامل ہیں۔سیاسی گلیاروں میں ان کی شرکت کو لے کر بی جے پی کے قریب جانے کی قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں۔اس پس منظر میں وہ تمام دعوہ کھوکھلے ثابت ہو جاتے ہیں جو کیے گئے تھے اور جو ابھی تک منظر عام پر موجود ہیں۔وہیں ریاست کے اندرونی مسائل پر نظر ڈالی جائے تو ریاست بہار حددرجہ غربت وافلاس میں مبتلا ہے، صحت عامہ کے مسائل سے بڑے پیانہ پر متاثر ہے، اعلیٰ تعلیمی اداروں کی قلت ہے، بے روزگاری ایک عام مسئلہ ہے، نتیجہ میں ریاست کا نوجوان مختلف ریاستوں میں اپنے آبائی وطن ،اہل خانہ اور خاندان سے دور، دربدر بھٹکنے پر مجبور ہے۔

گفتگو کے پس منظر میں جب کہ حقیقی مسائل پر روشنی ڈالی جاتی ہے، عموماً ایک بڑا طبقہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔محسوس یہی ہوتا ہے کہ جب اس قدر مسائل ہیں اور حکومتیں بھی بے توجہی کا رویّہ اختیار کیے ہوئے ہیں، تو مسائل کیسے حل ہوں گے؟اور اگر وہ حل نہیں ہوتے تو ہم کب تک عدم اطمینان کی زندگی بسر کریں گے؟اس موقع پر دو طرح کے افراد و گروہ سامنے آتے ہیں۔ایک جو حالات کا مسائل کا مقابلہ کرنے سے پہلے ہی ہاتھ پیر چھوڑ کے بیٹھ جاتے ہیں تو دوسرے وہ جو قبل از وقت مسائل پر نظر رکھے ہوئے تھے،اس کے لیے کسی حد تک سرگرم عمل بھی تھے،اب مزید منظم و منصوبہ بند انداز میں اور نئے حالات اور چیلنجز

کا مقابلہ کرتے ہوئے نئے لائحہ عمل کے ساتھ میدان عمل میں مزید قوت اور سرگرمی کے ساتھ میدان عمل میں اترتے ہیں۔اس مضمون کے پڑھنے والے ہر قاری کو اسی دوسرے گروہ میں شامل ہونا چاہیے،امید ہے کہ مسائل بھی حل ہوں گے،ناکامیوں اور عدم اعتماد کی کیفیت سے بھی باہر نکلیں گے،اور قوم وملت اور ملک و اہل ملک سب ہی کے لیے سود مند ثابت ہوں گے۔یہی وقت کا تقاضہ ہے اور یہی حوصلہ مند اور شجاعت پسند لوگوں کی زندہ مثال ہونی چاہیے !

مسلم پرسنل لاء کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک نادر موقع!

ایک عورت اپنے شوہر کو بوڑھے ماں باپ سے الگ رہنے پر مجبور کرتی ہے تو سپریم کورٹ کا کہنا ہے کہ ہندو لاء کی روشنی میں اسے طلاق دی جا سکتی ہے۔ کورٹ نے اپنے تبصرہ میں کہا ہے کہ ہندو لاء کے مطابق کوئی بھی عورت کسی بھی بیٹے کو اس کے ماں باپ کے تئیں مقدس ذمہ داریوں کی ادائیگی سے روک نہیں سکتی ہے۔ جسٹس انل آردوے اور جسٹس ایل ناگیشور راؤ کی بینچ نے کہا کہ ایک عورت شادی کے بعد شوہر کے خاندان کی رکن بن جاتی ہے۔ لہذا وہ اس بنیاد پر خاندان سے اپنے شوہر کو الگ نہیں کر سکتی ہے کہ وہ شوہر کی آمدنی کا پورا حصہ نہیں پا رہی ہے۔ کورٹ نے تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ماں باپ سے الگ رہنے کی مغربی سوچ ہماری تہذیب و ثقافت اور اقدار کے خلاف ہے۔ کورٹ نے کرناٹک کی ایک اہلیہ کے طلاق عرضی کی منظوری دیتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے۔ سپریم کورٹ نے فیصلے میں لکھا ہے کہ بھارت میں ہندو خاندانوں میں نہ تو یہ عام بات ہے اور نہ ہی رسوم میں ہے کہ کوئی بھی بیٹا اپنی بیوی کے کہنے پر شادی کے بعد بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ دے۔ خاص طور پر تب جبکہ بیٹا ہی خاندان میں واحد پیسہ کمانے والا ہو۔ ایک بیٹے کو اس کے ماں باپ نے نہ صرف جنم دیا بلکہ پرورش و پرداخت بھی کی اور اس کو بڑا کیا، پڑھایا لکھایا۔ صورت میں بیٹے کی قانونی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بوڑھے ماں

باپ کی دیکھ بھال کرے۔خاص طور پر اس وقت جب ان کی آمدنی یا تو بند ہو گئی ہو یا کم ہو گئی ہو۔دراصل کرناٹک کے اس جوڑے کی شادی 1992 میں ہوئی تھی۔شادی کے کچھ دنوں بعد سے ہی عورت اپنے شوہر پر اکیلے رہنے کا دباؤ بنارہی تھی۔بیوی کے اس ظالمانہ حرکت کی وجہ سے شوہر نے نچلی عدالت میں طلاق کی عرضی دی تھی۔دوسری جانب خاتون نے الزام لگایا تھا کہ اُس کے شوہر کے نوکرانی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں، اس لیے وہ مجھے طلاق دے رہے ہیں، لیکن کورٹ نے اسے جھوٹا پایا۔ نچلی عدالت نے طلاق کو منظور کر لیا۔ بعد میں خاتون معاملہ کو ہائی کورٹ لے گئ اور آخرکار سپریم کورٹ نے طلاق کی منظوری دے دی۔یہ ایک واقعہ ہے جو ایک جانب ہندو لاء تو وہیں ملک کے آئین پر روشنی ڈالتا ہے۔یہ واقعہ چند دن پہلے ہی اخبارات کی سرخیوں میں سامنے آیا ہے۔

آیئے پرسنل لاء سے متعلق ایک اور واقعہ کو دیکھتے ہیں،یہ واقعہ مسلم پرسنل لاء سے تعلق رکھتا ہے۔ہندوستان کے آئین کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مرکز نے مسلمانوں کے درمیان تین طلاق، نکاح حلالہ اور تعداد ازدواج کی سپریم کورٹ میں مخالفت کی۔ساتھ ہی جنسی امتیاز اور سیکولرازم کی بنیاد پر ان پر نظر ثانی کرنے کی حمایت کی۔ قانون و انصاف کی وزرات نے اپنے حلف نامے میں جنسی امتیاز، سیکولرزم، بین الاقوامی،مذہبی رسموں اور مختلف اسلامی ممالک میں

ازدواجی قانون کا ذکر کیا تاکہ یہ بات سامنے لائی جاسکے کہ ایک ساتھ تین طلاق کی روایت اور تعداد ازدواج پر عدالت کی جانب نئے سرے سے فیصلہ کیے جانے کی ضرورت ہے۔ وزرات میں ایڈیشنل سکریٹری ایم وجے ورگیہ کی طرف سے داخل حلف نامہ میں یہ دلیل دی گئی ہے کہ تین طلاق، نکاح حلالہ اور تعداد ازدواج کی پریکٹس کی منظوری پر جنسی امتیاز کے اصلولوں اور غیر امتیازی سلوک، وقار اور مساوات کے اصولوں کی روشنی میں غور کیے جانے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں میں ایسی روایت کی منظوری کو چیلنج کرنے کے لیے سائرہ بانو کی طرف سے دائر پٹیشن سمیت دیگر درخواستوں کا جواب دیتے ہوئے مرکز نے آئین کے تحت جنسی امتیاز کے حق کی حمایت کی۔ اس نے کہا کہ، اس عدالت کی طرف سے یقین خواہش کے لیے بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ایک سیکولر جمہوریت میں یکساں درجہ اور بھارت کے آئین کے تحت خواتین کو وقار فراہم کرنے سے انکار کرنے کے لیے مذہب ایک وجہ بن سکتا ہے۔ مرکز نے یہ بھی کہا کہ اقوام متحدہ کا بانی رکن ہونے کے ناطے بھارت بین الاقوامی معاہدوں اور اقوام متحدہ کے چارٹر کو لے کر مصروف عمل ہے جو مرد اور عورتوں کے لیے یکساں حقوق کی بات کرتا ہے۔ لہٰذا خواتین کے لیے جنسی مساوات کے انتہائی اہم مقصد کی روشنی میں پرسنل قانون کی ضرور پڑتال ہونی چاہیے۔

درج بالا کورٹ کے دو فیصلے جو درج کیے گئے، دیکھا جائے تو تضاد محسوس ہوتا

ہے۔پہلے فیصلے میں اِس پر بات زور دیا گیا ہے کہ ملک اپنی تہذیب و ثقافت کو داؤ پر نہیں رکھ سکتا، ہندو مذہب اور اس کا پرسنل لا اس کی اجازت نہیں دیتا، نیز شوہر پر ماں باپ سے الگ ہونے کا دباؤ، مغربی تہذیب کا حصہ ہے۔لہٰذا انہی بنیادیوں پر مرد کو حق ہے کہ وہ ایسی عورت کو طلاق دے سکتا ہے۔وہیں دوسری جانب مسلم پرسنل لا کے تحت فراہم کردہ تین طلاق، نکاح حلالہ اور تعداد ازدواج کی پریکٹس، جنسی امتیاز، سیکولرزم اور بین الاقوامی قوانین کی آڑ میں خلاف واقعہ بن جاتی ہے۔ساتھ ہی بھارت چونکہ بین الاقوامی معاہدوں اور اقوام متحدہ کے چارٹر پر مصروف عمل ہے، لہٰذا مسلم پرسنل لا کے تحت جاری پریکٹس کو،مذہب کی آڑ میں روکنے کی باتیں کی جانے لگتی ہیں۔اس کے باوجود یہ سوال برقرار رہتا ہے کہ اگر بھارت بین الاقوامی معاہدوں اور اقوام متحدہ کے چارٹر پر واقعی مصروف عمل ہے اور یہ بات اسی قدر اہم بھی ہے کہ اس کے خلاف جاری پریکٹس کو روکنے کی باتیں سامنے آرہی ہیں یا اس پر نئے سرے سے غور و فکر کا آغاز ہوا ہے تو پھر کیوں ہندو لا، ہندو تہذیب وثقافت سے تعلق کو قائم کرنے کی باتیں کی جارہی ہیں؟ اور کیوں مغربی تہذیب کا حوالہ دے کر ایک عورت کو اپنے شوہر سے الگ کرنے یا شوہر کو اپنی ہی بیوی کو اس بنا پر طلاق دینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے، جو مغربی تہذیب وثقافت کے خلاف ہے۔اسی سلسلے کی تیسری خبر یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ اور تین طلاق پر لا کمیشن نے لوگوں سے رائے مانگی ہے۔کمیشن نے معلوم کیا ہے کہ کیا تین طلاق کا رواج ختم کردینا

چاہیے؟کیا ملک میں یکساں سول کوڈ کو اختیار کیا جانا چاہیے؟کمیشن نے سوال نامے کی شکل میں پوچھا ہے کہ کیا موجودہ پرسنل لا اور مروجہ کوڈیفائڈ کرنے کی ضرورت ہے اور کیا اس سے لوگوں کو فائدہ ہوگا؟کمیشن کی جانب سے تیار کیے گئے 16 سوالات کے سوال نامے میں یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ کیا تین طلاق کا رواج ختم کر دینا چاہیے یا اس کو برقرار رکھا جانا چاہیے یا مناسب ترامیم کے ساتھ برقرار رکھا جانا چاہیے، یہ بھی پوچھا ہے کہ کیا یکساں سول کوڈ اختیاری ہونا چاہیے، وغیرہ۔ کمیشن نے کہا ہے کہ اس اقدام کا مقصد قوانین کا تنوع قائم کرنے کی بجائے سماجی نا انصافی کو ختم کرنا ہے۔ نیز کمزور لوگوں کے خلاف امتیازی سلوک کو ختم کرنا اور مختلف ثقافتی رواج کو عملی بنانا ہے۔

اس موقع پر مسلم پرسنل لا کے تحفظ اور پریکٹس کو جاری رکھنے کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے ایک دستخط مہم کا آغاز کیا گیا ہے۔ جس میں مسلمانان ہند سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ درج شدہ تحریر کے ساتھ اپنے آس پڑوس کے مسلم گھرانوں کی خواتین سے رائے لیں ،اور متعلقہ علاقہ میں بورڈ کے نزدیکی دفتر میں فراہم کردیں،تاکہ کمیشن و حکومت ہر دو سطح پر بتایا جاسکے کہ مسلمان اللہ رب العزت کے فراہم کردہ قوانین کی خلاف ورزی کو بخوشی قبول نہیں کر سکتے ۔ نیز جن قوانین کو اُن کے رب نے ان کے لیے پسند کیا ہے مسلمانان ہند اور ان کے اہل خانہ اُنپر یکسوئی اور مکمل اطمینان کے ساتھ

عمل پیرا رہنا چاہتے ہیں۔ تحریر جو فراہم کی گئی ہے وہ اس طرح ہے: "ہم دستخط کنندگان خواتین ہر ایک پر واضح کردینا چاہتی ہیں کہ ہم اسلامی شریعت کے تمام احکام خاص طور پر نکاح، وراثت، طلاق، خلع اور فسخ نکاح کے دینی احکام پر پوری طرح مطمئن ہیں اور ان میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی کی ضرورت یا گنجائش سے انکار کرتی ہیں۔ ہم قانون شریعت کی حفاظت میں آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے ساتھ ہیں۔ ہم زور دے کر کہتی ہیں کہ قانون شریعت میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ضرورت اپنی معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے، بگڑی عادتوں کو سدھارنے اور ایمانداری کے ساتھ شریعت پر عمل کرنے کی ہے"۔ فی الوقت کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ تمام حضرات جو اس مضمون کو پڑھیں اور جن تک بورڈ کا یہ پیغام راست نہ پہنچا ہو، چاہیے کہ اس کو ایک صفحہ پر لکھ کر مسلم خواتین کے نام، پتہ، موبائل نمبر اور دستخط کے ساتھ قریب ترین بورڈ کے آفس میں یا ای میل اور واٹس اَپ کے ذریعہ اُس کے مرکزی دفتر میں فراہم کریں۔ ساتھ ہی مسلم پرسنل لا کیا ہے؟ اِس کو خود بھی جانیں اور دوسروں میں بھی یہ پیغام عام کریں!

(نظریاتی سیاست۔منظر و پس منظر! (۲

عموماً دنیا میں بہت کچھ وہ ہوتا ہے جو ہم نے سوچا نہیں تھا یا ہمارے وہم و گمان میں نہیں ہوتا۔اس کے باوجود توقعات اور امیدوں پر دنیا میں نہ صرف نظریات فروغ پاتے ہیں بلکہ نظریات کی روشنی میں دائرہ کار بھی متعین کیا جاتا ہے۔اور چونکہ انسان غیب کا علم نہیں رکھتا اس لیے فطری طور پر ان خواہشات کو مزید تقویت ملتی ہے جس کی خواہش منفی یا مثبت پہلو سے انسان رکھتا ہے۔ایک زمانے میں مظلوم اور کمزور طبقہ کی فلاح و بہبود کے لیے آواز اٹھائی گئی۔مزدوروں سے اپنے رشتہ کو استوار کیا گیا۔ان کے مسائل کو عام و خاص ہر شخص کے سامنے پیش کیا گیا۔اس پیشکش اور فلاح و بہبود کی جدوجہد میں دو قسم کے لوگ شامل ہوتے نظر آئے ۔ ایک وہ جو فلاحی کاموں کو فروغ دینے کا حوصلہ رکھتے تھے،سماج میں پہلے ان کو حیثیت حاصل تھی ساتھ ہی ان لوگوں کا شمار سوچنے سمجھنے والے اور فیصلوں کا رخ موڑنے والوں میں ہوتا تھا۔تو دوسرے وہ جو مسائل سے دوچار تھے۔لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مظلومین کی آواز اٹھاتے وقت ہی یہ دو قسم کے لوگ اپنے ہی درمیان ایک بڑی کھائی قائم کر چکے تھے۔یہ کھائی تھی جدوجہد میں مصروف عمل لوگوں کے حصول اقتدار کی کھائی،تو وہیں جن سروں پر یہ اقتدار حاصل کیا جانا تھا،انہیں سروں کو اپنی جوتیوں تلے دبانے،کچلنے اور مسخ کرنے کی

کھائی۔لازم تھا کہ اسی پہلے مرحلے میں۔برسراقتدار طبقہ ابھر کر سامنے آجاتا تو وہیں وہ طبقہ بھی جس کے لیے بظاہر یہ سعی و جہد کی جارہی تھی،اور یہی ہوا بھی۔ایک جانب سماج کا سوچنے سمجھنے والا گروہ سامنے آیا،جس میں تخلیق کار، سماجی ایکٹوسٹ، پالیسی سازاور اکاڈمک افراد تھے تو وہیں وہ مظلوم ، کمزور،پست ، اور مسائل سے دوچار گروہ جس کے حق میں یہ آواز اٹھائی جانی تھی۔لیکن معاملہ یہیں نہیں تھمایہ طبقات جیسے جیسے ایک دوسرے کے ساتھ ایک دوسرے کے مفاد کی خاطر آگے بڑھتے گئے اور کسی بھی سطح پر کامیابی سے دوچار ہوئے، تو بس ذرا ہی وقفہ ہوا کہ ایک بار پھر اندرون خانہ وہ انہیں مسائل سے دوچار ہو گئے کے لیے اِن سب نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا۔

آپ یہ بات بھی خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ سننے والے کانوں نے سنا تھا کہ ہم دیکھیں گے، ہم دیکھیں گے،لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے،وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے،جو لوح ازل میں لکھا ہے،جب ظلم و ستم کے کوہ گراں،روئی کی طرح اڑ جائیں گے، ہم محکوموں کے پاؤں تلے،یہ دھرتی دھڑدھڑدھڑکے گی،اور اہل حکم کے سر اوپر،جب بجلی کڑکڑکڑکے گی،جب ارض خدا کے کعبے سے،سب بت اٹھوائے جائیں گے،ہم اہل صفا مردود حرم،مسند پہ بٹھائے جائیں گے،سب تاج اچھالے جائیں گے،سب تخت گرائے جائیں گے،بس نام رہے گا اللہ کا،جو غائب بھی ہے حاضر بھی،جو ناظر بھی ہے منظر بھی،اٹھے گا انا الحق کا نعرہ،جو میں بھی ہوں اور تم بھی

ہو،اور راج کرے گی خلق خدا،جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو،لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔یہ خوبصورت منظر جس وقت مخصوص علاقہ میں کھینچا جارہا تھااور اس خوبصورت منظر میں جس طرح اسلامی نظریہ حیات ، اسلامی اقدار، اسلامی اقتداراور اسلامی نظریہ حیات رکھنے والوں کو موہوم کیا جارہا تھااور عموماً توقعات اور امیدوں کے میناروں پر فائز افراد کو اپنی جانب متوجہ کیا جارہا تھا،جب انہیں لوگوں کو اقتدار مخصوص علاقہ میں یا ملک عزیز کی ریاستوں میں یا پھر دنیاکے دیگر حصوں میں حاصل ہوا۔تو ایک بار پھر اندورن خانہ نہ صرف بجلیاں کڑکڑنے لگیں بلکہ تاج بھی اچھالے گئے اور تخت بھی گرائے گئے۔کچھ یہی حال آج کل ہندوستان کی ریاست اترپردیش کا ہے جہاں سوشلزم یا سماج واد اور اس کے نظریات پر مبنی برسراقتدار طبقہ کے درمیان دیکھنے میں آرہا ہے۔

ولادیمیر لینن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ طبقاتی شعور رکھنے والے مزدوروں کے لیے سوشلزم ایک سنجیدہ عقیدہ ہے نہ کہ پیٹی بورژوا مصالحت ساز اور قوم پرست مخالفانہ میلانات کی پردہ پوشی۔وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر ہم مسئلے کو سائنسی طریقے سے یعنی جدید معاشرے میں طبقاتی تعلقات کے نقطہ نظر سے پیش کرنا چاہتے ہیں ، تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ اکثر سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں اور ان میں پیش پیش سب سے پہلے جرمن پارٹی- جو دوسری انٹر نیشنل میں سب سے بڑی

اور سب سے زیادہ باثر ہے، پرولتاریہ کے خلاف اپنے اپنے جنرل اسٹافوں، حکومتوں اور بورژوازی سے جاملی ہیں۔ یہ معاملہ عالمی تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور انتہائی جامع تجزیے کا تقاضہ کرتا ہے۔ مزید لکھتا ہے کہ ایک عرصے سے یہ بات تسلیم کی جاچکی ہے کہ جنگیں اپنی جلو میں ہولناکیاں اور تباہیاں لاتی ہیں لیکن ان سے ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسانی اداروں جو گندہ، دقیانوسی اور مردہ ہوتا ہے اسے وہ بے رحمی سے بے نقاب کردیتی ہیں، منظر عام پر لاتی ہیں اور تباہ کردیتی ہیں۔ 1914-15ء کی یورپی جنگ بلاشبہ اس لحاظ سے مفید ثابت ہو رہی ہے کہ اس نے مہذب ملکوں کے ترقی یافتہ طبقے پر یہ آشکار کر دیا ہے کہ اس کی پارٹیوں کے اندر بدبودار پھوڑا پک رہا ہے اور کسی سرچشمے سے ناقابل برداشت سڑی ہوئی عفونت آرہی ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ یورپ کی اہم اشتراکی پارٹیاں اپنے تمام عقائد اور فرائض کو خیر باد کہہ چکی ہیں؟ لیکن یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر نہ تو غدار بحث کرنے کے لیے آمادہ ہیں اور نہ وہ لوگ اچھی طرح علم ہے یا قیاس، کہ غداروں کے ساتھ انہیں دوستانہ اور بردبار رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ولادیمیر لینن کے اس مختصر ترین اقتباس سے چند حقائق واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک: گرچہ طبقاتی شعور رکھنے والوں کے لیے سوشلزم ایک نظریہ ہو سکتا ہے اس کے باوجود مصالحت ساز اور قوم پرست مخالفانہ میلانات ہر زمانے میں سوشلزم کی پہچان بنے رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی کرنی اور کتھنی پر یقین اور یقین کو عقیدہ کی شکل دینا نہایت خطرناک

رجحانات کی جانب ایک قدم ہے۔ وہیں لینن ہی کے الفاظ میں نظریہ کے حاملین اور پارٹیاں عموماً اپنے انسانی وسائل اور صلاحیتوں کے ساتھ متضاد فکر کے فروغ میں سرگرم عمل پارٹیوں کے ساتھ پردہ کے پیچھے فی زمانہ لین دین اور سودے بازی کرتی رہی ہیں۔اور یہ جنگیں اور تباہیاں جو نہ صرف اہم ترین انسانی جان سے کھلواڑ کرتی اور ہلاک کرتی ہیں بلکہ فضا کو بھی مکدر کرتی ہیں، اس میں اگر کچھ مثبت ہے تو وہ یہی کہ منافقین کی پہچان ہو جاتی ہے اور وہ بے نقاب ہوتے ہیں ۔اور آخری بات یہ کہ یہ اشتراکی فکر کے حاملین جنہیں کہیں نہ کہیں سوشلزم اور سماج واد کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے وہ غداروں کے ساتھ دوستانہ اور بردبار رویہ اختیار کرتے ہیں، تنقید سے بچتے ہیں، مسائل کے حل کے لیے جدوجہد اس نہج پہ نہیں کرتے جو مطلوب ہے اور تمام ان امور پر خاموشی اختیار کرتے ہیں، جہاں انہیں مزید قوت اور طاقت کے ساتھ اپنی بات رکھنی چاہیے۔

مضمون کے آخر میں آیئے ہندوستان کے پس منظر میں بات کرتے ہیں۔وطن عزیز میں اشتراکیت کے علمبردار بھی ہیں تو وہیں سوشلزم اور سماج واد کا نعرہ لگانے والے بھی۔نیز کمیونزم اور اس کے علمبردار بھی اپنی مٹھی بھی جمعیت کے ساتھ وقتاً فوقتاً مختلف ایشوز پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔لیکن غور کیجئے گا کہ یہ سب کب ہوتا ہے ؟اور کیوں ہوتا ہے ؟کیا واقعی یہ لوگ عدل و انصاف کے

علمبردار ہیں؟کیا واقعی جب انہیں کسی بھی سطح پر حکومت شامل ہونے یا حکومت چلانے کا موقع ملتا ہے، اس وقت بھی مخصوص دائرہ یا جغرافیائی حصہ میں ،اپنے خلاف یا ان لوگوں کے خلاف جن کی جانب سے دوسروں پر زیادتی ہو رہی ہے، آواز اٹھانے، نعرے لگانے، دھرنے دینے،اور اسی نوعیت کے دیگر کام کرنے کے مواقع میسر آتے ہیں، جن میں یہ اس وقت مصروف عمل ہوتے ہیں، جبکہ خود ان کی اپنی شناخت ختم ہوتی نظر آئے؟مغربی بنگال میں کمیونزم کے علمبرداروں نے ایک طویل عرصہ حکومت کی، نتیجہ کیا نکلا؟کیا واقعی اس عرصہ میں وہاں مزدوروں اور مظلوم و کمزور ترین سماج کے لوگوں کی حقوق کی بازیابی ہوئی؟نہیں ،ایسا نہیں ہے۔اگر ایسا ہوتا تو وہاں موجودہ برسر اقتدار ترنمول کانگریس اس قدر مارجن کے ساتھ ایک نہیں دو دو بار کامیاب نہیں ہوتی۔وہیں ریاست اترپردیش میں سماج واد کے علمبرداروں کا معاملہ کیا ہے؟کیا وہ اقتدار میں آنے کے بعد قریب ترین یا مخصوص گروپ کے مفاد کے لیے سرگرم عمل ہوئے یا پھر سماج کے طبقاتی نظام سے نجات دلانے اور کمزوروں و مظلوموں کی فریاد رسی کی قدر کرتے ہوئے، عدل و انصاف کے پیمانے قائم کیے؟۔۔۔۔جاری

نظریاتی سیاست- منظر و پس منظر! (۳)

جمہوریت بھی عجیب شے ہے۔کہنے کو تو اس نظام میں عوام کی حکومت ہوتی ہے کیونکہ یہ عوام ہی کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ کسے پسند کریں اور کسے نا پسند۔اس کے باوجود عموماً اس کے ذریعہ وہی لوگ منتخب ہوتے ہیں جنہیں اکثریت نا پسند تو اقلیت پسند کرتی ہے۔آپ کہیں گے ایسا کیوں ہوتا ہے؟تو اس کا سیدھا اور آسان جواب یہی ہے کہ عوام کے ذریعہ منتخب شدہ نمائندہ چونکہ ایک سے زیادہ کئی افراد کے درمیان منتخب کیا جاتا ہے، لہٰذا بڑے پیمانہ پر ووٹ تقسیم ہوتے ہیں،اور عموماً وہ شخص یا اشخاص منتخب ہو جاتے ہیں جنہیں عوام نے ووٹ دیا ہی نہیں تھا۔اور اگر آپ کے پاس وقت ہو تو کسی بھی انتخابی نتیجہ کے اعداد و شمار کا جائزہ اور تجزیہ حاصل کریں ،ہماری بات آپ کو صحیح محسوس ہو گی۔اس کے باوجود جمہوریت میں اس بات کی گنجائش ہے کہ عوام کسی شخص کو اکثریت کے ساتھ منتخب کریں۔اور یہی گنجائش موجودہ زمانہ میں اس نظام کے قیام کا سبب ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جسے عوام کی حکومت کہا جاتا ہے۔لہٰذا لازم ہے کہ جمہوریت آمریت کی ضد ہو اور ایسا ہی کہا بھی جاتا ہے۔وہیں جمہوریت چونکہ عوام کے ذریعہ منتخب ہونے والے نمائندوں پر منحصر نظام ہے۔اس لیے

لازماً ایسے نظام کو فلاحی نظام ہونا چاہیے ۔وطن عزیز ہندوستان بھی ایک جمہوری فلاحی ریاست ہے۔اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ فلاحی ریاست کیا ہوتی ہے؟اور جو کچھ بھی وہ ہوتی ہے اگراس کے ساتھ جمہوریت کو بھی شامل کر لیا جائے، جیسا کہ ہمارے ملک میں اور دنیا کے دیگر جمہوری ملکوں میں ہے، تو اُس کے تقاضے کیا ہیں؟اور کیا تقاضے پورے ہوتے نظر آرہے ہیں؟اور اگر نہیں ،تو اس کی وجوہات کیا ہیں؟آیئے سب سے پہلے فلاحی ریاست پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔فلاحی ریاست سے مراد ریاست کا وہ تصور جس میں ایک ریاست تمام شہریوں کو تحفظ اور شہریوں کے بہتری کی ذمہ داری لیتی ہے۔فلاحی ریاست شہریوں کے جانی ومالی تحفظ کو اولین ترجیح دیتی ہے اور اس کے لیے ٹھوس اقدامات کی پابند ہے۔وہیں اس کی یہ بھی خوبی ہے کہ ریاست شہریوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں کرتی۔ خواہ وہ لسانی ،مذہبی،علاقائی امتیاز ہو یا اقتصادی و معاشرتی امتیاز۔کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں ریاستیں صرف حکمرانوں کے مفاد تک محدود ہوا کرتی تھیں، لیکن جس طرح انسان تہذیب و تمدن سے واقف ہوا اور راست یا بلاواسطہ حقیقی علم حاصل ہوا،ریاست اور طرز حکمرانی کے نئے تصورات بھی سامنے آمنے آئے۔ریاست کے نظام کو از سر نو ترتیب دیا گیا اور لوگوں کے حقوق اور ریاست کے حقوق دونوں واضح کیے گئے۔انسانوں کی اکثریت میں جمہوریت کی قائل ہوئی اور ریاستی نظام میں بہتری آئی۔یہی وہ نقطہ آغاز تھا جب ریاستی نظام میں فلاحی ریاست تصور عام ہوا۔

ریاست نہ تو مطلق (i فلاحی ریاست بنیادی طور پر درج شدہ اصول ومقاصد پر کاربند ہے۔

اچھائی ہے جیسے اجتماعیت پسندوں کا خیال ہے اور نہ ہی لازمی برائی ہے جیسے انفرادیت پسندوں کا خیال کہا جاتا ہے۔ ii) فلاحی ریاست اپنے شہریوں کی سماجی اور معاشرتی ترقی و بہبود کے تحفظ اور فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر ریاست مقصود بالذات نہیں بلکہ اسے شہریوں کے ترقی، خوشحالی اور فلاح کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ ریاست اس بات کی پابند ہوتی ہے کہ وہ اجتماعی و انفرادی مفادات میں توازن قائم رکھتے ہوئے مقاصد کی تکمیل میں آگے بڑھے۔ دولت کی منصفانہ تقسیم فلاحی ریاست کا اہم ترین اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلاحی ریاست میں مساوی اجرت کا نظام قائم کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی خوراک، لباس، رہائش، صحت عامہ، اور تعلیم کا خصوصی انتظام، بے روزگاری سے نجات اور ریاست کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے والوں کی خدمات کے عوض پنشن کی سہولت، پبلک ٹرانسپورٹ، بچوں کی نگہداشت، عوامی پارکوں اور لائبریروں کا قیام، ودیگر اسی نوعیت کے کام، فلاحی ریاست کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ فلاحی ریاست میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اجتماعی وانفرادی مفادات میں توازن قائم رکھتے ہوئے ریاست اپنے مقاصد حاصل کرے۔ ساتھ ہی فلاحی ریاست اپنی سرحدوں کا دفاع کرتی ہے۔ اپنی حدود میں نظم و ضبط قائم کرتی ہے، انتظامی و عدالتی نظام کو قائم کرتی ہے، نظام چلانے کے لیے محصول اور دیگر فنڈز کا اہتمام کرتی ہے، کرنسی کا اجرا اور مالیات کا نظام چلاتی ہے، ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کے نظام کا بروقت انتظام و انصرام کرتی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ فلاحی ریاست کی یہ بھی خوبی ہے کہ یہاں غربت تیزی سے کم ہوتی ہے اور دولت کو عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑے پیمانہ پر صرفکیا جاتا ہے۔ فلاحی

ریاست عموماً لبرل ازم یعنی آزاد خیالی اور سوشلزم کے نظریات کی علمبردار ہوتی ہے۔ فلاحی ریاست، جمہوری فلاحی ریاست، لبرل ازم اور سوشلزم کے علمبرداروں کی بنیاد پر قائم ہونے والی جمہوری فلاحی ریاست، کے قیام کے بعد ایسا کیوں ہوتا ہے کے یہ ریاست وہ تقاضہ پورے نہیں کرتی، جو مطلوب ہیں؟ واقعات پر نظر ڈالیں تو جواب آسان ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لبرل ازم، سوشلزم اور جمہوریت کے علمبرداروں کے درمیان زماں و مکاں کی قیود سے باہر ایک طبقہ ایسا موجود ہوتا ہے جو گرچہ نہ لبرل ازم کا قائل ہے، نہ سوشلزم کا اور نہ ہی اُس جمہوری نظام کا جہاں عوام خود اپنا نمائندہ منتخب کرتے ہیں، اور نمائندہ کو اس بات کا پابند بناتے ہیں کہ وہ اُن کی خواہشات، توقعات اور ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے پالیسی و پروگرام بنائیں۔ برخلاف اس کے یہ لوگ اپنا مخصوص ایجنڈا رکھتے ہیں، مخصوص طرز حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور مخصوص فکر و نظریہ کو فروغ دیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ جمہوریت کا چولا پہنتے ہیں، اس کی پناہ میں داخل ہوتے ہیں، عوام کو بے وقوف بناتے ہیں، حالات کا فائدہ اٹھاتے ہیں، اور وہ طرز حکومت، فکر و نظریہ میدان عمل میں فروغ دیتے ہیں، جو فلاحی ریاست اور جمہوری فلاحی ریاست کا متضاد ہے۔ اور یہ تضاد ان تمام پالیسیوں، اصولوں اور بنیادوں کو مسخ کردیتا ہے جو جمہوری فلاحی ریاست کی پہچان ہے۔ نتیجہ میں فساد عظیم برپا ہوتا ہے۔ اب جیسے جیسے یہ تضاد گہرا ہوتا جاتا ہے اور متضاد افراد حکومت اور اس کے اداروں پر اثر انداز ہوتے جاتے ہیں، مسائل میں اسی رفتار سے دن بہ دن اضافہ ہوتا ہے۔ وہیں یہ بات بھی پیش نظر رہنی

چاہیے کہ یہ متضاد فکر و نظریہ کے حاملین ایک جمہوری ملک میں بیک وقت کئی بھی ہو سکتے ہیں اور اکّا دکّا بھی۔

گفتگو کے اختتام پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ موجودہ دور میں تشدد چہار جانب نہ صرف بڑھتا جا رہا ہے بلکہ تشدد کے مختلف طریقہ باقاعدہ اور منظم و منصوبہ بند طریقہ سے رائج بھی کیے جا رہے ہیں۔ تشدد کے قیام اور اس کی توسیع کی نئی نئی شکلیں نکالی جا رہی ہیں۔ سماج کی تشکیل میں اہم ترین کردار ادا کرنے والے فرد کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا جوان و نوجوان، اس کی اسی نہج پر ذہن سازی کی جا رہی ہے۔ ساتھ عوام کے سوچنے سمجھنے، اور کسی ایشو پر ٹھہر کر غور و فکر کرنے کے مواقع کم سے کم کیے جا رہے ہیں۔ اور اس سب میں سب سے اہم کردار الیکٹرانک میڈیا کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج میڈیا سیاسی گلیاروں، برسر اقتدار اور حزب مخالف کا سب سے بڑا ہتھیار بن چکا ہے۔ اس لحاظ سے فلاحی ریاست کے قیام واستحکام میں فی الوقت میڈیا منفی کردار ادا کرتا نظر آ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کا استعمال کم سے کم کیا جائے وہیں پرنٹ میڈیا کو فروغ دیا جائے۔ صرف خبروں کی حد تک نہیں بلکہ تجزیہ، سروے، ڈاٹا اور حقائق پر مبنی خبروں کے فروغ میں۔ ممکن ہے فلاحی ریاست کا تصور اور موجودہ پالیسی و پروگراموں کو سمجھنے اور منفی رویوں اور مسائل سے بچنے میں کچھ یہ طریقہ کسی حد تک کارآمد ثابت ہو۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ وطن عزیز گرچہ ایک جمہوری فلاحی ریاست ہے اس کے باوجود ستر سالہ دور آزادی کے بعد بھی اخبارات پڑھنے کے لیے وہ تعداد موجود نہیں جو مطلوب

ہے۔ان حالاتمیں الیکٹرانک میڈیا ہر ناخواندہ کو اپنے جال میں پھنسانے میں پوری طرح کامیاب ہے تو وہیں متشدد فکر کا شکار پڑھا لکھا بھی ہوتا جا رہا ہے!